سپیشل ایڈیٹر نمبر

خدمت گزاری وجاں نثاری کا بلا تعصّب وکیل

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

نمبر ۵ و ۶ تعداد جلد ۱۱ و ۱۲	نومبر و دسمبر سنہ ۱۹۳ء	پہلا سال جلد دویم

افکارِ عالیہ

[ہز اکسلینسی یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر جی۔سی۔آئی۔ای شادؔ سرپرست و معاون متعدد رسالہ جات]

ہستی کو فنا کر دے ہستی میں فنا ہو جا — ہوناہے تو اس سے بھی کچھ اور سوا ہو جا
کچھ قدر نہ کی اُس نے گر تیرے وفاؤں کی — تُو اُس کے جفاؤں پر خوش ہو کے فدا ہو جا
اے مرگ خبر کر دے سب قافلہ والوں کو — اے شورِ صفِ ماتم آہنگ درا ہو جا
نظّارے تڑپتے ہیں دیدارِ تجلاّ کو — اے جلوۂ نازآگیں تنویر نما ہو جا
ڈر ہے نہ کبھی وحشت دے طعنۂ ہشیاری — ہاں نشّۂ مدہوشی پھر ہوش رُبا ہو جا
جلووں کی تلاطم میں گُم ہوش و خرد کر دے — موسیٰ کی نظر بن جا ایمن کی فضا ہو جا
احساس غم و راحت ہستی نے مٹا ڈالا — بن زخمِ جگر مرہم اے درد دوا ہو جا
اٹھے ہیں وہ محفل سے اے فتنۂ دَوران اُٹھ — آتے ہیں وہ مقتل میں قدموں پہ فدا ہو جا
پستی و بلندی یہ دونوں ہیں سبب مہمل — دونوں پہ ہو تو حاوی اور راہنما ہو جا
مذہب جو ترا پوچھے کہدے کہ محبت ہے — ایثار کر اپنے کو اور اس پہ فدا ہو جا

اے شادؔ نہ کر دعوئ منصور تو۔ تُو بن جا
وحدت کے تماشہ میں اک سازِ انا ہو جا

(خاص)

شوقِ آزادی

[جناب منشی سکھدیو پرشاد سنہا بسملؔ سابق ایڈیٹر "طوفان" الہ آباد]

ازل سے شغل رہا شکرِ غم ادا کرنا علاوہ اس کے زمانے میں کام کیا کرنا
نہ جانتے تھے کبھی شکوہ جور کا کرنا ہمیں وہی ادب شیوۂ وفا کرنا
وفا شعار سے بھی اپنے بے وفائی کی
بدل گئی جو نظر اس لئے جدائی کی

اٹھائے ہاتھ جفاؤں سے بدگماں صیاد کبھی تو سن لے اسیروں کی داستاں صیاد
دہن میں بند ابھی تک رہی زباں صیاد یہ کھلنے والی ہے لینے کو امتحاں صیاد
بنے گی بن کے دلھن غیرتِ پری ڈالی
کچھ اور نکھرے گی اک اک ہری بھری ڈالی

ہر ایک سانس پہ ہم آہ آہ کرتے ہیں مگر کہاں وہ کرم کی نگاہ کرتے ہیں
بڑھ کر اور زیادہ تباہ کرتے ہیں نہ گھر نظر میں نہ دل ہی میں راہ کرتے ہیں
فلک کے لٹنے کو فریاد لب تک آئی ہے
سبب یہی ہے جو الزام بے وفائی ہے

جو عہد کر چکے ہیں اس کو صاف کہنا ہے کہ ہر طریق سے آزاد ہو کے رہنا ہے
نجات کے لئے زنجیر و طوق گہنا ہے یہاں تو کھیل غرض ہر ستم کا سہنا ہے
بلا سے کچھ نہ ملے غم نہیں چمن مل جائے
وطن کے ہم ہیں ہمارا ہمیں وطن مل جائے

ہم اپنا حال کہیں کیا کہ کہہ نہیں سکتے وہ اپنے دل پہ غبارِ جبر سہہ نہیں سکتے
سرشک آنکھوں سے بیکار بہہ نہیں سکتے بغیر رنگ کوئی لائے رہ نہیں سکتے
قرینہ کہتا ہے کون و مکاں کی خیر نہیں
زمیں کی خیر نہیں آسماں کی خیر نہیں

ہوا ہے حکم نہ لے کوئی نامِ آزادی پہنچنے پائے نہ ہرگز پیامِ آزادی
رہیں غلام نہ ہوں شاد کامِ آزادی نہ آئے دور میں بھولے سے جامِ آزادی
اسیرِ دام رہے ہم اسیرِ دام رہیں
اسی عذاب میں دن رات صبح و شام رہیں

پیامِ عیش ہوا بہار لائی ہے خزاں کے چہرے پہ پژمردگی سی چھائی ہے
طرح طرح کی کلیجے نے چوٹ کھائی ہے بہت دنوں میں مبارک یہ ساعت آئی ہے
قیامت اٹھے جو سرگرم ہوں فغاں کیلئے
قفس نصیب تڑپتے ہیں آشیاں کیلئے

چمن کے سارے فدائی چمن پہ مرتے ہیں ہزار جان سے توقیرِ ملک کرتے ہیں
کلیجہ کانپ اٹھے یوں آہ سرد بھرتے ہیں جو کام ضبط سے لیں تو کہیں کہ ڈرتے ہیں
قفس کو لے اڑیں قوت ہے ایسی بازو میں
کسی خیال سے لیکن ہیں اپنے قابو میں

دفورِ غم سے برا حال ہے جدائی کا ہر ایک شخص کو رونا ہے بے وفائی کا
خیال جی میں نہ آئے کسی برائی کا ملے نصیب سے موقع اگر صفائی کا
بس اٹھتے بیٹھتے حسرت ہے اور کیا دل کی
وہ جلد پوری ہو جو آرزو ہو بسملؔ کی

(خاص)

"چاند" سنہ ۱۹۳۰ء میں

"چاند" کا پہلا سال اس نمبر کے ساتھ ختم ہے' اور یہ اپنے حیات کی دوسری منزل میں قدم رکھ رہا ہے خشک و تر زمانہ سے اس کو بچانا بڑا کام تھا لیکن تربیت کنندگان "چاند" نے اسکو تمام بلاؤں سے محفوظ رکھا۔ کارکنان "چاند" نے جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اسکو جاری کیا ہے اس میں بہت کچھ کامیابی ہوئی "چاند" کی یکسالہ علمی' ادبی' قومی اور ملکی خدمات ایسے نہیں ہیں کہ ناظرین واقف نہ ہوں۔ "چاند" نے اس تھوڑی سی مدت میں جو کامیابی حاصل کی ہے' وہ اگر محال نہ تھیں تو حیرتناک ضرور تھیں۔ "چاند" کے وجود کی اہمیت کو اس ایک سال کی مدت نے ظاہر کر دیا ہے۔ کیا وہ فوائد جو "چاند" سے حاصل ہو رہے ہیں ان کی ضرورت نہیں ہے؟ کوئی پروگرام ہو لیکن اسکو عملی جامہ پہنانے میں بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ کارکنان "چاند" کو بھی یہ کاوشیں پیش آئیں معاصرین کے ایک طبقہ نے خوش آمدید نہیں کہا۔ کسی نے تجارتی اغراض کے حصول کا ذریعہ تبلایا تو کسی نے عصبیت اور کمونل ازم کا الزام دیا۔ کسی نے کہا کہ یہ ہندوؤں کا آرگن ہے اور کسی نے کہا کہ اسکو مسلمانوں سے خاص تعلق ہے غرضکہ "جتنے منہ اتنی باتیں"!! لیکن پھر بھی "چاند" کی خدمات کا اعتراف کیا گیا خیر مقدم ہوا اور اس کے محاسن کو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ "چاند" کا مقصد اصلی "سوشل رفارم" ہے۔ اس امر پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ قومی اصلاح کی ضرورت کی اہمیت دور حاضرہ میں کس قدر ہے۔ کوئی ملک یا قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اپنی اصلاح کی جانب متوجہ نہو ہماری معاشرت اور رسوم میں اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اسکی اصلاح کیجائے زمانہ بدلا خیالات بدلے اور ماحول بھی بدل گیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم لکیر کے فقیر بنے رہیں؟ ضرورت ترقی کی ہے اور ترقی بھی ایسی جو ہمکو دوسری مہذب اور تعلیم یافتہ اقوام کے مقابلہ میں کھڑا کردے یہ ضرور ہے کہ "چاند" ایسے زمانہ میں اپنے مقصد کو لے کر آیا جبکہ تمام ملک میں سیاسی آتش جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ صدائے انقلاب بلند ہو رہی ہے۔ ملک میں ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اور ایک ایک فرد نتیجے کے دیکھنے کے لیے مضطرب ہے۔ اور اہل دل کے جذبات لطیف کو جنگ و جدل کے نہایت سخت "جذبہ" نے بدل دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں اطمینان و سکون مفقود ہے۔ ایسی صورت میں "سوشل رفارم" کے علمبرداروں کی جو حالت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے مگر نہیں! ملک کی بہبودی اور آزادی کا ذریعہ صرف قہر و غضب ہی نہیں ہے بلکہ اس کا بہترین ذریعہ قوم کی اصلاح ہے

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی نہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

"چاند" اسی لئے جاری کیا گیا کہ تمام لوگ اپنی مشترکہ قوت سے سدھار لیکر اپنی سدھار کی جانب متوجہ ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک ہم اپنے کو نہ سدھارینگے ہمارا گھر نہ سدھریگا لیکن اگر ہمارا گھر سدھر گیا تو پھر ملک کی سدھار میں کون سی دقت ہے۔ وہ خود بخود اپنی کمزوریوں کو محسوس کریگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارا ملک آزاد ہو جائیگا۔ افسوس ہے تو اس امر کا کہ ہم اپنے مرض سے واقف تو ضرور ہیں لیکن مداوا کی کوئی فکر نہیں!! کیا مریض یوں ہی سسکتا رہیگا' اور کوئی خبر نہ لیگا۔ ضرورت اسکی تھی کہ قومی امراض کا علاج کرنے والے ہمہ تن اس جانب متوجہ ہو جاتے

"چاند" اسی لئے نکلا اور اس نے اپنا پہلا قدم بڑھایا مگر یہ تن تنہا کیا کر سکتا ہے؟

فضا مخالف ہے، فلک میں تاریکی ہے اور تلاطم و طوفان کا جوش ہے سه

شبے تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

چونکہ "چاند" کو مفید عام ہونا چاہئے اور ہر طبقہ سے اس کا تعلق ہے۔ اس لیے اس کی زبان بھی خالص اُردو ہے۔ یہ عربی اور فارسی کے بڑے بڑے الفاظ اور فارسی کی ترکیبوں و استعارات بعیدہ سے زبان کی فصاحت و شیرینی کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے روزمرہ اور عام بول چال میں آنیوالے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے یہی وہ زبان ہے جو ملک کی متحدہ زبان ہے۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ میانہ روی بہترین چیز ہے مضامین کے لحاظ سے "چاند" نے ہر صنف ادب کو پیش کیا ہے۔ تاریخ' اکتشافات جدید' فلسفہ' افسانے اور نظمیں برابر ناظرین کے سامنے پیش کرتا رہا ہے۔ اب ہم نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ دوسرا سال اپنے انداز میں ایک نیا دور پیش کرے اور نقش ثانی پہلے نقش سے زیادہ محکم ہو "چاند" نے اس کا بہت لحاظ رکھا ہے کہ کسی خاص گروہ اور جتھے کا ساتھی نہ رہے بلکہ ہر شخص کے ساتھ روادارانہ سلوک کرے ہم نے یہ نہیں کیا کہ لکھنؤ اور دہلی کے اختلافات زبان کو پیش کریں یا دکن اور پنجاب کو اپنے سے الگ کردیں' اور ان کو اپنا غیر بنادیں۔ الہ آباد سے "چاند" طلوع ہوا صرف اس لیے کہ سب کو ایک مرکز پر جمع کرے حیدرآبادی' پنجابی' لکھنوی یا دہلوی کی نسبت زبان کے لئے نہ رہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مرکزیت کو مٹانا چاہتے ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اختلافات جو اس کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں ہم اسکو مٹادیں اور سب کی اُردو ایک ہو جو مشترکہ زبان بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مضمون نگار کسی مخصوص گروہ یا مقام سے مخصوص نہیں ہیں۔ لکھنؤ' دہلی' حیدرآباد' پنجاب ان تمام مقامات کے مشہور ادبا اور مضمون نگار ہمارے معاون ہیں۔

ہم نے اس کو اور زیادہ کامیاب بنانے کے لیے ایک طریقہ اور اختیار کیا ہے جو ایڈیٹر نمبر کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ نمبر کیسا ہے؟ اس کو ناظرین خود ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ یہ "چاند" کی خصوصیات میں ایک گرانقدر اضافہ ہے کہ وہ اس نوعیت کا ایڈیٹر نمبر نکال رہا ہے جو اپنی آپ نظیر ہے۔ اردو صحافت کے میران کے مضامین کا یکجا ہونا ذرا مشکل کام تھا لیکن یہ مشکل بھی آسان کی گئی ہر وہ مقام جہاں پر اُردو صحافت کا اثر ہے وہاں سے مضامین فراہم کئے گئے ہم اپنے اُن معاصرین اور معاونین کے بہت ہی شکر گزار ہیں جنھوں نے ہماری دعوت قبول کرکے اس نمبر کے کامیاب بنانے میں مدد دی۔ بہرکیف ایک راستہ تھا جس کو ہم طے کر رہے تھے صعوبت سفر سے تھکے بھی راہ میں کچھ گل و بوٹے بھی نظر آئے اور کچھ کانٹے بھی چبھے۔ مگر ہمت دلانے والوں کی آواز کان میں گونجتی رہی کہ "بڑھے چلو منزل قریب ہے"!!

ہمیں پوری اُمید ہے کہ ہمارے معاصرین' معاونین اور ناظرین ہماری اسی طرح مدد سال آیندہ میں بھی کرینگے کہ جیسا انھوں نے ابھی تک کیا ہے۔

ایڈیٹر "چاند" (اُردو)

زاویۂ نگاہ

از آنریبل جسٹس سر عبدالقادر، جج ہائیکورٹ، لاہور، سرپرست "ادبی دنیا" سابق ایڈیٹر "مخزن" وغیرہ!

انگریزی زبان اور انگریزی طرزِ تحریر سے ہماری زبان نے بہت سے الفاظ اور بہت سی ترکیبیں لی ہیں۔ ان میں ایک دلچسپ دو لفظی ترکیب ہے جسے "زاویۂ نگاہ" کہتے ہیں۔ پُرانے ادیب بھی نگاہ سے کام لیتے تھے۔ مگر شاعرانہ۔ کہیں نگاہ کے تیروں کا ذکر تھا اور کہیں ترچھی نظروں کا۔ کسی پر دوست کی نگاہِ لطف ہوتی تھی اور کوئی اس کی نظروں سے گر جاتا تھا۔ مگر اُن کے زمانہ میں نگاہ پر اقلیدس کا حکیمانہ تسلط نہیں ہوا تھا لہٰذا کوئی نقطۂ نگاہ کو جانتا تھا نہ زاویۂ نگاہ کو۔ نئے زمانہ کی نئی باتیں جب انگریزی زبان کا رواج ہمارے ملک میں ہوا تو انگریزی دانوں نے کہنا شروع کیا "میرا نقطۂ نگاہ اور ہے۔ آپ کا نقطۂ نگاہ اور" یہ ایک انگریزی محاورے کا ترجمہ تھا جو کچھ دن کانوں کو کھلنے لگا۔ مگر رفتہ رفتہ رواج نے اسے مانوس بنا دیا۔ اور ٹھیٹھ اردو والے بھی سمجھنے لگے کہ نقطے کا اثر نگاہ پر پڑ سکتا ہے اور ایک نقطہ سے دیکھیں تو کچھ نظر آتا ہے اور دوسرے نقطہ سے کچھ۔ اخبار والوں کو مقرروں کو اس محاورے کے زبان میں داخل ہوتے ہی سو دلیلوں کی ایک دلیل ہاتھ آگئی۔ جہاں دیکھا کہ بحث کمزور ہوتی جاتی ہے کہہ دیا "صاحب آپ مانیں یا نہ مانیں کم از کم میرے نقطۂ نگاہ سے یہ بات درست ہے" اس سے مسکت جواب اور کیا ہو سکتا تھا۔ مخاطب کو خواہ مخواہ خاموش ہونا پڑتا۔ نگاہ کے نقطے کا یہ دَور دَورہ یوں رہا۔ اور اب بھی باقی ہے۔ مگر گزشتہ جنگِ یورپ کے زمانے سے نقطے نے اپنے پاؤں پھیلائے کہ زاویہ بن گیا۔ عجب نہیں کہ زاویۂ نگاہ انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی اور زبان میں پہلے سے موجود تھا مگر مجھے یاد نہیں کہ جنگِ عظیم کے زمانے سے پیشتر اس کا ذکر سننے میں آیا۔ اس جنگ نے جہاں بہت سے عجیب اثرات اور پیدا کئے ہیں وہاں نگاہ کا یہ تجزیہ ہو کر کہ کسی ایک نقطے پر قائم رہنے کے بجائے نگاہ کے دو حصے ہو کر اور طول کھینچ کر زاویے بننے لگے۔ اب کیا تھا ہر شخص کا زاویۂ نگاہ مختلف ہے۔ ہر جماعت کا علیحدہ زاویہ ہے ہر ملک او قوم کی نگاہ جدا زاویے رکھتی ہے جو ایک کے نزدیک برا ہے وہ دوسرے کے نزدیک اچھا ہے۔ ایک قوم کی نیکی دوسری کی نگاہ میں برائی ہے۔ شاید کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں جس پر انسان بحیثیت مجموعی متفق ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ اکثر قومیں اس رائے پر متفق تھیں کہ امن کی خاطر جنگ کے لئے تیار رہنا ہر قوم اور ملک کا فرض ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد سے ایک گروہ کی تو یہ رائے ہو گئی ہے کہ جنگ نہایت مُضر شے اور انسانیت سے بعید ہے کہ انسان آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کا خون بہاتے رہیں۔ مگر ایک اور گروہ کہتا ہے کہ جنگ کبھی صفحۂ ہستی سے منعدم نہیں ہو سکتی۔ اور اپنے علم و دولت کا یہ استعمال کر رہا ہے کہ تباہی کے آلات روز بروز زیادہ مکمل زیادہ مُہلک ہوتے جاتے ہیں۔ کوئی اور مثال لی لیجئے۔ بنی نوعِ انسان کی کثرت مشرقی اور مغربی دنیا دونوں میں اس بات کی قائل تھی کہ مرد اور عورت کے نکاح کی رسم دنیا کی کل کے کامیابی سے چلنے کے لئے ضروری ہے۔ اب زاویۂ نگاہ پھیلتے پھیلتے پرانے نقطۂ نگاہ سے اتنا دور چلا گیا ہے کہ مغربی دنیا میں بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ نکاح کی قیود ناقابلِ برداشت ہے، اور شادی و آزادی دو متضاد چیزیں ہیں۔ آزادی کی تکمیل یہی ہے کہ کوئی مرد اور کوئی عورت جب جی چاہے مل بیٹھیں۔ نہ مُلّا کو پوچھیں نہ پنڈت کو۔ اور پادری کے پاس جائیں جب تک بن آئے آرام سے ایک جگہ رہیں اور جب ان بن کے آثار پیدا ہوں چپکے سے الگ ہو جائیں۔ تو کون اور میں کون۔ جیسے کبھی آشنا ہی نہ تھے۔ اور یہ زاویۂ نگاہ مغرب تک محدود نہیں۔ مشرق میں بھی کئی آنکھیں اس زاویے کی مالک ہیں۔ دوسرا گروہ اُن پرانے لوگوں کا ہے جو ایسے خیالات کو تہذیب و تمدن کے لئے زہرِ قاتل بتاتے ہیں اور اُن کو سن کر کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ زنانہ لباس کے متعلق جو زاویۂ نگاہ پچھلے چند سالوں میں مغرب میں پیدا ہوا ہے اسے مشرق کا کثیر حصہ اب تک کنکھیوں سے دیکھتا ہے۔ اور یہ خیال کر رہا ہے کہ شوقِ نمود ممالکِ غرب میں حد سے گذر گیا ہے۔ برعکس اس کے دلدادگانِ طرزِ جدید کہتے ہیں کہ مدت کے بعد یہ راز انسان پر کھلا ہے کہ فطرت کے جس قدر قریب تر چلے جائیں اسی میں آزادی ہے اور آرام

میں بحث۔ ان سب مثالوں کو جانے دیجئے۔ اس سب سے اہم مسئلے پر یعنی دنیا کے ایک مالک اور خالق کے وجود کے بارے میں دنیا کے نگاہ کم از کم اب دو مختلف زاوئے ہیں۔ پہلے اقوامِ عالم کی اکثریت باوجود ہر قسم کے اختلافات کے یہ مانتی تھی کہ ان سب کو خدا نے پیدا کیا ہے اور وہی سب کی پرورش کرتا ہے۔ اب کچھ لوگ تو اس پرانے خیال پر قائم ہیں۔ مگر دوسرا گروہ جو خدا کے وجود سے منکر ہے روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے بھی جہان خدا کے منکروں سے خالی نہیں رہا۔ یہ درست ہے مگر ہم نے اب سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا کہ ایسی مجلسیں قائم ہوں جو یہ پرچار کریں کہ خدا کو ماننے سے دنیا کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ اور دنیا آرام میں تب ہوگی جب اُسے خدا کے پنجے سے رہائی مل جائے یہاں تک تو زاویۂ نگاہ رنگ لا چکا ہے۔ ابھی دیکھنا ہے کہ اس کا پھیلاؤ اور کہاں تک پہنچتا ہے۔ قدرت نے پہلے ہی ہر شخص کو مختلف قوتِ نظر بخشی ہے کوئی ہے کہ دور تک دیکھنے سے قاصر ہے اسے اگر دُور کی عینک نہ ملے تو اس کی نظر میں سو قدم پرے کے جلوے ناپید ہیں۔ کوئی ایسی آنکھیں لے کر آیا ہے جو ساخت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوگئی ہیں۔ بھینگے کو ایک چیز کے دو دو دکھائی دیتے ہیں۔ اس پر نقطۂ نگاہ اور زاویۂ نگاہ نے اور اضافہ کر دیا ہے۔ اب جدھر دیکھو یک بینی مفقود۔ اور اختلاف زوروں پر ہے۔ پھر مصنوعی تغیرات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ رنگین عینک سے سب بیرونی اشیا اس رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہیں جو رنگ عینک بنانیوالے نے شیشے پر چڑھا دیا ہے۔ حالانکہ رنگین عینک اُتارتے ہی چیزیں اپنی اصلی حالت میں آجاتی ہیں۔ یہاں عُلُومِ سائنس کے اُس رہے سہے لُطف پر جو نظر میں باقی تھا ایک کاری ضرب لگاتے ہیں۔ سائنس والے کہتے ہیں کہ یہ سب رنگ جنھیں ہم دیکھکر خوش ہوتے ہیں۔ کوئی اصلیت نہیں رکھتے۔ سورج کی سفید شعاعیں قوسِ قزح کے مختلف رنگوں کا مجموعہ ہیں۔ اور پہلو دار شیشے سے ان کا تجزیہ صاف نظر آسکتا ہے۔ ایک روشنی میں جو رنگ سرخ یا سبز نظر آتا ہے۔ دوسری روشنی میں وہی کا وہی رنگ سیاہ دکھائی دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ حالاتِ زمانہ اور سائنس سب مل کر اس فکر میں ہیں کہ انسان کو مجبور کر کے فلسفۂ ہنود کے اس مسئلہ کا قائل کر دیں جس کے رُو سے دنیا ایک دھوکا یا "مایا" ہے۔ کوئی اصلیت اور وجود نہیں رکھتی۔ خواہ ہم اس مسئلے کے قائل ہوں یا نہ ہوں۔ یہ سوچنا لازم ہے کہ دنیا کا تمدن نگاہ کے نقطوں اور زاویوں کی کثرت کے باوجود کس تدبیر سے قائم رہ سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا ایک ہی حل ہے۔ اور وہ حل اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو "رواداری" ہے۔ انسانوں میں خیال کا اختلاف ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ جو نئے اسباب مثال کے طور پر اوپر بیان کئے گئے ہیں وہ اس اختلاف کو بڑھا رہے ہیں۔ پس دنیا کا شیرازہ اُسی صورت میں بکھرنے سے محفوظ رہ سکتا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے نقطۂ نگاہ اور زاویۂ نگاہ کو جتنا چاہے اچھا سمجھے مگر دوسرے کے زاویۂ نگاہ سے بھی آگاہ ہو اور اُسے حقارت سے نہ دیکھے اور سمجھے کہ جیسا کہ ایک نقطے سے لکیریں کھینچیں تو بیشمار زاوئے پیدا ہو سکتے ہیں اور کسی زاویہ کو حق نہیں کہ کہے کہ میں تو رہتا ہوں اور گُم ہو جائیں۔ اسی طرح سب خیالات اور ادراک کے مختلف پہلو نکلے ہوئے دنیا میں جگہ ہے۔ اور سب کو موجود رہنے کا حق ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں جس زاویے کو موزوں سمجھیں اور پسند کریں۔ اپنے لیے چن لیں۔ (خاص)

قربانی

[مہاتما گاندھی، ایڈیٹر "ینگ انڈیا" احمد آباد]

یگیہ لفظ کا استعمال ہم اکثر کرتے ہیں اور سوت کاتنا ہمارے نقطۂ نظر سے مہایگ ہے۔ لہذا آج ہم لفظ یگ کے مختلف معنوں کے سمجھنے کی کوشش کرینگے۔

ہمارے ایسے افعال جن کا مقصد دوسروں کی بھلائی کرنا۔ اور اُن کی بے غرضانہ خدمت کرنا ہے۔ یگ کہلاتا ہے۔ ایسے افعال خواہ دنیوی ہوں یا دینی — اس جگہ افعال سے مراد یہ ہے کہ جس کے اندر خیال الفاظ و فعل تینوں شامل ہوں دوسروں کے اندر تمام خلقت کا شمار کرنا چاہیے۔ ہماری خدمتیں صرف انسان ہی تک محدود نہ ہونا چاہیے لہذا یگیہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کسی چھوٹے سے چھوٹے جاندار کو بھی ایذا پہنچانے سے پرہیز کریں۔

ویدوں کے اندر حیوانی قربانی کا جو ذکر کیا گیا ہے۔ اس پر بحث کرنا ہمارے لیے یہاں پر نامناسب ہے۔ اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ حقیقت اور صلح کے لیے ایسے رواج بے معنی اور غلط ہیں۔ ہم کو ایسے موقع پر غور نہیں کرنا چاہیے کہ مذہبی رسومات کے لیے کون طریقے صحیح اور جائز ہیں اور کون نہیں ہیں اور میں اپنے ویدوں کے سمجھنے کی نابلیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ اگر فرض کیا جائے کہ موجین ویدوں کی مدد سے یہ بات ثابت کر دیں کہ اُس زمانہ میں حیوانی قربانی جائز اور رائج تھی تو بھی ہمارے نزدیک ایسے حرکات دوسوت سچائی اور پریم کے معراج سے گرے ہوئے ہیں۔

مہایگ ہمارے لحاظ سے ایسے افعال کو کہتے ہیں جن کے ذریعے سے وسیع ترین رقبہ کے اندر زیادہ سے زیادہ جانوں کی خدمت کیجا سکتی ہے۔ لہذا اپنے مطلب میں کامیاب ہونے کے لیے دوسروں کے حق میں بُرائی کرنا، یا صرف بُرائی کا خیال ہی کرنا یگ کی راہ سے منحرف ہونا ہے۔ گیتا کا قول ہے کہ ہمارے ایسے افعال جو یگ کے زمرے میں نہیں شمار کیے جا سکتے ہیں وے غلامی کے مستحق ہیں۔

دنیا کا وجود ایک لمحہ بھی بغیر یگ کے قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے گیتا میں گیان کے باب کے بعد گیان حاصل کرنے کے طریقے بتلائے گئے ہیں۔ یگ ہماری فطرت کا ایک جزو ہے۔ یہ جسم خاکی صرف اسی لیے بنایا گیا ہے کہ ہم اس سے دوسروں کی خدمت کر سکیں۔ منذ گیتا میں لکھا ہے کہ وہ جو دوسروں کو بغیر کھلائے کھاتا ہے وہ چرایا ہوا کھاتا ہے۔ یگ ہمارے وجود میں آنے کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور اسی لیے ہم تمام عمر اُس کے قرضدار رہتے ہیں۔ ہمارا فرض ہمیشہ دنیا کی خدمت کرنا ہے۔

جس طرح کہ غلام اپنے آقا کے گھر میں رہ کر اُس کی خدمتگاری کرتا ہے اور اپنی اس نوکری کے صلہ میں جسم کی پرورش کے لیے کھانا کپڑا وغیرہ پاتا ہے اُسی طرح سب اُس خالق کائنات کے غلام ہیں۔ یہ مزدوری کے طور پر جو نعمتیں ہم کو اُس کے یہاں سے عطا کی گئی ہیں۔ اُن کے اندر ہمارا کوئی ذاتی حق نہیں ہے۔ اگر ہم خدا کی ترتیب میں اپنی وقعت پہچان لیں تو یہ راز بالکل کھل جائیگا۔ یہ جسم خاکی اُسی کا دیا ہوا ہے اُس کو اختیار ہے کہ یہ قائم رہے یا غارت ہو جائے۔ ہم کو شکایت کا موقع نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے ہم کو خوش ہونا چاہئے لیکن اس غایت درجہ کی روحانی مسرت سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایمان کامل کی ضرورت ہوگی۔

اپنے لیے ست پریشان ہو۔ خدا پر بھروسہ رکھو — ہر مذہب کا یہی فرمان ہے۔ اس اُصول سے کسی کو ڈرنا نہیں چاہیے۔

وہ جو کہ دوسروں کی خدمت کرنے میں دل وجان سے مصروف رہتا ہے روز بروز اپنے ایمان میں پختہ ہوتا جائیگا۔ خدمت کا راستہ دشوار ہے۔ وہ جو نفس پرستی سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا وہ کبھی بھی اس کا صادق راہ رو نہیں بن سکتا کیونکہ اُس کے ہر ایک کام سے خود غرضی کی بو آئیگی۔ اور سچ ہے کہ اس طرح حق کے متلاشی بہت مشکل سے ملینگے۔ (ینگ انڈیا)

سر تیج بہادر سپرو ، سابق چیرمین
"لیڈر"

مسٹر سی - وائی - چنتامنی ، ایڈیٹر
"لیڈر"

منشی سکھدیو پرشاد سنہا ' بسمل الہ آبادی ' سابق ایڈیٹر "طوفان"

پنڈت موتی لال نہرو، سابق چیرمین ”لیڈر“

پنڈت مدن موہن مالوی، سابق چیرمین ”لیڈر“

مولانا ابوالکلام آزاد، ایڈیٹر ”الہلال“

کامریڈ لینن

روس میں لینن کا تازہ شان سے جھنڈا اٹھا ❀ بول بالا ہوگیا دنیا میں بس مزدور کا

— مظفر حسین اظہر

اسلامی دنیا

ہندوستان سے باہر اُردو زبان

[جناب محمود احمد صاحب عرفانی مدیر اسلامی دنیا قاہرہ مصر]

اُردو زبان ایک ایسی زبان ہے جو دنیا کی زبانوں میں ایک جدید زبان ہے۔ مشرق میں عربی۔ عبرانی۔ سریانی سنسکرت فارسی وغیرہ زبانیں بہت پرانی زبانیں ہیں۔ مغرب میں انگلش۔ فرنچ۔ جرمن وغیرہ قدیم سے چلی آتی ہیں۔ اردو زبان مغلیہ بادشاہوں کے زمانے میں ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ پس زبانوں کی پیدائش یا تکوین کے لحاظ سے اردو سب سے کم زبان ہے مگر باوجود اپنی کم عمری کے اور باوجود اس کے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اسی زبان کی ترقی اور اسکے نشو و نما کے لئے کوئی مربی و سرپرست نہ رہا زبان ترقی کرتی رہی کسی زبان کا دوسرے ملکوں پر اسیوقت اثر پڑ سکتا ہے جبکہ وہ کسی آزاد ملک اور آزاد قوم کی زبان ہو۔ کوئی قوم جبکہ خود دوسروں کی محکوم ہو اور وہ مجبور ہو کہ دوسروں کی زبان سیکھے وہ اپنی زبان کا اثر دوسرے ملکوں پر نہیں ڈال سکتی اس لئے ایک طرف اُردو کی حداثت اور دوسری طرف اردو کی تقسیم آجتک اس امر کی مانع رہی کہ اردو کا اثر دوسرے ملکوں پر پڑتا اور دوسرے ملکوں کے لوگ اسی زبان کو بحیثیت زبان کے سیکھتے۔ اس لحاظ سے اُردو کا اثر غیر ملکوں پر نہ پڑ سکتا تھا ورنہ

لیکن

باوجود اس کے آپ کسی ملک میں چلے جائیں وہاں اگر آپ چاہیں تو اُردو آپ کے کان میں پڑ سکتی ہے اور اسکی دو وجوہات ہیں

اول

مشرق و مغرب کے تمام ملکوں میں ہندوستانی تاجر پھیل چکا ہے اور عام طور پر ہندوستانی تاجر نے اپنی وضع قطع کو تبدیل کرنے کی سعی نہیں کی۔

افریقہ اور حبشہ کی طرف نکل جائیں۔ مسوا۔ جیبوتی ادیس بابا۔ وغیرہ حبشہ میں۔ پورٹ سوڈان۔ خرطوم وغیرہ سوڈان میں مشرقی افریقہ۔ جنوبی افریقہ۔ مغربی افریقہ۔ افریقہ میں چین و جاپان میں۔ اور اسکے علاوہ دیگر بہت سے مشرقی ممالک ہیں۔

مغرب میں اٹلی۔ فرانس۔ جرمنی۔ روس۔ ٹرکی۔ انگلینڈ وغیرہ میں ہندوستانی تاجر اور پھیری کرنے والے پڑے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی زبان اُردو ہے۔

پس

غیر ممالک میں اُردو کے دلچسپ نظارے قائم کرنے کا سہرا ہندوستانی تاجر کے سر پر ہے جس نے تقریباً ہر ملک میں۔ اپنی زبان کے اثرات کو چھوڑ دیا ہے۔

دوسرے

بڑی جنگ میں ہندوستان کے ہزاروں نہیں لاکھوں سپاہی دنیا کے ملکوں میں پھیل گئے۔ وہ جن جن ملکوں میں پہنچے ان ملکوں پر انھوں نے اردو کے گہرے اثرات چھوڑے۔

(بقیہ صفحہ ۲۶۲ پر دیکھیے)

اُمّہاتُ المستقبل

ہندوستانی بہنوں کے نام
مصری خاتون کا پیغام

[سیدہ توفیقہ علام مدیرہ امہات المستقبل وصدر الجمعیۃ الشابات المصریہ۔ قاہرہ مصر]

معزز خواتین ہند! میں روزانہ تاروں میں تمہارے وطنی کارنامے پڑھتی رہتی ہوں جنمیں
تم نے اپنی بہادری۔ دلیری اور جانبازی کو پورے طور سے واضح کر دیا ہے اور تم نے بتلایا ہے کہ
ہندوستانی خاتون مرد سے کسی طرح کم نہیں ہے میری پیاری بہنو! میں خود چونکہ مصر میں
وطنی جہاد میں حصہ لینا اپنا فرض خیال کرتی ہوں۔ مگر میرا نقطۂ نگاہ اور ہے میرا خیال ہے کہ عورت کو دنیا
کی ماں ہونے کی حیثیت سے، اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرنی چاہئے جس سے وہ بچے ملک وطن اور سوسائٹی کیلئے
مفید بن سکیں اسلئے میں اور تمام میدانوں کو چھوڑ کر بچوں کی تربیت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میں جگہ جگہ
ہر خوشگوار نظارے کو دیکھوں کہ آنیوالی نسلیں پوری عمدگی سے یہ اچھی ملتوں کی زندگانی تیار ہو سکیں اچھے تربیت یافتہ
بچے اچھی تربیت یافتہ ماؤں سے ہی پیدا ہو سکتے ہیں اور کسی ملک کی آزادی اور ترقی کسی نسل کے اعلیٰ ہونے سے ہی
ہو سکتی ہے جو اچھی تربیت یافتہ ماؤں سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اسلئے میں تم جانباز اور بہادر وطن پرست عورتوں کو یہ
پیغام دینا چاہتی ہوں کہ تم اپنی توجہ کو آئندہ نسلوں کی اصلاح میں صرف کرو جس پر ہندوستان ہی نہیں
بلکہ تمام عالم مشرق کی بھلائی کا انحصار ہے۔ میں ہوں آپ کی مصری بہن۔ "توفیقہ علام"

(خاص)

[صفحہ ۴۶۱ کا بقیہ]

چنانچہ عراق وغیرہ کے میدانوں میں آپ چلے جائیں تو آپ کو
دیہات کے اندر اردو جاننے والے عرب ملیں گے۔

موٹروں کے موٹر ڈرائیور۔ دوکانوں کے دوکاندار
بے تکلف اردو بول لیتے ہیں۔ اور بعض تو عمدہ آواز سے گا
بھی لیتے ہیں۔ چنانچہ
جن جن ملکوں میں یہ فوجیں گئیں وہاں اردو کے گہرے
نقوش کھود گئیں ہیں۔ اسکے علاوہ
ایک اور چیز نے بھی اردو زبان کو بعض دوسرے ملکوں
میں پھیلایا ہے مگر یہ اثر بہت محدود ہے۔ اور وہ اسلام ہے۔

ناظرین تعجب کرینگے کہ میں نے یہ کیسے کہدیا مگر حقیقت
یہ ہی ہے مسلمان بوجہ مسلمان ہونے کے اپنے بعض مذہبی
فرائض کی ادائیگی کے لئے حجاز میں جاتے ہیں۔ اور شیعہ عراق
میں حجاز اور عراق کے مقدس مقامات کے باشندے بے تکلفی
سے اردو زبان بولتے چلے جاتے ہیں۔

کیونکہ ہزارہا ہندوستانی مسلمان وہاں جاتے ہیں اس
لئے وہاں کے ہر آدمی کو ان سے واسطہ پڑتا ہے اس لئے
ان دو ملکوں پر اردو زبان کا اسقدر شدید اثر پڑا ہے کہ اکثر
لوگ اردو جاننے لگ گئے ہیں۔

عدن ۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اصل اثر تو کسی حاکم قوم
پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے اردو زبان کے مربی وسرپرست کسی
ملک کے حکمران نہ تھے اسی لئے اسکا اثر بلحاظ وسعت کبھی نہیں پڑا
لیکن عدن چونکہ ایک عرصہ سے بمبئی کے ساتھ ملحق چلا آرہا۔
اس لئے عدن کو اردو نے اسقدر اثر ڈالا ہے کہ عدنی عربی
اردو حروف تلفظ کرنے لگ گئے ہیں۔ ورنہ اور کوئی ملک
بحیثیت ملک کے ایسا ملک نہیں جہاں اردو زبان نے ایسا
اثر ڈالا ہو۔

پس سب سے بڑا محرک اردو کو غیر ملکوں میں پھیلا
والا میرے نزدیک ہندوستانی تاجر ہے
جو تقریباً ڈیڑھ سو سال سے اپنی محبت اور کوشش سے
اپنے اثرات غیر ملکوں پر ڈال رہا ہے۔ (خاص)

اجمل

ہندوستان کی تحریک آزادی اور مسلمان

[جناب معین الدین صاحب حارث بی۔اے (جامعی) ایڈیٹر روزنامہ اجمل بمبئی]

(۱)

جس دن مہاتما گاندھی نے سابرمتی آشرم سے اپنے تاریخی کوچ کی ابتدا کی اُسی دن سے یہ بحث نہایت زور سے جاری ہوئی کہ آیا مسلمانوں کو اس تحریک میں شامل ہونا چاہیئے یا نہیں۔ گذشتہ ساڑھے بارہ ماہ کے عرصے میں تحریک وطنی پر۔ مسلمانوں کی شرکت کے حامی و مخالفین دونوں کی طرف سے اس مسئلے پر اتنا زیادہ لکھا جا چکا ہے کہ اب اسکی تائید یا مخالفت میں کچھ لکھنا تقریباً تحصیل حاصل ہوگا۔ اس پوری بحث کو سامنے رکھکر آئے کوئی شخص غیر جانبدارانہ حیثیت سے فیصلہ کرنا چاہے تو وہ ضرور اس نتیجے پر پہنچیگا کہ حامیان تحریک آزادی نے جو دلائل اپنے نقطۂ خیال کی حمایت میں پیش کی ہیں وہ محض جذبات حب الوطنی سے اپیل نہیں تھی بلکہ عقل و دانش اور خود مسلمانوں کی ضروریات بلکہ صحیح معنوں میں مسلم حقوق کا تحفظ" اس امر کا مقتضی تھا کہ مسلمانوں کو بھی دعوت دیجاتی اور یہ امر ہر مسلمان کے لئے باعث صد ہزار مسرت ہونا چاہیئے کہ باوجود ایک طریقے کی شدید مخالفت کے مسلمانوں نے اس تحریک میں ابتک اپنی شایاں شان حصہ لیا ہے۔ مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ جسطرح ہندوستان کو آزادی یا سوراج برطانیہ کے سامنے دست طلب دراز کرنے سے نہیں ملیگا بلکہ دنیا کی اس سب سے بڑی اور سب سے زیادہ محبوب شے کو اپنے زور بازو سے حاصل کرنا ہوگا اسیطرح مسلمان آپ اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں تو یہ مقصد اپنے برادران وطن کے مقابلے میں حکومت کا ساتھ دینے سے یا ہندوؤں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے حاصل نہ ہوگا بلکہ اسے بھی اپنے زور بازو سے حاصل کرنا ہوگا۔ ہندوستان بیشک اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ عاجزانہ درخواستوں اور عرضداشتوں یا زیادہ سے زیادہ ہر روز احتجاجات سے آزادی حاصل ہوتی اسوقت تک ہندوستان کی جو حالت رہی اسکا پتہ ہماری گذشتہ نصف صدی کی قومی تاریخ دے رہی ہے اور جس دن سے ہم نے اس غلط راستے کو ترک کرکے صحیح راستہ اختیار کیا اور اپنے زور بازو پر بھروسہ کرکے منزل آزادی کی طرف قدم بڑھانا شروع کیا اُسی دن سے ہماری حالت میں جو انقلاب پیدا ہوا وہ آج ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن قومی ذہنیت میں اس انقلاب عظیم کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ اس نصف صدی کی سیاسی گداگری نے ایک ایسا طریقہ پیدا کردیا ہے جو ہر مایوسیوں کے بعد بھی اسی فرسودہ طریقے پر ایمان رکھتا ہے اور اب بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ یہی گداگری اور منت و سماجت انھیں منزل مقصود تک پہنچا دیگی اس مثال کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر مسلمانوں نے بھی من حیث القوم یہ فیصلہ کرلیا کہ انکے حقوق کا تحفظ بدیسی حکومت کا ساتھ دینے یا ہندؤں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے ہوگا تو اس بات کا قوی احتمال ہے کہ انھیں بھی وہ روز بد دیکھنا نصیب ہوگا کہ قوم

میں سیاسی گداگروں کا جو طریقہ موجود ہے اسکے ساتھ یہ مضبوط ہوں اور وہ آیندہ انھیں کسی کام کا نہ رکھے گا وہ ہر بات میں غیروں کے رحم وکرم کے محتاج بن جایا کریں۔ میری ناچیز رائے میں کسی اور وجہ سے نہیں تو صرف اسی ایک وجہ سے کہ مسلمان اس آنے والے خطرے سے اپنے آپ کو بچالیں انھیں اس تحریک میں پورے شد و مد سے شرکت کرنا چاہئے۔

مگر اب تحریک وطنی میں مسلمانوں کو شرکت کرنی چاہئے یا نہیں اس مسئلے کو خارج از بحث سمجھنا چاہئے کیونکہ ڈاکٹر انصاری صاحب صدر مسلم نیشنلسٹ کانفرنس نے حال ہی میں اخبارات کے نام ایک بیان میں بالکل صحیح فرمایا ہے کہ یہ کہنا کہ مسلمان کانگرس سے علیٰحدہ رہنا چاہتے ہیں یا موجودہ تحریک وطنی میں شریک نہیں ہیں انکو بدنام کرنا ہے۔ مسلمانوں کے مایۂ ناز صوبۂ سرحد کی نوّے فیصدی مسلم آبادی نے آزادی دینے کی خاطر جو جانی قربانیاں پیش کیں صوبۂ پنجاب میں حب وطن کے جرم میں سرکاری جیلخانے آباد کرنے میں مسلمانوں نے ساٹھ فیصدی رضاکار دیکر اور سوائے دو ایک کے باقی تمام ممتاز مسلم رہنمایان صوبہ کو جیل بھیجکر اور اسیطرح صوبہ جات یوپی بہار وخاصکر شرقی بنگال میں اور بمبئی جیسے مقام پر بھی جو فرقہ بندی کے حامیوں کا مرکز کہا جاتا تھا اس تحریک میں نمایاں حصہ لیکر عام مسلمانوں نے ان بدنام کنندگان قوم کو مسکت جواب دیدیا ہے اور اب اسکے بعد کسی کو یہ جرات نہ کرنی چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو اس تحریک سے علیٰحدہ بتائے۔

عام مسلمانوں پر مخالفین تحریک آزادی کی دلائل میں سے جس دلیل کا سب سے زیادہ اثر ہوتا تھا اور جسے وہ بطور ایک کاری حربے کے استعمال کیا کرتے تھے وہ دلیل یہ تھی کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس تحریک میں شرکت مسلمانوں کا مذہبی اور وطنی فریضہ ہے تب بھی انھیں سردست اسمیں شرکت سے اجتناب کرنا چاہئے کیونکہ ابھی انمیں اسکی استطاعت نہیں ہے اور بلا استطاعت یا کامل تیاری کے میدان جنگ میں کود پڑنا قرین مصلحت نہیں۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور خاصکر اقتصادی کمزوریوں کو منقسم کرکے دکھایا جاتا تھا اور ہندوؤں کے مقابلے میں انمیں کم تعلیم یافتہ اور اقتصادی لحاظ سے بیحد کمزور بتاکر یہ نصیحت کی جاتی تھی کہ وہ پہلے اپنی تنظیم کرلیں اور پھر جنگ میں شریک ہوں۔

جہاں تک مسلمانوں کی تعلیمی و اقتصادی کمزوریوں کا تعلق ہے اُن سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا اور نہ اُنکی "تنظیم" سے شریفانہ مقصد سے کسی مسلم یا غیر مسلم کو بھی اختلاف نہ ہونا چاہئے مگر معمولی سے غور و فکر سے معلوم ہو جائیگا کہ اس ضرورت "تنظیم" کو تحریک وطنی میں شرکت کے خلاف دلیل بنانا ایک صریح دھوکہ ہے لیکن اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے گا واقعی مسلمانوں کی تنظیم اسیقدر ضروری ہے کہ آزادی کی جنگ میں شرکت سے قبل ہی اسے سد ہار کرلینا چاہئے تب بھی یہی لازم آتا ہے کہ مسلمان اس جنگ میں فوری شرکت کریں۔ بظاہر اس خیال میں تضاد نظر آتا ہے مگر موجودہ تحریک ہونے پر نظر ڈالتے ہی ہر منصف مزاج شخص کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ تحریک جو ہندوستان کی سیاسی آزادی کے لئے شروع کی گئی ہے اس درجہ ہمہ گیر ہے کہ اسکے دامن میں ہر قوم و فرقے کے لئے بہترین تنظیمی پروگرام بھی موجود ہے۔

بادی النظر میں یہ تحریک محض سیاسی آزادی کی تحریک معلوم ہوتی ہے لیکن اسکے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہی اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ جہاں اسمیں ہندوستان کو ڈیرھ دو صدی کی سیاسی غلامی سے نجات دیدینے کی قوت موجود ہے وہیں اسکے

پیشانی سے معاشرتی امراض اور اقتصادی کمزوریوں کا علاج بھی اسمیں مضمر ہے۔ علاوہ قانون شکنی یعنی کسی خاص قانون کی خلاف ورزی کے جسکا مقصد درحقیقت اس ایک قانون کو توڑنے سے زیادہ عوام میں ایک خاص ذہنیت پیدا کرنا ہوتا ہے اس تحریک کے باقی تمام پہلو پوری طرح تسلیم ہی نہیں اور سیاسی سے کہیں زیادہ معاشرتی اور اور اقتصادی طور پر ملک کی اصلاح کرنیوالے ہیں۔ مثلاً سب سے زیادہ نمایاں پہلو بدیسی کے منافع اور سُدیشی کے ترویج کا ہے۔

کھدر کی تحریک نے گزشتہ دس سال کے عرصے میں ہندوستان کے ہر مفلس فاقہ کش کسانوں کو پیٹ بھر کر روٹی دلانے میں جو حصہ لیا ہے اسکا بخوبی اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے مہاتما جی اور اُنکے رفقا کی خاموش کوششوں کا مطالعہ پابندی سے کیا ہو ان کوششوں سے گاندھی جی نے پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ بحالت موجودہ ملک کی دیہاتی آبادی کو افلاس و فاقہ کشی کے پنجے سے نجات دلانیکا یا بالفاظ دیگر ملک کی ۸۰ فیصدی سے زائد آبادی کی اقتصادی حالت کی اصلاح کا کوئی موثر ذریعہ ہو سکتا ہے تو وہ کھدر کو عام رواج دینا یعنی بدیسی کپڑے کا مقابلہ کر کے اسکی جگہ کھدر کا استعمال کرنا ہے۔ کھدر کی ترویج سے کھدر پوش شخص کی ذہنیت میں جو تبدیلی ہوتی ہے اور اسکے بدیسی پر سدیشی کو ترجیح دینے کا عادی بن نے سے خود بخود دوسری دیسی صنعتوں کو فروغ نصیب ہوتا ہے وہ ملک کی مزدور پیشہ آبادی کی اقتصادی حالت درست کرنیکا بہترین علاج ثابت ہو رہا ہے۔

معاشرتی اصلاح میں اس تحریک کا مظہر انسداد مے نوشی اور چھوت چھات کے انسداد کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ ذات پات کی تفریق کا خود بخود مٹتے جانا اور مختلف اقوام ہند کا اتحاد ہے شراب کی خرابیاں بیان کرنے کی نہ یہاں ضرورت ہے اور نہ اسکا موقع ہے۔ صرف انسداد مے نوشی میں موجودہ تحریک کو جو دخل ہے اسکی طرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے اگر ان تمام کوششوں کو نظر انداز کر دیا جائے جو گاندھی جی اور اُنکے رفقائے ۱۹۲۰ء سے لیکر ابتک اس سلسلے میں کی ہیں اور صرف گذشتہ چار ماہ کے کام کو پیش نظر رکھا جائے تو اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہاتوں تک میں ایک حیرت انگیز انقلاب رونما ہو گیا ہے اور اس قبیح عادت کو لوگ اس تیزی سے ترک کرتے جا رہے ہیں کہ اسکی توقع بھی مشکل سے کی جا سکتی تھی۔

چھوت چھات کے انسداد اور اُسکے بُرے نتیجے کے طور پر ذات پات کی تفریق مٹانے اور مختلف ہندوستانی قوموں کو قریب تر کرنے میں اس تحریک کا جو حصہ ہے اُسے بھی ہندوستان کی معاشرتی اصلاح کا کوئی حامی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

غرض یہ تحریک جو مختلف تحریکوں کا ایک مجموعہ ہے بلاشبہ ہندوستان کی غیر قوم کے لئے اگر وہ اسمیں پوری طرح حصہ لیکر کام کرے تو اسکی معاشرتی و اقتصادی اصلاح کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے اور لطف تو یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ اسکی سیاسی غلطی یا کسی اور کمزوری کی وجہ سے یہ تحریک اپنے سیاسی مقصد میں کامیاب نہ بھی ہو تب بھی اس اصلاحی پروگرام کی کامیابی یقینی ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے جن ممالک نے آزادی حاصل کی ہے انمیں سے اکثر ممالک مثلاً ایران، ترکی، روس، افغانستان و چین حصول آزادی کے بعد فوراً ہی اپنی معاشرتی و اقتصادی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے چنانچہ ان ممالک سے جو خبریں ہم تک پہنچتی ہیں اُنسے ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ کہیں تعلیم کو عام رواج دیا جا رہا ہے تو کہیں قانوناً سُدیشی کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے

[بقیہ صفحہ ۴۹۶ پر دیکھئے]

ادب

تفرقہ اندازی

[جناب سید اعظم حسین ایڈیٹر رسالہ ادب لکھنؤ]

(۱)

ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہندو مسلم مناقشات بہت بڑھے ہوئے تھے۔ مادر وطن کے فرزند پانڈوں اور کوروں کی طرح ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ لطف یہ تھا کہ جان دینے والے اس جنگ کی کوئی معقول وجہ نہ بتا سکتے تھے!

ہندوستان بھی پرانا تھا، اُسکے باشندے ہندو مسلمان بھی پرانے تھے، دونوں ایک مُدت سے شیر و شکر ہوکر بسر کر رہے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے کوئی تفرقہ نہ تھا۔ یہ دفعتہً فضا میں نہ معلوم کون سی سمیت پھیل گئی تھی اور ہندوستانیوں کے طبیعتوں میں کیسا ہیجان پیدا ہو گیا تھا کہ اُنکے قتل و غارت نے "آرگونالٹس" کا وہ خونی منظر پیش نظر کر دیا تھا جسمیں زمین سے طلسمی انسانوں کا ایک گروہ خود بخود نکلا اور اسکے سارے افراد ایک دوسرے کے ساتھ بلا وجہ کُشت و خون میں مشغول ہو گئے تا اینکہ اُنمیں کا کوئی بھی زندہ نہ بچا اور سب کے سب جس خاک سے اُٹھے تھے اُسی میں مل گئے!

اسی منحوس زمانے کا تذکرہ ہے کہ موضع شمس آباد میں دو زمیندار رہتے تھے، ایک ہندو، دوسرا مسلمان۔ ہندو ٹھاکر تھا، مسلمان "پٹھان"۔ دونوں کافی پڑھے لکھے اور مذہبی معلومات رکھنے والے تھے۔ آپس میں لڑکپن سے دوستی تھی۔ کمسنی میں ایک ساتھ کھیلے کودے تھے جوانی میں ایک ساتھ سیر و شکار کو گئے تھے اور اب انحطاط کے زمانے میں بھی علم کی چاشنی اور دلوں کی نرمی کی وجہ سے میل جول رکھتے ایک دوسرے کے ہاں گھنٹوں بیٹھتے اور تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔

دونوں کے ہاں اخبارات بھی آتے تھے۔ خانصاحب جن پرچوں کا مطالعہ کرتے اُنکے اڈیٹر متعصب مسلمان تھے اور ٹھاکر صاحب جن کو دیکھتے اُنکے لکھنے والے تنگ نظر ہندو تھے۔

ملک کی بگڑی ہوئی فضا سے متاثر ہوکر یہ اخبار نویس اپنے فرقہ کی بیجا حمایت اور دوسرے کی ناروا تذلیل میں اپنی ساری قابلیت صرف کرتے تھے ایسے ایسے اشتعال انگیز مقالے سپرد قلم کئے جاتے جنھیں پڑھکر پبلک کے جذبات بُری طرح برانگیختہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ٹھاکر صاحب اور خانصاحب بھی چند ہفتوں کے مسلسل مطالعہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ روز بروز رنگ گہرا ہوتا گیا اور کچھ دنوں میں وہ سخت متعصب فرقہ پرست ہو گئے!

ایک روز ٹھاکر صاحب کے ہاں خانصاحب بیٹھے ہوئے تھے کہ ڈاکیئے نے لاکر ایک ہندی اخبار دیا۔ ٹھاکر صاحب نے بڑے شوق سے اُسے لیکر دیکھنا شروع کیا۔ پہلی ہی سرخی تھی۔

"ملکش مسلمانوں کا ہندو جاتریوں پر اچانک حملہ۔ بے گناہ عورتیں اور بچے بے خبری کی حالت میں بُری طرح قتل کئے گئے!"

ٹھاکر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار کا ورق ٹھیک کیا

اور بہت غور سے اس خبر کو پڑھنے لگے۔ ایک صفحہ کا طولانی مقالہ، جس کا ہر ہر فقرہ گویا زہر میں بجھا ہوا نیچہ تھا، اپنا کام اچھی طرح کر گیا!

ٹھاکر غصہ میں بت بنے ہوئے بیٹھے تھے کہ خانصاحب پوچھ بیٹھے "کیوں بھئی ٹھاکر، خیر تو ہے، وہ کون سی خبر ہے جس کے متعلق تم اس قدر غور کرنے لگے؟ ذرا میں بھی سنوں"۔

ٹھاکر کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا، انہوں نے بلند آواز میں جواب دیا۔ خبر کے متعلق تو غور نہیں کرتا، البتہ اسلام اور اسکے ماننے والوں کی حمیت و شرافت کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ وہ انتہائی از خود رفتگی کے عالم میں کہتے گئے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ ایسے مذہب کو دنیا میں باقی رہنے کی کیا ضرورت ہے جس کی گود کے پالے ہوئے انسان آدم خور درندے ہو جاتے ہیں!"

وہ یہیں تک کہہ چکے تھے کہ خانصاحب کے دل میں دبی ہوئی آگ یک بیک بھڑک اٹھی۔ تڑپ کر بولے "ٹھاکر، تمہارا فیصلہ بالکل غلط ہے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس حیوانیت و درندگی کا مظاہرہ اول اول تمہارے ہی طرف سے کیا گیا ہے اور اسکی تمامتر ذمہ داری تم ہی لوگوں پر ہے۔ مساوات و حریت کا دلدادہ اسلام آدم خوری کی تلقین نہیں کرتا، البتہ چھوت اچھوت کے فرق پر جانیں لینے والا ہندو دھرم ذلت، حقارت، نفرت اور ظلم کی تعلیم دیتا ہے۔ وہی انسان کو گھانس پات کھانے والا جانور بنا کر اسکی "انسانیت" کا جو برباد کر دیتا ہے۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھکر بتاؤ کہ جو مذہب ایسی مختلف جماعتوں کا مجموعہ ہو جس کے افراد ایک دوسرے کو بالکل ناپاک اور ناقابل موالات تصور کرتے ہوں اسمیں محبت، رحم اور انسانیت کہاں سے آئیگی۔؟"

ٹھاکر نے بات کاٹ کر کہا۔ "خان، دیکھو اس طرح کے جملوں کی تاب کوئی ہندو بچہ اور پھر راجپوت کبھی نہیں لا سکتا۔ اب آگے سے کچھ اور نکالا تو گدّی سے زبان کھینچ لونگا"۔

خانصاحب آگ بگولا ہو گئے۔ بولے "میں بھی پٹھان بچہ ہوں۔ ذرا زبان سنبھال کر باتیں کرو!"

دونوں تنکر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور قریب تھا کہ بچپن کے دوست آپس میں دست و گریبان ہو جائیں کہ دوسرے عاقبت اندیش ساتھی یہ دیکھکر فوراً بیچ میں آگئے۔ انہیں سے چند نے خاں صاحب کو پکڑ لیا اور ٹھاکر صاحب کے ہاں سے ہٹا کر سمجھاتے بجھاتے ہوئے مکان تک پہنچا گئے۔

خاں صاحب نے اپنے بیٹھک میں پہنچکر دیکھا تو پلنگ پر اُن کا اُردو کا اخبار پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے جھپٹ کر اسے اٹھا لیا اور جلد جلد اُلٹ کر دیکھنے لگے۔ ایک جگہ لکھا تھا۔

"بنارس کے پنڈوؤں کی ایک بڑی جماعت نے مسلمان مسافروں کو گھیر کر سارا زر و مال چھین لیا اور بڑی بے دردی سے مارا!"

تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ وہی خبر ہے جسے ہندو اخبار نویسوں نے اپنے رنگ میں رنگا تھا۔ اس اخبار میں سراسر ہندوؤں کی زیادتی اور مسلمانوں کی بے گناہی ثابت کی گئی تھی۔ خاں صاحب نے پڑھکر وہ اخبار ایک آدمی کو دیا اور کہا کہ "جا کے ٹھاکر کو دو اور کہو کہ آنکھ ہو تو اسے بھی دیکھیں"!

(۲)

اتنی ہی دیر میں سارے گاؤں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ دونوں رئیسوں میں نفاق ہو گیا۔ کوئی خوش ہوا کوئی رنجیدہ۔ آپس میں چہ می گوئیاں اور ہر جگہ اسی کے چرچے ہونے لگے۔

چند دنوں سے ایک سنیاسی نہ معلوم کہاں سے آکر موضع شمس آباد کی آبادی سے کچھ دور مقیم تھے۔ انھوں نے ایک چرواہے سے پوچھا۔ "کہو بچّا۔ گاؤں میں سب کُشل منگل ہے؟" اس نے

جواب میں مفصل طور پر بتایا کہ دونوں زمینداروں میں آج اس بات پر چل گئی اور سارے گاؤں میں اس طرح ہلچل ہے۔

سنیاسی کھانا کھانے بیٹھے تھے۔ چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ میں سونٹا لیکر گاؤں کی طرف چلے۔

ٹھاکر صاحب نے بابا جی کو آتا دیکھا، اگرچہ سر پر غصہ کا بھوت سوار تھا لیکن اس رحمت کے فرشتے کو دیکھکر بیٹھ نہ سکے۔ دل میں کہا "ٹھاکر آج کیا ہے جو ان چرنوں نے اس جھونپڑے کو پوتر کیا!" اور قدم لینے کے لئے بیساختہ آگے بڑھے۔ بڑے خلوص سے خیر مقدم کیا اور بڑے احترام سے بٹھایا۔ لیکن بابا جی دل کی بات سمجھ گئے اور "پاؤں لگی" کے جواب میں "اسیرباد" دیکر کہنے لگے۔ "ٹھاکر جی۔ مجھے یہ سنکر بڑا دکھ ہوا کہ آپ اپنے بچپن کے سنگی اور جوانی کے ساتھی سے آج ایک بے بات کی بات پر بگڑ گئے اور ساری عمر کا کیا دھرا مٹی میں ملا دیا! مجھے یہ معلوم کرکے اور رنج ہوا کہ اس جھگڑے کی وجہ "دہرم" بنایا گیا ہے۔ ہائے سنسار کی طرح تم نے بھی دیوتاؤں کے اس پوتر کام کو بدنام کیا اور دنگا فساد کا کارن بنایا...!"

ٹھاکر نے بالکل اُس بیمار کی طرح جسکا زخم دبا دیا گیا ہو اور مواد نکالا جا رہا ہو تلملا کر کہا۔ "بابا میں اپنے دھرم کا دشمن نہیں ہوں۔ پر کیا کروں۔ یہ ملکش کسی طرح سُکھ سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ یہ لیجئے۔ اس خبر کو پڑھئے بھلا اسے دیکھکر کوئی اپنے ہوش میں رہ سکتا ہے؟"

سنیاسی نے اخبار لیکر پڑھا۔ پھر کہا۔ "اچھا بابا، اب اس اخبار کو دیکھو جسکا لکھنے والا مسلمان ہے۔ اُس کا بیان بھی سنو" ٹھاکر۔

ٹھاکر کے سامنے خاں صاحب کا ملازم چپکے سے اخبار رکھکر بھاگ گیا تھا اور وہ غصہ کی وجہ سے اس عالم میں تھے کہ اسے ابتک مڑ کے بھی نہ دیکھا تھا۔ سنیاسی نے اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ بیان بالکل برعکس تھا! اسے سنکر ٹھاکر کی پیشانی پر کئی شکنیں پڑ گئیں۔ دل نے کہا "واقعتہً بالکل ایک دوسرے کے خلاف خبریں ہیں!" وہ ابھی خاموش ہی تھے کہ سنیاسی نے زور دیکر کہا "بابا بتاؤ اب کسکو سچ مانیں اور کسکو جھوٹ؟ ہم تاد دہرم کو بیچ میں لاکر دنیا والے یونہی بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنالیتے ہیں۔ نہیں تو، بابا، دھرم کبھی دنگا فساد، کاٹ مار نہیں سکھاتا، وہ تو پریم لو، محبت کا۔ پرچار کرتا ہے۔ چار دن کی زندگی میل جول، ہنسی خوشی سے گزارنا سکھاتا ہے۔ دل توڑنا اور سر پھوڑنا نہیں بتاتا۔ برہما کا ہردے پربت کی طرح سخت نہیں، گنگا کی طرح نرم ہے! تم اسی کی لہریں ہو، پھر ایسے [illegible] کیسے ہو گئے؟ دیکھو اب مجھے زیادہ پریشان نہ کرو۔ آؤ اُٹھو، اور میرے ساتھ چلو"۔

بابا جی کی دل سے نکلی ہوئی باتوں نے سننے والوں کے دلوں میں اسی طرح جگہ پائی جسطرح خود بابا جی نے اُس مجلس میں اٹھاکر نے محسوس کیا کہ اسوقت اُنکے بھدّے اور بھونڈے فقرے کچھ کام نہ کرینگے۔ آخر انھوں نے بابا جی کی مرضی اور لوگوں کے اصرار کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور چپکے سے سنیاسی جی کے ساتھ ہوئے۔

آگے آگے بابا جی، اُنکے پیچھے ٹھاکر صاحب اور اُنکے پیچھے گاؤں کے بہت سے برہمن چھتری اور پٹھان خاں صاحب کے مکان میں داخل ہوے۔ خاں صاحب لیٹے ہوئے تھے سنیاسی جی کو آتا دیکھکر بیٹھ گئے۔ جب وہ اور قریب آئے کھڑے ہو گئے اور سلام کر کے مناسب جگہ پر بیٹھنے کی درخواست کرنے لگے۔

سنیاسی جی نے کہا۔ "بابا، میں ابھی نہیں بیٹھ سکتا۔ پہلے میری اِچھا کرو پھر میں بیٹھونگا۔ ابھی تو مجھے بڑا کشٹ ہے"!

خاں صاحب نے گھبرا کر پوچھا۔ "کس بات کی تکلیف ہے؟"

سنیاسی نے بات کاٹ کر کہا۔ "بابا سنو" میں ہندو دھرم کا ماننے والا ہوں پر میں نے "ہرمت" کی کتابیں دھیان لگا کر پڑھی ہیں۔ سچ مانو، سب کو ایک ہی طرح "سچا" پایا "بس سمجھ کے پھیر" اور "دنیا کے لالچ" نے لوگوں کو منش کی جگہ جانور بنا دیا ہے۔ "ہرمت" "آدمی کو آدمی" بناتا ہے پرمایہ کے جال میں اسکا ہردے پھنسکر ڈانوا ڈول ہوجاتا ہے۔ سنسار کی اسی ناسمجھی نے مجھے اتنا دکھ دیا کہ میں اپنا سارا کام کاج چھوڑ کر اسی کے پیچھے پڑ گیا۔ آج دیس دیس اسی لئے مارا مارا پھرتا ہوں کہ جیسے بھی ہو آپس کا میل جول اور پریم پیت بڑھے۔ یہی سنک تمہاری طرف بھی لائی ہے تم لوگوں کو یہاں مل جل کر رہتے سہتے دیکھکر خوش تھا۔ آج بُری خبر سنی۔ کہ تم دونوں ایک جگہ کے قدیمی "دھرم" اور "مذہب" کے نام پر بچھڑ گئے! سمجھو! دھرم اور مذہب بچھڑوں کو ملاتا اور روٹھوں کو مناتا ہے۔ دھرم "چاہت" کی ایک دیا ہے مذہب "عشق" کی ایک قسم ہے۔ اس سے آتما بڑھکر پرماتما سے مل جاتی ہے۔ اسکے ماننے والے کبھی ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے۔ پیارو! پرمیشور کی دیا ہے کہ تم دونوں دھرم اور مذہب کے ماننے والے ہو، پھر کیسی جدائی؟ ٹھاکر بڑھو۔ خان آگے آؤ، اور دونوں بھائی ملکر "پرمیشور" کے ماننے والوں کے جتھے کو مضبوط بناؤ!" یہ کہتے کہتے سنیاسی نے اپنے محبت کے ہاتھ بڑی نرمی سے ٹھاکر اور خان کے کاندھوں پر رکھکر دونوں کو گلے ملا دیا! سارا مجمع خاموش تھا صرف آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل رہے تھے! پھر باباجی نے دونوں اخباروں کو منگایا اور انھیں ایک ساتھ آگ لگا دی۔ ایک ہی منٹ میں متعصب اخبار نویسوں کے دل کی طرح سیاہ کاغذ کے ٹکڑے ادھر اُدھر اُڑ رہے تھے اور ٹھاکر صاحب اور خاں صاحب اُنھیں اپنے اپنے جوتوں سے روندتے پھرتے تھے۔ (خاص)

بقیہ صفحہ ۴۶۵

اور کھیں۔ دوسری معاشرتی خرابیوں کو دور کیا جارہا ہے۔ بدنصیب ہندوستان کی یہ خوش نصیبی کیا کم ہے کہ جو کام اور ممالک حصول آزادی کے بعد کر رہے ہیں وہ اسے حصول آزادی کی کوشش کے ساتھ ساتھ کرنے کا موقع ملا ہے، بلکہ اسکے حالات ہی کچھ اس درجہ عجیب و غریب ہیں کہ وہ جس شدت سے اس پروگرام کی تکمیل کی کوشش کریگا۔ اسی نسبت سے اپنے مقصد سے قریب تر ہوگا۔

سب سے آخر میں اس تحریک کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کیونکہ اس کا تعلق اس طریقے کے اصلاح سے ہے جسکی خدمت تحاذ کر رہا ہے میرا اشارہ طبقۂ نسواں کی طرف ہے۔ ہماری بہنوں میں موجودہ تحریک سے جو عدیم النظیر بیداری ہو چکی ہے وہ موجودہ تاریخ کا ایک قابل حیرت واقعہ شمار ہوگا اور ممالک میں خواتین کو اپنے جو حقوق منوانے کیلئے بجد جد و جہد کرنا پڑی ہے وہ حقوق ہندوستانی خواتین کو انکی موجودہ بیداری اور تحریک وطنی میں حصہ لینے سے خود بخود حاصل ہونگے۔ کیا ان قربانیوں کے بعد جو بلبل ہند مسز نائیڈو، مسز کملا دیوی چٹو پادھیا، مسز منشی، مسز بیرن کیپٹن، مسز نعمانی (بدرالدین طیب جی مرحوم کی صاحبزادی) نے اور دوسری صدہا خواتین نے کی ہیں، کہ ہندوستانی مرد کو یہ جرأت ہوگی کہ وہ آزاد ہند میں ہندوستانی خواتین کے جائز حقوق تسلیم کرنے سے انکار کرے؟

غرض متذکرۂ بالا تصریحات سے اندازہ ہوگا کہ تحریک میں شرکت اپنے اندر کتنے فوائد مستتر رکھتی ہے، اب اس فیصلہ کا اختیار مسلمانوں کو ملیگا۔ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیں۔ اور اپنے ہمسایہ برادران وطن کی طرح سیاسی آزادی کے ساتھ ہماری معاشرتی اصلاحات سے بھی متمتع ہوں۔ یا اس سے علیحدہ رہ کر اب اگر اُن سے مقابلتاً کچھ پیچھے ہیں، تو آئندہ اور پیچھے پڑجائیں۔ اُمید ہے کہ مسلمان جیسا کہ انکی طرز عمل سے ثابت ہو رہا ہے صحیح فیصلہ کرینگے۔ (خاص)

ادبی دنیا

کلام ناتمام

(پروفیسر تاجور چیف ایڈیٹر رسالہ ادبی دنیا روزانہ اتحاد اخبار پریم لاہور)

نہیں امتناعِ نظیرِ حق مگر ایک بات میں شک نہیں
کہ جہانِ حسن میں کوئی فرد ترا جواب نہ ہو سکا

یہ تجلیوں کا وفور تھا تری جلوہ گاہِ جمال میں
کہ نگاہِ شوق سے اس ہجوم میں انتخاب نہ ہو سکا

تری بزمِ عام میں دھوم ہے۔ ترے لطفِ عام کی اور میں
فقط ایک میں ہوں وہ بدنصیب کہ باریاب نہ ہو سکا

نہ فضائے دل میں سما سکیں تری طلعتیں اسے کیا کروں
کہ یہ آئینہ ہی حریفِ جلوہ لاجواب نہ ہو سکا

(خاص)

سراغ رسانی کے فسانے

(جناب عابد علی صاحب عابد ایم اے ایم او ایل ایل بی جوائنٹ ایڈیٹر ادبی دنیا لاہور)

عصر حاضر کے نقاد تمام ناولوں اور افسانوں کو ایک ہی ادبی معیار سے جانچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ وہ مسلمہ ادبی معیار جس سے اکثر سراغ رسانی کے افسانوں کو جانچا جاتا ہے۔ صرف ان تخلیقات ادبیہ کے لئے موزوں ہے جن کی اختراع کا مقصد یہ ہو کہ مصنف کو بقائے دوام حاصل ہو جائے اور تصانیف کو بہترین تخیلی تخلیقات کی صف میں جگہ مل جائے۔

ظاہر ہے کہ تمام ناولوں کی تحریر کا مقصد یہ نہیں ہوتا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایسی ناولوں کو ایسے معیار سے جانچنا جس سے مصنف نے قصداً تغافل برتا ہو ہرگز کبھی جائز نہیں

وہ ناول جو صرف قاری کی دلچسپی کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ ان ناولوں سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں جن کا مقصد "ذہن" اور "جمالیات" سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے ناول عارضی دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش میں اکثر صنعت کے اصولوں سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔

دلچسپ ناول اور "ادبی ناول" کی تحاریک اختراع اپنی نوعیت میں بالکل جداگانہ ہیں۔ ان کے مقاصد میں کوئی بات مشترک نہیں۔ پہلی قسم کا ناول علی الاعلان "سطحی" ہے دوسری قسم کا منطقانہ طور پر گہرا۔ وہ ذہنی اثرات جو اُن سے مترتب ہوتے ہیں بالکل مختلف ہیں۔ اور ان میں کوئی نفسیاتی مشابہت نہیں۔ قصہ مختصر از دونوں میں کوئی بھی پہلو مشترک نہیں۔ قاری کی نظر میں یہ ناول کبھی ایک طرح کے نہیں ہو سکتے۔

ان ناولوں کو ایک ہی معیار سے جانچنے کی کوشش کرنا اسی طرح ہے گویا کوئی امانت کی "اندر سبھا" اور شیکسپیر کے کنگ جان کو ایک ہی قسم کے اصولوں سے جانچنے کی کوشش کرے۔

فنون، مناظر و مرایا میں یہی اصول کارفرما ہے۔ چغتائی اور راوی ورما کی تصاویر کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھنا متقدم الذکر پر ظلم ہوگا" سمجھا"۔ ناولوں کی چار قسمیں ہیں۔ (الف) رومانی

ناول۔ یعنی وہ افسانے جن کا مرکز تخیل محبت ہے۔ مرکزی کردار اور مرکزی جذبات اسی شعلۂ آرزو کے گرد رقص کرتے ہیں (ب) تہور کے ناول یعنی وہ افسانے جنمیں تہور اور شجاعت کے کارنامے مرکزی رنگ لئے ہوتے ہیں (ج) اسرار کے افسانے یعنی وہ تحریریں جن میں ایک راز مرکز کے طور پر ہوتا ہے اور کردار اس راز کے انکشاف میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ (د) سراغ رسانی کے ناول یہ چاروں قسم کی تحریریں اکثر ایک دوسرے میں مدغم ہوجاتی ہیں اور بعض اوقات تو ان کی جزئیات میں اس قسم کا اختلاط پیدا ہوجاتا ہے کہ یہ اندازہ قائم کرنے میں مشکل پیش آتی ہے کہ افسانے کو کونسی قسم قرار دیا جائے۔ مندرجہ بالا چار قسموں میں سے سراغ رسانی کے افسانے اپنی پیچیدگی۔ تشکیل۔ ارتقا ترتیب۔ اور پلاٹ کی دلچسپی کے اعتبار سے ممتاز ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کے افسانے ناول کی ایک بالکل نئی قسم ہیں اور سوائے چند ترقی خصوصیات کے ان میں اور دوسرے ناولوں میں کوئی بات مشترک نہیں ہے۔

ان کی دلچسپی کا راز۔ موجودہ ادب میں سراغ رسانی کے افسانوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے متعلق کسی صحیح نتیجے پر پہونچنے کے لئے ان افسانوں کی اثر آفرینی کا راز دریافت کرنا ضروری ہے آخر ان میں وہ کیا شے ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے قاری ان کے مطالعہ میں دنیا و مافیہا سے علیحدہ ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ بھی جن کا ذہنی رتبہ بلند ہے جنکا تمدنی نقطۂ نظر قابل تعریف ہے جن کا ماحول تعلیم و تہذیب کے بہترین اثرات سے لبریز ہے۔ ان افسانوں کو پسند کرتے ہیں۔

اکثر کالج کے پروفیسر، مشہور سائنس داں، فلسفی اور وہ حضرات بھی جنکے دایرہ ہائے عمل حیات کے اہم اور سنجیدہ مشاغل سے متعلق ہیں۔ تمام ادبی تحریروں کو پس پشت ڈالکر "تفریح" کے طور پر اسی قسم کے افسانوں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔

اس کا جواب صرف یہ ہے کہ دراصل سراغ رسانی کا افسانہ ناول ہے ہی نہیں بلکہ اس کا لائق فن معما سے ہے۔ یہ افسانہ ایک پیچیدہ اور وسیع معما ہے جس کو ناول کی شکل دی گئی ہے معمے میں اور اس افسانے میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں صورتوں میں ذہن کو ایک پیچیدہ بات حل کرنا پڑتی ہے اور حل ذہن کے عمل پر مبنی ہوتا ہے یعنی تحلیل و تجربہ بظاہر غیر متعلق اور غیر موثر واقعات کی ترتیب اور ان کا مناسب جوڑ اجزائے ترکیبی کی واقفیت اور اندازہ دونوں صورتوں میں قاری کو "سراغ" دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ "انکشاف" کے راستے پر گامزن ہوسکے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات مل کر "حل" کی راہ میں شمع فروزاں کی طرح روشنی کر دیتے ہیں۔ اور اس روشنی میں منزل کا دھندلا سا خاکہ نظر آنے لگتا ہے دونوں صورتوں میں مسئلے کے حل ہونے کے بعد تمام اجزائے ترکیبی ایک کل میں اس طرح مدغم ہوجاتے ہیں کہ انسان متحیر بھی ہوجاتا ہے اور مرعوب بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ کراس ورڈ معمول اور سراغ رسانی کے افسانوں میں مشابہت کے اتنے عناصر پائے جاتے ہیں کہ نقاد یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ سراغ رسانی کے افسانوں کے اجزائے ترکیبی مشین کے اجزائے ترکیبی کی طرح ہیں۔

دراصل سراغ رسانی کے اچھے افسانوں کا تخلیقی محرک "ذہنیت" ہے اور اس بات کی تائید میں اس قسم کے افسانوں کے موجد کی ذہنیت کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ آگر ایلن پو جو اس قسم کے افسانوں کا موجد ہے سائنٹیفک تجارب کا دلدادہ تھا۔ اس کی فطرت میں تحلیل و تجزیئے کی قوتیں پنہاں تھیں ان کا ایک پرتو سیلزل کی شطرنج کا کھلاڑی ہے

دستخطوں کا ایک باب "رموزی تحریریں" میں پایا جاتا ہے اس کے چار مشہور افسانے "ارماگو کے قتل" "میری راجٹ کا قتل" "گولڈ بگ" "گم شدہ خط" جو تحلیل و تجربہ کے بہترین نمونے ہیں ان قیاسات کے منطقی نتائج ہیں جو وہ سائنس کے امکانات کے متعلق قائم کیا کرتا تھا۔

اعمال ذہنی سے زیادہ کوئی شے خیال آفریں نہیں عقلی معموں سے زیادہ کوئی شے دلچسپ اور اثرافزا نہیں۔ انسان نے ہمیشہ اس ذہنی کاوش سے مسرت حاصل کی ہے جو کسی معمے کو حل کرنے میں پیش آتی ہے۔ وہ دماغی ورزش جو معموں کو حل کرنے میں کرنی پڑتی ہے جسمانی ورزشوں سے کہیں زیادہ مسرت خیز اور پُر لطف ہے۔

تاریخ عالم کے اوراق اس قسم کے واقعات سے پُر ہیں، "چہار مقالہ" کا مصنف نظامی عروضی سمرقندی رقمطراز ہے کہ پچھلے زمانوں کے عظیم الشان بادشاہ اپنے معاصرین کی عظمت و شوکت کا اندازہ قائم کرنے کے لئے معمے لغز لطائف و ظرائف اور پیچیدہ سوال بھیجا کرتے تھے۔ جن بادشاہوں کے پاس یہ سوال ارسال کئے جاتے تھے وہ اپنے وزرا اور علما کو جمع کرتے تھے اور جب تک معموں کو حل نہ کر لیا جاتا تھا۔ اراکین دولت کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا تھا ہارون الرشید نے شارلمین کو ایک ایسی گھڑی تحفے میں ارسال کی تھی جس کے حیرت انگیز کارناموں کو جادو پر معمول کیا جاتا تھا۔

پھر اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اطمینان سے معمے کے حل کا انتظام کرنا اور شے ہے اور ان اجزا کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور شے ہے جو "انکشاف" میں ممد و معاون ہوتے ہیں معمولی اسرار اور ہتور کے افسانوں میں مصنف آخری باب میں راز کی گرہ کھول دیتا ہے۔ قاری اطمینان سے بیٹھا ہوا "انکشاف" کا انتظار کرتا رہتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں مصنف اپنے کمال فن سے تحیر۔ شک اور امید و بیم کی مختلف کیفیات پیدا کرکے پڑھنے والے کی دلچسپی کو قائم رکھتا ہے۔ لیکن پڑھنے والا واقعات کے ساتھ حرکت نہیں کرتا۔ وہ واقعات سے بے نیاز رہتا ہے۔ دوسری طرف سراغ رسانی کے افسانوں میں جذبات کا اتار چڑھاؤ ایک ثانوی اہمیت رکھتا ہے۔ پڑھنے والا واقعات کے ساتھ حرکت کرتا ہے اس کا ذہن معمے کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے وہ سراغ لگاتا ہے۔ شبہ کرتا ہے۔ اپنے شبہات کی تردید کرتا ہے سوچتا ہے "انکشاف" کا راستہ ڈھونڈتا ہے۔ اور پھر خود ہی اپنی بنی بنائی عمارت کو گرا دیتا ہے۔ اس گری ہوئی عمارت پر وہ ایک نئی تعمیر کی بنیاد رکھتا ہے۔ الغرض آخری باب تک [illegible] تش کے گھر بنا بنا کر لگاتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سراغ رسانی کے افسانے ترقی پذیر ہیں دوسرے افسانے یا ناول برباد ہوں یا باقی رہیں۔ سراغ رسانی کے افسانے یقیناً باقی رہیں گے جب انسانی فطرت نہ بدلے گی ایسے افسانے لکھے جائیں گے۔

سراغ رسانی کے افسانوں کے اصول۔ سراغ رسانی کے افسانوں کے اصول باقی اصناف ادب سے مختلف ہیں اس قسم کے افسانوں کے مصنفین نے خود ہی چند اصول وضع کرتے ہیں قانون بنائے ہیں۔ اور انھیں اصولوں پر تمام افسانے لکھے جاتے ہیں۔ ایسے افسانوں کی صنعتی ترتیب اجزا کا اختلاط۔ اور پلاٹ کی پیچیدگی بہت جاذب توجہ ہوتی ہے۔ اپنے مراحل ارتقا میں یہ صنف ادب باقی اصناف سے پرے ہوتے ہوتے ایک نئی مملکت میں جا داخل ہوئی ہے جہاں کے رسوم و رواج پرانے اصناف ادب سے مختلف ہیں۔ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ سراغ رسانی کے افسانوں کے اصول باقی تمام افسانوں کے اصولوں سے متضاد ہیں۔

سراغ رسانی کے ناول یا افسانے میں "واقعیت" ایک جزو لازمی ہے۔ کوشش کی گئی تھی کہ ایسے ناولوں یا افسانوں کو واقعی ماحول سے بلند کر کے تخئیلی دنیا میں لے جایا جائے۔ لیکن یہ کوشش قطعاً ناکامیاب رہی۔ معمولی ناولوں میں ایک تخئیلی یا غیر واقعی عنصر بھلا معلوم ہوتا ہے۔ پڑھنے والے مادی دنیا کی بندشوں اور یہاں کے معین قوانین سے آزاد ہو کر ایک تخئیلی دنیا میں جا بستے ہیں جہاں آرزو محبت کے پھول کھلاتی ہے۔ لیکن سراغ رسانی کے افسانوں میں اس عنصر کا پایا جانا ایک مہلک بات ہے۔ پڑھنے والا ذہنی ورزش سے کام لیتا ہے اور اس کی قوتوں کو بیدار کرنے کے لئے مصنف اپنے افسانے کو ایک واقعی اور فطری رنگ میں پیش کرتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو پڑھنے والا یہ سمجھے کہ اس کی تمام محنت اکارت گئی اس نے واقعی معمے کا حل نہیں کیا۔ دنیا کے عام واقعات اور سراغ رسانی کے افسانوں میں مشابہت اور مطابقت ہونی چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ کراس ورڈ معموں میں تمام الفاظ واقعی با معنی الفاظ ہوتے ہیں۔ اور مل کر کسی اہم معاشرتی یا تمدنی مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مسٹر اے ای ڈبلیو میسن ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ڈفو سراغ رسانی کے بہترین افسانے لکھ سکتا تھا۔ یہ کہنے سے ان کا منشاء ڈفو کی ان قوتوں کی طرف اشارہ کرنا تھا جس سے کام لے کر وہ اپنے ناول کے ماحول کو واقعی اور فطری بنا دیا کرتا تھا۔

ماحول کے اثرات معمولی افسانوں پر بہت گہرے ہوتے ہیں اکثر افسانہ نگار مناظر فطرت کی تصویر کشی کرتے ہیں اور اس سے افسانے میں دلکشی کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اردو زبان کے بہترین ناول نویسوں کے اکثر ناول اس طرح شروع ہوتے ہیں "آسمان پر گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آرہی تھی ہر شخص کے دل میں ...."

یا پھر اس طرح۔

"رات کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی"

اس طرح کی تصویر کشی (بشرطیکہ وہ پلاٹ کے کسی جزو کی تکمیل میں نہ لکھی گئی ہو) سراغ رسانی کے افسانوں میں جائز نہیں اس طرح پڑھنے والے کا ذہن اصلی مدعا یعنی سعیٔ انکشاف کی طرف سے ہٹ کر اسی چیزوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جن کو پلاٹ سے یا واقعات کی فطری ترتیب سے کوئی تعلق نہیں۔

پلاٹ ایسی خوبصورتی سے مرتب کیا جاتا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا واقعات حقیقی واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر سراغ رسانی کے ناولوں میں نقشے اور خاکے دیئے ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو پڑھنے والا اجنبی حالات اور اجنبی عمارتوں سے گھبرا جائے اور "انکشاف" میں اسے کوئی دلچسپی محسوس نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ملک کے سراغ رسانی کے ناول دوسرے ملک میں دلچسپی سے نہیں پڑھے جاتے۔ انگریزی معاشرت۔ تمدن طریق بود و باش اور ہندوستانی رسوم و رواج میں فرق ہے۔ اگر انگریزی کے اچھے سراغ رسانی کے افسانے اردو میں ترجمہ کئے جائیں تو شاید ہندوستانی اتنی دلچسپی محسوس نہ کریں جتنی انگریز کرتے ہیں۔

کردار نگاری۔ سراغ رسانی کے افسانوں میں کردار نگاری کے اصول بھی معمولی ناولوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس قسم کے افسانوں کے کردار بیجان تو نہیں ہوتے۔ لیکن ان میں وہ روح زندگی بھی موجود نہیں ہوتی جو کسی کردار کو میر حسن کی نجم النسا کی طرح زندہ جاوید کر دیں۔ سراغ رسانی کے افسانوں کے کردار صرف اس لئے تخلیق کئے جاتے ہیں کہ کہانی تمام تر مصنف کے

ایک پہلے ہی سوچے ہوئے پلاٹ کا نتیجہ نہ معلوم ہو۔ اور واقعات کے عمل اور کرداروں کے ردعمل سے نئے امکانات پیدا کئے جائیں۔ اگر کسی کردار کے جذبات و احساسات کا تجربہ کیا جاویگا اور مصنف اس کی طبیعت کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرے گا تو افسانہ بے لطف ہوجائے گا اور دلچسپی جاتی رہے گی۔ آپ غور کیجئے آج تک آپ نے جتنے سراغ رسانی کے افسانے پڑھے ہونگے۔ ان کے کردار آپ کے ذہن میں کبھی محفوظ نہ ہوں گے (ماسوا سراغ رساں کے)۔

انداز۔ سراغ رسانی کے افسانوں کا رنگ تحریر یعنی انداز صاف سادہ رواں صنائع بدائع اور تشبیہات و استعارات سے خالی ہونا چاہیئے۔ صنائع و بدائع دور از کار استعارات ادبی شان تفصیلی تحلیل، تصویر کشی۔ ایسے عناصر ہیں۔ جو قاری کے ذہن کو واقعات کی ترتیب سے ہٹا کر غیر متعلق جمالیاتی اثرات کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح توجہ بٹ جانے سے افسانے کی رفتار عمل میں سستی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی قاری کی دلچسپی زائل ہوجاتی ہے۔ پھر "دلچسپی" اور لطف ان افسانوں کا مقصد اعلیٰ ہے۔ اگر وہی فوت ہوگیا تو باقی کیا رہا۔ میری مراد یہ ہیں کہ انداز خشک واعظانہ یا خطیبانہ ہونا چاہیئے۔ میرا مفہوم یہ ہے کہ انداز کو افسانے کے امتیازی عناصر کی مطابقت میں کام کرنا چاہیئے۔

پھر یہ بات ضروری ہے کہ مصنف قصداً قاری کو کبھی دھوکا نہ دے۔ وہ اپنی ذہانت سے قاری کو غلط راستے پر گامزن رکھے۔ لیکن اس کی راہ میں غلط نشانات رکھ کر اسے فریب دینے کی کوشش نہ کرے۔ بعض کم سوار مصنف قاری کو قصداً فریب دیتے ہیں۔ وہ اسے قصداً غلط راستہ دکھاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی ذہانت پر اعتماد نہیں ہوتا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے قاری کو دھوکا نہ دیا تو وہ فوراً "صحیح حل" دریافت کریگا۔ "راز" اور "حقیقت" ہمیشہ الفاظ میں مستور ہونی چاہئے جب ساری کتاب ختم کرلے اور وہ دوبارہ صفحات پر نظر دوڑائے تو اسے محسوس ہو کہ واقعی صداقت الفاظ میں مستور تھی اور اگر وہ دانا یا ذہین ہوتا تو فوراً دریافت کرلیتا۔

سراغ رساں۔ سراغ رساں سراغ رسانی کے ناولوں اور افسانوں کا مرکزی کردار ہے۔ وہ ایک ایسا عنصر ہے جس پر کہانی کا ارتقاء منحصر ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں افسانے کی مرکزی شخصیت بھی ہے۔ اور مصنف کی ذہانت کی جیتی جاگتی تصویر بھی۔ وہ قاری کے لئے نشانات بھی مہیا کرتا ہے۔ اور خود بھی انکشاف کی طرف جاتا ہے۔ وہی افسانے کو پیچیدہ بناتا ہے اور وہی آخرکار اس گتھی کو سلجھاتا ہے عام طور پر اس کی شخصیت عام آدمیوں سے بلند اور ممتاز ہوتی ہے۔ بعض حضرات نے کوشش کی ہے کہ بچوں کو سراغ رساں بنادیں۔ لیکن ان کی کوششیں بارآور ہونے کی بجائے سامان استہزا بن گئیں۔ مشہور مصنفین نے مندرجہ ذیل سراغ رساں تخلیق کئے ہیں۔

مصنف	ایڈگر ایلن پو	سراغ رساں	ڈوپن
〃	بلانک	〃	لوپن
〃	کانن ڈائل	〃	شرلاک ہومز
〃	ڈی مین	〃	تھارن ڈائیک
〃	براما	〃	کیرڈاس
〃	مسین	〃	ہناڈ
〃	کرافٹ	〃	مختلف پولس کے افسر
〃	بیلی	〃	فارچون
〃	بروک	〃	کرنل گور

مصنف	رچرڈ ٹن	سراغ رساں	فادر براؤن
"	رچرڈ ویارش	"	جوڈ تھ لی۔
"	ہربرٹا جنکس	"	ملکم سیج
"	پوسٹ	"	انکل انبر

اتحاد۔ سراغ رسانی کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت "اتحاد" ہے خصوصیت سے اتحاد جذبات دوسرے ناولوں میں کبھی یہ وصف پایا جاتا ہے۔ لیکن معمولی ناولوں میں جذبات مثلاً رحم۔ شفقت۔ محبت اس طرح ملے ہوئے ہوتے ہیں کہ دلچسپی ضائع کرنے کے بغیر ان کا بیان ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف سراغ رسانی کے افسانوں میں امتیازی عنصر تحلیل کا ہوتا ہے اور قاری کی تمام تر توجہ انکشاف کی طرف ہوتی ہے۔ ان حالتوں میں جذبات و احساسات کا بیان نہ صرف غیر متعلق ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے ناول پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سراغ رسانی کے افسانے میں محبت مرکزی خیال کے طور پر نہیں پائی جاتی۔ اگر جذبات کو نمایاں کیا جائے تو کردار نگاری کا رنگ گہرا کرنا پڑتا ہے اور کردار نگاری کے رنگ کو شوخ کرنے سے مرکزی شخصیت (یعنی سراغ رسانی) کا اثر کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

انگریزی ادب کے دور حاضر میں سراغ رسانی کے افسانوں میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آ رہی ہے۔ اور وہ یہ کہ منطقی۔ ذہین غیر معمولی طور پر دقیق النظر سراغ رساں کی بجائے محنتی اور معمولی سمجھ کا سراغ رساں زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اس قسم کے سراغ رساں اپنی محنت کے ذریعے آثار و نشانات سے انکشاف کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ جزیات کا احاطہ کرتے کرتے "کل" تک پہونچ جاتے ہیں۔

اس قسم کا مسٹر ولز کرافٹ نے اسی قسم کے سراغ رساں تخلیق کئے ہیں۔ ان کے شاہکار "کاسک" "پالنس کین" "گرو ٹ پارک مرڈر" گنے جاتے ہیں۔

مسٹر چسٹرٹن اپنے ایک مضمون کے دوران میں ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے ایک کامیاب افسانہ نویس احتراز کرتا ہے۔ وہ مسٹر ماسٹرمن کے شاہکار "غلط خط" کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

اس کتاب کا مصنف ان باتوں میں سے کسی بات کا ارتکاب نہیں کرتا جن کی وجہ سے سراغ رسانی کے افسانے ذلیل ہو رہے ہیں وہ کہانی میں کسی خفیہ انجمن کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ بین الاقوامی جھگڑوں سے گریز کرتا ہے۔ وہ کہانی کے خاتمے پر کسی ایسے آدمی کو پیش نہیں کر دیتا جو ہیرو کا ہم شکل توام بھائی ہو۔ وہ آخر میں جرم کسی ایسے معمولی کردار کے سر میں تھوپ دیتا۔ جو آپ کو یاد بھی نہ ہو۔ کیا خوب کہا ہے۔ مسٹر چسٹرٹن نے لیکن اپنی شاید خیال میں رہا کہ مسٹر ماسٹرمین نے وہ کچھ کر دکھایا ہے جو کوئی اچھا مصنف نہ کرتا یعنی آخر میں خود سراغ رساں قاتل ثابت ہوتا ہے۔

اردو میں سراغ رسانی کے افسانے۔ اردو میں سراغ رسانی کے افسانوں یا ناولوں کا وجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اردو میں اچھے لکھنے والوں کی کمی ہے۔ بلکہ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عہد "دور تراجم" ہے اور تصانیف بہت کم لکھی جا رہی ہیں۔ سراغ رسانی کے افسانے (جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے) غیر زبان سے ترجمہ ہو کر اکثر بے لطف ہو جاتے ہیں۔

(خاص)

ادب

رام کے باغ میں

[جناب غلام احمد گل ایڈیٹر رسالہ "ادیب" پشاور]

(۱)

ماسٹر الطاف حسین کی منزل مقصود ایک متمول خاندان کا ایک بارونق گھر تھا۔ جہاں وہ ایک وکیل کے بچوں کو تعلیم دینے کے لئے ہر روز صبح دو گھنٹے کے لئے جایا کرتا تھا۔ آج بھی حسب معمول وہ اپنی منزل مقصود تک پہونچگیا۔ اس نے اپنے مخصوص کمرے میں جاکر اپنا ہیٹ میز پر رکھدیا' اور ملازم کو کہا کہ رام بہاری اور جودھا کو بھیج دو ملازم انھیں بلانے کے لئے اندر چلا گیا۔

ماسٹر الطاف حسین ٹائمز آف انڈیا کا تازہ پرچہ اٹھاکر دیکھنے لگے' جوں ہی اُس نے چند صفحات بے ترتیبی کے ساتھ اُلٹے' اسے اپنے مرحوم استاد کی تصویر نظر آگئی۔ اُس کے ہاتھ میں اب بھی کمان تھا کمان میں اب بھی تیر تھا۔ اور تیر میں اب بھی وہی آواز پنہاں تھی۔ جو یک لمحہ دنیا و مافیہا کے سکون کو خلش سے لبریز کر سکتی تھی ماسٹر الطاف کے دل سے ایک خاموش آہ نکلی۔ اس نے اخبار بغیر پڑھے میز پر رکھ دیا۔ اور دروازے کی طرف دیکھا، تو جودھا کھڑی سلام کر رہی تھی۔

جودھا سلام کرکے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی عمر ۱۵ سال سے کم نہ تھی۔ وہ نوجوانی کی خوبصورت منزل میں قدم رکھ چکی تھی۔

آج اس کے چہرہ پر خوبصورتی کچھ اس انداز سے کھیل رہی تھی، کہ اسکی کمسنی جوانی سے بدلی ہوئی نظر آتی تھی، وہ پوری عورت معلوم ہوتی تھی۔ مگر دوشیزہ۔ اس میں رعنائی' اور دلربائی کے تمام سامان نظر آتے تھی مگر پوشیدہ ماسٹر الطاف نے اسکی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا

جودھا منتظر تھی' کہ ماسٹر صاحب اس سے سبق سننگے' مگر ماسٹر صاحب تھے کہاں جو سبق سنتے۔ اس کی نگاہیں جودھا میں خدا معلوم کیا نئی چیز دیکھ [illegible] تھیں۔ جودھا بھی خاموش بیٹھی رہی۔ آخر الطاف ہوش میں آیا۔ وہ دفعتًا چونک پڑا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر جودھا کو دیکھا، اس کی نگاہیں پہلے سے زیادہ متاثر اور مجروح ہوگئیں وہ بعجلت یعنی ایک لمحہ میں جودھا کی رعنائی کو اپنے اندر جذب کرلینا اور خود اس میں جذب ہوجانا چاہتا تھا۔

ماسٹر الطاف نے کمزور اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ رام بہاری کہاں ہے ؟

جودھا "وہ تو آج گاؤں چلا گیا ہے' کل آئیگا"

الطاف "تم کیوں نہیں گئیں ؟"

جودھا "آپ ناراض ہوجاتے' اور میرے سبق میں ہرج ہوتا"

الطاف "تمھیں یونہی ناراضی کا خیال رہتا ہے"

جودھا "کیوں نہیں ؟"

الطاف "وکیل صاحب کہاں ہیں ؟"

جودھا: "وہ بھی گانوں گئے ہوئے ہیں۔"

الطاف: "گھر میں کون کون ہے؟"

جودھا: "میں ہوں اور تارا ہے، دادا میاں بھی بیمار پڑے ہیں۔"

الطاف: "تو گویا گھر میں تم اکیلی ہو۔"

جودھا: "جی ہاں۔"

الطاف پھر کسی خیال میں کھو گیا۔ وہ بار بار جودھا کو دیکھتا تھا۔ اور سوچتا تھا، کہ کیا یہ وہی لڑکی ہے، جسے میں ہمیشہ پڑھانے کے لئے آتا تھا۔ اُسے بار بار یقین ہوتا تھا، کہ یہ وہ لڑکی نہیں، یہ تو جنت سے اُتری ہوئی کوئی حُور ہے۔ وہ اپنے دل میں کہتا تھا، کہ جودھا بھی ضرور گانوں چلی گئی ہوگی۔ یہ تو میری ہلاکت کا سامان بنکر اور کوئی لڑکی میرے سامنے آگئی ہے۔ آخر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے پھر کہا۔

الطاف: "تم جودھا نہیں ہو؟"

جودھا خاموش ہوگئی۔

الطاف: "نہیں تم جودھا نہیں۔ جنت کی حُور ہو۔ حُسن کی دیوی ہو۔"

جودھا: "ماسٹر صاحب! آپ یہ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ سبق سُن لیجئے۔"

الطاف: "آہ جودھا! تمھیں کچھ معلوم نہیں، کہ اِس وقت میں تم میں کیا چیز دیکھ رہا ہوں۔ تم ایک دن میں بالکل بدل گئی ہو۔"

جودھا: "میں تو جودھا ہوں۔ آپ مجھ میں کیا تبدیلی دیکھ رہے ہیں۔"

الطاف: "کچھ نہ پوچھو میں جس جودھا کو روزانہ پڑھانے آتا تھا، وہ جودھا تم نہیں۔ تم مجھے پڑھانے آئی ہو، میری فطرت کا امتحان لینے آئی ہو۔"

جودھا: "ماسٹر صاحب! رات سے کچھ طبیعت خراب ہے، اس لئے میں کچھ اور نظر آرہی ہوں۔"

الطاف: "اُف! جودھا! جودھا!"

الطاف اپنی ناقابل جذباتی کیفیات کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے اپنے دونو ہاتھ جودھا کی طرف بڑھائے اور کرسی سے جودھا کو اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس نے ہم آغوشی میں ایسی قوت اور اتنے جوش سے کام لیا۔ کہ جودھا کی زبان سے بے اختیار "ہے رام" نکل گیا۔ اور جونہی الطاف کی گرفت ڈھیلی پڑی، وہ بھاگ کر زنانخانہ میں چلی گئی، اور الطاف بھی اُٹھ کر چلا آیا۔

(۲)

الطاف اب اپنے فرض منصبی پر مامور نہیں۔ اُس نے خود ہی وکیل صاحب کے بچوں کو پڑھانا چھوڑ دیا ہے۔ وہ اب جودھا کی محبت کا دیوانہ ہے۔ محبت کے ساتھ دہشت بھی طاری ہے۔ اُسے یقین ہے، کہ اُس نے جس حالتِ اضطرار میں جودھا کو سینے سے لگایا تھا، اس کا علم جودھا کے والدین کو ہوگیا ہوگا۔ وہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپتا پھرتا تھا۔ ایک ہفتہ کے بعد وکیل صاحب کا ایک خط اُسے ملا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ "آپ نے بچوں کو پڑھانا کیوں چھوڑ دیا ہے، اگر آپ پڑھانا نہیں چاہتے تو جواب دے دیجئے، تاکہ کوئی دوسرا انتظام کیا جائے۔"

اس خط نے ماسٹر صاحب کی دہشت کو دور کر دیا، اور وہ جودھا کی شرافت اور رازداری پر دل ہی دل میں

تحسین کرنے لگا۔ مگر پھر بھی اُسے اندیشہ تھا، کہ ممکن ہے
وکیل صاحب نے انتقام لینے کے لئے مجھے اس حیلہ
سے بُلایا ہو۔۔۔۔۔

اس لئے اُس نے سردست طبیعت کی ناسازی کا
بہانہ کر دیا۔ مگر دوسرے ہفتہ پھر وکیل صاحب کا خط
طلبی کے لئے پہونچا۔ تو وہ بلا تامل اپنا فرض منصبی
ادا کرنے کے لئے وکیل صاحب کے مکان کو روانہ ہو گیا۔

(۳)

رام بہاری اور اُس کی بڑی بہن جودھا تعلیم
کے کمرہ میں آئیں۔ جب الطاف نے جودھا کو دیکھا تو
اس میں وہی جاذبیت اور رعنائی موجود تھی جس نے
اُسے آج سے پندرہ دن پہلے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس نے
بچوں کو پڑھانا شروع کیا، مگر پڑھا نہ سکا۔

جودھا اپنی دلربائیوں کے ساتھ اس کی نگاہوں
کے راستہ سے اس کے دل میں گھُسی چلی جا رہی تھی۔
الطاف نے رام بہاری کو کسی کام کے لئے باہر بھیجدیا۔
جب تنہائی ہوئی، تو اس نے جودھا کو کہا "پیاری
جودھا! کیا تم میرا قصور معاف کر دو گی؟"

جودھا چونکی اور خاموش ہو گئی۔ الطاف نے
پھر کہا "پیاری جودھا! کیا تم میرے پریم اور دیوانگی
کے احساس سے واقف ہو۔ میرا حسرت بھرا دل تم پر
بدستور مٹا جا رہا ہے۔ اور میں تمھیں پھر اپنی آغوش
خالی کی زینت بنانا چاہتا ہوں"

جودھا "ہرگز نہیں"

الطاف "اُف تیری یہ سادگی! میں واقعی دیوانہ
ہو جاؤنگا۔ پھر بتاؤ۔ میں آخر میں اپنی تمناؤں کے
ہیجان کو کیونکر برداشت کروں"

جودھا "کیا کہہ رہے ہیں ماسٹر صاحب؟"

الطاف "(دیوانوں کی طرح) کب۔ کس جگہ۔
کس وقت۔ کس طرح۔ کہاں"

جودھا "ماسٹر صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

الطاف "آج شام کو سیر کے لئے کہاں جاؤ گی؟"

جودھا "رام کے باغ میں"

جودھا ایک حسین لڑکی تھی۔ مگر جذبات
محبت سے بالکل نا آشنا تھی۔

الطاف "تو رام کے باغ کس وقت جاؤ گی؟"

جودھا "شام کو پانچ بجے"

الطاف "تمھارے ساتھ اور کون ہوگا؟"

جودھا "کوئی نہیں"

الطاف "اچھا میں بھی وقت مقررہ پر پہنچونگا"

رام بہاری آگیا۔ پڑھائی شروع ہو گئی۔ مگر
بے ترتیبی سے، بے پروائی کے ساتھ جلد جلد وقت ختم
کرنے کے بعد ماسٹر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے، اور
چلتے چلتے جودھا سے کہہ گئے "یاد رکھنا"

(۴)

شام کے ۵ بجے "الطاف" رام کے باغ گیا۔ اور
چپہ چپہ چھان مارا۔ مگر جودھا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ رات کے
دس بج گئے، مگر ابھی تک جودھا نہیں آئی۔

اب ۱۲ بج گئے ہیں۔ مگر الطاف دیوانوں کی طرح
رام کے باغ میں گھوم رہا ہے۔ صبح ہو گئی، مگر جودھا کا

شیدائی اب بھی تلاش میں مصروف ہے۔ اور بآواز بلند پکار
رہا ہے۔ "ہائے وہ تو نہیں آئی۔ مجھے دھوکا دیا۔ آہ!
اب میں کیا کروں۔" پرستار محبت الطاف رات کا جاگا ہوا
ایک پتھر پر سر ٹیک کر بیٹھ گیا۔

نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ چنانچہ نسیم سحری کے
سرد و خوشگوار جھونکوں نے لطاف کو لوری دیکر سُلا دیا۔
وہ بے حواس تھا۔ کہ اسکی آنکھیں بند ہو گئیں۔ دل جاگ اٹھا
تخیلات کی محفل آباد ہو گئی۔ جودھا اُسے خواب
میں نظر آئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ لیکن اُس کی آنکھوں
سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ خوشی اور غم کی ملی جلی تصویر
الطاف کے سامنے کھڑی تھی۔ الطاف ہاتھ جوڑ کر
کہنے لگا "تم نہیں آئیں۔ مجھے دھوکہ دیا۔ آہ! کیسا تم
مجھے دنیا سے کھو دینا چاہتی ہو۔ جودھا! میں مجبور
محبت ہوں۔ تمہارا فدائی ہوں۔ تم نے رام کے باغ میں
ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر افسوس تم بھول گئیں۔

جودھا! میں رام کے باغ میں تمہارا انتظار کر رہا
ہوں تم جلد آؤ۔"

الطاف کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے متحیر نگاہوں
سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور جودھا جودھا کہتا ہوا بے اختیار
ایک طرف دوڑا۔ دیوار سے ٹکر کھائی۔ گرا۔ پھر اٹھا۔
اور دیوانہ وار اِدھر اُدھر جھانکنے لگا۔ اس کے ہونٹ
خشک اور آنکھیں سُرخ تھیں۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ
ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اٹھا۔ "رام کا
باغ۔ رام کا باغ" کہتا ہوا سیدھا وکیل صاحب کے گھر پہونچا۔

(۵)

الطاف نے جوں ہی وکیل صاحب کی کوٹھی کے
احاطہ میں قدم رکھا۔ اُسے وہاں لوگوں کا ایک ہجوم نظر
آیا۔ کوٹھی پر اُداسی طاری تھی۔ اندر سے ماتم اور رونے
کی آوازیں آرہی تھیں۔ ماسٹر الطاف کو دیکھ کر نند کشور
(جودھا کا چھوٹا بھائی) اس سے لپٹ گیا۔ اور چلا چلا کر
ہائے بوا ہائے بوا کرنے لگا۔ الطاف متحیر اور خاموش
تھا۔ اس میں کسی قسم کے استفسار کی قوت نہ تھی۔
وکیل صاحب بھی الطاف کے پاس آگئے۔ اور رو کر
کہنے لگے۔ "ماسٹر صاحب! آپکی شاگرد جودھا تو سدھار گئی۔"
"سدھار گئی۔ سدھار گئی؟" وکیل صاحب نے
کہا۔ "ہاں! کل شام کو وہ نیا جوڑا بدلکر رام کے باغ
جانے کا ارادہ کر رہی تھی۔ اس کی ماتا جی نے اسے
منع کیا۔ کہ تنہا نہ جاؤ۔ کسی لونڈی کو ساتھ کر لو۔ اس نے
تنہا جانے کے لئے ضد کی۔ چھت پر کٹہرے سے لگی کھڑی
تھی۔ کہ یکایک پاؤں پھسلا۔ اور کٹہرے کے نیچے گری۔
سر میں سخت چوٹ آئی۔ دائیں ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ فوراً
ڈاکٹر بلایا گیا۔ مگر آہ ماسٹر صاحب! آج چار بجے صبح
اس نے پران تیاگ دیئے۔

یہ کہہ کر وکیل صاحب رونے لگے۔ اور الطاف
"رام کا باغ رام کا باغ" کہتا ہوا وحشیوں کی طرح ایکطرف
بھاگ گیا۔ دن کے گیارہ بجے مرگھٹ پر بیحد ہجوم تھا۔
جودھا کی لاش چتا میں رکھ دی گئی۔ ہر شخص کے چہرے
پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ اور سوگوار نظر آتا تھا۔ چاروں
طرف خوف اور دہشت طاری تھی۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی

جو تر نہو۔ کوئی دامن ایسا نہ تھا، جو خشک نہو۔ آخر چتا میں آگ لگادی گئی۔ تھوڑی دیر میں شعلے بلند ہوئے۔ چتا سے ایک خوشبو نکلی، اور تمام مرگھٹ کو معطر کر گئی۔ بلند شعلوں کے لپٹوں میں جوانی کی رنگینیاں ناچ رہی تھیں۔ جو دھا اپنے شباب کے ساتھ خاکستر محبت بنائی جا رہی تھی۔ کہ یکایک ایک تباہ حال دیوانہ دریا کی طرف سے دوڑتا ہوا آیا۔ اور "رام کا باغ۔ رام کا باغ" کہتا ہوا چتا کے شعلوں میں غائب ہو گیا۔ چاروں طرف سے غل مچ گیا کہ دیکھنا! کون ہے۔ مگر کوئی نہ معلوم کر سکا، کہ یہ کون تھا۔ آہ! یہ بربادِ محبت ماسٹر الطاف تھا۔

(خاص)

دل

[جناب نشتر جالندھری ایڈیٹر رسالہ "ادیب" پشاور]

خونِ دلبند علی سرخیٔ افسانۂ دل — شورِ منصور ہے اک نغمۂ مستانۂ دل
نقشِ ہستی ہے غبارِ رہِ کاشانۂ دل — عرصۂ حشر ہے اک گوشۂ ویرانۂ دل
عشق کا بارِ گراں ہنس کے اٹھایا سر پر — اللہ اللہ یہ ہے ہمتِ مردانۂ دل
عقل گم کردہ رہ وادیٔ حیرت ہے ابھی — اور محبوب در آغوش ہے دیوانۂ دل
اس کا ہر ذرہ ہے آئینۂ اسرارِ حیات — لوحِ محفوظ ہے گویا مرا پیمانۂ دل
گرمیٔ عشق سے ہے تابشِ رخسارۂ حسن — شعلۂ طور ہے منت کشِ پروانۂ دل
آرزوؤں کا چمن ذرا ابھی کھل جائے — تپشِ برق اگائے جو کہیں دانۂ دل
نہ حرم ہے، نہ کلیسا ہے، نہ بت خانہ ہے — یار کی انجمنِ ناز ہے کاشانۂ دل
لاکھ ایمان ہیں اک کفرِ محبت پہ نثار — دیکھ صد کعبہ در آغوش ہے بت خانۂ دل

کیا کرامت مرے ساقی نے دکھائی نشتر
خطِ خورشید بنا ہے خطِ پیمانۂ دل

(خاص)

اردو

ہندو مسلمان

[جناب مولانا عبدالحق صاحب۔ بی۔ اے اڈیٹر اردو اورنگ آباد]

جب کبھی سفر کا اتفاق ہوتا ہے اور ایسا اتفاق مجھے اکثر ہوتا رہتا ہے تو ریل کے اسٹیشنوں پر ہر جگہ یہ عجیب و غریب اور دلدوز آوازیں سننے میں آتی ہیں "ہندو پانی" "مسلمان پانی" "ہندو چائے" "مسلمان چائے" ہر بار جب میں یہ آوازیں سنتا ہوں تو دل پر تیر کی طرح لگتی ہیں اور اپنے ہم وطنوں کی عقل پر افسوس ہوتا ہے۔ جس ملک میں پانی اور چائے تک ہندو مسلمان ہیں وہاں اتفاق و اتحاد کی کیا توقع ہو سکتی ہے خیر ہم تو آئے دن یہ آوازیں سنتے سنتے عادی ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر کوئی غیر ملک والا یہ سنے تو کیا خیال کرے گا۔ مس میو کو برا کہنا آسان ہے لیکن ہم خود بھی تو کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں خیر پانی اور چائے میں تو چھوت چھات کی بحث آجاتی ہے۔ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ پرانا عقیدہ ہے۔ مٹتے ہی مٹے گا۔ لیکن دوسری چیزوں میں جو ہندو مسلمان کی تخصیص لگی ہوئی ہے وہ کیوں؟ وہاں تو چھوت چھات کا کوئی موقع نہیں۔ ہندو اسکول مسلمان اسکول۔ ہندو کالج مسلمان کالج۔ ہندو یونیورسٹی مسلمان یونیورسٹی۔ اس ذہنیت میں ہمارے بدقسمتی کا اصل راز ہے۔ کیا علم کا بھی کوئی مذہب ہے؟ یہ بھی ہندو مسلمان ہوتا ہے؟ جس طرح ہمارے ہندی اردو زبانوں میں جھگڑے یا لفظ مذکر ہے یا مونث۔ اسی طرح ہمارے ملک کی ہر چیز ہندو ہے یا مسلمان۔ قومی اتفاق کے بھی لچھن ہوتے ہیں یہ! اور کیا کہیں کرتوتوں کے برتے پر

ہم اتفاق کے مدعی ہیں؟

جس زمانہ میں ہندو مسلم یونیورسٹیوں کا مسئلہ زوروں پر تھا اور لوگ اپنے تعلیمی حقوق کے لئے حکومت سے برسرپیکار تھے اس میں سب سے بڑا مابہ النزاع مسئلہ ہندو مسلم نام تھا۔ گورنمنٹ کا کہنا یہ تھا کہ یونیورسٹی کے ساتھ کسی فرقے یا مذہب کا نام نہ ہونا چاہیے بلکہ بجائے ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی کے علی گڈھ یونیورسٹی اور بنارس یونیورسٹی ہونے چاہئیں ہندو مسلمانوں کی قومی غیرت اسے قبول کرنے لگی تھی۔ یہ معاملہ مذہب کا تھا جس کی خاطر وہ ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار تھے۔ اس وقت ان کا جوش دیکھنے کے قابل تھا۔ بلا مبالغہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ گویا یہ مسئلہ ہندو مسلمان کی موت و زیست کا مسئلہ تھا۔ گورنمنٹ کا کہنا بہت معقول تھا اور ہماری ضد بیجا تھی لیکن ایسے معاملات میں عقل سے کام لینا ہماری غیرت اور شان کے خلاف ہے یہاں خاص جذبہ یا جنون کارفرما ہوتا ہے۔ آخر گورنمنٹ مجبور ہو گئی۔ وہ ہاری ہم جیتے۔ اگرچہ اس بے معنے جھگڑے میں ہم نے بعض حقوق کھو دئے مگر ہم خوش تھے کہ ہمارا مذہب بچ گیا اور ہمارے قومی وقار میں فرق نہ آیا۔

جس زمانہ میں ہندو مسلم یونیورسٹیوں پر زور شور سے بحث ہو رہی تھی میں نے بھی اپنی نافہمی سے ایک پمفلٹ مسلم یونیورسٹی پر لکھا تھا جس کے آخر میں یہ ناشدنی تجویز تھی کیا اچھا ہوتا کہ اگر ہندو مسلمان اس روپئے کو جو الگ الگ جمع کیا ہے ایک جگہ اکٹھا کر کے بجائے ہندو مسلم یونیورسٹیوں کے ایک "ہندوستانی"

یونیورسٹی بنائیں، جہاں اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ اور اعلیٰ درجے کا تجربہ خانہ ہو اور ایسی تعلیم دی جائے جو آزادی اور رواداری کے ساتھ علم و حکمت سکھائے لیکن ایسے وقت میں ایسی باتیں کرنا سری حماقت ہے۔

اس بات کے کہنے کی متعلق ضرورت نہیں کہ جن انجمنوں، مدرسوں یا اداروں کے ساتھ ہندو کا نام ہے ان کی نسبت مسلمانوں کے اور جن کے ساتھ مسلم کا نام ہوتا ہے ان کی نسبت ہندوؤں کے کیا خیال ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں نفرت نہ سہی مغایرت ضرور بڑھاتی ہیں اور اس طرح ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اس قدر تحقیق بات ہے کہ اس میں کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ مسلم مدرسوں اور کالجوں اور گروکل۔ ہندو کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبا کو دیکھ لو۔ یہ ہمارے لال ہمارے ایثار اور محنت کا پھل ہیں۔ وہ جس ماحول میں پلتے اور بڑھتے ہیں وہ تنگ دلی اور مغایرت پیدا کرنے والا ہے۔ یہی نوجوان بڑے ہو کر ملک کی قسمت کے مالک ہوں گے تو جو خیالات اور اثرات انہوں نے اپنی تعلیم گاہوں میں حاصل کئے ہیں مجبوراً انہیں پر کاربند ہونا پڑے گا۔

ہمارے ملک میں دو قسم کی تعلیم رائج ہے۔ ایک سرکاری دوسری غیر سرکاری۔ سرکاری درسگاہوں پر سرکاری نگرانی ہے تاکہ طلبہ میں ایسے خیالات نہ رائج ہونے پائیں جو سرکار کے منشا اور مصالح کے خلاف ہیں۔ اسی طرح قومی مدارس پر اس فرقے کی نگرانی ہوتی ہے جو اس کا بانی ہے اور اس کا مقصد اپنے طلبہ میں خاص قسم کے خیالات کا پیدا کرنا ہے جو اسی فرقے کے حالات اور مفاد کے مناسب ہوں۔ اور اسی مناسبت سے جن مدارس کے نصاب میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور مدرس بھی اسی خیال کے پابند ہوتے ہیں۔ اگر کوئی مدرس ایمانداری سے اپنے تعلیمی فرائض ادا کرنے چاہے تو اس کا رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ نتیجہ دونوں قسم کی تعلیم کا تنگ نظری ہے۔ آزاد تعلیم سے دونوں محروم رہتے ہیں۔ الگ رہنے اور تعلیم کو محدود حلقے میں رکھنے کا ہمیشہ یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ بہت سی چیزیں جو ان تعلیم گاہوں سکھائی جاتی ہیں محض بیکار ہوتی ہیں اور بعض ایسی ہیں جو ملک اور قوم کے حق میں سراسر مضر ہیں۔ رائے کی آزادی اور تنقید کی قوت جو تعلیم کا اصل مقصد ہے نہ یہاں پیدا ہوتی ہے نہ وہاں۔ اخلاق و مذہب جس پر ہمارے قومی مدارس بڑا زور دیتے ہیں (اور شاید اس پر ان کو ناز بھی ہے) اس کی تعلیم کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ اس کا درجہ ریاکاری سے کچھ ہی کم ہوتا ہے۔ رواداری جو اصل اخلاق ہے اور جس پر افراد اور جماعتوں کی خوش زندگی کا انحصار ہے وہ اس تعلیم میں بالکل مفقود ہے۔ ہندو مسلمان میں جو آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اس کی تہ میں یہی چیز ہے۔ ہم ان جھگڑوں کے اسباب پر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو وہ ایسے مہمل بے معنی مضحک اور طفلانہ نکلیں گے کہ حیرت ہو گی کہ یہ بھی کوئی لڑنے کی بات تھی۔ لیکن ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہم نے سیکھا ہی نہیں۔ سوراج یا کوئی اور راج جب تک تعلیم اور خاص کر ابتدائی تعلیم کی اصلاح نہ ہو گی کسی قسم کی بہبودی کی توقع رکھنا عبث ہے۔

(خاص)

ارمغاں

چندربھان برہمن

[جناب اشرف صبوحی مدیر رسالہ "ارمغان" دہلی]

برہمن تخلص چندربھان نام۔ اکبرآباد کے رہنے والے تھے۔ افضل خاں شیرازی وزیر شاہجہاں کے ملازم تھے' اور انھیں کے ذریعہ سے دربار شاہی میں باریاب ہوئے کچھ دن کے بعد سرکار شہزادہ داراشکوہ میں منشی گری کے عہدے پر تقرر ہو گئے۔ اور بہت جلد اپنی چرب زبانی طلاقت لسانی کی بدولت مصاحبت تک پہونچ گئے۔ قدرت اللہ خاں قدرت گوپاموی اپنے تذکرہ شعرا موسوم بہ نتائج الافکار میں انکے متعلق ایک لطیف حکایت لکھتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ایک روز شاہزادے نے شاہجہاں کی خدمت میں عرض کیا' کہ چندربھان ایک شاعر خوشگو ہے۔ اگر حکم ہو' تو حاضر خدمت ہوکر کچھ اشعار پیش کرے۔ بادشاہ نے برہمن کو حاضری کا حکم' دیا۔ انھوں نے آتے ہی عرض کیا ؎

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندین بار ٭ بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

شاہ دین پناہ کا مزاج اس شعر سے کسی قدر مکدر ہوا'
لیکن افضل خاں نے بات بنادی اور فوراً کہا ؎

خر عیسے اگر بمکہ رود ٭ چوں بیاید ہنوز خر باشد

اور اس طرح پر بادشاہ کا تنغص دور ہوگیا۔ آخرکار شہزادہ داراشکوہ کی کوشش سے شاہجہاں کے انتیسویں[۲۹] سال سرکار شاہی میں نوکری مل گئی۔ اور خطاب رائے اور منصب مناسب سے سرفراز ہوئے محی الدین اورنگ زیب شاہ عالمگیر کے زمانہ میں بھی ان پر نوازشات شاہی مبذول ہوتی رہیں۔ اور ان کا تقرر خدمات نمایاں پر ہوتا رہا۔ آخری عمر میں نوکری سے استعفار دے کر شہر بنارس میں سکونت اختیار کی۔ اور اہل ہنود کے رسم و راہ کے مطابق عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ اور ۱۰۷۳ھ میں انتقال کیا۔

تصوف کا رنگ اس زمانہ کے تمام شعرا کے کلام میں موجود ہے۔ برہمن بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اس انداز میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے۔ اُس میں اور کسی مسلماں کے کلام میں مطلق تمیز نہیں ہو سکتی۔ اصل یہ ہے' کہ اُس زمانہ میں بے تعصبی اور خلوص نیت نے تفرقہ مذہب کے خیال کو درمیان سے خارج کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ تھا، کہ زبان میں' طرز معاشرت میں' طریق گفتگو میں۔ غرضکہ ہر بات میں ان دونوں کی یکسانی اس درجۂ کمال کو پہنچ گئی تھی' کہ فرق امتیاز کی دریافت بھی مشکل ہو گئی تھی کچھ یہ وجہ بھی ہے' کہ مسائل تصوف قید مذہب سے بالکل آزاد ہیں مثلاً دیوان برہمن کی پہلی غزل ہے ؎

ای برتر از تصوف و وہم و گمان ما ٭ ای در میان ما و برون از میان ما
آئینہ گشتہ سینۂ ما از فروغ عشق ٭ شد جلوہ گاہ صورت معنی نہان ما
جا کرد در میان رگ و ریشہ مہر دوست ٭ پرودہ شد بمغز و فا استخوان ما
افتاد عشق حوصلہ فرسای عاشق ست ٭ صد جا شکست تا بلب آمد فغان ما
مانند غنچہ گرچہ خموشیم برہمن ٭ لیکن پر از نوا ست چو بلبل زبان ما

اس میں توجیہ لکھا ہے، وہ ایسا ہے جو عقائد برہمنہ و عقائد مسلمانان، دونوں کے موافق ہے، وہ خود لکھتے ہیں ؎

رُباعی

مارا زنِ شبانہ مستی دگر ست   در شگی زقید ہستی دگر ست
مابرہمنیم لیک در مذہب ما   حق دیگر و شغلِ بُت پرستی دگر ست

برہمن کے خصوصیاتِ کلام میں سے ایک یہ بھی ہے، کہ دو چار غزلوں کے سوا کسی غزل میں پانچ سے زیادہ شعر نہیں پائے جاتے۔ معلوم نہیں اتنے ہی شعر کہتے تھے، یا بعد میں انتخاب کر لیتے تھے۔ غالباً انتخاب ہی کر لیتے ہونگے۔ کیونکہ ان کی غزلوں میں بھرتی کے بہت کم شعر پائے جاتے ہیں۔ زبان ان کی نہایت شستہ ہوتی ہے۔ اور بندش صاف مطلب عام فہم۔ مثال کے طور پر کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں ؎ .. ..

بیاکہ بے تو دلم رنج بےحساب کشید   بیاکہ کارِ دل از غم باضطراب کشید
ہرگز کسے نکرد نگاہے بسوئے ما   کس گرم تر از شکِ نیامد بروئے ما
سوئے ما حاجتِ شمشیرِ ستمگاری نیست   بہ تغافل نگہِ مصلحت آمیز بس است
ہر کہ بیش از صبح دم با ساغرِ صہبا نشست   سر فرازانہ دنگارِ خویش چوں مینا نشست
جوانی بود فصلِ عیش و کامرانیہا   کجا آن فصل کو آن عیش کے ایّامِ شادمانیہا
حدیثِ عشق از گفتار و تکرار است مستغنی   برہمن در محبت کفر باشد قصہ خوانیہا

شائستہ مذاق کے لوگ اس عشق و محبت کے بیان کو فضول خیال کرینگے۔ اور کہینگے، کہ ہم تو مفید شاعری کے دلدادہ ہیں۔ سو برہمن کے یہاں ایسے حضرات کی بھی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ رنگ محبت کے ساتھ فلسفۂ عمل کے امتزاج نے عجب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ کہتے ہیں :-

کفر بے رشتۂ زنار نمی آید راست   کار کن کار کہ گفتار نمی آید راست
منزلِ عشق دراز ست سر از خواب برآر   کار بے دیدۂ بیدار نمی آید راست
برہمن شیشۂ دل سخت نزاکت دارد   چوں شکستند دگربار نمی آید راست

اس ضمن میں جو رباعیاں ہیں، اُن میں عمر خیام کا رنگ ہے، مثلاً عشق کے متعلق لکھتے ہیں۔

رُباعی

سرمایۂ عشق جاودانی عشق ست   سرچشمۂ آب زندگانی عشق ست
اسبابِ نشاط و کامرانی عشق ست   عنوانِ صحیفۂ معانی عشق ست

دیگر

تا چند ز جورِ فلک آزردہ شوی   وز گردشِ روزگار افسردہ شوی
چوں غنچہ بجمعیتِ خود راضی باش   زنہار مباش کہ گل شوی پژمردہ شوی

ان سب مثالوں کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ برہمن کا پایۂ شاعری معمول سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اور انہیں اساتذۂ زبانِ فارسی کے زمرہ میں شامل ہونے کا احسن حق حاصل ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہر نفس بوئے محبت آید از گفتار ما
می تواں فہمید از گفتار ما مقدار ما

(خاص)

اُردوئے معلّٰی

سری کرشن

(جناب مولانا حسرت موہانی ایڈیٹر "اردوئے معلّٰی" کانپور)

عرفانِ عشق نام ہے میرے مقام کا　　حامل ہوں کس کے نغمۂ نَے کے پیام کا

متھرا سے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے اُنس　　دُنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا

مخلوق اک نگاہِ کرم کی اُمیدوار　　مستانہ کر رہی ہے بھجن رادھے شیام کا

محبوب کی تلاش ہوئی رہبرِ نُجب　　برسانے سے جو قصد کیا نندگام کا

گوکل کی سرزمیں بھی عزیزِ جہاں بنی　　کلمہ پڑھا جو اُنکی محبت کے نام کا

برندا کا بن بھی رُوکشِ جنّت بنا، کہ تھا　　پامالِ ناز انھیں کی بہارِ خرام کا

لبریز نور ہے دلِ حسرت زہے نصیب
اک حُسنِ مشکفام کے شوقِ تمام کا

(قاص)

استقلال

ماؤں کو آخری سلام

[جناب ساغر نظامی ایڈیٹر استقلال]

(۱)

آخر ہمارے عزیز وطن میں ایک مبارک ساعت ایسی بھی آئی کہ مقتدر قوتوں نے انسانوں پر دنیا تنگ کر دی، ہر گل لالہ کی گود بلبل کے تازہ خون سے لبریز ہو گئی اور نوجوانانِ چمن کے گرم خون سے خاک چمن کا ذرہ ذرہ ایک مستقل لالہ زار بن گیا معصوم غنچوں اچھوتی کلیوں کے نازک اور خوشبودار سیمین اور لطیف حلقوں میں صیاد کے تیروں نے آشیانے بنائے۔ اے ماؤ! یہ وقت تمہارے رونے دھونے کا نہیں ہے ہمیں خاموش جنگ کے محاذ کی طرف دوڑنے دو اے سپید سر والیو! اے ہمارے مفلوک و مفلس چمن کی مصیبت زدہ غلام فطرت ماؤ! ہمیں زیادہ بزدل اور بیکار نہ بناؤ اسوقت تمام کائنات پر آزادی کے فرشتوں نے اپنے پروں سے سایہ کر لیا ہے اور سب کے سب اپنے زریں اور شیریں آوازے دف بجا رہے ہیں۔ اے ماتا! ہم آہن کے گرم و تند لیکن موثر نغمات علی الصباح سن کر پیدا ہوئے ہیں اور ہماری روح کی بیتابی ہمیں منزل مقصود کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔

سپیدۂ سحر غریبوں کی مضمحل و جوان آنکھوں کی طرح بے نوائے چمن کا پھول پھول اور پتہ پتہ ایک مہیب اداس خاموش اداسی میں ڈوبا ہوا ہے، میخانے اجاڑ ہیں "خیام و حافظ" کی روحوں کے چہروں پر گہری فسردگی چھائی ہوئی ہے۔ یہ دیکھکر ہماری پیاری ماؤ! ہم نے رات کی بچی کھچی شراب زمین پر لنڈھا دی ہے اور تمام پیالے توڑ ڈالے ہیں پھلکیں سڑکوں پر پھینک دی ہیں میکدے کی دیواروں پر چھائی ہوئی انگوروں کی شاداب بیلوں اور نیم تیار خوشنما خوشے تاک کو ہم نے ریزہ ریزہ کر دیا ہے، ناچنے والی لڑکیاں ہم سے خفا ہو کر چلی گئیں ہم نے اُنکے سلانے والے گیت نہیں سنے غفلت پیدا کرنے والے نغموں پر توجہ نہیں کی اور کیوں توجہ کرتے جب "وقت" ایک نغمۂ بیدار بلند کر رہا ہے۔

ہم نے اپنی منگیتر کنواریوں کو بھی نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا اور کیوں دیکھتے جبکہ ہماری نیت تم سے دودھ بخشوا کر میدان جنگ کی طرف جانے کی ہے، بس اے مجسم فردوس ماؤ! اس درجہ نہ چیخو خدا کی قسم ہماری روح اپنے فرض کو بھول جائیگی خدا کی قسم اس درجہ نہ روؤ ہم سب علی الصباح کافر ہو جائینگے ہمارے قویٰ میں بجائے خون کے بجائے آنسو دوڑنے لگیں گے۔

"اماں! اماں!! بوا!! بوا!" دامن نہ پکڑو ورنہ گریبان چاک کر دینگے۔ یہ بزدلی! یہ کمزوریٔ قلب! دھرم سے یہ غداری! فرض سے یہ بدعہدی! یہ میٹھے ظلم یہ شیریں ستم۔ اے ماؤ! یہ تلواریں پڑی ہیں گلے کاٹ دو مگر ہمیں لامذہب نہ بناؤ۔ ہمارا دامن نہ پکڑو۔ تمام دنیا اسوقت روحانی اور انسانی مطالبات کے حصول کے لئے جان دے رہی ہے ہمارے

باغ میں ہمارے لہلہاتے ہوئے میوہ دار باغ میں ایک مدت سے آندھیاں چل رہی ہیں خزاں اور صیاد کے ستم ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں ہر پھول پژمردہ ہے ہر درخت کی جڑ کھوکلی ہے خوش رنگ چڑیاں پیاس سے بے تاب ہوکر موت کی خوفناک وادی کی طرف پرواز کرنے والی ہیں ذرہ ذرہ قوت سے مغلوب ہے قطرہ قطرہ آلام و استبداد کے سمندر کی فلک بوس موجوں سے تھرتھرا رہا ہے آسمان ہمارے نہیں رہے زمین ہماری نہیں رہی، در و دیوار ہم سے خفا ہیں. کائنات ہم سے ناراض ہے تمام لالہ زاروں کے محافظ ہمیں ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اے ماؤ ہم نے اس خفگی کے راز کو معلوم کرلیا ہے ہم اپنی بے مائگی کے فلسفے کو سمجھ گئے ہیں ہم نے اپنے فرض کو بھلا دیا تھا اے ماؤ! وہ مقدس فرض اس وقت ہمارے پوتے میں ایک بہادر کی طرح انگڑائی لے کر جاگ اٹھا ہے اسکی چٹکیاں ہمیں بےچین کئے دیتی ہیں ہمارے قلب کی فضا میں ایک مقدس بزرگ کی دو روحانی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہماری آنکھوں میں میدان جنگ کا نقشہ گردش کر رہا ہے ہمارے گھوڑوں کے سموں کے نیچے غنیم کی روح سسکتی نظر آتی ہے ہماری تلواریں ہمارے نیزے ہمارے خنجر سب اپنی اپنی جگہ چمک رہے ہیں ہم روحانی بہادر ہیں ہم اپنے باغ کے پھولوں کی حفاظت کے لئے رنگین جہاد کے لئے تیار ہوئے ہیں۔ اے ماؤ! چھوڑ دو ہمارے گھوڑے ہنہنا رہے ہیں وہ ہمیں بلانے ہیں شاید اب جانے کا وقت ہوگیا —— اچھا سلام

(۲)

نوجوان مجاہد اتنا ہی کہہ سکتے تھے کہ کمسن کنواریاں اپنے اپنے چھپر کھٹوں پر جاگ اٹھیں ایک نے حیرت سے دیکھا —— دوسری نے کچھ کہنا چاہا —— تیسری رو پڑی "اوں اوں آ-آ-آب-ب بھ —— بھیاں کہاں جاتے ہو میرے بیرن! میرے بھائی جان!! —— لو میں دوش پر نیزے! —— کمروں میں تلواریں —— تھانوں پر گھوڑے تیار! —— بھیا اب کا ہے کو لوٹ کر آؤ گے" —— کنواری بہنوں کے دردناک بین سے ماؤں کے کلیجے اس طرح شق ہو گئے جیسے تربوز کو تیز چاقو سے ٹکڑے کر دیا جائے' نوجوان مجاہدین نے شدت تاثر سے منہ پھیر لیا۔ ماؤں نے ایک ساتھ رو کر کہا۔

"ہاں بیٹی جا کر کون آتا ہے پر تمی کی گھڑی پر گھوڑے ہی جا رہے ہیں جو ہنس ہنسا کر اور تما کو پی کر چلے آئینگے آگ اور خون کے میدانوں میں جاتے ہیں یہ ہمارے پیارے یہ ہمارے لاڈلے یہ جوان جوان پوت یہ مونگے کے دانے یہ ہیرے کے ٹکڑے —— آہ خدا یہ یوں ہی چلے جائینگے۔ ہے پرماتما ہمیں باغ کی پروا نہیں کوئی اس میں آگ لگائے تو لگا دے کوئی اسے لوٹے تو لوٹ لے کوئی اس پر قبضہ جمائے تو جمائے مگر اپنے بچوں کو نہ جانے دینگے پھل نہ آئیں باغ نہ پھولے۔ ہمارے پھول سدا بہار پھول یوں ہی شاداب رہیں —— سندری دوڑ —— کنڈی تو لگا —— جا سکتے ہو! ہماری اجازت کے بغیر جا سکتے ہو! ——"

ماؤں نے اپنی ماتا سے متاثر ہو کر غضبناک دیوانگی کے ساتھ کہا:-

اے بچو! اے ناتجربہ کار جوشیلے نوجوانو! ہماری اجازت کے بغیر جا سکتے ہو۔ پریم کو خودداری کی درانتی سے ذبح کروگے! محبت کا گلا جوش جوانی کے تیز چاقو سے کاٹوگے ——— ماتا کا گلا یوں گھونٹو گے؟ ———

کدھر ہیں تمہاری تلواریں ——— کہاں ہیں تمہارے تیر! بازوؤں کی کمانیں گرا دو ——— گھوڑوں کی پیٹھوں سے زین اتار دو ——— جنگی دہس کے ہک کھول دو ——— بڑے باغ کے رکھوالی! ——— شراب کے پیالے توڑ آئے ——— بہادر بڑے سورما ——— ناچ نہیں دیکھا ——— مہارشی!!! ماؤں کے حکم کے بغیر تم کچھ کر سکتے ہو؟؟

(۳)

مجاہد بیٹے سرنگوں کھڑے تھے ماتائیں پسینے میں نہا گئیں تھیں گھر میں بندھی ہوئی گائے بھینس اپنی اپنی جگہ بیدار ہو گئیں۔ پیتل کی گھنٹیاں بجنے لگیں کنواریوں کے خشک آنسوؤں نے سورج چمکا دیئے مجاہد نوجوانوں نے سر اٹھائے ان کے چہرے سرخ تھے۔ بیٹوں نے ماں کے حکم کی تعمیل کی تلواریں پھینک دیں کمانیں بازوؤں سے اتار دیں۔ ترکش اک طرف رکھ دئے۔ اس کے بعد ماؤں سے کہا:-

ہم تمہارے بغیر تمہارے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے پانی بھی نہیں پی سکتے، تنکا بھی نہیں اٹھا سکتے مگر بڑا بیٹا مجاہدوں کا سردار اپنی جگہ سے آگے بڑھا اس کی مٹھی بندھی ہوئی تھی اس کے بال بکھر گئے تھے اس نے کہا:-

اے ماں کیا تو راجپوتنی کے پیٹ سے پیدا ہے!

چھوٹا بیٹا انیمتا مجاہد اپنی جگہ سے بڑھا اور بولا:-

تو کیا تو افغانی بطن سے پیدا ہے!؟

ہے رام ——— اے خدا!!

بزرگ مائیں شدت تاثر سے چیخ اٹھیں ان کی خشک زبانوں سے غیر ارادی طور پر یہ الفاظ نکلے اور وہ پریم داسیاں وہ ماتا کی ماری مائیں اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑی ہو گئیں ان کے سروں سے سرزمین حیا و عفت کی ان دیویوں کے مقدس سروں سے۔ جو بچوں کے سامنے بھی برہنہ سر نہیں رہتیں دوپٹے سرک گئے ان کے ہاتھوں کی انگلیاں انکے لباس سے منہمک تھیں۔ بیٹے سمجھ گئے اور آگے بڑھے۔ دو قدم بڑھنے کے بعد وہ رک گئے ماؤں کی آنکھوں سے اسلاف کی عظمت وجلال کی کرنیں پھوٹ کر مجاہدین کی نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی تھیں انکے تنے ہوئے ابروؤں میں رام دھنش کھنچتا ہوا معلوم ہوتا تھا انکی نگاہوں سے تیغ امام چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی انکی آنکھوں کی سرخی بعد انفعال میں چتائیں تیار تھیں وہ ان میں بھسم ہو جانا چاہتی تھیں انکی آنکھوں کی حیرتناک سپیدی میں قبریں کھدی ہوئی تھیں وہ ان میں دفن ہو جانا چاہتی تھیں"۔

اتنی بڑی گالی گوشت کے جاندار لوتھڑوں کی زبان سے اپنے خون کی ارتقائی شکل کی طرف سے تف ہے تم پر اے ماؤ لعنت ہے تم پر اے ماؤ۔

بزرگ ماؤں کا ضمیر اپنے بیٹوں کی شدید روحانی چٹکی پر ان سے کہہ رہا تھا اور مائیں اپنی اپنی جگہ

ٹھنڈے آتشکدوں کی طرح بجھی ہوئی تھیں نوجوان مجاہدین ہمت سے آگے بڑھے اور ایک ساتھ بولے :۔

"اچھی جیجا! اچھی اماں! اچھی لوا ہمیں جواب دو۔ وقت سورج دیوتا کا رتھ تیزی سے کھینچے لا رہا ہے۔ رات کی سیاہی مٹتی جا رہی ہے سپیدۂ سحر رخصتی سلام کرنے کو ہے"

بیٹوں کے تمام محبت پر مائیں بے ضبط ہوگئیں۔ انکے خون گرم تیل کی طرح کھول گئے۔ انھوں نے للکار کر کہا :۔

"بیٹو ہمارے بہادرو۔ دشمن ہو رخصت ہو تم پر اہم بھول گئی تھیں، مامتا نے ہمیں سستے میں گم کر دیا تھا مگر اب ہم نے اپنی آتما پر فتح حاصل کر لی ہے اس لئے اے جوان بیٹو تمھیں جاننا چاہئے کہ ہم راجپوتوں افغانوں مغلوں ہی کے پیٹ سے پیدا ہیں۔

زندہ باد شریف اور بہادر قوم کے نوجوان بہادرو! موت تمہاری گھوڑوں کے سموں کے نیچے دبی ہوئی ہے اور زندگی تمہاری رکاب بردار ہے۔ ہم اپنی آہ و زاری واپس لیتی ہیں ہم اپنے آنسو پھیرتی ہیں۔ دیکھو ہمارے اسلاف کی مقدس روحوں نے ہمارے جوڑے سنوار دیے۔ دیکھو عہد ماضی کی یاد نے ہمیں پھر جوان کر دیا ہم اپنی کمزوری کو سمجھ گئے ہم فرض کا گلا گھونٹنے والی مامتا سے متاثر ہونے کی منزل سے اب کوسوں دور ہیں۔"

ماؤں نے یہ کہکر فضا پر ایک استغنا کی نگاہ ڈالی کتنا رکی بیٹیں نوجوان بھائیوں کو سامان جنگ لاکر دے رہی تھیں کوئی ترکش میں تیر رکھ رہی تھی کوئی روشن کمان سجا رہی تھی، ماؤں نے ہونٹ دبا کر پردۂ شب اندازہ میں کہا :۔

"گھوڑوں کی تیاری کرو —— تیرے ابا کی تلوار کہاں ہے! میری کمر پر باندھ۔ تیرے چاچا کا نیزہ کدھر ہے مجھے لا خون رگوں سے اچھلا پڑتا ہے ہم اپنے باغ سے کسی کو پتی بھی نہیں لے جانے دینگے اور تازہ پھلوں پر ڈاکہ ڈالنے والے قزاقوں کو نکال کر دم لینگے۔ ہم خاموشی سے موت کی نیند سو جائینگے۔ لیکن موجودہ زندگی کو گوارا نہیں کرینگے آہ اپنے چمن کی تباہی ہم سے نہ دیکھی جائیگی ہاتھوں نظر آنے والی ہتھکڑیاں، پاؤں میں دکھائی نہ دینے والی بیڑیاں، یہ ہم نہیں پہنینگے۔ چلو۔ ہٹو۔ بڑھو ہٹو"

جوشیلی ماؤں نے تلوار اور نیزے اٹھالئے اور دروازے کی طرف بڑھیں نوجوان مجاہد بیٹے ماؤں کے قدموں میں گر پڑے بوسہ دیا اور بولے :۔

اے مقدس ماؤ! تم پر تمہارے بیٹوں کے روح و تن نثار۔ مگر بہادر کبھی اپنی ماؤں کو میدان جنگ میں آگے نہیں رکھتے۔ پہلے سمندر میں ہم کود یں گے ہمارے گھوڑے بحر ہستی کی موجوں کو اپنے سینوں کے جوان رگ پٹھوں کی تیار قوت سے دھکا دینگے اور جب ہمارے آسودۂ ساحل ہونے کی خبر آئے تو ہنستی ہوئی تم آنا —— ان تمام باتوں کے بدلے ماؤ ہمارا دودھ بخشدو اس طرح کہ آنکھ سے ایک قطرہ گرے۔ اے ماؤ ہمارا آخری سلام لو —— آخری سلام اور آؤ ایک بار اپنے کلیجے سے لگا لو! اسوقت نوجوان مجاہد کمسن بچوں میں تبدیل ہوگئے تھے۔ وہ اسی حال میں ماؤں کی طرف بڑھے۔

دور ہوا شیطانو —— نہیں نہیں سینے دور رکھو ابھی تو تم انسان تھے دم بھر میں کیا ہوگئے؟

(بقیہ صفحہ ۴۹۱ پر دیکھئے)

اسٹار

نیکی کا صلہ

(جناب سید محمد جعفری ایڈیٹر اخبار اسٹار الہ آباد)

میرے ایک دوست جو مذہبی مسائل پر اکثر عجیب و غریب خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں ایک مرتبہ دوران گفتگو میں کہنے لگے اس دنیا میں جو شخص بے ایمانی کی زندگی بسر کرتا ہے اُسے کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا لیکن ایمانداری کی زندگی بسر کرنے والے کو ہر شخص نقصان پہونچا دیتا ہے۔ میں نے اپنے دوست کی اس بات کو اس وقت اسی طرح ہنس کر ٹال دیا جس طرح ان کی اور باتوں کو ٹال دیا کرتا تھا۔ لیکن چند ہی روز بعد خود میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے اپنے اُن دوست صاحب کا یہ مقولہ میری نظروں کے سامنے پھر گیا اور دفعتہً میرے دل میں یہ خیال گذرا کہ اخلاقی اور منطقی حیثیت سے میرے دوست کا مقولہ خواہ کتنا ہی بے اصول ہو لیکن واقعات کے لحاظ سے غلط نہیں معلوم ہوتا۔ بدقسمتی سے اس وقت میرے ذہن میں جتنے واقعات اور تجربات زندگی آئے اُن سب سے میرے دوست کے قول کی تصدیق ہوتی تھی۔ اب میں سخت خلفشار میں پڑ گیا اور شب و روز اس مسئلہ پر غور کرنے لگا کہ اگر واقعی میرے دوست کا مقولہ صحیح ہے تو پھر اخلاق اور مذہب کی ساری کتابوں کو بالائے طاق رکھ دینا چاہئے اس خیال نے میرا خواب و خور منتشر کر دیا اور سوتے جاگتے میں اسی مسئلہ پر غور کرنے لگا حتیٰ کہ بعض اوقات جب سوچتے سوچتے سو جاتا تھا تو خواب میں بھی ایسے ہی واقعات نظر آتے تھے جن سے مندرجہ بالا مقولہ کی مزید تصدیق ہوتی تھی۔ اب میرے دماغ میں یہ خیال اس قوت کے ساتھ جاگزیں ہو گیا کہ قریب تھا کہ میں مذہب و اخلاق کے تمام قوانین کو پس پشت ڈالکر اپنے دوست کے ہاتھ پر بیعت کر لوں لیکن غور و خوض کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن جبکہ مجھے اسی استغراق میں ۴۸ گھنٹے گذر چکے تھے اور دو وقت کا کھانا۔ دو شب کی نیند اور کئی وقت کا ناشتہ و چاء وغیرہ اس کے نذر کر چکا تھا دفعتاً میرے خیالات میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا اور میں نے دیکھا کہ میرے دوست کے استدلال میں ایک زبردست مغالطہ ہے اور اب مجھے اپنی حماقت پر خود تعجب تھا کہ اتنا بڑا مغالطہ مجھے اس کے پیشتر کیوں نہیں نظر آیا۔ اور اس سادی سی بات پر اس قدر دماغ سوزی کی ضرورت کیوں ہوئی۔

مغالطہ یہ تھا کہ اس دنیا میں ہم ہر چیز کا صلہ روپیہ آنہ پائی میں دیکھنے کے عادی ہیں اور جبتک اس محسوس شکل میں کوئی صلہ نہ ملے اس وقت تک ہم اُسے صلہ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی خوبیوں کا صلہ ہمیشہ اس شکل میں نہیں ملا کرتا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس شکل میں صلہ کی توقع کرنا بڑی سی بڑی نیکی کے مفاد کو زائل کر دیتا ہے۔ نیکی اور خوش خصالی کا اصلی صلہ تو وہ ہے جو ہمیں اخلاقی ارتفاع کی شکل میں ملتا ہے یعنی محسوس منافع کی صورت خواہ کتنی ہی ہم سے دور ہوتی جائے ہماری ہر نیکی سے خود ہمارے اخلاق کے مدارج بلند ہوتے رہتے ہیں مختصر یہ کہ مغالطہ سے بچنے کے لئے سمجھنا چاہئے کہ نیکی کا صلہ خود بھی نیکی ہے۔

اور اس کے علاوہ کسی اور صلہ کی توقع کرنا اخلاقی پستی کی دلیل ہے۔

اس بات کے ذہن میں آتے ہی میرے خیالات کا سارا رُخ بدل گیا اور اب میں اُنھیں واقعات کو جنکی مادی حیثیت میرے اختلال ذہنی میں اضافہ کرتی تھی۔ اخلاقی اور اصولی حیثیت سے دیکھنے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے دوست نے مجھے اس خلفشار میں مبتلا کر کے میرے ساتھ سخت دشمنی کی تھی۔ لیکن مجھے اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ جو باتیں میں محض عقیدۃً صحیح سمجھا کرتا اب اُن کی غور و خوض کے بعد بھی تصدیق ہوگئی اور اس غور و خوض کی تحریک نے میرے اعتقاد کو ہمیشہ سے زیادہ پختہ کر دیا۔ مختصر یہ کہ تمام واقعات اور تجربات زندگی کو اس نئی روشنی میں دیکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس نئی روشنی میں دیکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہر نیک کام جو مجھ سے عمل میں آیا اس سے میرے اخلاقی مدارج میں ترقی ہوئی اور اسی طرح اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے حالات سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوئی۔ اب میرے لا مذہب دوست یا اور کوئی بڑے سے بڑا منکر مذہب مجھے اس عقیدہ سے نہیں ہٹا سکتا کہ نیکی کا صلہ مادی شکل میں دیکھنے کی توقع کرنا اخلاقی پستی کی دلیل ہے۔ اور جو لوگ دنیا کے تلخ تجربات کے باوجود اپنے اخلاقی مدارج کو مائل بہ ارتفاع رکھنا چاہتے ہیں انھیں اس اعتقاد پر پختگی کے ساتھ قائم رہنا چاہئے کہ نیکی کا صلہ نیکی ہے اور اسکی شکل محسوسات مادی سے مشابہ نہیں ہوتی بلکہ اخلاقی ارتفاع کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ہندوستان کے مایہ ناز شاعر نے کہا ہے کہ ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں جھونک دو کوئی لیکر بہشت کو

(خاص)

صفحہ ۴۸۴ کا بقیہ

ماؤں نے چلّا کر کہا:—

کیا ہماری گرم روح کو سرد کرنا چاہتے ہو، جاؤ دودھ بخشا، چلو سلام لیا، اف جاؤ، جلد جاؤ سپیدی زیادہ بڑھ گئی دن نکلنے کو ہے کھیتوں کی مینڈھ پر شیاما نے گانا شروع کر دیا۔ تلواریں میاں سے نکال لو——"

لڑکیو! قلعہ کا دروازہ بند کر لو ——

مجاہد بیٹے خوش خوش قلعہ سے باہر ہو گئے، دروازے سے گردنیں نکال کر ماؤں نے تنبیہ کی:—

بیٹو! سنتے جاؤ اس دروازے کا کھلنا اسوقت تک تمہارے لئے حرام ہے جب تک باغ آزاد نہ ہو جائے شراب اور دودھ تم پر اسوقت تک بند ہے جب تک ایک ایک ذرہ چمن دست گلچیں سے رہائی نہ پالے۔ اگر راجپوتوں افغانوں اور مغلوں کے نام لیوا ہو تو ناکام زندہ واپس نہ ہونا ورنہ یہ دروازہ نہ کھلیگا۔ اور نہ تمہاری مائیں اور بہنیں تمہیں سینگی۔

بیٹوں نے ماؤں کی طرف غور سے دیکھا مائیں بولیں۔

بس ہماری طرف زیادہ نہ دیکھو، خدا پر نگاہ رکھو جاؤ پرمیشور کے حوالے جاؤ خدا کی حفاظت میں، یہ کہکر دروازہ بند کرتے ہوئے مائیں بیہوش ہو گئیں

نوجوان بیٹوں نے نعرہ لگایا۔

ماؤں کی جے —————— اور روانہ ہو گئے

آخری سلام قبول ہو چکا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑی ہوئی خاک بھی نسیم نے دبا دی تھی بستر سے نوجوان جسموں کی گرمی سے محروم تھے۔ اور گھوڑوں کے تھانوں گلگلیں بیٹھی ہوئی نوحہ گا رہی تھیں"۔

"اے پیارے تم کہاں ہو گئے ہم کسکی پیٹھ پر بیٹھیں کس سے کھیلیں"۔

(خاص)

اعجاز

ایک مصلح شاعر کے لباس میں

[جناب رئیس احمد صاحب، ایڈیٹر رسالہ اعجاز بارہ بنکی]

(۱)

رام و کرشن کی یہ راجدھانی پیشہ پورے عروج پر ہے، کہیں گیتا کے اسرار و رموز کی تعلیم ہو رہی ہے، کہیں وید کے اشلوک پڑھائے جا رہے ہیں، کہیں چھتری داد شجاعت دے رہے ہیں، کہیں برہمن علم و فضل کا ڈنکا بجا رہے ہیں، کہیں بودھ کی روحانیت اپنا جادو دکھا رہی ہے۔ حکومت اپنی ہے، لوگ اپنے ہیں، خیال اپنا ہے، جو لفظ منہ سے نکلتا تھا پورا ہو کر رہا، جو بات زبان سے نکل گئی، پتھر کی لکیر ہوئی، جو حرف قلم سے نکل گیا، نقش کا نحجر ہوگیا۔

اتنے میں پردہ اٹھا، سماں بدل گیا، رت بدل گئی، اب مسلمان کی حکومت ہے، اکبر کا دربار دربار ہے ابوالفضل و فیضی کے کمالات منظر عام پر نمودار ہیں، ٹوڈرمل، اور بیربل کی ظرافت و دانائی کا شہرہ ہو رہا ہے، اکبر کے نورتن اکبر کو سبز باغ دکھا رہے ہیں "دین الٰہی" کی بنیاد پڑ رہی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے یہ پردہ بھی اٹھا اب اورنگ زیب کی عالمگیر حکومت ہے، مذہبی رنگ نکھر گیا ہے، آزادی اور بے راہ روی کے دروازہ مسدود ہو گئے ہیں، رجحانات و میلانات بھی حکومت سے متاثر ہو رہے ہیں، ہوا و ہوس کے بندوں کا، جاہ پرست علما کا، زمانہ ساز فضلا کا، حرص و آز کے غلاموں کا قلع قمع ہو چکا ہے اب مذہب کی حکومت ہے، جو کچھ ہوتا ہے اس کے ماتحت ہوتا ہے، دین الٰہی پر عمل اب بھی ہوتا ہے، لیکن وہ دین الٰہی اکبر کا تھا، اور یہ دین الٰہی، "الٰہی" کا ہے۔ [illegible] ابھی یہ رنگ جمنے نہ پایا تھا کہ یہ بساط بھی آلٹ گئی۔

اب بہادر شاہ کی مفلوج حکومت ہے، بہادر شاہ، شاہ شطرنج ہے [illegible] حکومت پر جلوہ فرما ہیں لیکن ان کے احکام کا نفاذ لال قلعہ [illegible] علم و فضل جس کی اس سے قبل فراوانی تھی [illegible] ہے، ان کے وقت میں کوئی ملا جیوں پیدا [illegible] ان کے وقت میں شعرا کا ایک گروہ پیدا ہوتا ہے جس کے سامنے حکومت کی تباہی و بربادی کے مناظر ہیں، بہادر شاہ کی بے دست و پائی ہے، تہذیب اسلامی کا جاں بلب [illegible] ہے لیکن وہ ان چیزوں کی طرف نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھتا، اس کی محفل رنگین ہوتی ہے، جس میں "پیا" کے تذکرے ہو رہے ہیں، زردو نہاں کا ذکر ہو رہا ہے، سوز قلب کی کیفیت مزے لے لے کر بیان ہو رہی ہے، زلف و کمر کے افسانے، ناوک و مژگاں کے ترانے موضوع سخن ہیں، گل و بلبل کی پامال تمثیلیں ہیں، شب ہجراں کی کہانی ہے، ہجر و وصل کے قصے ہیں، نغمہ ایک ہے، ساز مختلف ہیں، نالہ ایک ہے، زبانیں دوسری ہیں، زمانہ بدل گیا ہے، لیکن خیالات وہی ہیں کہ اتنے میں ایک جوان [illegible] پیدا ہوا، وہ ماحول سے متاثر نہیں [illegible] ماحول [illegible] پیدا ہوا تھا شاعروں میں لیکن خود [illegible] شاعر بنا آجر کی صحبت میں

اس کے حالات وکلام پر کچھ روشنی ڈالنی مقصود ہے ،

اردو شاعری کے اس سب سے بڑے ہیرو نے اس عالم خاکی میں سنہ ۱۲۶۲ھ[1] میں قدم رکھا، اپنے عہد کے مشہور نغز گو اور قادر الکلام شاعر حضرت وحید سے شرف تلمیذ حاصل کیا[2]

جسٹس سر عبد القادر کلام اکبر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ایک دن میرے ایک طباع دوست نے جو خود ایک نامور شاعر ہیں مجھسے پوچھا کہ تمھارے نزدیک اکبر کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟ میں نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ اکبر روشن خیالی کے ساتھ مشرق کی سچی محبت کا دلدادہ ہے، اسکے نزدیک ہر مشرق نژاد کا فرض ہے، کہ اپنے وطن سے محبت رکھے، اپنے مذہب کی حفاظت کرے، اپنے بزرگوں کا ادب ملحوظ رکھے، اور ہر رسم و رواج کو صرف اسلئے مذموم نہ سمجھے کہ وہ مغربی رسم و رواج کے خلاف ہے بلکہ جائز حد تک اپنی چیزوں پر نازاں ہو، اپنے ماضی سے واقف ہو، اپنے حال کی تنقید کر سکے اور اپنے مستقبل کے متعلق اچھی امید رکھے، یہ خیالات اس زور اور خوبی کے ساتھ معاصرین میں کسی کے ہاں نہیں ملتے، میرے دوست نے مجھسے اتفاق کیا اور کہا کہ یہ تمام باتیں جو اپنے یہاں لکھیں اکبر کے کلام میں پائی جاتی ہیں ان سب کو ایک مرکب لفظ میں ادا کرتا ہوں کہ اکبر لسان العصر" ہے، [3]

اکبر نے جب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ حکومت تباہی و بربادی کے گھاٹ اتر چکی ہے، مسلمان گورنمنٹ کی نظروں میں ذلیل ہو رہے ہیں، سر سید احمد خاں کی تعلیمی کوششیں ایک خطرناک مستقبل کا اعلان کر رہی ہیں انھوں نے چاہا کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جائے، حالی کی نوا سنجیاں اسیران قفس کے لئے پیام حیات کا حکم رکھتی ہیں اکبر نے اسی اسٹائل پر اپنے کو ڈہالنا چاہا اور بلاشبہہ اکبر کا یہ نقش ثانی نقش اول سے کہیں بہتر رہا،

اکبر کی شاعری نے جس فضا میں نشو و نما حاصل کی، اسکا اقتضا یہ تھا کہ اکبر کی زبان سے یہ ترانے نکلیں،

ضعف سے میں جو گھٹا اور بڑھا اسکا ستم
یاں زباں ہل نہ سکی وہ متحمل سمجھا

اس توقع سے کہ تیرے پیرہن میں صرف ہو
ماہ نو بھی چرخ پر شکل گریباں ہو گیا

لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اکبر کا یہ رنگ ذرا نکھر گیا، انکے تغزل میں دوسری شان پیدا ہو گئی شعر وہ اب بھی کہتے ہیں لیکن اپنے موضوع سے ہٹنے لگے ہیں ملاحظہ ہو،

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس
ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا

اکبر نے جب میدان شاعری میں قدم رکھا تو اسکی کوشش کی کہ انکا کلام ہر حیثیت سے جامع مانع ہو، اگر ایک طرف غالب کی بلند پروازی کی جھلک نظر آئے، دوسری طرف جان صاحب کی سی موقیت پیدا ہو جائے پھکڑ بازی میں بازی لیجائیں

[1] گل رعنا صفحہ ۴۶۷ [2] گل رعنا [3] مقدمہ کلام اکبر ایڈیشن اول،

ملاحظہ ہو،

ایک بوسہ پر وہ ٹال گئے ہم بھی چپ رہے
سمجھے کہ کسے ملتا ہے قسمت سے زیادہ

اپنی یہ احتیاط کہ بوسہ پہ اکتفا
اس پر بھی یہ عتاب کہ تو بد معاش ہے

واسطہ کم ہوگیا اسلام کے قانون سے
دب گئی آخر مسلمانی مرے پتلون سے

اکبر کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک معقول نغز گو ہونے کے ساتھ ہی ساتھ قادر الکلام شاعر بھی تھے "جلوۂ دربار" اور "پانی کی روانی" ملاحظہ فرمایئے حیرت ہوگی کہ اردو جیسی تھی، یہ زبان میں ایسے ایسے گوہر گرانمایہ کہاں سے پیدا ہوئے؟ ان نظموں میں بعض مقامات پر آپ زبان کی لغزش ضرور پائینگے لیکن حضرت اکبر کی یہ صفت عام ہے زبان کی حیثیت سے ان کا کلام بہت کمزور ہے، خشو و زوائد کی مثالیں بھی اکبر کے ہاں کافی پائی جاتی ہیں، مثلاً۔

ابتک اس روش پہ ہے اکبر مست و بے خبر
کہدے کوئی عزیز من فصل بہار ہو چکی

متروکات بھی حضرت اکبر نہایت اطمینان سے استعمال کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

طائر رنگ چمن اڑنے کو پر کھولے ہیں
آشیاں ایسے گلستاں میں نہ بلبل باندھے

آئے ہے، جائے ہے۔ اس طرح کھولے ہے، اب متروک ہے پہلے مصرعہ میں کھولے اور دوسرے میں باندھے باندھ کر رعایت لفظی کے نباھنے کی کوشش کی ہے حق یہ ہے کہ وہ کسی مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہوئے، اسکے علاوہ پر کھولنا محاورہ نہیں ہے پر تولنا محاورہ ہے، نہ آشیاں باندھنا، محاورہ ہے، اس طرح حضرت اکبر کا ایک شعر ہے،

وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا
زمینوں کو شاداب کرتا ہوا

راہ کترنا بالکل غلط ہے، محاورہ ہے، کترا کے چلنا، اسکو راہ کترنا بنا دینا حضرت اکبر کا غیر ضروری اجتہاد ہے، محاورہ میں ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل محاورہ کو غلط کر دیتا ہے، ذوق بھی اسی قسم کی غلطی پر برسر مشاعرہ ٹوکے جا چکے ہیں، بہرحال، لطف زبان، زور بیان، بندش الفاظ اور جدت تراکیب کے لحاظ سے وہ نظمیں قابل دید ہیں انتخاب یہ ہے،

جلوۂ دربار

جمناجی کے پاٹ کو دیکھا	اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا	حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا
پلٹن اور رسالے دیکھے	گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے	بینڈ بجانے والے دیکھے
خیموں کا اک جنگل دیکھا	اس جنگل میں منگل دیکھا
مرمہا اور ورنگل دیکھا	عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری — پانی تھا ہر پیپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری — تیزی تھی ہر جمپ سے جاری
ڈالی میں نارنگی دیکھی — محفل میں سارنگی دیکھی
بیرنگی بارنگی دیکھی — دہر کی رنگا رنگی دیکھی
ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم — ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زریں جھولیں نور کا عالم — میلوں تک وہ چم چم چم چم
چوکی اک چوکھی دیکھی — خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی — شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی
ایک کا حصہ من و سلویٰ — ایک حصہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا — میرا حصہ دور کا جلوا
اوج برٹش راج کا دیکھا — پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا — رخ کرزن مہراج کا دیکھا
پہنچے پھاند کے سات سمندر — تحت میں اُن کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر — اپنی جگہ ہر ایک سکندر
اوج بخت ملاقی ان کا — چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی انکا — آنکھیں میری باقی ان کا
ہے مشہور کوچہ و برزن — بال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائر ہوش تھے سب کے پرزن — رشک سے دیکھ رہی تھی ہر زن

انگریزی میں ایک شاعر نے پانی کی روانی کا منظر دکھایا ہے حضرت اکبر اس تخیل کو اردو میں منتقل کرتے ہیں :-

"غرض دیکھئے اب یہ پانی چلا"

اُچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا — اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
یہ بنتا ہوا اور وہ تنتا ہوا — ٹپکتا ہوا اور چھنتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا — رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
اِدھر پھولتا اور پچکتا اُدھر — رخ اس سمت کرتا کھسکتا اُدھر
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا — چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوے ساحل دباتا ہوا — وہ سبزے پہ چادر بچھاتا ہوا
بھٹکتا ہوا غل مچاتا ہوا — وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا — یہ نہروں کو پیہم سجاتا ہوا
اِدھر جھومتا اور مٹکتا ہوا — اُدھر گھومتا اور اٹکتا ہوا

غرضکہ اسی طرح طبع موزوں موجیں مار رہا ہے جس طرح سے متلاطم بحر زخار کی روانی ہو۔ نمونۃً چند اشعار درج کئے گئے کلیات ملاحظہ ہو۔

شاعری کا ایک دلچسپ مگر غیر ضروری حصہ رعایت لفظی ہے۔ اکبر صاحب اس میدان میں گام فرسا ہوئے ہیں۔ یہ صنعت بھی مشکل ہے۔ ذرا چوک ہوئی اور سارے مضموں پر پانی پھر گیا۔

جیسے اکبر صاحب کہتے ہیں ؎

کیوں گلابی کے عوض پینا ہے جوڑا کاہی
طعنہ زن گل یہ مری جان کہیں کاہ نہ ہو
ہمکنار اُس بحر خوبی سے نہ ہوں گے اکبر آپ
ایسے منصوبے سمندر پار رہنے دیجئے
مطبخِ قوم میں رکھا کیا ہے
صرف شیخی ہی اب بگھاریں گے

یہ تو مثال تھی ناکامیاب۔ لیکن کامیاب رعایت لفظی کی بہار دیکھئے۔ کیسے کیسے گل کھلائے ہیں ؎

جام مے غیر کو دو میں نہ کرونگا شکوہ
رنج کی بات ہے پی جاؤنگا آنسو کی طرح
واعظا تیری زباں پر ہے مذمت مے کی
یہ سخن تیرا گلوگیر ہوا اچھو کی طرح

اکبر کے کلام میں بے ساختگی کا لطف بھی ہے کہیں

کہیں انکا کلام سہل ممتنع بھی ہوجاتا ہے۔جس سے لطف اور دوبالا ہوجاتا ہے ملاحظہ ہو۔دعوت عمل دے رہے ہیں، نصیحت جیسے تلخ فرض سے عہدہ برا ہو رہے ہیں۔طعن و تشنیع سے کام نکال رہے ہیں لیکن کس بے تکلفی سے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بے تکلف دوست دلچسپ گفتگو کر رہا ہے۔

کاہلی اور توکل میں بڑا فرق ہے یار
اٹھو کوشش کرو بیٹھے ہوے کس دھیان میں ہو
کھوئے دیتے ہو جو تم مذہب و ملت اے یار
کیا سمجھتے ہو کہ ملجائیگی تقدیر نئی

سلاست اور روانی بھی اکبر کے کلام کا ایک جزو ہے۔ پامال مضامین کو دلچسپ بنانا مرادخیالات میں شوخی پیدا کرنا اکبر ہی کا حصہ ہے فرماتے ہیں ؎

ہائے کیا دلکش ہے اسکی چشم مست
آنکھ ملتے ہی محبت ہوگئی
یہ ادائیں یہ لگاوٹ یہ بلا کی چتون
میں تو کیا ضبط فرشتوں سے بھی واللہ نہ ہو
جناب حضرت ناصح کا واہ کیا کہنا
جو ایک بات نہ ہوتی تو اولیا ہوتے

شراب معرفت اور مینائے حقیقت کے جام بھی اکبر کی مجلس میں ملینگے۔زرا کیفیت حاصل کیجئے ؎

قلقل شیشہ کو سنئے تو زرا حضرت شیخ
دیکھئے تو کہیں اُس قل میں ہو اللہ نہ ہو
ہم نے مخلوق میں خالق کی تجلی پائی
دیکھ لی آئینے میں آئینہ گر کی صورت

غالب کا موضوع شاعری فلسفہ تھا حضرت اکبر کا موضوع کچھ اور ہے مگر فلسفیانہ اشعار ان کے یہاں بھی ملتے ہیں۔عشق کی فلسفیانہ تعریف ملاحظہ ہو۔ ؎

دل میں شورش ہے آنکھ میں آنسو عشق سے کھیل آگ پانی کا

سر لب حیات پر اکبر کی فلسفیانہ رائے دیکھو۔ ؎

بحر ہستی میں ہوں مثال حباب مٹ ہی جاتا ہوں جب ابھرتا ہوں

وجود واجب الوجود کا ثبوت کتنے مکسّت انداز میں آیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا وہ خدا کیونکر ہوا

حکیمانہ احساسات سے بھی کلام اکبر خالی نہیں۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

رونا تو ہے اسی کا کوئی نہیں کسی کا
دنیا ہے اور مطلب مطلب ہے اور اپنا
کم بضاعت کو جو یک ذرہ بھی ہوتا ہے فروغ
خود نمائی کو وہ اُڑ چلتا ہے جگنو کی طرح

مبالغہ آفرینی میں بھی جناب اکبر کو کمال حاصل تھا۔ ؎

کردیا ایسا نزار و خشک منزل عشق نے مجھے
خار چبھنے کا مجھ میں کیا میں ہی چبھا ہوں خار میں
دلا! کیونکر میں اُس رخسار روشن کے مقابل ہوں
جسے خورشید محشر دیکھ کر کہتا ہے میں تل ہوں

حضرت اکبر کے بعض اشعار نے قبول عام اور حیات دوام کی سند بھی حاصل کرلی۔مثلاً ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

کبھی کبھی اس ہنسنے ہنسانے والے شاعر کی واہ" آہ
میں قہقہہ،، نالے میں، ہنسی سوز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
ایسے شعر کہتا ہے جو تیر و نشتر بنکر دل میں اُترتے ہیں۔ ؎

دھواں پہلے اُٹھتا تھا آغاز تھا وہ
ہوا خاک، اب یہ ہے انجام دل کا
اے ابر تڑپنے میں ہمیں ہیں ترے ساتھی
اے ابر ترے ساتھ جو گریاں ہیں تو ہم ہیں

دیکھنا سویا ہوا اکبر بیدار ہوتا ہے۔ اب تک وہ فرضی
معشوق کا عاشق تھا۔ وہ موہوم محبوب کا پرستار تھا۔
اب تک وہ بتوں کی پرستش حاصل حیات سمجھتا تھا اب وہ
عاشق ہوتا ہے۔ فطرت کا۔ اب وہ دل دیتا ہے حقیقت کو۔
اور بندہ بنتا ہے جذبات و احساسات کا۔ اسکی شاعری اب
شاعری ہوگی جو کچھ کہیگا دل میں اُتر جائیگا۔ وہ گالیاں دیگا
لیکن ہم ہنسیں گے وہ برا بھلا کہیگا لیکن ہم مسرور ہونگے۔
وہ طعن و تشنیع سے ہمارے قلوب مشبّک کریگا ہم سینہ
آگے کر دینگے۔ وہ ہم پر آوازے کسیگا، ہمیں بنائیگا۔ ہم پر
پھبتیاں کسیگا لیکن ہم ان باتوں کو خوشی سے انگیز کرینگے۔
وہ میٹھی چٹکیاں لیگا لیکن ہم تکلیف کے ساتھ لطف
محسوس کرینگے۔ وہ نصیحت کڑوی گولیاں خوش طبعی کی شکر
میں لپیٹ کر ہم کو کھلائیگا ہم بخندہ پیشانی اُسکے عطیے کو
قبول کرینگے۔

غدر کے بعد مسلمانوں کی کشتی کے ناخدا سر سید تھے۔
انھوں نے مسلمانوں کی تمام تر توجہ تعلیم انگریزی کی طرف
مرکوز کردی۔ سیاسات کو شجر ممنوعہ قرار دیا۔ انگریزی تعلیم کو
حاصل حیات سمجھا۔ اسکے جو نتائج ہوے وہ آج ہمارے
سامنے ہیں۔ لیکن اکبر کی دوربیں نظر اِن واقعات کو پہلے
ہی دیکھ چکی تھی، اس کا فیصلہ تھا کہ ؎

دل بدل جائینگے تعلیم بدل جانے سے

وہی ہوا اسلئے اکبر کے ہاں ایک مستقل موضوع
"سیدیات" کا ملتا ہے جسمیں جی کھول کر سید صاحب کی
مزاج پرسی کی ہے۔ اُن کے کلیات اور نظریات کی دھجیاں
بکھیری ہیں۔ ہنس ہنس کر سید صاحب کو جلایا ہے۔
ملاحظہ ہو۔ ؎

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
سید اُٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے رہے پیسا نہ ملا
سید کی روشنی کو اللہ رکھے قائم
بتی بہت ہے موٹی روغن بہت ہی کم ہے

لیکن باایںہمہ سید کے حسن نیت کے اکبر قائل تھے۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

انگریزی تعلیم حاصل کرکے بالعموم "صاحب بہادر"
بنجاتے ہیں بلکہ بعض تو ایسے ستم ظریفی سے کام لیتے ہیں
کہ اپنی "صاحبیت" کی تکمیل کے لئے "میم" صاحبہ کا وجود بھی
ضروری سمجھتے ہیں۔ اکبر صاحب اسکی ذمہ داری اولاد پر
نہیں والدین اور سید صاحب پر رکھتے ہیں کتنا معقول
اور مبنی بر واقعات استدلال ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

اِک بتِ سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد
اِس خطا پر سُن رہا ہوں طعنہ ہاے دلخراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم
کوئی کہتا ہے کہ ہے یہ بدخصال و بد معاش
دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش
ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش
جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو
سوپ و کاوی کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش
لیڈیوں سے مل کے دیکھو اُن کے انداز و طریق
بال میں ناچو کلب میں جا کے کھیلو اُن سے تاش
بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کردو پاش پاش
سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر
ہاں جوانی کی اُمنگ اور اُنکو عاشق کی تلاش
اُسکی چتون سحر آگیں اُسکی باتیں دل ربا
چال اُسکی فتنہ خیز اُسکی نگاہیں برق پاش
جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا
دست سیمیں کو بڑہاتی اور میں کہتا دور باش
دونوں جانب تھا رگوں میں جوشِ خون فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش
بار بار آتا ہے اکبر میرے دل میں یہ خیال
حضرتِ سید سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش
درکنارِ قصر دریا تختہ بندم کردئی
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

حضرت اکبر جس قدر تعلیم جدید سے بیزار تھے اسی قدر تہذیب جدید سے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی مشرقی، مغربی انداز و اطوار اختیار کرے۔ اس لئے اس موضوع پر بھی اُنکے کلیات میں مستقل مواد ملتا ہے۔ کتنے باغیرت طریقے پر تنبیہ کرتے ہیں۔ ؎

رنگ آڑانا اہل یورپ کا تو ہے اکبر محال
مفت اپنے آپ کو تم نے تماشا کردیا

موجودہ تہذیب و تمدن نے جو مہذب صورت اختیار کرلی ہے اور سوسایٹی کے لئے جو بدترین اصول وضع کئے ہیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ؎

شیطاں کو رجیم کہدیا تھا اک دن اک غل مچا کہ خلاف تہذیب ہے یہ

کالج کا کوئی مسٹر نمازی ہونے کے بعد مولینا کا خطاب پاتا ہے اب ذہنیت یہ پیدا ہوگئی کہ کوئی بات خلاف فیشن نہ ہو ورنہ آدمی احمق مشہور ہوگا۔ نماز پڑھنا فیشن سے خارج ہے لہذا اگر کوئی نماز پڑھے تو اس علم کدے سے حماقت مآبی کا سرٹیفکٹ ملجائیگا۔

اس خیال کو اکبر نے کتنے بہتر انداز میں باندھا ہے ؎

مین نے اکبر سے کہا آیئے حجرے میں مرے
اس چٹائی پہ نمازیں پڑھیں حسب دستور
چھوڑیے آپ یہ ہنگامۂ تعلیم جدید
کاٹ ہی دیگا کسی طرح خداوند غفور
بولا جنجھلا کے کہ ہے سہل جہنم مجھ کو
اسکی نسبت کہ میں کالج میں ہوں احمق مشہور

اکبر اپنے دعوے کے ثبوت میں اتنی عام بات پیش کرتا ہے کہ بادی النظر میں وہ مضحک ہوتی ہے مگر درحقیقت جس قدر غور کیجئے اسیقدر لذت الم کے متضاد جذبات پیدا

ہوتے جائیں گے۔ ذیل کے شعر میں اکبر نے کوزے میں دریا بھرا ہے۔ تعلیم جدید کی بھی حقیقت کھولی ہے۔ اُسپر آوازہ بھی کسا ہے ۔ قلوب کے سیاہ ہونے کا تو اتنا معقول ثبوت پیش کیا ہے کہ ماشاء اللہ۔ ؎

سیاہ کرنا دلوں کا اسے ہے کیا مشکل
تمھارا علم لگاتا ہے آفتاب میں داغ

بعض باتیں ایسی کہہ جاتے ہیں کہ اگر اُنکا تجزیہ کیجئے تو وہ بالکل بے معنی اور مہمل ہیں۔ مگر درحقیقت کوئی نہ کوئی نکتہ ملحوظ رہتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ ؎

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب

اس مِس پہ کون مرے سوا ہے فریفتہ
گاہک میں ہی ہوں ہند میں لندن کے مال کا

انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم جسطرح رفتہ رفتہ عقاید میں تغیر پیدا کرتی ہے اسکو ظاہر کرتے ہیں۔ ؎

نظر انکی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

ہم میں جب کوئی بڑا منصب حاصل کرتا ہے تو تبختر اور تمرّد کی وجہ سے اپنے ہمجنسوں اور عزیزوں سے گفتگو کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے ۔ اکبر صاحب اُسے نصیحت کرتے ہیں۔ لیکن کتنے دل موہ لینے والے الفاظ ہیں۔ ؎

عزیزانِ وطن سوجیں سول سروس سے کیا حاصل
یگانوں میں رہو "بیگانہ ہو کر" اس سے کیا حاصل

ہندو مسلم اتحاد کے بھی اکبر صاحب موافق ہیں انہیں اتحاد و اتفاق کی تلقین کرتے ہیں۔ تمثیل ملاحظہ ہو۔ ؎

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دھر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

فقیر کو ایک پائی دینا فضول خرچی ہے۔ ہمارا دل فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ مضبوط ہے کما کھائیگا۔ لیکن دوسرے لغویات میں جو ہم صرف کرتے ہیں اسکا احساس تک نہیں کرتے۔ اکبر صاحب اسی کے متعلق فرماتے ہیں۔ ؎

فقیر مانگے تو صاف کہدیں کہ تو ہے مضبوط جا کما کھا
قبول فرمائیں آپ دعوت تو اپنا سرمایہ کل لٹادیں

ہندوستان یورپ کے لئے کیا ہے ۔ لسان العصر کی زبان سے اسے بھی سُن لیجئے۔ ؎

یہ بات غلط کہ ملک اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن ورام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش
یورپ کے لئے بس اک گدام ہے ہند

قرآن کی فصاحت و بلاغت پر ہم بہترین لکچر دے سکتے ہیں ۔ اعجاز قرآن پر لاجواب تقریر کر سکتے ہیں۔ قرآن کو منزل من اللہ ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا عمل ہمارے ان داعیات کے بالکل خلاف شہادت دیتا ہے ۔

ورد قرآں کی نہ دو بھائے عمل اسپہ کرو
پیش درگاہِ خداداد کی حاجت کیا ہے

یورپ سے ہم اسقدر مرعوب ہیں کہ اسکے "ہذیانات" "وحی یوحیٰ" سمجھتے ہیں ہمارے دلمیں جو جگہ مل اور اسپنسر کانٹ اور ہکسلے کی ہے وہ غزالی اور رازی فارابی اور سینا کی

نہیں ہے۔ فرماتے ہیں ۔

غزالی اور رومی کی بھلا اب کون سنتا ہے
کہ محفل میں چھڑا اب نغمۂ اسپنسر و مل ہے

عیسائیوں کی برائے نام سہی مگر مذہبی حالت بہت مضبوط ہے۔ ہماری مذہبی حالت روز بروز بدتر ہو رہی ہے اسکی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ؎

گرجا میں تو کرنیل و کمشنر بھی ہیں موجود
مسجد میں کوئی ڈپٹی و منصف بھی نہیں ہے

خدا کے نام کا ورد تو ہماری زبان پر رہتا ہے لیکن ہمارے دل اسکی عظمت سے بالکل خالی ہیں۔ فرماتے ہیں ۔

نام خدا کو اکبر زیب زباں تو پایا
عشق بتاں کو لیکن نقش قلوب دیکھا

موجودہ سائنس نے جو محیر العقول ترقی کی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ نت نئے انسان شکن آئے نت نئی جان لیوا گیسیں روز ایجاد ہوتی ہیں۔ آج ایک ایسی گیس ایجاد ہوتی ہے جو کئی لاکھ آدمیوں کو چند منٹ میں ختم کر سکتی ہے۔ کل ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جاتا ہے کہ ہوائی جہاز دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے لگتا ہے ۔ غرض تہذیب کے پردے میں بربادی، تمدن کے پردے میں تباہی، مذہب کے پردے میں غارتگری، حضارت کے پردے میں دغا و فریب کی جو گرم بازاری ہے اسکی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی
موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

حسب ذیل شعر حضرت اکبر نے کسی کیفیت کے عالم میں کہا تھا اگر اسوقت نہیں تو آج یہ شعر اپنے حقیقی مضمون میں صادق ہے تمسک بالکتاب والسنت کا دعوی کرنے والے ابن مسعود کی صبا رفتار موٹریں، ریگستان حجاز میں مصروف خرام ہیں۔ ملک فیصل تھیٹر ہال میں جانا باعث فخر سمجھتے ہیں تصویر کھنچوانا عملاً جائز سمجھتے ہیں۔ شعر یہ ہے ۔

اپنے اشتر کو یہ کیا لیجائیگا سوئے حجاز
مست خود ہے بینڈ کی گت پر حدی خواں ندنوں

مسلمانوں کے اندر سے رفتہ رفتہ جس طرح غیرت و خودداری کا احساس فنا ہو رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ اکبر صاحب ارشاد فرماتے ہیں ۔

زمان حال کے اگلے فسانے امر ماضی ہیں
جو تلواریں چلاتے تھے وہ اب ٹھوکر یہ راضی ہیں

گورنمنٹ نے مذہبی آزادی دیکر بالواسطہ جو گمراہیاں پیدا کی ہیں اسکے متعلق کہتے ہیں ۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ گلے میں جو اتریں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

اسلاف کی خصوصیت یہ تھی کہ اُن کا ایمان ۔ "وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا" پر تھا وہ غایت درجہ بے نوئی اور بے عزتی سے اسلام کی خدمت کرتے تھے۔ اسکے بالکل برعکس اخلاف کی جو حالت ہے ظاہر ہے ۔

اُٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یاد خدا کرینگے
معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کرینگے
کہاں کے قبلہ کہاں کے قبلی جنید کیسے کہاں کے شبلی
عوض تصوف کے ہم نے طب لی بنیں گے سرجن اکر رہینگے

اکبر ہر ممکن کوشش سے مسلمانوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

[بقیہ صفحہ ۱۲۰ پر دیکھئے]

افسانہ

بیوہ کا لڑکا

[جناب عابد علی صاحب سابق ایڈیٹر افسانہ]

(۱)

شیھدرا شمالی ہند میں ایک چھوٹا سا خوبصورت گاؤں ہے، اس کی ترادت بخش آب و ہوا، اس کے کھلے کھلے میدان لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی کافی کشش رکھتے ہیں، بستی تو کوئی بڑی نہیں ہے تقریباً دو سو نفوس اسکی نزہت زا فضا میں نشو ونما پاتے ہیں مگر وہ چیز جو یہاں لوگوں کو خاص طور سے آنے کی دعوت دیتی ہے شاہان مغلیہ کے وقت کی ایک بوسیدہ مسجد ہے، لوگوں کا خیال ہے کہ اسے "شاہ دینا" نے بنوایا تھا، یہ پرانے وضع کی سادہ اور خوبصورت سی مسجد ہے، اسکے سامنے ایک بہت بڑا میدان ہے اور پشت پر ایک قبرستان، جہاں زمانہ سلف کے لوگ آزادی اور بے نیازی کی نیند سے سرشار، ابدی خواب کے کیف سے سرمست، ایک لا متناہی زمانہ کے لئے پڑے سو رہے ہیں۔

مکانات کچھ کچے اور کچھ پکے بنے ہوئے ہیں، جگہ جگہ پر کاشتکاروں نے چھوٹی چھوٹی جھونپریاں ڈال لی ہیں۔ ان سب کا اصل پیشہ جیسا کہ ظاہر ہے کاشتکاری اور زراعت ہے۔ صبح کے وقت جبکہ آفتاب کی اولیں کرنیں اس خطۂ فردوس بداماں پر پڑنے بھی نہیں پاتیں کہ یہاں کے کاشتکار ہل کاندھے پر رکھے بیلوں کو آگے آگے ایک دہقانی مگر دلکش گیت گاتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور وہ سماں جب وہ شام کو تھکے اور ماندے کھیتوں سے اپنے گھروں کو پلٹتے ہیں اور کالے کالے بادل انکے سروں پر منڈلایا کرتے ایک خاص دلفریبی رکھتا ہے۔ بستی زیادہ تر مسلمانوں پر منحصر ہے مگر پھر بھی یہاں ہندوؤں کی تعداد کافی ہے اور یہ دونوں کچھ اس سرگرمی سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں کہ مذہب کا تفاوت کوئی تفاوت نہیں معلوم ہوتا۔

اس مسجد کو "شاہ صاحب" کی مسجد کہتے ہیں، روزانہ تو یہاں زیادہ اجتماع نہیں ہوتا مگر جمعہ اور خصوصاً جمعہ کو یہ چھوٹی سی مسجد نمازیوں سے بھری نظر آتی ہے اور ہر شخص سچے دل اور حضور قلب سے ذرا صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے خدا کی دربار میں اپنی زراعت اور پیداوار کی دعا نہایت خشوع اور خضوع سے مانگتا ہے۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی ندی نہایت صفائی سے لہریں لیتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

میرے ایک دوست جو یہیں کے باشندے ہیں گرمیوں کی تعطیل میں مجھے بھی اپنے ساتھ یہاں لیتے آئے اور میں بھی اس فردوس نظر خطے کے منظر ہائے دلربا میں مسرت کی چند سانسیں لینے لگا۔ ایک روز جمعہ کو جبکہ نمازی ہر طرف سے آ آ کر مسجد میں جمع ہو رہے تھے میں نے دیکھا کہ ایک بڑھیا مگر خمیدہ اور بہت بزرگ، ایک ڈنڈے کے سہارے آہستہ آہستہ چلی آرہی ہے، اسکے بال بالکل سفید مثل برف کے تھے، گالوں پر تمام جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور چلنے میں اسکے قدموں کو اسقدر لغزش ہوتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا اب گرا ہی چاہتی ہے۔ اسکے چہرے

سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے خدا کے نام کے ساتھ کس قدر پیار اور محبت ہے اور وہ کس خلوص سے اتنی تکلیفوں اور کلفتوں کو برداشت کر کے حضور میں حاضر ہوئی ہے۔ اسکا سفید چہرہ تھکن کی وجہ سے تمتما رہا تھا، کپڑے کچھ میلے گر دھوئے ہوئے تھے جسے اُس نے خود ہی صاف کئے ہوں گے، وہ کانپتی ہوئی مسجد میں آکر ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔ دنیا میں اب اسکے لئے محبت کا کوئی سامان نہ تھا، اسکے کوئی عزیز و اقارب نہ تھے صرف آسمان کی امیدیں تھیں اور وہ، اور بس اسکے سوا اُسکا کوئی سہارا نہ تھا۔ غریب کھڑی ہوکر نماز نہ پڑھ سکتی تھی بیٹھ کر نماز پڑھنے لگی جب میں نے اُسکو لرزہ براندام سجدے میں جاتے ہوئے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اسکی نماز ہم لوگوں کی نماز سے پہلے بارگاہ الٰہی میں درجہ قبولیت کو پہونچتی ہوگی۔

(۲)

ایک دن ظہر کی نماز پڑھکر میں وہیں بیٹھا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ دو گورکن اس پرانے قبرستان میں ایک قبر کھودنے میں مشغول ہیں، اُن لوگوں نے ایسی جگہ کو انتخاب کیا تھا جو بالکل کنارے اور نشیب میں تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی غریب انسان کی ابدی آرامگاہ بنے گی۔ میں گھر جانے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے دیکھا چند آدمی ایک جنازے کو کاندھے پر رکھے ہوئے لا رہے ہیں میت پر امارت و دولت کا شائبہ بالکل نہ تھا بلکہ اسکی جگہ حسرت اور مایوسی برس رہی تھی، نعش پر پڑی ہوئی گاڑھے کی چادر اپنے مردے کی غربت و افلاس کا کافی ثبوت دے رہی تھی۔ میں نے اُسی بزرگ عورت کو جسے میں جمعہ کے دن دیکھ چکا تھا، جنازے کے پیچھے کانپتے اور ایک حالت میں جسکا بیان ناممکن ہے آتے دیکھا۔ وہ اس قدر رو چکی تھی کہ اب اپنے مردہ لڑکے کے لئے اُسکی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا، اُسکی آنکھیں ایک سوکھے ہوئے تالاب کی طرح خشک ہو چکی تھیں، مگر اُسکی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے کسقدر غم ہے ـــــ غم ہے اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کا، جو اسکی زندگی کا واحد سہارا اور تنہا امید تھا۔ اُسے گاؤں کی ایک دوسری عورت سنبھالے ہوئے تھی جو بار بار تسلی آمیز الفاظ میں اُسکو تسکین دیتی جاتی تھی۔ جنازہ مسجد کے سامنے رکھا گیا اور امام نے نکل کر نماز جنازہ پڑھائی۔

میں بھی میت کے ہمراہ ہولیا، ایک آدمی سے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اسی بزرگ خاتون کا بیٹا سالم تھا جو عالم نوجوانی میں وفات پاگیا، اسکی عمر تقریباً پچیس برس کی ہوگی۔ جنازہ بہت جلد قبرستان میں پہنچا دیا گیا۔ جنازہ سامنے رکھا ہوا تھا اور بڑھیا ہاتھ جوڑے اور کانپتے ہوئے الفاظ میں کہہ رہی تھی، کہ اے خدا یہ میرا آخری سہارا تھا۔ ...... تو نے اسے چھین لیا ...... آہ .... اچھا کیا .... اب میرا دنیا میں کوئی نہیں"۔

لوگ نعش کو قبر میں اُتار رہے تھے اور وہ غریب اپنے بیٹے کو خاک میں ملنے کے خوف سے ڈری جا رہی تھی اور آلام کے پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر اُس پر گر رہے تھے، اس حالت کو دیکھکر وہ عورت جو اُسکے ہمراہ تھی تسلی دینے لگی، نہیں، نہیں ... صبر ... صبر" مگر بڑھیا صرف سر ہلا دیتی گویا اُسے قرار نہیں آسکتا تھا۔

نعش قبر میں اُتار دی گئی۔ مردہ کا کفن سے چہرہ کھول دیا گیا اور غریب بڑھیا اپنے لڑکے کو آخری بار دیکھنے لگی۔ آہ اب وہ رو رہی تھی، آنسو خود بخود اُسکی آنکھوں

سے پیدا ہو رہے تھے۔ اسوقت وہ خود بھی چاہتی تھی کہ وہیں دفن ہو جائے۔ وہ زیادہ صبر نہ کر سکی، اُسکے صبر و قرار لڑکے کے دفن ہوتے ہی فنا ہو گئے اور وہ وہیں ایک درد بھری چیخ کے ساتھ بیہوش ہو کر گر پڑی۔

تھوڑی دیر بعد بڑھیا کو ہوش آیا مگر وہ اب بھی اصل میں اپنے ہوش میں نہ تھی، اُسکو ہوش کس طرح قائم رہتا جبکہ وہ اپنے سامنے اپنے پیارے سالم کو خاک میں ملتے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی ـــ اُسکے حواس کیسے بجا رہتے جبکہ اُسکی تمام تمناؤں کا خون ہو چکا تھا۔ مگر اُسے جبر کر کے اُٹھایا گیا اور وہ بہت آہستہ لکڑی کے خفیف سے سہارے پر اپنے لڑکے کو جو دنیا میں اُسے حد سے زیادہ پیارا تھا، ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلنے لگی۔

میرا دل اُسکے واسطے اشک آلود تھا، میرا قلب اُسکے غم پر رو رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ ایک دولتمند کے آلام کیسے ہوتے ہیں! ـــ اُسکے دوست اُسے بہلاتے رہتے ہیں، اُسکی مسرتیں اُسکے دل سے غموں کو بھلا دیتی ہیں، تمام دنیا اُس کے غموں کو بدلنے اور ان میں حصّہ لینے کی سعی کرتی ہے۔ ایک نوجوان کے آلام کیسے ہوتے ہیں! اُس کے جوان خیالات اُسکے غم پر غالب آجاتے ہیں اور وہ بہت جلد اپنے غم کو بھول جاتا ہے۔ مگر ایک غریب کے آلام جسکا کوئی ہمنوا نہ ہو ـــ ایک بڈھے کے آلام، جسکی زندگی چراغ سحری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ـــ ایک بڑھیا کے آلام جو معمر ہو چکی ہے، تنہا ہے، غریب ہے، اپنے لڑکے کی موت پر رو رہی ہے جو اُسکی زندگی کا آخری سہارا تھا، اصل میں یہی وہ آلام ہیں جو اپنے میں خدا معلوم کتنی کلفتیں پنہاں رکھتے ہیں۔

---

(۳)

مگر چلتے وقت میں نے اُس عورت سے جو بڑھیا کو سنبھالے ہوئے تھی تمام حالات دریافت کئے اور اُس نے جو کچھ بتایا اُسکا خلاصہ یہ تھا کہ مرحوم سالم کے والدین پیدائش سے اُسی گاؤں میں رہتے تھے اور کاشتکاری کے ذریعہ اپنی زندگی مسرت اور اطمینان کے ساتھ بسر کرتے تھے، اُن کے صرف یہی ایک لڑکا تھا جو ان کی زندگی کا سہارا تھا، پر اُس عورت کے الفاظ یہ تھے" جناب، وہ بہت خوبصورت، بہت خوش مزاج اور رحمدل تھا غریب بڑھیا (اُسکی ماں) بھی اسے بہت پیار کرتی تھی اور کیوں نہ پیار کرتی وہ اسکا کسقدر تابع فرمان تھا۔ وہ اس پر فخر کرتی تھی اور اسے اس پر ناز تھا" بدقسمتی سے ایک سال قحط پڑ گیا اور مجبوراً اسے کشتی بانی کی ملازمت کرنا پڑی۔ اس ملازمت میں وہ زیادہ عرصہ تک نہ رہا ہوگا کہ بدمعاشوں کی ایک جماعت اسے پکڑ لے گئے اور وہاں اسے ایک جہاز میں کوئی معمولی نوکری مل گئی۔ اس کے والدین نے یہ خبر سُنی مگر اسکے علاوہ پھر انھیں کوئی اطلاع نہ مل سکی کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔ اسکا باپ جو کمزور تو پہلے ہی تھا اب اور بھی نحیف ہو گیا اور آخر کار اسے قبر کے تاریک گوشے میں بہت جلد امان مل گئی۔

غریب بڑھیا اب تنہا رہ گئی تھی، نیچر کی چند ضروری خواہشات اسکا باغ اور گاؤں کے کچھ ذی مقدرت لوگ پوری کر دیا کرتے تھے۔ ایک روز جب وہ بیچاری اپنے کھانے کے لئے کچھ سامان کر رہی تھی کہ جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور ایک اجنبی شخص در آیا اور چاروں طرف متجسّس نظریں پھینکنے لگا۔ وہ ملاحوں کے سے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اُسکی صورت پر افسردگی اور زردی برس رہی تھی اور معلوم ہوتا تھا

کہ وہ بیمار ہے اور محنت شاقہ کا مارا ہوا ہے۔ وہ جوش مسرت سے لغزش بہ قدم اپنی ماں کی طرف بڑھا۔ غریب بیوہ غور کرکر کے اسکو دیکھ رہی تھی مگر اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون ہے۔ "اماں ... میری اماں" کہکر وہ بڑھیا کے پیروں پر گر پڑا اور آنسو اسکی آنکھوں سے جاری ہوگئے۔ یہی اسکا گم شدہ بیٹا سالم تھا جو بیماری کی تکلیفوں سے پریشان ہوکر سختیوں کو جھیلتے جھیلتے خدا معلوم اپنی ماں کے پاس کس طرح بھاگ آیا تھا — یہ ایک ایسا منظر تھا جس میں مسرت والم آمیزاں تھے۔ مسرت اس لئے کہ وہ زندہ تھا اور اپنے گھر آگیا تھا اور الم اس لئے کہ اسکی حالت بہت سقیم تھی وہ سخت علیل تھا۔ بیوہ ماں اسے دیکھکر بیقرار ہوگئی، فرط انبساط میں جلدی سے اُسے گلے لگالیا اور خوشی کے چند آنسو نکل کر زمین جذب ہوگئے۔

وہ بیمار تھا اور اپنی ماں کے اس بوسیدہ بستر پر لیٹ رہا جس پر اُس بیماری نے خدا معلوم کتنی راتیں شب بیداری، اختر شماری اور گریہ وزاری میں بسر کردی تھیں۔ وہ اُسی پر، غریب سالم اس پر اس طرح پڑا کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔ غریب بڑھیا دن دن اور رات رات بھر اس کے پاس بیٹھے بیٹھے جاگ کر گذار دیتی تھی۔ اُس کی مادری محبت جوش پر تھی، آہ اس نے کتنے عرصے کے بعد اپنے لڑکے کو پایا تھا۔ وہ اس پر ہر چیز قربان کر دیتی، اگر اسکے پاس کائنات عالم کی بادشاہت بھی ہوتی تو بھی وہ اس پر نثار کردیتی کہ وہ زندہ رہے مگر اسکے پاس کیا تھا جو وہ اُس پر نثار کرتی، اسکے پاس کیا تھا جو اُس پر فدا کرتی، وہ غریب تھی اور اس قابل بھی نہیں کہ شہروں میں لا کر اچھی طرح علاج کرا سکے۔ ماں کے دل میں اپنے لڑکے کے لئے سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے ایسی کہ جو خود غرضی سے کبھی مسرور بھی نہیں ہوسکتی، وہ اپنی راحت پر اسکی راحت کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ اپنی تمام مسرتوں کو اُس پر نثار کردیتی ہے، وہ اسکے عروج پر خوش ہوتی ہے، اسکی دولتمندی پر مسرور ہوتی ہے — اور اگر لڑکے پر بدبختی کا زمانہ آجاتا ہے تب بھی وہ اُسے چاہتی ہے اور اگر اُسکے نام پر بدنامی کا دھبہ لگ جاتا ہے اُسوقت بھی وہ اُس سے محبت کرتی ہے اور اگر تمام دنیا اُسے چھوڑ دے اور اُس سے نفرت کرنے لگے تو وہ اُس کے لئے تمام دنیا بن جاتی ہے۔

غریب سالم جانتا تھا کہ تنہائی میں بیماری کیسی ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی ماں کو اپنے سامنے سے ہٹنے نہ دینا چاہتا تھا۔ اگر وہ کہیں چلی جاتی تو اُسکی آنکھیں اُسکا تعاقب کیا کرتی تھیں۔ وہ گھنٹوں اُسکے پاس بیٹھی رہتی اور وہ سویا کرتا۔ کبھی وہ سخت بخار کی غفلت سے چونک پڑتا اور اوسکی نظریں اپنی ماں کو تلاش کرنے لگتیں اور جب وہ دیکھ لیتا کہ وہ آگئی ہے تو اُسکا ہاتھ اُٹھا کر اپنے سینہ پر رکھ لیتا اور ایسی بے پروائی سے سوتا جیسے ایک بچہ۔ اس طریقہ سے اُسکی موت ہوئی۔

سالم کی موت کے کچھ ہی دن بعد میں نے سنا کہ وہ بیوہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئی اور اس دنیا میں پہونچ گئی جہاں رنج والم کا پتہ نہیں اور جہاں دوست ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔

(خاص)

افغانستان

"پس کجائی تو اے معمارِ ملت؟"

(افغان نوجوانوں سے خطاب)

[آقائی مرتضیٰ احمد خاں صاحب محمد زائی ایڈیٹر اخبار افغانستان لاہور]

[ہندوستان کے ایک فارسی اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت میں برادرم مرتضیٰ احمد خاں کا مضمون' قاعدے سے' فارسی زبان ہی میں ہونا چاہئے تھا' چنانچہ اُنھوں نے فارسی مضمون ہی عنایت کیا' مگر چونکہ رسالہ "چاند" کے اکثر ناظرین کو فارسی مضمون نامانوس معلوم ہوگا اس لئے "چاند" کے فاضل ایڈیٹر صاحب کا حکم صادر ہوا کہ مضمون' اردو ہونا چاہئے۔ اب یہ جناب ایڈیٹر صاحب "چاند" کی "عنایت" سمجھئے [نزلہ بر عضو ضعیف می ریزد!] یا برادرم مرتضیٰ احمد خاں کی "نوازش" ["بمعنی کاہلی"!] کہ ترجمہ کے لئے ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند! چنانچہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے اس مضمون کا عنوان جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے' کیونکہ اردو کے حسین سے حسین اور موزوں سے موزوں الفاظ بھی اُس لطافت کو محفوظ نہیں رکھ سکتے جو اصل میں ہے

اختر شیرانی]

زخاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیماست
قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است

کہاں ہے۔ ؟! اے غمخوار قوم! اے معمار ملت! تو کہاں ہے؟! وطن کی سرزمین' انتظار کے عالم میں فریاد کر رہی ہے۔ آ! اس اُجڑی ہوئی سرزمین کو آبادی سے' ان سنسان بیابانوں کو' آباد سڑکوں سے اور ان بنجر وادیوں کو سرسبز کھیتوں اور پھل دار باغوں سے بدل دے۔! تاکہ وہ خواب جو ہماری جنم بھومی' ہماری مادر وطن' اپنی پیدائش' کے پہلے دن سے دیکھتی آئی ہے' حقیقت بن جائے' حقیقت سے بدل جائے! اور سہانی آوازوں والی بلبلیں اور دوسری چڑیاں اس خاکی جنت کو' اپنی نت نئی اور بھانت بھانت کی مست راگنیوں سے لبریز کر دیں!

آ! اور اس مٹی کے ذرّوں کو اپنے انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے' زندگی بھرے سانس سے' رقص و وجد میں مبتلا کر دے! تاکہ یہ ذرّے' جو جُگوں سے پڑے سو رہے ہیں' اپنے ارتقا کی ممکنہ منزلوں کو ایک ہی سانس میں طے کر کے' چاند سورج کی طرح جگمگانے لگیں! اور سارے سنسار میں اپنی نورانی کرنوں سے اُجالا کر دیں۔!

آ! اس سرزمین پر ایک محبت بھری' ایک عاشقانہ نظر ڈال! اور اسے کیمیا بنا دے! تاکہ وطن کی آنے والی نسلوں کی رگ رگ اور نس نس میں ایک جوان' اور گرم خون لہریں مارنے لگے۔

آ! کہ وطن کے آسمان فرسا کوہستان میں' قدیم'

بھولے ہوئے زمانوں سے بیش بہا اور نادر خزانے مدفون چلے آتے ہیں، اور صدیوں کے طبعی انقلابات نے اُن میں قابل فخر ورشک اضافہ کر دیا ہے۔ آج تک یہ کوہسار یہ کہستان تیری آمد کے منتظر رہے ہیں! کہ تو آئے اور اپنے محبوب وطن کے دامن کو لعل و یاقوت اور زر و سیم سے بھر دے۔

آ۔ کہ ہمارے کوہسار تیرے تیشوں کی ضربوں کا انتظار کر رہے ہیں! تاکہ تو آئے اور فرہاد کی طرح صرف ایک دودھ کی نہر نہیں بلکہ مادرِ وطن کے عشق میں طلائی پانی کی صدہا نہریں بہائے اور وطن کی روح کو شاد کر دے۔!

آ۔ محبوب وطن تیرے اشتیاق میں ہمہ تن دیدہ انتظار بنا ہوا ہے۔ آ! اور اُس کے نازنین جسم کے زخموں پر اپنے شفا بخش ہاتھ سے مرہم رکھ! اور اُسے نئے سر سے تنومند بنا دے!

آ! قوم کی حالت خوار و زبوں ہے! ۔ جہالت کے دیووں اور وحشت کے عفریتوں نے تیری قوم کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے! آ! ان دیووں اور عفریتوں کے ساتھ ایک مردانہ جنگ کی بنیاد ڈال! تاکہ وطن کی اولاد علم و عرفان کی روشنی سے منور ہو جائے اور یہ باعزت زندگی کے دشمن عالمِ نیستی میں دفن ہو جائیں۔!

آ۔ وطن کی اولاد اپنے دامن میں ترقی و خوش نصیبی کے تمام تر امکانات کی پرورش کرتی ہے لیکن تیرے آنے کے سبب سے ابتک جنگلوں اور بیابانوں میں آوارہ ہے سیدھا راستہ بھول کر ادھر اُدھر بھٹکتی پھرتی ہے۔ آ! اس گم کردہ راہ کا ہاتھ پکڑ! ۔ اس قافلے کو منزلِ مقصود تک پہنچا دے!!

آ! اے معمارِ ملت! اے جوانِ افغان! تو کہاں ہے!

یہ ویرانے اور میدان، یہ جنگل اور بیابان! یہ وادیاں اور کوہستان۔ یہ تمام کائنات تیری منتظر ہے! ۔ اُٹھ! کمر باندھ ایثار سے کام لے! اور ہمت کر! تاکہ تیرے بزرگوں کی روحیں تجھے سلامتی و دعائیں بھیجیں، اور آنے والی نسلیں فخر و ناز کے ساتھ تیرا نام لیں۔ اور سارا سنسار آفریں کہے ؎

خضر وقتے کو کہ تعمیر خراب ما کند
زانکہ گنجے ہست پنہاں در تہِ دیوارِ ما (خاص)

چین کا نغمۂ آزادی

[مترجمہ جناب اختر شیرانی، جوائنٹ ایڈیٹر افغانستان]

ذیل میں اُس نغمہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جسے چین کی قومی فوجیں (جنھوں نے ۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر سن یٹ سین کی قیادت میں حریت قومی کے جہاد علم بلند کیا تھا) گاتی تھیں]

آزادی ایک برکت ہے، جو تمام آسمانی برکتوں سے اعلیٰ ہے!

جب یہ برکت امن کی برکت کے ساتھ مل جائیگی دس ہزار فوق العادت چیزیں پیدا کر دے گی۔

آ! اے آزادی! آ! پختہ اور متین روح کی طرح آ!

پُر ہیبت اور پُر جلال دیو کی طرح آ!

سر بفلک کوہساروں کی طرح سربلند ہو کر آ!

اے آزادی آ! طوفانی بادلوں کو گاڑی بنا! اور تند ہواؤں سے گھوڑے کا کام لے، اور آسمان سے ہم پر نازل ہو!

آ! اے آزادی آ! اور اس فنا کی خطے پر حکمراں ہو!
اے یورپ کی سفید رنگت سرزمین! تو آسمان کی ایک
بدخصلت لڑکی ہے!

مجھے روٹی اور شراب۔ غرض کسی چیز کی ضرورت نہیں!
لیکن میں آزادی کو محبوب رکھتا ہوں! میں آزادی کے
عشق سے سرشار ہوں! میں آزادی چاہتا ہوں!
میں آزادی کو ایک نئی نویلی دولھن کی طرح پیار کرتا
ہوں! میرے دن اُسی کے خیال میں کٹتے ہیں! اور میری
راتیں اُسی کے خوابوں میں بسر ہوتی ہیں۔!

میں وطن کی مصیبتوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں! لیکن
آزادی اپنی بیوفایانہ عادتوں کے ساتھ۔ کہاں ہے!
آہ! میں ابھی تک اسکو حاصل نہیں کر سکا۔

افسوس! صد افسوس! کہ میرے بھائی غلامی اور
قید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔
اور ہوا کسقدر بہار آفریں ہے! شبنم کیسی درخشاں ہے!!

پھول اپنی مستانہ خوشبوئیں بکھیر رہے ہیں!
شخص بادشاہ بنا ہوا ہے!

مگر ہم اس حقیقت کو نہیں بھلا سکتے کہ ہماری قوم
مصیبتوں سے گھری ہوئی ہے۔
بیکن میں ہم مجبور ہیں کہ گیدڑ بادشاہ کے سامنے
اپنا سر جھکائیں!۔ افسوس آزادی کی روح مردہ ہو گئی ہے۔
ایشیائے عظمیٰ ایک صحرا ایک ویرانہ بن گئی ہے۔
ہم اس عہد میں دورِ جدید کی مہم سر کرنے کے لئے
کام کر رہے ہیں۔
اس عہد میں تمام شجاعت اور جوانمرد انسان آسمان و
زمین کے حالات بدل دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔
کاش انسانی روحیں کوہ انگ کانگ اور کوہ ہمالہ
کی طرح بلند ہو جائیں۔
واشنگٹن اور نپولین! تم دونوں آزادی کے جلیل القدر
فرزند تھے!
کاش تمہاری روحیں مشرق کے باشندوں کے جسم
میں سما جائیں!
ہینیوں! اور ہمارے جد امجد ہینیوں! ہماری
رہنمائی کر!
اے روح آزادی! اے فرشتۂ حریت! آ! اور ہماری
زندگی کو محفوظ اور باعزت بنا دے!! (خاص)

(بقیہ صفحہ ۵۲)
عموماً ایشیا اور خصوصاً ہندوستان کے علما و حکما فلسفی
مانے جاتے ہیں۔ کسی وقت یہاں برہمچریہ کا چرچا بھی تھا۔ مگر
وائے برمن کہ سالہا سال کی غلامیوں نے میرے فلسفیانہ دل
و دماغ کو پست ہی نہیں بلکہ پست تر بنا دیا۔ اب میں بھول چکا کہ
۱۴+۱۸ کی شادیاں صرف کچی کلی کو گوندھنا ہے اس لئے ارباب حل و عقد
کو چاہئے کہ اپنے قدیم تمدن و معاشرت کو مد نظر رکھ کے دیکھیں ۱۴
کو ۲۴ اور ۱۸ کو ۲۸ کرنا چاہئے کہ نہیں کیونکہ ۱۴ + ۱۸ کی
مواصلت سے جو بچے پیدا ہوں گے کیا وہ ایسے سورما ہوں گے
جن کی قوت بازو سے ہم موجودہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکتے
ہیں؟ اور کیا اس کم سنی کی مباشرت سے زن و شو کی حیات
کمزور یا کمتی نہیں ہوتی؟ نہیں ہوتی ہے یا نہیں ہو گی؟ پھر کیوں
نہیں مان لیتے کہ سارڈا ایکٹ میں جو بیلو کی عمر مقرر کی گئی ہے وہ
خلاف فطرت ہے اور سچ پوچھ اس پھول کو گوندھنا ہی
کیا ضرور ہے جس میں نہ کچھ رنگ ہے نہ بو؟ (خاص)

اکبر

بسمل الہ آبادی

[جناب خاں صاحب محمود علی خاں عرف آغا علی خاں ازیری اسپیشل مجسٹریٹ]

منشی سکھدیو پرشاد صاحب تخلص بسمل خلف منشی بشیشر دیال صاحب ۱۱ نومبر ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ ذی عزت سریواستو کائستھ خاندان سے ہیں۔ مکتب میں پڑھنے کے بعد انگریزی کی تعلیم کائستھ پاٹ شالا و ماڈرن ہائی اسکول الہ آباد میں حاصل کی۔ قدرت نے چونکہ آپ کی فطرت میں مادہ شاعری بہ درجہ اتم ودیعت فرمایا تھا اس لئے بچپن ہی سے آپ نے شعر کہنا شروع کر دیا۔ آپ کے چچا بابو اننت لال صاحب وکیل نے جب ان کا رجحان طبیعت شاعری کی طرف پایا تو اپنے ہونہار بھتیجے کو ہدایت کی کہ فصیح العصر ناخدائے سخن حضرت نوح رئیس قصبہ نارہ ضلع الہ آباد جانشین حضرت داغ مرحوم سے اپنے کلام کی اصلاح لیا کریں۔ سعادت مند بھتیجے نے اس کی تعمیل کی۔ اور ۲۵ دسمبر ۱۹۱۸ء سے اپنے کلام کی اصلاح لینی شروع کی۔ یوں تو حضرت نوح کے صدہا شاگرد ہندوستان کے اکثر شہروں میں ہیں۔ مگر حضرت نوح کو جو محبت اپنے اس ہونہار شاگرد سے ہے وہ کسی سے نہیں ہے جس کا اظہار خود حضرت نوح نے مختلف مواقع پر مشاعروں میں اس طرح پر کیا ہے۔

پہونچا ہوں بڑی دقت و دشواری سے ؛ اٹھا ہوں ابھی بستر بیماری سے
بسمل کی ضیافت کا خیال آ ہی گیا ؛ مجبور تھا اس گھر کی نمک خواری سے

—•—

بسمل میں سعادت بھی محبت بھی ہے ؛ بسمل میں نجابت بھی شرافت بھی ہے
اے نوح وہ لکھتے ہیں بہت خوب اشعار ؛ سب کچھ ہے جہاں حسن طبیعت بھی ہے

—•—

میں داد سخن سب سے سوا دیتا ہوں ؛ انعام زمانے سے جدا دیتا ہوں
اللہ کرے خوش رہیں آباد رہیں ؛ اے نوح یہ بسمل کو دعا دیتا ہوں

جناب بسمل کو بھی اس قدر عقیدت اور محبت اپنے استاد سے ہے کہ وہ اُن کے آستانے پر جا کر اکثر رہتے ہیں اور بعض حالتوں میں اس سے زیادہ عرصہ تک حاضر رہ کر خدمت کرنا اپنی زندگی کا محض ضروری فرض ہی نہیں سمجھتے ہیں بلکہ وہ مثل عبادت کے ایک ضروری فرض سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح نے بھی اپنے قابل اور ذہین شاگرد کے مدارج شاعری کو اس قدر جلد آگے بڑھایا ہے جس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ جناب بسمل بھی اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار ہمیشہ ہر مشاعرے میں اس طرح سے کیا کرتے ہیں کہ قبل غزل پڑھنے کے ایک رباعی اپنے استاد کی مدح میں پڑھنا آپ کا فرض شاعری ہے اگر بانی مشاعرہ رباعی پڑھنے کو منع کرے تو وہ غزل ہی نہیں پڑھتے ہیں۔ جناب بسمل چونکہ فطری شاعر ہیں اس لئے انھوں نے بہت جلد ترقی کی ہے اور ملک میں کلام اتنا مقبول ہوا ہے کہ ہندوستان کے صدہا اردو اور ہندی رسالوں اور اخبارات میں آپ کا کلام شائع ہوا کرتا ہے شاعری کا اس قدر ذوق ہے کہ فرائض حیات کی طرح آپ کا بیشتر حصہ زندگی کا شعر و شاعری کی دلچسپیوں میں بسر ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں ممدوح کے ہر قسم کے کلام کا مختصر نمونہ ہدیہ ناظرین کروں۔ یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ مختصر سی تمہید فطری اور غیر فطری

شاعری کی عرض کروں اور یہ بھی کہ شعر کی تعریف کیا ہے میں اس مسئلہ میں عام اصول کے مطابق رعب قائم کرنے کے لئے یورپ اور ایشیا کے کسی ایک مقتدر ادبی ہستی کا بھی کوئی قول درج نہ کروں گا جو بالعموم ایسے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے بلکہ میں اُن اثرات کا اظہار کروں گا جو میرے تخئیل اور دماغ پر براہ راست شاعری سے پڑے ہیں شعر اور شعریت کی مختصر تعریف میں یہ سمجھا ہوں کہ کسی جذبہ انسانی کی صحیح ترجمانی یا فطرت کے کسی پہلو کی تصویر موسیقیت کے لباس میں کرنا، اس بات سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ جذبات انسانی کی ترجمانی یا فطرت کے ہر پہلو کی تصویر نثر میں ہی ہو سکتی ہے ایسی حالت میں یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ پھر ان کے مسائل کے ہوتے ہوئے نظم کی ضرورت کیوں واقع ہوئی وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر جذبہ انسانی میں ایک کیف ہوتا ہے اسی طرح فطرت کے کسی پہلو کو نمایاں کرنے میں اگر تخئیل پر ایک ارتعاشی کیفیت پیدا نہ ہوئی تو اس وقت تک وہ احساس انسانی کے لئے بیکار چیز ہے۔ اسی لئے ان مسائل کے لئے نظم کی ضرورت تمام دنیائے ادب کو محسوس ہوئی اب رہا یہ مسئلہ کہ نظم کی شعریت یا موسیقیت کیا چیز ہے اس کو میں دو تمثیل سے واضح کرنے کی سعی کروں گا۔ مثلاً رباب کے سب تار اگر اپنے صحیح اور موزوں موقع اور محل پر نہ ہوں تو بھی کچھ نہ کچھ نغمہ نما آواز ضرور نکل سکتی ہے مگر وہ سامعہ نواز نہ ہوگی اور اگر سب تار اپنے صحیح اور موزوں موقع اور محل پر ہوں اور اسوقت رباب نواز اُسے بجائے تو اس میں سے ایسا نغمہ دل نواز نکلے گا۔ جس سے ہستی انسانی کی تمام کیفیاتی برقی لہریں تھرتھرا اُٹھیں گی اسی طرح سے فطری شاعر کی طبیعت کسی جذبہ انسانی کے اظہار کے وقت شعر میں ایسے موزوں اور مناسب الفاظ اکٹھا کر دیتی ہے جس سے شعر میں موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ کوئی فطری مصور جب تصویر میں نیچر کے کسی حصہ کو ابھارنا چاہتا ہے تو وہ اس کو اپنے تخئیل کے سامنے رکھ کر قلم کو جنبش دیتا ہے اور قلم ایک اضطراری حالت میں اپنا کام کرتا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فطری مصور کی مصورانہ وجدانی کیفیت قلم کے ذریعہ سے تصویر میں جذب ہوتی جاتی ہے اور بالآخر تکمیل کے وقت تصویر کے سطح پر نمایاں ہو جاتی ہے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ خود مصور بعض وقت یہ نہیں سمجھتا کہ میں نے اس تصویر کو اس طرح کیونکر بنا دیا حالانکہ اُسی کے ہاتھ کی تصویر بنائی ہوئی ہوتی ہے بعینہ یہی حالت شاعری کی ہے۔ فطری شاعر کے طبیعت سے بعض اوقات ایسے اشعار نکل آتے ہیں جن کو دیکھ کر خود وہ متعجب ہوا کرتا ہے کہ یہ اشعار مجھ سے کیوں کر ہو گئے ہر خیال کے نظم کرنے کو تو ہر شاعر نظم کر سکتا ہے مگر جسے شعریت کہتے ہیں وہ ہر شاعر اپنے شعر میں پیدا نہیں کر سکتا۔ شعریت جسے دوسرے لفظوں میں موسیقیت کہتے ہیں وہ فطری شاعر بھی اپنے شعر میں پیدا کر سکتا ہے یہ ضرور ہے کہ شاعری کے لئے زبان کی صفائی اور بندش کی چستی بھی ایک ضروری عنصر شاعری کے ہیں مگر اُس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ الفاظ کے گورکھ دھندوں میں مفہوم کو پھنسا دیا جائے یا بجائے فصیح اور عام فہم ہونے کے شعر کو بھول بھلیاں بنا دیا جائے اس بات کی کوشش کرنا دلفریب اور خوش الفاظ اکٹھا کر دینے سے کچھ نہ کچھ معنی اس سے ضرور نکل آئیں گے حقیقت میں شاعری کے اصلی مقصد کو فوت کرتا ہے بلا ضرورت فارسی ترکیبوں کا استعمال کرنا اس لئے کہ اس کا دیکھنے یا سننے والا مرعوب ہو جائے یہ محض شاعری کی ذلت ہے بلکہ اُردو ادب کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ہاں اگر خوش نوا یا دل آویز فارسی کی ترکیب صحیح موقع اور محل سے استعمال کی جائے تو نہ محض شعر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے بلکہ شعر کی موسیقیت بڑھ جاتی ہے مگر اس کے محل اور موقع کی دیکھنے کے لئے بھی فطری شاعر کے آنکھ کی ضرورت ہے

مثال اس کی اس طرح سے ہو سکتی ہے کہ نگینوں کا جڑنے والا جو اس فن کا ماہر ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ کون نگینہ مجھے کہاں پر جڑنا چاہیئے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کس رنگ کا اور کس قدر کا نگینہ کہاں پر موزوں ہوگا اس کے خلاف ایک نگینہ بھی نامناسب جگہ پر ہو گیا تو اس سے تمام حسن زیور کا گھٹ جاتا ہے جناب جوش ملیح آبادی کی نظم کا ایک شعر مجھے یاد ہے ملاحظہ فرمائیے۔

پھر گھنے جنگل میں چھیڑا مست چرواہے نے راگ
پھر صدائے بربط و چنگ و رباب آنے لگی

بظاہر نظم کے لئے جنگل کا لفظ نغمہ ساز نہیں معلوم ہوتا ہے مگر اس فطری شاعر کی طبیعت نے اس جگہ کے لئے اسی لفظ کو موزوں سمجھا غور فرمائیے کہ اس لفظ نے شعر کی موسیقیت میں کتنا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کہ اُردو شاعری میں فارسی کی ترکیبیں بالکل استعمال نہ کی جائیں یا بھاشا کا کوئی لفظ آنے نہ پائے حقیقت تو یہ ہے کہ اردو کی ہمہ گیر جامعیت اور اس کی مقناطیسیت اور شیرینیت مختلف زبانوں کے خوش نوا اور خوش نما الفاظ ہی نے پیدا کر دی ہے اب رہا لفظوں کا استعمال اس کے لئے صحیح مذاق ادب کی ضرورت ہے شعر تو بہت بلند چیز ہے نثر تک میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر لفظ موقع اور محل کے لحاظ سے استعمال کیا جائے تاکہ دیکھنے اور سننے میں اس جگہ کریہہ اور ثقیل نہ معلوم ہو۔ شعر کے لئے اس قسم کی قید لگانا حقیقت میں اُردو شاعری کو تباہ کرنا ہے (اوس) اور (شبنم) اردو اور فارسی کے ہم معنی الفاظ ہیں جہاں پر اس کا لفظ شعر میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے شاعر اس کو رکھتا ہے جہاں پر شبنم کے لفظ کی ضرورت ہوتی ہے شبنم رکھتا ہے ہندوستان کا مایہ ناز اُردو کا شاعر جس کو ہندوستان کا شیکسپیر کہنا بے جا نہ ہوگا۔ یعنی جناب میر انیس صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنان کے ذیل کے دو مصرعوں سے میرا مقصد بخوبی واضح ہو جائے گا۔

(۱) "کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا"
(۲) "شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے"

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ محض مشق سخن شاعری کے حقیقی مدارج کو بلند کر دیتی ہے مجھے معاف کیا جائے اگر میں صاف لفظوں میں یہ کہوں کہ اکثر صاحب دیوان ایسے شاعر گزرے ہیں جن کا مرتبہ فن کے لحاظ سے تو بہت بلند ہے مگر ان کو شاعر کہنا حقیقت میں شاعری پر ظلم کرنا ہے۔ تمام عمر اُن کی مشق سخن میں گذری علم عروض اور معنی و بیان کے مسلم الثبوت عالم تھے مگر اُن کے دیوان سے مشکل سے دس بیس اشعار آپ ایسے نکال سکتے ہیں جن میں اتفاقیہ طور پر کچھ شعریت داخل ہو گئی ہو۔ ہاں آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ شعروں کی بندشیں بہت چست ہیں زبان اور محاورہ میں کوئی نقص نہیں ہے علم عروض کی غلطیوں سے پاک و صاف ہیں معنویت بلند ہے مگر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان اشعار میں شعریت یا موسیقیت بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ ہونی چاہئے۔

جناب بسمل کے کلام میں بیشتر اشعار آپ ایسے پائیں گے جن میں شعریت بدرجہ اتم موجود ہے۔ مختلف اصناف سخن پر بسمل نے طبع آزمائی کی ہے اس مقام پر کچھ کلام ضمناً پیش کرتا ہوں جن سے آپ کو اس بات کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ممدوح کو ہر قسم کی نظموں پر قدرت ہے میں یہ مناسب نہیں سمجھتا ہوں کہ ہر شعر کی توضیح کر کے عام اصول کے مطابق درس شعر دوں۔ جناب بسمل کا کلام اتنا عام فہم اور فصیح ہے کہ غیر شاعر بھی اس کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے اب رہی اس کی شعریت یا موسیقیت اس کو بھی ہر مذاق سلیم رکھنے والا ہر شعر سے اس کی شعریت کا اپنے مذاق طبیعت کے مطابق لطف حاصل کرے گا۔

سری کرشن اور جمنا کے متعلق جو مسدس ہیں۔ ان کے دو دو بند ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

مسدس سری کرشن

رات بھادوں کی اندھیری تھی گھٹا چھائی تھی ٭ مژدۂ عیش و خوشی ساتھ لگا لائی تھی
کھلنے والی کلی دل کی نہیں مرجھائی تھی ٭ کنس کی موت اسی پردے میں چھپی آئی تھی
لیا متھرا میں جنم جا کے رہا گوکل میں
پاؤں کے رکھتے ہی امرت ملا جمنا جل میں

وہ کنھیا وہ مرے دل کا لبھانے والا ٭ وہ زمانے میں نئے روپ سے آنے والا
وہ بھجن نغمۂ اسم بتانے والا ٭ وہ بڑے پریم سے بنسی کا بجانے والا
جلوۂ نور ازل عالم تنویر میں تھا
یعنی جو کچھ بھی تھا اس خاک کی تعمیر میں تھا

مسدس جمنا

مٹ گیا لطف ترا چھن گیا گہنا تیرا ٭ جب کنھیا نہیں بے لطف ہے رہنا تیرا
غم اٹھانا ستم و جور کو سہنا تیرا ٭ پانی ہو ہو کے شب و روز یہ بہنا تیرا
آتش ہجر کچھ اس درجہ لگی ہے تن میں
دل نہ متھرا میں بہلتا ہے نہ بندرابن میں

سادی سادی ہے روش وضع ہے بھولی بھالی ٭ ہے روانی بھی غضب چال بھی ہے متوالی
تیلی موجوں سے لپیٹے ہوئے زلفیں کالی ٭ حسن و آرائش و زینت سے بڑھی خوشحالی
اللہ اللہ رے اس ناز و ادا کی ہستی
تیرے آگے نہیں کچھ آب لقا کی ہستی

حضرت بسمل نے رباعیات بھی کہی ہیں چند رباعیاں پیش کرتا ہوں مضمون و طرز ادا دیکھئے قابل داد ہیں۔

(رباعیات)

ایک ایک سے کہتی ہے زبان ہستی ٭ بے کار ہیں سب نام و نشان ہستی
سودا نہ ہو سودا نہ کرو اے بسمل ٭ بڑھ جائے گی اک روز دکان ہستی

جاتا ہے بہت جلد شباب ہستی ٭ موت آ کر الٹتی ہے نقاب ہستی
مے خانۂ دنیا میں سنبھل اے بسمل ٭ بدمست نہ ہو پی کے شراب ہستی

پایا نہ کسی نے بھی سراغ ہستی ٭ دنیا نے پیا بھر کے ایاغ ہستی
جھونکا جو کبھی موت کا آیا بسمل ٭ گل ہو گیا دم بھر میں چراغ ہستی

رنگ تغزل

پردۂ عالم کو صوت حق سے کتنا ساز ہے ٭ اس سرے سے اس سرے تک ایک ہی آواز ہے
پردۂ انسان میں پوشیدہ خدا کا راز ہے ٭ مختلف ہے شکل سب کی مختلف آواز ہے

تم کو یہ ہے اگر یقین دل میں وہ جلوہ گر نہیں ٭ ڈھونڈھا کرو تمام عمر ملنے کا عمر بھر نہیں
آئے نہ آئے بے خبر کیا تجھے یہ خبر نہیں ٭ سانس کا اعتبار کیا شام ہے تو سحر نہیں

ہے قضا نزدیک میں کیا شاکی صیاد ہوں ٭ رات بھر کی ہے اسیری صبح کو آزاد ہوں

پھول کے بدلے چڑھا جاتے ہیں اہل وحشت ٭ دھجیاں تربت مجنوں پہ گریبانوں کی

آہ سے دل کا داغ جلتا ہے ٭ یہ ہوا میں چراغ جلتا ہے
خود بہ خود دل کا داغ جلتا ہے ٭ بے جلائے چراغ جلتا ہے
خانۂ دل میں داغ جلتا ہے ٭ بند گھر میں چراغ جلتا ہے
مر رہے ہیں پتنگے جل جل کر ٭ اسی گھر میں چراغ جلتا ہے
دل میں ہے یاد روئے جاناں کی ٭ آئینہ میں چراغ جلتا ہے
بے کسی ہے غضب کی مدفن پر ٭ جھلملا کر چراغ جلتا ہے

اور دریائے محبت میں تلاطم بڑھ گیا ۔ جب ملاخوان سر فرہاد جوئے شیر میں

تم ہو جب تقدیر میں تقدیر بھی تقدیر ہے ۔ تم نہیں تقدیر میں تو کچھ نہیں تقدیر میں

— • —

مجھے ہے واسطہ دیر و حرم دونوں سے اے بسمل

کہ میں ہندو ہوں ہندو میں مسلماں ہوں مسلماں میں

— • —

نرالے اک تماشے ہند و نظر آئے زمانے میں ۔ بتوں کے سامنے بسمل قسم کھاتے ہو قرآں کی

— • —

آئینہ دیکھتے ہو جو تن تن کے بار بار ۔ دیکھو سما نہ جاؤ تم اپنی نگاہ میں

— • —

اس کی خبر نہیں کہ ارادے کہاں کے ہیں ۔ ہم ساتھ ساتھ توسن عمر رواں کے ہیں

مشتاق ہم بھی جلوہ کون و مکاں کے ہیں ۔ پردے ذرا اٹھا دو یہ پردے کہاں کے ہیں

— • —

جو بے رخی کبھی ہی رخ یونہیں چھپایا تھا ۔ مرے خیال میں بھی آپ کو نہ آنا تھا

نہاں ہے خاک کے ذروں میں جلوۂ قدرت ۔ بشر بنا کر اُسے اپنے کو دکھانا تھا

— • —

میں کیوں اسے تسلیم کروں پردہ نشیں ہے ۔ پردے کا تو ہے نام وہ پردے میں نہیں ہے

یوں پردے میں پوشیدہ کوئی پردہ نشیں ہے ۔ ہوتا نہیں معلوم مجھے ہے کہ نہیں ہے

— • —

ایک عالم پہ رہ نہیں سکتا ۔ گردش روزگار کا عالم

ناامیدی بھی دیکھ لے آکر ۔ دل اُمیدوار کا عالم

— • —

مخالف کیا ہوا لے دے کے تنہا باغباں میرا ۔ لئے پھرتی ہے بجلی گود میں اب آشیاں میرا

— • —

مزا تھا ہم یوں ہی تکمیل آرزو کرتے ۔ تری تلاش میں اپنی بھی جستجو کرتے

ظریفانہ کلام

بیکار یہ رونا ہے چندہ نہیں ملتا ۔ کیا اس کے سوا کوئی دھندہ نہیں ملتا

کیا دیکھ سکے جلوہ محدود نظر بسمل ۔ اللہ تو ملتا ہے بندہ نہیں ملتا

— • —

اس وہم اس خیال میں پڑنا فضول ہے ۔ سرکار کے خلاف اکڑنا فضول ہے

دنیا سے جھک کے حضرت بسمل ملا کرو ۔ دو دن کی زندگی پر اکڑنا فضول ہے

— • —

آج کل بدلا ہوا مضمون ہے ۔ ہر قدم پر اک نیا قانون ہے

کیا لکھیں مضمون یہ مضمون ہے ۔ نقطے نقطے کے لئے قانون ہے

— • —

بن سے نفرت اور حسرت پاپ کی ۔ خیر پبلک کیا منائے آپ کی

اب کے لڑکے کچھ سمجھتے ہی نہیں ۔ آبرو جاتی رہی ماں باپ کی

— • —

وقت آخر جان ہے کس صدمۂ جانکاہ میں ۔ ریل یا موٹر نہیں ملتی عدم کی راہ میں

— • —

وہ فرماتے ہیں تجھ کو رنگ ہی لانا نہیں آتا ۔ ڈنر میں ساتھ سب کے بیٹھ کر کھانا نہیں آتا

اب اس کی بحث ہی کیا ہے ندوۂ میں ہم جائیں ۔ انھیں آنا نہیں آتا ہمیں جانا نہیں آتا

— • —

کثرت غم میں بھی چہرے پہ بحالی چاہیئے ۔ سامنے نظروں کے تصویر خیالی چاہیئے

پڑھئے لیڈر میں یہ منشی جی کا اک کلام ہے چھا ۔ یا مُطر شالہ کے لئے امداد مالی چاہیئے

— • —

یہ عالم دیکھ کر دم گھٹ رہا ہے ۔ کرفیشن میں خزانہ لٹ رہا ہے

پسے ہیں اس طرح قانون سے ہم ۔ سڑک پر جیسے کنکر کٹ رہا ہے

— • —

ہندو بھی مسلماں بھی رستے سے بھٹک کر ۔ میدان ترقی کی سڑک کوٹ رہے ہیں

آپس کی لڑائی سے ہوا نفع یہ بسملؔ ٭ رشتے جو محبت کے تھے وہ ٹوٹ رہے ہیں

دعوت تو ہیں ہزار مگر کون کوئی نہیں ٭ بے سُرے گیت گاتے ہیں وہ دھن کوئی نہیں

آخر میں اُردو کے متعلق جو محض فارسی رسم الخط ہونے کی وجہ سے غلط فہمیوں کی آماجگاہ ہو گئی ہے۔ چند باتیں پیش نظر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ تھی کہ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی یہیں اس کی نشوونما ہوئی اسی مادر ہند کی آغوش میں پروان چڑھی ہندوستان کے دونوں فرزند یعنی ہندو اور مسلمان نے اس کی جسمانی اور روحانی ارتقا کو بلند کر کے اُسے آج اس قابل کر دیا ہے کہ دنیا کی اور قومیں اس کو اپنی آنکھوں میں جگہ دینے کو تیار ہیں۔ اُردو کے نشوونما میں اگر ہمارے ہندو بھائی امداد نہ کرتے تو آج اس کو یہ عروج جو حاصل ہوا ہے دشوار ہو جاتا صد ہزار تحسین اور آفرین کے قابل ہیں ملک کی وہ زمانہ شناس ہندو ہستیاں جنھوں نے پہلے ہی سے یہ سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں سے معاشرتی اور علمی اتحاد اسی وقت ہو سکتا ہے جب اُن کے تہذیب اور تمدن میں اشتراک عمل پیدا کیا جائے اور یہی وجہ ہے کہ علاوہ لباس اور غذا کے اتحاد کے زبان میں بھی اتحاد پیدا کرنا ضروری سمجھا۔ یوں تو کم و بیش ہندوستان کے ہر قوم کے افراد نے کچھ نہ کچھ اس زبان کی خدمت کی ہے۔ کشمیری برہمنوں اور کالستھ صاحبوں نے جس محبت اور خلوص کے ساتھ اس کی نشوونما میں امداد کی ہے اس کو یہ قیامت تک بھول نہیں سکتی

اُردو ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں بولی اور سمجھی جاتی ہے عالم کے تمام ممالک اسلامیہ میں سے نہ تو کسی ملک میں یہ زبان بولی جاتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کو اپنی قومی زبان نہیں سمجھتے ہیں ورنہ وہ مثل عربی کے اس زبان کو بھی حاصل کرنا ضروری سمجھتے محض فارسی رسم الخط کی وجہ سے بعض حضرات کا اس کو اسلامی زبان سمجھنا اس بات کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ہر ہندو اور مسلمان کو فخر کرنا چاہیئے کہ ہم نے ایک ایسی زبان ایجاد کی ہے جس کی حلاوت اور موسیقیت کا یہ عالم ہے کہ یہ محض ہندوستان کی کل قومیں اس کی گرویدہ ہیں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی اس کی قدر بڑھ رہی ہے۔ ہندوستان میں جو ہر دلعزیزی اس کو حاصل ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ باوجودیکہ پنجابیوں کی مادری زبان پنجابی ہے مگر جس قدر پنجاب میں تصنیف اور تالیف ہو رہی ہے وہ زیادہ تر اردو زبان میں ہوتی ہے گو کہ گھر میں اپنے وہ گھریلو زندگی کی وجہ سے پنجابی زبان بولنے پر مجبور ہوتے ہیں مگر جب کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کرتے ہیں یا کوئی رسالہ یا اخبار جاری کرتے ہیں تو اردو زبان ہی میں جاری کرتے ہیں۔ ہمارے ہندو بھائیوں کو اس وجہ سے بھی خوش ہونا چاہیئے کہ ملک کی دو بڑی قوموں کی اتحاد معاشرت اور اتحاد زبان کی یہ ایک زندہ جاوید یادگار ہے ہم لوگ جو ممالک متحدہ میں رہتے ہیں اس زبان کی دلکشی کو اتنا محسوس نہیں کرتے جتنا کہ اور صوبے کے حضرات کرتے ہیں کیونکہ اپنے گھر کی چیز کو انسان ہر وقت دیکھتے دیکھتے اتنا سیدھا ہو جاتا ہے کہ جتنی قدر اس کو کرنا چاہیئے اتنی وہ نہیں کر سکتا۔ جسطرح پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار جناب چکبست منشی نوبت رائے صاحب نظرؔ جناب سرور جہان آبادی وغیرہ وغیرہ کے احسانات کو اردو زبان کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس طرح جناب مہرؔ بسملؔ صاحب اور گلشنؔ صاحب وغیرہ وغیرہ کے نام بھی جو اس نونہال کو اپنی آغوش عاطفت میں لے کر اس کو ارتقائی منازل طے کرا رہے ہیں اردو کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جائیں گے ہر فرد قوم کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ باوجودیکہ دو قوموں کا اتحاد محض لفظوں کے گھروندں یا دل آویز تقریروں سے گو کہ

دہندوں سے نہیں ہو سکتا ہے بلکہ عمل اور اشتراک عمل سے ہو سکتا ہے۔

ایڈیٹر گنج

(خاص)

[گھر کا بھیدی]

لندن میں ایک سڑک ہے اس کا نام ہے فلیٹ سٹریٹ۔

اس سڑک پر جو مردرحرف پریس والوں کی بستی ہے ایڈیٹر۔ جوائنٹ ایڈیٹر۔ سب ایڈیٹر۔ ناشر۔ طابع۔ منیجر۔ منشی۔ خزانچی بس انھیں کے دفتر ہیں اور مختلف دارالاشاعت ہندوستان میں جواہر بازار جوہری ٹولہ۔ قاضیانہ۔ مولودیانہ۔ صرافہ، بزازہ۔ کیتھانہ۔ چمروٹی سب کچھ موجود ہے۔ مگر بمبئی۔ کلکتہ۔ لاہور۔ حیدرآباد۔ کراچی۔ اور دہلی ایسے شہروں میں بھی ایڈیٹر ٹولہ یا ایڈیٹر گنج کہیں نہیں ہے جس طرح ۱۹۱۰ء میں الہ آباد میں ایک بہت بڑی نمائش ہوئی اور دو ڈھائی مہینہ کیلئے قلعہ کے میدان میں ایک نیا عالم بس کر اجڑ گیا اسی طرح چاند کی انوکھی اور اچھوتی چاندنی میں آئے اور میرے ساتھ ایک خیالی ایڈیٹر گنج کی سیر کیجئے۔ مضمون ختم کرکے سب بھول جائے گا۔ "کانا رہے کھوج جائے" کی تو اور بات ہے نہیں تو چاند کے بسائے ہوئے ایڈیٹر گنج کا پتہ وہم و خیال کے عالم کو چھوڑ کر اور کہیں نہیں مل سکتا یہ دوسری شکل ہے کہ خیال مادہ ہی کا عکس ہوا کرتا ہے۔

ایڈیٹر نمبر میں بھائی برادری کا مجمع ہے خوب گھل مل کے باتیں ہونی چاہئے۔ اب تو نہیں ہوں آج سے چار برس پہلے میں بھی ایک ماہوار رسالہ کا نائب مدیر تھا۔ اگر کوئی جملہ کسی مدیر صاحب کے خلاف مزاج ہو تو یہ سمجھ لیں کہ آخر کہنے والا بھی تو اسی بستی کا رہنے والا ہے۔

ہمارے ایڈیٹر گنج میں صرف ماہواری رسائل کے ایڈیٹر رہتے ہیں۔ بس اور کوئی نہیں۔ اور اس وقت ہم آپ کا تعارف صرف چند ایڈیٹروں سے کرانا چاہتے ہیں جو اپنے اپنے طبقہ کے بہترین نمائندہ ہیں۔

نمبر ایک (فیشنیبل ایڈیٹر)

رسالہ کا دفتر نہایت باقاعدہ سجا ہوا ہے۔ الماریوں میں بہت سے رسائل کے فائل باقاعدہ رکھے ہیں۔ میز پر صد ہا سادے اور لکھے ہوئے کاغذ تتر بتر ہیں۔ ٹوٹ کی گھومنے والی گول کرسی پر مسٹر اکس اکڑے ہوئے بیٹھے ہیں۔ قلمدان پر سیاہی اور سرخی کے قلم ربر۔ جاذب کے دستے اور بہت سی پنسلیں رکھی ہوئی ہیں۔ طرح طرح کی روشنائیوں کی دواتیں جلوہ گر ہیں۔ بڑے میز کے دونوں پہلوؤں پر ایک ایک چھوٹا میز ہے جس کے سامنے دو نائب سب ایڈیٹر اپنے اپنے کام میں جی توڑ کر لگے ہوئے ہیں کہ انھیں اپنے گرد و پیش کی بھی خبر نہیں ہے۔

ایڈیٹر صاحب (پنسل سے دانتوں پر باجہ بجاتے ہوئے، آپ لوگ بہت سست کام کرتے ہیں۔ مجھے صرف ایک رسالہ ہی کا کام تو ہے نہیں۔ ادھر طبیعت بھی اچھی نہ تھی۔ دیکھئے میرے نام سے جو پرچہ نکلے۔ وہ ایسی ہو کہ اس پر کوئی انگلی نہ رکھ سکے اس مہینہ میں مجھکو شذرات کے علاوہ باب انتقاد۔ باب رسائل۔ اور سوال و جواب سبھی کچھ لکھنا تھا آج ۱۰ ہوگئی پرچہ تیار ہے ۴۸ صفحے مکمل ہیں۔ صرف ۱۶ صفحات کی کمی ہے اور آپ کے قلم کو جنبش بھی نہیں ہوتی۔

ایک سب ایڈیٹر۔ آپ خود ملاحظہ فرمالیجئے کہ ہم لوگ کتنی تیزی سے کام کرتے ہیں۔

ایڈیٹر۔ خیر شذرات کے چار صفحے تو آپ میرے ذمہ رہنے دیجئے۔ مولوی الف صاحب اور پنڈت کاف صاحب کے لکھے ہوئے شذرات کے وی۔ پی اس ڈاک سے آتے ہونگے پھر جب

روپیہ دیدیا تو مال ہمارا ہے جو چاہیں وہ کریں میں خود ملکی مسائل پر اور علمی مباحث پر نہایت اعلیٰ درجہ کے نوٹ لکھ سکتا ہوں مگر کیا کروں ایک تو افکار میں مبتلا رہتا ہوں دوسرے ہندوستان کی فضا ایسی خراب ہے کہ لوگ محض نکتہ چینی پر آمادہ رہتے ہیں پچھلے مہینہ میں لئے دو تین چار سطر لکھی تھی ڈیڑھ دو سو خطوط اعتراض کے آگئے۔ خبر غلط۔ املا غلط۔ انشا غلط۔ ترکیب غلط۔ زبان غلط۔ حرف غلط۔ نو غلط، جتنے نقطے نہ تھے۔ اتنی غلطیاں دکھائی گئیں۔ (بائیں طرف مڑ کر) اچھا آپ کیا کر رہے ہیں؟

دوسرے سب ایڈیٹر۔ انتقاد والا مضمون درست کر رہا ہوں ہر سطر میں زبان اور رابط سے قطع نظر املا کی بہت سی غلطیاں ہیں۔

ایڈیٹر۔ جیسے۔

سب ایڈیٹر۔ انتقاد ط سے لکھا ہے مورس ث سے سحافت س سے ظخامت ظ سے ضمن ص سے۔

ایڈیٹر (دیدہ دلیری سے، اپنے بھانجہ سے جلدی میں لکھوا دیا تھا پھر میں نے دیکھا بھی نہیں خدا جانے کیا کیا لکھ دیا۔ خیر ٹھیک کر دیجئے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اردو کا رسم الخط نہایت ہی برا ہے ایک آواز کے لئے ایک ہی حرف ہونا چاہئے یہ کیا کہ ص، س، ث اور ز، ذ، ض ظ سب کی آواز تو ایک مگر موقع مختلف۔

یہ کہہ کے ایڈیٹر صاحب پھر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ پندرہ منٹ تک قلم کو ہوا میں ہلاتے رہے۔ اور قلمدان سے کھیلتے رہے کبھی کبھی کچھ گنگنا دیتے تھے۔ اتنے میں ڈاک آئی۔ دو وی پی ملے باچھیں کھل گئیں۔ لفافے پھاڑ کر مضمون نکال لئے ایک سادے کاغذ پر لکھا شذرات۔ آلپین سے دونوں مضمون نتھی کر کے سب ایڈیٹر کو دیا۔ اکڑ کر اٹھے اور یہ کہہ کر چلدئے۔ بس میرا کام ختم ہو چکا اب آپ جانئے۔ پروف بھی دیکھ لیجئے گا۔ وہ کمرے سے باہر نکلے اُن کی توند ان سے پہلے گئی۔

دونوں سب ایڈیٹر دیر تک مسکراتے رہے کیوں؟

نمبر ۲ (پیدائشی ایڈیٹر)

اچھا آپ سے ملئے آپ کا نام ہے۔ پھول۔ آٹھ ہی برس کے سن سے آپ پر ایڈیٹری کا بھوت سوار ہوا ہے۔ کمسنی کی شادی روکنے کے لئے تو ساردا ایکٹ بن گیا مگر بچپنے کی ایڈیٹری کے انسداد کیلئے مجلس قانون ساز بھی خاموش ہے اگر بے جا شادی سے ایک خاندان تباہ ہوتا ہے تو بے جا ایڈیٹری سے سیکڑوں نسلیں برباد ہو جاتی ہیں اس وقت ہمارے ایڈیٹر صاحب کا سن اٹھارہ سے زیادہ نہ ہو گا۔ مگر ادب اور سائنس، حکمت اور فلسفہ معدنیات اور اکتشافات موسیقی اور مصوری وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ تمام دنیا کی چیزوں پر آپ قلم برداشتہ رسالے کے رسالے لکھ سکتے ہیں اور لکھتے ہیں رہا یہ کہ مضامین عجب کھلے ہوتے ہیں یا پھر تو با معنی ہوتے ہیں یا مہمل بیکوڑ ہوتے ہیں یا الٹے ہوتے یہ تو وہی جانیں جو جاننے والے ہیں ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہر ایک لاکھ میں جس میں وہ خود بھی شامل ہیں۔ $\frac{99999}{100000}$ انسان کچھ نہیں سمجھتے اور شاید وہ خود بھی نہ سمجھتے ہوں مگر لوگ تو شوکت پرست ہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس اور بجائے اس کے کہ اپنی لاعلمی بتائیں وہ تعریفیں کرتے ہیں کہ تو یہ بھلی —— ہمارے ایڈیٹر صاحب گھر سے بہت خوش ہیں باپ کر جو کچھ ملا تھا اس کا ۱/۲ حصہ برباد کر چکے ہیں اور دنیا کی ناپائیدار دوست لٹا کر جیتے جی زندہ جاوید بن گئے ہیں۔ اگر دوسرے گروروں ایڈیٹروں کی طرح زمانہ ان کے مرنے کے بعد ان کو دس برس کے اندر ہی بھلا دے تو مجبوری ہے۔

نمبر ۳ (طلسمی ایڈیٹر)

آپ سے ملئے۔ آپ ایڈیٹر ایاہیں۔ معجون مرکب ہیں۔ خود ہی

مشہر خود ہی ناشر۔ خود ہی ایڈیٹر۔ خود ہی منیجر۔ خود ہی مالک خود ہی ایجنٹ۔ آپ کا دفتر عجیب و غریب دفتر ہے۔ خوابگاہ۔ ردی خانہ۔ ڈاکخانہ۔ دفتری خانہ۔ نشست گاہ۔ لائبریری۔ دارالمطالعہ۔ ملاقاتی کمرہ۔ دارالاشاعت۔ دارالتصنیف و تالیف۔ ایک ہی کمرہ ہے اور اس سے اتنے کمروں کے کام لئے جاتے ہیں میرے خیال میں دنیا کے بہترین اقتصادی بھی ایک کمرہ سے اتنا کام نہیں لے سکتے بیچارے کو تمام کام دیکھنے پڑتے ہیں فرصت نہیں ملتی پھر بھی۔ خاص ایڈیٹر کے قلم سے ہر مہینہ میں کم سے کم دس صفحات ضرور نکلتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو دنیا کیا کہے اور پھر ایڈیٹر جو کچھ لکھے وہ عام سطح سے بہت بلند اور اچھوتے جواہرات سے مالامال ہونا چاہئے۔ لہٰذا ذیل کے سرچشموں سے مدد لی جاتی ہے۔

(۱) نہایت غور و خوض سے آج ۱۹۳۰ء میں ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۷ء کے وہ پرچے دیکھے جاتے ہیں جن کے ایڈیٹر بھی آرام سے سو رہے ہیں۔ اور پرچے بھی کہیں اکا دکا ہوں تو ہوں ورنہ زمانہ کے بھنور میں پھنس کر ڈوب چکے ہیں پھر اب تو نہ پریس ایکٹ کی بندش ہو سکتی ہے نہ کوئی اخلاقی قید۔ جہاں سے جو چاہا نقل کر لیا۔ ربط ہو یا نہ ہو تک بیٹھے یا نہ بیٹھے لکھا اور جھٹ سے فہرست مضامین میں یا تو ایڈیٹر اور مدیر کا نام دیدیا یا صرف ـــــ لکیر کھینچ دی یا نقطے دیدئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۲) اردو رسائل کے پڑھنے والے اکثر وہی ہوتے ہیں جو اور کسی دوسری زبان سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ بس پھر کیا ہے انگریزی سے غلط سلط ترجمے کئے اور اپنے نام سے چھاپ دئے۔ لطف یہ کہ ہندی بھاشا سنسکرت لاطینی۔ فرانسیسی، انگریزی اطالی یونانی۔ امریکن۔ جاپانی چینی۔ ٹامل۔ ٹیلیگیلو۔ بنگلہ۔ فارسی۔ عربی۔ برمی اور ہزارہا دوسری زبانیں ایڈیٹر صاحب کی نوک زبان پر ہیں اور ہمہ دان بنے ہوئے ہیں۔

(۳) کسی ایسے غریب مضمون نگار کا مضمون جو ابھی نوآموز ہے جس کو دنیائے صحافت نہیں جانتی یا اچھی طرح نہیں پہچانتی اس کا کوئی مضمون کہیں سے نقل کر لیا اور آخر میں لکھ دیا کہ یہ مضمون میں نے آج سے دو سال پہلے لکھا تھا مگر بوجوہ ابتک نہیں چھپ سکا تھا آپ سمجھے یہ کیا ترکیب ہے؟ الٹا چور کو توالے ڈانٹے۔

نمبر ۴ (گویا ایڈیٹر)

آپ سے ملاقات کیجئے آپ اپنے زمانے کے بہترین شاعر بہترین نثار بہترین نقاد اور بہترین ایڈیٹر ہیں۔ ملک کے ہر گوشہ میں آپ کی جوانی آپ کی موسیقی آپ کی رسیلی آواز اور آپ کی نسائیت نوازی کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ اب جس مشاعرے کی خبر سنتے ہیں اپنا حق سمجھ کر فوراً تشریف لے جاتے ہیں۔ اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہر محفل کے بعد کم سے کم دو کوڑی خریدار بنا کر اٹھتے ہیں۔ پھر بقول طارموزی کے جیب میں بیاض فدوی چھپائے ہوئے ہر جگہ دعوت اور جہاد پر موجود۔ "ایک نظم میں بھی عرض کرتا ہوں"۔

نمبر ۵ (سیاسی ایڈیٹر)

آپ سے ملئے آپ اپنے وقت کے سب سے اچھے ایڈیٹر اور سب سے انوکھے ماہر سیاسیات ہیں۔ آپ کے لئے یہ کوئی بات ہی نہیں کہ اس نواب کے خلاف مضامین لکھے اس راجہ کی مذمت میں صفحے کالے کئے اور جب دربار میں بلائے گئے۔ منہ دکھائی ہوگئی تو چوتھی کی معصوم دلہن بنے ہوئے واپس آئے۔ اور آپ ہی اپنے تمام مضامین کی پوری تردید اس آن بان سے کرنے لگے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

یہ ایڈیٹر لیگ کا صرف ایک کونہ تھا۔ ورنہ اسمیں تو ایک دنیا آباد ہے۔ خیر پھر کبھی سہی چاند باقی رہے روشن رہے سیر ہو ہی جائیگی اب بتائیے آج لیگ زیادہ دلچسپ رہی یا لہذ بٹر لیگ

(خاص)

پیام اعظم

(ڈاکٹر اعظم کریوی سابق ایڈیٹر اکبر و طوفان الہ آباد)

غفلت میں دن کھونے والے ؛ اُٹھتے بیٹھتے رونے والے
ساری رات کے سونے والے ؛ او بیدار نہ ہونے والے
صبح ہوئی ہے اُٹھ متوالے
بڑھ گئے آگے جانے والے

ہائے تری یہ غفلت کب تک ؛ یہ عالم یہ صورت کب تک
اپنوں سے یہ نفرت کب تک ؛ غیروں سے یہ الفت کب تک
صبح ہوئی ہے اُٹھ متوالے
بڑھ گئے آگے جانے والے

صدمے سب ہیں دیکھے بھالے ؛ دیتے ہیں غم دینے والے
ہردم آہیں ہردم نالے ؛ پڑ گئے اب تو جان کے لالے
صبح ہوئی ہے اٹھ متوالے
بڑھ گئے آگے جانے والے

جان ہی لینے کو یہ اڑا ہے ؛ غیر کا جھنڈا گھر میں گڑا ہے
غفلت میں کیوں مست پڑا ہے ؛ دیکھ تو اٹھ کر کون کھڑا ہے
صبح ہوئی ہے اٹھ متوالے
بڑھ گئے آگے جانے والے

یورپ مالا مال ہوا ہے ؛ ہند میں اپنے کال ہوا ہے
کیسا وہ خوشحال ہوا ہے ؛ یہ ہی غلط کنگال ہوا ہے
صبح ہوئی ہے اُٹھ متوالے
بڑھ گئے آگے جانے والے

ہم نے سب کو دیکھا بھالا ؛ گوروں کا منہ ہو گیا کالا
سب کا ہے تیار رسالہ ؛ تو نے قدم گھر سے نہ نکالا
صبح ہوئی ہے اٹھ متوالے
بڑھ گئے آگے جانے والے

ہردم کیا روتا ہی رہے گا ؛ داغ جگر دھوتا ہی رہے گا
تخم الم بوتا ہی رہے گا ؛ عمر یوں ہی کھوتا ہی رہے گا
صبح ہوئی ہے اٹھ متوالے
بڑھ گئے آگے جانے والے

اعظمؔ اُٹھ تو آنکھ کھول اب ؛ اشکوں کو آنکھوں سے رول اب
نیت کیوں ہے ڈانواں ڈول اب ؛ بھارت ماتا کی جے بول اب
صبح ہوئی ہے اُٹھ متوالے
بڑھ گئے آگے جانے والے

(خاص)

میرا بائی

(جناب طالب الٰہ آبادی سابق ایڈیٹر الٰہ آباد)

چپ ہے تو کیوں مغنیہ پیت کے گیت گائے جا ٭ رکنے نہ پائیں انگلیاں ساز ابھی بجائے جا
دل کی تڑپ دکھائے جا من کی کتھا سنائے جا

نغموں سے گونج جائے آج ساری فضا مندر کی ٭ نالہ اٹھے یہ بس اُٹھے پالن ہار مندر کی
سجدوں کے چاند سے بڑھے اور ضیا مندر کی

پھول جو داغ دل کے ہیں گوندھ کے ہار رکھ دے ٭ گوہر اشک کی لڑی کر دے نثار دار دے
پیارے پتی کے پاؤں پر سارا سنگار وار دے

حسن و وفا کی مورتی دل کی گرہ کو کھول بھی ٭ لب ہیں ترازو سخن کو ہر نطق تول بھی
تجھ کو کرشن کی قسم کیوں ہے خموش بول بھی

کون ہے تیرے سامنے دیکھ رہی ہے تو جسے ٭ کھویا ہوا ہے کیا ترا ڈھونڈ رہی ہے تو جسے
ہے یہ ستارہ بے خطا بند نہ کر ابھی ات

آنکھ یہ کس سے لڑ گئی کیوں تو خموش ہو گئی ٭ کھو گئی کس کے دھیان میں تیری شبابہ کیا ہوئی
دیکھ تو مورتی ذرا رقص میں ہیں کرشن جی

خالی ہوا میں کون ہے کیوں ہے تری نظر جمی ٭ حسن و شباب و مال کی تجھ کو نہیں ہے کچھ کمی
آنکھ میں پھر ہے کیوں نمی بال میں کیوں ہے برہمی

محو ہے کس کی یاد میں اس کا پتہ بتا تو دے ٭ آئینہ وفا پہ آج ایک نئی جلا تو دے
خود ہی چلے وہ آئیں گے ساز ذرا بجا تو دے

دیکھ تو صبح کا سماں آج ہے کیا بہار پر ٭ جھک گئی ڈال ڈال ہے مست اپنی نئی نکھار پر
تار پہ انگلیاں تو پھر رکھی ہیں جو ستار پہ

دیکھ نئے طلوع رہی ہے آنکھ سو کے اٹھی ہے کائنات ٭ نسل قدیم کی دور دور سب تھک کے اٹھی ہے کائنات
پھر نئی شان سے جواں ہو کے اٹھی ہے کائنات

گردش روزگار کا تجھ پہ مگر اثر نہیں ٭ بھولی خبر کسی کی کیا اپنی بھی جب خبر نہیں
تیرے لئے جہان میں شام نہیں سحر نہیں

اپنے سہاگ کی قسم ساز کے تار چھیڑ دے ٭ زخمۂ آہ سے ذرا دل کا ستار چھیڑ دے
مست شباب چھیڑ دے مست بہار چھیڑ دے

لیٹے انگلیاں پھریں ساز کے تار تار پر ٭ ایک نئی جلا ہوئی صاعقۂ بہار پر
نغمے رواں دواں ہوئے چار طرف ستار پر

پنکھڑیاں گلاب کی بند جو تھیں وہ کھل گئیں ٭ ریخ و الم کی کلفتیں صفحۂ دل سے دھل گئیں
حسرتیں قلب زار کی نغموں کے ساتھ تل گئیں

روز ازل سے ہے بسا عشق مرے خمیر میں ٭ جلوہ فزا ہیں بس کرشن قلب میں اور ضمیر میں
مجھ سی فقیرنی نہیں یار گرہ اسیر میں

یاد پتی کی ہے ملال کوئی نہیں ہے دوسرا ٭ اُن کے سوا مجھے خیال کوئی نہیں ہے دوسرا
میرے تو گردھر گوپال کوئی نہیں ہے دوسرا

اور نہیں کوئی مرا پیارے پتی کرشن جی ٭ ہم پہ کرو ذرا دیا پیارے پتی کرشن جی
ہو گئے کس لئے خفا پیارے پتی کرشن جی

حسرت دل ہے بس یہی مجھ پہ ستم ہوا کریں ٭ راہ وفا سے پر قدم میرے نہ ایک چھٹ سکیں
دل میں بھی آپ ہی رہیں لب پہ بھی آپ ہی رہیں

سب یہی کہتے ہیں پتی کو یا خدا ہے دوسرا ٭ میں تو کرشن جی کی ہوں میرا پتی ہے خود خدا
اور کسی سے کام کیا اس کی ہوں میں وہ ہے مرا

ناچ رہے ہیں مور کیوں پھولوں میں کس کی ہے مہک ٭ دوبا میں کس کی ہے لہک سوجھ گئیں کسی کی جھلک
رنگ حنا ہے سرخ کیوں موتیوں میں ہے کیوں چمک

سب ہے پتی کا یہ جمال کوئی نہیں ہے دوسرا ٭ ہے وہی ایک باکمال کوئی نہیں ہے دوسرا
میرے تو گردھر گوپال کوئی نہیں ہے دوسرا (طالب)

الامان

ہندوستانی سماج کی نئے اصولوں پر تقسیم

[جناب فہیم الدین نوری اڈیٹر اخبار الامان دہلی]

حالات بآواز بلند بتلا رہے ہیں کہ آج ہندوستان کا کوئی ذمہ دار شخص ایسا نہیں ہے جو اپنے دل میں اس بات کی خواہش اور ولولہ نہ رکھتا ہو کہ ہندوستان غیر قوم کی محکومیت سے نجات پائے اور ہندوستانی خود اپنے ملک کا انتظام کریں یہ واقعہ تمام باخبر اور مہذب دنیا کو معلوم ہو گیا ہے یہاں تک کہ اب برطانیہ عظمیٰ کی مختلف سیاسی جماعتیں بھی محسوس کرنے لگی ہیں کہ ہندوستانی تا دیر لیت و لعل میں نہیں رکھے جا سکتے۔

(۲) لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک کسی ذمہ دار ہندوستانی نے اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ اگر واقعی ہم ہندوستان کو غیر قوم کی حکومت سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بلا شرکت غیرے اپنے ملک کی نظم حکومت اور ملکی مدافعت کی باگڈور اپنے ہاتھ میں لیں اور ہندوستان کو دور حاضرہ کی مہذب اقوام کی صف میں کھڑا کر دیں تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو سلف سپورٹنگ بنا دیں یعنی انہیں ایسی صلاحیت و طاقت پیدا کر دیں کہ وہ ہر اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائیں۔

(۳) یہ صلاحیت و طاقت ہماری عورتوں میں اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ :-

(الف) ان کو وہ تمام حقوق دیدئے جائیں جو ہم مردوں کو حاصل ہیں تاکہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے برابر حصہ لے سکیں

(ب) اور ان سے صاف لفظوں میں کہہ دیا جائے کہ تم کو اپنی تمام ضروریات زندگی خود پوری کرنی ہونگی اور تم بہ طور استحقاق کے ایک پیسہ کا بار اپنے شوہروں پر نہ ڈالوگی۔

یہاں یہ واضح رہنا چاہیئے کہ قدرت نے مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر آزاد پیدا کیا ہے چنانچہ مرد و عورت دونوں ہزاروں برس تک اسی قدرتی آزادی کی چھاؤں میں زندگی بسر کر چکے ہیں۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ مرد نے عورت کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالدیں اور رفتہ رفتہ اس کو اپنا پابند اور تابع فرمان بنا لیا۔ لیکن کل کی غلطی آج کی غلطی کو جائز نہیں بنا سکتی۔ پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ انسان نے اس قسم کی غلطیاں اس زمانہ میں کی تھیں جب دنیا اپنے دور ارتقا کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی۔ لیکن آج جبکہ عالم انسانیت اپنے عہد طفولیت سے ترقی کرتے کرتے عین شباب کے مرحلے پر پہنچ گئی ہے ہم کو چاہیئے کہ ایام جاہلیت کی ان بدعتوں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیں تاکہ انسان صحیح معنے میں انسان بنے اور دنیا عالم مثال کا نمونہ پیش کرے۔

اگر ہم ہندوستانیوں کے دل میں آزادی کا صحیح جذبہ موجزن ہے اور ہم اپنے پیدائشی حق آزادی کے سچے طالب بنے ہیں تو عورتوں کے معاملہ میں ہم کو "ہرچہ برخود مپسندی بردیگراں ہم مپسند" پر غور کرنا چاہیئے۔

اب تک ہماری عورتیں اپنی ضروریات و حوائج زندگی کا بار مردوں پر ڈالتی رہی ہیں۔ یہ عورتوں کی اس پابندی و غلامی کا نتیجہ ہے جس میں مرد نے عورت کو ہزاروں برس سے مبتلا کر رکھا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ نہ کسی مرد کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے پر اپنا بوجھ ڈالے۔ نہ کسی عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی دوسرے کے بل بوتے پر زندگی بسر کرے۔ عورت کے لئے یہ بات نہایت شرمناک ہے کہ وہ محض بیوی بننے کی بنا پر، جو مرد و عورت کا ایک فطری تعلق ہے۔ اپنے تئیں اس کا حقدار سمجھتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے روٹی کپڑے اور ضروریات زندگی کا کفیل ہو۔ اگر ہماری عورتیں اپنے عزت نفس اور احساس خودداری کو ذرہ بھر حرکت میں لائیں تو مجھے یقین ہے کہ خود اس بدعت کا جلد تر خاتمہ کر دینے کے لئے تیار ہو جائیں گی۔

(۴) قومی معماروں کا اولین فرض ہے کہ وہ قوم کے جسم کے ان معطل اعضاء میں حرکت پیدا کر دیں ان میں گرمی پیدا کریں۔ اور رفتہ رفتہ ان کو بروئے کار لے آئیں۔

ایک زمانہ میں ہندوؤں نے اپنی سماج کو برہمن چھتری ویش اور شودر پر تقسیم کیا تھا۔ لیکن آج ہندوستانیوں کو اسکی ضرورت ہے کہ وہ صرف دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں۔ جوانان ہند سپاہی بنیں اور خواتیں قوم سماج کے تمام دوسرے کاموں کی ذمہ داریاں اپنے شانوں پر اٹھائیں۔

جب تک یہ نہ ہوگا مرد اپنے اہل و عیال کی نگہداشت و پرورش کے وبال میں پھنسے رہیں گے اور قوم حقیقی قومی و ملکی خدمت کے لئے سو برس تک بھی تیار نہ ہوگی۔ (خاص)

صفحہ ۵۰۰ کا بقیہ

جب دیکھتے ہیں کسی طرح کام نہیں چلتا تو طعن و طنز سے کام لیتے ہیں۔

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں
میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

ذیل کا نقشہ کسی قسم کے جذبات کا حامل ہے آپ خود اندازہ لگائیے۔

مذہب چھوڑو ملت چھوڑو صورت بدلو، عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ

جب اس سے بھی کام نہیں نکلتا تو کہہ اٹھتے ہیں۔

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس سے کیا ہے کوئی جنٹ ہے کہ جج ہے

غرض اکبر ہر ممکن کوشش سے کام لیتے ہیں کہ مسلمان مسلمان بن جائے۔ درس عبرت دیتے ہیں کہ اگر کوئی چشم بینا رکھتا ہے تو دیکھے گوش حقیقت نوش رکھتا ہے تو سنے، قلب و دماغ کا مالک ہے تو محسوس کرے۔

ضروری کام جو نیچر کا ہے کرنا ہی پڑتا ہے
نہیں جی چاہتا مطلق مگر مرنا ہی پڑتا ہے

معلوم ہوتا ہے کہ صانع کا جلوہ صنعت میں حضرت اکبر بھی دیکھا کرتے تھے۔ اسی لئے ارشاد ہوتا ہے۔

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

تصویر اکبر کے دونوں رخ آپ کے سامنے ہیں۔ آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حضرت اکبر کس دل و دماغ کے آدمی تھے قوم کی نبض انھوں نے کس طرح پہچان لی تھی اور مرض کی تشخیص تو ایسی عمدہ کی کہ خود مریض بھی قائل ہو گیا۔ (خاص)

الجمعیت

دول یورپ کی افواج قاہرہ

(جناب محمد عثمان صاحب فارقلیط، سابق ایڈیٹر الجمعیت دہلی)

جنگ عظیم کے بعد دنیا کی مختلف حکومتوں نے فتح اور شکست سے دوچار ہونے کے بعد جس بات کی طرف سب سے پہلے توجہ مبذول کی وہ بحری اور بری بیڑے کی تنظیم اور اس کے اضافہ اور ترقی کا عملی پہلو ہے۔ جن حکومتوں نے دوران جنگ میں کسی نوع کی ہزیمت اٹھائی تھی انھوں نے اپنی فوجی طاقت کیلئے جو کچھ بھی کیا وہ عین مناسب اور مقتضائے احتیاط تھا لیکن جن حکومتوں نے بجائے نقصان کے کچھ فائدہ ہی اٹھایا۔ انھوں نے بھی اپنی عسکری قوت میں اضافہ کیلئے اپنے خزانوں کے منہ کھولدئے اور جوش رقابت سے مجبور ہوکر بین الاقوامی قوانین کی بھی پرواہ نہیں کی۔ کچھ دنوں کے بعد جب مسئلہ تخفیف قوائے حربیہ منظر عام پر آیا اور مختلف حکومتوں سے سر جوڑ کر سامان حرب کی تخفیف کے مسئلہ پر غور کیا تو بین الاقوامی قوانین سے بحری اور بری فوج کے سیلاب کو روک دیا اور آئندہ کے لئے ان پر حد لگا دی۔ اگرچہ تخفیف قوائے حربیہ کے مسئلہ پر اب تک بہت ہی کم عمل ہوا ہے اور پوشیدہ اور علانیہ اس کی خلاف ورزی کی جارہی ہے۔ مگر تاہم اب وہ بے باکی نہیں رہی ہے جس کا اس مسئلہ کے وجود میں آنے سے پیشتر مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ چند یورپین حکومتوں کی عسکری کیفیت انکی تعداد اور طریق کار پر ایک اجمالی نظر ڈالیں تاکہ دور افتادہ اور ناواقف لوگوں کو یورپین ممالک کے فوجی نظام پر بصیرت حاصل ہوجائے اور ان کی معلومات میں ایک معتد بہ اضافہ ہو۔

برطانیہ عظمیٰ۔ دوران جنگ میں برطانیہ عظمیٰ کے پاس ۵۰ لاکھ سات ہزار فوجی سپاہی تھے۔ ۱۹۲۹ء میں فوج کی ایک بڑی تعداد کو خدمات سے علٰحدہ کردیا گیا اور کل دو لاکھ سات ہزار چوبیس سپاہی باقی رکھے گئے جن میں سے ایک لاکھ چالیس ہزار سات سو ۴۲ سپاہی برطانی علاقوں اور ہندوستان کے بیرونی مقامات میں متعین ہیں اور ۵۹ ہزار نوسو ۸۰ ہندوستان کی مختلف چھاؤنیوں میں مامور ہیں ۱۹۲۹ء سے پہلے برطانیہ کے پاس باون ٹینک مشینیں تھیں جو بعد میں گھٹ کر صرف چار رہ گئی ہیں مگر ان کی جگہ بارہ مسلح موٹر کاروں کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ تمام قلمرو برطانیہ میں توپوں کے بارہ مورچوں کی نئے اسلوب سے تعمیر ہوئی ہے۔ اس کے باوجود فوجی افسروں کا خیال ہے کہ برطانیہ کا مورچہ کمزور ہے اور اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۱۹۲۹ء کے فوجی مصارف کے لئے برطانیہ نے جو رقم منظور کی ہے وہ چار کروڑ چون لاکھ پانچ ہزار پونڈ ہے ۱۹۲۸ء کی بنسبت ۱۹۲۹ء میں ان مصارف میں ۵ لاکھ کی تخفیف کردی گئی ہے آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ میں فوج کا جبری داخلہ ہے اور کناڈا اور شمالی افریقہ میں حکومت کو ایسے اختیارات حاصل ہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ۔ جنگ کے زمانہ میں ممالک متحدہ امریکہ کیطرف سے جبری بھرتی کی گئی تھی ۱۹۲۹ء میں امریکن فوج کی صحیح تعداد ایک لاکھ چونتیس ہزار۔ پانچسو تھی جن میں سے ۱۳ ہزار نوسو سپاہی

دوسرے مقامات پر متعین تھے امریکہ میں ایک قسم کی "قومی محافظ فوج" بھی ہے جو ضرورت کے وقت جبری بھرتی کے لئے کام میں لائی جاتی ہے لیکن فوجی بھرتی کا منشا جبر نہیں بلکہ برضا و رغبت عسکری خدمات حاصل کرنا ہے اس تعداد کے علاوہ امریکہ کے پاس ایک علیٰحدہ فوج بھی ہے جو ایک لاکھ بارہ ہزار افراد پر مشتمل ہے امریکہ کا ہوائی بیڑہ تو دنیا کی تمام حکومتوں میں نمبر اول مانا گیا ہے۔

مملکت فرانس۔ فرانس کی فوجی قوت تمام یورپ میں بے نظیر ہے اور اس کے عسکری نظام کی دنیا مداح ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے فرانس میں فوجی ملازمت دو سال کے لئے تھی مگر دوران جنگ میں ملازمت کو تین سال کے لئے کر دیا گیا اب جبکہ تمام یورپ میں امن و سلامتی کے خواب دیکھے جا رہے ہیں تو ملازمت کی میعاد بھی گھٹا دی گئی اور تین سال سے ایک سال کر دی گئی ۱۹۲۸ء میں فوجی مصارف کا تخمینہ ۵ کروڑ ۶ لاکھ ستر ہزار پونڈ لگایا گیا۔ جنگ سے ۴ سال پیشتر تخفیف کے خیال سے فرسٹ لائن ڈویژن میں بیس فیصدی کی کمی کر دی گئی مگر ہوائی بیڑے کے ۱۲۰ اطیاروں میں ترقی دیدی گئی۔ اور وہ دو ہزار کر دئے گئے۔ فرانس کی جنگی قوت کا تمام دارومدار ہوائی بیڑے اور ٹینک مشینوں پر ہے۔ اور ٹینک کی قوت اس قدر زبردست ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ فرانس میں ہلکی ٹینکوں کی ۴۲ بٹالین ہیں اور بھاری ٹینکوں کی دو بٹالین ہیں غرض اس حساب سے فرانس کے قبضہ میں کل ٹینک تین ہزار ساٹھ ہیں اس قدر کثیر تعداد میں ٹینک دنیا کے کسی خطہ میں نہیں مل سکتے۔

فرنچ انفنٹری میں دو سو چھبیس پلٹنیں ہیں اور ہر پلٹن تین حصوں پر منقسم ہے۔ ایک کمپنی مشین گنوں پر کام کرنے والوں کی ہے اور مختلف کمپنیوں میں ایک حصہ ان سپاہیوں کا ہے جو رائفلوں سے مسلح ہیں۔ ان سامانوں کے علاوہ فرانس کے جنگی بیڑے میں تین سو آرمرڈ کار بھی ہیں جو نئے ساز و سامان سے آراستہ و پیراستہ ہر وقت تیار رہتی ہیں۔

جرمن۔ وارسیلز کے عہدنامہ کے بموجب جرمنی فوج کی تعداد محدود و معین کر دی گئی ہے اور اس کو ایک لاکھ فوج سے زیادہ رکھنے کا اختیار نہیں ہے اس کے ساتھ ہی وہ جبری بھرتی بھی نہیں کر سکتا۔ صرف رضاکارانہ خدمات حاصل کرنے کا اُسے محدود اختیار ہے جنگ سے پیشتر جرمن کا جو جنرل سٹاف تھا۔ وارسیلز کے عہدنامہ کے بموجب اس کو بھی موقوف کر دیا گیا اور اس کی دوبارہ تعمیر کی بھی ممانعت کر دی گئی یہ بات تعجب سے سنی جائے گی کہ جرمن کا اب کوئی ہوائی بیڑہ نہیں ہے اور نہ اس کو رائن لینڈ کے قریب کسی قلعہ کی تعمیر کی اجازت ہے۔

عہدنامہ کے وقت جرمن کے پاس جس قدر بھی سامان حرب مقررہ مقدار سے زائد تھا وہ سب برباد کر دیا گیا۔ بھاری بھاری بندوقیں اور سامان حرب کا ایک معتد بہ ذخیرہ قانون احتساب کی رو سے یا تو ضبط کر لیا گیا اور یا برباد کر دیا گیا۔ اگرچہ جنگ کے بعد جرمن کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ مگر پھر بھی اس کے پاس ایک لاکھ فوج ہے جنگی باقاعدہ ترتیب کیجاتی ہے۔ نیز رائفل، مشین گن اور ٹرینچ موٹر کا ایک کثیر تعداد میں اس کے پاس موجود ہیں۔ ہوائی بیڑہ اگرچہ بہت کمزور ہے مگر موجود ہے۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء کے فوجی اور بحری مصارف کی کل رقم تین کروڑ ۵ لاکھ بیس ہزار پونڈ ہے۔

اٹلی۔ زمانہ جنگ میں اٹلی کے پاس ۵۶ لاکھ سپاہی تھے جو سب کے سب ہشیار مرتب اور منتظم تھے۔ لیکن صلح کے بعد بین الاقوامی قوانین کی رو سے اٹلی کے پاس صرف تین لاکھ۔ اسی ہزار سپاہی رہ گئے۔ فوج میں جبری بھرتی ہے اور اٹھارہ ماہ فوجی خدمات کی میعاد مقرر ہے اٹلی کی فوج کا کچھ حصہ سسلی اور سرڈینیا پر بھی متعین رہتا ہے اس فوج کے علاوہ اٹلی کے پاس رضاکاروں کی باقاعدہ فوج بھی ہے جس کی تعداد تین لاکھ ۲۶ ہزار ہے۔ اٹلی کی ہوائی طاقت مختصر ہے اس وقت تک اس کے پاس ایک ہزار اسی ہوائی جہاز

ہیں اور باقی زیر تعمیر یا زیر تجویز ہیں - جن کی کل تعداد مستقبل قریب میں چار ہزار پانچسو ہو جائے گی - ہوائی بیڑہ میں جو افسر اور ان کے ماتحت عملہ کام کرتا ہے انکی مجموعی تعداد ۲۵ ہزار ہے - چھوٹے چھوٹے قلعے بھی ٹریپولی آیرن دیا اور اٹالین سمالی لینڈ کی سرحدوں پر موجود ہیں اور مندرجہ بالا فوج کا کچھ حصہ ان میں ہر وقت پڑا رہتا ہے -

ترکی - ترکی فوج کی کل تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہے جنکو نہایت منظم طور پر تربیت دیجاتی ہے - ٹرکی کے پاس ٹینک - ہوائی جہاز اور توپوں کی تعداد بہت کم ہے مگر سپاہیوں کی تربیت اعلیٰ پیمانہ پر کیجاتی ہے - ٹرکی کا محکمہ مالیات اس قدر منظم ہے جس کی باعث فوجی مصارف نہیں نکلتے -

روس - روس میں بالشویک سرخ فوج کی بھرتی جبری ہے اور اس مقصد کے لئے بہت بے رحمی سے کام لیا جاتا ہے اس فوج کی کل تعداد آٹھ لاکھ بیالیس ہزار ہے - فوج کے بہت سے افسر تجربہ کار اور آزمودہ پرانے جانباز ہیں لیکن بالشویک حکومت کا فوجی نظام اس قدر ابتر ہے کہ کسی مغربی حکومت کا ایسا نہ ہو گا - بالشویک فوج اگر چہ تعداد اور ساز و سامان کے اعتبار سے بہت زیادہ اور وسیع ہے مگر نظم و تربیت کی حیثیت سے اس کا درجہ بہت گرا ہوا ہے - چنانچہ ۱۹۲۰ء میں جب بالشویک فوج کا پولز کی فوج سے مقابلہ ہوا تو پولسز نے ان کو نہایت ذلت آمیز شکست دی اور اوس کو سخت ندامت اٹھانی پڑی - ۱۹۱۷ء میں قیصر فوج کے ذریعہ جس قدر سامان حرب روس میں پہونچایا گیا تھا اس کا کثیر حصہ اس وقت تک موجود ہے - بالشویک حکومت کو ریلوے لائن کی بد انتظامی نے سخت نقصان پہونچایا ہے جس کا براہ راست اثر بالشویک کی فوجی قوت پر پڑ رہا ہے اس کے ہوائی بیڑے میں اس وقت پانچسو جہاز ہیں بالشویکی حکومت کے فوجی سامان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا - کیونکہ اس قسم کی اطلاعات کا دستیاب ہونا سخت مشکل ہے روس کے ہوائی بیڑہ میں سویٹ اور جرمن ہر دو قسم کے کارکن موجود ہیں مگر جرمنی انجینیروں کا عنصر غالب ہے -

جاپان - جاپانی فوج میں تین سال کے لئے جبری بھرتی کی جاتی ہے - اس وقت جاپانی فوج کی تعداد ایک لاکھ اٹھانوے ہزار ہے جس میں سے ۲۵ ہزار منچوریا اور کوریا میں متعین ہیں - جاپان کی فوجی قوت بہت زبردست ہے اور فوجی انتظامات قابل اطمینان ہیں - فوج کی تربیت کا سب سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے - اور اس چیز میں ان کو بعض حکومتوں پر برتری حاصل ہے - البتہ سامان حرب موجودہ زمانہ کے مطابق نہیں ہے اور اس میں اصلاح کی بہت کچھ ضرورت ہے - جنگ عظیم کے بعد نفیس بندوقوں کی ایک کافی تعداد جاپان نے فراہم کر لی ہے اور رفتہ رفتہ وہ ترقی کر رہا ہے - جاپان کے ہوائی بیڑہ میں چھ سو ہوائی جہاز ہیں -

الشرف

بیاہ کی عمر

[جناب مولانا محمد احسن سخن سابق اڈیٹر الشرف بہار]

سوال یہ ہے کہ سارد ایکٹ کے نفاذ کی ضرورت کیوں ہوئی اور اس قانون میں جو بیاہ کی عمر مقرر کی گئی ہے کیا وہ قانون فطرت کے خلاف ہے؟

مذکورہ سوال کا پہلا ٹکڑا یہ ہے کہ سارا ایکٹ کے نفاذ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اس سوال کے جواب میں پہلے کچھ تمہیداً گذارش ہے۔

۱۸۲۸ء میں لارڈ بنٹنگ ہندوستان کے گورنر ہوکے آئے اور آتے ہی ستی سسٹم کے کاغذات دیکھ کے ٹھان لیا کہ اس نالائق رسم کو موقوف کرنا چاہیئے۔ اسی زمانہ میں راجہ رام موہن رائے آنجہانی نے بھی اس رسم کو بند کرنے کے لئے کئی انگریزی اور بنگلہ زبانوں میں کئی کتابیں شایع کرائیں۔ ان کتابوں کی اشاعت پر کلکتہ شوبھا بازار کے راجا سر رادھا کانت دیو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے ذریعہ قائم شدہ ہندو دھرم سبھا کی طرف سے راجا رام موہن رائے کی مخالفت کی گئی۔ کتابوں کے جواب چھپے۔ بحث و مباحثے ہوئے مگر حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں لارڈ بنٹنگ نے اسی موضوع پر اپنا منشا شایع کرایا اور ایک ہی مہینے کے بعد ۴ دسمبر ۱۸۲۹ء کے کلکتہ گزٹ میں رسم جوہر (ستی داہ پرتھا) بند کرنے کے لئے ایک قانون جاری کیا جو ریگولیشن XVII ۱۸۲۹ء کے نام سے مشہور ہے اور جس کا منشا یہ ہے کہ اب سے رسم ستی یعنی ہندو بیواؤں کو زندہ جلانا یا دفن کرنا فوجداری کچہریوں کے ذریعے خلاف قانون اور موجب سزا سمجھا گیا۔

پہلے پہل یہ قانون بنگال، بہار و اڑیسہ میں جاری کیا گیا۔ پھر ۱۸۳۰ء میں بمبئی اور مدراس میں نافذ ہوا۔ رسم جو بہت مدید سے نہ جانے کتنی غریب بیواؤں کو زندہ جلا رہی تھی وہ لارڈ بنٹنگ کی عنایتوں سے فی النار ہوگئی۔

۱۹۲۷ء میں شیو مندر کی تعمیر پر رام گوپال مہتاجی نے ہندی چاند کے محترم اڈیٹر کو لکھا تھا کہ افسوس لندن میں شیو مندر بنے اور ہندوستان میں زناکاری نہ رکے۔ اس خط کو شایع کرتے ہوئے چاند کے فاضل ایڈیٹر نے جو زبردست اور مفید لکھا تھا ذرا ملاحظہ ہوا سے اردو میں منتقل کئے دیتا ہوں۔

"ہم مہتاجی کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ بنگال کے گورنر لارڈ لٹن کی اس محبت بھری تقریر کی طرف جو انہوں نے کلکتہ ویجی لینس ایسوسی ایشن (Calcutta Vigilance Association)۔ منعقدہ ۲ جولائی ۱۹۲۴ء کی مجلس میں کی تھی خود جناب گورنر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ایک لاکھ روپیہ کی اپیل اس لئے کیا تھا کہ کلکتہ میں ایک [illegible] کھولا جائے جس میں ان کنیاؤں کو رکھا جائے جو بھگا کر کلکتہ لائی جا رہی ہیں اور جنہیں بچپن میں (جو ان کی تعلیم و تربیت کا زمانہ ہے) زنا کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ جناب گورنر نے یہ بھی فرمایا کہ نو برس سے تیرہ تک کی سولہ سو سے دو ہزار کنیائیں آج صرف کلکتے میں زناکاری کی تعلیم میں مصروف ہیں اور لگ بھگ بارہ سو کنیائیں ہر سال کلکتے میں صرف اسی سیہ کاری کی غرض سے بھگا کر لائی جاتی ہیں۔ آپ نے بڑے جوشیلے الفاظ میں کلکتے کی پبلک زندگی پر نگاہ ڈالی اور فرمایا "یہ میرے بچے ہیں۔ یہ بچے مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ جس دم میں سوچتا ہوں کہ میرے بچوں کو کوئی نابکار بھگا کر لے جائے

اور ان پر ستم ڈھائے۔ جس طرح ان دوہزار کنیاؤں پر بجلیاں گرائی جارہی ہیں تو خدا لگتی کہتا ہوں کہ میں خوف سے کانپنے لگتا ہوں اور غصہ سے لال ہوجاتا ہوں اس لئے اب میں ایک لمحہ کے لئے نہ رک کر اصلاح کی کوششوں میں مصروف ہوجانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اب بھی متوجہ نہ ہوں گے؟ اور ان بھولی بھالی بچیوں اچھوتی کنیاؤں کی طرف سے بے خبر رہیں گے؟" اس کلکتہ میں ۲۲۶۲ رنڈیاں ۲۰ سے ۴۰ برس عمر کی اپنی ناپاک زندگی بسر کررہی ہیں یعنی ۱۲ عورتوں میں ایک رنڈی ہے۔ ۱۲ سے ۲۰ برس والی فی صدی ۱۸ رنڈیاں ہیں۔ سب سے نفرت انگیز عصمت فروشی تو یہ ہے کہ ۳۱۰۴۸ رنڈیوں کی عمر دس سال سے بھی کم ہے۔ قارئین کرام کو یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ ان رنڈیوں میں نوے فی صدی ہندو ہیں اور یہ حال آج سے نہیں پچاسوں سال سے ہے۔ ۱۸۵۲ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی کلکتہ میں ۱۹۱۴۲۱ بیسوائیں تھی جن میں ہندو بیسواؤں کی تعداد تھی ۱۰۴۶۱ ۱۸۶۷ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جبکہ مسلمان بیسواؤں کی تعداد ۲۶۲ ۱ تھی یورپین کی ۵۶ یورپین کی پانچ یہودیوں کی ۳۵ اور ہندو گھرانوں کی بہو بیٹیوں کی تعداد تھی ۸۳۴۹ ، جو لمبی ناک والے ہندوؤں کے منہ میں کالک پوت کر ہندو سماج کو کوس رہی تھیں۔"

اسی تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ ہو تیئیس کروڑ ہندوؤں میں لگ بھگ سات کروڑ اچھوت ہیں جن میں سوا دو کروڑ بیواؤں کی تعداد ہے اور ان میں اعلیٰ خاندان کی بیوائیں زیادہ ہیں یہ بیوائیں ہندوؤں کے ماتھے پر کلنک ہیں اور یہ کس وجہ سے اس حسرتناک اسٹیج پر پہونچی ہیں؟ 'بال بیواہ' نے 'میل بیواہ' 'برِدھ بیواہ' بیواہ کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے جس طرح ۱۸۲۹ء میں رسم ستی کو روکنے کے لئے ایک نئے قانون کے بنانے کی نوبت آئی اسی طرح نت نئی کرمیوں اور آئے دن کی مہیکاریوں کو دیکھتے دیکھتے ۱۹۲۸ء میں صغر سنی کی شادی کو مسدود کرنے کے لئے سارداجی نے گورنمنٹ آف انڈیا کے ہاں تحریک کی اور والسرائے نے ۱۹۲۹ء میں اس قانون کو تصدیق کرتے ہوئے یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے نفاذ کا حکم دے دیا۔

یہ ہوا پہلے سوال کا جواب یعنی سارد ا ایکٹ کے نفاذ کی ضرورت کیوں ہوئی۔ اب ذرا دوسرا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ کیا سارد ا ایکٹ میں جو بیاہ کی عمر مقرر کی گئی ہے وہ خلاف قانون وفطرت ہے؟

دنیا کے مختلف ترقی یافتہ ملکوں میں بیاہ کی ابتدائی عمر کا نقشہ یہ ہے۔

		لڑکا	لڑکی
(۱)	اسٹریلیا۔	۱۴	۱۴
(۲)	جرمنی۔	۱۸	۱۴
(۳)	بلجیم۔	۱۸	۱۵
(۴)	فرانس۔	۱۸	۱۵
(۵)	روس۔	۱۸	۱۶

(۶) اسپین، گریس، ہنگری، پرتغال اور سوئٹزرلینڈ میں لڑکا ۱۴ لڑکی ۱۲۔ مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ سبھی بیاہ اوپر لکھی ہوئی عمر ہونے پر ہی کئے جاتے ہیں نہیں زیادہ تر بیاہ بڑی عمروں میں ہوتا ہے۔ بچیوں کا بیاہ نمو حسن کے پہلے تو ہوتا ہی نہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی بکثرت پورے بالغ ہونے پر ہی ہوا کرتا ہے تاہم اوپر کی مثالیں جن میں ابتدائے عمر شادی شادی مقرر کی گئی ہے وہ ایسی ہے جیسے طلوع ہوتے ہی سورج کی کرنوں میں گرمی اور ہلال نو سے بھرپور چاندنی تلاش کرنی۔

(بقیہ صفحہ ۵۰۷ پر دیکھو)

المعلم

بالک گھر

(جناب سجاد مرزا ایم۔ اے کنٹب ایڈیٹر رسالہ "المعلم" حیدرآباد دکن)

کنڈرگارٹن ایک جرمن لفظ ہے۔ جو مرکب ہے کنڈر اور گارٹن سے کنڈر یعنی بچے اور گارٹن یعنی باغ لہٰذا بچوں کا باغ اس کا لفظی ترجمہ ہے۔ لیکن اسکا مروجہ ترجمہ گلشن اطفال کیا ہے۔ اور بعض نے باغ اطفال اور بوستان اطفال کیا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ طفلستان ہونا چاہئے۔

ترجموں سے اکثر یہ فرو گذاشت ہوتی ہے کہ وہ مفہوم کو ادا کرنے کے بجائے لفظوں کے الٹ پھیر میں پڑ جاتے ہیں ہم نے اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کنڈرگارٹن کا ترجمہ بالک گھر مناسب و موزوں خیال کیا ہے۔ بالک گھر ایک وسیع مضمون ہے اور غیر معین بھی۔ اگر صرف بالک گھر کی تفصیلی توضیح اور تشریح کیجائے تو اندیشہ ہے کہ بہت طوالت سے کام لینا پڑیگا مگر ابتدائی تعلیم کی اہمیت کے احساس کے ساتھ عام طور پر بالک گھر کے متعلق ایسے خام خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ کہ میں نے اس موقع پر یہ مناسب خیال کیا، کہ ان غلط فہمیوں کو دور کرنیکی کوشش کروں جو عموماً بالک گھر کے متعلق پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے ارتقاء کی مختصر تاریخ بیان کرکے اس کے طریقہ تعلیم کی صراحت کروں۔ اپنے ہموطنوں کی خدمت میں جو ابتدائی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں، ایسے مسائل پیش کروں، جن کے حل ہونے سے کار آمد نتائج حاصل ہو سکیں۔

زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ کہ (۳۵) سال کا تعلیمی تجربہ رکھنے والی فرنگن صدر معلمہ نے یہ بیان کیا، کہ "ہر چہارشنبہ کے سہ پہر کو ہم بالک گھر بناتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد ایک ہفتہ تک کچھ نہیں کرتے۔" واقعی یہ بہت ہی بامعنی اور پر عجیب اظہار حقیقت ہے۔ ہمیں اس فرنگن صدر معلمہ کا شکر گذار ہونا چاہئے، کہ جس نے نہایت درجہ درست گوئی سے کام لے کر اپنے زمانہ کے بالک گھر کا راز کھول دیا۔

اس صدر معلمہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اس وقت بالک گھر صرف نصابی CURRICULUM مضمون سمجھا جاتا ہے۔ اور اس بات کی تحریری شہادتیں موجود ہیں۔ کہ نظام الاوقات TIME TABLE میں اکی ایک مضمون کی حیثیت تھی۔ اس کو لکھنے پڑھنے کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ فرق صرف اس قدر تھا، کہ اوقات تعلیم میں اس مضمون کے وقت چند آلات استعمال ہوتے تھے یا کھیل کھیلے جاتے تھے۔ تحفوں کو کام میں لانا ادائے رسم سے زیادہ نہ تھا۔ مقررہ وقت پر گھنٹی بجتے ہی بچے اپنے تحفوں سے مقررہ رسوم انجام دیتے۔ اور دوسری گھنٹی کے بجتے ہی ان رسوم کو ختم کر دیتے۔ ذمہ دار مدرس بچوں سے اینٹوں کا امتحان کراتا، اور ان سے کچھ تعمیر کرواتا۔ اس کے بعد سامان کو بگاڑے اور منتشر اور خراب کئے بغیر کھلواتا۔ اسی طریقہ سے اور کام بھی کرایا جاتا تھا۔ اسی طور پر دیگر مشاغل زیادہ تر وضع کردہ

سامان سے انجام پاتے، مثلاً کاغذ تراشی کا کام دی ہوئی
پیمائش کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ مدرّس کاغذ کے عرض و طول
مقرر کر دیتا۔ اور بیچارے بچے ذاتی سعی کو ترقی دینے کی
غرض سے وہاں موجود ہوتے۔ اپنے اُستاد کے حکم سے ذرا
بھی انحراف نہ کر سکتے تھے۔

فطرت یا خاندان یا کسی پیشہ یا تجارت سے متعلقہ
ہیت کے گرد کھیل کھیلے جاتے۔ لیکن ذاتی احساسات کے
اظہار کی غرض سے سوانگ بھرنے کا خیال ان میں بالکل مفقود
تھا۔ بچوں کی طرف سے کسی بات کا اظہار نہ ہوتا۔ بلکہ اُستاد سے
ہی ہر بات کی ابتدا ہوتی۔ بچوں کے تمام کھیل مشقوں میں
تبدیل ہو گئے تھے، اور بچوں کو اس سے کوئی فائدہ تھا، تو یہ
کہ ایک ہی طریقہ پر خاموش بیٹھے رہنے کے بجائے طبیعت
بہلنے کا موقع مل جاتا تھا۔

بالک گھر میں جو کہانیاں سُنائی جاتیں، وہ غیر دلچسپ
اور بچوں کی سمجھ سے باہر ہوتیں۔ مطالعۂ قدرت جو ترقی کاروباری
ملکوں کے بچوں کو اس قدر دلآویز ہوتا ہے، خشک نظری
سبق بن گیا تھا، جو ہر قسم کی ذاتی سعی سے جدا کر لیا گیا تھا۔

جب سے ہمارے مدارس میں ٹرینڈ مدرسین کی
کثرت ہو گئی ہے، جو ہمارے نارمل مدارس سے جرمنی کے ارزاں
سامان کی طرح جلد جلد تیار ہو کر نکل رہے ہیں۔ کہیں کہیں
ایسا ٹرینڈ مدرس نظر آ جاتا ہے، جو لپک کر اپنے دورکنندہ
مہتمم سے یہ نہ کہے، کہ اس نے جائزہ لیتے ہی اپنے مدرسہ میں
ایک بالک گھر کی جماعت قائم کر دی۔ جس جماعت کا اس نے
ذکر کیا، وہ ایک تنگ و تاریک اور مرطوب کمرہ میں واقع ہوئی
ہے۔ جہاں کسی قسم کا نہ فرنیچر موجود ہوتا ہے، اور نہ ریت و

کنکر ہی۔ یہ جماعت عموماً ایک از کار رفتہ مدرس کے تفویض ہوتی
ہے۔ جو ضعیف، جاہل اور قلیل ترین تنخواہ پاتا ہے۔ لیکن بستی
کے گوشہ گوشہ سے بچوں کو گھیر لانے میں مہارت رکھتا ہے۔ اور یہی
وہ صفت ہے، جس کی وجہ سے اس کا نام مدرسے کے عملہ میں قائم رہتا ہے۔
اس قسم کے جو بچے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ بالکل برہنہ اور غلیظ ہوتے
ہیں۔ ان کی ناک بہتی رہتی ہے۔ آنکھوں میں چیپڑ بھرے ہوتے
ہیں۔ ناخنوں میں میل ہوتا ہے۔ اور منہ پر مکھیاں بھنکتی ہوتی ہیں۔
ہاتھ میں بید لئے مدرس بچوں کو خاموش رکھتا ہے۔ اگر وہ سو جائیں
تو اُس کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ لیکن اُن کا ہنسنا، کھیلنا یا
شور و غل کرنا غضب ہے ؎

بنا لی شوق میں شدّاد نے لیکن نہ یہ سمجھا
نہ میں جنّت کے قابل ہوں نہ جنّت میرے قابل ہے

لیکن حکام یا عوام اس بالک گھر کو کس نظر سے دیکھتے
ہیں؟ چند ثانویہ مدارس کے سوائے اب کوئی مدرسہ نہیں، جس کی
تعداد کا دار و مدار خاصکر صغیر جماعتوں پر نہ ہو۔ ان میں داخلہ کے
لئے محکمۂ تعلیمات نے پانچ سال کی عمر مقرر کر دی ہے۔ مگر حکام بالا
کے لگاتار مطالبہ کہ مدارس میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ کیا
جائے، خواہ شرح پیدائش میں کمی ہو یا اموات میں اضافہ اس
طرح تکمیل کی جاتی ہے، کہ پانچ سال سے کم عمر والے بچوں کو
جماعتہائے صغیر میں اندھا دھند داخل کر لیا جاتا ہے، اور ہوشیار
صدر مدرس اپنے مہتمم کے ضابطہ کے اعتراض سے بچنے کے لئے
تمام پانچ سال سے کم عمر والے بچوں کی ایک جماعت قائم
کر کے، اور اُس کو بالک گھر کے نام سے موسوم کر کے اپنے بچاؤ کی
گنجائش نکال لیتا ہے، اور اس طریقہ سے وہ نہ صرف مدرسہ میں
طلبہ کی تعداد کے اضافہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، بلکہ جدید

طریقۂ تعلیم پر عمل کرکے اپنے مدرسہ میں اپنی ٹریننگ کا سکہ بٹھا دیتا ہے۔ مہتمم صاحب خوش ہوجاتے ہیں، کہ ان کے احکام کے بموجب تعداد بڑھ گئی۔ اور اُس کے بر خلاف جو رابطہ میں ہے یہی حال والدین کا ہے۔ خاصکریاں کا، وہ صدر مدرس کی اس بنا پر احسان مند ہوتی ہے کہ اُس نے دن بھر اُس کے بچے کو مدرسہ میں رکھکر اُس کو بے کھٹکے گھر کے کام کاج کرنے کا موقع دیا۔

بالک گھر کی ابتدا: جس طرح ہر برائی میں بھلائی پنہاں ہے۔ اسی طرح بالک گھر کی مسخ شکل بھی تعلیمی فضا کا رنگ تبدیل کردیتی ہے۔ اس کا وجود موجودہ حالت سے بے اطمینانی۔ قدیم نظام سے ترک واسطہ اور جدید نظام کی جستجو کا خیال پیدا کرتا ہے، اور بالک گھر کو اچھی طرح سمجھنے کا راستہ کھول دیتا ہے۔

انیسویں [19] صدی میں جبکہ صنعت وحرفت کی جدوجہد کے دور نے خانگی زندگی کی بنیادیں ہلادی تھیں۔ افادیت زیادہ سے زیادہ تعداد کو بیشتر سے بیشتر مفاد ہونا چاہئیے کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ اور مادیت نے انسان کی قدر و منزلت قائم کردی تھی۔ کہ بالک گھر ملک کے لئے بہادر بچے اور کاروباری لوگوں کو تربیت کرنے کی واحد غرض و مقصد سے معرض وجود میں آیا۔ بالک گھر فریڈرک فروبل کی دماغ سوزی اور ۲۵ سالہ تعلیمی تجربہ کا نتیجہ ہے خود بانی نے اسکو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین ما حصل خیال کیا۔ اور اس میں شبہ نہیں، کہ یہ اس کی فطری جدت کا اعلیٰ نمونہ اور فن تعلیم میں حیرت انگیز اضافہ ہے۔ لیکن یہ بات ہم فراموش نہیں کرسکتے، کہ فروبل دوسرے ماہران تعلیم کے ان نظریات کا بھی مرہون منت ہے، جو بالک گھر کی روح رواں ہیں۔ ممکن نہیں ہی وہ شخص تھا، جس نے جدید تعلیم کی بنیاد قائم کی۔ اس کی تعلیم یہ تھی، کہ بغیر اشیاء کے ہرگز الفاظ مت سکھاؤ۔

اگر یہ میسر نہ ہوسکے، تو صحت کے ساتھ ان کے ترجمانی کی کوشش کرو۔ بچے کی جسم وساخت پر توجہ کرو۔ کیونکہ جسمانی صحت پر ہی بچہ کی ذہنی ترقی منحصر ہے۔ لیکن کمی نیس جو اپنے زمانہ میں خیالات کے لحاظ سے بہت ہی پیش پیش تھا۔ اپنے ہمعصروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہا۔ کامیابی ایک سرگرم فرانسیسی کی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی، کہ دنیا کو سوتے سے جگائے۔ اور جدید نظریہ کی طرف پیش قدمی کرنے پر مجبور کرے۔ روسو نے جو انقلاب عالم کا پیشرو ہے، یہ بات اچھی طرح سمجھ لی کہ اُسکے سیاسی نظریوں کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے نئے وضع کے لوگ تیار کرنا ضروری ہے۔ اس لئے اُس نے تعلیم کے مسئلہ پر اپنی توجہ مبذول کی۔ اور اُس کے فکرمند دماغ نے مروجہ نظام کی خامیوں اور اُنکے اصلاح کا پتہ چلا لیا۔ اس کو معلوم ہوگیا، کہ اُس کے زمانہ تک اگرچہ تعلیم کے طریقے اور تعلیم کے مضامین لوگوں کی توجہ حاصل کررہے تھے۔ تاہم بچہ کی طرف جو تعلیم کا جزو اعظم ہے غفلت برتی جارہی ہے۔ اس نے معلمین کی توجہ متعلمین پر منعطف کرائی۔ اس کا اصول یہ تھا، کہ اپنے شاگرد سے تعلیم کی ابتدا کرو۔ جس سے تم پورے واقف ہی نہیں ہم اپنے خیالات بچوں میں بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر بچوں میں اُنکا جو اثر ہوتا ہے، اُس پر بالکل غور نہیں کرتے۔ روسو کے تعلیمی منصوبے حیرت انگیز طریقہ سے بالکل معقول اور جدید تھے، مگر بہت سارے خیالی لوگوں کی طرح وہ عملی آدمی نہ تھا۔ اس نے سوتی دنیا کی اینٹ سے اینٹ بجادی مروجہ نظام تعلیم میں رخنے ڈال دیئے۔ لیکن خود کوئی تعمیری کام پیش نہ کرسکا۔ جس شخص نے نظریوں کو عملی شکل میں اور خواب و خیال کو واقفیت میں تبدیل کردکھایا، وہ پسٹالوزی تھا۔

لفال سے ہمیشہ اُس کا نام وابستہ رہیگا۔ اور پیشۂ تعلیم کا
فرد و بشر اس کے نام کو احسان مندی کے احساس سے یاد
یگا۔ وہ واقعی اور حقیقی معلّم تھا۔ اُس کا اعتقاد عمل پر تھا نہ کہ
صوبوں پر۔ اس نے اپنے تمام منصوبوں کو عملی طور سے پیح
ت کر دکھایا۔ اُس کی تعلیم یہ تھی، کہ زندگی اور تجربہ اصلی
لم ہیں۔ اور اصلی ترقی اندرونی قوتوں سے ہوتی ہے۔ اس
مشاہدہ کی اہمیت پر زور دیا۔ اور اس بات کو ضرور سمجھا،
بچوں کی مناسب نشو و نما کے لئے محبت اور شفقت کی فضا
پیدا ہونا ازبس ضروری ہے۔ اس کا اپنا مدرسہ جو اُس نے بڑی
نفشانی مگر بے سرو سامانی سے چلایا، کامیاب ثابت ہوا۔
حتی کہ اس کے ان شاگردوں کا رنگ روپ بھی بہت کچھ تبدیل
گیا جنھوں نے تھوڑے دنوں وہاں تربیت حاصل کی۔ وہ بچے
ذہین اور اپنے کاموں میں منہمک معلوم ہوتے تھے۔ فریڈ
ربل پیدائشی معلم نے کی نیس اور روسو کے فلسفہ تعلیم کو جذب
کے پسٹالوزی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ اور بعض اہم
لیمی مسائل کے بنیادی اصول دریافت کرلئے۔ اس نے بچے
ذاتی سعی کی ضرورت کو معلوم کیا۔ اور ہر تعلیمی نظام کے تصور میں
چہ کو فیصلہ کُن امر قرار دیا۔ اس نے یہ امر بھی معلوم کیا، کہ جسمانی
ور ذہنی دونوں حالتوں میں بچہ چنچل ہوتا ہے۔ اور اسکو اپنی ذہنی
کے اظہار کے لئے موقع ملنا چاہیئے۔ لہذا کوئی تعلیمی نظام اسوقت
مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں بچے کی جانب سے جد و
جہد کرنے اور معلم کی جانب سے صرف ہدایت کرنے کا لحاظ
رلیا گیا ہو۔ کہ دہ بیز تعلیم آدمی کو غور کن۔ ذہین مخلوق کی
حیثیت سے ذاتی ادراک سے ترقی کرکے پاک اور بے عیب
ضمیر اور وحدت ربّانی کے باطنی قانون کی نیابت کرنے

اور اس کے ذرائع اور وسائل کی رہبری کرنے میں مضمر ہے، وہ یہ
امر تسلیم کرتا ہے، کہ بچہ کی ذہنیت کے اعتبار سے اس کی ترقی
میں اختلاف ہونا ضروری ہے۔ اُس کے نزدیک تمام ترقیوں کا
دار و مدار انسانی ربط و تعلق پر منحصر ہونا چاہیئے۔ (لیکن ہم اسکو
ارث کہتے ہیں) اسکو ہر فرد اپنے اسلاف پُشتوں سے وراثت
میں حاصل کرتا چلا آتا ہے، تاہم فروبل نے اس بات کو بھی ضروری
سمجھا، کہ چند ایسے وسیع اصول کو اختیار کرلینا چاہئے۔ جن کی مدد سے
بچوں کو تعلیم دیتے وقت معلم اپنی رہبری کر سکے چونکہ انسان ربّانی
یا رحمانی، سفلی اور انسانی صفات سے متصف کیا گیا ہے۔ اس لئے
اُس کا تعلق خدا، قدرت اور انسانیت سے سمجھنا چاہیئے جس
کے اندر وحدت، کثرت اور یکتائی اور اسی طرح ماضی، حال
اور مستقبل بھی شامل ہے۔
یہ بالکل صحیح رائے ظاہر کی گئی ہے، کہ بچے اس وجہ سے
نہیں کھیلتے کہ وہ بچے ہیں بلکہ بچپن اُن کو اس واسطے عطا
ہوا ہے، کہ وہ کھیلیں۔ ہر وہ شے جس سے بچے کو دلچسپی ہو۔ اُس
کے لئے کھیل ہو جاتی ہے۔ اسی غرض سے فروبل نے کھیل
کے سامان کو تنظیم کرنے کا مشکل کام اپنے سر لیا تھا تا کہ بچوں کی
ذاتی جد و جہد روبکار لانے میں زیادہ سہولت ہو جائے۔
اُس نے سوانگ بھرنے اور بہادری کے کھیل ایجاد کئے جن
سے سماج کی معاشرتی سرگرمیاں ظاہر ہوں، اور اُن کے ذریعہ
اُن کے اندرونی صفات پیدا ہوں۔ اس نے ان کے حواس
کو تربیت دینے کی غرض سے تحفے، ایجاد کئے۔ اور ایسے مشاغل
اختراع کئے، جن سے انکی تعلیم بھی ہو سکے۔ گولوں کی سٹ سے
رنگ کے متعلق خیالات پیدا ہوتے، تین اساسی اشکال سے
جو مختلف دستعد و طول و عرض میں منقسم ہوتیں معالم اور

مطالعۂ قدرت کا موقع ملتا' پس کھیل کے سامان کو باہم گرجوڑ جانے کر فروبل نے خیال کیا' کہ بچہ کو اس کے وسائل ترقی سے متحد و منسلک کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے' جو اعلیٰ ایجاد کے قائم کرنے میں حقیقی تعلیمی کوشش کیلئے ضروری ہے۔

فروبل کا بالک گھر۔ جب فروبل کا منصوبہ پورا ہوگیا' تو اس نے ۱۸۳۷ء میں بمقام بلیکن برگ واقع جرمنی کم عمر بچوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اور خود اُس کو چلایا۔ جو مقام کہ اس نے مدرسہ کے لئے منتخب کیا' وہاں باغبانی اور سیر و تفریح کے لئے بھی اچھے مواقع تھے۔ بد قسمتی سے کوئی عمارت اُسکی ساتھ نہ آسکی۔ لیکن مطالعۂ قدرت چونکہ اسکی اسکیم کا جزو اعظم تھا' اس لئے ایک ناکارہ بارود خانہ پر ہی قانع ہوگیا۔ دن کا کام وہ اس طرح شروع کرتا' کہ بچے ایک حلقہ میں کھڑے ہوجاتے' اور وہاں خدا کے حمد و ثنا کی گیت گاتے' جب اس سے فارغ ہوتے' تو انکو ترتیب دادہ سامان کھیلنے کی غرض سے دیئے جاتے' ہر بچے کے تجربے پر غور کیا جاتا۔ تاکہ اُسکے محصلہ معلومات کے مدنظر نسبتاً مشکل کام اُس کے حوالہ کیا جائے۔ یہ سب خود فروبل کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد بچے باغوں' جنگلوں یا میدانوں یا بازی گاہوں کو چلے جاتے۔ اور یہاں کھیل اور مشاہدہ دونوں میں انکی فوری اور دقتیہ دلچسپی بنائے کار ہوتی۔ اور اس طریقہ سے ذمہ دار معلم کے زیر نگرانی کھیل اور مشاہدات کے موقع پر بچوں کی رہبری کیجاتی۔ بیرونی مشاغل کے بعد بچے پھر ترتیب دیئے ہوئے سامان سے کھیلتے۔ اور دن کا کام کسی قصہ کہانی کے بیان پر ختم کردیا جاتا تھا۔ فروبل خود بچوں کے ساتھ رہتا۔ جب بچے میدان میں ہوتے تو وہیں جاکر ملتا۔ اور بالاتر کام کی ہدایت کرتا۔ اور موقع بموقع اصلاح کرتا۔ اس کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس بات کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔ کہ فروبل کی ایجاد سے اس کے معاصرین متاثر ہوئے' اور مروجہ تعلیمی نظام میں رد و بدل کے متعلق نئے نئے خیالات پیدا ہونے لگے۔

بالک گھر میں طریقۂ تعلیم۔ یہ فروبل کی دائمی شہرت کا نتیجہ ہے' کہ بالک گھر کی ابتدا ہوکر تو ۹۰ برس گذر چکے' اور اس عرصہ میں بہت کچھ ترقی ہوگئی' علم وسیع ہوگیا۔ مطالعۂ اطفال ایک اہم موضوع بن گیا۔ اور باوجود اس کے فروبل کا نفسیاتی اصول متزلزل ہوگیا ہے۔ بالک گھر کی تحریک کی نشو و نما جس کی اس نے بنیاد ڈالی تھی۔ آج تک فطری تو کیا عملی شکل میں بھی بدستور اس کے اصولوں پر جاری و ساری ہے۔ گو اس کی مشقونکی تربیت میں اور زیادہ استحکام کردیا گیا ہے' زیادہ محنت طلب کھیل ایجاد کئے گئے ہیں۔ بہتر قصے اور گیت تصنیف کئے گئے ہیں۔ اور سامان کی مقدار اور نوعیت میں بھی معقول اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے اصول میں ذرا بھی تبدیلی کئے بغیر موجودہ زمانے کے نقادونکی توجہ خاص طور سے اس کے ترتیب دادہ سامان کے خلاف منعطف ہوئی ہے۔ زور اس بات پر دیا جاتا ہے' کہ اُس کے سامان یا آلات بے جان اور مُردہ ہیں۔ وہ بے شکل اور غیر متبدل ہیں۔ اس لئے اُن کا میلان ضابطہ کی طرف ہے' جو بچونکے نشو و نما کے خیال کا بالکل مترادف ہے۔ ڈاکٹر مانٹیسوری جدید زمانہ کی مشہور تجربہ کار معلمہ نے فروبل کے اس اصول میں متفق الرائے ہونے کے بعد کہ بچہ ایک ذی روح ہیولیٰ ہے' اور اُس کے اندر وہ قوتیں موجود ہیں' جو اس کو ان سرگرمیوں کی جستجو کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ جن سے اُنکی ترقی اور نشو و

میں مدد ملتی ہے۔ اسی مقصد و غرض کی خاطر بالکل مختلف آلات
تعلیمی ایجاد کئے ہیں۔ برخلاف فروبل کے جس نے خیالات
میں حیات آفرینی کی غرض سے دستی مشاغل کی ایجادی اور
اظہاری شکل پر زور دیا۔ ڈاکٹر مانٹیسوری احساسی اور اعصابی
تعلیم پر زیادہ توجہ کرتی ہے۔ وہ حواس کی جانچ کرتی ہے اور
نقائص معلوم کرنے کے بعد اُن کو رفع کرنے کی کوشش
کرتی ہے۔ فروبل نے بچوں کو جماعت کی شکل میں تعلیم دی
لیکن ڈاکٹر مانٹیسوری انفرادی تعلیم پر زور دیتی ہے۔ آزادی
سے چلنے پھرنے کی اجازت دیتی ہے، اور خاص حدود
کے اندر بلا روک تھام اپنے کام کو انتخاب کرکے اور اپنی
مرضی کے مطابق وقت پر پورا کرنیکی تائید کرتی ہے۔ طلبہ کو
آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے پر مجبور نہیں کیا جاتا جیسا کہ
گروہ بندی کے لحاظ سے جماعت میں تعلیم دیتے وقت ضروری
ہے؛ جب بچے نئے خیالات حاصل کر لیتے، تو فروبل ان
کی ترویج کی تدابیر سوچتا۔ لیکن ڈاکٹر مانٹیسوری اس
نئے حاصل کردہ معلومات کو ترویج کی کسی طرح بھی حوصلہ
افزائی نہ کرتی۔ وہ اس وقت کا انتظار کرتی ہے، جب کہ
اس کام کو از خود کرنے لگے۔ یہ ظاہر ہے، کہ فروبل کا اساسی
نظریہ آج تک مسلّم ہے۔ لیکن بچوں کو کس قسم کا سامان
استعمال کرنا چاہئے، اس کے متعلق مختلف رائے ہیں۔
فروبل کے سامان پر جو مردہ ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے،
اس سے ہم کو متاثر نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ بچے کے نزدیک
کوئی شے بیجان اور مُردہ نہیں، وہ تصورات سے بھرپور
ہے۔ اور اس میں گویہ وصف موجود ہے، کہ وہ اپنے کھیل
کی بے جان چیزوں میں بھی زندگی اور انسانی احساس
پیدا کر لیتا ہے۔ اس مسئلہ کو زیادہ طول دینے کی ضرورت
نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص نے بچہ کو لکڑی پر سواری
کرتے دیکھا ہے۔ جس کو اپنا گھوڑا کہتا ہے۔ کھلونے سے
کھیلتے دیکھا ہے، جن کو وہ جاندار سمجھتا ہے۔

لیکن کیا فروبل کے تحفے (تعلیم سامان) بچے کی
نشو و نما میں امداد دیتے ہیں؟ ہاں۔ لیکن نہ اس حد تک
جتنی کہ فروبل کو ان سے توقع تھی۔ کیا مانٹیسوری کے
آلات اس مسئلہ کو حل کرتے ہیں؟ اس کا جواب دینا قبل
از وقت ہے۔ مانٹیسوری کے آلات ابھی تجربہ کی منزل
سے نہیں گذرے۔ میرے دوران قیام میں لنڈن میں جو
ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا۔ شاید اس مسئلہ کی توضیح
کرنے میں مدد کر سکے۔ ۱۹۲۰ء عیسوی میں مانٹیسوری ٹرنڈ
کی معلمات نے ڈاکٹر موصوفہ سے یہ استدعا کرنے کا
تصفیہ کیا، کہ وہ لنڈن آکر مدارس کا معائنہ کریں۔ اور
اُن کو ضروری ہدایات دیں۔ معلمات کی دعوت پر مانٹیسوری
لنڈن آئیں۔ موصوفہ نے تمام مدارس کا معائنہ کیا۔ پھر
وہ ٹاویسٹاک اسکوائر کے جلسہ میں معلمات سے ملیں۔
وہاں انھوں نے اپنے خیالات کی غلط فہمی اور غلط ترجمانی
کی شکایت کی۔ اور متعلقہ معلمات پر خوب لعن و طعن کی۔
اس سے ایک گڑبڑ مچ گئی۔ اور ڈاکٹر مانٹیسوری ناراض
ہو کر جلسہ سے باہر چلی گئیں۔ اور معلمات بھی شور و
غل میں منتشر ہو گئیں۔

جس طرح کہ ایک ماں باپ کے دو بچے ایک
سے نہیں ہوتے، اُسی طرح دو قومیں بھی یکساں نہیں
ہوتیں۔ ہر ایک کے اوصاف جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ بطالوی

اطفال نے انفرادی کام کی اہمیت ظاہر کی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے، کہ ہر ملک کے بچے کی حالت کا مطالعہ کیا جائے "تاکہ ہم بچوں کی مناسبت سے آلات تعلیمی میں ترمیم یا اضافہ کر سکیں، جس کو بڑے بڑے معلمین نے ایجاد کیا ہو حقیقت میں یہ کام نارمل مدارس اور کالجوں کا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہندوستان کے ایسے مدارس نے اس قسم کے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں ظاہر کی ہے۔ میرے علم میں ہندوستان میں اس قسم کا ایک بھی مدرسہ نہیں ہے جہاں موجودہ نفسیاتی اصول کی روشنی میں ہندوستانی بچوں کے مطالعہ کرنے کی کوشش تک کی گئی ہو۔

میرا تو یہ اعتقاد ہے، کہ فروبلی یا مانٹیسوری نظام کے تحت ہندوستان کا کوئی مدرسہ بھی کامیابی سے چل نہ سکے گا۔ جب تک ہندوستان کے ہر بچہ کا غور سے مطالعہ نہ کیا جائیگا۔ اور مصلحت و افقیت کے لحاظ سے کھیل اور آلات میں موزونیت طبع کے لحاظ سے ترمیم یا اضافہ نہ کیا جائے۔ ہم کو اپنے مدارس میں ایسے مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے، جو مغربی ممالک میں معدوم ہیں۔ ہمارے مدارس میں مختلف الحیثیت اور مختلف اقوام کے بچے بھرے پڑے ہیں۔ میں نہیں خیال کرتا، کہ سب سے زیادہ جمہوری ملک بھی ایک ایسے مدرسہ کی نشاندہی کر سکیگا۔ جہاں ہر مذہب و ملت و معاشرت کے بچے ہمارے بچوں کی طرح مل جل کر تعلیم پاتے ہوں۔ ہمارے مدارس کی یہ خصوصیت جو ہندوستان کے قومی ارتقاء کیلئے مفید ہے۔ حقیقت میں ہمارے بچوں کی ذہنی ارتقا میں رکاوٹ ڈال رہی ہے۔

چونکہ ہر نظام کی کامیابی کا دارومدار انھیں لوگوں پر منحصر ہوتا ہے، جو اس کو پورا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ کارپردازاں میں ایسی خصوصیات کی جستجو اور تلاش کیجائے، جن کی بالک گھر میں ضرورت ہے۔ میری رائے میں بالک گھر کے معلم میں کم از کم حسب ذیل اوصاف ہونے چاہئیں۔

(۱) بالک گھر کے معلم کو بچہ کی نفسیات کی مبادیات سے واقف ہونا چاہئے۔ زندگی کے کسی دور میں نہ تو انفرادی کام اس قدر اہم ہے، اور نہ تو انفرادی توجہ اس قدر ضروری جیسی کہ پانچ سال سے کم عمر والے بچہ کے لئے۔ صرف وہی شخص بچوں کے لئے کارآمد اور مفید ہو سکتا ہے جو ان کی طبیعت کو سمجھتا ہے ہمارے اپنے بچوں کے نفسیاتی حالات سے پوری واقفیت نہ ہونے کے باعث صرف معلم نفسیاتی ہی بالک گھر کے لئے مناسب آلات تعلیمی بہم پہنچانے میں مدد دے سکیگا۔

(۲) بالک گھر کے معلم کو بچوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہئے۔ محبت کے یہ معنی نہیں، کہ صرف اچھے اور ذہین بچوں کے ساتھ ہی انسیت ہو سچی محبت کے معنی یہ ہیں، کہ امیر و غریب، خوبصورت یا بدصورت، ذکی یا غبی سب کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے، اور جس قدر بھی چھوٹے بچے اسکی نگرانی میں دیئے گئے ہیں، ان سب کے ساتھ عمدہ سلوک کیا جائے۔ محبت کی فضا بالک گھر کا لازمی جزو ہے۔

(۳) بالک گھر کے معلم کو مستقل مزاج اور خندہ رو ہونا چاہئے۔ بچے فطرتاً نقال پیدا ہوتے ہیں۔ خوش مزاج آدمی بچوں کو خوش رکھ سکتا ہے۔ اچھے کام کے لئے

خندہ پیشانی کی ضرورت ہے۔ خوش بچے عموماً فرمانبردار ہوتے ہیں
(۴) بالک گھر کے معلّم کو منصف مزاج اور راست گو ہونا چاہئے۔ بچے فطرتاً راز در نج۔ اور جلد متاثر ہونے ہیں۔ عام طور سے بچے نیک ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اور دروغ گوئی وہ اپنے بڑے بوڑھوں سے ہی سیکھتے ہیں۔

(۵) بالک گھر کے معلم کے لئے اچھی شخصیت رکھنا ضروری ہے۔ اس کو صاف ستھرے کپڑے پہننے چاہئیں اور پاک وصاف عادات رکھنا چاہئے۔ شخصی وجاہت کا بچوں پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ بچوں میں نقل کرنے کا مادہ چونکہ زبردست ہوتا ہے۔ اس لئے بالک گھر کے معلّم کی خوش پوشاکی بچوں سے بھی خوش لباسی کی متقاضی ہوگی۔ اس کی صفائی وستھرائی ان میں پاک وصاف عادتیں پیدا کردیگی۔

(۶) سب سے آخری سوال صنف کا ہے۔ عورت بچوں کے حق میں نفسیاتی معلّمہ ہے۔ وہی بچوں کو خوب سمجھتی ہے۔ بالک گھر کا معلّم مرد ہو سکتا ہے، لیکن بہترین معلّم عورت ہی ہو سکتی ہے۔ چونکہ بالک گھر کا عمدہ معلّم ہونے کے لئے ماہر نفسیات ہونا ضروری ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے، کہ ہندوستانی عورت اگر اس کی اچھی تعلیم وتربیت ہوئی ہے۔ تو دوسرے ملک کی عورت سے بہتر بالک گھر کی معلّمہ بنیگی۔ کیونکہ اس کی خانگی زندگی، یعنی ساس کے مقولے خسر کی مزاجداری خاوند کی ناز برداری اور گھر کے ساز نازنے صدیوں سے اس کے اندر ایسے نفسیاتی معلومات کوٹ کوٹ کر بھردئے ہیں، کہ وہ کسی ٹریننگ کالج کی تعلیم وتربیت سے بھی مہیا نہیں ہو سکتے۔

میرے نزدیک کسی تمدن کی جانچ بچوں کی تعلیمی انتظامات سے کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص دنیا کی مہذب قوموں کی حالت کو دیکھے، تو اس کو معلوم ہوگا، کہ بچوں کی تعلیم اس ملک کا فریضۂ اول ہے صرف وہی قومیں سب سے آگے ہیں، جن کے یہاں بچوں کی تعلیم کا نظام اعلیٰ ہے۔ لیکن یہ تقدیر کی گردش ہے۔ کہ ہمارے ملک میں جو انگڑائیاں لے رہا ہے، بچوں کی تعلیم پس پُشت ڈال دی گئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم پر بیجا زور دیا جاتا ہے۔ ہر مقام پر جامعہ پر جامعہ کُھلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقی بنیاد یعنی بچوں کی تعلیم پر مطلق توجہ نہیں کی جاتی، جس کے بغیر جامعہ کی عمارت پائیدار ہی نہیں ہو سکتی۔ خرگوش کی طرح بچوں کی پیدائش کی کثرت اور چوہوں کی طرح ان کی موت نے ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کو اور بھی زیادہ اہمیت دیدی ہے۔ مختصر یہ کہ بہ حالت موجودہ ہندوستان کو بالک گھر کی ضرورت ہے۔ نہ کہ جامعہ کی۔ (خاص)

الواعظ

افکارِ عزیز

[جناب مولانا عزیزؔ لکھنوی سابق ایڈیٹر "الواعظ" لکھنؤ]

تیرے فراق سے مری ہستی تباہ ہے — میرا وجود میرے لئے اک گناہ ہے

ہے سب کا اتفاق مری موت پر مگر — جو ضبط آشنا ہیں اُنھیں اشتباہ ہے

وجہِ خلش ہے نقشِ سویدا سے آشکار — کانٹا چُبھا ہے یا یہ کسی کی نگاہ ہے

کھولی ہے کس نے زُلف کہ میری نگاہ میں — عالم تمام مُوجۂ دودِ سیاہ ہے

ہے بس حقیقتِ دلِ زخمی اسی قدر — گلدستۂ بہار فریبِ نگاہ ہے

دنیا کو جانتا ہوں میں اک جُزوِ معصیت — جب ہر وجود اس میں سراپا گُناہ ہے

آساں نہیں ہے بتکدۂ دہر سے عبور — ہر ایک گام پر کوئی بُت سنگِ راہ ہے

یہ مُنھ چُھپائے جاتے ہیں جو سوئے میکدہ — مجھ سے بھی ان جناب سے کچھ رسم و راہ ہے

دل میں ہے کچھ، نظر سے ٹپکتا ہے اور کچھ — کتنی زمانہ ساز کسی کی نگاہ ہے

میں کیا ہوں ایک شعلۂ جانسوزِ عشق ہوں — دل کیا ہے اک نشانۂ تیرِ نگاہ ہے

قبرِ عزیزؔ دیکھ کے کہتے ہیں اہلِ دل
یہ تو کسی شہید کی آرامگاہ ہے

(خاص)

اَلنّاظِر

یادِ حبیب

(جناب محمد حسین صاحب صدیقی لکھنوی سابق اسسٹنٹ اڈیٹر الناظر لکھنؤ)

کیا کیجئے اے ہمنشیں یہ دل بہلتا ہی نہیں ٭ یہ غنچۂ افسردہ اب برسوں سے کھلتا ہی نہیں

چین اب کسی پہلو سے اس ظالم کو ملتا ہی نہیں

یہ اضطراب آخر ہے کیوں

جاتا ہوں صبح و شام میں ہر چند سوئے گلستاں ٭ کلیاں چٹکتی ہیں جہاں غنچے چٹکتے ہیں جہاں

کرتی ہے برگ و غنچہ و گل سے ہوا اٹھکھیلیاں

ملتا نہیں پھر بھی سکوں

جاتا ہوں کچھ اپنے علاج سوزِ نہاں کیلئے ٭ دل میں جو کرب و درد ہے کچھ اُس کی درماں کیلئے

یعنی مداوائے ہجوم یاس و حرماں کے لئے

پر ہے وہی جوشِ جنوں

عیش و نشاط و لطف سے کچھ ایسا بیگانہ ہوا ٭ جیسے کبھی یہ آشنائے ذوقِ عشرت ہی نہ تھا

جیسے نہ دیکھی تھی کبھی اس نے مسرت کی ضیا

کس نے کیا ہے دل کا خوں

آخر یہ ہے کیا ماجرا تو ہی بتا اے ہمنشیں ٭ تسکین کیونکر پائے گا میرا دلِ اندوہ گیں

کب تک رہے گا رات دن ایسا اداس اتنا حزیں

میں اس طرح کب تک جیوں

عمر بھر اب یہ کبھی راحت نہ پائے گا کہیں ٭ میری حیات بے مزہ گزرے گی کیا آخر یونہی

کیا میری قسمت میں مسرت اور آسائش نہیں

تو پھر بتا میں کیا کروں

بے کیف ہو جب زندگی کیونکر نہ اکتا جائے جی ٭ افسوس ایسی زیست پر یہ بھی ہے کوئی زندگی

افسردگیٔ دل ہے وہ جس کی نہیں حد ہی کوئی

یوں خستہ دل کب تک رہوں

یہ کون پہلو سے گیا یہ کس کا رنجِ ہجر ہے ٭ یہ کس کے غم میں بے مزہ و بے کیف ہر اک پہر ہے

اب دیکھئے ہوتی ہے راہِ زندگی کس طرح طے

حالت تو ہے بالکل زبوں

رنجِ فراقِ دوست میں دن رات خاموشی سی ہے ٭ اندوہِ تنہائی سے اب ہر دم ہم آغوشی سی ہے

بس ایک دھن ہے اور ہر وقت ایک بیہوشی سی ہے

کس نے کیا ہے یہ فسوں

یہ داغِ ہجراں ہو کہ پیغامِ وداعِ عیش ہے ٭ برہم نظامِ کیف ہے معدوم متاعِ عیش ہے

یارب ہمیشہ کے لئے کیا انتزاعِ عیش ہے

کیا اب نہیں ممکن سکوں

اے یادِ جاناں دے دلِ مجروح کو کچھ آسرا ٭ میرے ہر اک زخمِ دروں کی ہے فقط تو ہی دوا

تیرے ہی دم سے زندگی کا میری روشن ہے دیا

ورنہ ابھی میں جل بجھوں

آ مجھکو تسکیں دے کہیں ٹکڑے نہ ہو جائے جگر ٭ ہاں ایک بیکس ایک محرومِ وفا پر بھی نظر

تو ہی تو ایسے غم نصیبوں کی بنی ہے چارہ گر

آ تجھ سے حالِ دل کہوں

(اختصار)

الہ آباد یونیورسٹی میگزین

عالم خیال

[پروفیسر امر ناتھ جھا، ایم۔ اے۔ ایڈیٹر۔ الہ آباد یونیورسٹی میگزین]

مسرت! — "میں اگیا بیتال" کی طرح نظر فریب روشنی ہوں۔ تم مجھے دیکھ سکتے ہو مگر پا نہیں سکتے۔

میں! — اس پر بھی تم اپنے وجود سے انکار نہیں کر سکتی ہو۔

مسرت! — میرا وجود صرف انھیں کے لئے ہے جنکو میری آرزو نہیں ہوتی۔ میں دبے پاؤں چپکے سے ان کے خیالات میں در آتی ہوں ان کے تمام اعضا میں ساری ہو جاتی ہوں اور ان کے آنکھوں میں چمکنے لگتی ہوں لیکن خستہ اور مضطرب ہیں وہ لوگ جو میرے پیچھے دوڑتے ہیں اور میں بڑی کوشش سے اپنے کو ان سے چھپاتی ہوں۔

میں! — پھر تمہارے حاصل کرنے کی کیا صورت ہے۔ سراب اور حسرت بھری تمنائیں تو بیکار ثابت ہوئیں۔

دل سے آواز آئی

آرزوئیں اور کوششیں چھوڑ دو! تمناؤں کو اطراف میں منتشر کر دو۔ دل کو حرص سے خالی دماغ کو ہوا و ہوس سے پاک اور روح کو تکبر کے ناپاک پنجوں سے آزاد کرو۔ پھر تم دیکھو گے کہ تمہارا وجود مسرت سے توام ہے۔

(خاص)

شاعر کا دل

[جناب زوار عباس، بی۔ اے۔ ایڈیٹر الہ آباد یونیورسٹی اردو ایسوسی ایشن میگزین]

شاعر ترجمان فطرت ہوا کرتا ہے۔ اس کے دل میں جذبات کا دریا موجزن ہوتا ہے۔ وہ کچھ باتیں محسوس کرتا ہے اور اسکو شکل منظوم کے الفاظ کے لباس میں دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ شاعر کا منشا یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس کے اشعار بحث و دلیل کا کام دیں یا تصورات و حقائق کی عقلی ترکیب و تشریح کریں بلکہ وہ حقائق و تصورات کے مظاہر کلی حیثیت سے پیش نظر کرنا چاہتا ہے اور اس سے وہ اثر پیدا کرنا چاہتا ہے جو خود اسپر ہے شاعر کسی واقعہ یا فطری امر یا چیز کو اسی حیثیت سے پیش کر کے دوسروں میں وہی جذبات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس نے خود محسوس کئے ہیں، شاعری کیفیات زندگی و واقعات فطرت کا آئینہ ہوتی ہے۔ زندگی کا مبدا دل ہے اور اسی سے خون رگوں میں دوڑتا ہے جس سے جذبات و خواہشات و کیفیات نفسانی برانگیختہ ہوتی ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دل جو شاعر کی نظروں میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے کیا شے ہے اور اس کی کیا ماہیت ہے۔ طبی مباحث میرے دائرۂ مضمون سے باہر ہیں اور نہ میں اپنے کو ان مسائل کا اہل پاتا ہوں اس لئے مجھ کو اس کے ماننے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ دل یا قلب (جس کو عربی میں فواد بھی کہتے ہیں) ایک صنوبری شکل کا عضو ہے جو سینے کے بائیں جانب ہوتا ہے" یا یہ کہ "اس کے بیچ میں ایک خول ہے جس میں

سیاہ خون رہتا ہے ظاہر ہے کہ دل روح حیوانی کا منبع ہے لیکن اگر ہم ان تشریحات کی تلاش ایک شاعر کے یہاں کریں گے تو اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہ پائیں گے کیونکہ شاعر جو کسی طبی حقیقت کے جاننے کا دعویٰ نہیں کرتا وہ بھی کہدیگا کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو یک قطرۂ خوں نہ نکلا+

یہ دل کہتا ہے آئے انقلاب اک میرے ملنے سے.
بظاہر ہے بضاعت ایک ہی قطرہ او میری،

علم حیوانات کا ماہر دل کی ماہیت بیان کرتے ہوئے اس کے مختلف افعال پر جس کا تعلق صرف کالبد خاکی سے ہوگا روشنی ڈالے گا اور دل کو اشرف اعضا' رئیس بدن' روح باطنیہ وغیرہ کے لقب سے ممتاز کرے گا لیکن ایک شاعر دل کو صرف کائنات زندگی یا حقیقت انسانی ہی کہہ کر خاموش نہ ہو جائیگا بلکہ اس کا مطمع نظر اوروں سے کہیں زیادہ وسیع ہوگا اور وہ دل کو مبدأ معرفت و کشف حقائق اشیاء قرار دے گا۔ جن جذبات او حسیات سے ایک شاعر کا دل آشنا ہے ان سے کسی فلاسفر' سائنس داں' یا ماہیت داں کا دل واقف نہیں یا اگر ہے تو اس کو ان چیزوں سے ذوق نہیں۔ اس سے میرا مطلب ہر گز نہیں کہ ہر شخص کا دل مختلف ماہیت رکھتا ہے۔ شاعر دل کو دل ہی سمجھتا ہے جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے۔

؎ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں.
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں+

لیکن شاعر کے دل کو اپنے خاص جذبات' حقیقت شناسی اور ترجمانی فطرت کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے۔ باغ میں پھول کو دیکھ کر سائنس داں کا دل کوئی خاص اثر نہ لیگا. نہ کوئی خاص جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوگا بلکہ وہ تو اس فکر میں غرق ہو جائیگا کہ اس پھول کو نباتات کے کس خاندان کی فرد سمجھنا چاہیئے لیکن برعکس اس کے ایک شاعر کا دل اسی پھول کو دیکھ کر ہزاروں کیفیات کا آماجگاہ بن جائیگا کبھی تو وہ شاعر کے منہ سے برجستہ یہ کہلائے گا۔ ع اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری۔ اور کبھی یہ کہنے پر مجبور کرے گا.

؎ نکلے ہو زمیں سے اس لئے پوچھتا ہوں۔
گلشن سے مرے کچھ بھی خبر رکھتے ہو+

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر شاعر کا دل کون سی بلا ہے کہ میرؔ کو کہنا پڑا ؎

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش.
ایک عالم کے سر بلا لایا+

اس دشوار گذار وادی کو طے کرنا مجھ پاشکستہ اور کم بضاعت کے لئے ایک مشکل امر ہے لیکن دقت پسند طبیعتوں سے داد محنت پانے کی امید ہمت افزائی کرتی ہے اور اس عمیق مسئلہ پر چند سطور لکھنے کی جرات دل میں پیدا ہوتی ہے

؎ غرض یہ اپنی ہے اس معنے آفرینی سے۔
ضیافت نظر اہل ذوق کرتا ہوں+

ہستی انسان کا پہلا نقطہ دل ہے اور اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ بزم ازل میں جبکہ ؎

سہانی نمود جہاں کی گھڑی تھی.
تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی.

اور ہر شے کو کچھ نہ کچھ امتیازی تمغے مل رہے تھے یعنی ؎
کہیں مہر کو تاج زر مل رہا تھا+ عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے+ ستاروں کو تعلیم تابندگی تھی

کہیں شاخ ہستی کو لگی تھو تھے + کہیں زندگی کی کلی پھوٹی تھی۔
اسوقت دل کو تو حقیقت انسان، اور لطف ربانی کہلانے کا
شرف رکھتا ہے" درد" ملتا ہے۔ اس عطا کی شان پر
اگر غور کیا جائے تو شاعر کے دل کی حقیقت کا کچھ راز ضرور
کھل جائے لیکن افسوس سے

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جو بنایا ٭ راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا ٭ کھلتا نہیں بھید زندگی کا۔

حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

مصور کو نقش اول سے جس قدر محبت اور کشش ہوتی ہے
وہ محتاج بیان نہیں۔ شاید ازل کی محفل میں دل کو وہی
امتیاز حاصل ہوتا ہے جو نقش اول کو ایک مصور کی نظروں
میں ہونا چاہئے۔ کبھی حسن حقیقی کا آئینہ بن جاتا ہے، کبھی یہ ترانا
گاتا ہے سے

تو جو محفل ہے تو ہنگامہ محفل ہوں میں ٭ حسن کی برق ہے تو عشق کا حاصل ہوں میں
حسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا

لیکن کثرت وجود کے مشاہدات اس نادان دل کو جرم و فا کے
ارتکاب کرنے پر آمادہ کرتے ہیں اور تعینات کے پردے
حریم دل پر پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذرا
سی لغزش پر عالم سفلی کی طرف ناکام دیدار مان رجوع ہونا
پڑتا ہے سے

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق ٭ آواز جان ہوئی تپش آموز جان شوق
یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ ٭ اک آنکھ لے کے خواب پریشاں بہار دیکھ

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ماحول کی تبدیلی سوہان
روح ہوا کرتی ہے اور ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں ہر چیز اجنبیت
کا لباس پہنے ہو محو حیرت بنجانا پڑتا ہے۔ دل جو بزم حسن کا
چراغ تھا اور نقطہ اول ہونے کی بنا پر یکتائی کا دعوی کرتا
تھا ایک ظلمتکدہ میں مقید ہوتا ہے اور بزم ماموره ہستی میں
پہنچکر تصویر حیرت بنجاتا ہے اور فراق وطن میں زبان حال
سے فریاد کرتا ہے سے

ریاض دہر میں نا آشنائے بزم عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جسکو میں وہ محروم مسرت ہوں

جب بزم حسن کی چیزیں طلب کرتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ سے

یہاں کہاں ہم نفس میسر یہ دیس نا آشنا ہے اے دل۔
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیر چرخ کہن نہیں ہے۔

خدا نہ کرے کوئی اپنے ماحول سے علیحدہ ہو۔ اور وطن سے بچھڑے
اجنبی کو شہر کی آبادی ویرانی سے زیادہ پریشان کن ہوتی ہے۔
سیر گلشن سے داغ جگر ہرے ہو جاتے ہیں۔ بلبل کی گیت سے
دل پر چوٹ لگتی ہے۔ نظارہ لالہ زار سے جگر میں شعلے بلند ہوتے
ہیں۔ اور ابر گوہر بار دیکھ کر سینے میں ہوک اٹھتی ہے سے

ہر کسے کو دور باشد از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

اور پھر دل ایسا نازک مزاج اور ناز پرورد ہ۔ پہلے پہل بزم
حسن سے بچھڑ کر خاکدان سفلی میں آیا ہے۔ اور پھر اکیلا نہیں
بلکہ تمام علوی کی ایک نشانی، لطف ربانی "درد" لے کر آیا ہے۔
یہ درد وہی شاندار ازل کا عشق ہی تو ہے جو ایک فطری
جذبہ و کشش ہے بلکہ ایک برقی اور مقناطیسی قوت ہے جو ہر
لحظہ یاد معشوق دلا کر چٹکیاں لیتی ہے۔ پھر اگر ماحول سے چھوٹکر
دل کو جنون ہو جائے تو کیا بعید اس عالم میں آنا تو اسکے لئے

ویرانی اور خانماں بربادی کا میشن خیمہ ہے ؎

جنون عشق ازل کیوں نہ خاک اڑائیں ہم

جہاں میں آئے ہیں ویرانی جہاں کے لئے۔

جب خود ویرانی لے کر آیا ہے تو دل آبادی سے کیوں نہ گھبرائے ؎

ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں۔

ڈھونڈھتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں،

اور جب ہر طرف سر پھوڑنے کے بعد بھی گوہر مقصود ہاتھ نہ آئے تو عزلت نشینی کیوں نہ اختیار کی جائے ؎

بزم ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند

ہے دل عاشق کو کیوں تنہائی پسند۔

غیر کیا جانیں کہ دل کنج تنہائی میں کس خیال میں محو رہتا ہے اور اسے کیا لطف حاصل ہوتا ہے ؎

طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنج عزلت کا ہوں میں۔

دیکھ اے غافل پیامی بزم قدرت کا ہوں میں۔

کیا خیال مرگ دل کو تسکین دے سکتا ہے اور اس کے جنون وحشت کو دور کر سکتا ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں ؎

خیال مرگ کب تسکین دل آزردہ کو بخشے۔

مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی۔

اگر دل کو تسکین مل سکتی ہے تو اسی اپنی چھوٹی سی دنیا میں اور اسی محویت تمنا و درد میں اور اسی جنون میں ؎

جنون تہمت کش تسکین نہ ہو گر شادمانی کی

نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا

لذت ریش جگر غرق نمکداں ہونا

کیوں اے دل! تیرا یہ جنون کس قسم کا ہے؟ آخر تو جرم وفا کر ہی چکا ہے چارنا چار اسی ماحول میں بسر کر ؎

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

مگر ہاں تیری کائنات تو درد ہے، اسی کو تو عالم علوی و بزم حسن سے ساتھ لایا ہے۔ اسی میں تیری دوا بھی ہوگی۔ اچھا اسی درد کو زیادہ کرتا چلا جا شاید اسی سے تیرا علاج ہو جائے اس لئے کہ "درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا" اے دل ذرا آتش درد عشق کو بھڑکا دے کہ ایک مرتبہ جل اٹھے شاید اسی لو سے عالم سفلی کی اجنبیت کافور ہو جائے۔ اور انجمن خاکدان عالم روشن ہو جائے ؎

جلانا دل کا گویا ہے سراپا نور ہو جانا۔

یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے۔

وہ دیکھئے دل کی دود سیاہ سے لپک اٹھی اور کل عالم معمور ہو گیا۔ اب دل کا ماحول اُسے اجنبی نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس کی کیفیات اور جذبات کا ترجمان نظر آتا ہے۔ ہر شے دل کی ہمدرد بنتی جاتی ہے اور سب میں دل کے لئے ایک خاص پیغام موجود ہے۔ کبھی پھول [illegible] دیکھ کر کشش کی برقی لہر موجزن ہوتی ہے اور حسن مطلوب کی تصویر پھول میں نظر آتی ہے۔ کبھی صدائے آبشار نغمۂ یار معلوم ہوتی ہے اور دل اس کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ آسمان پر نظر پڑتی ہے تو چاند کو مخاطب کرتا ہے ؎

زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں

تو فروزاں محفل ہستی میں ہے سوزاں ہوں میں+

تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے

چاندنی ہے نور تیرا عشق میرا نور ہے+

کبھی شمع و پروانہ کی صحبت دیکھ کر بیساختہ بول اٹھتا ہے۔
ع پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں۔
یہ جان بیقرار ہے تجھ پر نثار کیوں۔
کچھ اس میں جوش عاشق حسن قدیم ہے۔
چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے۔
الغرض دل کو یہ نظر آتا ہے کہ ہر شے کی خلقت محض اسی لئے ہوئی ہے کہ وہ دل کو درد ازلی کی یاد دلاتی رہے اور حسن عشق کی ترجمانی کرتی رہے۔ اس حالت میں دل اشیاء کی ذاتی حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ان کو صرف وہی اہمیت دیتا ہے جو اس نے انھیں اپنے تصور و نظام عشق میں دے رکھی ہے۔ درد و عشق میں کامل محو ہونے کی وجہ سے دوسری اشیاء کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دینا چاہتا ہے تاکہ ان میں غیریت کی بو نہ رہے اور سب دل کے ہمدرد اور ہمزبان و ہمرنگ ہو جائیں۔

ظاہر بین نگاہوں میں اب دل کی تسکین کا پورا سامان ہوگیا مگر افسوس کہ دل کو مرض عشق ہے اور ع
مریض عشق پر رحمت خدا کی۔
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔
دل مجسم جوش و اضطراب ہے بھلا اس کو کہاں سکوں ع
پوچھتے کیا ہو کہ تیرے دل میں کیا ہے مجھ سے پوچھ۔
اور کیا یاں خاک ہوگی جوش ہے یا اضطراب۔
دل کا فطری درد جو لطف ربانی اور عطائے باری ہے اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ اسی درد پر تو دل کا ناز ہے اور اسی پابندی کو وہ عین رہائی سمجھتا ہے ع
سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا۔

دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے کس قدر ذوق گرفتاری ہے ہمکو
اور ایسا کیوں نہ ہو اس لئے کہ درد ہی تو دل کی کائنات ہے۔
اور بغیر درد کے دل وہی ایک قطرۂ خون ہے ع
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں۔
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز۔
اگر درد نہ ہو تو دل بیکار ہے اور سینے سے نکال دینے کے قابل ہے۔
ع بے ننگ سینۂ دل اگر آتشکدہ نہو۔
بے عار دل میں نفس اگر آذر فشاں نہو۔
ماحول کو ایک حد تک بدلنے کے بعد دل اور بیقرار ہو جاتا ہے اور کل کو بدلنے کی فکر دامنگیر ہوتی ہے اور اس فکر سے سوہان روح اور بڑھتا ہے ع
وعدۂ وصل چوں شود نزدیک۔
آتش عشق تیز تر گردد۔
دل کی آگ اس قدر بھڑک اٹھتی ہے کہ شعلے پھیل کر منتشر ہو جاتے ہیں اور تمام اشیاء کو اپنے میں سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔ اب دل تمام اشیاء کو دل سے متحد کر لیتا ہے اور ہمزبانی ہمرنگی اور ہمرازی کو یگانگت اور وحدت سے بدل دیتا ہے یعنی دل کے لئے دل کی ہستی سے علیحدہ کچھ نہیں قرار دیا جاسکتا سب اشیاء اس کے لئے معدوم ہیں اور صرف دل اور درد باقی ہے۔ اگر کچھ اور نظر آتا ہے تو اسی دل کے آئینے میں ع
از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ۔
طوطی کو شش جہت کے مقابل ہے آئینہ
زندگی دل کا یہی مقصد ہے کہ اسی عشق یا درد کی آگ میں جلتا رہے اور اس قابل ہو جائے کہ اپنے کو اس کے شعلوں میں فنا کر دے اور یہ سمجھے کہ ع

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام۔
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی،

درد کے شعلے فطرتاً عالم علوی کی طرف مائل ہیں اور بلند پروازی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر دل جلکر خود بھی شعلہ ہو جائے گا تو ضرور ان شعلوں کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اور پھر دل تو خود بھی جلنا چاہتا ہے اس لئے وطن پہنچنے کی شاہراہ یہی ہے سہ

جی جلے ذوق فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں۔
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے،

درد کی گرمی اور ذوق فنا کی ناتمامی پر دل جلتا ہے اور شعلہ بن کر درد سے متحد ہو جاتا ہے سہ

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا۔
آتش خاموش کے مانند گویا جل گیا،

اپنی ہستی کو مٹا دینے کے بعد دل کو کیا ملتا ہے؟ اس مسئلہ پر ذرا غور کرنے سے ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے سہ

کیا کہئے حسن عشق کے آپ ہی طرف ہوا۔
دل نام قطرہ خوں یہ ناحق تلف ہوا،

اب حسن اور عشق کا اتحاد ہوتا ہے۔ درد مجسم حسن ہو جاتا ہے۔ قلم اس کیفیت کے بیان کرنے سے عاجز ہے۔ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ دل کو اس فنا کے بعد بقا ملتی ہے۔ وہ شاہراہ جس پر درد گامزن ہے بہت عالی ہے۔ سہ

ہے یہ وہ راہ کہ تا عرش پہنچتا ہے بشر۔
دل میں دروازہ ہے اس گنبد مینائی کا،

اس راہ سے گذر کر دل بھی عظیم المرتبت ہو گیا سہ

ہے عرش آستانۂ دولت سرائے دل۔
اللہ رے مرتبہ حرم کبریائے دل،

دل کی سرگذشت ایک خاص پیرایہ میں بیان کی گئی ہے مگر باطن بین دریافت کر لیں گے کہ یہ بیان دراصل شاعر کے دل کی مختلف حیثیات کا آئینہ ہے۔ بجائے موتیوں کا ڈھیر کر دینے کے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ان کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے۔ اب جسے جو موتی پسند خاطر ہو وہ لے لے۔ جو کچھ بیان ہوا سب شاعر کا دل ہے۔ شعراء میں بھی ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں۔ کسی کا جذب کم اور کسی کا زیادہ ہوتا ہے۔ جس کا جذب دل جس درجے تک ہوتا ہے وہ اتنا ہی بیان کرتا ہے۔ مگر شاعری بغیر جذب دل کے مشکل ہے سہ

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد۔
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی،

شاعر کا دل اس کی کامل کائنات ہے اور اسی پر اس کی شاعری کا دارو مدار ہے اور حق تو یہ ہے کہ شاعر کے دل کا مفہوم شاعر شعر ہی میں خوب ادا کر سکتا ہے۔ سہ

آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلت باید از وے رو متابہ

(خاص)

امام

ایرانی عورتوں میں بیداری کی لہر

[جناب پروفیسر علم الدین صاحب سالک ایم۔ اے (علیگ) سابق مدیر روزنامہ انقلاب وسوارج و مدیر اعزازی رسالہ قوس قزح لاہور]

کوئی ملک اسوقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک وہاں کی عورتیں علم کے نور سے منور ہوکر پوری طرح مردوں کا ساتھ نہ دیں۔ یہ اصول مشرق ومغرب دونوں پر یکساں حادی ہے مغرب نے اسوقت تک ترقی نہیں کی جب تک وہاں تعلیم نسواں عام نہیں ہوئی۔ ہندوستان کی موجودہ بیداری بھی بہت حد تک تعلیم نسواں کی مرہون منت ہے ایران ایک مدت تک عورتوں کی تعلیم سے بے پروا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک اوج کمال سے گرکر پستی کے عمیق غار تک پہنچ گیا مگر موجودہ فرمانروا کی بدولت آج تعلیم نسواں کا گھر گھر چرچا ہو رہا ہے۔ اور ملک اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ابھی ایران میں تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔ اور قدامت پسند جماعت اسکی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر رہی ہے۔ مگر اسکے باوجود عورتوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوچکی ہے جو صبر و استقلال کی ڈھال لیکر قدامت پسندی کا مقابلہ کر رہی ہے اس جماعت کی سب سے بڑی راہنما مہر بانو ہے۔ جو زنانہ مدارس کی انسپکٹرس ہے۔

مہر بانو طہران کے ایک متمول خاندان کی چشم وچراغ اور امریکن سکول کی فارغ التحصیل ہے۔ یہ پہلا سکول ہے جو ایرانی خواتین کی فلاح وبہبود کے لئے تقریباً پچاس سال سے جاری ہے مہر بانو بچپن ہی سے تعلیم ہی کی دلدادہ تھی اور نسوانی تحریکات میں گہری دلچسپی لیتی تھی۔ اسی بنا پر اسے سرکاری مدارس کی انسپکٹرس مقرر کیا گیا ہے طہران کی تمام نسوانی تحریکات اسکے دم سے وابستہ ہیں۔ ایک موقعہ پر اُس نے تعلیم نسواں کی موجودہ پستی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"ایرانی عورتیں تعلیم میں اسلئے پیچھے ہیں کہ اوائل عمر ہی میں انھیں وہم پرستی سکھا دی جاتی ہے اور مذہب کے نام پر طرح طرح کے بیہودہ خیالات کا شکار کر لیا جاتا ہے۔ مذہبی جماعت اس غلط فہمی کی بنا پر کہ تعلیم نسواں اُن کی ہستی کو ملیا میٹ کر دے گی۔ ہر جائز وناجائز طریقے سے اُس کی مخالفت کرتی ہے۔ مگر میں بتا دینا چاہتی ہوں کہ ہم مذہب یا مذہبی جماعت پر حملے کرکے انھیں مٹا نہیں سکتی اور نہ ہی علما کی جماعت کو نظر انداز کرکے ترقی کرسکتی ہیں۔ ہماری کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس جماعت کو اپنا ہمخیال بنایا جائے۔ اور تعلیم کے معاملہ میں اس سے مدد لی جائے حصول تعلیم مرد وزن دونوں پر فرض ہے۔ قرآن پاک عورتوں کو اس سے محروم نہیں کرتا"

مہر بانو اور اُسکی دیگر ہمخیال عورتیں باوجود آزاد خیا

ہونے کے پردے کی سخت حامی ہیں۔ وہ تسلیم کرتی ہیں کہ موجودہ پردہ اسلامی پردہ نہیں مگر ابھی تک انھیں اسکے خلاف آواز اُٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔

ایران کی ایک اور خاتون جس نے اپنی زندگی عورتوں کی ترقی کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ پروین خانم ہے۔ وہ ایک اخبار نویس کی لڑکی ہے اور امریکن سکول کی گریجوایٹ اور شاعرہ ہے اور اسکا کلام کم وبیش طہران کے ہر پرچہ میں شائع ہوتا ہے۔ وہ مختلف علوم وفنون کی بالغ النظر فاضلہ ہے۔ علم التصوف سے اُسے خاص لگاؤ ہے۔ وہ سادہ اور بے تکلف زندگی کو پسند کرتی ہے۔ ایک بار رضا شاہ پہلوی نے ملکہ ایران کی تعلیم کے لئے اس کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر خانم نے انکار کر دیا۔ رضا شاہ جس کے سامنے کسی کو انکار کی جرأت نہیں یہ جواب سنکر حیران و ششدر رہگیا۔ اسکے بعد اعلیٰ حضرت نے پروین خانم سے استدعا کی کہ وہ رات کے وقت اسے ایران کی تاریخ سنایا کرے۔ جسکے معاوضہ میں معقول مشاہرہ اور وسیع محل بھی پیش کیا۔ اور یہ یقین دلایا کہ اسے ولیعہد سلطنت اور ملکہ پر حکمرانی کا اختیار ہوگا اور شاہی خاندان اس کی متابعت کریگا۔ مگر پروین خانم نے جو شاہی دربار کے آداب وضوابط سے گھبراتی ہے۔ اس پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا۔ اسکا خیال ہے کہ بادشاہ کی طبیعت بالکل بچوں کی سی ہوتی ہے۔ کبھی تو سلام سے رنجیدہ ہوجاتے ہیں اور کبھی گالیوں پر خلعت فاخرہ انعام دیدیتے ہیں۔

پروین خانم پردے کی حامی ہے۔ اسکا اعتقاد ہے کہ نسوانی تحریک کی خاطر پردے کو خیرباد رکھنا درست نہیں۔ اس تحریک کا کچھ حصہ مردوں کے ہاتھ میں اور کچھ عورتوں کے پاس ہونا چاہیئے۔

ایران کی تیسری مایہ ناز خاتون سارہ خانم ہے۔ وہ پردے کی چنداں پروا نہیں کرتی۔ دارالخلافہ میں بیحد مشہور ہے۔ کجکلاہ ایران خود بھی اس سے واقف ہے وہ ایک مدت تک روس میں مقیم رہی۔ وہیں اُس نے تعلیم حاصل کی۔ اور وہیں اُس کی شادی ہوئی۔ گذشتہ انقلاب روس میں اس کا خاوند مارا گیا اور وہ ایران واپس چلی آئی۔ روس میں تو پردے کا رواج ہی نہ تھا۔ مگر یہاں آکر اُسے چارو ناچار چادر اوڑھنی پڑی وہ نہایت سنجیدہ مستقل مزاج سرگرم مگر خاموش کام کرنے والی خاتون ہے آجکل وہ ادارہ رفاہ عام میں ملازم ہے اور ٹائپ کا کام کرتی ہے۔ یہ پہلی خاتون ہے جو ایران کے سرکاری دفتر میں ملازم ہوئی۔

سارہ خانم امریکہ۔ فرانس اور دیگر یورپی ممالک کی سیاحت بھی کر چکی ہے۔ اسکے وسیع اثر اور رسوخ کی بدولت حکومت اور وزرائے دولت اُسکی عزت کرتے ہیں۔

ایران میں اسوقت کم وبیش پانچ چھ ہزار بالغ عورتیں ایسی ہونگی جو پڑھ لکھ سکتی ہوں۔ یہ اعداد و شمار کچھ زیادہ حوصلہ افزا تو نہیں کہے جا سکتے مگر پھر بھی غنیمت ہیں۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ایران مشرقی اقوام کی دوبارہ راہنمائی کرے گا۔ اور وہاں کی خواتین ایشیائی تہذیب و تمدن کی مشعل سے اہل عالم کو منور۔ انسانیت کو استبداد و غلامی سے آزاد اور مشرقی نسوانی تحریک کو ترقی کے انتہائی زینے تک لے جائیں گی۔

(خاص)

انڈین ڈیلی ٹیلیگراف

ماں کی پرستش

(جناب ڈی آر مہادیشور جائنٹ ایڈیٹر "انڈین ڈیلی ٹیلیگراف")

ہندوستان کے کل تہواروں میں سے درگا پوجا ایک بڑا متبرک تہوار خیال کیا جاتا ہے۔ بعض مقاموں میں یہ تہوار "دسہرہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ہندوستان کے ہر قصبہ میں ساگر جزیرہ سے لیکر سندھ تک اور کشمیر سے راس کماری تک ہندو کئی مختلف طریقوں سے درگا دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ مشرقی لوگوں کا خیال ہے کہ اس پوجا کا آغاز قدیم آرین کے زمانے سے ہوا ہے۔ نووارد آرین اور قدیمی باشندگان کے آپس میں خلط ملط ہونے سے اس پوجا کی بنیاد پڑی تھی۔ پہلے زمانہ میں یہ تہوار عالمگیر تھا۔ پرانی دنیا میں ہر جگہ یہ تہوار منایا جاتا تھا۔ مصری "ایسس" کی پرستش کرتے تھے، ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ موت کے بعد "حشر" کی دیوی ہے۔ اسیریا قوم کے لوگ زمین کے دیوی کی پوجا کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ دیوی پیداوار کی ملکہ ہے ایشیا مائنر کی بیٹی ماٹز "میو" دیوی کی پوجا کرتے تھے۔

ہندو شاستروں کے لحاظ سے درگا دیوی کی پوجا ایک اہم بات ہے۔ ہندوستانی مندروں میں پانچویں صدی سے بارھویں صدی تک درگا کی کئی قسم کی مورتیں پائی جاتی ہیں۔ اس دیوی کی پیدائش کا ذکر ویدوں میں کیا گیا ہے۔ اپنیشدوں میں بھی دیوی کے بعد کی زندگی کی سوانحعمری قلمبند کی گئی ہے۔ تنتر و پران میں دیوی کی تمام زندگی کا مفصل حال درج ہے۔ اس دیوی کا ذکر مہابھارت میں بھی آیا ہے۔

مورت

درگا دیوی مورت کی شکل یوں بیان کیجاتی ہے:-

اول دیوی کی خاص مورت ہوتی ہے، شیر کے اوپر سوار دکھلائی گئی ہیں۔ اور ہاتھوں میں فنا کے سب ہتھیار لئے ہوئے رہتی ہیں۔ خاص مورت کے دونوں طرف سرسوتی لکشمی کھڑی رہتی ہیں۔

کارتک اور گنیش بھی کھڑے دکھلائے گئے ہیں، یہ مورتیں دیوی کی صفات کا مجسمہ علامتیں ہیں۔ درگا دیوی دنیا کی ہر چیز سے مستغنی پائی جاتی ہیں۔ اور وہ تمام کائنات کی ملکہ ہیں۔ وہ لوگوں کو غم سے نجات دیتی ہیں۔ اور برائی کو آدمی سے دور رکھتی ہیں شیر سے خدائی قوت کا جذبات حیوانی پر قادر ہونے کی علامت ہے بھینسا جذبات حیوانی کی علامت ہے۔ دیوی کے بارہ ہاتھ دکھلائے گئے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ مورت سے ہر سمت میں روحانی قوت کا انتشار ہو رہا ہے۔ لکشمی سے مال و دولت کا پتہ چلتا ہے۔ سرسوتی ہندوؤں کے لحاظ سے علمیت کی دیوی ہیں۔ گنیش برائیوں کو دور کرتے ہیں۔ اور ان کی کرپا سے آدمی ہر کام میں کامیاب ہوتا ہے۔ کارتک خدائی فوج کا سپہ سالار ہے۔ اور اس کی فوج شیطانی

حرکتوں پر فاتح سمجھی جاتی ہے۔

مصر

مصر کے اندر چند سال پیشتر ایک دیوی کی مورت ملی تھی جو کہ درگا سے مشابہت رکھتی تھی۔ مورت شیر کے اوپر سوار دکھلائی گئی تھی۔ دونو طرف دو عورتوں کی مورت سرسوتی اور لکچھمی کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ داہنے جانب کارتک کی طرح ایک اور مورت بنی ہوئی تھی سب مورتوں کے اوپر ایک ایک محراب بنایا گیا تھا۔ کل دستہ کی شکل شیو بنجیا تسن سے ملتی جلتی تھی۔ وہ مورتیں ۴۵۰۰ برس قبل مسیح کی خیال کی جاتی ہیں۔ تبت میں بھی کچھ مورتیں ایسی ہیں۔ ان کی شکل چیتے کے چہرہ سے متشابہ ہے

مہاراشٹر

مہاراشٹر پوجا عجیب طرح سے کی جاتی ہے کل ہتھیاروں اور اوزاروں کی پرستش ہوتی ہے۔ اور دسہرے کے روز "سنمیت پوجن" کا جشن منایا جاتا ہے شامی درخت کی پتیاں ایسے موقع پر بہت ہی مبارک اور نیک شگون سمجھی جاتی ہیں۔ لوگ بڑی آزادی سے اسکو لوٹتے ہیں' اور آپس میں ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ اس رسم سے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے' کہ آپس میں میل اور اتفاق بڑھتا ہے۔ اور اس تہوار کو "سنمیت پوجن" کہتے ہیں۔ کیونکہ زمانہ قدیم میں رام جب لنکا جیت کر واپس ہوئے تھے' ان کی رعایا "سیما" یعنی سرحد پر انکا خیر مقدم کرنے آئی تھی۔ اکثر دیں روز سرسوتی "علم کی دیوی" کی پوجا ہوتی ہے بھجن اور اچھے اچھے

گانے گائے جاتے ہیں۔ دوسرے روز صبح مورتی کو جلوس میں لیجاتے ہیں' اور کسی دریا یا سمندر میں غرق کر دیتے ہیں۔

دُرگا مورتی کا معجزانہ ظہور

سارنت وادی ریاست کے ایک گانوں پورسی میں سری ساتری (درگا دیوی) کا ایک مندر بنا ہوا ہے۔ دسہرے کے روز ہزارہا آدمی کا مجموعہ بہت دور دور سے آتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے' کہ اس روز مندر کے درشن کرنے سے دیوی جی سال بھر تک انکے اوپر مہربان رہینگی۔ بہت سے لوگ گرہستی کے اہم مسئلوں پر دیوی جی سے رائے لینے کے ارادے سے آتے ہیں۔ مہا دیشور فرقہ کو بہت عرصہ سے اس مندر کا خاص نیاز ملتا چلا آ رہا ہے۔ سری ساتری کے مندر کے بارہ میں عجیب و لیکن نہایت دلچسپ ایک کہانی بیان کی جاتی ہے۔ کئی صدیوں کا زمانہ گذرا' کہ ایک شخص مہا دیشور نامی جو کہ سری ساتری کا پکا پجاری تھا۔ ایک رات سوتے ہوئے خواب میں دیکھا' کہ دیوی جی اس کی عبادت اور سرگرمی سے بے انتہا خوش ہوئی ہیں۔ اور وہ سامنے صورت اختیار کر کے آئی ہوئی ہیں۔ لیکن وہ شکل حیرت انگیز تیزی سے بڑھنے لگی' یہانتک کہ دیوی کا سر چھت سے چھونے لگا۔ پوجاری نے دُعا کی' تب دیوی جی کا بڑھنا رُک گیا۔ دوسرے روز صبح کو جب اُس کی نیند کھلی' اس کو اپنے رسوئی گھر میں ایک بڑی بھاری پتھر کے سل کی مورت' جیسا کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ رکھی ہوئی دیکھکر بڑا تعجب ہوا۔ مندر کا نام اسی وجہ سے "سوئمبھو" رکھا گیا۔ کیونکہ وہ خود بخود دفعتہً وجود میں آگیا تھا۔

ساتھ ہی اس کے یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے بعد کسی بھی بیرونی واقعہ سے یہ پتہ نہ لگ سکا کہ ایک رات کو کس طرح اتنی مہیب سل مکان کے اندر آگئی تھی۔ اس حیرتناک واقعہ کے تھوڑے روز بعد اسی جگہہ کے چاروں طرف ایک عالیشان مندر تعمیر کرایا گیا۔

دُور اور نزدیک ہر جگہ کے لوگ سری ساتری کی پوجا کرنے کو آنے لگے۔

اور کہا جاتا ہے کہ بہت سے لوگ ان کی اشیرباد سے مستفید ہوئے ہیں۔ مرحوم بابا صاحب مہادیشور کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ دُور درشن اور دور شروان تھے (یعنی وہ دنیا بھر کی چیزیں ایک جگہ سے دیکھ سکتے اور ہر جگہ کی باتیں سُن سکتے تھے) ان کے متعلق اور بھی کئی معجزے بیان کئے جاتے ہیں۔

بنگال

بنگال میں درگا پوجا قومی تہوار خیال کیا جاتا ہے، ان دنوں میں بنگال میں ہر گھر میں خوشی اور جشن منایا جاتا ہے، رقص و سرود کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ ناچ اور گانا ہوتا ہے۔ پوجا کی چھٹیوں کے دنوں میں بہت سے لوگ اپنا کام بند کر دیتے ہیں۔ ہر ہندو خواہ کسی بھی ذات یا فرقہ کا ہو، درگا پوجا میں حصہ لیکر دیوی کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ امیروں کے مکان کی رونق و چہل پہل کا ذکر ہی کیا، روپیوں کی کمی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں پوجا بڑی شان و شوکت سے کی جاتی ہے۔

دیگر مقامات

جھریا ریاست میں درگا جی کی پوجا بڑے دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ شاہی تالاب کے کنارے پر ایک بڑا میلہ ہوتا ہے، گرد و نواح کی تمام زمین پر بجلی کی بتیاں اس طرح جلائی جاتی ہیں۔ کہ رات کے اندھیرے میں دن سے بھی زیادہ روشنی رہتی ہے۔ درگا کی مورت جلوس میں نکالے جانے کے وقت راجہ اپنے شاہی خاندان کے ہمراہ بڑے طمطراق کے ساتھ راج گدی ہال میں آتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ راجہ کو راستے میں نیل کنٹھ اور سنکھا چیل کا درشن ضروری ہے۔ نہ ہی لوگوں کا خیال ہے کہ درشن نہ ہونے سے سال بدشگون ہوگا۔ (ان چڑیوں کو پہلے ہی سے اسیر قفس بنا رکھتے ہیں) راج گدی ہال میں رعایا راجہ کو نذر بھینٹ چڑھاتی ہے

پیڑہ بین " بجے " کا دن روز عید سمجھا جاتا ہے لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر سیاحی کرتے ہیں، اور یہ بڑی رات تک قائم رہتا ہے۔

ندیا میں لوگ اس پوجا کی طرف خاص توجہ دیتے ہیں۔ عورتیں گانوں میں دروازہ دروازہ پانی کی بھیک مانگنے جاتی ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ مجل سدھا کا تہوار آپس میں اتفاق و میل جول پیدا کرتا ہے۔ کمرول کی چوکھٹ پر سرخ اور سفید رنگ چڑھایا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں پوجا کے دوسرے روز ندیا کا مہاراجہ آئے ہوئے مہمانوں پر قتل کئے ہوئے جانوروں کا خون چھڑکتا تھا۔ بعض اوقات بھینسے بھی قربان کئے جاتے تھے، لیکن اُن کا گوشت استعمال میں نہیں لایا جاتا تھا۔ ندیا

کے وشنو خاندان دیوی کو سپاری، گنے و کدو بھینٹ دیتے ہیں۔ پوجا کے تیسرے روز ہر طبقہ کے لوگ امیر و غریب "کاواکنتی" تہوار مناتے ہیں۔ اس موقع پر آپس میں کیچڑ بھی پھینکتے ہیں۔

سورما کی وادی میں جس کے اندر سلہٹ اور کچھار کے کچھ اضلاع شامل ہیں، یادگار پوجا کا تہوار تین طریقوں پر منایا جاتا ہے۔ (۱) مٹی کی مورت (۲) کیلے کا پودا (۳) مٹی کا برتن یا گھڑا۔ چائے کے باغات میں یہ پوجا بڑے زور شور سے منایا جاتا ہے۔ یورپین مالک باغ ایک کثیر رقم اس پوجا میں دیا کرتے ہیں۔ اور اس روز صاحبوں کے قلی خوب شراب اور نشہ کھاتے پیتے ہیں۔ کسی کو بھی اس روز تماشہ اور جشن سے پرہیز نہیں ہوتا۔

کچھار کے اضلاع میں گورکھے جو فوج میں ملازم ہیں درگا پوجا عجیب رسم سے ادا کرتے ہیں۔ پنڈت یا پجاری درگا دیوی کی مورت کے پیچھے سے منتر پڑھتا ہے۔ اور بعد کو سب لوگ باہر آکر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ اور مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔

اوڑیسہ کے اندر بنگالیوں کے آنے کے پہلے یہ پوجا اب کی طرح نہیں ہوتی تھی۔ باطل پرست اوڑیسہ والے اب بھی "گھاٹ" یعنی مٹی کے برتن کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس کے اندر دیوی کی آتما سمائی ہوئی ہے۔ "کھانڈا ایتہ ن" اوڑیسہ کے فوجی نوجوان اپنے "کھرگ" اور دیگر اسلحہ جنگی کی پوجا کرتے ہیں۔

ندیا کے حصوں میں جنگلی لوگ "بندھا" تہوار مناتے ہیں۔ اس تہوار کا وقت درگا پوجا کے زمانہ میں ہوتا ہے۔ گھاٹ سلا (یہاں پر جنگلی لولو نگا راجہ رہتا ہے) میں آدھی رات کو پہلا بندھا منایا جاتا ہے گولے دغائے جاتے ہیں۔ اور ایک مہیب آواز پیدا کی جاتی ہے۔ اور اسی وقت راجا "ران کنی" کے مندر میں جاتا ہے۔ لوگ لڑائی کا باجا بجاتے ہیں۔ اور عورتیں لڑائی کا ناچ ناچتی ہوئی آتی ہیں۔ ان کے ناچنے کے اصول کئی اور مختلف ہیں چار اور پانچ عورتیں دائرہ بنا کر ناچنا شروع کرتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اور بھی عورتیں اس میں شریک ہو جاتی ہیں۔ اس موقع پر ہرے یا سفید رنگ کا لباس زیب تن کرتی ہیں۔ نقرئی و طلائی سکوں کے ہار گلے میں پہنتی ہیں۔ راجا دیوی کے سامنے تیر سے ایک بھینسا قتل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد حاضرین جلسہ بھینسے کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ اسی طریقہ سے دوسرے روز یہ ترکیب عمل میں آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی بکریوں کی قربانی کر کے راجا اور مہمانوں کے ہاتھ انھیں جانوروں کے خون سے رنگے جاتے ہیں۔ تیر مارنے کی وجہ سے اس تہوار کا نام "بندھا" رکھا گیا ہے۔ یہ تہوار شاید گرد و نواح کے زیادہ مہذب لوگوں سے صلح قائم رکھنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ ※ ※ ※ ※ ※ ※ ※ (خاص)

انڈین ہسٹاریکل جرنل

مصطفےٰ کمال پاشا

(جناب ڈاکٹر شفاعت احمد خاں ایم اے لٹ ڈی ایڈیٹر انڈین ہسٹاریکل جرنل الہ آباد)

مصطفےٰ کمال پاشا کی زندگی کے نمایاں کارناموں کا آغاز اس زمانہ سے ہوتا ہے جبکہ وہ انسپکٹر جنرل کی حیثیت سے مئی ۱۹۱۹ء میں باقر پاشا کی سرکوبی کے لیے مشرق کی طرف روانہ ہوئے تھے مصطفےٰ کی دور اندیشی نے اس نادر اتفاق میں اپنے عروج کا راز سربستہ دیکھا لہذا وہ بےخوف باغیوں کے آزاد طبع سردار کی اشتراکی صف میں شامل ہو گیا۔ اور اس وقت سے جب تک کہ ترک ازسرنو اسمرنا پر قابض نہیں ہو گئے وہ مجنوں کی طرح اپنی دھن میں مشغول رہا۔ فوجوں کو ترتیب دی۔ عدالتوں کی اصلاح کی۔ نئے نئے آئین اجرا کیے۔ انگورہ میں امور ملکی اور توضیح قوانین کی اعلیٰ مجلس طلب کی۔ غرض کہ ترکوں میں اس کے اثر نے ایک نئی روح پھونک دی اس کی عالی حوصلگی و مستقل مزاجی کی مثال اس سے بہتر اور کہاں سے مل سکتی ہے۔

اب میں کمال پاشا کی رفیع المنزلت شخصیت کے متعلق کچھ ذکر کرتا ہوں وہ کس قسم کا آدمی تھا۔ اُن کی معراجِ زندگی کیا ہے۔ کیا واقعی وہ خود غرض ہیں۔ اس پر خود استبداد کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے؟ اس کے حاکمانہ تشکیل کی تحقیق اصلاح کون سی تھی۔ ان سب سوالات کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔ ایک طرف اس کو ملک کا دلی [illegible] تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ

تمام ترکی قوم پیر کی طرح اس کی پرستش کرتی ہے اس کے نظم حکومت پر جان دیتی ہے عوام الناس اس کی صداقت و بےلوث جانفشانی کے اس درجہ معتقد ہیں اور اس کی رہنمائی میں اس قدر سرگرم ہیں کہ [illegible] صورت حال پر نگاہ کرنے سے عثمان کی (جس نے دولت عثمانیہ کی بنیاد ڈالی تھی) شاندار دور سلطنت کا خیال ہو جاتا ہے دوسری جانب ملک کے دوسرے خدامان وطن جن کی سرفروشی اور تدبر نے ترکی کو معراج کمال پر پہنچانے میں مصطفےٰ کمال کی مدد کی ہے وہ بھی قابل ذکر ہیں۔

ان لوگوں کی قربانی اور جانفشانی کی شاہد ترکوں کی جنگ آزادی ہے جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک برابر قائم رہی ہے اس گروہ میں محترمہ خالدہ ادیب خانم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ وہ ترکی کی مشہور و معروف ناول نگاروں میں سے ہیں جس وقت کہ یونانی استنبول پر قابض ہو گئے شہر کی بربادی و تباہی سے تنگ آ کر انھوں نے وطن کو خیرباد کہا۔ یہ شہر ترک کرنے پر ان کو بے انتہا مصائب و تکالیف برداشت کرنا پڑیں آخرکار بڑی مصیبتوں اور آفتوں کو جھیل کر ۲ اپریل ۱۹۱۹ء کو انگورہ میں قدم رکھنا نصیب ہوا آنے کے ساتھ ہی تعمیری کام میں لگ گئیں اور قومی جماعت نے ایک گروہ کو اپنا ہم خیال بنا کر آزادی ملک کی فکر میں لگ گئیں۔ اس جانفشانی نے ان کو ملک والوں نے اپنا قائد تسلیم کر لیا اور ان کے ابرو کے اشارہ پر کام کرنے لگے۔ ملک کے موقر اخباروں میں مضامین

وتقریریں شائع کرانے کا بھی انتظام انھیں نے کیا ڈاکٹر آرڈیل جوان کی خود تصنیف کردہ کتاب ہے اس میں انھوں نے کمال پاشا کے ساتھ اپنے امورات ملکی تحریک قومی کا تذکرہ نہایت کمال وخوبی سے قلمبند کیا ہے اور مدبرہ کی حیثیت سے تمام قومی تحریکوں پر محققانہ بحث کی ہے۔ موجودہ ترکی کا شاید ہی کوئی ایسا طالب علم ہو جس نے اس کا مطالعہ نہ کیا ہو۔

خالدہ ادیب خانم آغاز ہی سے کمال پاشا پر مشتبہانہ نظر ڈالتیں تھیں ان کو مصطفےٰ کمال کے غیر معمولی استقلال سے انکار نہیں ہے۔ وہ خود کمال پاشا کی نظم سلطنت وثابت قدمی کی دل سے قائل ہیں۔ لیکن اُن کی رائے میں کمال پاشا بے قاعدگی کا ملزم ہے۔ اُن کو یقین ہے کہ کمال پاشا نے پہلے ہی سے دفتر حکومت کے شیرازہ کو منتشر کرنے کو ٹھان لیا تھا۔ اور جس زمانہ سے انھوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اُسی وقت سے اُن کے دل میں ایک مطلق العنان حاکم بننے کی ہوس دامنگیر ہو چکی تھی۔ لیکن کمال پاشا نے اس ارادہ کو نہایت ہوشیاری اور صفائی سے حب الوطنی کے پردہ میں مخفی رکھا تھا۔

محترمہ خالدہ نے جو تصویر مصطفےٰ کمال پاشا کی کھینچی ہے اس کے اندر نفرت وتعصب کی اوصاف آتی ہے۔ مصطفےٰ کمال پاشا ظاہر وباطن میں یکساں نہیں ہے۔ ملک کی آزادی کو اپنی ذاتی غرض پر قربان کر دینے میں شاید پاشا کو روحانی اذیت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی رائے میں کمال پاشا حوادث روزگار کا قسمت آزما، وحکمت عملی سے سرفراز ہونے کا جویاں ہے۔ کمال پاشا کی فطرت میں نہ محبت ہے اور نہ رحم کا دخل ہے۔ اگر کوئی شے کبھی اس کی خود غرضانہ خواہشات کے راستہ میں نائل ہوتی ہے تو کمال پاشا غضبناک ظلم کی صورت اختیار کرنے سے گریز نہیں کرتا۔

کوہ آتش فشاں کی شعلہ افگنی کی طرح اس غازیانہ آزادی جس کے نام پر پاشا نے ملک کی مستقبل کی بہبودی کا پالنسہ پھینکا تھا۔ اور جس پر ترکی کی تمام امیدیں وتمنائیں لگی ہوئی تھیں وہ اس کے نزدیک شخصی مکمل حکومت وذاتی اختیارات حاصل کرنے کی مختلف راہیں تھیں میری رائے میں یہ بیان صداقت سے بالکل خالی نہیں ہے مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنے وفادار ساتھیوں، آزادی کے دیگر سپوتوں کے ساتھ جنھوں نے کہ دور انقلاب میں کمال پاشا کی پوری حمایت کی تھی۔ بعد میں صرف آپس کے اختلاف کی وجہ سے جو سلوک اور ظلم وستم کا برتاؤ پاشا نے اُن کے ساتھ کیا ہے وہ واقعی ایسا ہے جو خالدہ ادیب کی رائے سے متفق ہونے کے لئے مجبور کرتا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر خالدہ خانم کی تصنیف میں سے چند منتخب امور ناظرین کے سامنے پیش کر دوں۔ یہ وہ امور ہیں جو کمال پاشا کی روزانہ زندگی ومشاغل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

عصمت پاشا کے حق میں خالدہ سے زیادہ ملائمت اور نرمی سے کام لیا ہے عصمت پاشا میں ایک فطرتی مذاق ایسا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ اس کو بڑی آسانی سے اپنا رازدار بنا لیتے ہیں۔ ترکی میں وہ بہت ہی دور اندیش اور تیز فہم شخص ہے خاموشی پسند خوددار اور مزاج میں استقلال وسکون ہے۔

لارڈ کرزان نے جو سوانح عمری لکھی ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف فن سپہ گری ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ ایک مشہور مقرر بھی تھے جس کے سخن میں جادو اور گویائی میں سحر کا اثر ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی ذاتی لیاقت وپرجوش تقریر کے اثر سے ترکی میں لارڈ کرزان کی حکمت عملی کی دال نہیں گلنے دی۔ اور لاثانیہ (Lausanne) کی دوسری کانفرنس میں اُس نے کرزن کے مقدمہ

کا ہر ورق پریشان کر دیا اور اپنے ایک ایک مطالب میں کامیاب رہا میرے خیال میں مصنف کمال پاشا کے متعلق شروع ہی سے بڑے ٹھیک تھا محترمہ خالدہ کا قول ہے کہ شاید ہی کوئی سفیر یا مدبر کبھی اپنے مدعا میں اس قدر سرفراز ہوا ہو"؟

"دفعتہ کمرہ کا دروازہ کھلا۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا کا ہاتھ مجھے زینہ سے اتارنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس دھندلی روشنی میں صرف اس کے ہاتھوں کو میں صاف صاف دیکھ سکی۔ ہاتھ تنگ لیکن خوبصورت وسڈول نرم نازک انگلیاں جس کے دیکھنے سے جلدی فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کسی مرد کا ہاتھ ہے یا کسی عورت کا ہے۔ ہاتھوں کی حرکت کو دیکھ کر محمد حادث کی یاد آتی ہے یہ ہاتھ عام ترکوں کے چوڑے دبڑے ہاتھوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی کہیں کہیں ابھری ہوئی رگیں مستقل مزاجی کی شہادت دے رہی تھیں۔ یہ وہی ہاتھ ہے کہ جس نے مخالفین کی گردن کو اپنے لوہے کے شکنجہ میں پھنسا رکھا تھا۔ خوش آمدید خانم افندی اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا مزاج پرسی کے بعد ہم لوگوں کا ایک بڑے ہیکل جسم دیو شکل انسان سے تعارف کرایا گیا

مصطفےٰ کمال پاشا ڈاکٹر انڈرین وجامی بے سے گفتگو کر رہے تھے مجھکو داخل ہوتے دیکھکر میرے نزدیک آئے اور میرے ہاتھوں کو نہایت صدق دلی و تپاک سے بوسہ دیا۔ جب ہم لوگ دیوان پر بیٹھکر باتیں کر رہے تھے اُن کے چہرہ سے بشاشت چمک رہی تھی۔

گفتگو کا سلسلہ سفر کے دلچسپ حالات کے تذکرہ سے شروع ہوا، لیکن میں نے جو رائے کہ یونس نادی سے بحث و مباحثہ کر کے قائم کی تھی اس کا بیان کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

اس وقت ہماری خاص ضرورت یہ ہے کہ ایک انجمن خبر رسانی کے لئے بہت جلد قائم ہو جائے۔ باہر کی دنیا اور نیز اپنے ملک کے لوگ ابھی تک اس تحریک سے بالکل روشناس نہیں ہوئے ہیں۔

اور جس قدر لوگوں سے راستہ میں ملنے کا موقع نصیب ہوا ان سبھوں کو حالات دور حاضرہ کے حالات کی لاعلمی و بےخبری کی شکایت تھی۔ اس کا نام اناطولین ایجنسی رکھا جائیگا۔ اور آپس کی بحث میں یہ بھی طے پایا ہے کہ ہم ہی دونوں اس کے روح رواں ہونگے یہاں ہر طرف جہاں جہاں کہ تار برقی کا مرکز ہے چیزیں بھیج دی جایا کرینگی۔ شہر کے مسجدوں کی دیواروں پر بڑے بڑے حرفوں میں ملک کی چیزیں لکھ کر چسپاں کر دیا جانا چاہئے علاوہ بریں انگریزی و فرانسیسی پرچوں کو اسطور پر قابو میں کرنا چاہئے تاکہ وہ یہاں کے حالات کو صحیح طریقہ پر شائع کیا کریں۔ ٹائمس منچسٹر گارڈین دیلی ہیرالڈ جو کہ مختلف پالیسی و سیاسی طرز عمل کے صورت نما ہیں ان کو یہاں کی چیزیں شائع کرنے کے لیے مائل کرنا چاہئے ہم لوگوں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ ڈیلی کرانیکل جو کہ مسٹر لائڈ جارج کا ایک طور پر اس سے ملتا ہے۔ کہ عصمت اس وقت پاشا کا داہنا ہاتھ ہے۔ خالدہ اس کے متعلق یوں لکھتی ہے کہ مجھے بخوبی یاد ہے کہ جب ڈاکٹر آدنین اور عصمت دونوں نے ایک دوسرے کا خلوص سے بوسہ لیا تھا۔ یہ ایک عجیب کیفیت تھی کہ اس قدر دو سنگدل انقلابی آپس میں ایک دوسرے سے اتنی محبت والفت کا برتاؤ روا رکھتے تھے۔ یہ میرا ذاتی خیال تھا کہ کرنل عصمت ایسے لوگ اس انقلاب کے اندر شریک ہیں اس وقت تک اس تحریک میں وحشیانہ حرکتیں سرائت نہیں کر سکتی ہیں اور یہ لوگ کسی طرح بھی اس تحریک کو ذلیل و رسوا نہ ہونے دیں گے اور اسی سے مجھکو کمال پاشا اور عصمت کی باہمی الفت کو دیکھکر خوشی ہوتی تھی۔ ایک طرف عصمت پاشا میں گھر کی سادگی دردمندی کا احساس تھا دوسری جانب کمال پاشا میں بلند حوصلگی تھی میرا خیال تھا کہ دونوں کا باہمی ارتباط ایک دوسرے کی جو کمزوریوں کو ہم وزن بنا رکھے گی۔ خالدہ کو کمال پاشا سے اظہار مدعا کرنے میں بے انتہا مزہ

ملتا ہے۔ ٹرکی کے مستقبل عملی طرز حکومت کا سوال قوم کے سامنے پیش تھا۔ عرض بیگی ہے اُس کو بھی اپنا رازدار بنالیں۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے اس پر سوال کیا کہ کیا حکومت ملی جس کو یونونس شائع کرنے جا رہا ہے۔ میں مدد دے سکوں گی۔ میں نے پھر ایک ٹائپ رائٹر کی درخواست کی۔ جس پر پاشا نے کہا کہ آٹو فن بنک سے منگا دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس روز کے لئے گفتگو ختم ہوئی۔

عصمت کا ذکر ضمناً ہو چکا ہے۔ لیکن کچھ مزید ذکر کرتا مضمون کے لئے مفید ہوگا تاکہ تشنہ نہ رہ جائے۔ خالدہ نے بیان کیا ہے۔ عصمت اس وقت اسٹاف کا چیف تھا اور انگورہ کی مجلس مشورہ کا ایک رکن تھا۔ یہ تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ اسٹاف کا چیف اس مرتبہ پر سرفراز ہو۔

کمال کے تعلقات عصمت کے ساتھ بہت گہرے تھے۔ اس کا ثبوت جو لوگ کہ ملکی نظم و نسق کے ماہر تھے اُن کا یہ خیال تھا کہ حکومت کا ہر شعبہ ایک دوسرے کا دست نگر نہ ہونا چاہیئے اُن کی دلی آرزو یہ تھی کہ مان ٹیگو کی حرف بیانی طرز عمل میں آجائے۔ مصطفےٰ کمال پاشا ان کی مخالفت کر رہا تھا۔ وہ جمہوری سلطنت کو پسند کرتا تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ حکومت لوگوں کی زیادتی رائے پر قائم ہونا چاہیئے لہٰذا اُن کے نزدیک مختلف اجزاء حکومت کو پریشان کرنا بے معنی تھا۔ خالدہ کے نقطۂ نظر سے کمال پاشا کی دلی آرزو یہ تھی کہ وہ دور حاضرہ کا نپولین ثانی بن جائے۔

کمال پاشا کی سوانح عمری استقلال اور وقار کی ایک طول کہانی ہے۔ سیاسی انجمنوں کے بحث و مباحثہ میں اس جوش و گرمی سے کام لیتے ہیں کہ لوگ اُن کی تقریر سے بہت موثر ہوتے ہیں۔ خودداری بھی کمال پاشا میں پائی جاتی ہے شائد یہی وجہ ہے کہ وہ ہر موقع و محل پر اپنے ارادوں میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

چند لوگوں نے بڑی دقتوں کے بعد کمال پاشا کی تنظیم حکومت کی تجویز کو منظور کر لیا۔ پاشا نے اس کے بعد ایک علحدٰہ تقریر تیار کی۔ تقریر کا خاص مقصد یہ تھا کہ عوام الناس کے دلوں میں نئی حکومت کے فوائد نقش ہو جائیں ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء کو انجمن کی نشست طے ہوئی تھی۔ اس کے ایک روز پیشتر کمال پاشا مجھکو اپنے کتب خانہ میں لے گئے اور تقریر پڑھنے کی غرض سے میرے حوالہ کر دی (Hakki Behadge) پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اندر موجودہ حوادث کی انجام کا ذکر تھا جب سے کہ مصطفےٰ کمال پاشا اناٹولیا کو گئے ہوئے تھے۔ تقریر اس طور پر تیار کی گئی تھی۔ کہ جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا تھا کہ کمال پاشا ملک کا سب سے بڑا خیر خواہ ہے اُس کو مطلق العنان حاکم یا سلطان بننے کی ہوس ذرہ بھر نہ تھی۔ وہ حکومت کو رعایا کی ذمہ داری پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ میں چند باتیں اور قلمبند کرتا ہوں جس سے کہ پاشا کے چال چلن پر نئی روشنی پڑے گی۔

قومی حکومت نے مجرموں اور مخالفین کو معاف کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ عصمت پاشا نے بھی بہت کچھ سمجھایا اور اس معاملہ میں کوشش کی۔ لیکن کمال پاشا بالکل بے حس تھا اور اُن بد نصیبوں کو پھانسی پر لٹکانے کے لئے تلا ہوا تھا۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ ہم لوگ کھانا کھا کر بڑے ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سفیر کا پیغام اس وقت پاشا کے پاس آیا حسین اور عثمان بیگ کو حکومت نے بالکل معاف کر دیا تھا لیکن اس خط میں سفیر نے ان سبھوں کو پھانسی کی سفارش کی تھی باوجودیکہ انگورہ نے ان کی خدمات کا خیال کر کے ان کو بالکل معاف کر دیا تھا۔ تاہم پاشا کو یہ بات منظور نہ تھی وہ اب دستخط کرنے کے لئے جا رہا تھا کہ میں نے اٹھکر اعتراض کیا

ابھی تک میں نے کبھی بھی پاشا کو اپنا ذاتی مشورہ نہیں دیا تھا۔ جب کبھی پاشا مجھ سے رائے لیتا تھا۔ مگر میں اس کو صلاح دینا مناسب سمجھتی تھی۔ لیکن اس بے انصافی اور وعدہ شکنی سے مجھکو رنج ہوا۔

میں نے بہت کچھ کوشش کی اور نشیب فراز سمجھایا لیکن پاشا ایک جو بھی اپنے ارادے سے نہ ہٹا۔ میں نے آخر کار عصمت پاشا کی طرف مدد کے لئے نگاہ کی وہ اپنے کرسی پر بیٹھا ہوا ہماری گفتگو غور سے سن رہا تھا۔ میری التجا کی نگاہیں دیکھکر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور پاشا کی منبر کے سامنے آکر مصطفےٰ کو مخاطب کیا اس روز عصمت اور کمال پاشا کی گفتگو سننے قابل تھی۔ عصمت نے ہر طرف سے پاشا کو مجبور کیا اور ہر نکتہ بحث پر قائل کیا تاہم پاشا کا یہ قول تھا کہ ایسے موقعوں پر ہمدردی دکھلانا کمزوری کی نشانی ہے۔ دشمن کو ایک بار چنگل میں لاکر رہا کرنا بڑی غلطی ہے۔

مقتول باغی پھر سرکوبی کی جرأت نہیں کرتے ہیں۔ ورنہ ملک کے اندر ہمیشہ ان کی ذات سے خرفشار پر ہونے کا اندیشہ رہتا ہے لیکن قصّہ کوتاہ عصمت اپنی طاقت گویائی اور منصفانہ مزاج کی بدولت آخیر میں پاشا پر غالب آیا اور کمال پاشا دستخط کرنے سے باز رہا۔ لیکن دیر بہت ہو چکی تھی۔ رہائی کا حکم اجرا ہونے کے پہلے ہی عثمان اور اُس کے دیگر ساتھی سولی کے نذر ہو چکے تھے۔

مصطفےٰ کمال پاشا میں ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے وہ انسانی کمزوریوں کو خوب سمجھتا تھا۔ اُس نے شروع ہی سے تواریخ اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ مذہبی کتابوں کو اس لئے پڑھتا تھا۔ تاکہ لوگ اس کے قابو میں رہیں اور ملک کے علماء کے مخالف نہ ہو سکیں۔ لیکن وہ موقع کا انتظار کر رہا تھا کہ گھات پاتے ہی وہ ان سبھوں کو جہنم داصل کر دے گا۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ ۱۹۲۰ء کے موسم گرما میں ہیڈ کوارٹرس کے اندر زہد و پارسائی کا بے انتہا خیال رکھا جاتا تھا۔ وہاں پر کمال پاشا بڑی احتیاط کے ساتھ رہتا تھا لیکن کبھی کبھی وہ وہاں سے غائب ہو جایا کرتا تھا لیکن کہاں جاتا تھا۔ عیش و سرور کی مجلسوں میں وہ جا کر مزے اُڑاتا تھا اخلاق کی زیادہ پرواہ نہ کرتا تھا۔

پاشا کے نزدیک اس کی اہمیت بہت کم تھی۔ پاشا کا یہ قول تھا کہ زندگی کے مشکل گذرراہوں میں بڑے ہوشیاری سے قدم رکھنا چاہیئے۔ یہاں ہر قدم پر خونخوار جانور گھات میں بیٹھے رہتے ہیں۔ لہذا اگر یہاں سے صحیح و سلامت گذر کرنا ہے تو احتیاط و سختی کی ضرورت ہے۔ اکثر وہ اپنے خواب کے متعلق اپنے ساتھیوں سے ذکر کیا کرتا تھا اور اس کے ساتھی بھی کبھی کبھی اس قسم کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ کمال پاشا کی کامیابی کا یہی راز تھا۔ (خاص)

(صفحہ ۵۱۱ کا بقیہ)

کیا ہے مجھے اس میں کوئی بات قابل اعتراض نظر نہیں آتی اضافت فارسی میں ایک لطیف چیز ہے جس سے اظہار مطالب میں اختصار اور آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر جب اضافت کا استعمال اردو کی فطرت کو صدمہ پہنچائے بغیر کھپ سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے استعمال سے اجتناب کیا جائے۔ لہذا اگر ہم اضافت کی خوبیوں پر نظر کر کے اُسے اردو میں لے لیں تو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ موسم برسات کہنے میں کیا حرج ہے خوبیاں اور اچھائیاں جہاں اور جس زبان میں ہوں ضرور لینی چاہیئے۔ صرف اتنا خیال رہے کہ اردو کی فطرت مجروح نہ ہو۔ اردو کو ہر لحاظ سے ہندوستان کی زبان معلوم ہونی چاہیئے اس میں سے اجنبیت اور پردیسیت دور کرنی چاہیئے تاکہ وہ ہندوستان میں ہندوستان کی زبان بن کر رہے۔ (خاص)

انکشاف

زود پشیماں

(۱)

[جناب نسیم انہونوی، اڈیٹر انکشاف، لکھنؤ]

سعید کے والدین نے اُسکی شادی اپنے خاندان ہی کی ایک حسین اور خوش سلیقہ لڑکی سے کردی تھی، اور اسمیں شک نہیں کہ اگر سعید محض فیشن کا دلدادہ نہ ہوتا، تو زہرہ کے ساتھ اُسکی زندگی نہایت ہی عیش و آرام کے ساتھ بسر ہوتی، اسلئے کہ زہرہ حسین تھی، خوش طبع تھی اور تعلیم یافتہ بھی لیکن تعلیم کا معیار صرف اتنا ہی تھا، کہ وہ قرآن شریف کی تلاوت کرلیتی اور ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی آسانی سے کرلیتی۔ معمولی خط وکتابت اور خانگی حساب وکتاب لکھنے میں بھی وہ معذور نہ تھی لیکن اس سے زیادہ تعلیم نہ اُسے دی گئی تھی اور نہ وہ اوسکی متمنی تھی۔ اسلئے کہ وہ ایسے گھر کی تربیت یافتہ تھی جسکے کسی فرد کو بھی مغربی تہذیب یا تعلیم کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ زہرہ سلائی کا کام بھی بہترین جانتی تھی، کھانا پکانے کے لئے اسے باورچی کا رہین منت نہ ہونا پڑتا تھا۔ غرض ایک شریف اور سلیقہ مند بیوی کی تمام خصوصیات اسمیں موجود تھیں۔ لیکن یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ سعید کی نگاہ میں یہی خوبیاں خار تھیں، وہ والدین کے خوف سے تو کچھ نہ کہہ سکا، لیکن زہرہ کا [illegible] ایک جاہل بیوی؟ اسکے خیال سے ہر وہ شخص جاہل تھا جو انگریزی نہ جانتا ہو، اسے شاق تھا۔

سب سے زیادہ سعید کے لئے یہ باعث تکلیف بات تھی کہ جسوقت وہ گھر میں داخل ہوتا تو زہرہ شرم وحجاب سے اندر چلی جاتی، (اسلئے کہ دیہاتی زندگی میں حیا و شرم کا یہی معیار ابتک قائم ہے) حالانکہ سعید کی خواہشات یہ تھیں کہ وہ زہرہ کو فلٹن پر ہمراہ لیکر تفریح کے لئے جائے۔ دوستوں سے ملائے اور بالکل آزاد مغربی عورت بنادے، لیکن زہرہ نے ان باتوں کی طرف قطعی توجہ نہ کی جبکا مستقبل ایک خطرناک صورت پکڑتا گیا۔

سعید نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی تھی، اسکے خیالات بالکل مغربی تھے۔ وہ پردہ کا اتنا ہی سخت مخالف تھا جتنی "نذر سجاد حیدر صاحبہ"۔ مگر قسمت کی نیرنگی اس کو کہتے ہیں کہ شریک زندگی زہرہ ایسی لڑکی ملی جو بالکل اسکی ضد تھی سعید نے زہرہ کو بہت کچھ سمجھایا، کہ وہ اس پردے کی پرانی رسم کو توڑکر آزاد ہوجائے، مگر زہرہ کی سمجھ سے یہ بات باہر تھی۔ آخرکار یہ ہوا کہ سعید کی کشیدگی بڑھتی رہی۔ مگر زہرہ کو اسکا احساس نہیں ہوا، جسکے دو اسباب تھے۔ اول تو وہ حق پر تھی دوسرے خسر اور ساس کی موجودگی میں اسے کسی قسم کی تکلیف بھی نہ تھی، لیکن دو ہی سال کے بعد جب اُنکا انتقال ہوگیا تو زہرہ نے اپنے تئیں ایک بالکل نئی دنیا میں پایا۔ جہاں کے ہر در و دیوار سے آزادی کی صدا بلند ہو رہی تھی۔

سعید نے والدین کے مرتے ہی اپنی قدیم بارہ دری کو کرایہ پر اُٹھاکر سول لائن میں ایک نہایت ہی شاندار بنگلہ کرایہ پر لیا،

اور اُسے انگریزی طریقہ پر آراستہ کرکے اپنے اُن تمام حوصلوں کو پورا کرنا شروع کر دیا جو ایک عرصے سے دلمیں دبے ہوئے تھے۔ اسکا خیال تھا کہ صحبت کا اثر زہرہ کی معاشرت میں بھی تبدیلی پیدا کر دیگا مگر خلاف توقع ایسا نہیں ہوا۔

جب سعید نے کوششوں کے باوجود بھی اپنی حسرتوں کا خون ہوتے دیکھا، تو اُسنے ایک دن زہرہ سے صاف صاف کہدیا کہ "زہرہ تم نے ابھی تک اپنی دہقانیت ترک نہیں کی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم زمانہ حال کی ایک شریف لیڈی کی طرح زندگی بسر کرو، اور ساتھ ہی ساتھ دنیا میں نام پیدا کرنے کی بھی کوشش کرو، اسلئے کہ انسان صرف اسی لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے کہ چند روز زندہ رہکر مر جائے۔ میں نے اسی وجہ سے تمسے بارہا انگریزی پڑھنے کے لئے کہا مگر تم نے کوئی توجہ نہ کی۔ تم نہیں جانتیں کہ صرف اس بات کے لئے مجھے روزانہ دوستوں سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس "خالق باری" "مولود سعید" "جنگنامہ حضرت علی" "پنجسورہ" اور "درود تاج" ایسی کتابوں کے مطالعہ سے کیا فائدہ ہے۔

زہرہ شوہر کی باتوں کو بغور سنتی رہی لیکن جب اسنے دیکھا کہ سعید اسکی مذہبی اور اخلاقی باتوں پر بھی تنقیص کر رہا ہے تو اسکا سکوت ٹوٹ گیا، اور اسنے کہا کہ مجھے انھیں کتابوں کے پڑھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ رہا انگریزی پڑھنا میں معیوب خیال کرتی ہوں۔ اگر آپ اپنے احباب پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ میں انگریزی داں بھی ہوں تو یہ مشہور کر دیجئے میں نے ایف۔ اے تک تعلیم پائی ہے۔ بس جو آپ چاہتے ہیں وہ ہو جائیگا۔

سعید۔ لیکن اگر میرے کسی دوست نے تمسے انگریزی میں گفتگو کی تو کیا کرو گی؟

زہرہ۔ (متحیر ہوکر) تمہارے دوست اور مجھ سے باتیں کریں۔ اسکا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا؟

سعید۔ (ذرا تیز ہوکر) بس انہیں باتوں سے تو میں تمھیں جاہل خیال کرتا ہوں۔ میرے دوستوں نے اکثر تمسے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر میں ابتک ٹالتا رہا؟

زہرہ۔ ہیں! تو کیا تم مجھے غیر محرموں سے ملانا چاہتے ہو؟

سعید۔ اسمیں تمہارا نقصان ہی کیا ہے؟

زہرہ۔ بس خاموش رہئے آپنے مجھے کیا تصور کیا ہے۔ میں کوئی بازاری عورت نہیں؟

سعید۔ (قہقہہ لگاکر) یہ جہالت کی انتہائی منزل ہے۔ بیوقوف کیا دوستوں سے ملکر کوئی عورت بازاری ہو جاتی ہے۔ تم کسقدر تاریک خیال انسان ہو؟

زہرہ۔ میں نے کبھی یہ نہیں سُنا کہ شریف عورتیں یار دوستوں سے ملاقات کرتی ہوں؟

سعید۔ اگر تمنے نہیں سنا تو کوئی تعجب نہیں۔ اسلئے کہ تم ایک ایسے دیہات میں ابتک بسر اوقات کرتی رہیں جہاں کے لوگ انسان کہے جانے کے قابل نہیں۔ آجکل کی تہذیب یہی ہے کہ پردہ کو بالائے طاق رکھدیا جائے؟

زہرہ۔ ایسی تہذیب میں آگ لگے۔ مجھ سے تو یہ تاقیامت نہیں ہو سکتا؟

سعید۔ لیکن میرے احکام کی پابندی تمپر لازم ہے؟

زہرہ۔ بیشک لیکن جبکہ وہ جائز ہوں۔ بیوی شوہر کی فرمانبرداری کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے مگر۔ یہ ضروری نہیں کہ اگر شوہر گمراہی پر ہو تب بھی اُسی کے کہنے پر عمل کرتی رہے۔ میرا فرض تو اسوقت یہ ہے کہ آپ کو ان لغویات سے دور رکھوں؟

سعید۔ ہنسکر یعنی تم میری اصلاح کرو گی؟

زہرہ - اسمیں ہنسنے کی کیا بات ہے؟

سعید - صرف یہی کہ ایک جاہل عورت ایک بی - اے پاس کو نصیحت کرے؟

زہرہ - اگر بی - اے کی تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ بیوی کو طوائف بنا دیا جائے تو لعنت ہے ایسی تعلیم پر؟

سعید - (ذرا ناراض ہوکر) زہرہ تم میری Insult کر رہی ہو - سوچو کہ میں کون ہوں؟

زہرہ - میں خوب جانتی ہوں - اور میری یہ مجال کبھی نہیں ہو سکتی کہ آپکی شان کے خلاف کچھ کہہ سکوں - مگر؟

سعید - میں مگر - وگر سننا پسند نہیں کرتا - میرا حکم ہے کہ تمکو میرے ساتھ سیر و تفریح کے لئے چلنا ہوگا - میرے دوستوں سے متعارف ہونا پڑے گا - انگریزی تعلیم حاصل کرنی ہوگی - یہ بیس گز کے پائجامہ کے بجائے تمہیں نہایت ہی سبک ہلکے انگریزی لباس استعمال کرنے ہوں گے - مجھے تمہاری یہ دہقانیت ذرا بھی نہیں بھاتی - غضب خدا کا تمنے یہ ۵ اسیر کے زیور لاد رکھے ہیں - اگر میرا کوئی دوست تمکو اس حالت میں دیکھے تو یا تو مجھے بیوقوف خیال کریگا یا تم کو عورت کے بجائے سنٹرل جیل کا قیدی سمجھے گا - بس آج سے تم ان قیود سے اپنے تئیں آزاد کرو - مسّی کے بجائے لبوں پر غازہ اور چہرے کو Pale بنانے کے لئے پوڈر وغیرہ کا استعمال کرو - مجھے امید ہے کہ تم خود اُسوقت اپنے تئیں اس سے کہیں زیادہ خوبصورت پاؤگی - اور ہاں یہ بالوں کو بھی کٹوا ڈالو - آجکل کا نیا فیشن یہ ہے کہ بال گردن تک ہوں؟

زہرہ - مجھے ان میں سے کوئی بات بھی منظور نہیں - مجھ سے میم صاحب نہ بنا جائے گا - آپ خوش ہوں یا ناراض؟

سعید - دیکھو تم بہت زیادہ بدتہذیبی کی باتیں کر رہی ہو - میں زیادہ بحث کرنا فضول سمجھتا ہوں - بس اتنا سُن لو کہ جسوقت تک تم ان پر عمل نہیں کروگی، تمکو مجھسے جدا رہنا پڑیگا؟

زہرہ - کیا - کہا - مجھے آپ سے جدا رہنا پڑیگا - کیا اس زندگی میں میں آپ سے الگ ہوجاؤں گی؟

سعید - یقیناً ایسا ہی ہوگا - میں سوسائٹی میں اپنے تئیں اب زیادہ بدنام نہیں کرسکتا؟

زہرہ - لیکن میرے لئے یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں؟

سعید - جو کچھ بھی ہو ایک نہ ایک شرط تمہیں منظور کرنی ہوگی؟

زہرہ - پہلی شرط تو مجھے قطعی گوارا نہیں ہے، رہا دوسری کے لئے میں اپنے تئیں آپ کے رحم و کرم پر چھوڑتی ہوں؟

سعید - بہتر ہے؟

تیسرے روز سعید کے تار پہنچنے پر زہرہ کا بھائی آیا اور اُسے اپنے گھر لے گیا -

(۲)

زہرہ کے جانے کے بعد سعید نے یہ سمجھ لیا کہ اسکا دباؤ اسکی سرشت میں تبدیلی پیدا نہیں کرسکتا - اسلئے اُسنے نئی شادی کے لئے یہ اہتمام کیا کہ ایک روزانہ اخبار میں اپنا اشتہار دیدیا - جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی روز سے اسکے پاس خطوط کی آمد شروع ہوگئی - یہ سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا اس درمیان میں سیکڑوں خطوط آئے جسمیں کثرت کے ساتھ لڑکیوں کی تصاویر بھی تھیں - خطوط اکثر ایسے بھی تھے جو خود اُن لڑکیوں نے لکھے تھے جو آزادانہ شادی کرنے کی متمنی تھیں - ایسا بھی ہوا کہ دو چار لڑکیاں اس سے خود آکر ملیں مگر سعید نے ان میں سے کسی کو پسند نہ کیا -

سعید نے صرف ان خطوط کو حفاظت کے ساتھ رکھ لیا جو خود لڑکیوں کے لکھے ہوئے تھے - اسلئے کہ سعید کے خیال سے صرف وہی لڑکیاں اُسکی بیوی بننے کی اہل ہوسکتی تھیں جو خود اپنی شادی کی تحریک

کرسکے۔ وہ اتنا آزاد خیال تھا!

دو ماہ کے بعد سعید نے تمام تصاویر اور خطوط یکجا کر کے آخری نظر ڈالنی شروع کی تاکہ کسی ایک کے لئے اپنی رضامندی کا ووٹ دیدے۔ وہ ہر ہر تصویر کو غور سے دیکھتا، اسکے خطوط کو پڑھتا۔ صورت اور سیرت کے متعلق کچھ دل میں فیصلہ کر کے رکھ دیتا۔

ابھی وہ اسی انتخاب میں مصروف تھا کہ نوکر نے ایک کارڈ لا کر دیا جس پر مس بلقیس ایم۔ اے لکھا ہوا تھا۔

سعید نے نوکر کو اجازت دی کہ وہ مس بلقیس کو اندر لے آئے۔

ایک منٹ کے بعد مس بلقیس اندر داخل ہوئیں جو نام سے تو مسلمان ضرور معلوم ہوتی تھیں مگر لباس بالکل مغربی تھا اسکے سر پر ایک نائی انگریزی ٹوپی تھی جسمیں کٹے ہوئے بال چھپے ہوئے تھے۔ چہرہ پوڈر اور غازہ سے اور بھی دلکشا بنایا گیا تھا۔ بدن کے ایک چوتھائی حصہ پر لباس بھی تھا اسلئے کہ دونوں ہاتھ نصف سینہ اور قریب قریب نصف سے زائد ٹانگیں برہنہ تھیں۔ سعید نے نہایت ہی تبسم انداز سے اسکا خیر مقدم کیا اور پاس ہی کوچ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گیا۔ چند لمحہ سکوت میں گذرے اسلئے کہ سعید حسن اور رعب فیشن کے باعث بولنے سے معذور تھا، اور بلقیس اسی کی منتظر۔ آخر کار بلقیس نے ایک معشوقانہ انداز سے کہا، مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے آپکے کام میں بیجا دخل دیا۔ غالباً آپ اسوقت کوئی ضروری کام کر رہے تھے۔

سعید۔ نہیں نہیں۔ یہ آپ کی عین نوازش ہے کہ آپ نے تشریف لا کر مجھے عزت بخشی۔ میں بہت خوش ہوں۔

بلقیس۔ کیا آپنے اپنی شادی کے متعلق کوئی اشتہار دیا تھا۔

سعید۔ جی ہاں۔ اور اسوقت میں اسی کا انتخاب کر رہا تھا۔ میرے پاس بہت سے خطوط اور تصاویر آئی ہیں؟

بلقیس۔ کیا آپ آج اسکا انتخاب کر لیں گے؟

سعید۔ قطعی؟

بلقیس۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو میری تصویر بھی اسمیں شامل کر لیجئے۔ (تصویر دیتے ہوئے) یہ حاضر ہے؟

سعید۔ تصویر کی کیا ضرورت آپ تو خود موجود ہیں۔ مگر یہ فرمایئے آپ مذاق تو نہیں کر رہی ہیں؟

بلقیس۔ کیا آپ مجھ ایسی لیڈی سے اسی کی امید رکھتے ہیں؟

سعید۔ نہیں میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اور میرا فیصلہ ہے کہ اگر آپ تیار ہیں تو مجھے بھی کوئی عذر نہیں۔ غالباً آپ فیشن پرست ہیں اور آپ میں وہ خوبیاں بھی موجود ہیں جنکے لئے میں ایک عرصے سے پریشان تھا؟

بلقیس۔ لیکن یہ فرما دیجئے کہ شادی کے بعد آپ میری آزادی میں تو مخل نہ ہونگے۔ مسٹر سعید! اسی وجہ سے آجتک میں نے شادی نہیں کی؟

سعید۔ اوہو! کیا آپکو معلوم نہیں کہ میں نے اپنی بیوی کو صرف اسی لئے نکال دیا ہے کہ وہ آزاد خیال نہ تھی؟

بلقیس۔ تب تو ہماری زندگی آرام سے بسر ہوگی؟

سعید۔ بیشک۔ ہاں یہ فرمایئے کہ آپکے والدین کیا کرتے ہیں؟

بلقیس۔ میں تنہا ہوں۔ میرے اعزہ کا انتقال ہو گیا ہے؟

سعید۔ (مسکرا کر) میں بھی ایسا ہی ہوں۔ یہ بہت اچھا ہوا؟

(۳)

سعید اب اپنے خیال سے کامیاب ترین زندگی بسر کر رہا تھا۔ مس بلقیس اب مسز سعید کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ سعید نے فیشن پرستی کو اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ اسکے دوستوں کے سوا کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اسے کرسچین اور بلقیس کو یوروپین نہ خیال کرتا ہو۔ بلقیس رقص کی فطرتاً شیدائی تھی اور تھوڑا بہت ڈانس

کر بھی لیتی تھی مگر سعید نے اُسے ایک مکمل مغربی رقاصہ بنا دیا۔ شہر کا کوئی ڈانس ایسا نہ ہوتا، جہاں مسز سعید شریک نہ ہوتیں، اور پھر خوبی یہ کہ جسطرح سعید دوسری لیڈیوں سے بغلگیر ہو کر رقص کرنا معیوب نہ خیال کرتا اسیطرح مسز سعید کو دوسرے انگریزوں اور فیشن پرست ہندوستانیوں کے ساتھ ڈانس کرتے دیکھکر ناخوش نہ ہوتا۔

بلقیس اول تو حسین تھی دوسرے شباب کا عالم تھا اور ان سب باتوں پر اسکی عریانی، مصنوعی ناز و نخرے نزاکت اور رعنائی وغیرہ نے اسکے حُسن کی ہر چہار طرف دھوم مچا رکھی تھی۔ ہر کس و ناکس اسے دیکھکر ایکبار دل پکڑ لیتا۔ بڑے بڑے امرا اس فکر میں رہا کرتے کہ کسی طرح مسز سعید سے نیاز حاصل ہو جائے اور اکثر انگریز اس خیال میں بھی تھے کہ اسکو بہکا کر عیسائی کر لیں۔

سعید مسز سعید کی شہرت کو اپنی کامیابی اور شہرت سمجھ کر جامہ سے باہر ہو جاتا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سعید کے احباب اس کثرت کے ساتھ ہو گئے کہ اسے ان سب سے ملاقات کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ مسز سعید کا کمرہ بالکل علٰحدہ تھا۔ اسے ہر کس و ناکس سے ملنے کا اتنا ہی اختیار تھا جتنا کہ سعید کو چنانچہ مسز سعید کے دوست یار اسکے حُسن کے متوالے ہر وقت اسکے پاس آتے رہتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ سعید کثرت کار کے باعث شام کو تفریح کے لئے نہ جا سکتا تو مسز سعید اپنے کسی دوست کے ہمراہ تفریح کو مکمل کر لیتی اسلئے کہ وہ بالکل آزاد تھیں۔

(۴)

سعید صرف ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا ملازم تھا اور کم و بیش اتنی ہی آمدنی جائداد سے بھی تھی۔ لیکن اسکے باپ نے بینک میں بہت کافی روپیہ چھوڑا تھا، جسے وہ نہایت ہی بے دردی کے ساتھ خرچ کرتا رہا۔

مسز بلقیس کے پاس جائداد وغیرہ کچھ بھی نہ تھی، اور نہ اسکا ہی راز معلوم ہو سکا کہ وہ ایکسو روپیہ ماہوار کی کوٹھی میں کسطرح بسر کرتی تھی۔

بہرحال ایک ایسی حسین اور فیشن پرست ایم۔ اے لیڈی کے لئے اس قسم کی آسانیاں ہر گام پر پہنچ سکتی ہیں۔ وہ کچھ بھی کرتی تھی، مگر یہ ضرور تھا کہ شاہانہ زندگی بسر کرتی تھی۔ اسکا معمولی لباس بھی پانچسو سے کم میں تیار نہ ہوتا تھا۔ وہ کئی روپئے روز کا سینٹ (عطر) اور لونڈر وغیرہ رومالوں اور کپڑوں پر چھڑک کر ختم کر دیتی تھی۔ سعید نے شادی کے بعد ہی اسکے لئے پانچ رقص کرنے والے لباس تیار کرائے تھے جو ولایت سے پندرہ ہزار میں بن کر آئے تھے اور اسقدر خوشنما اور خوشرنگ تھے کہ جسوقت وہ ہال میں انھیں پہنکر جاتی تو لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہونے لگتیں۔

ڈیڑھ سال تک تو دولت کی فراوانی کسی شوق میں حائل نہ ہوئی، لیکن اسکے بعد سعید کی محدود آمدنی ایک بالکل حقیر رقم تھی جو کسی طرح بھی صرف رقص و سرود کی مجلسوں کے لئے بھی کافی نہ ہو سکتی تھی ادھر شراب فیشن کے مست اور متوالے سعید پر عیش و راحت کا خمار ایسا چڑھا تھا کہ اُسے دنیا میں بلقیس اور فضول خرچیوں کے سوا کچھ دکھائی ہی نہ پڑتا تھا۔ وہ ہر ہر منٹ اسی اولوالعزمی کے ساتھ بسر کرنا چاہتا تھا جیسا کہ دو سال سے عادی تھا۔ اسنے بلا کسی رد و قدح کے اپنی تمام جائداد نیلام کر دی۔ اور ایکبار وہ پھر امیر بن گیا۔

اس مرتبہ بلقیس نے مشورہ دیا کہ ایک لاکھ کی یکمشت رقم معمولی نہیں۔ اگر اس سے تجارت کیجائے تو بہت بڑی کامیابی ہو سکتی ہے لیکن تجارت کے لئے ہر شہر موزوں نہیں۔ میرے خیال سے بمبئی میں یہ کام خوب ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہاں کی نیرنگیاں بھی دیکھنے میں آئیں گی سنتی ہوں کہ بمبئی ہندوستان کی جنت ہے۔

سعید جسکے ہوش و حواس خفتہ تھے، نوکری کو خیرباد کہکر فوراً تیار ہو گیا۔

عیش پرستوں کے لئے اگر بمبئی کو ہندوستان کا پیرس کہا جائے تو غیر موزوں نہیں، اسلئے کہ بمبئی وہ جگہ ہے جہاں انسان لاکھوں

روپیہ روز بیکار مشاغل میں صرف کرسکتا ہے۔ بلقیس نے بمبئی میں پہنچتے ہی تاج ہوٹل میں قیام کیا اور وہاں کی سوسائٹیز میں شریک ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ اسکے حُسن جہاں تاب کی شہرت بمبئی کے بڑے بڑے تاجروں کے کانوں میں بھی پہنچ گئی، اور ہر کروڑپتی انسان اس سے ملنے لگا محض اس لئے کہ وہ حسین تھی، اور حُسن سے زیادہ فیشن نے اُسے رشکِ حُسن بنادیا تھا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد انکی دعوتیں ہونے لگیں۔ بڑے بڑے جلسے کئے جاتے جنمیں مسز سعید صدر مقرر کیجاتیں، انکے فوٹو لئے جاتے اور اخبارات میں شائع کردئے جاتے۔ ان عیش پرستیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعید جس مقصد کے لئے بمبئی آیا تھا۔ اُسکا بھولکر بھی خیال نہ آیا اسے صبح سے لیکر شام تک محض تفریح کی ضرورت تھی جسمیں بلقیس بھی ساتھ ہوتی۔

۶ ماہ اسی شادمانی کے ساتھ بسر ہوگئے اسلئے کہ ایک لاکھ روپیہ خرچ کرتے کرتے ختم ہوتا ہے۔ سعید سمجھا تھا کہ بڑے بڑے تاجر اس سے ملنے آتے ہیں، شاید وہ تو بھی ان ہی جیسا ہے۔ لیکن یہ محض فریب تھا فیشن کا ورنہ اسکی ۔ ہی سہی امارت بھی ختم ہو رہی تھی۔

آخر کار وہ دن بھی آگیا جو ایسے خود فراموش انسانوں کے لئے ضروری ہے۔ اب انکے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا اور نہ کہیں سے ملنے کا کوئی ذریعہ تھا۔ بلقیس نے ذرا غمزے کے ساتھ کہا آخر اب بسر کہاں سے ہوگی ایکہزار سے زیادہ تو ہوٹل کا باقی ہے دوسرے میرے ڈریس بھی پرانے ہوگئے ہیں۔ میں کبتک اس تنگ حالی میں بسر کروں گی۔ سعید کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا مسز سعید نے بھی وہی کیا جو اُسے کرنا چاہئے تھا۔ صبح کو سعید نے اُٹھتے ہی میز پر ایک خط پایا۔ جسمیں لکھا تھا۔

مسٹر سعید

تمنے ایک ایم۔ اے لیڈی سے شادی کرتے وقت اسپر نہیں غور کیا تھا کہ اسکی فیشن پرستیوں کے لئے تمہاری حقیر جائداد اور آمدنی کتنے عرصے تک کافی ہوگی۔ خیر یہ تمہارا فعل تھا۔ میں جسوقت تک وفادار رہ سکتی تھی رہی۔ اب چونکہ تم فاقہ مست ہو رہے ہو، اور میرے شباب کی قدر و منزلت کرنے والے اب بھی سیکڑوں موجود ہیں اسلئے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ، میں اپنے عیش کو برباد کردوں تمہارا خود بھی یہی خیال تھا کہ دنیا صرف عیش و راحت کے لئے بنی ہے۔ غالباً تم اسوقت بھی مجھے یہی مشورہ دیتے۔ خیر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اب میں بالکل آزاد ہوں۔ تمہارا مجھپر کوئی اختیار باقی نہیں رہا محض اس لئے کہ شادی کرتے وقت بجائے نکاح پڑھانے کے تمنے یہی الفاظ کہے تھے کہ "جسوقت دو دل ایک دوسرے سے متفق ہوجائیں تو پھر نکاح کی ضرورت نہیں رہتی، اسلئے کہ نکاح نام ہے طرفین کی رضامندی کا۔" اسلئے اُسوقت ہمارے قلوب متفق تھے تو ہم زن و شوہر تھے مگر اب جبکہ مجھے تمسے نفرت پیدا ہوگئی ہے تو میں تمہیں اپنا شوہر تسلیم نہیں کرسکتی۔ غالباً تم آزادی پسند ہوتے ہوئے میری اس حرکت پر اظہار مسرت کروگے۔ آج سے میں مسز سعید نہیں رہی۔

بلقیس

سعید نے خط کو ختم کیا لیکن اس حالت میں کہ اسکی آنکھیں خونبار ہو رہی تھیں اور چہرے کا رنگ سرخی مائل ہو رہا تھا اسنے خط کو زمین پر پٹک کر اپنے سر کے بال نوچنے شروع کئے اور اسکے بعد وہ ایک گھنٹہ تک ایسی ایسی حرکتیں کرتا رہا جیسے پاگل معلوم ہو رہا تھا۔ مجبوراً منیجر ہوٹل نے اسے نکال دیا۔

سعید دیوانوں کے مانند بمبئی کی گلیوں میں پھرتا رہا۔ وہ ہر فیشن ایبل عورت پر بلقیس کا گمان کرکے ایک نظر ڈالتا۔ مگر ناکام واپس آتا۔ وہ ہر خوبصورت عورت کو بلقیس تصور کرکے انتقام لینا چاہتا مگر بے سود۔ وہ ہر کوٹھی اور بنگلہ میں بلقیس کی موجودگی کا

شبہ کرنا مگر فضول۔ وہ بالکل سودائی ہوگیا تھا۔ لوگ اسے ذلیل انسان خیال کرتے تھے، اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ وہی سعید ہے اسے ٹھکرا دیتے۔ سعید کی حالت اسوقت اُس بادشاہ یا جواری کی سی ہو رہی تھی جسنے اپنا تمام مال و متاع اپنی حماقت سے دشمن کے حوالہ کردیا ہو۔

(۵)

زہرہ جانے کو تو گھر ملی گئی تھی، مگر جسوقت اُسے یہ معلوم ہوا کہ سعید نے کسی میم سے شادی کرلی ہے تو اُسکا دل ٹوٹ گیا، اُسنے سمجھ لیا کہ سعید اب اس سے کبھی ملتفت نہ ہوگا۔ "وہ پُرانی تہذیب کو چھوڑکر آزادی اور عریانی کو پسند کرلے"۔ یہ خیال اسکے دل میں غیرارادی طور پر دوڑ گیا مگر اسکے ضمیر نے باپ دادا کی عزت پر دھبہ لگانا گوارا نہ کیا۔

زہرہ نے ایک مرتبہ دل کڑا کرکے سعید کو خط بھی لکھا کہ وہ اسے لونڈی کی طرح اپنے پاس رہنے کی اجازت دیدے مگر سعید نے اسپر کوئی توجہ نہ کی اسلئے کہ وہ بلقیس کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔

زہرہ کے رنج و غم نے آخرکار دِق کی صورت اختیار کرلی۔ اسکا حسین اور نازک چہرہ رفتہ رفتہ مرجھانے اور زرد ہونے لگا۔ اسکی غذا قریب قریب ترک ہوچکی تھی اور ڈاکٹروں نے کہدیا تھا کہ اگر اسے سکون و قرار چندروز اور نصیب نہ ہوا تو زندگی مشکل ہوجائے گی۔

زہرہ کے والدین نے یہ بھی کوشش کی کہ سعید سے فارغ خطی لیکر اسکی شادی کسی دوسرے کے ساتھ کردیں مگر زہرہ کے غیور دل نے اسے پسند نہ کیا، وہ خود دار تھی اور اپنی خودداری کو ذلیل کرنا نہ چاہتی تھی آخرکار اُسکی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی، یہانتک کہ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوگئی۔ اسکے والدین نے دوا علاج میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا مگر مرض بڑھتا گیا جیوں جیوں دوا کی اسلئے کہ اسکا مرض لاعلاج تھا اور اگر اسکی دوا کوئی تھی تو صرف سعید کی توجہ۔

لوگوں کے مشورہ سے زہرہ کے والدین اسے بمبئی لے گئے جہاں ایک دِق کا مشہور ڈاکٹر تھا۔ خیال ہوا کہ شاید تبدیل آب و ہوا ہی کا کچھ اثر پڑے۔

بمبئی کے شاہی اسپتال میں زہرہ کو ڈاکٹر نے دیکھا، اسکی حالت پر متاسف ہوا اور بہایت ہی انہماک کے ساتھ علاج کرنے لگا۔ مگر زہرہ ان دواؤں سے اچھی نہ ہوسکتی تھی۔ آخرکار مجبور ہوکر ڈاکٹر نے کہدیا کہ اسے وطن لیجاؤ ورنہ مٹی بھی نصیب نہ ہوگی۔

آج زہرہ اسپتال سے رخصت ہوکر وطن جانے والی تھی، اسے گو اپنے مرض کے متعلق لاعلاج ہونے کا یقین پہلے ہی سے تھا۔ مگر امید انسان کا دامن مرتے وقت تک نہیں چھوڑتی۔ ایسی نازک حالت میں بھی زہرہ کبھی کبھی اس خیال میں محو ہوجاتی کہ سعید اسکا برگشتہ شوہر ایک روز راہ راست پر آجائے گا، اور پھر اسے اپنی آغوش میں لیکر پیار کریگا۔ زہرہ کے جانے میں صرف چند گھنٹے باقی تھے۔ اسی عرصہ میں ایک دِق کا نیا مریض داخل کیا گیا جسے میونسپل بورڈ کے محکمہ حفظان صحت کی جانب سے بھیجا گیا تھا۔ اسلئے کہ اسکا کوئی بھی والی اور وارث بجز خدا کے نہ تھا۔ اس مریض کو زہرہ ہی کا پلنگ دیا گیا تھا، اسلئے کہ اُسکی سیٹ (جگہ) آج خالی ہونے والی تھی۔

پردہ نشین ہونے کے باعث زہرہ کے پلنگ کے کنارے پردے پڑے ہوئے تھے، مگر جسوقت اسے لیجانے کے لئے وہ ہٹائے گئے تو زہرہ کی پہلی نظر اسی مریض پر پڑی جو اسکی خانہ پُری کرنے کے لئے آیا تھا۔ زہرہ نے ایک حیرت کے ساتھ اسے گھور کر دیکھا، اور باپ کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ "اُبّا جان" کیا مرتے وقت میری نگاہیں جیسے دھوکا دے رہی ہیں۔ یہ میرے سامنے۔ . . . . . .

زہرہ کے باپ نے مریض کی طرف دیکھا اور نفرت کے ساتھ

نگاہ پھیر کر کہا۔ بیٹی تیرا خیال ٹھیک ہے مگر یہ وہ سعید نہیں ہے۔ جسکے لئے تیرا دل بے چین ہو رہا ہے۔ یہ انسان نما حیوان ہے۔ خبردار اس پر رحم نہ کھانا۔

زہرہ نے تڑپ کر کہا۔ آہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ میں اور انھیں بھول جاؤں۔

سعید حیرت کے ساتھ زہرہ کو دیکھ رہا تھا۔ اسوقت ایک ایک کرکے تمام گذشتہ واقعات اسکی نگاہوں میں چکر لگا رہے تھے۔ وہ مرنے کے قریب تھا مگر اب اسے زہرہ کی محبت ستا رہی تھی۔ اسنے رحم خواہ نگاہوں سے زہرہ کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر کہا "میری خطاؤں کو معاف کردو۔ ایک شریف اور نیک بیوی ہوتے ہوئے اپنے بے وفا اور بدکردار شوہر کی غلطیوں کو معاف کردو۔

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں" (زہرہ کے باپ نے غصہ کے ساتھ کہا) بیٹی اگر تونے میرا کہا نہ مانا تو تیری عاقبت خراب ہو جائے گی۔ سوچ یہ وہی ہے جسنے تیری زندگی کو برباد کردیا۔

زہرہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "ابا جان میری زندگی تو انکی تھی ہی۔ اگر خراب ہوگئی تو اسکا کیا گلہ۔ میں خود گنہگار ہوں ورنہ یہ مجھ سے ناراض کیوں ہوتے"۔

زہرہ کے باپ نے پھر غصہ کے ساتھ سعید کو مخاطب کرکے کہا۔ سعید۔ نام کے سعید مگر ناخلف تونے دیکھا دنیا عیش کے لئے بنی ہے یا غم کے لئے۔ یہ تیرے اعمال کا نتیجہ ہے کہ تو اس طرح ہو رہا ہے اگر تونے میری معصوم لڑکی کا دل نہ دکھایا ہوتا تو آج تیری یہ حالت نہ ہوتی۔ بتا اب وہ بلقیس کہاں گئی جو ہر وقت سایہ کی طرح تیرے ساتھ رہتی تھی۔ بیوقوف کیا تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ برا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔

سعید خاموشی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں خود لعنت ملامت کر رہا ہے۔ آخر کار زہرہ نے نہایت ہی نحیف آواز میں کہا۔ "میں امید کرتی ہوں کہ اب آپ آزادی نسواں کے مخالف ہوں گے۔ کاش آپ اب بھی میری استدعا کو منظور کرلیں بہت ممکن ہے کہ ہماری زندگی کی امیدیں جو منقطع ہو چکی ہیں پھر قائم ہو جائیں

سعید نے جواب دیا کہ "خدا تمہیں اچھا کرے مگر میں اب زندگی سے سیر ہو چکا، اور کوئی امید باقی نہیں رہی کہ میں کچھ روز اور جی سکوں گا۔ اسلئے کہ میری موجودہ زندگی بھی موت کے ہم پلہ ہے . . . . . .

یکایک سعید نے متحیر ہو کر سامنے سے نوروزجی کو آتے دیکھا جو بمبئی کے مشہور سیٹھ تھے اور جنکے ساتھ بلقیس بھی تھی جسنے اب پارسی لباس پہن لیا تھا۔ شاید وہ اب مسز نوروزجی تھی۔ سعید کے تمام بدن میں کمزوری کے باوجود ایک ارتعاش پیدا ہو گیا، اسکے تیوروں سے ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ بلقیس کا اسی وقت خاتمہ کردیگا۔ اُدھر بلقیس نے اسپر ایک سرسری نظر ڈال کر زہرخندہ کے ساتھ منھ پھیر لیا۔ گویا وہ سعید سے ناواقف تھی۔ سعید کے جذبات اسقدر مشتعل ہوئے کہ وہ ایک آہ سرد کے ساتھ فرش پر گر پڑا۔

زہرہ کے علاج میں اُسکے والدین نے اپنے گھر کا تمام اسباب تک فروخت کرکے صرف کردیا تھا اور اسوقت اُنکے پاس جو کچھ باقی تھا، وہ صرف زہرہ کے زیور تھے، جنکے لئے وہ قطعی فروخت کرنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ سعید کی ملاقات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ زہرہ دن بدن اچھی ہونے لگی۔ اسکا قیام ایک ماہ تک بمبئی میں رہا۔ اس عرصہ میں وہ کئی مرتبہ سعید کو دیکھنے گئی۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سعید بھی اچھا ہو گیا۔

وطن واپس آکر سعید کو گویا دوبارہ زندگی نصیب ہوئی مگر اسے سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ وہ بالکل مفلس تھا۔ اسوقت زہرہ نے اپنے تمام زیور نکال کر اسکے سامنے

رکھدیئے اور کہا کہ اے سعید یہ وہی فضول سونے کے ٹکرے ہیں جنھیں پہنکر میں ایک قیدی نظر آتی تھی، اور جنسے تمھیں نفرت تھی - میرا خیال ہے کہ بزرگوں نے زیوروں کا چلن صرف ایسے ہی دقتوں پر کام آنے کے لئے رائج کیا ہوگا . . . .

میں نے قسم کھائی ہے کہ زیور نہ پہنوں گی لہذا تم انھیں فروخت کرکے کاروبار کرو . . . . . . اور میری کوئی خواہش نہیں - مگر ہاں دیکھئے آپ آیندہ مجھے بے پردہ ہونے کے لئے استدعا نہ کیجئے گا -

سعید کے چہرے سے عرق انفعال ٹپک رہا تھا - اس نے شرمندگی کے ساتھ زہرہ کی طرف دیکھا اور ہر طرف خاموشی دیکھکر اُسے آغوش میں لے لیا -

انکی آیندہ زندگی نہایت ہی کامیابی کے ساتھ بسر ہوئی، اور پھر کبھی سعید نے آزادی کا نام نہیں لیا -

(خاص)

شرح غم

[جناب شکیل صاحب زیدی معاون انکشاف ہے]

آپ ہی - اپنی کیوں دوا نہ کرین — لاؤ اظہار مدعا نہ کریں
ان کو آمادہ جفا نہ کریں — ہو جو ممکن تو التجا نہ کریں
حضرت دل کو مشورہ دیدوں — ضبط غم - صرف التجا نہ کریں
کون ہمدرد بیکساں ہوگا — آپ ہی جبکہ ابتدا نہ کریں
کہدو جاکر کہ حضرت عیسیٰ — مجھ کو شرمندہ دوا نہ کریں
بزم جاناں میں جائیں تو لیکن — اُن سے امید اعتنا نہ کریں
پرسش حال - چارہ سازی غم — آپ چاہیں اگر تو کیا نہ کریں
خلش زخم دل! ارے توبہ!! — اب وہ ناوک کہیں خطا نہ کریں

زندگی ہو عزیز جن کو شکیل
دل کا اپنے کبھی کہا نہ کرین

(خاص)

اودھ اخبار

تاریخی چھڑی

[جناب شوکت تھانوی معاون اودھ اخبار لکھنؤ سابق مدیر معاون ہمدم لکھنؤ]

بھائی زبیر اچھے خاصے توانا تندرست تھے یکایک بیمار پڑ گئے اور ایسے بیمار پڑے کہ بڑے بڑے سول سرجنوں نے دق کا فتویٰ دیدیا اب کیا تھا بیچارہ کو چت لٹا دیا گیا اور بات تک کرنے کو منع کر دیا تھوڑے دنوں تک تو گھر پر پڑے رہے لیکن جب بخار کم نہ ہوا تو میڈیکل کالج میں جا کر لیٹنا پڑا وہاں جا کر بیچارے کے ایک پھیپھڑے کو ہوا بھر کر بیکار کر دیا گیا اور روزانہ اس نیمو تھوریکس کا سلسلہ جاری رہنے لگا جس کے یہ معنی گویا انکو مجبور کیا جا رہا تھا کہ بس ایک ہی پھیپھڑے سے زندہ رہو موسم سرما میں تو خیر اُن سے پھر بھی قرب حاصل تھا اس لئے کہ میڈیکل کالج بھی لکھنو ہی میں ہے لیکن جیسے ہی موسم گرما کی آمد آمد ہوئی اُنکے معالج نے اُنکو بھوالی ضلع نینی تال کے سنا ٹوریم میں بھیجنے کا مشورہ دیا اور وہ آخر کار ع بھیجے ہیں ہمیں بھوالی ہیں۔ کہتے ہوئے لکھنؤ سے تشریف لے گئے۔ انکے بھوالی جانے کے بعد اُنکا تو خیر جو کچھ حال ہوا وہ اُنکے خطوط سے ظاہر ہے جسمیں وہ ہمیشہ لکھا کرتے تھے کہ "بحمد اللہ بخیریت ہوں اور آپ کی خیر و عافیت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے" لیکن ہم اپنے فرصت کے اوقات میں اکثر اور بیشتر دست بدعا رہنے لگے کہ خداوند کریم اُنکو صحت کلی عطا فرمائے۔

گرمیوں کے ختم ہونے کے بعد جب بھوالی میں برف باری کا شروع ہونے کو ہوئی تو آپ وہاں سے واپس آئے اور اس طرح واپس آئے کہ بیمار تو خیر معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن دستی چھڑیوں کے سوداگر ضرور معلوم تھے کہ آپ کے ہمراہ کوئی ڈیڑھ درجن چھوٹی بڑی۔ موٹی۔ پتلی۔ ٹیڑھی سیدھی چھڑیاں اور ڈنڈے اور لاٹھیاں اور لٹھ تھے جنکو دیکھتے ہی ہم سمجھ گئے کہ ان میں سے ایک نہ ایک ہماری قسمت میں بھی لکھی ہے چنانچہ جس وقت اُن چھڑیوں اور ڈنڈوں کی تقسیم شروع ہوئی تو آپ نے ہم کو بھی ایک پتلی سی چھڑی عنایت فرماتے ہوئے کہا کہ یہ تو روزمرہ کے استعمال کی ہے اور بڑی مضبوط ہے اور پہاڑی ہے اور عمدہ ہے اسکے بعد ایک دوسری گرہ دار پتلی سے ذرا موٹی اور موٹی سے ذرا پتلی بادامی رنگ کی چھڑی اُٹھاتے ہوئے فرمایا کہ مگر ایک خاص چیز ہے اور میں بس تمہارے لئے لایا ہوں اُسکی صفت یہ ہے کہ یہ گرمیوں میں جب ہاتھ سے پسینہ چھوٹتا ہے تو نہایت خوشگوار خوشبو دیتی ہے اُسکا نام ہے چیبری کی لکڑی یہ دو قسم کی ہوتی ہے ایک ولایتی دوسری جاپانی لیکن جاپانی زیادہ بیش قیمت ہوتی ہے اور یہ وہی ہے اسکو حفاظت سے رکھئے گا اور اس سے آپ بہت خوش ہونگے اس لکچر کے بعد وہ چھڑی ہمارے حوالہ کر دی گئی۔ ہم نے اپنے ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر گرمانا چاہا تا کہ چھڑی کی خوشبو محسوس کر سکیں اور اس محویت میں ہم نے بھائی زبیر سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آپ کا دوسرا پھیپھڑا

بھی بخیریت ہے یا خدا نخواستہ نہیں۔

وہ جاپانی تم بھوالوی چھڑی آج تک ہمارے پاس بخریت ہے حالانکہ اس بیچاری پر اتنے حادثات گذرے کہ اُسکو از روئے قاعدہ جنت میں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن نہیں معلوم کہ بھائی زبیر نے کس نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ وہ ہمکو دی تھی کہ حوادث کی تیز اور تند آندھیاں بھی اُسکو ہم سے نہ چھڑا سکیں اور اب تو ہمکو یقین ہوگیا ہے کہ اگر ہم خود اسکو چھوڑنا چاہینگے تو بھی وہ ہم سے اس پالو کتے کی طرح نہ چھوٹے گی اور جو دریا پار پھنکوا دینے کے پہر تھے گھنٹے دم ہلا ہوا ہمارے گھر میں نظر آتا ہے۔

سب سے پہلے یہ چھڑی ہمارے ہمراہ ایک دوست کے یہاں تک گئی لیکن وہاں سے واپسی پر ہم خالی ہاتھ تھے اور ہم ایسے بے وفا نکلے کہ ہمکو اس غریب کا راستہ بھر خیال نہ آیا جب رات کو بستر پر سونے کے لئے لیٹے اور تمام دن کا نقشہ ہماری آنکھو کے سامنے پھرا تو ہمکو چھڑی بھی یاد آئی اور ہم نے بستر سے اُٹھ کر اُس کھونٹی پر دیکھا جسپر وہ ہمارے یہاں آنے کے بعد سے ابتک لٹکا کرتی تھی لیکن وہ کھونٹی ویران نظر آ رہی تھی اور اسپر ایسی یاس کا عالم طاری تھا گویا اسکا سہاگ لٹ گیا ہے اب ہمکو ذرا تشویش ہوئی اور ہم نے اپنی دن بھر کی ایک ایک نقل و حرکت پر آنکھیں بند کرکے غور کرنا شروع کر دیا کہ وہ کہاں تک ہمارے ساتھ تھی اور کہاں سے جدائی ہوئی لیکن ہمکو اُسکا چھوٹنا نہ یاد آتا تھا نہ آیا بڑی دیر تک یاد کرنے کے بعد ہم نے ایک آہ سرد کے ساتھ اُسکو صبر کر لیا اور سو گئے تمام رات خواب میں وہ چھڑی ہمارے ہاتھ میں تھی۔

رات گذری دن ہوا۔ دن کٹا رات آئی یہانتک ہفتوں سے مہینے گذر گئے لیکن اُس چھڑی کا کہیں پتہ نہ لگا اور ہم اس کو بھولنے لگے ایک دن اتفاق سے وہ دوست ہمارے مکان پر آگئے جن کے یہاں ہم چھڑی گم کرنے گئے تھے اور اُنکے ہاتھ میں اپنی چھڑی دیکھکر اُنکی طرف جھپٹے وہ سمجھے کہ ہم جوش خلوص میں مصافحہ یا معانقہ کرینگے۔ لیکن ہم اُنکے ہاتھ سے چھڑی کو لیکر اوپر سے نیچے تک دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ بولے:-

"کیا یہ تمہاری ہے"؟

ہم:- "اور نہیں تو کیا تمہاری ہے"؟

وہ: "یہ تو بہت دلوں سے میرے یہاں پڑی تھی میں سمجھا کہ کوئی بھول گیا ہوگا اور جب اُس کی لاوارثی کو ایک عرصہ گزر گیا تو میں نے استعمال کرنا شروع کر دی"۔

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ وہ یہ سمجھکر کچھ بگڑ بھی گئے کہ شاید ہم نے اُن پر چوری کا شبہ کیا ہے لیکن ہمکو تو اپنی چھڑی کے ملنے پر اتنی مسرت تھی کہ ہم چھڑی کو دیکھنا چھوڑ کر اُن سے گفتگو کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ایک دن دفتر پہنچنے میں اتنی دیر ہوگئی تھی کہ ہمکو سوائے جلد سے جلد دفتر پہنچ جانے کے اور کوئی فکر ہی نہ تھی چنانچہ دفتر پہنچ کر جب سب سے پہلی مرتبہ ہمکو چھڑی کا خیال آیا تو ہم سمجھے کہ جلدی میں گھر پر بھول آئے ہیں اور اسی اطمینان پر تمام دن چھڑی کی جدائی ہم پر گراں نہیں ہوئی لیکن جب گھر پر آکر ہم نے اُس کو نہ پایا تو گھر کے ایک ایک بڈھے جوان اور بچہ کو بلا کر تحقیقات کی سب کے بیانات لئے بڈھوں سے خوشامد کی جوانوں کو لالچ دی بچوں کو دھمکایا لیکن سب انکار کرتے رہے بلکہ ہماری بیوی نے اپنی عینی شہادت پیش کر دی کہ "واہ میں خود تمہارے ایک ہاتھ میں رومال اور ایک میں چھڑی دیکھی تھی تمنے چھڑی سے پردہ بھی ہٹایا تھا اور بکری کو بھی مارا تھا"۔ ہمکو خاموش ہو جانا پڑا لیکن تھوڑی دیر کے بعد ہم نے

پھر بیوی سے پوچھا کہ "تم کو اچھی طرح یاد ہے کہ چھڑی کے متعلق جو کچھ تم نے کہا ہے وہ آج ہی کا قصہ ہے؟" اور جب اُنھوں نے ہمکو یقین دلایا کہ آج ہی دفتر جاتے وقت ہم چھڑی لیکر گھر سے نکلے تھے تو ہم نے اُسکے دوسری مرتبہ گم ہونے پر صبر کر لیا اس لئے اِبکی مرتبہ تو کسی دوست کے یہاں بھی نہیں گئے تھے جو اسکے ملنے کا کوئی امکان ہو۔ لیکن صاحب خداوند کریم واقعی مسبب الاسباب اور بڑا رحیم ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ یکہ والا جسپر ہم دفتر گئے تھے دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور ہماری چھڑی ہمارے حوالہ کر دی ہم نے حیرت سے پوچھا:۔ یہ کیا؟"

اُس نے جواب دیا آپ یکہ پر بھول گئے تھے بڑی مشکل سے آپکا گھر ملا ہے تو اُسوقت آیا ہوں"

ہم کو اسکی ایمانداری پر ایسی خوشی ہوئی کہ کہ دل چاہا کہ اپنی تمام جائداد اسکے نام منتقل کر دیں لیکن بال بچے والے کے لئے یہ بات چونکہ ناممکن تھی لہذا انعام کے طور پر ہم نے فوراً دو پیسے اسکو دیدئے وہ سلام کر کے چلا گیا اور ہم نے چھڑی لاکر کھونٹی پر ٹانگدی اب ہر شخص نے ہمکو قائل کرنا شروع کر دیا کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ چھڑی لیکر دفتر گئے تھے۔ چونکہ چھڑی مل گئی تھی لہذا ہم نے بھی کوئی ناراضگی کا اظہار نہ کیا بلکہ ہنسی خوشی سب کی باتیں سنتے رہے۔

اس کے بعد بھی متعدد مرتبہ کھوئی اور ملی لیکن وہ اسی طرح یکہ سے گری اور راہگیروں نے چیخنا شروع کر دیا "چھڑی گر گئی چھڑی گر گئی" اور ہم نے فوراً یکہ رکوا کر چھڑی اٹھا لی لیکن تحریک سول نافرمانی کے سلسلہ میں جب لکھنؤ میں ہنگامہ ہوا اور دفعہ ایک سو چوالیس یا کرفیو آرڈر کے ماتحت چھڑی لیکر نکلنا ممنوع قرار پایا اسوقت بھی ہم نے چھڑی کو نہ چھوڑا اور برابر اُس کو ہاتھ میں لئے نکلتے رہے۔ ایک دن امین آباد کے چوراہے پر آرمڈ پولیس کے ایک سپاہی نے ہمکو روکا اُس سپاہی کے پاس لکڑیوں، ڈنڈوں، لاٹھیوں اور چھڑیوں کا ایسا انبار لگا ہوا تھا کہ گویا وہ بھی بھائی زبیر کی طرح بھوالی سے آیا تھا فرق صرف اتنا تھا کہ بھائی زبیر چھڑیاں تقسیم کرتے تھے اور وہ چھڑیاں وصول کرتا تھا۔ بہر حال اُس کے روکنے پر ہم رک گئے اُس نے کہا:۔

"یہ چھڑی دیدو"

ہم نے جواب دیا "کیا کہا؟"

وہ۔ کہا یہ کہ "یہ چھڑی دیدو"

ہم۔ "کیا کروگے اسکو"

وہ۔ "ہم کو حکم ہے سب سے چھڑیاں لے لیں"۔

ہم۔ "لیکن یہ تو ڈنڈا نہیں ہے چھڑی ہے"۔

وہ۔ "ہوا کرے اسے اِدھر لائیے"۔

ہم۔ "سنو تو بھائی تمکو تو یہ حکم ہے کہ ایک انچ موٹی لکڑی تم لے سکتے ہو اور یہ ایک انچ سے کم ہے"

وہ۔ "ہم کچھ نہیں جانتے یہ چھڑی ہے تو لاؤ اسکو ادھر"

ہم۔ پہلے اسکو ناپ لو اگر ایک انچ نکل آئے تو ضرور لے لو نہیں تو.....

وہ۔ "ہم کچھ نہیں سن سکتے چھڑی ہمکو دو"

ہم۔ "اچھا ہم کل سے لیکر نہیں نکلیں گے"

وہ۔ آج تو نکلے ہو چھڑی لاؤ"

ہم۔ "خیر آج جانے دو اب معلوم ہو گیا"۔

وہ۔ "جانے کیسے دیں چھڑی لاؤ ہم نہیں جانتے"۔

یہ کہکر اُس نے ہمارے ہاتھ سے چھڑی لے لی اور ہم منہ دیکھتے رہ گئے ہماری چھڑی بھی اسی انبار میں پھینکدی گئی اور ہم قانو

چارہ جوئی کے ارادے سے پولیس کی چوکی طرف چلے کہ افسران بالا کو اس اہم معاملہ کی طرف متوجہ کریں پولیس کی چوکی پر اس زمانہ میں سب انسپکٹر بھی رہا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی آجاتے تھے ہم نے جاکر فوراً سب انسپکٹر صاحب سے کل حال کہدیا وہ بیچارے کچھ مرد مسلمان واقع ہوئے تھے فوراً ہمارے ہمراہ موقع واردات پر تشریف لائے اور سپاہی سے ہماری چھڑی طلب کی اُس نے فوراً چھڑی اُٹھا کر دیدی سب انسپکٹر صاحب نے اُسکو ہر طرح ناپ کر تول کر سپاہی سے کہا "دیکھو ایسی چھڑیاں نہ لیا کرو یہ ایک انچ سے کم ہیں" اور ہمکو چھڑی دیدی ہمارے خیال میں چھڑی کے معاملہ میں اس سے زیادہ کامیابی ہمکو کبھی نہیں ہوسکتی تھی لہذا ہم فتحمندانہ نظروں سے سپاہی کو دیکھتے ہوئے گھر چلے آئے اور چھڑی کو بدستور کھونٹی پر ٹانگدیا ایک دن تو اس چھڑی کی وجہ سے کمال ہی ہوگیا کہ ہم معہ اُسکے ایک مشاعرہ میں گئے اور اُسکو اپنے سامنے رکھکر بیٹھ گئے اتفاق سے ہمارے نزدیک ہی ایک اور صاحب کے پاس اسی قسم کی ایک چھڑی تھی اُنھوں نے ہماری چھڑی کو اور ہم نے اُنکی چھڑی کو اُن نظروں سے دیکھا جنکا مفہوم یہ تھا کہ "ارے ان کے پاس بھی ایسی چھڑی ہے" اور اسکے بعد خاموشی کے ساتھ مشاعرہ سنتے رہے عین اُسوقت جب ہماری باری آئی اور ہم غزل جیب سے نکال کر دوزانو ہوکر بیٹھے وہ حضرت مشاعرہ سے اُٹھکر جانے لگے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی لہذا ہم اُنکی طرف متوجہ بھی نہ ہوئے بلکہ صدر مشاعرہ سے پوچھا "اجازت ہے عرض کرتا ہوں" اُنھوں نے فرمایا "بسم اللہ" اور تمام حاضرین ہماری طرف متوجہ ہوگئے ہم نے ایک ہاتھ سے چھڑی کو ٹٹولتے ہوئے پڑھنے کا ارادہ کیا کہ ہمکو چھڑی کے نہ ہونے کا شبہہ ہوا اب جو ہم نے اسکو دیکھا تو واقعی نہ تھی بلکہ اُس کی جگہ پر دوسری اسی قسم کی چھڑی رکھی تھی ہم سمجھ گئے

کہ یہ حضرت جو ابھی اُٹھکر گئے ہیں ہماری چھڑی لے گئے ہم فوراً مشاعرہ سے اُٹھے اور باہر کی طرف اس طرح بھاگے کہ ہمکو حاضرین کے متوجہ ہونے کی بھی پرواہ نہ ہوئی ہم جب باہر آئے تو وہ حضرت موجود تھے اور چھڑی اُنکی بغل میں دبی تھی ہم نے اُنکی چھڑی اُنکو دیتے ہوئے کہا جناب یہ آپکی میری چھڑی مجھکو دیجئے" اُنھوں نے تعجب سے دونوں چھڑیوں کو دیکھا اور کہا "جی ہاں جی ہاں" ہم چھڑی لیکر واپس ہوئے اسوقت مشاعرہ میں عجیب چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کسی نے کہا "جناب وہ ضرور خفا ہوکر گئے ہیں" دوسرے نے "چھڑی کا لیجانے کا کون سا شک تھا" دوسرے صاحب بولے مگر کوئی بات بھی تو نہیں ہوئی تیسرے نے فرمایا "معلوم ہوتا ہے غزل گر گئی" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ہمکو دیکھکر سب بولے "وہ آگئے وہ آگئے" اور ہم "چھڑی بدل گئی تھی" کہتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور غزل پڑھنا شروع کردی۔

اب سنئے کہ اُس چھڑی کو ہم نے سفر بھی کرایا یعنی اپنے ہمراہ بھانسی بریلی سلطانپور وغیرہ لے گئے لیکن یہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی ایکمرتبہ ہمکو شاہجہانپور جانے کا اتفاق ہوا اور حسب معمول چھڑی بھی ہمارے ساتھ تھی ہم معہ اپنی چھڑی کے بخیریت تمام شاہجہانپور پہنچے لیکن ہمکو دوسرے دن صبح ہی کو سیتاپور جانے کا اتفاق ہوگیا لہذا اس سفر میں بھی چھڑی ہمارے ساتھ تھی اور سیتاپور سے شاہجہانپور آتے ہوئے بھی تمام راستہ وہ ہماری نظروں کے سامنے موجود رہی لیکن جب گاڑی شاہجہانپور کے اسٹیشن پر رکی تو اسباب اتروانے کی گڑبڑ میں ہم نے اُس غریب کو چھوڑ دیا اور تمام اسباب کی طرف سے اطمینان کرکے اسٹیشن سے باہر آگئے بلکہ تانگے پر روانہ بھی ہوگئے مگر وہ چھڑی نہ آئی جب گھر پہنچ کر تانگہ والے نے کرایہ کے معاملہ میں جھگڑا کیا اور ہم نے اسکو مارنا چاہا تو چھڑی نہ تھی اب کیا کرتے یہ واقعہ تو قطعاً ایسا تھا کہ اب ہم کو چھڑی نہیں مل سکتی تھی گاڑی چھوٹ چکی تھی اور ہم گھر آگئے تھے اس مرتبہ تو چھڑی کی جدائی کو دائمی سمجھکر ہماری آنکھوں میں آنسو بھرآئے اور ہم نے

ہر ایک سے آہ سرد کے ساتھ اپنی مرحومہ چھڑی کا ذکر کیا اور جس نے جس نے بھی سنا چھڑی کے ملنے کی طرف سے مایوسی کا اظہار کیا اس لئے کہ وہ گاڑی شاہجہانپور سے چل کر روسا جنکشن پر رات بھر کھڑی رہتی ہے اور صبح چھ بجے پھر شاہجہانپور آکر سیتاپور روانہ ہو جاتی ہے اول تو اسی چکر میں چھڑی کو غائب ہو جانا چاہیئے دوسرے جس گاڑی سے ہم لکھنؤ آنے والے تھے وہ ساڑھے پانچ ہی بجے چھوٹ جاتی تھی لہذا ہم چھ بجے والی گاڑی پر اپنی چھڑی تلاش بھی نہیں کر سکتے تھے غرضکہ ہر طرف سے مایوسی ہی مایوسی تھی ہم نے دل پر پتھر رکھ لیا اور مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے کہکر صبر کی طرف مائل ہوئے۔ رات بھر چھڑی یاد آئی اور صبح ہم چھڑی کی یاد لئے گھر سے اسٹیشن روانہ ہوئے اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ دہرہ میل جس سے ہم لکھنؤ آنے والے تھے پچاس منٹ لیٹ ہے ہم نے اسٹیشن پر ٹہلنا شروع کر دیا تھوڑی ہی دیر میں وہ سیتاپور والی گاڑی نظر آئی اور ہماری نظروں کے سامنے چھڑی کی تصویر گھومنے لگی ہمارا دل دھڑکنے لگا کہ خدا کرے چھڑی ملجائے کہ اتنے میں گاڑی پلیٹ فارم پر رک گئی اور ہم آہستہ آہستہ زیر لب دعائیں کرتے ہوئے اپنے درجہ کی طرف بڑھے اور دروازہ کھولکر جو دیکھا تو چھڑی گدے پر لمبی لمبی لیٹی ہوئی تھی بلکہ اس کے قریب ہی ایک پیتل کا قفل بھی رکھا تھا ہم نے چھڑی کو اصل اور قفل کو سود سمجھکر رکھ لیا اور اپنی قسمت پر فخر کرتے ہوئے گاڑی سے نکل آئے یعنی واللہ کوئی امکان ہی نہ تھا کہ چھڑی مل جائے گی لیکن دہرہ میل کا لیٹ ہونا ہمارے لئے اُسی دن لکھنؤ لوٹنا وغیرہ یہ سب باتیں ایسی تھیں جو فطرت کی طرف سے غیر محسوس طور پر ہو رہی تھیں اور چھڑی کا خلوص ہمکو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اگر یہی چھڑی اتفاق سے بجائے لکڑی ہونے کے انسان ہوتی تو ہمارا اور اس کا افسانہ بھی لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد وغیرہ کی طرح آج بچہ بچہ کی زبان پر ہوتا لیکن کوئی ہمارے دل سے پوچھے کہ ہمکو وہ چھڑی اب کتنی عزیز ہے ہم کو معلوم ہے کہ وہ بیجان ہونے کے باوجود ہم سے ایک خاموش محبت رکھتی ہے اور ہم اس کو اسی طرح چاہتے ہیں کہ اب اُس کی جدائی ہماری کمر توڑے گی اسوقت ہم لکھتے جاتے ہیں اور محبت بھری آنکھوں سے اسکو دیکھتے جاتے ہیں وہ بھی کھونٹی پر ٹنگی ہے اور ہوا سے جھوم جھوم کر ہماری محبت کو گویا محسوس کر رہی ہے وہ تو کہئے کہ یہ ہماری چھڑی ہے یعنی ایک مضمون نگار کی جو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ ایک مضمون لکھدے ورنہ اگر یہ کسی بادشاہ کی ہوتی تو آج اسکو جادو کی چھڑی اور نہیں معلوم کیا کیا سمجھا جاتا بہر حال اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک تاریخی چھڑی ہے اور اُس کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی جب یہ ہمارے ولائت کے سفر میں سمندر میں گرنے کے بعد تیرتی ہوئی بندرگاہ بمبئی پہنچے گی اور واپسی میں ہمکو ملے گی۔

(خاص)

اودھ پنچ

خط ایڈیٹر اودھ پنچ بنام ایڈیٹر چاند

[جناب حکیم سید ممتاز حسین صاحب۔ ایڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ]

محترم و معظم جناب منشی کنھیا لال صاحب

تسلیم۔ اودھ پنچ کا بار تنہا اپنی گردن پہ لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کام چور ہو گیا۔ پھر بھی دو چار ورق کا مضمون لکھنا پہاڑ کے پتھر ڈھونے کے برابر نہ تھا جو تعمیل حکم سے گردن تابی کرتا۔ اور بہانہ ڈھونڈھتا مگر دو قسم کی بیماریوں نے یکبارگی حملہ کر دیا۔ ایک ملیریا بخار جس نے تمام ڈیل پر کرم فرمایا۔ دوسرے اسفل جسم کے بعض دو سر یا تیسری عضو "تولید مثل" پر آمادہ ہو گئے آپ جانتے ہیں مردوں کو تولید کی زحمت یا عسر ولادت کی ایذا سے کب واسطہ پڑتا ہے؟ پھر تولید بھی کس کی۔ اوندتے پھوڑے کی تین چار ہفتے اس مخصوص اور موذی بیماری نے ضایع کئے۔ خدا خدا کر کے اب تفرق اتصال ہوا ہے۔ اس حالت میں چاند کے لئے مضمون لکھنا بہت مشکل ہے۔ عذر لنگ نہیں عذر صحیح قبول فرمائیے۔

مجھے جب اس کا علم ہوا کہ آپ نے میرا نام اہل قلم کی فہرست میں لکھ لیا تو بہت تعجب ہوا۔ آجتک سیکڑوں مضمون قدیم اور جدید نظم و نثر لکھنے والوں کے متعلق ماہواری رسالوں اور اخباری کاغذوں میں شایع ہوئے ان میں کہیں میرا ذکر یا میرا نام نہیں۔ اور ہے بھی تو اعتراضات کی ٹھکڑیوں بیڑیوں میں مقید ہے۔ خدمت اردو معلی کا خلعت دوسروں کے جسم کی زینت نظر آتا ہے۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ ایک تو میں ادیب نہیں۔ دوسرے بیمار تیسرے متروک الدنیا۔ چوتھے اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ نالایقی کا خلعت جو برادری نے عنایت کیا ہے اسے نامنظور کر دوں اور زبردستی کہوں کہ میرا شمار کاملین روزگار میں ہونا چاہئے۔ پانچویں سب سے بڑا عذر یہ کہ ڈرپوک ہوں یعنی مرد میدان مقابلہ و مسابقت نہیں۔ پھر بھلا کیا سمجھ کے مضمون نگاری کی بانگی دکھاؤں جناب میرا دور ہی سے سلام ہے۔

میں ان لوگوں کا حشر کتب تاریخ میں دیکھ چکا ہوں جن کو جہل مرکب کی بیماری نے تشکل کا بوسی کی طرح دبوچا اور اپنے پرائے کے سامنے بے جانی بوجھی بات میں دخل دے کے ذلیل ہوئے:۔

(۱) اسحٰق بن ابراہیم موصلی کے سامنے ابو عبیدہ نے قدما کے بعض شعر پڑھے۔ اسحاق نے پوچھا "کیوں جی اس کلام میں کوئی حسن یا مزہ بھی ہے؟" عبیدہ نے جواب دیا "نہیں" اسحاق نے ناک بھوں چڑھا کے کہا "تو پھر کیوں گدھے کی طرح بوجھ اٹھائے پھرتے ہو"۔

ممکن ہے کہ میری بے مزہ عبارت دیکھ کے آپ سے یہی سوال ہو کہ جناب منشی صاحب آخر اس شخص کے ٹوٹے پھوٹے جملوں اور بے ربط عبارت میں کیا لال لگے ہیں جو آپ نے خواہ مخواہ اچھا بھلا کاغذ ردی بنا ڈالا؟ اے حضرت اس سے تو بہتر تھا کہ ملا فلاں جناب فلاں مسٹر فلاں۔ پروفیسر فلاں سے مضمون لکھنے کی درخواست کی ہوتی جو سید الہیئتی ادیب و ظریف ہیں اور جن کے رشحات قلم کے زیر بار احسان آج ہندوستان بھر کے میگزین ہیں۔

(۲) بنی تمیم (قبیلہ) کا ایک شخص ابو نواس فرزدق

سنئو شاعرِ عرب کے پاس آیا اور کہا" میں نے ایک شعر کہا ہے سُن لیجیے" فرزدق نے شعر سنا اور چند لمحہ کے بعد کہا" سنو بھائی شعر کو ایک نہٖ سالہ اونٹ فرض کرو جس کے اجزائے جسم کی تقسیم یوں ہوئی کہ امرؤالقیس کے حصّے میں تو سر آیا۔ عمر بن کلثوم نے کوہان پایا عبید بن الابرص نے ران پر قناعت کی اعشیٰ کو سُرین ملی زهیر نے پٹھے ہتھیائے طرفہ کے ہاتھ سینہ لگا نابغتان (نابغۂ جعدی و نابغۂ ذبیانی) پہلو اور پسلیاں لے بھاگے۔ میں سب کے آخر میں پہنچا۔ تو اُم (پنڈلیاں اور ٹانگیں) اور پیٹ کا مالک میں بنا۔ اوجھڑی بچی ہوئی اور خون پر جزار یہ کہہ کے قابض ہوا کہ یارو مجھے بھی کچھ ملنا چاہیئے۔ ہم نے کہا لے جاؤ تمھیں مبارک ہو۔ اوجھڑی بچی ہوئی اسے پکا کے کھائی مگر نہ بچی تو زمین دیکھی اور دکھائی۔ میاں تمہاری شاعری وہی جزار کے پیٹ سے نکلا ہوا فضلہ ہے۔

جناب ایڈیٹر صاحب! مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں کوئی مستقل مضمون لکھوں تو وہ اگلوں کے پیٹ کا فضلہ سمجھا جائے گا۔

ابھی تک لوگوں نے بجائے خود یہ طے کیا ہے کہ پرانے اودھ پنچ کے ماخوذات جدید اودھ پنچ کے حیات کا سبب ہیں۔ ابی وہ وقت ہی اور تھا۔ وہ زمانہ ہی اور تھا۔ وہ لوگ ہی اور تھے۔

(۳) ایک شاعر صاحب نے اپنے برادرِ مکرم سے فرمایا کہ میں شاعر ہو گیا ہوں سنا آپ نے ؟ انہوں نے ارشاد کیا بھائی یہ کوچہ پرخطر ہے۔ خیر مگر سناؤ تو سہی۔ شاعر صاحب مستعد ہوئے۔ ابھی یہی ایک شعر پڑھا تھا ؎

هل تعرف الدار بالقفنینا
ابکیننا فاحسزنینا

کیا تم اس گھر کو جانتے ہو جو قفنینا میں ہے اور اسنے مجھے رولایا اور رنجیدہ کیا) نون کی نامعقول تکرار سے جھلا کے بھائی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے" ابے مردود اگر تو نے دوسرا شعر پڑھا تو خدا کی قسم تجھے کنویں میں ڈھکیل دوں گا۔

اڈیٹر صاحب۔ مجھ بے بضاعت فرومایہ کا مضمون دیکھ کے مبادا چاند کے خریداروں میں سے کوئی کنویں میں ڈھکیلنے پر آمادہ ہو جائے۔

(۴) ابنِ صباح کی کنیز جس کا نام بُرھان تھا۔ ابن صباح کے مہمان بُنان کے سامنے گانے بیٹھی ؎

ان نفسی رسول نفسی الیها
ولنفسی جعلت نفسی رسولا

(میرا نفس خود میرے نفس کا معشوقہ کی طرف پیامبر ہے۔ اپنے نفس کے لئے میں نے اپنے نفس کو پیامبر بنایا ہے)

بنان نے برہان کے منہ پر ہاتھ رکھ کے کہا۔" چپ لب تو سارے گھر میں فس فس پھس پھس کی آواز گونجنے لگی"

منشی صاحب! میں ڈرتا ہوں کہ چاند میں میرا سڑا ہوا سا مضمون دیکھ کے لوگ چاند کے منھ پر ہاتھ نہ رکھیں۔

(۵) ایک شاعر صاحب شعر پڑھ رہے تھے دوسرے نے تعریف کی" واہ صاحب! کیا شکر ہے جس میں مٹھاس نہیں"

حضرت بیمار ہوں۔ بیماری میں ٹھٹھول کیسے سوجھتی ہے۔ کڑوی دوائیں پیتے پیتے زبان تلخ ہو گئی۔ سوکھے ٹھیٹھے۔ یا زہر خند اور بن مٹھاس کی شکر ایک ہی ہیں۔ تاریخ میں بُرے اور بے معنے مضمون کے نتائج صدہا درج ہیں مگر سب سے بڑا یہ واقعہ ہے کہ محمد بن حسن الحصفی کے صاحبزادے کو شاعری کا شوق ہوا۔ مگر وہ صرف شاعری

[بقیہ صفحہ ۶۹۹ پر دیکھئے]

انقلاب

غزل

(شریمتی جے دیوی حیاؔ - سابق ایڈیٹر "انقلاب")

جل بجھے ہم نہ رہا داغ نہیں دل باقی — نہ تو وہ شمع رہی ہے، نہ وہ محفل باقی
راہ کترا کے وہ جاتے ہیں سوئے بزم عدو — حوصلہ اب بھی ہے تجھ میں کشش دل باقی
پر پروانہ کہیں ہیں، کہیں ہے شمع کا گل — صبح کو رہ گئی یہ رونق محفل باقی
ہاتھ رکھا ہے ستمگر نے مرے سینے پر — کچھ تو رہ جائے الٰہی تپش دل باقی
ڈالی ہیں قہر کی نظریں سر محفل اُس نے — کیا کروں ہائے نہیں ہیں جگر و دل باقی
گردشیں کیوں نہ دیں ساقی کی خماری آنکھیں — نشہ میں کیا ہو خیال حق و باطل باقی
کیوں کشیدہ ہے گلے تیغ سے مل لینے دے — دل میں رہ جائے نہ قاتل ہوس دل باقی

اے حیاؔ یار کی مژگاں کا تصور نہ گیا
رہ گئی دل میں ہمارے خلش دل باقی

(خاص)

(صفحہ ۵۶۸ کا بقیہ)

کی تہمت اپنے سر لینا چاہتے تھے۔ محاسن شعر یا معنویت کی پروا انہیں نہ تھی۔ ایک دن باپ سے کہنے لگے "ابا - ابا - میں نے شاعری شروع کر دی۔ باپ نے جواب دیا کہ سناؤ صاحبزادے اس پر مچلے کہ اگر شعر آپ کو پسند آیا تو ایک لونڈی یا ایک غلام انعام میں لوں گا۔ بابا نے حامی بھری کہ ایک نہیں دو دونگا۔ اب تو صاحبزادے دل کھول کے پر کٹی اڑانے لگے جصنی کو غوریا آگیا اور کہنے لگا :- خدا کی قسم ایسے اشعار کا صلہ نہ لونڈی ہے نہ غلام۔ مگر یہ دست میں تیری ماں کو تین طلاقیں دیتا ہوں جس نے ایسا یاوہ گو لڑکا جنا

بہر کیف جناب ایڈیٹر صاحب میں عذر خواہ ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے میدان نظم و نثر میں بھیڑوں کے ساتھ کلول کرنے پر مجبور نہ فرمائیں گے۔ میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ مجھے کوئی دعوی یا سلیقہ انشا پردازی میں نہیں۔ میں نے تو "چندیں شکل برائے اکل" کے طور پر یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ زیادہ نیاز

آئینہ

اُردو

[جناب وحید الدین احمد سابق ایڈیٹر "آئینہ" الٰہ آباد]

کچھ عرصہ سے اردو کے ادیب اور انشا پردازوں کا رجحان اس طرف ہو رہا ہے کہ اردو میں فارسی و عربی کے نامانوس اور غریب الفاظ اور ترکیبوں کی بھرمار سے زبان میں اظہار خیال کے لئے وسعت پیدا کریں اور انہوں نے شاید اس ذریعہ سے اردو کو انگریزی کا ہم پایہ بنانا چاہا ہے۔ لیکن اس کوشش میں سب سے ضروری امر جو اردو کی ترقی اور ترویج کا باعث ہوا ہے اس کو ان بہی خواہان اردو نے قطعی نظر انداز کر دیا۔ اردو کی عالمگیری اور ہر دلعزیزی کا خاص سبب اس کا عام فہم ہونے کے علاوہ اس میں دوسری ہندوستانی زبانوں کی آمیزش تھی۔ یہی وجہ تھی اور ہے کہ اردو بہت تھوڑے تغیر کے ساتھ ہندوستان کے ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ان حضرات نے اردو کی اس سب سے بڑی خصوصیت سے اس کو محروم کر دیا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو ہونے والا ہے ظاہر ہے۔ فارسی کا یہ مصرعہ۔ سعدی از دست خویشتن فریاد۔ بالکل اردو کی حالت پر صادق آتا ہے۔ کس قدر تعجب و حیرت کا مقام ہے کہ اردو کو ابتدا میں غیروں سے امداد ملی اور غیروں نے اس کی زندگی اور بقا کے سامان فراہم کئے اور آج خود اپنی ناعاقبت اندیشی سے اسکی ہلاکت کے ذریعے اور اس کے فنا ہو جانے کے اسباب مہیا کر رہے ہیں۔ اردو کے آخری دور کے شعرا اور بہی خواہان زبان کو اس کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی مرحوم کا کلام اور سرسید کی نثر بطور ثبوت پیش کی جا سکتی ہیں۔ عدم گنجایش کی وجہ سے مولانا حالی کی صرف ایک نظم کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ اردو کے اس نامور شاعر پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ مولانا حالی کی ایک مشہور حمد کے یہ چند شعر اور اس میں الفاظ خطوط کشیدہ خاص طور پر ملاحظہ طلب ہیں۔

اے سارے سنسار کے مالک ÷ بے پر اور پروار کے مالک

اے اندھوں کے آنکھ کے تارے ÷ اے لوٹے لنگڑوں کے سہارے

دُکھ میں تسلی دینے والے ÷ نیا جہاں کی کھینے والے

اب جب تب تجھ سا نہیں کوئی ÷ تجھ سے ہیں سب تجھ سا نہیں کوئی

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہندوستان کسانوں اور کاشتکاروں کا ملک ہے۔ اس کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔ پھر کیا ہماری موجودہ دور کی شاعری میں جو عربی و فارسی الفاظ و ترکیبوں سے پٹی پڑی ہے۔ ان کے تمدن و معاشرت کی کوئی جھلک نظر آتی ہے یا ان کے جذبات کا دھندھلا سا پرتو بھی دشمن نظر آتا ہے؟ اور پھر ایسی صورت میں کیا اردو کی شاعری ہندوستان کی شاعری کہلائی جا سکتی ہے؟ ایک صاحب فکر کا قول ہے کہ کسی ملک کی شاعری اس ملک کی معاشرت و تمدن کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کیا ان معنوں میں اردو شاعری اس معیار پر جانچے جانے کی متحمل ہو سکتی ہے؟ ایک موقعہ پر میں نے کسی سے ایک دوہا سنا تھا جو حسب ذیل ہے۔

کہر گھسے - پیر تھکے — پیٹھ نہ بوجھا لے
ایسے بوڑھے بیل کو کون باندھ بھس دے

اسوقت بے اختیار میرے منہ سے نکلا کہ یہ واقعی ہندوستان کی شاعری ہے۔ اور ہندوستان کی شاعری کے لئے یہی زبان اور انداز بیان مناسب ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر آج مولانا حالی اور ان کے دوسرے عاقبت اندیش معاصرین کا تتبع کیا جاتا تو آج یہ دوہا بلا تامل اردو زبان کا شعر کہلاتا۔ موجودہ اردو شعرا تو شاید اس شعر کو اردو کا شعر کہنا اردو کی توہین سمجھیں۔ مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اگر اردو کو اسی طرح اجنبی اور پردیسی بنانے کی کوششیں جاری رہیں تو وہ دن دور نہیں ہے جب ہندوستانی اردو کو بھی بدیشی کپڑے کی طرح بائیکاٹ کردیں گے۔ اور جب تک اردو ان الفاظ و محاوروں کو قبول کرنے سے انکار کرتی رہیگی جو صدیوں سے ہندیوں کی زبان پر ہیں اور جب تک اس میں ہندی اور دوسری دیسی زبانوں کے الفاظ کو عربی و فارسی پر ترجیح نہ دیجائے گی اسوقت تک اردو کا مستقبل ہندوستان میں تاریک اور مایوس کرنے والا رہیگا۔ ایک طرف اردو کا یہ حال ہے اور دوسری طرف ملک کی بدقسمتی سے ہندی کے بہی خواہ وادیب اردو دانوں کی دیکھا دیکھی ہندی میں آدھے سے زیادہ سنسکرت کے نامانوس و ثقیل الفاظ و محاورے شامل کرکے ان دونوں زبانوں کے اختلاف کی خلیج کو اور زیادہ وسیع بنا رہے ہیں۔ لیکن بہی خواہان ہندی کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنی زبان کو ایک مردہ زبان کا خوشہ چیں بناکر بجائے فائدہ کے نقصان اٹھائیں گے۔ سنسکرت ملی ہوئی ہندی کبھی مقبول ہوکر ملک کی زبان نہ قرار دیجاسکے گی۔ ہندی اور اردو کی بہتری اور بھلائی اسی میں ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی جائے اور

بہت تھوڑے تغیر کے ساتھ یہ مشترکہ زبان جس کا آیندہ نام ہندوستانی رکھا جائے ملک بھر میں رواج پائے۔ اردو کے حامیوں کا ایک ضروری اور اہم فرض یہ بھی ہونا چاہیئے کہ ہندو مت اور دوسرے ہندوستانی مذاہب کی مقدس اور مذہبی کتابوں کو باقاعدہ طور پر ترجمہ کے ذریعے اس طرح اردو میں منتقل کریں کہ ایک ہندو یا کوئی غیر مسلم اپنی روزمرہ کی مذہبی معلومات کے لئے کسی دوسری زبان کا محتاج نہ رہے۔ سب سے آخر میں حامیان اردو سے یہ عرض کروں گا کہ وہ ذرا وسعت نظر سے کام لیں اور ہندی الفاظ و محاورں کو اردو میں منتقل کرتے وقت فراخ دلی اور عالی حوصلگی برتیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کی آب و ہوا اور ہندوستانیوں کے گلے کی ساخت وغیرہ کی مناسبت سے اردو کو سدھاریں اور اس میں وہ صلاحیت پیدا کریں جس سے ہندوستان کے رہنے والے اسے اپنی مادری زبان کہہ سکیں اور وہ ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار پاسکے۔ حرکت یا کلمہ رمضان یا غلطی کا عربی تلفظ جن میں تین یا تین سے زیادہ حروف متواتر متحرک ہوں ترک کردیں۔ تین حرفوں کا متواتر متحرک ہونا اردو کی نظرت اور فصاحت کے خلاف ہے۔ اسی طرح تین حروف کا مسلسل سکون بھی اردو کی فطرت کے خلاف ہے۔ لہٰذا انگریزی داں اصحاب کو چاہیئے کہ جب وہ کارڈ یا کورٹ اردو میں بولیں تو کارڈ اور کورٹ کے بجائے کارڈ اور کورٹ کہیں تاکہ ایسے الفاظ اردو میں مستعمل ہو جائیں اور ہندوستانیوں کی زبان سے جو انگریزی سے ناواقف ہیں ادا ہوسکیں۔ اکثر حضرات فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان اضافت کا استعمال قابل اعتراض سمجھتے ہیں اور اس کو انشا پردازی کی غلطی اور زبان سے ناواقفیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ لیکن میں نے جہاں تک غور

[بقیہ صفحہ ۲ ۵۵ پر دیکھئے]

بائیسکوپ

نرالی اُردو

(کارخانہ کے ایک کاریگر کی زبانی)

(جناب ایم۔ اے۔ معنی۔ بی۔ اے۔ سابق ایڈیٹر بائیسکوپ دہلی)

[ذیل کی عبارت دیکھتے وقت زیروزبر اور الفاظ کی عجیب وغریب تبدیلیوں کو ضرور ملحوظ خاطر رکھئے]

بعض آدمی تو جناور سے بھی بدتر ہوتے ہیں جنکے وِن کی عُقل گدّی کے پیچھو ہوتی ہے کہ اپنے آگو کسو دوسرے کو کچھ سمجھتے ہی نئی۔ دُور کیوں جاؤ مُنتیاز ہی کو دیکھ لو جِتّا جُتّا آٹھ دِن وہے پلوانی کرتے وسے ہوئے ہیں مگر پھر دخت کھال سے باہر رہتا ہے۔ گو یا افلاطون کا بچہ بنا وا ہے۔ بے ناحق لوگوں سے اڑتا ہے کسو کو مار کسو کو پیٹ ایک زور اٹھار کھا ہے۔ میں نے کِتّی ایک دفعہ وِس سے کیا کہ دیکھ وئی منتیاز تو اِتّا اکڑا اکڑا نہ کر۔ بڑے بول کا سر ہمیشہ نیچو ہوتا ہے یہ فضول میں ہر ایک کو ستانا اچھا نئی ہے کدھی کسو بیڈھب سے واسطہ پڑ گیا تو تو تیرے تکلّے کے سے بل نکل جائیں گے گر وہ آدمی ہو تو سمجھے وسے تو اپنی جوآنی اور پلوانی پر اِتّا غرہ تھا کہ میری وصیت کو ایک کان سنا ایک کان اُڑا دیا۔ سنا نہ سنا برابر کیا۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ ایسا آدمی ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے میں کیوں اپنی زبان تھکاؤں ہاں اِس فِکر میں ضرور رہا کہ کسو طریاں وسے اپنی آنکھوں کے سامنے سیخ پلتا وا دیکھوں۔ اور میری یہ مراد پوری بھی ہوگئی ایک دِنا کو ہی ڈیڑھ بجے کا ٹیم تھا میں کلّن دردوز سے باتیں کر رہا تھا کہ اِتّے میں گلی میں سے غُل غپاڑے کی آواز آئی۔ میں ذلدی سے باہر نکل کے گیا نظر اٹھا کے جو دیکھا تو دال سیب والے کا خونچہ تو زمین میں گرا وا پڑا تھا اور منتیاز کی اور دل سیب والے کی بڑے زوروں پہ ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔ کدھی تو منتیاز وسے نیچو دبا دیتا اور کدھی وہ منتیاز کے اوپر چڑھ بیٹھتا۔ میں نے ایک لمڈے سے جو واں کھڑا وا تھا دریافت کیا کہ دئی یہ لڑائی دنگہ کس بات پہ ہو رہا ہے وہ بولا خلیفہ جی بات در اصل میں یہ ہوئی تھی کہ منتیاز اپنی بیٹھک میں سوا پا تھا۔ وِس دال سیب والے نے آواز لگا کے چینخنا شروع کیا تو وِس کی آنکھ کھل گئی بس وِس نے غصّہ میں جا کر دال سیب والے کو پھلم پار تو گالیاں دیں اور بازدال دِس کا خونچہ بھی زمین پہ پھینک دیا۔ پھر تو وِس دال سیب والے کو بھی غصّہ آگیا اور وِس نے منتیاز کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا کہ میرا خونچہ کیوں پھینکا وِس کا ناتواں ابھی تیرے سے رکھوالوں گا۔ بس جد سے دِن دونوں کی کشتم کشتا ہو رہی ہے۔ میں نے کیا غضب اندھیر منتیاز تو نواب کا بچہ ئی بنا وا ہے کہ وِس کے سونے کے دخت سودے والا گلی میں آواز بھی نئی لگائے میں تو یہ کہہ ئی رہا تھا کہ دال سیب والے نے منتیاز کو کولے پہ لا دکے دے مارا۔ منتیاز کی ساری شیخی کرکری ہوگئی۔ دال سیپ والا جھپاکے سے اس کے سینے پہ چڑھ بیٹھا اور پھر جو وِس نے منتیاز کے دے ریپٹے پہ ریپٹا رسید کیا ہے تو منتیاز کو چھپا چھٹانا دو بھر ہو گیا۔ وہ تو مجھے یاریاں نے کا خیال آگیا

(بقیہ صفحہ ۵۶۹ پر دیکھئے)

بال سکھا

زبان

"بہ تتبع مضمون نثر علامہ حالی"

[جناب مولانا سید حامد علی صاحب ایڈیٹر بال سکھا الہ آباد]

اے زباں اے بادشاہ ملک سر سبز سخن .:. بلبل شیریں بیاں خلاق دطوطی شکر شکن
تیرے باعث آدمی حیوان ناطق ہوگیا .:. جتنی مخلوق خدا ہے سب پہ فائق ہوگیا
اصل میں انساں تیری وجہ سے انسان ہے .:. ورنہ وہ بھی مثل حیوانوں کے اک حیوان ہے
غیر کو اپنا بنا لیتی ہے گویائی تیری .:. یعنی عقل و فراست بھی ہے سودائی تری
کھول دینا عقدۂ مشکل کا تیرا کام ہے .:. کاشف اسرار پنہاں تیرا سچا نام ہے
تجھسے دنیا کے نہیں دیں کے بنے ہیں کام بھی .:. اہل عالم نے سنا تجھسے خدا کا نام بھی
گوشے گوشے میں زمانے کے مچی ہے تیری دھوم .:. تو وہ کنجی ہے کہ جس سے کھل گئے قفل علوم
تو نہ ہوتی تو بستر میں عقل بھی بیکار تھی .:. سرد ساری اس جہاں کی گرمی بازار تھی
دلبری و دلکشی کی تجھ میں خوبی جمع ہے .:. روشنی نطق پھیلی جس سے تو وہ شمع ہے
دھوم ہے تیرے سبب سے عالم اسباب میں .:. بے ترے آتی نظر بیدار دنیا خواب میں
تو نہ ہوتی تو تماشا ہر جوان و پیر تھا .:. تو نہ ہوتی تو جہاں اک عالم تصویر تھا
نام کا بھی ہے سبب تو اور وجہ ننگ بھی .:. صلح کی دیوی بھی ہے تو اور دیو جنگ بھی
تیری نرمی سے ہزاروں سنگدل پانی ہوئے .:. تیری سختی سے احباب دشمن جانی ہوئے
تیرے باعث منقلب دنیا ہوئی اور ساکن ہے تو .:. تیرے کاٹے کا نہیں منتر ہے وہ ناگن ہے تو
دیکھنے میں گوشت کا اک لوتھڑا صورت تیری .:. تخت شاہوں کے الٹتی ہے مگر قوت تیری
تو نے عالم میں خدائی لی ہے اپنے زور سے .:. قیس کے کہتے ہی نکل آے ہیں مردے گور سے
جان لینے میں سوا ہے تیغ آتش دم سے بھی .:. زخم تیرا بھر نہیں سکتا کسی مرہم سے بھی
گالیاں سنوائی ہیں تو نے نصیحت پر کبھی .:. اور انعامات دلوائے نضیحت پر کبھی
یار بنتی ہے کبھی اغیار بن جاتی ہے تو .:. ڈھال بنتی ہے کبھی تلوار بن جاتی ہے تو
سم قاتل ہے کہیں تو اور کہیں اکسیر بھی .:. تجھ میں امرت کا اثر ہے زہر کی تاثیر بھی
تو کہیں زخموں کے خاطر مرہم زنگار ہے .:. اور کہیں بہر عدو چلتی ہوئی تلوار ہے
صاف زنگ کفر سے تو نے کبھی دل کر دیا .:. اور کبھی لالچ میں پڑ کے حق کو باطل کر دیا
جبکسی ٹوٹے ہوے دل کی ہوئی سازش تری .:. عرش اعظم کو ہلا دیتی ہے اک جنبش تری
با اثر تو ہو تو بزم خرمی کا ساز ہے .:. بے اثر گر ہو تو اک آدلرہی آواز ہے
قید خانے تو نے سچائی سے اکثر بھر دیئے .:. مدہ میٹھوں کے پیٹ جھوٹی بات کہکر بھر دیے
اے زباں سچی زباں تو ہے تو ہے بیشک زباں .:. ورنہ تو ایسی زبوں ہے جس سے ہوتا ہے زیاں
صدق گفتاری ترا جوہر ہے اسکو یاد رکھ .:. اہل حاجت کو بھی قید طمع سے آزاد رکھ
راہ حق میں سر جو کٹوا دے تو اسکا غم نہیں .:. تاک جانبازان الفت کی نہ کٹوانا کہیں
جھوٹ کہکر بادشاہوں سے نہ موتی رولنا .:. چاہے کھنچی جاے گدی سے مگر سچ بولنا

زرد رو ہوں چاہے قوم پر جفا کے سامنے
سرخرو لیکن مجھے رکھنا خدا کے سامنے

(خاص)

بہارِ سخن

[ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی سابق ایڈیٹر "بہارِ سخن" الہ آباد]

تری تندخوئی تری کینہ جوئی تری کج ادائی تری بے وفائی
بلا ہے ستم ہے غضب ہے قیامت دہائی دہائی دہائی دہائی
حقیقت نے چکر میں ڈالا تھا ہمکو طریقت بڑے وقت پر کام آئی
ہمہ اوست کا مسئلہ جب ہے آگے تو کیسی دوائی اور کیسی جدائی
اُدھر پاس چلمن کے موجود تھے وہ اِدھر تھے پریشان اُنکے فدائی
رہا شرم و شوخی کا دلکش تماشا نہ جلوہ دکھایا نہ صورت چھپائی
مدد کر ذرا اے جوشِ اُلفت کہ ارمان دل کا نکل جائے دل سے
کبھی جلوہ گہ تک گذر ہو ہمارا ابھی رہ گذر تک ہوئی ہے رسائی
بھرم کھل گیا اس سے عیاریوں کا کھلا راز بھی اس سے مکاریوں کا
چرایا تھا تم نے اگر دل ہمارا تو دل کو چرا کر نظر کیوں چرائی
اِدھر سب سے پردہ اُدھر سب میں جلوہ یہاں اور عالم وہاں اور منظر
کہیں وہ عیاں ہے کہیں وہ نہاں ہے کبھی حسن پوشی کبھی خود نمائی
تری ناخوشی اور میری خوشامد ترا روٹھنا اور میرا منانا
طبیعت نہ آئی تو شامت نہ آئی طبیعت جو آئی تو شامت بھی آئی
جو کہتا ہوں میں رنج و غم سے رہا کر رہا کر رہا کر رہا کر رہا کر
تو کہتا ہے وہ بھی نہ دونگا نہ دونگا نہ دونگا نہ دونگا نہ دونگا رہائی
جہاں میں بشر ان سے ہو بے تعلق کوئی مان لے ہم نہ مانینگے اس کو
کہ چاروں طرف ہیں یہی چار چیزیں محبت عداوت بھلائی برائی
ہمارے یہاں دیر و حرم کے مراتب مساوی ہے دونوں گھروں کی حقیقت
نہیں فرق کچھ بھی ہماری نظر میں وہی سجدہ ریزی وہی جبہ سائی

جنھیں عیش و عشرت کا ارمان ہوگا انھیں عیش و راحت کا ارمان ہوگا
تمھاری محبت میں ہم نے بلا سے یہ پایا نہ پایا وہ پائی نہ پائی
یہ برتاؤ کیا ہیں یہ اطوار کیا ہیں ذرا آپ سوچیں ذرا آپ سمجھیں
ہمیں پر کسی روز چشمِ عنایت ہمیں سے کسی وقت بے اعتنائی
بہار آئے مژدہ مسرت کا لے کر دھواں دھار اٹھیں فلک پر گھٹائیں
اِدھر جام چھلکے اُدھر توبہ ٹوٹے بہم زہد و رندی میں ہو ہاتھا پائی
اگر کوئی ہو رمز شناسی کا طالب تو پہلے مقلد بنے آئینے کا
کدورت سے اللہ محفوظ رکھے بڑی شے ہے دنیا میں دل کی صفائی
یہ توقیر و تحقیر میں بحث کیسی کہ ہیں دونوں باتیں خدا کی طرف سے
وہ رائی کو چاہے تو پربت بنا دے وہ پربت کو چاہے تو بن جائے رائی
کسی کو رلاؤ کسی کو جلاؤ کسی کو ستاؤ کسی کو مٹاؤ
خدائی کا غم کیا زمانہ کا ڈر کیا تمھارا زمانہ تمھاری خدائی
ہزاروں بکھیڑے ہزاروں جھمیلے ہزاروں تو ہم ہزاروں تردد
مگر آپ آئیں تو مہمان رکھ لوں مرے دل میں اب بھی ہے اتنی سمائی
جو بندے خدا کے خدا پر نہ رکھیں تو رکھیں بھروسہ خدائی میں کس پر
بنایا انھیں اہلِ حاجت اسی نے کریگا وہی اُن کی حاجت روائی
چھپانا تھا عشق و محبت کو دل میں نہ کرنا تھا عشق و محبت کا چرچا
ہمیں سے ہوئی چوک بیشک ہمیں سے ہمیں نے بتایا ہمیں نے جتائی
یہ اندھیر کھاتہ یہ کفرانِ نعمت زمانے کو اے نوح کیا ہو گیا ہے
خدا کے کرم سے تو ڈوبے نہ بیڑا اگر پائے شہرت مری ناخدائی

مسٹر نظام الدین حسین نظامی ، ایڈیٹر "ذوالقرنین"

فصیح العصر ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی ، ایڈیٹر "بہار سخن"

ر اختر شیرانی ، ایڈیٹر "خیالستان"

حکیم محمد یوسف حسن ، ایڈیٹر "نیرنگ خیال"
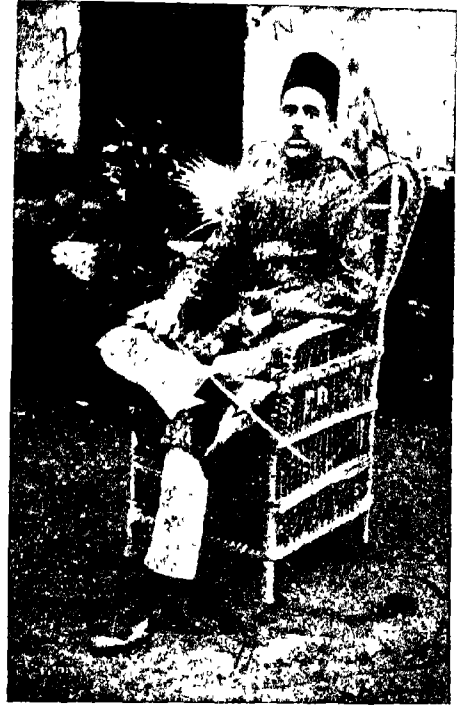
مسٹر مشیر احمد علوی ' ایڈیٹر '' تنقید ''

مسٹر محمد الدین ' ایڈیٹر '' صوفی ''

مسٹر حسن لطیفی ' معاون '' خیالستان ''

مسٹر نشتر جالندھری ' ایڈیٹر '' ادیب ''

حضرت لسان القوم صفی لکھنوی ' رکن ادارت '' معیار ''

حضرت ظریف لکھنوی ' رکن ادارت '' معیار ''

مسٹر محمود احمد عرفانی ' ایڈیٹر '' اسلامی دنیا '' قاهرہ

ڈاکٹر ایچ - جگناتھ پرشاد ' ایڈیٹر " دکن پنچ "

مسٹر ظہیر الدین احمد ؛ ایڈیٹر " مشاعرہ "

مسٹر بشیر احمد ' ایڈیٹر " عزیز "

مسٹر محمد منظور فاضل ' ایڈیٹر " بیدار "

مسٹر عابد علی، رکن ادارت ''ادبی دنیا''

مسٹر میرزا یگانہ، ایڈیٹر ''صحیفہ''

مسٹر مرزا شجاع، ایڈیٹر ''غالب''

پروفیسر محمد حسین، ایڈیٹر ''حسن خیال''
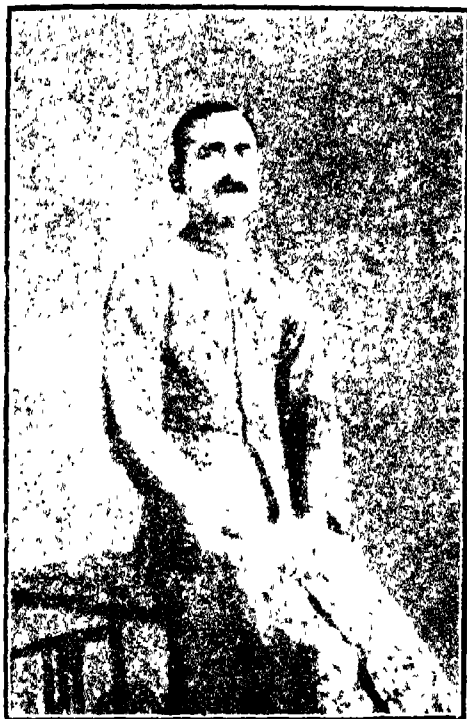
حضرت ریاض خیرآبادی ' ایڈیٹر '' ریاض الاخبار ''

مسٹر رحم علی ہاشمی ' ایڈیٹر '' ہمدم ''

مسٹر جاگیشور ناتھ ورما بیتاب ' ایڈیٹر '' شما ''

ڈاکٹر ایف - نادری ' ایڈیٹر '' رہنما ''

شریمتی جے دیوی حیا ' سابق ایڈیٹر " انقلاب "

محترمہ سیدہ توفیدہ علام ' مدیرہ " امہات المستقبل " قاہرہ

مسٹر ڈی ۰ آر ۰ مہادیشور ' جائنٹ ایڈیٹر
" انڈین ڈیلی ٹیلیگراف "

مسٹر ظفر عباس ' ایڈیٹر " نظارہ "

ہزاکسلینسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر ' معاون
وسرپرست متعدد رسالہ جات

مسٹر محمد اسحاق ' رکن ادارت '' جام جہاں نما ''

مسٹر ہوبلوک سالکا ' ایڈیٹر '' خبردار ''

مسٹر امینی سلونوی ' ایڈیٹر '' لطر ''

بھارت

اُردو جرنلزم

[منشی شیونرائن صاحب بھٹناگر ایڈیٹر بھارت دہلی و سابق ایڈیٹر "تیج"]

(۱)

دُنیا کی گذشتہ سو سالہ تاریخ میں اخبارات نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ امر کسی چشم حقیقت میں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اہم ترین واقعات کو پیدا و تبدیل کرنا اور اپنی مرضی کے مطابق ماحول پیدا کر لینا اخبارات کے لئے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ رائی کا پہاڑ بنا دینا اور پہاڑ کو پریس کی سیاہی سے چھپا دینا اخبارات کا ہی حصہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ یقینی دوستوں کو بھڑانا اور جانی دشمنوں میں صلح کرا دینا اخبارات کے لئے معمولی کھیل ہے۔

گذشتہ جنگ عظیم میں جرمنی کی مسلمہ فتح کو شکست میں تبدیل کرا دینے والے اخبارات تھے۔ جس وقت جنگ زوروں پر تھی۔ اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں نے جو زیادہ تر برطانیہ کے ہاتھ میں تھیں۔ جرمنی کے مفروضہ مظالموں کی داستانیں گھڑ کر امریکہ اور دوسرے غیر جانبدار ممالک کے دلوں میں جرمنی کے خلاف نفرت و حقارت کا جذبہ پیدا کر دیا جس سے اتحادیوں کو تمام دنیا کی اخلاقی بلکہ مالی امداد حاصل ہو گئی۔ اور پریذیڈنٹ ولسن کی امداد سے انہوں نے شیر جرمنی کو عہدنامہ ورسلز کے آہنی پنجرے میں بند کر دیا۔

انگریزی اور ہندوستانی اخبارات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جہاں انگریزی اخبارات کی ترقی کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہے۔ اُردو و ہندی کے اخبارات کا سورج ابھی فی الحقیقت طلوع بھی نہیں ہوا ہے۔ برطانیہ و امریکہ کے روزانہ۔ ہفتہ وار اور ماہوار و اخبارات و رسائل نے جو ترقی کی ہے۔ وہ ہندوستانی اخبارات کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہوئی۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ سرمایہ و انتظام ہر دو کے یکجا ہونے پر کامیابی ممکن ہے۔ جہاں انگلستان میں بڑے بڑے سرمایہ دار اخبارات میں لاکھوں روپیہ صرف کر دیتے ہیں۔ اور اعلیٰ ترین قابلیت کے اشخاص گراں قدر مشاہرے ملازم رکھتے ہیں۔ وہاں ہندوستان میں روپیہ والے تو اخبارات کے نام سے ہی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ اخبارات جاری کرتے ہیں۔ اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کم سے کم تنخواہ دار آدمی رکھے جائیں۔ اور ان سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ کامیاب ترین ہندوستانی اخبارات میں دیکھا گیا ہے۔ کہ سٹاف کو تنخواہ تو اسقدر ملتی ہے کہ وہ بمشکل جسم و روح کو کو یکجا رکھ سکتے ہیں۔ لیکن کام دس دس بلکہ بعض اوقات بارہ بارہ گھنٹے لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ رکھنے والے بھی اس حالت میں اچھا کام نہیں کر سکتے۔ جسمانی کام کرنے والے مزدوروں کے لئے تو یہ کوشش ہو رہی ہے۔ کہ چالیس یا بیالیس گھنٹہ کا ہفتہ مقرر کیا جائے۔ مگر ان دماغی مزدوروں کو جن سے اور بھی کم کام لیا جانا چاہیئے۔ کوئی نہیں پوچھتا۔

ہندوستان میں اُردو اخبارات عام طور پر کسی خاص مقصد و خیال کو لیکر پیدا نہیں ہوتے۔ بلکہ دوسرے اچھے موقع

نہ پانے والے نوجوانوں کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سرمایہ ان کے پاس ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے اشاعت میں اوّل تو خود ہی بطور ایڈیٹر۔ منیجر۔ مترجم اور کنویسر کے کام کرتے ہیں۔ اور اگر انہیں کوئی اچھا آدمی تھوڑی تنخواہ پر مل جاتا ہے تو اسے سب کاموں میں رگڑتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو اخبار وہ پیدا کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف ادارکا اور بدانتظامی کا نمونہ ہوتا ہے۔ بلکہ انگریزی اخبارات کی خبروں کے ترجمے۔ منقول مضامین اور بھدّے ایڈیٹوریل کا ایسا جھگڑا ہوتا ہے۔ جسے کوئی معقول آدمی پسند نہیں کرتا۔ اخبار میں ظاہری خوبیاں پیدا کرنے اور اشتہارات حاصل کرنے کے لئے پروپیگنڈہ کرنے کے لئے ان کے پاس روپیہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اُن کی آمدنی کا انحصار زیادہ تر خریداروں پر ہوتا ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ کثیر الاشاعت ہونے کے باوجود بھی ہندوستانی خصوصاً اُردو اخبارات گھاٹے پر چلتے ہیں۔

ایک اور مشکل جسکا اُردو اخبارات کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیتھو پریس ہے۔ انگریزی۔ ہندی۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ بنگلہ وغیرہ ہر زبان کا بہترین ٹائپ موجود ہے۔ لیکن اُردو ٹائپ جو اسوقت تک طیار ہوا ہے۔ نہایت بھدا اور ناقص ہے۔ نستعلیق ٹائپ کی اول تو کسی نے کوشش ہی نہیں کی اور اگر کی تو ایسے لوگوں نے کی جنکے پاس نہ تو سرمایہ تھا۔ اور نہ اُنہیں اردو نستعلیق سے واقفیت تھی۔ اس لئے انھیں کامیابی نہ ہوسکی۔ اردو اخبارات کو مجبوراً لیتھو سے ہی گذارہ کرنا پڑتا ہے۔ لیتھو میں بعض خوبیاں بھی ایسی ہیں۔ جو ٹائپ میں نصیب نہیں ہوسکتیں۔ مثلاً کارٹون اور لائن خاکے وغیرہ چھپ جاتے ہیں۔ جس سے نہ صرف بلوک کا خرچ بچتا ہے۔ بلکہ وقت بھی ضائع نہیں ہوتا۔ اسکے علاوہ لیتھو کی چھپائی ٹائپ سے ارزاں ہوتی ہے۔ لیکن یہ نقص ہے کہ اعلیٰ چھپائی نہیں ہوسکتی۔ دوسرے بلاک اور تصویر وغیرہ لیتھو میں چھپ ہی نہیں سکتی۔ اور جب کبھی اسکی ضرورت ہوتی ہے۔ تو اُردو اخبارات کو ٹائپ پریس کی پناہ لینی پڑتی ہے۔ اور یا تو علیحدہ کاغذ پر تصویر دینی ہوتی ہے۔ یا ایک فارم کو دو دفعہ چھاپنا پڑتا ہے۔ جس سے لاگت بڑھ جاتی ہے۔ جرمنی نے فوٹو لیتھو پریس کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ مگر ہندوستان میں ابھی تک وہ کسی جگہ کامیاب نہ ہوسکا۔ جسکی بڑی وجہ وہی سرمایہ کی کمی اور بدانتظامی ہے۔

جہاں تک میرا تجربہ ہے۔ میں دعوئی سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ قابلیت میں ہندوستانی دوسری قوم والوں سے کم نہیں ہیں۔ اس حالت میں بھی جبکہ ہندوستان میں اخبار نویسی مفلسی اور جیلخانہ کی درمیانی حالت کا نام ہے۔ ہندوستانی اخبارات میں کئی ایک بہترین اہل قلم اور انتظامی قابلیت رکھنے والے موجود ہیں لیکن یہ ایک کھُلی حقیقت ہے۔ کہ قابل اخبار نویس بشرطیکہ انھیں اخبار نویسی کا مرض لاعلاج نہ ہوگیا ہو۔ عموماً یہ کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کہ اگر انھیں کوئی دوسرا اچھا موقعہ مل جائے تو اس مصیبت سے نجات حاصل کریں۔ اگر ہندوستان میں کافی سرمایہ سے بڑی بڑی کمپنیاں جاری کیجائیں جو اپ ٹو۔ ڈیٹ پریس کی امداد سے بہترین اخبارات جاری کریں تو یقیناً اُردو اخبارات کا پایہ بہت بلند ہوسکتا ہے۔ گجراتی اور مرہٹی زبان میں وہ بہترین اخبارات ہیں جن کو پڑھے بغیر انگریزی اخبارات کے پڑھنے والوں کو بھی اطمینان نہیں ہوسکتا لیکن اُردو اخبارات کو عام طور پر وہی لوگ پڑھتے ہیں جو انگریزی اخبارات نہیں پڑھ سکتے۔ اگر اُردو اخبارات کو ظاہری معنوی

ہر دو لحاظ سے بہتر بنایا جائے تو یقیناً ہر شخص اُن کی قدر کریگا۔ اور تجارتی نکتہ نظر سے بھی ایسے اخبارات کو فائدہ رہیگا کیونکہ وہ زیادہ قیمت پر اشتہارات حاصل کر سکیں گے جو اخبارات کی آمدنی کی ٹھوس مد ہے۔

آج سے تیس سال پہلے اور اخبار نویسی کا معیار یہ تھا کہ معمولی کاغذ پر ردی چھپائی کے ساتھ چھ آٹھ صفحہ کا اخبار نکالنا۔ حکومت اور عمال حکومت کی مدح و تعریف میں قصیدے شائع کرنا اور مہینوں کی پرانی چیزیں بھدی ترتیب سے درج کر دینا۔ لیکن اسکے بعد اردو جرنلزم کا نیا دور شروع ہوا جسمیں نہ صرف لکھائی۔ چھپائی اور دوسری خصوصیات کے متعلق توجہ دی جانے لگی بلکہ حکومت پر نکتہ چینی بھی ہونے لگی اور پبلک کی صحیح معنوں میں رہنمائی کی جانے لگی۔ اب اردو جرنلزم کا موجودہ دور روزانہ اخبارات کا زمانہ ہے۔ جسمیں درجنوں روزانہ اردو اخبارات تازہ ترین خبریں لیکر شائع ہوتے ہیں۔ اور حکومت کے نظم و نسق پر کڑی سے کڑی تنقید کرنے میں ذرہ برابر پیش و پس نہیں کرتے۔ اس نئے دور کا آغاز جرمنی کی جنگ عظیم سے ہوا تھا لیکن عدم تعاون کے قابل یادگار زمانہ میں روزانہ اخبارات نے کافی ترقی کی اور اب تو روزانہ اخبارات کی تازہ ترین خبروں کے لئے ہر شخص نظر آتا ہے۔ مستقبل قریب میں ایک اور دور آنے والا ہے جبکہ ہر ایک اخبار کو صبح یا شام کا اخبار ہونا پڑیگا یا دو دو تین تین ایڈیشن روزانہ نکالنی پڑیں گی۔ ہفتہ وار اور ماہوار اخبارات نے بھی ہر لحاظ سے کافی ترقی کی ہے جہاں چالیس سال پہلے طویل طویل مضامین کے علاوہ کوئی اور خبر نہیں ملتی تھی وہاں اب نہ صرف ہر مذاق کے دلچسپ آرٹیکل شائع ہوتے ہیں بلکہ یک رنگے اور سہ رنگے فوٹو انکی زینت کو دوبالا کر رہے ہیں۔ جن کے بغیر کسی رسالہ کا زندہ رہنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔

اردو اخبارات کی ترقی بلکہ بقا کے لئے ضروری ہے کہ کافی سرمایہ سے کمپنیاں بنائی جائیں جنکا مقصد حیات سرمایہ داری یا دولت کمانا نہ ہو بلکہ نیک اور بنی نوع انسان کی خدمت کرنا ہو۔ یہ کمپنیاں اعلیٰ قابلیت کے اشخاص کو معقول مشاہرے پر نوکر رکھیں بلکہ ایسا انتظام کریں کہ ملازمان کا کمپنی سے دائمی تعلق بنا رہے۔ یا جیوں جیوں ان کی ملازمتیں پرانی ہوتی جائیں کمپنی پر ان کے حقوق زیادہ ہوتے چلے جائیں۔ لیکن اگر ایسا انتظام نہ ہو سکے تب بھی اخبارات کی کمپنیاں کافی ترقی کر سکتی ہیں۔ یہ کمپنیاں اعلیٰ پریس اور مشینوں کا انتظام کر کے اعلےٰ سے اعلےٰ اخبارات نکالیں جن سے نہ صرف ملک کی قوم کی بہترین خدمت ہو سکے گی بلکہ اخبار نویسی کو بھی کافی ترقی کرنے کا موقع ملیگا۔

وہ زمانہ گیا جبکہ اخبارات کو خبروں مضمونوں اور داستانوں کا معجون مرکب بنایا جاتا تھا اب وہ وقت آگیا ہے جب خبروں کے اخبار میں مضامین درج کرنا پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا اور نہ مضامین کے اخبارات یا رسائل میں خبروں کا درج کرنا مقبول ہو سکتا ہے اسلئے روزانہ اخبارات کے لئے لمبے چوڑے مضامین سے اجتناب کرنا لازمی ہے اور ہفتہ وار یا ماہوار رسالوں کے لئے خبروں سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ میں تو یہانتک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ روزانہ اخبارات کے لئے ضروری نہیں ہے کہ روزمرہ تین چار کالم ایڈیٹوریل میں صرف کریں۔ ایڈیٹوریل حسب

[بقیہ صفحہ ۱۰۱ پر دیکھئے]

بھٹناگر سماچار

افلاس میں امارت

[منشی جے پرکاش رائے بھٹناگر بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔بی ایڈیٹر بھٹناگر سماچار سنبل]

اس جہان فانی میں مالی حیثیت کا امتیاز۔امارت کا تفاوت۔اہل دول کا بوجہ سرمایۂ ذاتی اپنی برتری کا احساس اور آنکے مقابلہ میں ستم رسیدہ وآفات زدہ مفلس وقلاش کا اپنی کم حیثیت کا خیال۔امیروں کے پاس لاانتہا دولت ہونیکا سمجھ میں نہ آنے والا راز۔دنیا کے سٹیج پر روز ازل سے نمایاں پارٹ ادا کرتا رہا ہے۔ شروع ہی سے امیروں اور غریبوں کی جنگ وجدل۔اس امر کی شاہد ہے کہ اگر ایک طرف اہل دول کا اعلیٰ طبقہ اپنے مرتبہ وجاہ وجلال کو برقرار رکھنے کے لئے سرگرداں ہے تو دوسری طرف دلدادگان زر وخواستگاران سرمایہ اپنی موجودہ مالی حالت سے ترقی کرکے زمرۂ اصحاب برتر میں شامل ہونے کے لئے رات دن کوشاں ہیں اگر تواریخ کے صفحات ٹٹولے جاویں تو دنیا کی نہایت خونخوار وتباہ کن لڑائیاں اسی جذبہ کا باعث ثابت ہونگی۔کہ جہاں یا تو کم سرمایہ والوں وغریبوں نے امیروں کی بیجا ناز برداری و اپنی فاقہ کشی کی موجودگی میں اونکی مجرمانہ عیاشی وفضول خرچی کو برداشت نہ کرکے کوشش کی کہ وہ بھی اپنے درجہ برتری سے گر کر انکے ہم پلہ ہو جاویں۔یا اہل دول کی حرص وہوا۔ زیادتی حصول زر ومملکت کی خواہش نے انکو اپنے سے کمتر سے جا کر لڑا دیا۔نتیجہ خواہ ایک یا دو کی فارغ البالی وآسودہ حالی کا باعث ہو مگر بزور بازو لکھوکھا بندگان خدا کی مصیبت لاانتہا مصیبت وپریشانیوں کا باعث ہوگیا۔بیسویں صدی کی ملک روس کی تحریک۔سوویٹ گورنمنٹ کا خاتمہ۔فرقہ بالشیوک کا وجود۔ہر ملک میں عام بے چینی اُس نکتہ خیال کا بہترین مظاہرہ ہے کہ یہ دنیا اسیقدر تفاوت زر کی آماجگاہ نہیں ہے تعداد قدرت کی کائنات۔سائنس وعلم کے بہترین دماغ کے نتائج میں ہر ذی روح کا مساوی حصہ ہے لہذا اگر کوئی والیٔ ملک یا صاحب دول اس جذبہ سے متاثر ہو کر طبقہ ادنیٰ کے ساتھ اپنی دولت وذاتی سرمایہ میں شرکت کے لئے تیار نہ ہوگا تو زمانہ اپنے تجربات وجد وجہد سے اُنکو مجبور کریگا کہ یا تو ہمارے نکتہ خیال کے مطابق عمل پیرا ہو ورنہ از خود۔یا بہ زور اپنی مسند نشینی سے برطرف ہو کر معمولی انسان کی زندگی بسر کرو۔مگر گو یہ جد وجہد روز ازل سے گوناگوں شکلوں میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہے مگر قانون قدرت غالباً اس تفاوت عظیم کو نیست ونابود نہیں ہونے دیتا اور غالباً شاید ہی وہ کسی زمانہ دنیا میں ظہور پذیر ہو کہ جب ہر ایک بنی نوع انسان درجہ مساوی پر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو۔ درجہ تفاوت کی قائمی کا خاص سبب روپیہ کی زیادتی نہیں ہے۔

دل و دماغ کی قدرتی ساخت۔ اور بعد کی تربیت۔ واقعات زندگی، اور حادثات روزمرہ کا وقوع۔ ہزار ہا اور دیگر اثرات اس خلیج کو وسیع کرتے رہتے ہیں۔ ملک انگلستان و امریکہ میں پیدا شدہ انسان کب ملک حبش و افریقہ کے دیسی باشندگان کے برابر ہو سکتا ہے۔

جاوا و سماٹرا کی تہذیب۔ جاپان و یورپ کی شائستگی۔ بھلا ایک دوسرے کو درجہ مساوات پر کب لا سکتی ہے ۔۔ جو اپنی محنت۔ جانفشانی۔ امتیاز نفسی۔ قربانی سے کسی سرمایہ کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔ کونسا فلسفہ۔ کونسی منطق۔ کونسے دلائل حق بہ جانب نہیں کہ اُن کے گاڑھے پسینہ سے کمائے ہوئے روپیہ کو دوسرے لوگ بلا محنت۔ بلا جد و جہد۔ بلا کوشش۔ کئے ہوئے حاصل کر لیں اور دونو ایک درجہ کے انسان دُنیا کی نگاہوں میں ہو جاویں۔ اگر یہ عمل دنیا میں ہو گیا۔ اگر یہ تحریک زور پکڑ گئی تو نظام عالم منتشر ہو جائیگا۔ سائنس اور علم کی موجودہ حیرت انگیز ترقی ہرگز ظہور پذیر نہ ہوتی اور آج دُنیا سائنس کے کرشمے ہوائی جہاز۔ آبی جہاز۔ گیس۔ لاسلکی تار۔ ٹیلیفون۔ و دیگر ہزار ہا ایجادات سے محروم رہتی اگر اسی نکتۂ خیال پر لوگ عمل پیرا ہوتے۔ کیونکہ ترقی کرنے کا جذبہ اپنی زندگی کو آیندہ سہولیت و فارغ البالی سے گذارنے کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ اپنے نام و نمود۔ اپنے خاندان و بزرگان۔ اپنے قوم و ملک کی آیندہ ترقی بنے ہزار ہا بندگان خدا کو اپنے دل و دماغ۔ اپنی پوشیدہ قدرتی قوتوں و قابلیت کو ان حصول کے حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے لیکن اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ ہماری موجودہ عرقریزی و جانفشانی کا نتیجہ باہمی تقسیم مساوی مابین مستحق و غیر مستحق اشخاص ہو گا تو کس کا سر پھرا ہے۔ کس کا دماغ چکر کھا رہا ہے کہ خود آفات و مصائب کا شکار بنکر موج سے زندگی بسر کرنے والے۔ کاہل و سست۔ بے دل و دماغ۔ بے درد و بے حس اشخاص کے لئے سرمایہ اکٹھا کرے۔ اگر کسی کو اپنی محنت و جانفشانی کے پھلوں سے فیض یاب ہونے کا امکان نہ ہوگا تو اُسکی تمام قوتیں۔ قابلیتیں کوئی منزل مقصود نہ دیکھ کر بیکار و زائل ہو جائینگی۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا میں ایسے سخی۔ نامور و ذاتی محبان وطن۔ ملک و قوم گذرے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے کہ جنہوں نے دوسروں کی خاطر اپنا سب کچھ نوچھاور کر دیا۔ اپنا عیش و آرام قربان کر دیا۔ دوسروں کے لئے زندگی وقف کر دی۔ اپنا سرمایہ ذاتی قوم و ملک کو نذر کر دیا۔ مگر بہ ایں ہمہ کیا تفاوت درجہ و مرتبہ۔ دُنیا سے مٹ گیا؟ بلکہ اگر نظر غور سے دیکھا جاوے تو دنیا کی ترقی کا دار و مدار ہی اس تفاوت عظیم پر ہے۔ اگر مساوات ہو گی تو نہ کسی کو ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت ہو گی اور نہ ترقی و سرمایہ کا سوال درمیان میں آئیگا۔ جب قانون قدرت و اختلاف دل و دماغ مساوات کا نہ تو خاص ہے اور نہ اُنکی وجہ سے مساوات ممکن ہے اور نہ موجودہ نظام بشریت میں ممکن معلوم ہوتا ہے تو ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ذرائع اختیار کرے کہ جو اُسکی ذاتی آیندہ ترقی و اُنکی ذات سے دوسروں کی ترقی کا باعث ہو۔ امیر خاندان کے نونہال ہو کر جاہ و مرتبہ حاصل کیا تو کیا تعریف! عیش و آرام میں زندگی بسر کرتے ہوئے عہدۂ جلیلہ پر ممتاز ہوئے تو کیا خوبی! اُدنی مرتبہ و حالی رتبہ کے ذی بلد و بلند ہو کر نامور ہوئے تو کونسا فعل قابل ستایش ہوا! قابل تعریف ہیں وہ نونہالان وطن جو خستہ حالی و نان شبینہ سے محتاج ہوتے ہوئے رات دن ایک کرکے اپنی محنت جانکاہ

سے دنیا میں وہ کمال دکھایا کہ جو اہل دنیا کے لئے باعث حیرت ہوا - خوبی ہے اُن نوجوانان ملک کی جو عُسرت و افلاس کی زندگی بسر کرتے ہوئے قربانی و ایثار نفسی کے ساتھ دُنیا کی ہر ایک مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے کسی ایسی ایجاد و کرشمہ سائنس کے موجد ہوئے کہ جنکی کل دُنیا تا ابد ممنون احسان رہیگی - قابل ستایش ہیں غریب طبقہ کے وہ چراغ کہ جو اوائل عمر میں مطالعہ کے لئے معمولی روشنی کو نہ پاکر سڑکوں پر لالٹین کی روشنی میں تمام دن کی محنت شاقہ کے بعد علم حاصل کرکے وہ رتبہ - وہ مرتبہ و وہ کمال حاصل کیا کہ دنیا انگشت بدنداں ہے جو والی زر ہیں - جو دولت کی فکر سے مبرا ہیں جنکو اپنی خواہش پیدا کرنے کے لئے کسی کا دست نگر ہونا نہیں پڑتا وہ امیر تو ضرور ہیں مگر کیا اُنکا درجہ اُن افلاس زدہ و مفلس اشخاص سے زیادہ ہے کہ جو اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتے ہوئے قدم بقدم مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے اُس رتبہ و شان کو حاصل کر لیتے ہیں کہ جو غالباً شروع میں اُن کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگی -

دنیا کے ہر ملک کے برگزیدہ اصحاب کی ذاتی تواریخ وہ حیرت انگیز اقبالمندی کا انکشاف کریگی کہ بے اختیار منہ سے یہ کلمہ نکلیگا کہ کاش ہم بھی اُس طبقہ عُسرت کے جزو ہوتے اور ہمکو بھی وہ قوت برداشت و تحمل - جانفشانی و عرقریزی - حوصلہ بلا انتہا ہے بُردباری - دل و دماغ ملتا کہ اوائل عمر سے ماں باپ کی پیدا کی ہوئی دولت پر اعتبار نہ کرکے اپنی ناموری - اپنے منزل مقصود کے حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پیر مار لیتے - وہ لوگ دولت مند کہلاتے ہیں کہ جنکے پاس ہزار ہا روپیہ ہو - سب طرح آسایش ہوں - مگر واقعی دولت مند وہ ہیں کہ خواہ اُنکی تہلیاں خالی ہوں - خواہ وہ اکثر نان شبینہ سے محتاج رہتے ہوں - خواہ اکثر فاقہ کشی کی جان کَش تکلیف اُن کا ساتھ دیتی ہو - مگر وہ اپنے اندر وہ کمال رکھتے ہوں کہ ان مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھے ہوئے منزل مقصود کو پہنچنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے ہوں اور بعدہٗ منزل مقصود پر پہنچکر اہل دول میں - اہل ہنر - اہل کمال کے زمرہ میں اُنکا شمار ہو - وہ بھی مالدار ہے کہ جسکا روپیہ بنک میں جمع ہو خواہ ہاتھ میں کوڑی نہ ہو - وہ غریب بھی امیر ہیں جو اپنے دست بازو سے صاحب کمال بننا چاہتے ہوں - تواریخ ایسے اشخاص جن کے کارناموں سے بھری ہیں - درحقیقت ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں کہا جاسکتا ہیں کہ افلاس میں امارت موجود ہے - تقلید کا مادہ قدرتی ہے ہماری نگاہوں کے سامنے ہمارے حوصلہ کو افزا کرنیوالی ہزار ہا مثالیں پیش ہیں کہ جو غریبی سے ترقی کرکے معراج کا درجہ حاصل کر گئی ہیں - ایسی مثالیں اگر نوجوانان قوم کے روبرو آئے دن پیش ہوتی رہیں گی تو ضرور بار آور ہونگی - علم اور واقفیت اپنا اثر ضرور ڈالتے ہیں - ابراہیم لنکن سابق پریزیڈنٹ یونائٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ کی شخصیت سے واقف ہیں جو ایک جھوپڑی میں پیدا ہوا اور رات دن کھیت پر کام کرتا ہوا - نیویارک کے گھنٹہ کے ٹن - ٹن آواز کو سنکر وایٹ حال کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیتا تھا - آج دُنیا جانتی ہے کہ کسی طرح یہ نحیف کمزور بچہ متواتر ۲۵ سال جد و جہد کے بعد جمہوری امریکہ کا پریزیڈنٹ ہوکر وایٹ ہال میں جاگزین ہوا -

دنیا کا مشہور و معروف انگریزی شاعر شکسپیر ایک قصائی کا لڑکا تھا - بلکہ بعض کا قول ہے کہ وہ اوائل عمر میں ایک اسکول کا ملازم بھی تھا - مگر اُسنے ڈرامہ نویسی میں اپنی

علمیت کا وہ اظہار کیا کہ کوئی شاعر آج تک اوسکے کمال کو نہ پہنچا۔ خوبی یہ تھی کہ اگر بحری زندگی کا خاکہ کھینچا تو اخترانِ بحر و ملاحوں کو گمان گذرا کہ اسکی زندگی کا کچھ حصہ ضرور سمندر میں گذرا ہوگا۔ اگر پرستش خدا اور چرچ کا تذکرہ کیا تو پادریوں کو گمان گذرا کہ ضرور وہ کبھی نہ کبھی پادری رہا ہوگا۔ جسوقت فوجی کارناموں اور جنگ و جدل کے سین ناظرین کے سامنے پیش کئے تو جرمنوں اور کمانڈروں نے فتویٰ دیا کہ بلاشبہ شکسپیر برسرِ پیکار رہا ہوگا۔ جسوقت عدل و بیمان کے نظارے عدالت و وکیل کے سامنے آئے تو اُنھوں نے بے ساختہ رولنگ دی کہ اس سے زیادہ کامیاب بیرسٹر نہ ہوا ہوگا۔

سر رچرڈ آرک رایٹ

موجد "روئی کی مشین" ایک ایسے غریب باپ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا کہ جسکے ۱۳ لڑکے تھے۔ غربت کی وجہ سے تعلیم نصیب نہ ہوئی۔ مشکل سے ایک دو حرف اِدھر اُدھر سے سیکھ لیتا اور وہی آیت حدیث کی طرح وردِ زبان ہوجاتے۔ حجام کے یہاں نوکری کی۔ بال اکٹھا کرنیکا پیشہ کیا۔ واہ ری غربت۔ ایک دفعہ الیکشن کے موقع پر یارانِ طریقت نے کوٹ پتلون سلوا دیا کہ وہ افسران کے آگے ووٹ دے سکے۔ یہ تو افلاس اور دل و دماغ اس حرکت میں کہ کوئی مشین ایسی ایجاد ہو کہ روئی دھنکر کاتی جاسکے۔ نہ کوئی مشین دکھلانے والا۔ نہ کوئی کام سکھلانے والا۔ ہمت کا پورا۔ خالی وقت میں لوہاروں کی دکان پر سینہ بند کر پرزوں و استعمالی اوزاروں سے واقف ہوکر نہ صرف کاٹن پتنگ کا موجد ہوا بلکہ سر کے خطاب سے ممتاز ہوا۔ سر والٹر سکاٹ انگلستان کا نادلسٹ جب لاکھ لاکھ روپیہ کے قرض سے دب گیا۔ یارانِ مجلس نے صلاح دی۔ دیوالہ نکالو اور بےفکری کی زندگی بسر کرو۔ مگر عقلِ سلیم و فرائض شناس نے کہا ادائیگی قرض مقدم بتائی۔ رات دن محنت کرکے انگریزی زبان کے وہ افسانے لکھے کہ مرتے دقت تک نہ صرف قرضہ اُتار ڈالا بلکہ دنیا کو ہمیشہ کے لئے وہ خزانہ بیش قیمت دیگیا کہ آج اُس سے بہتر قیمتی خزانہ اہلِ علم کو میسر نہیں آسکتا۔

لارڈ ڈسریلی

جب اول مرتبہ اسپیچ دینے کھڑے ہوئے تو کانپ گئے اور آماجگاہِ تمسخر بنے۔ عالی حوصلہ و مصائب کی پروا نہ کرنے والے نے باآوازِ بلند اعلان کیا۔ "ہنس لو جسقدر جی چاہے۔ مگر خدا شاہد ہے ایک دن وہ آئیگا جب تم مجھے سننے آوگے"۔ دُنیا شاہد ہے کہ ڈسریلی نے فصاحت و بلاغت میں وہ کمال حاصل کیا کہ دُنیا کشش خوبی سے از خود کھنچکر اُسکو سننے کے لئے آنے لگی۔ کشب چندر دو یا ساگر برہمو دھرم کے ریفارمر بنگال کے مسلمہ لیڈر اپنے والد سے اسقدر خائف ہے کہ رات میں اُنکی آمد کی انتظار میں اپنی پیاری نیند کو بھگانے کے لئے آنکھوں میں تیل ڈال لیتے تھے۔ دادا بھائی نوروجی نے جب پارلیمنٹ وانگلینڈ کی ممبری کا ارادہ کیا تو دُنیا ہنسی۔ "یہ کالا آدمی اور پارلیمنٹ کی ممبری"۔ رہے جھونپڑوں میں اور خواب دیکھے محلوں کا۔ مگر انکے اندر وہ جذبہ و قوت کام بنی کہ ان جا بیجا حملوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی مہم میں سرگرم رہے اور نہ صرف ولایت والوں کا سر نیچا کیا بلکہ اہلِ ہند کے لئے وہ دروازہ کھول گئے جو ہمیشہ سے بند تھے۔ لنین مشہور اور روسی لیڈر نے کشت و خون سے بندگانِ خدا کی آزادی کا سبق پیش کیا مگر ہندوستان کا ڈیڑھ ہڈی کا ٹوٹا پنجہ

مہاتما گاندھی عدم تعاون اور بے جنگ کی لڑائی کے اصول سے دُنیا کو دکھلا رہا ہے کہ اہم سے اہم مقصد اس طریقہ کار سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ کے جد و جہد و کامیابی و آئے دن کے ہزار ہا ہندی مسائل اُنکے حصول کی دشواری و بعدہٗ کامیابی نے آج اُسکو ۳۳ کروڑ کا رہنما بنا دیا۔ جسوقت سٹیم انجن کے موجد واٹ نے اپنی مشین پیش کی تو بلوہ ہو گئے۔ لوگ برانگیختہ ہو گئے۔ کافر قرار دیکر قتل کے طالب ہوئے۔ وہ واٹ جو اوائل عمر میں نان شبینہ کا محتاج تھا آج دُنیا کا سب سے بڑا محسن شمار کیا جاتا ہے۔ جسوقت جارج سٹفین نے دخانی انجن چلایا۔ پارلیمنٹ میں تجویز ہوئی کہ بجائے انعام کے پس پا کر دیا جاوے۔ نہ کہیں کالج میں سائنس کی تعلیم پائی۔ نہ کسی کارخانہ میں نوکری کی۔ مگر ہاں تجربات اور مشاہدات کے مشین گھر ڈال کی پتیلی کے مشاہدہ سے وہ کمال حاصل کیا کہ وہ چیز بتائی کہ جسکے لئے آج دُنیا ناممکن ہے کہ اسکے احسان سے سبکدوش ہو سکے۔ نپولین بونا پارٹ۔ کارسیکا جزیرہ کے ایک معمولی وکیل کا لڑکا۔ اپنی شجاعت۔ اپنے حوصلہ۔ وقت پر کام کرنیکی عادت سے نہ صرف فرانس کی فوجوں کا جنرل و ملک کا بادشاہ بن گیا بلکہ ہر ایک کو دکھا گیا کہ اگر زندگی کا ایک ایک لمحہ باقاعدہ اور مفید طریقہ سے استعمال کیا جاوے تو انسان کونسا مرتبہ ہے جو حاصل نہیں کر سکتا۔ رنجیت سنگھ معمولی سپاہی کا لڑکا۔ علم سے بے بہرہ۔ محض اپنی قابلیت سے پنجاب کا والی بنگیا۔ ایک معمولی سردار کا بچہ۔ سلطنت مغلیہ کی عظیم بادشاہت کے مقابلہ میں۔ پے در پے شکست دہا رکے باوجود۔ قدم بقدم۔ سلسلہ بسلسلہ۔ اپنی زور و قوت و دوربین چشم باطن سے نہ صرف دکھن کا راجا ہوا۔ بلکہ سیوا جی کے نام سے اُس زمانہ کے حالات ناگفتہ بہ میں دُنیا جانی کا بچانیوالا ہوا۔ شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں ڈاکٹر بریٹر نے اپنے ملک و قوم کو اپنی ذات و مفاد سے زیادہ سمجھا۔ بادشاہ کے صحتیابی پر جسوقت مُنہ مانگا انعام ملنے کا وعدہ ہوا تو کہا کہ میرے ہموطنوں کو سلطنت مغلیہ میں تجارت کی آزادی حاصل ہو۔ غالباً سلطنت برطانیہ کی ہند میں قائمی کا باعث ڈاکٹر بریٹر ہی ہے۔ ایثار نفسی و قربانی بلا رنگ لائے نہیں رہتی۔ ہاروے کہ جس نے دوران خون کا مسئلہ پیش کیا کیفیت کے لئے باعث مذاق تھا۔ ہر وقت طعنہ و تشنہ کی بوچھار تھی۔ مگر اس دُھن کے پورے۔ ہمت کے پکے کو کب پروا تھی۔ راک فیلر۔ مٹی کے تیل کا بادشاہ جسکو آج اپنی دولت کی انتہا کا پتہ نہیں۔ شروع شروع میں اخبار بیچنے والا لڑکا تھا۔ ملک افریقہ کے اندرونی حصہ کا کی دریافت کرنے والا۔ ڈیوڈ لونگ سٹون۔ ایک غریب باپ کا بچہ تھا جو دس سال کی عمر میں ایک آدمی کے کارخانہ میں نوکر ہوا تھا۔ اور ۱۴ سال کی عمر میں اُس نے اپنے کمائے ہوئے پس انداز روپیہ سے گرامر خریدی۔ اور ایک نائٹ اسکول میں دن کی محنت شاقہ کے بعد علم حاصل کرتا تھا۔ مزدوری کرتے کرتے سائین اور گریک کے کلاسوں میں داخل ہو کر علم حاصل کیا اور جب افریقہ میں بطور مشنری گیا تو وہ کام انجام دئے جو ایک غریب لڑکے سے ہونا خواب و خیال میں بھی نہ آتے تھے۔ ملٹن نے اپنی PILGRIM'S PROGRESS. لاجواب کتاب "لوکمانیہ" تلک نے "گھتیا رہن" جہل میں لکھی = غرضیکہ ایسی ہی ہزار ہا مثال موجود ہیں کہ باوجود غریب ہوتے ہوئے جاہ و جلال کے بام اوج پر پہنچ گئے۔ جو مصائب۔ و آفات کا

شکار ہوتے ہوئے دنیاکے محسن بنگئے۔ اور جنکا نام نامی دُنیاکی تواریخ میں آب زر سے لکھا جائیگا۔ تلقین سے زیادہ عمل کی تقلید ہوتی ہے۔ ملک ہند اسوقت جد وجہد کے پایان سمندر میں آزادی وطن حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ ایسا نہو کہ اسوقت چھوٹے سے چھوٹے۔ غریب سے غریب یہ سوچ کر اس سیاسی جد وجہد میں شامل نہ ہوں کہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔ کیا پدی اور کیا اُسکا شوربہ۔ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قوت افرادی مجموعی شکل میں قومی قوت ہوجاتی ہے ممکن ہے کہ جو کام بڑے آدمی اپنی آسایش کی زندگی کی وجہ سے مادر ہند کی آزادی کے لئے نہ کرسکیں وہ مائی کے لعل۔ جھتیڑوں میں بسر کرنے والے۔ پورا کرسکیں۔ ہمت وارادہ کی ضرورت ہے۔ حوصلہ و اُمنگ کی ضرورت ہے۔ ہر چھوٹے۔ مصیبت زدہ غریب کو سمجھنا چاہیئے کہ ہم میں وہ قوت پوشیدہ ہے کہ جسکے اظہار کا وقت اب تک نہ آیا تھا۔ مگر اب آیا ہے سمجھنا چاہیئے، کہ گو ہم غریب ہیں مگر ہمارے پاس دل و دماغ۔ تحمل و برداشت۔ محنت و جانفشانی کی وہ دولت موجود ہے جسکے ہوتے ہوئے ہم ضرور منزل مقصود میں کامیاب ہونگے اور باوجود غربت کے ہمارا کام کسی امید سے کم نہ ہوگا اور جسوقت قومی خدمت کا جائزہ لیا جائیگا تو ہم کو سرنگوں نہ ہونا پڑیگا اور افلاس میں امارت کا مسئلہ ہم پر پورے طور پر اطلاق ہوگا۔ اور ہم دنیاکو دکھادینگے کہ اگر ہم روپیہ سے مادر وطن کی خاطر نہ کرسکے تو اپنی الفت قومی۔ جذبۂ ملی سے اُسکو اتنا سرشار کرسکے کہ بے ساختہ دُنیا فتویٰ دیگی کہ گو یہ لوگ بے زر و بے نوا تھے مگر ان کے پاس وہ بیش بہا خزانہ تھا کہ وہ اپنی غربت میں بھی امیروں سے بڑھکر تھے اور ایسے بھی لوگوں کی زندگی دوسروں کے لئے باعث تقلید ہوتی ہے۔ اس لئے غریبوں کو ہراساں نہ ہونا چاہیئے کہ وہ دُنیا میں کچھ نہ کرسکیں گے وہ سب کچھ کرسکتے ہیں بشرطیکہ قوت ارادی ہو۔ اس لئے نوجوانان قوم کو چشم وا سے اپنی پوشیدہ پُر اسرار قوتوں سے کام لیتے ہوئے مادر وطن کی خدمت کرنا چاہیئے اور ہر لحظہ۔ ہر سمجھ اپنی خدمت سے ملک و وطن کو نیک نام بناکر منزل مقصود تک پہونچنا چاہیئے۔ جب یہ راز سمجھ میں آگیا۔ جب یہ کیریکٹر ہمارے نوجوانوں میں بن گیا تو قوم کا بیڑا پار ہے۔ ڈگمگاتی کشتی ساحل کامیابی پر پہنچکر رہروانِ منزل مقصود کو ہمیشہ کے لئے آزاد کردیگی۔ بس اب اس جذبہ کی ضرورت ہے۔ اس قوت ارادی کی ضرورت ہے نوجوانان ہند کو اس مسئلہ "افلاس میں امارت" کو خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ پھر کوئی مشکل اُن کے سد راہ نہ ہوگی۔ پھر کوئی آفت ان کو راستہ سے نہ موڑسکے گی۔

(خاص)

(صفحہ ۶۷۹ کا بقیہ)

اور ترقی کی طرف قدم بڑھانے کے متعلق مشورہ دے اور اس کا سالانہ اجلاس مختلف اضلاع میں ہوتا رہے تاکہ ہر نواح کے اخبار نویسوں کو تبادلہ خیال سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے اور اس الیسوسی ایشن کے پاس ایک ایسا امدادی فنڈ بھی ہو۔ جو ضرورتوں کے وقت جائز مدد بھی کرسکے۔

مدیران اخبار کے فرائض اور صحافت کی ذمہ داریوں پر بحث کرنے کی بہت گنجائش ہے لیکن میں اپنے اس مختصر مضمون کو یہیں پر ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میری یہ مختصر تحریر صاحبان اخبار کو کم سے کم اس مسئلہ پر ضرور متوجہ کردے گی۔ کہ ہمیں اپنی تنظیم کے لئے الیسوسی ایشن کی کس قدر ضرورت ہے۔

(خاص)

بیدار

ساردا ایکٹ

(علمی اخلاقی اور معاشرتی روشنی میں)

[جناب محمد منظور فاضل، سابق ایڈیٹر بیدار]

ہندوستان ہی وہ بدنصیب ملک ہے جہاں اس تہذیب وتمدن کے زمانہ میں بھی ہر قسم کی اسمیں، خراب دستور اور طرح طرح کے قابل نفرت رواج برابر برتے جاتے ہیں، انکی پابندی اس قدر ضروری سمجھی جاتی ہے کہ شاید دنیا مفید سے مفید رواج پر زور نہ دیتی ہو، سوسایٹی کے خوف اور برادری کے ڈر سے ہر تعلیم یافتہ اور روشن خیال شخص بھی ان مراسم بیہودہ کا پابند نظر آتا ہے۔

ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں اخلاق ومعاشرت کی خرابیاں غالباً سیکڑوں برس گزرنے کے بعد بدستور رائج ہیں اور اب بھی انکے قیام پر نہ صرف جاہل، عام طبقہ کے افراد بلکہ بڑے بڑے عالم، پنڈت اور سیاست داں لیڈر زور دیتے اور خواہ مخواہ کا شور وشغب مچاتے ہیں۔

یہاں جس طرح سیکڑوں قومیں، زبانیں، طریق تمدن اور طرز معاشرت ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ معاشرت واخلاق میں ہزاروں برائیاں ہیں، جنکے ذکر سے متمدن وترقی یافتہ قوموں کے سامنے مارے شرم کے ہماری گردنیں نہیں اٹھتیں۔

ہمارا ہندوستان ہی ہے، جہاں قوم وملک کے اُن نونہالوں کا جن پر آئندہ تہذیب وتمدن کا دارومدار ہوتا ہے، پانچواں حصہ آغوش مادر ہی میں دم توڑ دیتا ہے اور سالانہ ۲۰ لاکھ شیرخوار بچے ہندوستانیوں کی جہالت کو دعائیں دیتے ہوئے عالم بالا کو سدھارتے ہیں، ہندوستان ہی وہ ملک ہے جہاں ۱۷ لاکھ ایسی بیوائیں اور رانڈیں ہیں جنکی عمر ایک ماہ سے ایک سال کے اندر ہے، کل بیواؤں کی تعداد جو حیوان سے بدتر زندگی کرنے پر مجبور ہیں جدید ترین رپورٹ کے رو سے ۲۶۸۳۴۸۳۸ ہے۔ یہ ایسے مظالم کا شکار ہیں، جس کے قہر میں معلوم ہوتا ہے ۳۲ کڑور انسان غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہندوستانی بیوائیں جس انسانیت سوز ظلم وستم کے عالم دن کاٹ رہی ہیں، اس کے بیان کو پتھر کا کلیجہ چاہیئے، پھر تعداد دیکھکر ہر دردمند ہندوستانی کا دل پھٹا جاتا ہے۔

ان دردناک واقعات . . . واعداد وشمار کو دیکھکر سوال ہوتا ہے کہ ان کا باعث کیا ہے، وجوہ واسباب کونسے ہیں، اس کا جواب لوگ مختلف دیتے ہیں، بعض کہتے ہیں . . . تعلیم کی کمی اس کی ذمہ دار ہے، کوئی کہتا ہے افلاس اس کا باعث ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے اسکا سبب غیر ملکی حکومت ہے، کچھ لوگ قسمت ونصیبہ کے قائل ہیں، غرضکہ ہر شخص ایک نئی وجہ بتاتا ہے، مگر غور سے دیکھئے تو فوراً یہ حقیقت ظاہر ہوجائیگی کہ معاشرت کی خرابیاں، سوسایٹی کے برے چلن، ملک کی بدرواجیاں، ان برائیوں کی جڑ ہیں

تاوقتیکہ سوشل ریفارم ہم میں پوری طرح سے رائج نہ ہولے۔ ہمارا کسی قسم کی ترقی کا خیال بھی گناہ ہے اور سوسائٹی تنظیم کے بغیر قوم کی اصلاح کسی پہلو سے انسانی قوت سے باہر ہے۔

ہندوستان[1] کی آزادی بلکہ اسکی موت وحیات کی جنگ ہندوستان کے گھروں اور جھونپڑوں میں لڑی جانی چاہیئے۔ کیونکہ یہی وہ گھر ہیں جہاں ہندوستانیوں کی خود غرضی، انکی بزدلی، دماغی انحطاط اور جذبات منافرت پیدا ہوتے ہیں جس کا باعث یہ ہے کہ جو شخصیت کسی گھر یا جھونپڑے کی منتظم ہو اس کے اختیارات بدرجہ غایت محدود ہیں،

کہتے ہیں کہ جو ہاتھ گہوارہ جنبانی کرتا ہے وہی ہاتھ دنیا پر حکومت بھی کرتا ہے مگر یہ بات اُسی وقت صحیح ثابت ہوسکتی ہے جبکہ اس ہاتھ کو ایسے دل کی امداد حاصل ہو جو اس قوم کی جس سے اس کا تعلق ہو، زندگی اور قسمت پر وسیع نظر ڈال سکتا ہو، میرے ایک دوست نے فرمایا تھا کہ ہندوستان کا مستقبل اس کے طبقہ نسواں کے ہاتھ میں ہے"۔

اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، لیکن آیئے ہندوستان کے طبقہ نسواں پر غور فرمایئے کہ معاشرتی طور پر کہانتک اس ذمہ داری کے بار اُٹھانیکی طاقت اسمیں ہے۔

ہماری معاشرت کا نقشہ یہ ہے:۔

اوسط درجہ کی ہندوستانی ماں کی شادی ایسی عمر میں کردی جاتی ہے جس میں وہ بیچاری یہ بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ ماں بننا کیسا ہوتا ہے؟ لیکن جبراً اسکو ان فرائض کی انجام دہی کرنی پڑتی ہے، اس وقت وہ صنفیت و انسیت دونوں کے جذبات سے بیگانہ ہوتی ہے، اس میں الھڑپن اور بچپن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے، یہ وہ باتیں جو پختہ عمر تک پہونچنے کے بغیر دور نہیں ہوسکتیں۔

ہندوستان میں کمسنی کی شادی کے باعث بچوں کی کثیر تعداد موت کا شکار ہوتی ہے اور لاکھوں کمسن دلہنوں کا سہاگ لٹ جاتا ہے اور وہ سوگ کی ایسی دردناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں جو بیوگی کہلاتی ہے،

اولادیں جو پیدا ہوتی ہیں وہ ایسی کمزور و ناتواں کہ ملک و قوم کے لئے مفید ہونے کے بجائے عذاب جان بنی رہتی ہیں۔

کمسنی کی شادی

مہاتما گاندھی اس بری رسم کے متعلق ینگ انڈیا میں تحریر فرماتے ہیں۔

یہ خراب رسم ہمارے ہزاروں لڑکوں اور لڑکیوں کی قوت کو نچوڑے لے رہی ہے، حالانکہ انھیں بچوں پر ہمارے تمدن کا آئندہ دار و مدار ہے، اس بری رسم کے بدولت ہر سال ہزاروں کمزور لڑکیاں اور لڑکے ایسے پیدا ہوتے ہیں جو والدین کے عدم بلوغیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہماری قوم میں جس کثرت سے بچوں کی افسوسناک موتیں اور مردہ پیدائشیں دیکھنے میں آرہی ہیں انکے جاری رکھنے کا پہلا ذریعہ ہی رواج کمسنی کی شادی ہے،

ہندو سوسائٹی کے تدریجی اور یقینی انحطاط کا باعث یہی ہے جس سے تعداد میں، قوت باہ میں ہمت میں اور اخلاق میں کمتر اور ذلیل تر ہوتے جاتے ہیں۔

[1] ڈاکٹر ایس۔ اے حامد صاحب در ہمدم ۱۲

کمسنی کی شادی کے نقصانات

کمسنی کی شادی کے نقصانات کا اندازہ آپ فرما سکتے ہیں اس سے نہ صرف ملک کے نوجوانوں کی تندرستی خراب ہوتی ہے، بلکہ اس سے اقتصادی نقصانات بھی ہوتے ہیں، کمزور بچوں کے علاج اور دوا درمن میں ہر شخص اپنی وسعت بلکہ وسعت سے زیادہ صرف کرتا ہے، پھر نتیجہ کیا نکلتا ہے کہ یہ دوائیوں کے زور سے زندہ رہنے والے نوجوان ہوکر ملک و قوم کی تباہی کے باعث ہوتے ہیں، انمیں نہ مردانگی ہے، نہ شجاعت، نہ علم ہے، نہ قوت، نہ ہمت ہے، نہ استقلال، بھلا ایسے نوجوان ملک و قوم کے لئے کیا مفید ہوسکتے ہیں،

ایک مغربی مصنف ہندوستانیوں کی صحت اور انکی کمسنی کی شادی پر یوں رائے زنی کرتا ہے،

"ہندوستانیوں کی قوت حیات مقابلہ کی اہل نہیں ہے یعنی روزمرہ کے امور دنیوی میں انکے زن و شوہر کے تعلقات اور تربیت کی شکلیں و اسباب ناقص ہیں، سن بلوغیت کو پہونچکر ہندوستانی لڑکی نویں مہینے ماں بن جاتی ہے، ماں بننے کا زمانہ آٹھ سے چودہ برس تک کی عمر میں شروع ہوتا ہے، یہ سن و سال اُس پر زچگی کی مصیبت اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں بلکہ صدیوں کی قدامت سے چلی آرہی ہے جس نے ساری قوم کے جسم کو نحیف و کمزور اور بچہ کشی نے ناقابل کردیا، وہ بالکل جاہل ہوتی ہیں۔ اسکی معلومات کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ اُس کا شوہر اُس کے گھر کا دیوتا ہے . . . .

اُس کے شوہر کے لئے کوئی درجہ عمر مقرر نہیں، وہ عمر میں بیوی سے چھوٹا بھی ہوسکتا ہے اور پچاس برس کا رنڈوا بھی . . . . . . نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چھوٹی سی ماں تباہ کُن حمل میں مبتلا ہو جاتی ہے، جس کے آخر میں زچگی کا وہ زمانہ آتا ہے جسکی مصیبت کا اندازہ محض مصیبت کے تصور سے نہیں ہوسکتا، بچہ اگر پیدایش کی سختیوں سے جانبر ہوجاتا ہے تو کمزور جثہ کے ڈھانچہ میں زندگی کاٹتا ہے، اُسکی کمزور ہڈیاں طاقت سے محروم ہوتی ہیں، وہ اس چھوٹی سی ماں کی نگرانی میں پرورش پاتا ہے، جو اصول حفظان صحت سے ناواقف، قدیم ٹوٹکہ و ٹونہ کی مقصد ہوتی ہے"

تشریحی شہادتوں اور طبی روشنی میں دیکھئے تو مندرجہ امور پیش کئے جائیں گے،

"کمسنی کی شادی کا خمیازہ اگرچہ میاں بیوی دونوں کو بھگتنا پڑتا ہے، لیکن اس کا مضر اثر اکثر کمسن بیوی کی صحت پر پڑتا ہے، ایسی لڑکیاں جو عین حالت بلوغ میں یا اس سے قبل بیاہی جاتی ہیں :-

(۱) اُن کے اعضاے ظاہری کی نشو و نما رک جانے کے ساتھ رحم (   ) بھی پوری وسعت حاصل نہیں کرسکتا،

(۲) رحم کو اُسکی جگہ پر قائم رکھنے والے روابط کے بیحد کمزور ہو جانے کے سبب سے وہ جنہیں (بچہ و شکم) کا بوجھ اُٹھانے سے مجبور ہوجاتی ہیں، اس قسم کی عورتوں میں اسقاط حمل زیادہ ہوتا ہے۔

(۳) جنین کی گذرگاہ تنگ ہونے کے سبب سے عسر ولادت بھی ایسی ہی لڑکیوں میں پایا جاتا ہے۔

(۴) اگر خدا خدا کرکے کسی طرح وضع حمل ہوا بھی تاہم بچہ خلقتاً کمزور پیدا ہوتا ہے۔

(۵) بیوی کی اصلی کمزوری کے ساتھ وضع حمل کا ضعف

اور تکان شامل ہو کر اُس کو اپنے پیارے بچے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانے پر مجبور کرتا ہے"۔

(مشیر الاطبا)

ہندوستان میں جہاں سن بلوغیت کو پہونچتے پہونچتے تقریباً ہر لڑکی کی شادی ہو چکتی ہے اور اُسکو زن و شو کے فرایض انجام دینے پڑتے ہیں، اور بالآخر زچگی کی مصیبت میں مبتلا ہوتی ہے اور اکثر اسمیں مرجاتی ہے ۔:

چنانچہ ایک نسل کی مدت عمر میں ۳۲ لاکھ مائیں صرف زچگی کی تکلیف سے مرتی ہیں۔

ملک میں بچوں کی صحت اچھی نہ رہنا، اور بچوں کی شرح اموات کا بہت زیادہ ہونے کا باعث بھی مسلمہ طور پر کمسنی کی شادی ہے کیونکہ ہمارے ملک کی اکثر عورتیں ماں بننے اور بچہ کی پرورش کرنے کی قطعی اہلیت نہیں رکھتیں، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ان بیچاریوں کی شادیاں ایسی کچی عمر میں کر دیجاتی ہے کہ جسمانی اور دماغی طور سے ماں بننے کے قابل نہیں ہوتیں۔

قانون کی ضرورت ان دردناک واقعات کو دیکھتے ہوئے تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر حلقے میں ایسے قانون نہ ہونے سے سخت بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا کہ رضامندی عمر کے لئے کوئی دفعہ نہیں، اس نے سخت احتجاج کیا اور بتایا کہ ایسے قانون کی سخت ضرورت ہے، جس میں شادی کی عمر کا تعین ہو، کیونکہ جب دستور معاشرت اور مذہبی رسوم کسی قوم اور بیکس قوم کی اخلاقیات اور زندگی کو خطرہ میں ڈالدیں تو وہاں قانون حکومت کو مداخلت کا حق ہونا چاہئے۔ اس میں ہندو مسلمانوں کی کوئی تخصیص نہیں، کمسنی کی شادی کی لعنت ہندوستان کے باشندوں میں موجود ہے، مسلمان بھی اس سے بری نہیں اور بکثرت انمیں اس کا رواج ہے، اور رسم و رواج بھی کیسا کہ اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ وعظ و نصیحت اصلاح حال کے لئے فائدہ مند نہیں، تو یقیناً ایک خاص عمر حکماً و قانوناً مقرر ہونا کبھی دین میں مداخلت نہیں ہو سکتی، جسکا خواہ مخواہ مچایا جائے بلکہ اس بارے میں قانون کا نافذ ہونا عین دین کے حکم کی تعمیل ہو گئی اس لئے کہ اسلام میں سوائے خاص خاص حالات کے عاقل و بالغ کا حق قبولیت شرط نکاح ہے، چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں میں بھی بکثرت کمسنی کی شادی کا رواج ہے، اور یہ رسم و رواج اس قدر راسخ ہو چکے ہیں کہ زبانی پند و نصیحت سے کسی مفید نتیجہ کی امید نہیں اس واسطے حکومت کے قانون کی ضرورت ہے اور بلا قانون مسلمانوں سے بھی اس بد رواجی کا مٹنا محال ہے،

بحیثیت ایک مسلمان کے جس نے بچپن ہی سے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی شخص بھی ثابت کر دکھلائے کہ اسلام بطور ایک مذہب کے عورت کو آزادی، اور تعلیم کے حق سے محروم کرتا ہو، اسلام عورت کو آزادی، وراثت، تعلیم، شادی میں انتخاب کا ہر ایک حق اور دیگر مراعات جو اسوقت تک مردوں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھی ہیں۔ عطا کرتا ہے۔

بہرحال کمسنی کی شادی کے نقصانات و مصائب کا لحاظ کرتے ہوئے ایک قانون کی ضرورت ملک نے سمجھی، جو روشن خیال اور ترقی خواہ طبقہ کی کوششوں سے اسمبلی میں پیش ہو کر پاس ہو گیا، اس میں لڑکی کی عمر شادی ۱۴ برس

اور لڑکے کی عمر ۱۸ سال رکھی گئی ہے، جو ہندوستان ایسے گرم ملک کے لئے بھی کم سے کم ہے۔

دقیانوسی خیال | بعض احباب اس قانون پر (جو سارداایکٹ سے عوام میں مشہور ہے) یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہندوستان میں لڑکیاں ۱۴ برس سے بیشتر بالغ ہوجاتی ہیں، اس لئے یہ عمر بہت زیادہ ہے، اسمبلی میں پنڈتوں اور کٹر دقیانوسی خیال کے لوگوں نے بہت سے خطرات سے آگاہ کیا ہے، منجملہ اس کے یہ ہے کہ ہندوستان میں بدکاری اور حرامکاری روزافزوں ہوجائیگی اور لڑکیاں آئے دن بھاگ جایا کرینگی۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دوراندیشی کہانتک تجربہ پر مبنی ہے، اگر ہم کو اپنے اخلاق وعادات پر اتنا بروسہ نہیں کہ ملکی بہنوں کی عزت واحترام کرنا سیکھیں، تو بہتر یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے پھانسیاں لگاکر جان دیدیں۔

اگر محض اس خیال سے کمسن، اور معصوم بچیوں کی شادی کردی جاتی ہے، کہ خدانخواستہ جوان ہوکر اپنی مرضی سے شوہر کا انتخاب کرلیا کرینگی یا بھاگ جایا کرینگی، تو نہیں کہا جاسکتا کہ ایسی لڑکیاں شادی شدہ ہونے کی حالت میں کس طرح باعصمت رہتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ہمارے دماغ کے تراشے ہوئے الزامات اور خواہ مخواہ کی بدگمانیاں ہیں جنکا وجود سوائے دقیانوسی ہندوستانیوں کے دماغ کے کہیں نہیں،

شادی کی غرض | شادی کا مقصد عقل ومذہب کے رو سے جب کہ شاستروں نے بنایا ہے، نیک، طاقتور اور قابل اولاد پیدا کرنا اور بقائے نوع کی کوشش کرنا ہے۔

اس سے اعلیٰ مطمح نظر یہ ہے کہ انسان محنت ومشقت اور فکر معاش کی کلفت ومصیبت میں ایک دل بہلانیوالے سچے ہمدرد، رفیق حیات کے پُرخلوص مشوروں سے ایک گونہ راحت وسکون حاصل کرے اور جب شام کو تھکا ہارا گھر میں آئے تو اس کا خیرمقدم کرنے کے لئے ایسا مسکراتا ہوا چہرہ اور مخلص دل جسکی دلدہی واظہار ہمدردی سے دل ودماغ کی ساری کلفتیں دور ہوجائیں، موجود ہو۔

ظاہر ہے شادی کے بعد بھی ایک انسان ان باتوں سے محروم رہے تو سوا اس کے کوئی چارہ نہیں کہ کسی اور طرح اپنے دل بستگی کے سامان مہیا کرے۔

شادی کا تنہا مقصد صرف جسمانی ونفسانی خواہشوں کو پورا کرنا نہیں، بلکہ اس کا سچا مدعا یہ ہے کہ انسان اجتماعی حیثیت سے ایسی زندگی بسر کرے جو قوم وملک کے لئے مفید ہو، اس کے لئے بھی کسی طرح کمسن بیوی اہل نہیں، مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کاروباری سلسلے میں کسی دور دراز جگہ پر مقیم رہنے پر مجبور ہیں۔ اگر آپ کی بیوی ۱۴ سال یا اس سے کم عمر کی ہے، تو سوا اس کے آپ کے لئے کسی اطمینان وراحت کا موجب ہو، اُلٹا مصیبت کا پیش خیمہ اور آفتوں کا مجموعہ ہوگی، کہ کمسن لڑکی کسی گھر کے سنبھال سکنے کے بجائے ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی اس بچی کا سنبھالنے والا ہو، پھر شادی کے بعد بھی انھیں دقتوں کا سامنا کرنا پڑے، جو شادی نہ کرنے کی حالت میں پیش آئیں، تو شادی سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا اور شادی کرنا نہ کرنا برابر، بلکہ دوراندیشی وعاقبت بینی مقتضی اس امر کی ہے کہ ایسی شادی نہ کی جائے۔

ڈاکٹروں کی ایک بڑی جماعت اس عمر میں شادی کرنے کے شدت سے مخالف ہے، وہ لکھتے ہیں کہ عمر پختہ ہونے سے قبل شادی کر دینے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور بطریقہ توارث اسکا سلسلہ آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے، وہ اُن مفاسد سے کہیں زیادہ مصیبت خیز ہیں جو بہ دیر شادی کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

مثال میں ایسی قومیں لیلو جو کمسنی کی شادی کی عادی ہیں انمیں نسلی اور دماغی کمزوریاں پائی جاتی ہیں جیسا کہ ہندوستانی ہیں اسکا تنہا سبب پختگی سے قبل شادی کر دینے میں مضمر ہے۔

ساردا ایکٹ میں عمر کا تعین جو کیا گیا ہے، یہ کم سے کم ہے، میرے خیال میں کوئی ہندوستانی لڑکی ۱۶ سال سے پہلے پختگی کو نہیں پہونچتی، اس لئے ہمکو اس بارے میں نہایت حزم و احتیاط کرنی چاہیئے اور اپنے کو دھوکے میں نہ رکھنا چاہیئے، بلکہ غور و فکر کے ساتھ طبی مشوروں پر عمل کر کے اولاد کی واقعی شادی کرنی چاہیئے۔

کام کی باتیں اب جبکہ حکومت نے شادی کی عمر مقرر کر دی ہے، جہاں ملک و قوم کا یہ فرض ہے کہ اس قانون کا احترام کریں۔ وہاں اس پر بھی غور و فکر کرنی چاہیئے کہ ہماری بچیوں کو جو یہ چار برس مل رہے ہیں، اس سے لڑکی کی تعلیم و تربیت میں پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے، کیونکہ اب تک تعلیم و تربیت نسواں میں سب سے بڑی رکاوٹ جو تھی وہ یہی تھی کہ والدین برادری کے خوف اور سوسائٹی کے ڈر سے لڑکی کی شادی دس گیارہ برس میں کر دیتے اور اس سے قبل تعلیمی سلسلہ منقطع کرا دیتے تھے۔

یہ بات صحیح ہے کہ ایسے والدین فیصدی بہت کم ہونگے جو بارہ برس کی عمر کے بعد اپنی لڑکیوں کو اسکول بھیجنا پسند کریں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جو والدین بھیجنا پسند کرینگے اُن کو اس کا صلہ بھی کچھ ملتا ہے یا نہیں؟ یعنی اُنکی لڑکیوں کو ایسی تعلیم و تربیت حاصل بھی ہوتی ہے یا نہیں جو وہ سنجیدہ اور کام کے قابل عورتیں اور کنبہ میں جو فرائض اُنکے سر عائد ہوں انکو بخوبی انجام دے سکیں۔ علاوہ ازیں اگر جبریہ ابتدائی تعلیم کو رواج دیا جائیگا تو اُسکی عمر دس برس سے زیادہ نہ ہوگی اسی طرح لڑکیاں چار برس تک گھروں میں بیکار بیٹھی رہیں گی، اس لئے ضرورت ہے اس امر کی کہ غریب سے غریب گھر میں بھی اس زمانہ میں لڑکیوں کو کسی طرح تعلیم و تربیت دیجائے، تاکہ یہ زمانہ ضائع نہ ہو، یعنی ضرورت ہے کہ ایسی اُستانیاں رکھی جائیں جو دورہ کر کے سب کے گھروں میں جا کر تعلیم دیں اور ہر گھر میں ہر روز کچھ نہ کچھ وقت صرف کریں اور جو کچھ لڑکیاں اسکول میں سیکھ چکی ہیں اس سے آگے سکھائیں اور پچھلا سبق بھولنے نہ دیں ایسی اُستانیاں بسا اوقات اُنکو حفظان صحت و امور خانہ داری وغیرہ کے اصول بتا کر فائدہ پہونچائیں گی۔ یہ اسکیم اگرچہ گراں ہے مگر باہمی جمع خرچ سے قومیں نہیں بنا کرتیں۔

تا وقتیکہ تعلیم نسواں کا عام رواج نہ ہو اور عورتوں کی تربیت نہ کی جائے کسی بہتر نتیجہ کی امید نہیں، بلا اس کے سوسائٹی کی بد رواجیوں کا مٹانا اور اسکی تنظیم مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ایک صاحب علم کا قول ہے " دو باتوں میں ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے، عورتوں کی

ترتیب (جسمانی دماغی اور روحانی ترقی) اور اس قوم کی تباہی میں" ہمارے معاشرتی انحطاط کی اصل وجہ یہی ہے کہ عورتوں میں جہالت عام ہے اور انہیں ۱/۲ ۱ فیصدی سے زائد تعلیم نہیں، لہذا اگر ہم کو سوشل ریفارم رائج کرنا اور موجودہ برائیوں سے نجات حاصل کرنا ہے تو ہمکو تعلیم نسواں کے عام کرنے کے ذرائع پر غور کرنا ہوگا، اور صرف زبانی جمع خرچ سے نہیں بلکہ عملی طور پر کوشش کرنا چاہیے، تاکہ ہم بھی معاشرتی خرابیوں کو دور کر کے ملکی ترقی حاصل کریں اس امر میں جب تک ہماری امداد تعلیم و ترقی یافتہ خواتین نہ کریں گی ہم کبھی مقصد کو نہیں پہونچ سکتے۔

اپیل! میں تعلیم یافتہ روشن خیال، ترقی کی خواہشمند ہندوستانی خاتونوں سے عرض کرتا ہوں کہ "سیا سیات جرائد نگاری اور بے فیض مشقتوں کے بجائے وہ اپنی توجہ، اپنی کوشش، اپنی ہم جنسوں کی اصلاح و خبر گیری میں صرف کریں تو بہت بڑی خدمت انجام دیگی۔

ان کمسن بیویوں اور بیواؤں کی بہتری کے لئے عورتوں کی ہی خدمات اور ان تھک کوششیں زیادہ بار آور ثابت ہوسکتی ہیں، تعلیم یافتہ خواتین بجائے اس امر کے کہ وہ عورتوں کے لئے سیاسی حقوق و انتخاب آرا کی بھی اور دیگر مشاغل میں پڑیں، اور اپنے ہم جنسوں کی زبون حالی کا الزام مردوں پر رکھیں، انھیں انکی ہی بہبودی کے لئے انتھک کوشش کرنی چاہیے۔" (خاص)

[صفحہ ۵۶۲ کا بقیہ]

جو میں نے دوسرے جا کے دال سیب والے سے چھینا یا ورنہ وہ تو وہس کی ایسی گت بناتا کہ صبو کر دیتا۔ دال سیب والا بولا خلیفہ جی آخر دیکھو میرا کوہی قصور بھی ہو وہس نے بے مطلب مجھے گالیاں دیں۔ لڑلنے پہ آمادہ ہوگیا اور میرا نقصان ہوا سو الگ میں تو وہس سے ایک ایک کوڑی دمیر والوں گا۔ میں نے دیکھا بات بڑھتی چلی جاتی ہے لبس وہی وخت اپنی نیما استین کی جیب میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر وس کے ہاتھ میں دیدیا کہ لے دلی لبس جھگڑا ختم کر بلا سے ہم اپنے یار کے کارن پانچ روپے کا جرمانہ ہی بھگتین تے دال سیب والا تو نوٹ لیکر چلتا بنا اور میں نے منتیاز سے کیا دیکھ پیارے اب کسو سے خانا خانہ اُلجھیو یوں کہ دنیاں میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہے جیسے جس بات کا طمنڈ تھا وہ بھی تو نے دیکھ لیا۔ اگر میں بروخت پہ نہ آ جاتا تو آج خدا جانے تیری کیا گت بنتی۔ منتیاز کچھ ایسا جھینپ رہا تھا کہ وس نے مجھے کچھ جواب نئی دیا اور سیدھا اپنے گھر میں گھس گیا اور میں بھی اپنے دل میں یہ کہتا واپس گیا کہ جو بیا یہ بڑا بول بولتا تھا اوس لوگ باگوں سے بُرائی سے پیش آتا تھا۔ دیسائی آج وس کو سنج بھی مل گیا۔

(خاص)

مسٹر سید حامد علی ' ایڈیٹر '' [illegible] ''

مسٹر شوکت تھانوی ' معاون '' اودھ اخبار ''
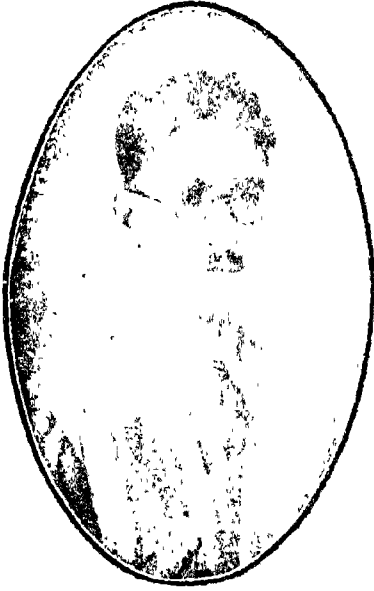
مسٹر محمد حبیب قصائی ' ایڈیٹر '' کیف ''

مسٹر عظیم الکریم ' ایڈیٹر '' نوبہا ''

مسٹر سجاد مرزا ، ایڈیٹر " المعلم "

مسٹر ... سہرانی ، ایڈیٹر " گلکدہ "

مسٹر سید احمد اللہ قادری نائب ایڈیٹر '' تاریخ ''

مسٹر اصغر حسین ' اصغر گونڈوی ' ایڈیٹر
'' ہندوستانی ایکیڈیمی جرنل ''

مسٹر مضطر عابادی ' ایڈیٹر '' پروانہ ''

مسٹر طالب الہ آبادی ' ایڈیٹر '' اکبر ''

خواجہ حسن نظامی، چیف ایڈیٹر ''منادی''

مسٹر وصل بلگرامی، ایڈیٹر ''مرقع''

مسٹر حنیف ہاشمی، نائب ایڈیٹر ''ریاست''

مسٹر سراج لکھنوی، معاون ''مبصر''

پروانہ

انگریزی ڈرامانگاری کی تاریخ

[جناب محشر عابدی صاحب' سابق ایڈیٹر پروانہ حیدرآباد]

پہلا باب۔ پہلا دَور

ناکمل ڈرامانگاری:۔ اگر انگلستان کی تاریخ ادب پر نظر ڈالی جائے' تو معلوم ہوگا' کہ ڈراما انگلستان میں بارھویں صدی عیسوی کے اوائل ہی میں جنم لے چکا تھا۔ چونکہ یہ ڈرامانگاری کی بالکل ابتدا تھی اس لئے اس زمانے کے ڈرامے کسی اصول اور قواعد کے پابند نظر نہیں آتے۔ عموماً تمام ڈرامے مذہبی ہوتے تھے' جو میریکل اور مسٹری ڈراموں کے نام سے موسوم تھے۔

میریکل اور مسٹری:۔ یہ ڈرامے تقریباً ایک ہی قسم کے مذہبی واقعات اسٹیج پر پیش کرتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا' کہ اول الذکر ڈراموں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندگی کے حالات اور معجزات کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اور موخر الذکر میں مذہبی اولیا اور بزرگوں کے قصے اور حکایتیں بیان کی جاتی تھیں۔

شروع شروع میں گرجاؤں کے پادری عوام الناس کو مذہبی تعلیم سے متاثر کرنے کے لئے گرجا کے اندر ہی اس قسم کے مذہبی ڈرامے دکھلاتے تھے' عموماً دو تہواروں یعنی "کرسمس ڈے" اور "ایسٹر ڈے" کے موقع پر یہ ڈرامے کئے جاتے تھے "کرسمس ڈے" کے روز صرف حضرت عیسیٰ کی زندگی کے متعلق بعض مناظر پیش کئے جاتے تھے۔ اور "ایسٹر ڈے" میں آدم کی پیدائش' انسانی زندگی اور اس کے بعد تمام واقعات کی نقل اُتاری جاتی تھی۔ ان تمام ڈراموں کی زبان لاطینی ہوتی تھی۔

ان مذہبی ڈراموں کو دیکھنے کا شوق اس قدر عام ہوگیا' کہ گرجا کے اندر جگہ کافی نہ ہونے لگی۔ اور آخر یہ ڈرامے باہر میدانوں میں کئے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ تجارت پیشہ لوگوں نے جو "گلڈز" کہلاتے تھے' اس میں شرکت شروع کر دی' اور آہستہ آہستہ یہ ڈرامے گرجا سے ہٹتے ہوئے عام لوگوں تک پہنچ گئے۔ اور ایک پیشہ کے طور پر ہر طبقہ کے لوگوں نے اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور اس کی زبان بھی لاطینی سے انگریزی ہوگئی۔ یہ ڈرامے کئی روز تک مسلسل کئے جاتے تھے۔

اس قسم کا سب سے پہلا مذہبی میریکل ڈراما "دی ہیرڈنگ آف دی ہل" ہے' جو ڈنسٹبل میں سینٹ کیتھرائن کے انداز میں سنہ ۱۱۱۰ء میں دکھایا گیا تھا۔ اور اس نوعیت کا سب سے آخری ڈراما کوونٹری میں سنہ ۱۵۸۰ء میں کیا گیا تھا۔ ان مذہبی ڈراموں کے بعض مجموعے حسب ذیل ناموں سے موسوم ہیں:۔

(۱) چسٹر سائیکل۔ اس میں کل پچیس ۲۵ ڈرامے ہیں (۲) وکفیلڈ میں اکتیس ۳۱۔ (۳) یارک میں اڑتالیس ۴۸ اور کوونٹری کا میں بیالیس ۴۲ ان ڈراموں میں دنیا کی تخلیق' آدم کی زندگی' طوفان نوح' اسحاق کی قربانی' (قرآن مجید سے حضرت اسمٰعیل کی قربانی ثابت ہے) وغیرہ کے تذکرے ہیں۔

دوسرا دَور

موریلیٹی:۔ حسب بالا ڈراموں کے بعد ایک اور تیسری صورت

جو پیدا ہوئی' وہ موریلیٹی ڈراموں کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ان ڈراموں میں اولیاء کی زندگی یا مذہبی حکایات کو بیان کرنے کے بجائے انسانی "خوبیوں" اور "برائیوں" کو کردار کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اور اسطرح ہر اخلاقی اور دماغی خاصیت کو ان کرداروں میں منتقل کر دیتے تھے۔ مثلاً ایسے ڈراموں کے بعض کرداروں کے نام یہ تھے :۔ دولت' نیک عمل' اعتراف گناہ' تُرش' استقلال وغیرہ۔ ان ناموں سے موریلیٹی ڈراموں کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ بعض ڈراموں کے نام حسب ذیل ہیں:۔ "قصر استقلال"۔ "انسانیت"۔ "ہر ایک آدمی" وغیرہ۔ یہ سب ڈرامے "خوبیوں" اور "برائیوں" کو بیان کرتے تھے' اور آخر میں "خوبی" کی فتح ہوتی تھی۔ ان ڈراموں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں "ڈیول" (شیطان) ایک ایسا کردار تھا' جو بالکل "ظرافت" کے لئے مخصوص ہوتا تھا' اور جو ہمیشہ "برائی" سے برسرپیکار رہتا تھا۔ چنانچہ یہ "ڈیول" رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ اور عہد حاضرہ کے ڈراموں وغیرہ میں جو بھانڈ یا "جوکر" ظریفانہ ایکٹ ادا کرتا ہے۔ یہ اُسی قدیم "ڈیول" کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

ان موریلیٹی ڈراموں کے لئے ایک خاص قسم کا قصہ یا پلاٹ ہوتا تھا۔ اور اس لئے یہ موجودہ مکمل ڈراموں کے قریب قریب پہونچ رہا تھا۔ اور آخرکار رفتہ رفتہ یہ موریلیٹی ڈرامے کیمڈی ڈراموں میں تبدیل ہوگئے۔ اس کے بعد ڈرامے کی ایک اور صورت پیدا ہوئی۔ جس کا ذکر بھی مختصراً ضروری ہے یہ انٹرلیوڈس یا "درمیانی ڈرامے" کہلاتے ہیں۔

انٹرلیوڈس:۔ اس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ موریلیٹی ایک جدید شکل ہے۔ مگر یہ خیال غلط فہمی پر مبنی تھا۔ کیونکہ درحقیقت یہ ڈرامے اور اخلاقیات سے مبرا ہوتے تھے۔ ان میں ظرافت ہی ظرافت ہوتی تھی۔ اور ان کی زبان موریلیٹی ڈراموں کی بہ نسبت کم سنجیدہ ہوتی تھی۔ سولھویں صدی عیسوی میں جان ہے وڈ نے' جو کچھ عرصہ تک ہنری ہشتم کے دربار میں گانے کی خدمت پر معین تھا۔ اس کو بہت ترقی دی۔ اس قسم کی بعض قابل ذکر مثالیں یہ ہیں: "خود پتیر" یہ ایک مکالمہ ہے' جس کے کردار ایک زائر' ایک بخی' ایک طبیب' اور ایک راہرو پر مشتمل ہیں۔ اس میں یہ آپس میں کہانیاں کہتے ہیں۔ اور پھر اس بات کا مقابلہ کرتے ہیں کہ کس کی کہانی میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو سکتا ہے۔ یہ بہت دلچسپ ہے۔ دوسرے اور ڈرامے "فور ایلیمنٹس" اور "تھرسائیٹیز" وغیرہ ہیں۔ ان میں کردار' انسان' اور واقعات' زندگی سے متعلق ہوتے تھے۔ ان تمام ڈراموں میں "برائی" کا کردار ضرور موجود ہوتا تھا۔

دوسرا باب

مکمل ڈرامانگاری:۔ مکمل ڈرامانگاری کو دو دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے' پہلے دور میں ۱۵۴۰ء سے ۱۵۸۰ء تک کے حالات درج ہیں۔ اور دوسرے دور میں جو ۱۵۸۰ء سے ۱۵۹۶ء پر مشتمل ہے شیکسپیر کے پیشرؤوں' اور شیکسپیر کی ابتدائی ڈرامانگاری سے بحث کی گئی ہے۔ شیکسپیر کی ڈرامانگاری ایک علٰحدہ باب میں درج کی گئی ہے۔

پہلا دور

مکمل ڈرامانگاری کا پہلا دور سولھویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانہ یعنی ۱۵۵۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل جس قسم کے بھی ڈرامے ملک میں رائج تھے' گو وہ انگریزی میں لاطینی اور فرانسیسی ڈراموں کے طرز پر لکھے جاتے تھے۔ لیکن مکمل نہ ہوتے تھے۔ یعنی ان میں صرف مکالمہ ہی مکالمہ

ہوتا تھا۔ اور ایک قصہ مسلسل بیان ہوتا چلا جاتا تھا۔ نہ اس میں مختلف حصے ہوتے تھے نہ سین' نہ مناظر' چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد ایٹن کے ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر نکولاس یوڈال نے خالص انگریزی زبان میں سب سے پہلے کمیڈی (ڈراما) "رالف رائسٹر ڈائسٹر" لکھی' جس کے متعلق کہا جاتا ہے' کہ ۱۵۵۱ء سے قبل ہی اسکول کے طلباء نے اسٹیج پر پیش کی تھی لیکن وہ کتاب کی صورت میں ۱۵۶۶ء تک شائع نہیں ہوئی۔ یہ وہ سب سے پہلا انگریزی ڈراما ہے' جس میں لندن کی معاشرت پیش کی گئی ہے' یہ متعدد مکمل حصص مناظر اور سین پر مشتمل ہے اور ابتدا سے انتہا تک منظوم ہے' گویہ لاطینی ڈراموں کے طرز اور پلاٹس اور ٹیرینس یونانی ڈرامانگاروں کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں میریکل اور موریلیٹی ڈراموں کی ظرافت جگہ جگہ موجود ہے۔ شکسپیر نے بھی پلاٹس کے رنگ میں اپنی کمیڈی "ایررس آف فورز" لکھی ہے۔

اس کے بعد سیک ویل اور نارٹن نے ملکر انگریزی میں سب سے پہلی مکمل ٹریجیدی (ڈراما) "گاربوڈک" یا "فیریکس اور پوریکس" ۱۵۶۱ء میں لکھی۔ اس کا پلاٹ ایک انگریزی ولایت سے لیا گیا ہے۔ ڈراما سینیکا' لاطینی ڈرامانگار کے طرز پر لکھا گیا ہے' یہ ایک انتظامی ٹریجیڈی' یا بلیڈی ٹریجیڈی بھی کہلاتی ہے' یعنی اس میں قتل و خون کے مناظر بہت خوفناک طرز پر دکھائے گئے ہیں۔ اور کرداروں کے انتقامات جو انھوں نے ایک دوسرے سے بہت عبرتناک طریقوں پر لئے ہیں۔ یہ ٹریجیڈی "کرسمس ڈے" کے موقع پر "دی انر ٹیمپل" میں ۱۵۶۱ء میں دکھائی گئی تھی۔ اس ڈرامے کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے' کہ انگریزی مکمل ڈرامانگاری میں یہ ڈراما (گاربوڈک) سب سے پہلا ہونیکے علاوہ اس میں سب سے پہلی مرتبہ بلینک ورس (نثر مرجز یا غیر مقفہ عبارت) استعمال کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا ڈراموں کے بعد تقریباً ۱۵۶۱ء سے ۱۵۸۰ء بیس سال تک انگریزی ڈرامانگاری میں ایک کشمکش اور انجھاؤ سا رہا۔ یعنی کسی خاص نوعیت کے ڈرامے نہ لکھے جاتے تھے' بلکہ یہ کبھی مریلیٹی اور کمیڈی کا آمیزہ ہوتے' کبھی کمیڈی اور ٹریجیڈی خلط ملط ہوتے' اور کبھی ان تینوں کا مجموعہ۔ اس کے علاوہ مصنفوں میں دو فریقین قائم ہوگئی تھیں۔ ایک تو ان لوگوں کی' جو انشائے قدیم (کلاسکس) اصولی ڈرامانگاری یا سینیکا وغیرہ کے طرز نگارش کو رواج دینا چاہتے تھے۔ اور جس کی تائید انگلستان کے مشہور ادیب و شاعر سر فلپ سڈنی نے کی' دوسری میں وہ ایکٹر اور ڈرامانگار شامل تھے' جو عام پبلک کی دلچسپی اور تفریح کا خیال کرتے تھے۔ اور جو یہ سمجھتے تھے' کہ انکے سرپرست ڈرامانگاری کی فنی باریکیوں اور تفصیل کو پسند نہیں کرتے۔ اور جو صرف تعجب خیز پلاٹ اور پرلطف ایکٹنگ کے خواہشمند ہیں۔ یہ لوگ کسی پابندی کو پسند نہ کرتے تھے۔ اور انشائے قدیم کے اصولی طرز سے الگ رہ کر بالکل مختلف قسم کے ڈرامے لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو پبلک کا رجحان اس طرف زیادہ ہونے سے کامیابی ہوئی۔ اور شکسپیر کی ڈرامانگاری سے قبل ہی یہ غیر اصولی ڈرامانگاری "رومانی (خیالی) ڈرامانگاری" کے نام سے وجود میں آچکی تھیں اصولی ڈرامانگاروں کی فریق "یونیورسٹی وٹس" کے نام سے موسوم تھی۔ یعنی اس میں یونیورسٹی اور کالج کے فاضل شریک تھے

جو انشائے قدیم میں ڈرامے لکھتے تھے - اور دوسری "تھیٹریکل ڈرامانگاری" کہلاتی تھی -

کلاسکل اور رومانی ڈرامے:- (اصولی اور غیر اصولی یا خیالی) ان کے امتیازات کو جاننے کے لئے حسب ذیل اصول ہیں:
ایک کلاسکل یا اصولی ڈرامے میں حسب ذیل اصول و قواعد کی پابندی لازمی امر ہے:-

(۱) سارے ڈرامے کا صرف ایک ہی پلاٹ ہو، اور زبان بھی ایک ہی ہو۔ یعنی اگر ٹریجیڈی ہے، تو ابتدا سے انتہا تک ٹریجیڈی ہو۔ اور ہر جگہ سنجیدگی اور ٹریجیڈی کا رنگ جھلکتا ہو۔ کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہ ہو کہ جس سے ظرافت کا اظہار ہو۔ اسی طرح کیمڈی میں کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جو غم کا اظہار کرے۔ پلاٹ میں ضمنی حکایات اور روایات نہ آنی چاہئیں۔ ،، ،، ،،

(۲) ابتدا میں کوئی ایکٹنگ نہ ہو۔ گذشتہ تمام واقعات پبلک کے سامنے قصہ کی طرح بیان کر دئے جائیں۔ اور صرف آخر کا ایک حصہ مع چند ضمنی مناظر کے اسٹیج پر ایکٹنگ کے ساتھ پیش کیا جائے۔

(۳) وقت مقام اور ایکٹنگ میں یکسانیت ہونی چاہئے یعنی صرف ایک دن ہو، ایک کہانی اور ایک منظر، جس میں حکایات اور روایات بالکل نہ ہوں۔

(۴) محبت کے واقعات سنجیدہ پلاٹ کی شکل میں پیش نہ ہونے چاہئیں۔ بلکہ ضمنی طور پر تفریح کیلئے لائے جا سکتے ہیں۔

(۵) ابتدا سے انتہا تک ڈرامے میں یکسانیت ہو خالص ٹریجیڈی، خالص کیمڈی دونوں ایک جا مجتمع نہ ہونی چاہئیں۔

(۶) عبارت بھی یکسا رنگی ہو۔ یعنے صرف نثر صرف نظم یا صرف نثر مرجز۔

ایک رومانی غیر اصول یا شکسپیری ڈرامے میں کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اس میں حسب ذیل خصوصیات موجود ہوتی ہیں:-

(۱) اس کی زبان میں تنوع ہوتا ہے۔ یعنی ایک ہی ڈرامہ میں نثر و نظم، نظم و بلینک ورس، یا تینوں استعمال ہو سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ٹریجیڈی اور کیمڈی بھی مخلوط ہو سکتی ہیں۔

(۲) اس کے پلاٹ میں ایکٹنگ اور بیان ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور جو واقعات پلاٹ میں ہوتے ہیں۔ ان کو عملی طور پر اسٹیج پر دکھایا جاتا ہے۔

(۳) اس میں وقت، مقام، اور قصہ کی یکسانیت کی ضرورت نہیں

(۴) قصہ کا پلاٹ مہینوں اور سالوں پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے۔ ،، ،، ،،

(۵) مقامات بدلتے رہتے ہیں۔ یعنی ایک شہر کے علاوہ دوسرے شہروں اور مقامات کے مناظر بھی پیش کئے جا سکتے ہیں

(۶) اصل قصہ کے ساتھ ضمنی حکایات اور روایتیں بھی اسٹیج پر ایکٹنگ کے ساتھ دکھائی جا سکتی ہیں۔

دوسرا دور

یہ دور ۱۵۸۰ء سے ۱۵۹۶ء یعنی سولہ برس پر مشتمل ہے۔ اور یہ دور اس لئے زیادہ اہم ہے کہ شکسپیر کے قبل ہی رومانی ڈراما بہت ترقی پا چکا تھا اور ہر قسم کی آسانیاں مہیا ہو گئی تھیں جن سے آنیوالے دنیا کے سب سے بڑے ڈرامانگار شکسپیر نے بہت مدد لی۔ اس دور میں مختلف قسم کے سو سے زیادہ ڈرامے لکھے جا چکے تھے جنھیں مختلف تھیٹر کی کمپنیاں دکھا رہی تھیں۔ یہ سب نثر، نظم، اور بلینک ورس میں لکھے جا چکے تھے۔

شکسپیر کے پیشرو۔ شکسپیر کے پیش روؤں میں جان للی (۱۵۵۴-۱۶۰۶ء) ٹامس کڈ (۱۵۵۸-۹۴ء) جارج پیل (۱۵۵۸-۹۶ء) ٹامس لاج (۱۵۵۸-۱۶۲۵ء)۔ رابرٹ گرین (۱۵۶۰-۹۲ء) کرسٹفر مارلو (۱۵۶۴-۹۳ء) اور ٹامس نیش (۱۵۶۷-۱۶۰۱ء) ہیں۔ یہ "یونیورسٹی وِٹس" کہلاتے ہیں۔ ان میں جان للی اور کرسٹفر مارلو کو خاص اہمیت حاصل ہے

جان للی اپنی ایک کتاب "یوفیوز" کی وجہ سے جو ایک منثور رومان ہے، بہت مشہور ہے۔ اس نے آٹھ کمیڈی (ڈرامے) لکھی ہیں۔ جس میں سب سے اچھے "کمپاسپے" "انڈمی آن" اور "گیلاتھی" ہیں۔ یہ سب دربار میں دکھلائے جانے کے لئے لکھے گئے تھے۔ اور ان کی دلچسپی، پلاٹ، مناظر اور کرداروں پر منحصر نہیں ہے بلکہ "زبان" پر جو بجد شیریں، معنی خیز اور برجستہ ہوتی ہے۔ للی کی تشبیہات اور استعارات سے شکسپیر نے بہت کافی مدد لی ہے۔ شکسپیر کے ڈرامے "لوز لیبرس لاسٹ" اور "مڈ سمر نائٹس ڈریم" للی کے ڈراموں کے رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ شکسپیر نے للی کے ڈراموں سے یہ بات بھی حاصل کی کہ ایک درباری قصہ کے پلاٹ، اور ایک دیہاتی قصہ کے پلاٹ کو ایک جا مجتمع کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا شکسپیر کے دونوں ڈراموں میں یہی نکتہ واضح کیا گیا ہے چنانچہ ان تمام امور کے مدنظر بلا انکار للی شکسپیر کا پہلا استاد کہا جاسکتا ہے۔ للی کی تحریریں حسب ذیل خصوصیات کی وجہ سے بہت ممتاز ہیں:-

(۱) وہ اعلیٰ کمیڈی لکھتا ہے۔ یعنی اس کے کردار اعلیٰ مراتب کے لوگ مثلاً بادشاہ، حکام سلطنت، رؤسا اور اُمراء ہوتے ہیں۔

(۲) اس کی کمیڈی رومانی ہوتی ہیں۔ جس میں کسی نہ کسی طرح "محبت" کا اظہار کیا جاتا ہے۔

(۳) ڈراموں کے پلاٹ عموماً انشائے قدیم (کلاسکس) کے افسانوں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

(۴) تمام ڈرامے نثر میں لکھے گئے ہیں۔

للی کے بعد شکسپیر جس کے ڈراموں سے بہت مستفید ہوا وہ کرسٹفر مارلو ہے۔ مارلو گو نہایت اوباشانہ اور لاابالی زندگی بسر کرتا رہا، لیکن اس کا دماغ نہایت زود فہم اور باریک بین تھا؛ اور جبکہ وہ بالکل جوان ہی تھا تو شرابیوں کے ایک جھگڑے میں مار ڈالا گیا۔ ڈرامانگاری کی بہ نسبت اُسے غزلگوئی میں زیادہ ملکہ تھا۔ تاہم اُس کے ڈرامے ٹریجڈی "ٹیمبرلین دی گریٹ" (تیمور اعظم)، "ڈاکٹر فاسٹس" اور "دی جیو آف مالٹا" (مالٹا کا یہودی) باوجود اپنی نہایت مشکل عبارت کے جس سے ڈراموں میں جگہ جگہ نقائص پیدا ہوگئے ہیں اس عہد کے تمام ڈراموں سے زیادہ قابل قدر ہیں۔ اور مارلو اپنے تمام ہمعصروں اور شکسپیر کے پیش روؤں میں سب سے زیادہ بلند پایہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ ان تمام ڈراموں میں مارلو نے بلینک ورس (نثر مرخیز) استعمال کی ہے۔ جو اب تک اصولی ڈراموں اور خانگی ڈراموں کے لئے رائج تھی۔ اس طرح شکسپیر جو مارلو کے ساتھ کچھ عرصہ رہ چکا تھا، ابتدا میں مارلو کے ڈراموں سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی ابتدائی دور کی بلینک ورس (نثر مرجز) مارلو کے طرز سے بہت مشابہ ہے۔ چنانچہ شکسپیر نے اپنی نظم "وینس اور ایڈونس" مارلو کی نظم "ہیرو اور لیانڈر" سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ اور اسی طرح شکسپیر نے "رچرڈ دوم" اور "رچرڈ سوم" مارلو کے ڈرامے "ایڈورڈ دوم" کے رنگ میں لکھے ہیں اس پر بھی مارلو کا "ایڈورڈ دوم" شکسپیر

کے ڈرامے" رچرڈ دوم" سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ شکسپیر کا ڈراما "وینس کا سوداگر" مارلو کے ڈرامے " مالٹا کا یہودی" سے بہت ملتا جلتا ہے۔

جارج پیل نے "آرینمنٹ آف پیرس" اور "دیوڈ اور بتھ سیبا" دو ڈرامے لکھے ہیں۔ جن میں جدید طرز کی اور نشاط اور شاعری کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ رابرٹ گرین اپنے ڈراموں کی بہ نسبت، لطیف نظموں کے لئے بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ٹامس کڈ کا ڈراما " اسپانش ٹریجیڈی" بہت دلچسپ اور اچھا ہے۔

تیسرا باب

شکسپیر کے عہد سے ڈراما نگاری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے، شکسپیر کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ اردو میں لکھے جا چکے ہیں، اور اس قدر ان کا اعادہ کیا جا چکا ہے، کہ اب اس کے متعلق کچھ کہنا بے معنی سا معلوم ہوتا ہے، لیکن چونکہ ڈراما نگاری میں سب سے بڑا "ڈراما نگار" یا "ڈراما نگاروں کا بادشاہ" ہے۔ اس لئے مختصراً اس کے حالات درج کئے جاتے ہیں۔

ولیم شکسپیر، جس نے اٹھائیس سال کے عرصہ میں ڈرامے کو اس قابل بنا دیا تھا، کہ انسان کی "حیات کامل" کو مو بمو پیش کر سکے۔ ۱۵۶۴ء میں "اسٹارڈ آن۔ ایون" میں پیدا ہوا تھا۔ اور ابھی جبکہ وہ کمسن ہی تھا، اس کا تجارت پیشہ باپ غریب ہو گیا۔ اور اس کی تعلیم کامل طور پر نہ ہو سکی۔ اس وجہ سے وہ ایک معمولی درجہ کا طالبعلم رہا۔ گو وہ یونانی اور لاطینی بہت کم جانتا تھا۔ لیکن انگریزی کا اس کے پاس ایک بیش بہا ذخیرہ تھا۔ (کیونکہ وہ خالص انگریزی لکھتا تھا۔ اور اس نے ...۵ الفاظ استعمال کئے ہیں) بہرکیف اپنی دماغی قابلیت، ذکاوت اور ایسی سوسائٹی میں رہنے سے جس میں ہر قسم کے واقعات کا علم ممکن تھا۔ وہ ایک قابل آدمی بن گیا۔ بیان کیا جاتا ہے، کہ لڑکپن میں اس کی فطرت نہایت آزاد اور نڈر تھی۔ اور اس نے شارلی کوٹ کے جنگلوں میں ایک بار ہرن چرایا تھا۔ لیکن معلوم نہیں، یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے۔ ۱۹ انیس برس کی عمر میں اس نے "این ہاتھ وے" سے شادی کر لی جو اس سے تقریباً سات سال زیادہ بڑی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اُس سے موافقت نہ ہو سکی۔ اس وجہ سے یا کسی اور سبب سے وہ وطن سے روانہ ہو کر ۱۵۸۶ء میں لندن آیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۲ بائیس سال کی تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ مارلو اور گرین وغیرہ کے ہمراہ ایک ایکٹر اور ڈراما نگار بن گیا۔ رفتہ رفتہ یہ "گلوب" اور "بلیک فرائرس" تھیٹروں کا حصہ دار بن گیا۔ اور بہت متمول ہو گیا۔ کچھ جائداد وغیرہ بھی خرید لی۔ لیکن اس کے بعد ہی ۱۵۹۶ء میں اس کا اکیلا بیٹا مرا۔ ۱۶۰۱ء میں باپ ۱۶۰۸ء میں بھائی۔ اور ۱۶۰۸ء میں اس کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کی دو لڑکیوں نے ٹامس کینی اور ڈاکٹر جان ہال سے شادی کر لی تھی۔ اب شکسپیر کی صحت خراب ہو چلی تھی۔ اور آخر کار ۵۲ برس کی عمر میں ۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء میں انتقال کر گیا۔

شکسپیر کا پہلا دور ۱۵۸۸ء-۱۵۹۶ء

لندن آنے سے قبل خیال کیا جاتا ہے۔ کہ شکسپیر نے "وینس اور ایڈونس" کے ایک حصہ کا خاکہ تحریر کر لیا تھا۔ اور جب وہ ۱۵۹۳ء میں شائع کیا گیا۔ تو بہت پسند کیا گیا۔

اور پبلک نے اس کی بہت قدر کی۔ اس ڈرامے میں مناظر قدرت کے بہت دلچسپ نمونے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ لندن آنیکے بعد سب سے پہلا ڈراما جو اس نے لکھا۔ وہ "ٹائٹس اور اینڈرونیکس" ہے۔ اور اس کے بعد ہنری ششم کا پہلا حصہ تحریر کیا۔ "لوز لیبرز لاسٹ" ۱۵۹۰ء میں شائع ہوا۔ جو ہر نوعیت سے بہت دلچسپ ڈراما ہے۔ اس کے بعد کے ڈرامے حسب ذیل ہیں:۔

کمیڈی آف ایررس۔ مڈسمر نائٹس ڈریم یہ خالص منظوم ڈراما ہے۔ اور اس میں انشائے قدیم کی روایات اور پریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ "ٹو جنٹلمین آف ورونا" میں اطالوی رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔ اس کے بعد "رومیو اور جولیٹ" ایک ٹریجیڈی ہے جو سب سے پہلی "محبت آمیز" ٹریجیڈی ہے۔ "لوز لیبرز ون" "وینس اور ایڈونس" وغیرہ۔ اس کے بعد جب اس میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا ہوا، تو اس نے بھی مارلو اور پیل کی طرح تاریخی ڈرامے لکھے "رچرڈ دوم، رچرڈ سوم، ہنری ششم" اور پھر اس دور کا سب سے آخری ڈراما "کنگ جان" ہے، جو تقریباً ۱۵۹۶ء میں لکھا گیا۔

دوسرا دور ۱۵۹۶ء-۱۶۰۱ء

"مرچنٹ آف وینس" وہ سب سے پہلی کمیڈی ہے جسمیں شیکسپیر نے اپنے فن میں کمال حاصل کر لیا۔ جب اس کے وہ مختلف کردار پورشیا اور شائلاک، ایک موقع پر ملتے ہیں، تو کمیڈی اور ٹریجیڈی کے دو دلکش مناظر مخلوط نظر آتے ہیں۔ اور ڈراما بیحد دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے ڈرامے "ٹیمنگ آف دی شریو" ہنری چہارم" میری وائوز آف ونڈزر" اور ہنری پنجم ہیں۔ اس کے بعد شیکسپیر نے پھر محبت آمیز ڈرامے لکھنے شروع کئے۔ جس میں صرف سطحی جذبات ظاہر کئے گئے ہیں۔ ایسے ڈرامے "مچ ایڈو اباوٹ نتھنگ" "از یو لائک اٹ" اور "ٹویلفتھ نائٹ" ہیں۔

اب شیکسپیر کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ اب تک اُسے بہترین ادبی سوسائٹی حاصل تھی۔ بڑے بڑے رؤسا اس کے سرپرست تھے۔ اور وہ کافی دولت کا مالک تھا۔ لیکن یکایک ہر طرف سے بربادی اور تباہی اس پر نازل ہوئی۔ ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ دوست چھوٹ گئے۔ سرپرست تباہ اور جلاوطن ہو گئے، اس کی ساری دولت تباہ ہو گئی۔ اس کے ایک عزیز ترین دوست نے اس سے بیوفائی کی۔ اور اب وہ اپنے ایکٹری کے پیشہ سے بھی برگشتہ خاطر ہو گیا۔ اور اسلئے اس نے زندگی کے زیادہ سنجیدہ، عمیق اور المناک حالات لکھنے کا ارادہ کر لیا۔

تیسرا دور ۱۶۰۱ء-۱۶۰۸ء

یہ دور الزبتھ کے آخری زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کا سب سے پہلا ڈراما جولیس سیزر ہے۔ یہ ایک نہایت غمناک اور عبرت آمیز ٹریجیڈی ہے جس میں روم کے بادشاہ۔ "جولیس سیزر" کا قتل پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کے ڈرامے حسب ذیل ہیں:۔

"ہملٹ" ۱۶۰۲ء۔ اس میں "پرنس آف ڈنمارک" کی تباہی و بربادی دکھائی گئی ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے، کہ تقریباً شیکسپیر نے اس میں اپنے کردار کو پیش کیا ہے۔ "میژر فار میژر" (کمیڈی اور ٹریجیڈی مخلوط) اوتھیلو۔ میکبتھ" "کنگ لیر" "ٹرائلس اور کریسیڈ" ۔ انطونی اور قلوپطرہ، اور کورلونس ہیں

حسب بالا ڈراموں میں شیکسپیر نے انسان کے بدترین گناہ، غرور کا ناقابل رحم انجام، خوفناک جرائم اور حرص و ہوا کے حالات نہایت مؤثر پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ ضمیر کا انتقام، کمزوری کی سزا، دغا بازی، شہوت، حسد، احسان فراموشی،

اور دیوانگی کے عبرتناک واقعات، ہزاروں اور خیالات دلکش اور موثر طرز سے پیش کئے گئے ہیں۔ جن کا تجربہ خود اس نے اپنی مصیبت و تکلیف کے وقت کیا تھا۔ چنانچہ اس دور کے ڈراموں میں تقریباً سارے ڈرامے شیکسپیر کے شاہکار کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

چوتھا دور ۱۶۰۸-۱۶۱۳ء

اب اس دور میں شیکسپیر پھر ایک بار راحت و مسرت سے ہم و مسرت سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ اس کی کھوئی ہوئی چیزوں میں سے اسے بہت کچھ مل جاتا ہے۔ بیوی سے صلح ہو جاتی ہے اور وہ مسرور و مطمئن زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ ان ایام میں جو اس نے ڈرامے لکھے ہیں وہ سب تقریباً کمیڈی ہیں۔ اور ان میں مسرت و لطف زندگی کا بیان ہے۔ "ونٹرس ٹیل" میں دیہات کی نظر فریب چراگاہوں اور بہار کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے بعد "سمبیلائن"، "ٹیمپسٹ"، "ہنری ہشتم" اور "دی نوبل کنسمین" ہیں۔ ، ، ، ،

اب ہم اس کے ڈراموں اور سانیٹس کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حکم لگانا چاہیں کہ شیکسپیر کیا تھا۔ تو اس میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اس نے بہت سے ایسے کردار ڈراموں میں پیش کئے ہیں، جس میں اس نے اپنے آپ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ایسے کردار کون سے ہیں۔

دوسرے ڈرامانگاروں سے جب ہم شیکسپیر کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ شیکسپیر شاعری، جدت نگاری، بلند خیالی، دوربینی، جذبات نگاری، عام انسانی زندگی کے حقائق پیش کرنے، احساسات کو زیادہ پرزور بنانے، تخیلات کو ایک مناسب طور پر جمع کرنے، واقعات میں تسلسل پیدا کرنے، اور ترتیب کی دلبستگی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا شاعر کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

شیکسپیر کا ہمعصر۔ شیکسپیر کے بعد ہی ڈرامانگاری میں انحطاط شروع ہوتا ہے، لیکن بن جانسن اس وقت کی ایک ایسی زبردست شخصیت ہے، کہ جس کی وجہ سے اس انحطاط کا احساس مشکل سے ہو سکتا ہے۔ اس وقت کے تمام انشائے قدیم میں لکھنے والے ڈرامانگاروں میں بن جانسن سب سے زیادہ قابل اور بلند مرتبہ شخص تھا۔ اس کے حالات زندگی مختصراً درج کئے جاتے ہیں

بن جانسن ۱۵۷۳ء میں، لندن میں پیدا ہوا۔ ویسٹ منسٹر کے گرامر اسکول میں تعلیم پائی۔ ۱۵۹۲ء میں ایکٹر بن گیا اور ۱۵۹۸ء میں ایک ڈرامانگار کی حیثیت سے میدان ادب میں نمودار ہوا۔ اس کی سب سے پہلی تصنیف "ایوری مین ان ہز ہیومر" ہے، جو طنزیہ رنگ میں لکھی گئی ہے۔ کیونکہ بن جانسن اس وقت سب سے بڑا طنز نگار تھا۔ ۱۶۳۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا

بن جانسن کے بہت سے ڈرامے ہیں۔ جن میں بعض بہت اچھے حسب ذیل ہیں:-

"سیجانس اور کیٹلائن" یہ ایک تاریخی اور بہت بلند پایہ ٹریجیڈی ہے۔ اس کے اور ڈرامے دلچسپ اور مفید کمیڈی ہیں۔ مثلاً۔ "دی الکیمسٹ"، "دی فاکس"، اور "دی سائلنٹ وومن"۔ ان ڈراموں کے مطالعہ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نے کیا لکھا ہے جس کی وجہ سے وہ شیکسپیر کا ہم پلہ کہا جاتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے اس کے فن ڈرامانگاری اور اس کی بلند پایہ ذہنیت کا پورا علم اور یقین ہو سکتا ہے۔ اس نے شیکسپیر سے بالکل مختلف طرز میں، جو اس کا اپنا رنگ تھا لکھا اور اس کو حسب منشا کامیابی ہوئی۔ اس کے کمیڈی ڈراموں میں "رومانیت" یا "محبت" کو دخل نہیں ہے، بلکہ وہ ہر بات کو

نہایت عمیق اور سنجیدہ رنگ میں پیش کرتا ہے، وہ اخلاقی اصلاح کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ اور اسٹیج پر اُسے لانا ضروری سمجھتا ہے۔ اس نے لندن کی روزمرہ کی زندگی کے واقعات پیش کئے ہیں۔ اور دنیا کی بہت معنی خیز تصویر کھینچی ہے۔ اس کا مقصد محض تفریحی نہیں ہوتا۔ اس لئے اُسکے ڈراموں میں اخلاقی تعلیم کا عنصر بہت حد تک ہوتا ہے اور ان تحریروں کی اصلیت ذومعنی ہوتی ہے۔ وہ رومانی ڈراموں کا رنگ نظرانداز کرکے لاطینی طرز اختیار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بن جانسن کے ڈراموں کے کردار بہت پُرمذاق ہوتے ہیں۔ جانسن کے ڈراموں میں ایک اور بات یہ بھی ہوتی ہے، کہ ان میں جدت نگاری کے بجائے "علمی" اور "فنی" نکات پائے جاتے ہیں۔ اور گو ان کی عبارت پُرلطف نہیں ہوتی۔ لیکن تاریخی حیثیت سے نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ بن جانسن حقیقی معنوں میں "ادب آموز" ڈراموں کا موجد تھا۔ اور مستقبل کے ڈرامانگاروں پر ان تحریروں کا بیحد اثر ہوا۔ گولڈ اسمتھ وغیرہ نے بھی اس رنگ میں ڈرامے لکھے ہیں۔ بن جانسن کے اکثر ڈراموں میں شیکسپیر نے ایکٹ کیا ہے، اور خود اپنے ڈراموں میں بھی لیکن اس نے کبھی کسی "ہیرو" کا پارٹ نہیں لیا۔ "ہملٹ" میں اس نے "گھوسٹ" (شیطانی روح) کا ایکٹ کیا ہے۔

جب تک شیکسپیر زندہ رہا، بن جانسن ہمیشہ اس کے ڈراموں پر نکتہ چینی کرتا رہا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ شیکسپیر کے سب سے بڑے مداحوں میں بھی تھا۔ چنانچہ ۱۶۲۵ء میں شیکسپیر کے مرنیکے بعد جب اس کے تمام ڈراموں کا مجموعہ کتاب کی شکل میں شائع ہوا، تو مقدمہ میں بن جانسن نے شیکسپیر کو مارلو اور للی سے بھی زیادہ بلندمرتبہ اور قابل ثابت کیا۔

شیکسپیر اور بن جانسن:۔ اگر ہم ان دونوں کی تصانیف کا مقابلہ کریں، تو حسب ذیل اختلافات ملینگے:۔

(۱) شیکسپیر رومانی یا غیراصولی ڈرامانگاری کے اسکول کا پابند تھا۔
بن جانسن انشائے قدیم اور اصولی ڈرامانگاری کے اسکول کا معتقد تھا۔

(۲) شیکسپیر کا نصب العین عموماً تفریحی ڈرامے پیش کرنا ہے، اور بالواسطہ اخلاق کی تعلیم دینا ہے۔
بن جانسن کا اخلاقی درس مضمر رکھتا ہے، اور وہ راست طور پر اخلاقی تعلیم دینے کا متمنی ہے۔

(۳) شیکسپیر ایک غیر حساس ڈرامانگار ہے، اور وہ رموز ونکات پر زیادہ توجہ نہیں کرتا۔
بن جانسن بہت حساس ہے۔ یعنی وہ فنی نقاط و اصول کا بہت سختی سے لحاظ رکھتا ہے۔

(۴) شیکسپیر نے عموماً خیالی باتیں اپنے ڈراموں میں بیان کی ہیں۔
بن جانسن نے لندن کی زندگی پیش کرکے اصل واقعات زندگی پر سے پردہ اٹھایا ہے۔

(۵) شیکسپیر نے بہت "جدت" سے کام لیا ہے۔
بن جانسن نے علمی اور فنی باتوں سے زیادہ بحث کی ہے۔

عہد شیکسپیر کے دوسرے ڈرامانگار:۔ ان ڈرامانگاروں میں جان ویبسٹر ایک اچھا ڈرامانگار تھا۔ اس کے ڈرامے "وہائٹ ڈیول" اور "ڈچز آف مالفی" نہایت عجز تناک ٹریجیڈی ہیں۔ جن کی مثال شیکسپیر کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتی جان فورڈ میں بھی ٹریجیڈی نگاری کا ذوق ویبسٹر کی طرح تھا۔ اس کا ایک ڈراما "بروکن ہارٹ" ہے۔ فرانسس بیومانٹ اور جان فلیچر دونوں نے متحدہ طور پر ڈرامے لکھے ہیں۔ اور ان کے ڈرامے "فلاسٹر" اور "دی میڈس ٹریجیڈی" اپنی رومانیت

کے لحاظ سے شیکسپیر کے علاوہ ہر دوسرے بتھوں ڈراموں کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ فلپ میسنجر اپنی کمیڈی "اے نیو ڈے ٹوپے اولڈ ڈٹس" کی وجہ سے مشہور ہے۔ اسکے بعد سب سے آخر میں جیمس شرلے (۱۵۹۶-۱۶۶۶ء) ہے جس کا تعلق چارلس اوّل کے عہد سے تھا۔ اس کے متعلق چارلس لیمپ لکھتا ہے "کہ وہ ایک بڑی قوم کا آخری نام لیوا تھا۔ اس نے بہت سے ڈرامے لکھے ہیں۔" دی اسکول فار اسکینڈل" ایک اچھا ڈرامہ ہے۔ ان ڈرامانگاروں کے بعد ہی ڈرامانگاری کا زوال شروع ہوتا ہے۔ جیمس شرلے اس دور کی شمع سحری کا مرتبہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ہی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اور ایک جدید مذہبی پارٹی "پیورٹنس" کے وجود میں آنے سے تمام تھیٹر وغیرہ بند کر دئے گئے۔ ۰۰ ۰۰ ۰۰ ۰۰ ۰۰ ۰۰ ۰۰

عہد شیکسپیر کے تھیٹر:- یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامانگاری کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اُن تھیٹروں کا ذکر کر دیا جائے جن میں شیکسپیر اور اس کے ہمعصروں نے ایکٹنگ کی تھی۔ (کیونکہ بغیر تھیٹر کے ڈراما ایک بے معنی شے ہو کر رہ جاتا ہے) مکمل ڈرامانگاری کے ابتدائی زمانہ میں ڈرامے سرائیوں کے صحن اور دیگر کھلی ہوئی جگہوں میں دکھائے جاتے تھے۔ چنانچہ جب شیکسپیر لندن پہونچا، تو صرف دو تھیٹر تھے جو "تھیٹر" اور "کرٹین" کہلاتے تھے۔ شیکسپیر نے تھیٹر میں شرکت کی تھی ۱۵۹۲ء میں "روز تھیٹر" "بلیک فرائرس تھیٹر" اور ۱۵۹۹ء میں "گلوب تھیٹر" قائم ہوئے۔ ان کی شکل باہر کی طرف شش پہلو ہوتی تھی۔ اور اندر دائری۔ یہ چھوٹے اور لکڑی سے بنے ہوتے تھے۔ اسٹیج کے علاوہ پبلک کے بیٹھنے کی جگہ پر کوئی سائبان یا چھت نہ ہوتی تھی۔ اسٹیج پر البتہ ایک چھت بنائی جاتی تھی حکام اور اُمرا اسٹیج ہی پر کرسیوں پر بیٹھتے تھے۔ باقی لوگ زمین پر کھڑے رہ کر دیکھتے تھے۔ اسٹیج ایک کمرہ ہوتا تھا جس میں پردے کے لئے صرف ایک کمبل استعمال ہوتا تھا۔ لکڑی کے بنے ہوئے جانور، مینار، جنگل، مکانات وغیرہ ہی وہ سامان تھا، جو سین سینری کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اور جب پبلک کو یہ بتانا منظور ہوتا کہ تماشا کس مقام پر ہونے والا ہے، تو اسٹیج کے اوپر سے ایک تختہ لٹکا دیا جاتا تھا، جس پر اس مقام، جنگل یا مکان کا نام لکھ دیا جاتا تھا مثلاً شیکسپیر کے ڈراموں کے بعض مقامات مثلاً آرڈن کے جنگلات یا میکبتھ کا محل دکھانا ہوتا تو تختہ پر لکھ کر لٹکا دیتے اور لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ واقعہ کس مقام پر ہونے والا ہے۔

چونکہ مصور پردے، سین سینری اور کوئی ساز و سامان ایسا نہ ہوتا تھا، جس سے معلوم ہوتا کہ ایکٹر کا ماحول کس قسم کا ہے۔ اس لئے ایکٹروں کو بہت توجہ اور جانفشانی سے کام کرنا پڑتا تھا۔ اور ان کو اپنی ہر حرکت اور ہر بات سے اپنا ماحول پیش کرنا پڑتا تھا جو بہت مشکل کام ہے۔ اور اس لئے ایکٹنگ کمال کو پہونچی ہوئی تھی۔ ہم اگر اب اپنے موجودہ اور ان کے اسٹیج سے مقابلہ کریں تو ہم کو یہ معلوم کر کے ہنسی آتی ہے۔ کہ ان چھوٹے چھوٹے اسٹیجوں پر فوجیں کس طرح حرکت کرتی تھیں جن پر الزبتھ کے زمانہ کے لوگ بہت لطف اُٹھاتے تھے۔ تماشے عموماً دن کو تین بجے شروع ہوتے تھے اور تقریباً دو گھنٹے میں ختم ہو جاتے تھے۔

اس وقت لڑکیاں یا عورتیں تھیٹر میں بالکل حصہ نہ لیتی تھیں۔ انکی بجائے کمسن لڑکے اور حسین مرد زنانہ پارٹ کرتے تھے۔ البتہ حکومت شاہی کے بعد عورتیں اور لڑکیاں بھی تھیٹر میں شرکت کرنے لگیں۔ گو اس انقلاب کو متقدمین نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا + +

پیسہ اخبار

ہمارے گم شدہ حواس

(جناب مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور)

قدرت کی نیرنگیاں اور بوقلمونیاں انسانی سمجھ سے باہر ہیں۔ انسان کے جسم کی ساخت ایسی ہے کہ جس کو خود انسان بھی کما حقہٗ سمجھ نہیں سکتا۔ مگر قدرت کو انسان سے جو کام لینا ہے اس کے بالکل مناسب انسان کی ساخت بنائی گئی ہے۔ اگر انسان کی انگلی کٹ جائے تو بیماروں کو اٹھا کر شفاخانہ لیجانے والی گاڑی کی نسبت قدرت اس جگہ شفا بخشنے والے مادہ کو بڑی سرعت کے ساتھ پہنچا دیتی ہے قدرت نے زرافہ کی گردن بہت لمبی بنا دی ہے تاکہ وہ دراز قامت درختوں کی چوٹی کے رسدار پتے کھا سکے خاص خاص ملاحوں کیلئے قدرت نے اسیطرح انسان کو ترغیب اور ہمت دلائی ہے۔

کتے کی قوت شامہ نہایت تیز ہے۔ لیکن اگر انسان کی قوت شامہ بھی کتے کے برابر تیز ہوتی۔ تو اس کو گلی کوچہ کی بدبودار چیزیں نہایت خائف رکھتیں کیونکہ اُن بدبودار چیزوں میں انسان پہلے جراثیم سے واقف ہوتا۔ تو پھر وہ شاید گلی کوچوں میں نکلنا قطعی ترک کر دیتا۔ پرندے گھاس کے نیچے حشرات الارض کی آواز سن لیتے ہیں لیکن انسان نے اپنے دماغ و عقل کے زور سے یہ جان لیا ہے کہ کس موزگھاس ہارے جسم کو بھی ڈھک لیگی۔

اگر ان باتوں پر انسان کو غلبہ دیدیا جائے اور اس کے دل اور دماغ پر غفلت کے پردے نہ ڈالدئے جاتے تو اسکو اس دنیا میں جینا وبال ہو جاتا۔ سیر و تفریح تماشہ غرضکہ کسی چیز میں اس کا دل نہ لگتا نہ اس کو اطمینان حاصل ہوتا۔ خوردبین سے جس قدر جراثیم انسان کو نظر آتے ہیں اگر وہ انسان کی عریاں آنکھ سے انسان کو نظر آنے لگتے۔ تو پھر جراثیم کے ڈر کے مارے۔ نہ وہ غسل خانہ میں جاکر غسل کر سکتا۔ نہ کھانا کھا سکتا۔ نہ پانی پی سکتا غرضکہ قدرت نے انسان کیلئے جو بات رکھی ہے وہ نہایت عقل و فراست پر مبنی ہے۔

(خاص)

(صفحہ ۵۷۷ کا بقیہ)

ضرورت با ہفتہ میں ایک دو روز لکھا جا سکتا ہے روزمرہ ایسے واقعات نہیں ہوتے جن پر تنقید کرنا ضروری ہو اور بعض اوقات تو ان کا اس قدر قحط ہو جاتا ہے کہ ایڈیٹر کا کافی وقت اسی فکر میں ضائع ہو جاتا ہے کہ آج کا آرٹیکل کس چیز پر لکھا جائے۔ علاوہ ازیں حسب ضرورت لستلی سے لکھا ہوا آرٹیکل زیادہ مفید بھی ہوگا۔

اخبارات کو یہ حقیقت ہردم پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ان کا مقصد حیات قوم کو درست راستہ دکھلانا اور ملکی ترقی میں معاون و مددگار رہنا ہے۔ نہ کہ پیسہ کمانا اردو اخبارات میں بہت سے ایسے پرچے موجود ہیں جو معمولی لالچ کی وجہ سے اپنے معیار کو خواہ مخواہ پست کر کے ملک و قوم کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں اگر یہ اخبارات تجارتی نکتہ نظر سے جاری کئے گئے ہیں تو جتنا جلد ان کو بند کر دیا جائے اتنا ہی مالکان اخبار کی بہتری کا موجب ہوگا۔ کیونکہ یہ مسلم امر ہے کہ اخبارات اچھی تجارت نہیں بن سکتے۔ بعض اوقات ان میں نفع بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اردو اخبارات عموماً گھاٹے پر چل رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گھاٹا ناطویل عرصہ تک برداشت نہیں ہو سکتا اس لئے یا تو اس کو وہ پارٹیاں ادا کرتی ہیں جو ان اخبارات سے اپنا پروپیگنڈہ کراتی ہیں یا اخبار کے چلانے والے اپنے بلند اصول سے گر کر نامناسب طریق سے اسے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جرنلزم کے میدان میں داخل ہونے والے نوجوان کو بھی چاہئے کہ روپیہ کمانے کے خیال سے اس پیشے کو اختیار نہ کریں بلکہ شروع کرنے سے پہلے ہی اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہئے کہ وہ اپنی تمام عمر افلاس میں کاٹنے کے لئے تیار رہیں۔ اخبار نویسی میں بڑے سے بڑی عزت مل سکتی ہے۔ سہولتیں مل سکتی ہیں۔ لیکن روپیہ نہیں مل سکتا۔ اس لئے جو لوگ روپیہ کمانے کے متمنی ہوں انھیں اس طرف کا رخ بھی نہ کرنا چاہئے۔ ہاں جو اشخاص فاقہ مست بادشاہی کا لطف اٹھائے ہوں اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ میدان کھلا ہوا ہے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ کبھی جرنلزم سے بیزار نہ ہوں گے

(خاص)

پیشوا

شہیدِ محبت

(جناب مولانا عزیز حسن بقائی ایڈیٹر رسالہ پیشوا دہلی)

بہت دنوں کی بات ہے' اب اچھی طرح تو یاد نہیں' لیکن جہانتک مجھے خیال پڑتا ہے گل شیر خاں سے پہلی مرتبہ میری ملاقات بمبئی کے ایک قہوہ خانہ میں ہوئی تھی۔ خوب گورا چٹا آدمی تھا' اور تمام قہوہ خانے میں اس وقت چونکہ وہی سب سے لمبا اور سب کا چوڑا انسان تھا۔ اس لئے الگ معلوم ہوتا تھا۔ اور ہر شخص کی نگاہ بلا ارادہ بھی اسی پر جا پڑتی تھی۔

اتفاق سے میں اور وہ ایک ہی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے اور شاید کوئی اور ہوتا تو نہ وہ مجھ سے بولتا۔ اور نہ میں اس سے۔ لیکن گل شیر ان مراسم اور تکلفات کا پابند نہ تھا۔ اس لئے بلا تکلف مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ جو ابتدا میں حسب دستور معمولی موسمی حالات اور مشہور سیاسی واقعات تک محدود رہیں۔ اور شاید اس سے آگے نوبت بھی نہ پہونچتی' اگر ہماری میز کے بالکل سامنے ایک دوسری میز پر ایک پارسی نوجوان اور اس کے ساتھ ایک نہایت ہی حسین و نازنین پارسی لڑکی نہ آبیٹھتی۔ یہ نوجوان بھی اپنے مردانہ حسن کے لحاظ سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں انتخاب تھا۔ اور اس کے ساتھ جو لڑکی تھی' وہ تو یقیناً بمبئی کی منتخب حسین عورتوں میں سے ایک تھی۔

ہر شخص کی نگاہ ان نئے آنیوالوں کی طرف اٹھ گئی اور کوئی ایک شخص بھی بہت دیر تک اپنی نظر اس طرف سے نہ ہٹا سکا۔ اسکے تصنعات سے پاک اور خداداد حسن میں کچھ ایسی دلکشی تھی' کہ جس نے اُدھر دیکھا' وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ چاء میں شکر ڈالنے کے لئے جو چمچے اُٹھے تھے' وہ اٹھے کے اٹھے رہ گئے۔ جو شکر ڈالنے کے بعد اُسے گھول رہے تھے' ان کی حرکت رُک گئی۔ اور بہت سے کیک اور بسکٹ کے ٹکڑے جو دانتوں سے دبائے گئے تھے۔ اسی طرح دبے کے دبے رہ گئے' اور اُنکے چبانے کی نوبت نہ آئی۔

میں نے بھی اس جوڑے کو دیکھا' اور گل شیر نے بھی۔ گل شیر کے چہرہ سے انتہائی محویت اور اس کی آنکھوں سے انتہائی حسرت برس رہی تھی۔ مجھے بالکل ایسا معلوم ہوا' کہ گل شیر اس لڑکی پر عاشق ہو گیا ہے۔ اور اس کے عشق کا درجہ بھی وہ آخری درجہ ہے جس میں انسان عقل و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ گل شیر سے گفتگو کرتے مجھے ابھی بہت دیر نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اتنے ہی عرصہ میں میں نے یہ اندازہ ضرور کر لیا تھا' کہ وہ ایک بہت ہی شریف اور لائق آدمی ہے۔ اور اب اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے اس پر بہت ہی ترس آیا۔ اور بے انتہا ہمدردی پیدا ہو گئی۔

"میں دیکھتا ہوں' کہ آپ کو حُسن سے بہت دلچسپی ہے۔" میں نے مسکرا کر گل شیر سے کہا۔

گل شیر: (محویت سے چونک کر) دلچسپی! نہیں تو۔ مجھے اب دنیا
میں کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں ہے۔"
میں: "معاف کیجئے" جس محویت کے ساتھ آپ اس حسین لڑکی کو
دیکھ رہے تھے۔ اس سے تو میں یہی سمجھا تھا! بلکہ سچ تو یہ ہے'
کہ میں ڈر گیا تھا۔"
گل شیر: (ہنسکر) کیوں ڈر کیوں گئے تھے۔ کیا یہ اندیشہ تھا
کہ میں کوئی نازیبا حرکت کر بیٹھونگا؟"
میں: نہیں ایسا اندیشہ تو نہ تھا۔ خوف یہ تھا' کہ وہ بظاہر
اس نوجوان کی منکوحہ یا منسوبہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے
آپ کی کامیابی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اور ممکن تھا کہ ناکامی
کا صدمہ آپ کے لئے ناقابل برداشت ہوتا۔"
گل شیر: (کچھ رک کر اور ٹھنڈی سانس لیکر) سید صاحب!
صدموں کا اثر تو دل پر ہوتا ہے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا
ہوں' کہ میرے سینہ میں دل ہی نہیں ہے۔"
میں: (تعجب سے) میں آپ کا مطلب نہ سمجھا۔"
گل شیر: جب تک میں آپ کو سارا قصہ نہ سناؤں۔ آپ کچھ
نہ سمجھینگے۔ لیکن اسے سننے کے بعد آپ میری تمام باتوں کا
اور حرکتوں کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔"
میں: قصہ کا تعلق غالباً آپ کے کسی راز سے ہوگا۔ جس کے
دریافت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے؟"
گل شیر: راز! ہائے کبھی وہ ایک راز تھا۔ اور میری زندگی
کا سب سے زیادہ مقدس راز تھا۔ لیکن اب وہ راز نہیں ہے
اب تو اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔"
میں: مجھے دوسروں کے حالات جاننے کا ذرا بھی شوق نہیں
ہے۔ اور اگر میں آپ سے یہ درخواست کروں' کہ وہ قصہ مجھے
سنا دیجئے' تو اس کا باعث میرا ذوق تفتیش نہیں ہے۔ بلکہ
میں یہ چاہتا ہوں' کہ آپ کی گفتگو کا مطلب سمجھ سکوں۔ آپ
نے جس محویت کے ساتھ اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ اگر محبت
اور عشق پر مبنی نہ تھا' تو پھر وہ ضرور میرے لئے ایک معمّہ
ہے اگر کوئی دقت نہ ہو' تو میں حل کرنا ضرور پسند کرونگا۔"
گل شیر: (مسکراکر) میں آپ کو یقین دلاتا ہوں' کہ عشق
اور محبت کے پاک جذبات کے لئے مدتیں ہوئیں' کہ میرا دل
مُردہ ہوچکا۔ یہ ضرور ہے' کہ جب اتفاق سے کوئی غیر معمولی
حسین صورت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے' تو میرا خیال
مجھے ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچا دیتا ہے' جو کبھی میری
اپنی دنیا تھی۔ اُفوہ! سید صاحب میں آپ سے کیا عرض
کروں' کہ میری زندگی کے واقعات ہی عجیب ہیں۔"
میں: اگر اُن میں اب بھی کوئی راز ہے' یا ان کے بیان
کرنے سے آپ کو خفیف سی خفیف بھی تکلیف پہونچتی ہے' تو
میں ہرگز نہیں چاہتا' کہ آپ وہ واقعات مجھے سُنائیں۔"
گل شیر: میں تو کہہ چکا ہوں' کہ ان میں قطعاً کوئی راز کی
بات نہیں ہے۔ اور جن واقعات کے اپنے اوپر گذرنے کی
تکلیف میں برداشت کرچکا ہوں ان کے بیان کرنے کی
تکلیف مجھے کیا محسوس ہوسکتی ہے۔"
اس کے بعد گل شیر تھوڑی دیر تک خاموش رہا'
اور پھر آپ ہی آپ اپنی داستان اس طرح شروع کردی
"ہم دونوں ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ مگر آپ
کو کیا خبر کہ میں کس کا ذکر کر رہا ہوں۔ یوں سمجھئے' کہ حسن گاؤں
کا میں رہنے والا ہوں۔ اسی میں ایک شخص سمند خاں نامی
رہتے تھے۔ اور انکی ایک لڑکی تھی' جس کا نام شیرین تھا۔

میں اور شیریں گویا ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ عمر میں وہ مجھ سے تین چار برس چھوٹی تھی۔ مگر بچپن ہی سے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے اُنس ہو گیا تھا۔ ہم ابھی بالکل بچے ہی تھے، مگر ہم دونوں کی حالت یہ تھی کہ جبتک ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیتے، چین نہ پڑتا تھا۔ بچپن میں میں بہت شریر اور کھلاڑی تھا! لیکن مجھے خوب یاد ہے، کہ اگر ہمارے کھیل میں شیریں شریک نہوتی، تو میرا دل کھیل میں بالکل نہ لگتا تھا۔

میں نے ابھی آپ کو یہ نہیں بتایا، کہ میں افغانی سرحد کے آزاد علاقے کا رہنے والا ہوں۔ ہم لوگ عام طور پر بالکل جاہل رہتے ہیں، اور بہت ہی کم ایسے خاندان ہیں، جن کے بچے تعلیم پاتے ہوں۔ میرا تعلق ایک اچھے معزز خاندان سے ہے، اور شیریں کا خاندان بھی کافی معزز ہے۔ اتفاق سے اس زمانہ میں ایک سید صاحب ہمارے گاؤں میں آگئے تھے اور میرے والد نے مجھے اُن کے پاس پڑھنے بٹھا دیا۔ شیریں کی عمر اس وقت کوئی چھ سال کی تھی، اور اس کے والد نے بھی اُسے سید صاحب کے سپرد کر دیا، کہ قرآن شریف پڑھا دیں۔ یں اگر تنہا رہتا، تو شاید کچھ بھی نہ پڑھتا، مگر اب شیریں کی وجہ سے میرا دل لگ گیا۔ اور میں شوق سے پڑھنے لگا۔

تین برس تک ہم دونوں نے ساتھ ساتھ تعلیم پائی، اس کے بعد سید صاحب اپنے وطن کو واپس چلے گئے اور وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب پھر ہم دونوں کے لئے کوئی خاص کام نہ تھا۔ لیکن سید صاحب کی تربیت کا ہم دونوں پر یہ اثر پڑا تھا کہ کتابیں دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے والد سے کہہ کر بہت سی کتابیں منگوا لی تھیں۔ انھیں خود بھی پڑھتا تھا، اور شیریں کو بھی دیدیا کرتا تھا۔ کہ وہ بھی پڑھ لے۔ سمندر خاں صاحب سے اور میرے والد سے بہت گہری ملاقات تھی۔ اس لئے میں شیریں کے گھر اور شیریں میرے گھر برابر بے تکلف آیا جایا کرتے تھے۔ میری عمر اب تیرہ برس کی ہو چکی تھی، اور اگرچہ عشق و محبت کا مطلب تو میں اب بھی کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن جب شیریں میرے سامنے آتی تھی، تو بے اختیار میرا دل اسکی طرف کھنچنے لگتا تھا۔ اور میری حالت کچھ ایسی ہو جاتی تھی، کہ جیسے کوئی کھویا ہوا سا ہو، شیریں کی بھی یہ حالت تھی۔ کہ اچھے اچھے انار، اور عمدہ عمدہ انگور میرے لئے چھانٹ کر اور خوب اچھی طرح دھو کر اور صاف کر کے رکھتی، اور جب میں اسکے گھر جاتا، تو چپکے سے مجھے لا کر دیتی!

ہماری آپس کی محبت اسی طرح برابر بڑھتی چلی گئی۔ اور اب وہ زمانہ آگیا، کہ میں اٹھارہ سال کا تھا، اور شیریں چودہ سال کی تھی۔ ہماری طرف کے لوگوں کے ڈیل ڈول عام طور پر اچھے ہی ہوتے ہیں۔ میں بھی اٹھارہ سال کی عمر میں خوب لمبا چوڑا مرد ہو گیا تھا۔ اور وہ بھی صرف اپنے قد و قامت کی وجہ سے پوری جوان معلوم ہوتی تھی۔ اس کے حُسن کا اب یہ عالم تھا، کہ مجھ سے تو اسکی طرف نگاہ بھر کر دیکھا بھی نہ جاتا تھا۔ اور دوسروں کے لئے بھی یہ ناممکن تھا، کہ اُسے دیکھیں۔ اور دیکھتے نہ رہ جائیں۔ حسن درحقیقت تندرستی اور اعضائے تناسب کا نام ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اسمیں بدرجۂ کمال موجود تھیں۔ ہماری طرف پردہ کا رواج اسقدر سختی کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گاؤں میں گویا یہ رواج ہے ہی نہیں۔ ایک آزاد ہرنی کی طرح شیریں اپنی خوشبو سے اس تمام پہاڑی علاقہ کو مہکاتی پھرتی تھی کہ جہاں ہمارا گاؤں تھا، اور اب اُس کے حُسن کا شہرہ گاؤں سے نکل کر دور دور تک پھیل گیا تھا۔ ہمارے گاؤں سے کوئی

چھ سات پہر کے فاصلہ پر ذکاخیلوں کا ایک گانوں تھا۔ اور اُن سے ہماری بہت پُرانی مخالفت چلی آتی تھی۔ بعض دوسرے قبیلوں نے بیچ میں پڑکر ہماری اور انکی صلح اس حد تک ضرور کرا دی تھی کہ ادھر کوئی بیس برس سے ہمارے اور انکے قبیلہ کے درمیان کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ اور حالات اگر ایسے ہی رہتے، تو غالباً وہ دشمنی ہمیشہ کیلئے مٹ جاتی۔ اس قبیلے کا سردار دوست محمد خاں نامی ایک شخص تھا۔ جس کی تمام عمر لڑتے اور جھگڑتے ہی گذری تھی۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا، کہ اُسے کسی سے لڑے بھڑے بغیر چین ہی نہ پڑا کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں ذکاخیلوں کی ایک دھاک سی بندھ گئی تھی، اور آس پاس کے قبیلے اکثر اُن سے الجھنا کم پسند کرتے تھے۔

دوست محمد کے تین لڑکے تھے۔ ان میں سے سب سے چھوٹے لڑکے کی عمر کوئی بائیس سال کی تھی۔ اچھا خوبرو جوان تھا۔ اور اس کی طاقتوری اور بہادری کی بھی دھوم تھی۔ شیریں کی خوبصورتی کا حال کسی سے سُنکر وہ چپکے سے کسی طرح ہمارے گانوں میں آیا۔ اور اُسے دیکھ کر اس پر دل اور جان سے فریفتہ ہوگیا۔ کچھ دنوں تک بات چھپی رہی۔ لیکن بالآخر دوست محمد کو سب حال معلوم ہوگیا۔ وہ بیٹے سے ناراض نہ ہوا، بلکہ اس نے مہمندوں سے لڑنے اور انہیں نیچا دکھانے کے لئے اسے ایک ذریعہ بنا لیا۔ میں نے شاید آپ کو بتایا نہیں ہے، کہ ہمارا قبیلہ مہمند تھا۔ اور اس سے پہلے کبھی انہیں ذکاخیلوں کے مقابلہ میں شکست نہیں ہوئی تھی۔ دوست محمد نے پہلے بالکل معقول طریقے پر سمند خانصاحب کے پاس درخواست بھیجی، کہ شیریں کا نکاح اس کے چھوٹے لڑکے سے کر دیں، جس کا نام اکبر خاں تھا اور اُس طرف سے جب کچھ ٹالے بالے ہوئے، تو اس قسم کی دھمکی بھی کہلا بھیجی، کہ اگر انکار کیا، تو یہ سمجھ لینا، کہ میرا نام دوست محمد خاں ہے۔ اور میں کسی طرح اسکو گوارا نہیں کر سکتا، کہ کسی سے کچھ درخواست کروں، اور وہ رد کر دے۔

شیریں کے متعلق ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ تو نہیں ہوا تھا، کہ اسکی شادی کس کے ساتھ کیجائیگی۔ تاہم سارے گانوں کی اور خود سمند خاں کی بھی خواہش تھی، کہ وہ میرے عقد نکاح میں آئے۔ اس قسم کی خبریں میرے کان میں بھی پڑ چکی تھیں، اور میں بالکل مطمئن تھا۔

اول تو یوں ہی لوگوں کے ذہن میں شیریں میرے ساتھ منسوب ہوچکی تھی۔ اس لئے دوست محمد کی درخواست کی منظوری کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ لیکن اس دھمکی کے بعد تو ناممکن تھا، کہ کوئی مہمند بھی اس ذلت کو گوارا کر لیتا۔ دھمکی کا جواب نہایت ذلت آمیز الفاظ میں دیا گیا، اور دوست محمد کی دلی آرزو بر آئی۔ اُس نے جس طریقہ پر اور جن لفظوں میں جنگ کا پیغام بھیجا، اُسنے سارے گانوں کو اس بات کی خبر کر دی، کہ شیریں میرے لئے مخصوص ہوچکی ہے۔ اس کے بعد شیریں جسطرح شرما اور لجا کر مجھ سے ملی، اُس سے مجھے معلوم ہوگیا، کہ اُسے بھی تمام حالات سے آگاہی ہے۔

میری طبیعت میں شر اور فساد بالکل نہیں ہے۔ اور گو اپنے قبیلے کے فنونِ جنگ میں نے بھی سیکھے تھے، اور نہایت شوق سے سیکھے تھے۔ پھر بھی اس وقت تک میں کبھی کسی سے نہیں لڑا تھا، لیکن یہ معلوم ہونیکے بعد کہ اکبر خاں شیریں کا طالب ہے، میرے دل میں بار بار یہ خواہش پیدا ہوتی تھی، کہ اگر اکبر کہیں تنہائی میں مل جائے، تو میں اُس سے دو بدو فیصلہ کر لوں اب میں انیس ۱۹ برس کا ہوچکا تھا، اور اپنے غیر معمولی قد و قامت اور خداداد قوت و طاقت کے لئے سارے گانوں میں مشہور تھا۔

زکا خیلوں سے لڑائی کی خبر مشہور ہوتے ہی ہر شخص کی نگاہیں مجھ پر پڑنے لگیں۔ اور ان نگاہوں کا مطلب میں خوب سمجھتا تھا۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ لڑائی تمھاری وجہ سے ہو رہی ہے، اور اب ہمیں دیکھنا ہے، کہ تم اس لڑائی میں کیا جوہر دکھاتے ہو۔ ان کے اس اشارے کا جواب میں نے انھیں تو کبھی نہ دیا۔ لیکن ایک روز خود شیریں سے جب میری گفتگو ہوئی، تو میں نے دیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک دن شام کے وقت جب میں گھر کو جا رہا تھا، تو شیریں مجھے راستہ میں مل گئی۔ اور ادھر اُدھر کی بہت سی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

شیریں :۔ "کیا تم بھی اس لڑائی میں شریک ہوگے ؟"

میں :۔ "کیوں ؟ کیا اس میں کچھ شبہ بھی ہے ؟"

شیریں :۔ "مجھے یہ لڑائی جھگڑے اچھے نہیں لگتے۔ مرد خدا جانے کیوں آپس میں لڑا کرتے ہیں"

میں :۔ "لڑائی سے مجھے بھی نفرت ہے۔ لیکن جب کوئی زبردستی حملہ کرے، تو اُس وقت اپنی اور اپنے وطن کی حفاظت کرنی ہر شخص پر فرض ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس وقت کوئی اس سے جان چُرائے، تو بُزدلی ہے"

شیریں :۔ "ہاں یہ تو میں بھی جانتی ہوں"

میں :۔ "تو پھر کیا تم یہ چاہتی ہو، کہ میں بُزدل بن جاؤں ؟"

شیریں :۔ (حقارت کے ساتھ) خدا نہ کرے۔ میں ایسا کیوں چاہنے لگی۔ مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ ---- (کہتے کہتے رُک گئی)"

میں :۔ "کیا کہہ رہی تھیں، کہہ ڈالو"

شیریں :۔ "خدا جانے کیوں میرا دل بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ تم مجھے نہیں ملو گے"

میں :۔ "عورتوں کے دل میں اکثر ایسے ہی وہم آیا کرتے ہیں۔ خدا نے چاہا، تو ہماری فتح ہو گی۔ اور تمھیں موقع ملیگا۔ کہ اپنے گل شیر پر فخر کیا کرو"

شیریں کسی قدر شرما سی گئی اور پھر اس نے یہی کہا۔ "میں ہمیشہ اس خیال کو دل سے نکالتی ہوں، مگر وہ کسی طرح دُور نہیں ہوتا"

ہماری باتیں اسی جگہ ختم ہو گئیں۔ شیریں اپنے گھر چلی گئی، اور میں اپنے گھر آ گیا۔

اس واقعہ کے تیسرے روز جمعہ کی نماز کے بعد زکا خیلوں کا حملہ ہوا۔ اندازاً کوئی آٹھ سو آدمی ہونگے۔ جن میں سے اکثر کے پاس بندوقیں تھیں۔ جلدی جلدی ہم نے بھی اپنے آدمیوں کو اکٹھا کیا۔ اور تقریباً چھ سو خوب تندرست اور مضبوط جوان اپنے قبیلے کی عزت اور اپنے وطن کی خاطر جان دینے کے لئے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ زکا خیلوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ اور حملہ بھی انھوں نے بہت سختی سے کیا تھا۔ لیکن اس طرف بھی عزت، آبرو، جان، مال اور گھر بار غرض کہ ہر چیز خطرہ میں تھی۔ اس لئے ہم لوگ بھی خوب ہی جی توڑ کر لڑے۔ دو روز تک مسلسل گولیاں چلتی رہیں۔ اور دونوں طرف کے کوئی سو آدمی کام آ گئے۔ اب کارتوسوں کی پیٹیاں خالی ہو چکی تھیں۔ اس لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا، کہ دست بدست لڑائی ہو، اور مجھے اسی وقت کا انتظار تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا، کہ جس طرح بھی ہوگا۔ اکبر تک پہونچ کر اسے للکارونگا، اور سر میدان اُسے اسکی گستاخانہ جراٗت کی سزا دونگا۔

تیسرے روز ایسا موقع آ گیا۔ دونوں طرف کی

فوجیں آپس میں مل گئیں۔ دوست و دشمن کا امتیاز باقی نہ رہا۔ ایک عالم بے اختیاری میں ہر شخص کا ہاتھ اٹھتا تھا، اور کسی نہ کسی کے سر پر گرتا تھا۔ زمین پر خون کا کیچڑ ہو گئی تھی۔ اور زخمی پیروں کے نیچے روندے جا رہے تھے۔ میں نے ہاتھ روک کر ذرا غور سے دیکھا۔ تو اکبر کو ایک طرف مصروف کارزار پایا۔ اُسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور میں بے اختیار اُس کی طرف دوڑا لوگ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل دیکھ کر ہٹ گئے۔ اور ہم دونوں میں تلوار چلنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہونے لگا، کہ اکبر کا ہاتھ سست ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس بات کو محسوس کیا۔ اور ان میں سے ایک بہت ہی تنومند شخص آگے بڑھ کر اس کی مدد کے لئے آ گیا۔ اور اب مجھے دو شخصوں کے حملوں سے اپنی حفاظت کرنی پڑی۔ میں کسی قدر پریشان ہو چلا تھا۔ کہ ہماری صفوں سے بھی ایک نوجوان بڑی تیزی کے ساتھ نکلا، اور آتے ہی اکبر کے مددگار پر کچھ ایسے تابڑ توڑ حملے کئے، کہ اُسے سنبھلنا مشکل کر دیا۔ مجھے ذرا کسی قدر فرصت ملی، تو میں نے اپنے مددگار کو غور سے دیکھا، اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کہ اس قدر خوبصورتی سے جو شخص تلوار چلا رہا تھا وہ میری پیاری شیریں تھی۔ . . . .

انتہائی حیرت اور کمال محبت کے ساتھ میں نے کہا۔
"شیریں! تم یہاں کہاں ؟"

ابھی یہ جملہ میری زبان سے پورا نہوا تھا۔ کہ اکبر نے ایک بھرپور جنیو کا ہاتھ شیریں پر چلایا۔ اور ساتھ ہی "او بزدل! او نامرد!" کہہ کر میں نے بھی ایک تلا ہوا ہاتھ اکبر کی گردن پر رسید کیا۔ اکبر کی گردن قریب قریب بالکل الگ ہو گئی۔ مگر افسوس کہ اس کمبخت کا وار چل چکا تھا۔ شیریں بے حس و حرکت میرے قدموں میں پڑی تھی۔ . . . . . .

آہ! سید صاحب کیا کہوں، کہ اس روز سے میری کیا حالت ہے۔ میں زندہ ضرور ہوں، لیکن یقین کیجئے، کہ مُردوں کی قسمت پر رشک آتا ہے۔ اب میں جب کسی عورت کو دیکھتا ہوں، تو میرا دل اس کی عظمت سے بھر جاتا ہے۔ شیریں کی محبت اور شجاعت کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے اور میں انتہائی حیرت کے ساتھ اُن نرم اور نازک جسموں کو دیکھتا رہتا ہوں، کہ جن کے اندر ایسے ایسے عجیب و غریب دل چھپے رہتے ہیں"

گل شیر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور وہ یکایک بغیر کچھ کہے سُنے مجھے حیرت زدہ چھوڑ کر بہت تیزی کے ساتھ قہوہ خانے سے چلا گیا۔ اور آج تک پھر کبھی نہیں ملا ہے ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛

(اعا ص)

پیمانہ

سیر ماہتاب

[جناب مولانا سیماب اکبر آبادی ایڈیٹر پیمانہ آگرہ]

چاند پہلے ہماری ہی دنیا کی طرح آباد تھا۔ اس میں بھی ایسی ہی چہل پہل تھی۔ حسین مرد اور عورتیں بستی تھیں عشق و حسن کے افسانے مرتب ہوتے تھے۔ زندگی کے روشن اور رنگین آثار اسمیں موجود تھے۔ مگر اب ارض ماہتاب میں قیامت آچکی ہے۔ زندگی کے تمام آثار مٹ چکے ہیں۔ صرف چند ٹھنڈے آتش فشاں پہاڑ۔ چند سنسان گھاٹیاں اور کچھ خشک جھلیں اور دریا اسکی کائنات باقی ہیں جو آفتاب کی روشنی پڑنے سے اب بھی رات کو ہماری آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ارتقی نے اپنی ہمخواب نازنین سے کہا "کیا اچھا ہوتا کہ امسال موسم گرما ہم "ارض ماہتاب" میں بسر کرتے۔ منصوری۔ نینی تال۔ شملہ۔ مری۔ حکروتہ۔ کشمیر سب دیکھے بھالے ہیں۔ طبیعت کسی نئے مقام کی سیر چاہتی ہے اور "ارض ماہتاب" سے بہتر کوئی دوسرا گوشۂ راحت مجھے تو زمین سے آسمان تک نظر نہیں آتا۔

نور افروز نے ایک عزم آفرین انگڑائی لی۔ اس کی آنکھیں بند ہو کر کھلیں اور زیادہ روشن ہوگئیں۔ اس کے جسم کو ایک حرکت ہوئی گویا کہ وہ ارتقی کے ارادہ کیسا تھ پرواز کر جانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک خوبصورت اور مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ اپنے نازک ہونٹوں کو جنبش دی۔ اور کہا "ہاں خیال اچھا تھا۔ اگر عملاً ممکن بھی ہوتا۔

ارتقی۔ تو کیا دنیا میں کوئی چیز ناممکن بھی ہے؟

نور افروز۔ ہمارے آپ کے رشتۂ ازدواج نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں؟

ارتقی۔ بس تو اس طرح چاند کی سیر بھی ناممکن نہیں ہو سکتی۔؟

نور افروز۔ بہتر ہے۔ پھر کب چلنے کا ارادہ ہے!

ارتقی۔ اس سے پہلے کہ چاندنی راتیں ہماری دنیا میں شروع ہوں۔ ہمیں چاند کی سیر کر لینی چاہیئے۔

نور افروز۔ مگر ان دنوں تو وہاں اندھیرا ہوگا۔

ارتقی۔ کرہ نور کا اندھیرا بھی ایک منور دنیا سے زیادہ تابناک ہونا چاہیئے۔ خاموش دھندلکے میں سیر کا جو لطف آسکتا ہے۔ وہ روشنی میں نہیں آسکتا۔

نور افروز ایک پارسی دوشیزہ تھی۔ ارتقی ایک مسلمان نوجوان تھا۔ دونوں خوبصورت تھے۔ نور افروز مسلمان ہو کر ارتقی کے عقد میں آچکی تھی۔ دونوں تعلیم یافتہ تھے۔ اور دونو کے دماغ تہذیب جدید سے منور۔ رات کو سیر ماہتاب کا ارادہ ہوا اور ہو کر رہگیا۔ مگر دونوں نے چاند کے متعلق کئی روز تک خوب مطالعہ کیا۔ اسٹرانومی پر جو بہترین کتابیں گھر کے کتاب خانہ میں موجود تھیں۔ سب پڑھ ڈالیں۔ اور ارتقی ان ذرائع کی تلاش میں منہمک ہوگیا جو ان دونوں کو "سرزمین سکون و نور"

تک پہونچادیں - اور یہ سیر ماہتاب سے سیر ہوجائیں -
ارتقٰی نے ان لوگوں سے بھی خط وکتابت کی جو کرۂ
مریخ کی سیر کے لئے مدتوں سے عازم ہیں - اور ان آسمانی
مکاتیب پر بھی غور کیا جو کرۂ مریخ سے اس دنیا میں نازل
ہوتے رہتے ہیں - آخر وہ اس فیصلہ پر پہونچا کہ ظاہری
ذرائع سے ہم پہونچنے کا امکان نہیں - اگر روحانیت سے مدد لی
جائے تو شاید یہ مہم سر ہوسکے -

ارتقٰی علمائے متصوفین سے ملا - اور ان کے سامنے
اپنا مقصد ظاہر کیا - لیکن اس تحت میں وہ بھی خاموش ہوگئے
اور بعض بزرگوں نے "قوت خیال" کو اسکا ذریعہ بتایا
- بعض نے خواب کے وسیلہ سے ارض ماہتاب تک پہونچنے کا
امکان ظاہر کیا - ان کے علاوہ کوئی اور ذریعہ ماہتاب تک
رسائی کا ارتقٰی کو نہ مل سکا - اس نے پورے جوش وعزم کے
ساتھ پھر کہا "جب دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں - تو سیر
ماہتاب بھی ناممکن نہیں ہوسکتی - میں ضرور ہی جاؤنگا اور نور
افروز کو چاند کے چپہ چپہ کی سیر کراؤنگا - وہ تو ہماری ہی
زمین کا ایک ٹکڑا ہے لیکن نو کرور اٹھائیس لاکھ نوے ہزار
میل بلند! اتنی مسافت ایک انسان کی عمر طبعی میں کیونکر طے
ہوسکتی ہے - مجھے پھر کیا کرنا چاہئے؟ -

وہ صوفے پر دراز ہوگیا - اس کی دور رس نگاہیں سطح
فلکی کی طرف تھیں چاند کا ایک بے نور سا ٹکڑا اسکے سامنے تھا
اس نے خیال کیا کہ نگاہ - اپنی پوری قوتوں کے ساتھ قدرت
کا ایک عجیب عطیہ ہے - باوجود اتنی لمبی مسافت کے چاند تک
ایک سکنڈ کے کم سے کم حصہ میں پہونچ جاتی ہے - مگر انسان
اپنی تمام مادی قوتوں کے باوجود ایک بڑی عمر میں بھی اس
سفر کو طے نہیں کرسکتا -

نورافروز مردانہ لباس میں اسکے سامنے آئی - ایک
دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی - کیا آپ کسی خاص
خیال میں ہیں؟ -

ارتقٰی "کچھ نہیں" میں چاند کی سیر کرنے کا ارادہ مکمل کر
رہا ہوں -

نورافروز - کیا ابھی تک یہ ارادہ مکمل نہیں ہوا -

ارتقٰی - قریب قریب ایسا ہی ہے -

نورافروز - آپ فکر نہ کریں - میں نے سامان سفر
اور ذرائع سفر پر کافی غور کرلیا ہے - مگر آپ اپنے ارادے
میں کامیاب نہیں ہوسکتے - تو میں آپکو کرۂ ماہتاب تک لے
چلنے میں کامیاب ہوجاؤنگی -

ارتقٰی - سیدھا ہوکر بیٹھ گیا - وہ نورافروز کی صورت
دیکھنے لگا - اسے ایسا معلوم ہوا کہ گویا چاند خود اسے دعوت
نظر دے رہا ہے - اور وہ چاند کی ایک کرن سے سرگرم گفتگو
ہے - اس نے نورافروز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر ذرا
زور سے کہا -

"ذرائع سفر"

نورافروز - جی ہاں ذرائع سفر پر بھی میں نے قابو
پالیا ہے؟ -

ارتقٰی - قابو پالیا ہے؟ -

نورافروز - یقین کیجئے - میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں

ارتقٰی - وہ کیونکر؟ -

نورافروز - یہ پھر بتاؤنگی - بس آج شبکو ہم لوگ
کرۂ ماہتاب میں ہوں گے -

رات کو ۱۲ بجے نور افروز نے ارتقی کو ایک خوبصورت اور لذیذ طریقے سے جگا دیا وہ اپنے ہونٹوں کو اپنے ہاتھ سے چھوتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اور پوچھنے لگا۔ کیوں خیریت تو ہے؟

نور افروز۔ اٹھئے سفر ماہتاب کی موسم شروع ہوگئی چلئے ہمیں جلدی پہونچنا ہے۔ اور صبح ہونے سے پہلے واپس آجانا ہے۔

ارتقی۔ تو کیا اس کوٹھے سے براہ راست چلنے کا ارادہ

نور افروز۔ جی نہیں نیچے اترئے وہاں سے چلیئے۔

ارتقی۔ اور کپڑے۔؟

نور افروز (قہقہہ لگاکر) ماشاءاللہ کیا سوال کیا ہے۔ کرۂ ماہتاب میں آپ اپنے دنیا کے لباس سے چلنا چاہتے ہیں"۔

ارتقی۔ تو پھر کیا برہنہ چلنا ہوگا۔؟

نور افروز۔ آپ اٹھیں تو سہی۔ یہ مرحلہ پہلی منزل پر طے ہو جائیگا۔

ارتقی۔ آسمان کی طرف دیکھتا ہوا اٹھا۔ مگر اس کی نظروں نے چاند کا پتہ نہ پایا۔ وہ نور افروز کے ساتھ ہولیا اس کے جسم پر صرف ایک قمیض اور پاجامہ تھا۔ وہ اسی حال میں برہنہ سر روانہ ہوگیا۔ ہاں اسکی قمیض کی جیب میں ایک نازک اور لطیف رومال بھی تھا۔ نور افروز بھی اپنے لباس شب خوابی میں تھی اور اسوقت ارمن ماہتاب کی ایک کنواری معلوم ہوتی تھی۔

دونوں کوٹھے سے نیچے اترے دروازے سے باہر گئے پھر مکان کا زینہ طے کرکے پھر اوپر پہونچے اور ایک نیچان کے ذریعہ اس پہاڑی پر چڑھ گئے۔ جو اس مکان سے ملی ہوئی تھی۔ پہاڑی پر انھیں چند نوجوان لڑکیاں ملیں۔ جنکے چہروں پر نقاب پڑا ہوا تھا۔ اور جنکے جسم لطیف سفید لباس میں پوشیدہ تھے۔ ان لڑکیوں نے ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ اور خود بھی اسی طرف چلنے لگیں۔ دونوں ان کے پیچھے ہوئے پہاڑی ختم ہوگئی۔ اور یہاں انھیں ایک ہی سیڑھی نیچے اترنے کے لئے ملی۔ یہ خوبصورت قافلہ پہاڑی سے نیچے اترا تو میدان میں کچھ روشنی سی نظر آئی۔ راہبر اور راہرو سب خاموش تھے اور سفر نہایت سکون کیساتھ طے ہو رہا تھا ابھی یہ لوگ تھوڑی دور چلے تھے کہ انھیں پھر ایک پہاڑی پر چڑھنا پڑا۔ جونہی یہ لوگ پہاڑی پر چڑھے۔ انھیں اپنے سامنے ایک طویل و وسیع روشن کرہ نظر آنے لگا۔ جو دور سے بالکل چاند نظر آتا تھا۔ جس کا نصف سایہ سے پوشیدہ تھا۔ اور نصف چاند کی شکل میں روشن۔ روشنی بادی النظر میں سنہری تھی لیکن اس پر کسیطرح آگ کا گمان نہیں ہوسکتا تھا۔

ارتقی۔ بالکل خاموش اور مبہوت چلا جا رہا تھا جب اسکی نظر کرۂ نور سے ٹکرائی تو وہ ٹھہر گیا۔ اس نے نور افروز کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا۔ جو خدا جانے کب سے برابر مسکرا رہی تھی وہ ایک دم چیخ اٹھا "کیا میں واقعی کرۂ ماہتاب کے قریب ہوں"؟

نور افروز۔ بالکل قریب، مگر آپ ذرا خاموش رہیئے۔

اس منزل میں خاموشی آداب سفر میں داخل ہے
"سب یہاں مشہور ہے جو بولا وہی مارا گیا"

ارتقی پھر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر خاموش ہوگیا۔ اس کی نگاہیں یکبیک روشن درخشاں چاند پر جم گئیں۔ یہ لوگ جسقدر آگے بڑھتے جاتے تھے۔ اسی قدر چاند ان سے قریب تر ہوتا جاتا تھا۔ آخر جب یہ کرہ صرف سو قدم دور رہگیا۔ تو راہبر لڑکیوں

میں سے ایک لڑکی نے کہا۔ اب آپ لوگ جوتے اتار دیں۔ اور ممکن ہو تو لباس بھی۔

نور افروز۔ کیا آپ بھی ایسا ہی کرینگی۔

راہبر لڑکی۔ چاند کی کنواریوں کو اسکی ضرورت نہیں۔

نور افروز۔ ممکن ہو تو اپنا لباس ہمیں دیدیجئے۔ ہم بالکل برہنہ رہنے کے عادی نہیں ہیں۔

راہبر لڑکی۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ میں اپنا لباس تو نہیں دے سکتی۔ البتہ کرۂ زہرہ سے جاکر لاسکتی ہوں۔

یہ کہکر ایک لڑکی اپنے خرام تیز کے ساتھ آگے بڑھی اور غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں وہ دو لباس لے آئی۔ نور افروز اور ارتقی نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور ایک پتھر سے دباکر وہیں پہاڑی پہ چھوڑ دیئے۔

اب یہ لوگ اور آگے بڑھے۔ یہانتک کہ باب نور میں داخل ہوگئے۔

ارتقی۔ نور افروز ———— کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

نور افروز۔ ہم آپ بیداری میں چاند کی سیر کررہے ہیں

ارتقی۔ وہی نہریں۔ وہی دریا۔ وہی گھاٹیاں اور وہی جھیلیں۔ چلو دریا کے کنارے بیٹھکر ذرا سیر کریں۔

راہبر لڑکی۔ دریا تو خشک پڑے ہوئے ہیں۔

ارتقی۔ ہمیں ایسی جگہ لے چلئے جو ارض ماہتاب میں سب سے بہتر ہو۔ جسپر قافلہ پھر ایکطرف روانہ ہوگیا۔

نور ہی نور۔ روشنی ہی روشنی۔ سکون ہی سکون۔ قوس و قزح کے سیکڑوں رنگ سر زمین مہتاب پر کھیل رہے تھے۔ روشنی کی زمین۔ روشنی کا آسمان۔ روشنی کے مکانات غرضکہ ہر چیز روشن تھی۔

سیاحوں کی نگاہیں جھپک رہی تھیں۔ وہ روشنی کے تصادم سے اپنی آنکھیں بندکرلیتے تھے۔ اور بڑی دیر تک انھیں آنکھیں کھولنے کی جسارت نہ ہوتی تھی۔ وہ اس حالت میں دیر تک خاموشی کے ساتھ ٹھہر جاتے۔ اور راہبر لڑکیاں شہاب ثاقب کے ٹوٹنے کی آواز سے ایک قہقہہ لگاتیں۔ وہ متعجب ہوکر آنکھیں کھولتے۔ مگر روشنی کی شدت درخشاں کی کثرت اور تنویر کی افراط انھیں ایسا کرنے سے معذور رکھتی۔ آخر ایک خشک تر مقام پر یہ لوگ ٹھہرے۔ جہاں نسبتاً روشنی کم اور سردی زیادہ تھی۔ ارتقی تھک کر بیٹھنا چاہتا تھا کہ راہبر لڑکیوں کی ایک چیخ نے اسے روکا۔ جسکا مفہوم یہ تھا کہ اگر آپ بیٹھے تو کرۂ اسفل میں جاگرینگے۔ یہ عجیب فلسفہ تھا۔ ارتقی کی دماغی قوتیں سلب ہوچکی تھیں۔ وہ اپنے دماغ سے کام لینا چاہتا تھا۔ مگر نہ لے سکتا تھا۔ جہاں انسان کھڑا ہو سکتا ہے وہاں بیٹھ بھی سکتا ہے۔ لیکن کرۂ ماہتاب کا یہ عجیب طلسمی طریقہ بود و ماند تھا۔ کہ یہاں کوئی بیٹھ نہیں سکتا۔

ارتقی۔ تو کیا آپ ہمیشہ کھڑی رہتی ہیں۔

رہبر لڑکیاں۔ ہمیں چاند کے ... سے پیدا کیا گیا ہے ہم زوال سے واقف نہیں۔ آپ جسطرح ہمیں دیکھ رہے ہیں یہی ہمارا طریقہ زندگی ہے۔ یوں ہی سوتے ہیں یوں ہی جاگتے ہیں۔ یوں ہی چلتے پھرتے ہیں۔

ارتقی۔ اور آپ کی خوراک کیا ہے؟

راہبر لڑکی۔ یہ سنہری غلاف دار پودے۔ جو چاند کی خشک ... ٹیلوں پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں اپنے ... سے ہماری زندگی کی کفالت کرتے ہیں۔ آپ چکھنا چاہیں تو حاضر کروں

ارتقی خاموش ہوگیا۔

نور افروز۔ ہمیں پیاس نہیں ہے مگر ہم کچھ دیر کسی نوری چٹان پر بیٹھنا ضرور چاہتے ہیں۔ یقین کیجئے کہ ہم لوگ تھک گئے ہیں۔

راہبر لڑکی۔ ہم اپنا رقص دکھا کر آپ کی تکان دور کرینگے

ارتقی۔ سبحان اللہ۔ میں بہت ممنون ہونگا۔ اور اب تو رس پینے کو بھی جی چاہتا ہے۔

ایک لڑکی دوڑی ہوئی گئی۔ اور کسی انجم نما چیز میں رس بھر کرلے آئی۔ ارتقی اور نور افروز نے تھوڑا تھوڑا رس پیا۔ اس میں شراب کا سا کیف۔ برف کی سی ٹھنڈک اور شہد کی سی شیرینی تھی۔ رس کے دو گھونٹ حلق سے اترے تھے کہ تکان سفر دور ہوگئی۔ اور ایک عجیب قسم کے سرور میں ارتقی اور نور افروز مست ہوگئے۔

چاند کی کنواریاں حلقہ باندھ کر مصروف رقص ہوئیں ان کے پاؤں میں آواز نہ تھی۔ صرف روشنی کے چند پیکر متحرک نظر آرہے تھے۔ ان کے متحرک سائے روشن زمین ماہتاب پر گرمیٔ رقص کو بڑھا رہے تھے۔ ان کی پرنور آنکھوں کی لمبی لمبی پلکوں کا عکس ان کے روشن نقاب چہرہ سے جھلک رہا تھا ارتقی نے عالم سرمستی و بیخودی میں نور افروز کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔ نور افروز جھجک کر سمٹ گئی۔ رقص ملتوی ہوگیا۔ چاند کی کنواریاں متحیر ہو کر دوسری دنیا کے مہمانوں کو دیکھنے لگیں اور راہبر لڑکی نے اداسی بھرے لہجے میں کہا۔ اب آپ کا زمانہ قیام ختم ہوگیا۔ جو باتیں چاند میں قیامت اور زوال کا باعث ہوئیں ان کا اعادہ پھر ناممکن ہے۔

نور افروز۔ تو ہمیں واپس چلنا چاہئے۔

ارتقی۔ بیشک۔ مگر جانے سے پہلے ــــــ صرف دو سوال کرنا چاہتا ہوں۔

راہبر لڑکی۔ فرمائیے جلد فرمائیے

ارتقی۔ کیا چاند میں اب بھی آبادی ہے؟

راہبر لڑکی۔ جی نہیں۔ سرزمین ماہتاب بالکل غیر آباد ہے

ارتقی۔ پھر آپ لوگوں کا قیام یہاں کسطرح ہے۔

راہبر لڑکی۔ ہم کرۂ مشتری اور کرۂ زہرہ کی رہنے والیاں ہیں کبھی کبھی سیر کرنے کے لئے یہاں آجاتے ہیں۔

ارتقی۔ اسی طرح آپ ہماری دنیا میں بھی آجا سکتی ہیں۔؟

راہبر لڑکی۔ ہر وقت۔ آپ کی دنیا بھی ہماری سیر گاہ ہے!۔

ارتقی۔ بس ایک بات اور بتادیجئے۔ وہ یہ کہ آپ ہماری زبان میں گفتگو کرنے پر کسطرح قادر ہیں۔

راہبر لڑکی۔ یہ راز کی باتیں ہیں۔ اتنی جلدی نہیں بتائی جا سکتیں؟۔

نور افروز۔ اب آپ ہماری دنیا میں کب آئینگی۔

راہبر لڑکی۔ اس کے متعلق بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

مہمان رخصت کر دیئے گئے۔ سرزمین ماہتاب پھر خاموش اور سنسان ہوگئی۔ سو قدم تک راہبر لڑکیاں اپنے مہمانوں کے ساتھ آئیں۔ اپنے لباس واپس لئے کچھ لڑکیاں وہیں سے واپس ہوگئیں۔ کچھ تھوڑی دور تک آگے آئیں۔ اور پھر وہ بھی رخصت ہوگئیں۔؟

آخر آپ کو حیرت کیوں ہے۔؟۔

نور افروز نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو گردش دیکر

کہا " جب دنیا میں ہر چیز ممکن ہے تو کرۂ ماہتاب کی سیر بھی ناممکن نہیں ہو سکتی "

یہ آپ کا قول تھا۔ میں نے اسے ثابت کر دیا جس طرح آپ میری شادی پر قادر ہو گئے۔ جو قطعی ناممکن تھی۔ اسی طرح میں سیر ماہتاب پر قادر ہو گئی" "نہیں" ۔ نور افروز جب تک تم تفصیلی واقعات بیان نہ کرو گی۔ میری حیرت و استعجاب میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔ اب تک میری نگاہوں میں وہ سماں موجود ہے۔ میرے دماغ میں ابتک "ارض ماہتاب کی کنواریاں رقص کر رہی ہیں۔ اور چاند کے پودوں کا رس میری رگ رگ میں کیف برسا رہا ہے۔ سچ بتاؤ یہ کیا طلسم تھا جسے باوجود غور و فکر میں ابتک نہیں سمجھ سکا۔ ارتقی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ نور افروز کو ہنسی آگئی۔ وہ کہنے لگی کہ یہ راز اگر راز ہی رہے تو پر لطف رہے گا۔ افشائے راز ممکن ہے کہ بدمزگی کا باعث ہو۔

ارتقی ۔ تمہاری قسم وہ لذتیں۔ وہ کیفیات اور وہ لطف کبھی کم و رنہیں ہو سکتے۔ خواہ ان کا کتنا ہی بطلان کیا جائے مجھے بڑی حیرت یہ ہے کہ جن پہاڑوں پر میں اسدن مصروف سیر تھا۔ اور جن پر مجھے سرزمین ماہتاب کی سیر نصیب ہوئی تھی وہ پہاڑ اب بھی موجود ہیں۔ میں کل بھی وہاں گیا تھا۔ مگر چاند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ بتاؤ۔ بتاؤ۔ نور افروز مجھے بتاؤ کہ وہ کیا سحر تھا۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤنگا۔

نور افروز ۔ اب آپ نہیں مانتے تو مختصراً عرض کئے دیتی ہوں۔ سنئے۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ میں پہلے فلم ایکٹرس تھی۔ فلم کمپنیوں میں میری بے حد رسائی تھی۔ جب آپ نے مجھ سے اپنی آرزو بیان کی۔ اور پھر اسے ممکن بھی بتایا۔ تو میں خائف ہوئی کہ کہیں آپ امکان پیدا کرنے کی کوشش میں پریشان نہ ہوں۔ حالانکہ میں سمجھتی تھی کہ چاند کی سیر قطعاً ناممکن ہے موجودات کی تقسیم واجب و ممکن پر ہے۔ واجب وہ ہے جو معدوم نہ ہو اور جسکا وجود ہو۔ اور ممکن وہ ہے جو واجب کے بالکل خلاف ہو۔ اور جسکا عدم وجود برابر ہو۔ پھر ممکن کی دو قسمیں ہیں۔ وہ یا تو جوہر ہوگا یا عرض یعنی یا تو بالذات قائم ہوگا یا بالغیر۔ اور اسکے عدم یا وجود کو علت کی احتیاج بھی ہوگی۔ ممکن کے وجود علت کے ساتھ واجب ہو جاتا ہے مگر وہ وجوب بالغیر ہوتا ہے۔ پس میں اس فکر میں تھی کہ ممکن کو بالغیر واجب بنا کر آپکا نظریہ پورا کر دوں۔

میں نے علت پر غور کیا اور "وجوب بالغیر" کے متعلق سوچا تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی فلم کمپنی سے اس کے متعلق خط و کتابت کروں میں نے ایسا کیا اور میں کامیاب ہوگئی۔

ایشیاٹک فلم کمپنی نے مجھے اپنا پروگرام لکھ بھیجا۔ دن مقرر کر دیا۔ میں آپ کو ارض ماہتاب کی سیر کرا لائی۔ غالباً اب آپ کا ہیجان و تحیر دور ہو گیا ہوگا۔ ارتقی نے نور افروز کے متبسم چہرہ کو غور سے دیکھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ جوش مسرت سے کھڑا ہو گیا۔ اور نور افروز کی کشادہ اور روشن جبین پر بوسہ دیکر کہا۔ نور افروز آج تم نے میری مساعیٔ ازدواج کی اہمیت کو میری نگاہوں میں بالکل کمزور کر دیا۔ میں اپنے پندار کی شکست مانتا ہوں۔ تم حقیقت میں نور افروز ہو۔

(خاص)

ہند و دیوی

[جناب ساغر نظامی سیمابی "مدیر" رسالہ "پیمانہ" آگرہ]

(۱)

صبح کو جمنا کنارے موج سے پیدا ہوئی ۔۔ موج کی گودی سے ہندو استری پیدا ہوئی

باتھ میں ساری کا آنچل لہرائی ہوئی + لب پہ ہلکا سا تبسم آنکھ شرمائی ہوئی
کرشن کی بنسی میں پھر اک لہر سی پیدا ہوئی + لہر نے اک گیت گایا گیت کی پوجا ہوئی

موج کی گودی سے ہندو استری پیدا ہوئی
استری کے ست پن سے زندگی پیدا ہوئی
شانتی پیدا ہوئی
تازگی پیدا ہوئی
صبح کو جمنا کنارے موج سے پیدا ہوئی

(۲)

شاعر نرگس نے اٹھایا اپنا تو الا قلم + اور پتوں پہ کنول کے نظم یہ کردی رقم

---

(۱)

ہندو دیوی ہے پریم کی مورت :: پریم اور پریت اس کی ہے فطرت
اسکی باتوں میں درد کی گنگا :: اسکی آنکھوں میں کیف کی جمنا
کرشن کی بانسری کا نغمہ ہے :: قلب قدرت کی اک تمنا ہے
اسکی فطرت نیاز سے معمور :: اور نیاز اسکا ناز سے معمور
وہ محبت کی اک پجارن ہے :: وہ اطاعت کی ایک جوگن ہے
اس میں اک جذبۂ عبادت ہے :: اپنے معبود کی وہ عظمت ہے
اپنے بچوں کی ہے وہ بیراگن :: ساتا کے چمن کی ہے مالن

(۲)

پریم چاہے وہ پتی کی ستی :: ہے حیا اور شرم کی دیوی
اسکا احساس نرم و نازک ہے :: اسکا ہر سانس گرم و نازک ہے
اسکی گردن جھکی جھکی سی ہے :: اسکی چتون میں سادگی سی ہے
اسکے دل میں وفا کی دنیا ہے :: کسی دیوی کی وہ تمنا ہے
اپنے شوہر سے پریم کرتی ہے :: اسکے ہمراہ زندہ مرتی ہے
ہندو دیوی ہے بانسری پتی کی :: ہندو دیوی سے لاج ہے ست کی
اسکی عصمت بہت ہے پاکیزہ :: اسکی عفت جوان و دوشیزہ
وہ اچھوتی کلی ہے گلشن کی :: ایک کنواری نظر ہے مالن کی

اسکی ہر بات اک بشارت ہے
اپنی مفہوم میں وہ عورت ہے

---

(۳)

اس کے جلووں سے لطافت کا اثر پیدا ہوا
اسکی عادت سے شرافت کا اثر پیدا ہوا
اس کی ہستی روشنی کی نہر بن بہنے لگی
یک بیک ہر موج افسانہ نیا کہنے لگی
چھڑ کنول کے پھول سے چھلکا تبسم کا ایاغ
جمنا مائی کا مسرت سے ہوا دل باغ باغ
اسکی مسرت کی لطافت سے پری پیدا ہوئی
شہپری میں پھر اک تھرتھری پیدا ہوئی
گدگدی پیدا ہوئی
زندگی پیدا ہوئی
صبح کو جمنا کنارے موج سے پیدا ہوئی
موج کی گودی سے ہندو استری پیدا ہوئی

(نامص)

تاج

فطرت کی جوگن

[جناب مولینا سیماب اکبرآبادی ایڈیٹر تاج، آگرہ]

(متعلق تصویر)

عروج شبہائے ماہ کا ہے، ضیائے مہتاب چھا رہی ہے — عروسِ شب بے حجاب ہوکر، تجلّیوں میں نہا رہی ہے
چمک رہا ہے ڈوبا ہوئے آسماں پہ چاند چودھویں کا — برس کے بادل ابھی کھلے ہیں، فضا کی سنہری بتا رہی ہے
فلک بھی روشن، زمیں بھی روشن، مکاں بھی روشن مکیں بھی روشن — فقط نمودار روشنی ہے، نظر جہاں تک بھی جا رہی ہے
سکوت دنیا پہ حکمراں ہے، نہ داستاں گو نہ داستاں ہے — عجیب منظر عجب سماں ہے، عجیب کیفیت آ رہی ہے
ہے ایک طوفانِ رنگ و نور، اور اسمیں تیری ہوئی ہے دنیا — بہار کی رنگ آفرینی، نمو کی موجیں بڑھا رہی ہے
پہاڑ جنت بنے ہوئے ہیں، ہے بارشِ نور چوٹیوں پر — کرن جو چشمے میں پڑ رہی ہے، وہ آئینے سے بتا رہی ہے
ہے دور میں چاند کا پیالہ، افق پہ پھیلی ہوئی ہے مستی — رواں ہے اک آبشار، گویا شراب فطرت بہا رہی ہے
یہ رات رنگین اور سنہری یہ وقت خاموش اور ٹھنڈا — یہ وقت کی ہے نظر فریبی، کہ رات جادو جگا رہی ہے
تلاطم رنگ و بو میں، بیٹھی ہوئی ہے فطرت کی ایک جوگن — جو اپنے ماحول کی خموشی میں زندگی سی بڑھا رہی ہے
قریب چشمہ جمائے بیٹھی ہے مرگ چھالے پر اپنا آسن — اور آبشار رواں سے اپنی نشیلی نظریں لڑا رہی ہے
نہ یادِ عقبیٰ، نہ فکرِ دنیا، نہ جوشِ مستی نہ ہوشِ ہستی — مگر وہ بے رنگینیوں کی بستی، فضا کے دلمیں سما رہی ہے
اُدھر ہے اک آبشار لرزاں، اِدھر ہے زلفِ رسا پریشاں — وہ اپنی موجیں دکھا رہا ہے، یہ اپنی موجیں دکھا رہی ہے
حسین جوگن، جوان جوگن، جوان راتوں کی جان جوگن — کنارِ چشمہ، کسی کے رنگیں خیال میں کھوئی جا رہی ہے
یہ محویت اور یہ تصور، نہ کچھ آئے ساری دنیا — یہ کیا کرشمے دکھا رہی ہے یہ کیا قیامت اُٹھا رہی ہے
یہ دن تو ہستی کے گلکدے میں بہار افروزیوں کے دن تھے — تو کیوں یہ سنسان خلوتوں میں شباب اپنا لٹا رہی ہے
یہی ہے وہ عمر اور وہ موسم، بنادے دیوانہ جسکو چاہے — پھبن پھبن اسکی دلنشیں ہے، ادا ادا مسکرا رہی ہے
مگر یہ فطرت کی ہے پجارن، تصور و محویت کی دیوی؟ — نظر میں کوئی لبھا ہوا ہے، کسکو دل میں بسا رہی ہے
نہ آنکھ جھپکے، نہ ہونٹھ لرزیں، نہ ہاتھ اُٹھیں نہ پانوں ہلکیں — یہ اپنے آسن پہ بیٹھے بیٹھے، قریب منزل کے جا رہی ہے
جمال سے اس کے پا رہا ہے، فروغ ماہ تمام کیا کیا — نگاہ خود آبشار بنکر فضا کی مستی بڑھا رہی ہے
یہ محو و مستِ خیالِ فطرت، شبابِ فطرت، جمالِ فطرت — جہاں کی فانی لطافتوں کو، خود اپنے اوپر لبھا رہی ہے
خیال طے کر رہا ہے، تیزی سے جادۂ منزلِ حقیقت — وہ خود ہے مرکز پہ اپنے قائم، نہ آ رہی ہے نہ جا رہی ہے
یہ دل کے کانوں سے سن رہی ہے پیامِ فطرت بنامِ ہستی — اور اسکی یکسر زبان، خموشی، پیامِ فطرت سنا رہی ہے

(خاص)

کہ جو درِ حقیقت میں محو ہوکر یہاں حقیقت پرست ہوگا
اُسی کی رنگیں تجلیوں سے دماغ نظارہ مست ہوگا

تاریخ

مورخ خافی خاں

میر محمد ہاشم نظام الملکی

[جناب حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری۔ ایڈیٹر تاریخ]

خافی خاں ہندوستان کا مشہور مورخ ہے۔ زمانۂ حال کے بعض یوروپین مصنف خیال کرتے ہیں کہ اس کا لقب **خافی خاں** لفظ 'خفا' سے نکلا ہے۔ اور اس کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ **اورنگ زیب عالمگیر** نے بڑی تاکید کے ساتھ حکم دے رکھا تھا کہ اُسکے عہد کی تاریخ لکھی نہ جائے۔ لیکن **خافی خاں** نے خفیہ طور پر اپنی تاریخ لکھی اور جب اُس کی اشاعت ہوئی تو مصنف کا لقب **خافی خاں** مشہور ہوگیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ **خافی خاں** کے اجداد **خواف** کے باشندے تھے جو **خراسان** میں **نیشاپور** کے قریب آباد ہے[۲]۔ اور اسی سے منسوب ہوکر اُس نے **خافی خاں** یا جیسا کہ **صمصام الدولہ** نے **ماثر الامرا** میں لکھا ہے[۳] **خوافی خاں** کے لقب سے شہرت حاصل کی ہے۔

خافی خاں کے اقارب شاہان تیموریہ کے متوسل تھے

[۱] مارلی کی مخطوطات تاریخی ص ۱۰ لتھبرج کی تاریخ ہند ص ۴۵۳

[۲] نزہتہ القلوب طبع بمبئی ص ۱۸۲

[۳] ماثر الامرا جلد اول ص ۲۶۴ جلد سوم ص ۶۰۰

اسکے باپ کا نام **خواجہ میر** ہے[۴]۔ وہ **شاہزادہ داور بخش** کا ملازم تھا اور اُسکے اسیر ہونے تک اسکی رفاقت میں رہا[۵]۔

خافی خاں کے خالو کا نام **خواجہ کلاں** ہے۔ **اورنگ زیب عالمگیر** نے ۱۰۶۸ھ میں جب شاہزادہ **محمد سلطان** کو **دار الفتح اوجین** کا صوبہ دار بنایا تو **خواجہ کلاں** کو اسکا دیوان اور نائب مقرر کیا اور **کفایت خاں** کا خطاب دیکر عطائے خلعت واسپ و فیل سے مفتخر فرمایا[۶]۔

خافی خاں نے **سید محمد علامی** سے تعلیم حاصل کی تھی یہ شخص اپنے عہد کا فاضل اجل اور ریاضی داں بے مثل تھا[۷]۔

اورنگ زیب کے عہد میں **خافی خاں** سالہا سال عاملان **گجرات** کی رفاقت میں رہا اور **سورت** و **احمد آباد** میں کارہائے نمایاں انجام دیے[۸]۔

۱۱۲۵ھ میں **فرخ سیر** نے **خافی خاں** کو صوبہ جات **دکن** کا دیوان مقرر کیا[۸]۔ **خافی خاں** نے یہ خدمت تین سال تک انجام دی۔ اس کے بعد جب دربار میں واپس آیا تو **فرخ سیر** نے **مصطفےٰ آباد چوپڑہ** کا فوجدار بنادیا[۹]۔

[۴] منتخب اللباب جلد دوم ص ۱۵۵ [۵] منتخب اللباب جلد دوم ص ۱۹ و ص ۲۰

[۶] منتخب اللباب جلد اول ص ۳۰۸ [۷] منتخب اللباب جلد دوم ص ۴۴۲ و ص ۶۰۰

[۸] منتخب اللباب جلد دوم ص ۷۴۸

[۹] منتخب اللباب جلد دوم ص ۷۶۰

محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں نواب نظام الملک آصف جاہ دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے تو اُنھوں نے خافی خاں کو اپنا دیوان کل بنا لیا اور اُسی زمانہ سے اس نے اپنا لقب محمد ہاشم خافی خاں نظام الملکی اختیار کیا[۴۹]

خافی خاں کے تعمیرات سے دکن میں ایک کنواں اس وقت بھی موجود ہے۔ یہ کنواں سرکار میدک کے قصبہ نرساپور میں واقع ہے۔ پہلے زمانہ میں اس قصبہ کو سلطانپور کہا کرتے تھے۔ اس میں ایک مسجد قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے عقب میں کنواں ہے۔ اُسکے زینہ پر بالائی حصہ میں حسب ذیل کتبہ نصب ہے جس سے سنہ ۱۱۴۰ھ میں اس کا تعمیر ہونا ثابت ہوتا ہے[۵۰]

چشمۂ شیریں دریں قصبہ نہ بود + کز زلالش تشنہ را لب تر بود
ساخت خافی خاں چنیں چاہ لطیف + موج آبش جسم را جوہر بود
ہاتفی گفت از پئے تاریخ سال + چشمہ پاکیزہ از گوہر بود

خافی خاں کی تاریخ کا نام منتخب اللباب ہے۔

یہ ایک صحیح کتاب ہے اس میں ابتداء فتح اسلام سے محمد شاہ بادشاہ کے بارھویں سال جلوس تک ہندوستان کے واقعات مرقوم ہیں مصنف نے مضامین کے اعتبار سے ایسے تین جلدوں میں تقسیم کیا ہے۔

جلد اول میں امیر ناصر الدین سبکتگین کے عہد سے سلطان ابراہیم لودھی کے انقراض تک سلاطین دہلی کا تذکرہ ہے۔

جلد دوم سلاطین تیموریہ سے متعلق ہے۔

جلد سوم میں سلاطین دکن کے حالات ہیں۔

دوسری جلد بابر بادشاہ کے فتح ہندوستان سے شروع ہوئی ہے۔ اسکے بعد ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر شاہجہاں۔ اورنگ زیب۔ اعظم شاہ بہادر شاہ جہاندارشاہ فرخ سیر۔ محمد شاہ کے واقعات شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں۔ اس کے ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جس میں ترک بن یافث کے زمانہ میں سے بابر کے جلوس تک شاہان مغول کا مختصر حال مذکور ہے۔

خافی خاں نے اس جلد کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ کہ اس میں محمد شاہ کے حالات سنہ ۱۱۴۳ء تک تحریر ہیں۔ لیکن محمد شاہ کے حالات میں ایسے متعدد واقعات موجود ہیں جو سنہ ۱۱۴۳ء کے بعد وقوع پذیر ہوئے ہیں مثلاً مبارز خاں کا مارا جانا اور حیدرآباد پر نواب نظام الملک آصف جاہ متصرف ہونا یہ واقعہ سنہ ۱۱۳۷ھ کا ہے[۵۱]۔ اسی طرح اشرف خان افغان کی وفات کے بعد شاہ طہماسپ صفوی کا ایران کی حکومت پر دوسری مرتبہ بحال ہونا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۱۴۲ء میں سرزد ہوا ہے[۵۲]۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ خافی خاں اس تاریخ کی تالیف و ترتیب میں سنہ ۱۱۴۲ھ تک مصروف و مشغول رہا۔

منتخب اللباب کی پہلی جلد اور دوسری جلد کا ابتدائی حصہ شہنشاہ اکبر کے جلوس تک محمد قاسم فرشتہ کی تاریخ سے منقول ہے۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے ابتدائی دو سالہ واقعات مغلیہ

---

[۵۰] منتخب اللباب جلد سوم ص ۲

[۵۱] منتخب اللباب جلد دوم ص ۹۵۶

[۵۲] منتخب اللباب جلد دوم ص ۹۷۶

دربار کے حسب ذیل مورخین کی تاریخوں سے ماخوذ ہیں۔

ملا نظام الدین احمد بخشی	مصنف	طبقات اکبری
ابوالفضل علامی	مصنف	اکبرنامہ و آئین اکبری
ملا عبدالقادر بدایونی	مصنف	منتخب التواریخ
محمد شریف معتمد خاں	مصنف	اقبال نامہ جہانگیری
عزت خاں	مصنف	مآثر جہانگیری
عبدالحمید لاہوری	مصنف	بادشاہ نامہ
محمد صالح کنبوہ	مصنف	شاہجہاں نامہ
محمد کاظم منشی	مصنف	عالمگیر نامہ

اورنگ زیب کے دسویں سال جلوس سے کتاب کے اختتام تک خافی خاں نے اپنے چشم دید واقعات اور معتبر مسموعات تحریر کئے ہیں۔ چنانچہ اورنگ زیب کے حالات میں ایک موقع پر خود خافی خاں نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

اما راقم الحروف بقدر مقدور دست و پا زدہ بعد تفتیش تمام و تفحص تام بعضے مقدمات و واقعات قابل تحریر کہ از السنہ کہن سالان ثقہ مسموع نمودہ و از اہل دفتر و واقعہ نگار کل تحقیق کردہ و دریں مدت برائے العین مشاہدہ نمودہ بدستور خوشہ چیناں بے بضاعت از صد یکے بزبان خامہ می دہد۔

تیسری جلد جسمیں سلاطین دکن کے حالات ہیں بجائے خود ایک مستقل کتاب ہے۔ اسمیں ایک ابتدا ایک مقدمہ ہے جسمیں قبایل عرب کے دکن میں آکر سکونت پذیر ہونے اور سلاطین دہلی کی فتوحات دکن کی سرگذشت بیان کی ہے اسکے بعد سلاطین دکن کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ جسکے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں سلاطین بہمنیہ کا تذکرہ ہے۔ دوسرے حصہ میں ملوک الطوائف کے حالات ہیں۔

اس جلد کے بیشتر اجزا تاریخ فرشتہ سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس کے ضمن میں خافی خاں نے اُن اختلافات کو بھی بیان کیا ہے جو دکن کی دوسری تاریخوں میں مذکور ہیں۔ اسکے بعد سنہ۱۰۰۰ئہ سے ملوک الطوائف کے انقراض تک خافی خاں نے وہ روایات جمع کئے ہیں جو معتبر اور ثقہ حضرات سے مسموع ہوئے یا خود خافی خاں نے برائے العین مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ اسکا ذکر خود خافی خاں نے اس طرح کیا ہے۔

”ازیں سرشتہ انتخاب تاریخ فرشتہ باتمام رسیدہ اما آنچہ از زبان مردم ثقہ مسموع شدہ و از حوادث کون و فساد دیدۂ عبرت بین مشاہدہ کردہ بزبان قلم میدہد و اگر کم و زیاد آن از روئے تاریخ دیگر یا زبانی راوی صحیح القول ظاہر گردد بریں ہیچ مدان خوردہ نگیرند۔

منتخب اللباب کی پہلی جلد نایاب ہے۔ اس کے دو نسخے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں موجود ہیں دوسری جلد ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی طرف سے سلسلہ کتب ہندیہ میں بمقام کلکتہ سنہ۱۸۶۸ء سے سنہ۱۸۷۴ء تک تقریباً چھ سال میں چھپی ہے تیسری جلد کو سر و لزلی ہیگ نے سنہ۱۹۲۵ء میں بمقام کلکتہ سلسلہ کتب ہندیہ میں چھپوایا ہے۔

(قاص)

کشمیر کی مشہور تاریخ راج ترنگنی اور اسکا مصنف

[جناب سید احمد اللہ قادری - ایم آر - اے - ایس لندن نائب ایڈیٹر تاریخ]

راج ترنگنی راجگان کشمیر کی نہایت قدیم اور مستند تاریخ ہے۔ یہ راجہ جے سنگھ [۱۲۲۸ء تا ۱۱۴۹ء] والی کشمیر کے عہد حکومت میں تصنیف ہوئی ہے۔ اور تاریخ ہندوستان کے بہترین ماخذات میں شمار کی جاتی ہے اس کی نسبت مستشرقین مغرب خیال کرتے ہیں کہ سنسکرت زبان میں جس قدر تاریخی سرمایہ ہے۔ اس میں یہ کتاب معمول سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کلہن

نامی ایک شاعر ہے۔ جو کشمیر کا رہنے والا تھا۔ اس مورخ کے حالات کسی تاریخ میں نہیں ملتے ہیں۔ سنسکرت زبان کی قدیم تصنیفات میں اسکا ذکر آیا ہے۔ لیکن اس میں اس کا حال نہایت سرسری طریقے پر لکھا گیا ہے۔ البتہ اس کی حیات کے واقعات کو جس تصنیف سے صحیح طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے۔ وہ خود اس کی تصنیف راج ترنگنی یا اسکے بعد کا لکھا ہوا تکملہ ہے ان پر نظر ڈالنے سے صرف اسقدر پتہ چلتا ہے کہ کلہن کے آباو اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ اور ان کو شاہی دربار میں غیر معمولی رسوخ حاصل تھا۔ کلہن کا باپ جسکا نام چنپک ہے۔ راجہ ہرش [۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء] والی کشمیر کا وزیر تھا اسکے سوا کلہن کے بعض عزیز مانک ... خاص ... امیر ... شاہی ...

ہوتے تھے۔ کلہن کا چچا لنگ بھی دربار میں تقرب رکھتا تھا۔ اور راجہ کی اس پر خاص نظر شفقت تھی۔ کیونکہ علم موسیقی میں اسے کمال حاصل تھا۔ اور راجہ نے اسے ایک موقعہ پر اسے ایک طلائی سکے عطا کئے تھے۔

اس طرح کلہن کے باپ کے متعلق بھی ایک واقعہ راج ترنگنی میں تحریر ہے کہ جب راجہ ہرش کا قتل ہوا تو اس وقت چنپک راجہ کے ان چند وفاداروں کی فہرست میں منسلک تھا۔ جو اس کی جانثاری کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اور اس معرکہ میں چنپک کے آدمیوں نے خوب داد شجاعت دی تھی۔

راجہ ہرش کے اس عظیم الشان قتل کے بعد کشمیر میں طوایف الملوک کا زور ہو گیا اور کشمیر کے باج گذار اقطاع خود مختار ہو گئے۔ کلہن کا خاندان چونکہ آخر وقت تک راجہ کا شریک رہا تھا۔ اس لئے فاتحین نے انکے ساتھ کوئی مراعات نہیں کیں۔ بلکہ ان کا خاندان اس عہد کے بعد گمنام ہو گیا۔

ان مختصر واقعات کے علاوہ کلہن اور اس کے اجداد کے حالات کسی تصنیف میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

راج ترنگنی سنسکرت زبان میں نظم میں لکھی گئی ہے اس میں ہندو دکن اور جنوب کے تقریباً ان تمام راجا مہاراجاؤں کا تذکرہ قلمبند ہے۔ جو راجگان کشمیر کے ہمعصر۔ حملہ آور یا ماتحت رہے ہیں۔

دراصل کشمیر کی ابتدائی تاریخ خاندان موریا عہد سے شروع ہوتی ہے اور یہ خاندان صدیوں راجگان کشان کے تحت رہا ہے۔ لیکن اس کی مستند

تاریخ کا آغاز کرکوٹ خاندان کے وقت سے ہوتا ہے[۵]۔ جن کی نشوونما کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی خیال کیا جاتا ہے کلھن نے تاریخ کشمیر کی ابتداء راجہ گو نند کے عہد سے شروع کی ہے۔ جس کا زمانہ تخت نشینی تین ہزار سال قبل عیسیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ اس حساب سے یہ کتاب چار ہزار دو سو پچاس برس کے واقعات کی ایک تاریخ ہے

اس میں عہد قدیم اور ازمنہ وسطیٰ کے حالات مصنف نے زیادہ وضاحت کے ساتھ تحریر کئے ہیں۔ وہ حصہ جس میں عہد مصنف کے واقعات ہیں معاصرانہ حیثیت سے خاص وقعت رکھتا ہے۔ او یہ کتاب کے بہت بڑے حصہ پر محیط ہے۔

اس میں اکثر جگہ مسلمانوں کی فتوحات اور داخلہ کا تذکرہ بھی نظر آتا ہے۔ جس کو مصنف نے نہایت راستبازی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ ۱۰۱۵ء میں سلطان محمود [۴۰۶ھ] کے کشمیر پر حملہ کرنے کا ذکر بھی اسمیں موجود ہے۔ اور یہ محمود کو ہمیرا کے لقب سے یاد کرتا ہے جو عربی لفظ امیر کی سنسکرت زبان میں بگڑی ہوئی صورت ہے۔

یہ کتاب بقول ولسن[۶] Wilson اور اسٹین M.A Stein کے سنسکرت زبان کی تمام کتابوں پر غیر معمولی فوقیت رکھتی ہے اور صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے جو ایک حد تک فن تاریخ کے لئے مخصوص ہے۔

تاریخ ہندوستان میں اسمتھ[۷] Smith نے بھی یہی بیان کیا ہے۔ اس میں اُنھوں نے صرف اس قدر اضافہ کیا ہے۔ کہ اس میں کی بعض سوانحات اور واقعات میں اکثر ایسی بے سرو پا باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ جو بڑی احتیاط کے بعد کام میں لائے جانے کے قابل ہوں گی۔

حقیقت میں اس کتاب میں ساتویں صدی عیسوی سے پہلے کے جو واقعات مذکور ہیں۔ وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے بعد کے جو حالات اس میں لکھے گئے ہیں وہ تاریخی شان رکھتے ہیں۔

یہ کتاب جن کتابوں کی مدد سے لکھی گئی ہے۔ ان کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) سورت نامی شاعر کی ایک نظم جو قدماء کے کلام کا مجموعہ تھا۔

(۲) نیل مت پران۔

(۳) عہد سابق کے گیارہ علما کی گیارہ چیدہ چیدہ تصانیف۔ لیکن راج ترنگنی سے اس میں صرف تین مصنفین کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ کشمندر مصنف' نرپاولی' جو راجگان قدیم کی تاریخ ہے۔ یہ شخص کلھن سے تقریباً سو سال قبل گذرا ہے یہ کشمیر کا رہنے والا تھا۔ راجہ کشمیر کے دربار سے اسکو خاص تعلق تھا۔ اس نے دربار میں ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کے علاوہ اُس نے "برہت کتھا" کی کتاب کو ازسرنو تالیف کیا تھا۔ اس کی یادگار سے بہت سی تصنیفات ہیں۔

---

[۵] قدیم تاریخ ہند از ونسنٹ اے۔ اسمتھ باب چہاردہم صفحہ ۵۶۱ [ترجمہ]

[۶] انسائی کلو پیڈیا جلد ۵ صفحہ ۶۸۸ و ۶۸۹۔

[۷] تاریخ ہند قدیم از ونسنٹ اے اسمتھ مترجمہ جمیل الرحمٰن صفحہ ۵۶۳۔

یہ اس زمانہ کے محقق مصنفین میں شمار ہوتا ہے[1]

۲۔ پدم مہر۔ کشمیر پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس سے کلہن نے اپنی تصنیف کے لئے آٹھ نام انتخاب کئے تھے۔ یہ مصنف غیر مشہور ہے۔ اس کا نام کسی ہند و تصنیف میں نہیں ملتا ہے۔

۳۔ چھو لاکر۔ اس مصنف کا نام بھی کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا ہے اس نے اپنی کتاب کی بنیا دہیلاراج کی پارتھوا آلی پر رکھی تھی۔ اس کتاب سے کلہن نے راج ترنگنی میں چند نام اضافہ کئے ہیں۔

ان ماخذات کے علاوہ کلہن نے مزید تحقیق اور تفتیش کی خاطر سنگی کتبوں اور اس عہد کی اسنادات اور قدیم سکون سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جس کا اس نے کتاب میں کئی مقام پر تذکرہ کیا ہے۔

راج ترنگنی کی ترتیب مصنف نے آٹھ باب میں کی ہے۔ اور اس کے ہر باب کو ترنگ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ پہلی ترنگ میں مصنف کا دیباچہ اور قدیم راجاؤں کا ذکر ہے جو جناب مسیح سے صدیوں پہلے گذرے ہیں۔ اس ترنگ کا خاتمہ یدھشتر پر ہوا ہے یہ راجہ بقول مؤرخ الفنسٹن Elphinstone کے حضرت عیسیٰ سے ساڑھے چودہ سال [۱۴۵۰] قبل حکمران تھا[2]

دوسری ترنگ تخمیناً دو سو سال کے زمانہ پر مشتمل ہے۔

تیسری ترنگ میں [۵۸۹] سال کے حالات ہیں۔

چوتھی ترنگ میں دوسو چون [۲۵۴] سال کے واقعات ہیں۔

[1] ہندو کلاسیکل ڈکشنری صفحہ ۲۱۹۔

[2] تاریخ ہند از الفنسٹن صفحہ و آثار الصنادید از سرسید احمد خان صفحہ ۲۵

پانچویں ترنگ مصنف نے بہت بڑے زمانہ پر لکھی ہے۔ اور اس کا آخری حصہ مسیحی صدیوں میں آگیا ہے۔

چھٹی۔ ساتویں۔ اور آٹھویں ترنگیں مسیح کے بعد کے زمانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

ساتویں ترنگ کے ابتدائی حصہ میں مصنف نے سلطان محمود غزنوی کا ذکر کیا ہے اور خاتمہ راجہ ہرش کے قتل پر ہوا ہے۔ جو سنہ ۱۱۰۱ء کا واقعہ ہے۔

آٹھویں ترنگ مصنف کے عہد سے تعلق رکھتی ہے اس کا زمانہ سنہ ۱۱۰۱ء سے سنہ ۱۱۵۰ء تک ہے۔

راج ترنگنی کا طرز تحریر بالکل قدیم زمانہ کے مطابق ہے۔ اور یہ زیادہ تر راماین اور مہابھارت سے ملتا جلتا ہے۔ اس کتاب میں سب میں اچھا اور بہترین حصہ راجہ ہرش کے قتل کا واقعہ ہے۔ جس کے لکھنے میں مصنف نے کمال دکھایا ہے[3]

راج ترنگنی نے مختلف زبانوں میں ترجمے لکھے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض عام طور پر مشہور ہیں۔

کلہن کے تقریباً تین سو سال بعد جو ناراجہ اور سری وارا پنیا بھاٹا نے اس تکملہ لکھا ہے۔ یہ حصہ سنہ ۱۸۳۵ء میں بمقام کلکتہ چھپا ہے۔

اس کو اے ٹریر A. Troyer نے فرنچ میں ترجمہ کرکے بمقام پیرس شایع کیا ہے۔ اس کے حصے سنہ ۱۸۴۰ء سے سنہ ۱۸۵۲ء تک مسلسل چھپتے رہے ہیں۔ اسکے پہلے چھ باب کا خلاصہ پروفیسر ولسن نے ایشیاٹک ریسرچ میں کیا ہے[4]

[3] ایشیاٹک ریسرچ جلد ۱۵ صفحہ ۱ تا ۹۲

[4] ما بقیہ دوسرے صفحہ پر دیکھئے۔

شہنشاہ اکبر [۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء – ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء] نے جب سنہ میں کشمیر کو فتح کیا تو اسکو یہاں کی تصنیفات سے خاص محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ اکبر کے حکم سے ملا شاہ محمد شاہ آبادی[1] نے ۹۹۸ء میں سنسکرت زبان سے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ بادشاہ کو پسند نہ آیا۔ تو بادشاہ کے حکم سے ملا عبد القادر بدایونی نے ۹۹۹ء میں اس کی نظر ثانی کی[2]

اس کا خلاصہ ابو الفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں درج کیا ہے[3]

جہانگیر [۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء – ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء] بادشاہ کے حکم سے حیدر ملک بن حسن ملک بن کمال الدین ملک نے ۱۰۳۰ء کے قریب کشمیر کی ایک قدیم تاریخ لکھی تھی۔ اسمیں عہد ہنود کی تاریخ کو راج ترنگنی سے اخذ کیا تھا۔ یہ تاریخ شہنشاہ اکبر کی فتح کشمیر تک ہے[4] اس کتاب کا ترجمہ برنیر F. Bernier نے کیا تھا۔ جس کا ذکر اُس نے اپنے سفرنامہ میں کیا[5]

کشمیر کے ایک پنڈت نارائن کول عاجز نے اس کا اصل سنسکرت زبان سے ۱۱۲۲ء میں بزبان فارسی ترجمہ کیا ہے۔ اس کا ایک مخطوط بوڈلین لیبریری میں موجود ہے[6]

اِن ترجموں اور خلاصوں کے علاوہ اے۔ اسٹین M.A. Stein نے مکمل راج ترنگنی کا ترجمہ

(حاشیہ صفحہ سابق) نمونہ کے طور پر ہم اسکو ذریعہ ترجمہ کرتے ہیں جس سے مصنف کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ جو کبھی راجدھانی کے نشہ میں چور تھا تقدیر کے جال میں پھنس گیا اور وہ وقت خدا کو یاد کرکے زمین پر گر پڑا۔ یہ وہ تھا جس نے زمین کو کبھی پیر نہ دکھلائے تھے ایسا محو خواب تھا۔ کہ جیسا ہرا بھرا درخت جڑ سے کاٹ دیا گیا ہے۔ یہ راجہ بڑا اولو العزم اور خاص شان والا تھا اور ایسے راجہ کبھی دیکھنے میں نہیں آئے ہیں اسکی جو آرزو تھی کبھی سرسبز نہ ہوئی۔ راس کا دامن ہمیشہ حزن و یاس سے لبریز رہا۔ جب یہ دنیا سے رخصت ہوا تھا تو اسوقت اسکا سن ۴۲ سال ۸ ماہ کا تھا۔ اسکی پیدائش کا دن منگل تھا۔ اسوقت آسمان پر برج سرطان تھا۔ زحل پانچویں مشتری اور عطارد چھٹے زہرۂ شمس ساتویں اور قمر دسویں خانے میں تھے۔ سنگھنا کا مصنف لکھتا ہے کہ کورو اور دوسرے لوگ یا اُسکے جانشین جو اِن کی علمداری کے زمانہ میں پیدا ہوئے وہ کبھی پھولے نہ پھلے۔ بلکہ آپ اپنے خاندان کی تباہی کا باعث ہوئے۔ چنانچہ یہ بھی انھی کے دور میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے یہ خود ہی اپنے خاندان کی تباہی کا منسوب ہوا۔ جس وقت اس کا سر تن سے جدا ہوا تو زمین کانپی اور آسمان چلا اٹھا۔ گو اسوقت آسمان صاف تھا۔ فضا کھلی تھی۔ مگر اس دم میں مکدر ہو گئی آسمان کو جوش آیا۔ اور بادل جھوم جھوم کر آئے اور اس پر آہ و زاری کرنے لگے.......

[1] شاہ آباد کا علاقہ شاہ کشمیر سری نگر سے تین میل اسطرف واقع ہے دربار اکبری آزاد صفحہ ۱۱۹

[2] منتخب التواریخ طبع کلکتہ جلد ۲ صفحہ ۳۷۴ ایلیوٹ جلد ۵ صفحہ ۴۷۸۔ رسالہ اُردو اورنگ آباد جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۶۱۸۔ ریو صفحہ ۲۹۶ دربار اکبری صفحہ ۱۱۶۔

[3] تاریخ ہند سید ہاشمی طبع دار الطبع صفحہ ۱۹۶۔

[4] ایتھے نمبر ۲۸۴۶

[5] وقایع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر جلد دوم ۵۹۔

[6] بوڈلین نمبر ۱۳۱۸ و ایتھے نمبر ۵۱۱۔

[بقیہ ۶۴۴ صفحہ پر دیکھئے]

تنقید

تارہ گڈھ

[جناب مشیر احمد علوی القادری بی۔ اے سابق ایڈیٹر تنقید و سابق معاون حقیقت لکھنؤ]

ہندوستان نے یوں تو جملہ مزارات شجاعت و تقدس کے زرات کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں لیکن تارہ گڈھ کا قدیم قلعہ ایک اختصاصی حیثیت رکھتا ہے تارہ گڈھ کے قلعہ کو دیکھکر یہ واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے کہ ۱۲۱۰ء میں تارہ گڈھ کی مشہور بغاوت میں راجپوتوں کے ایک منظم گروہ نے مسلمانوں کو بارہ بارہ کر دیا اس حملہ میں ایک مسلمان متنفس بھی زندہ نہ بچ سکا۔ یہ قلعہ اجمیر شریف کے اوپر سے اور چاروں طرف سے معلوم ہوتا ہے کہ چھایا ہوا ہے اس قلعہ کو چوہان فرمانرواؤں نے اپنے ابتدائی عہد حکومت میں تعمیر کیا تھا اسکی وضع و قطع بہت ہی خوفناک ہے لیکن قلعہ کے اندر ایک دلفریب و خوبصورت سفید مسجد بنی ہوئی ہے جسکو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس عمارت کو دور وسطیٰ سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی مسجد کے قریب ایک مزار ہے جس میں سید حسین گو زیر تارہ گڈھ کی قبر ہے اس مزار کی آجکل بہت توقیر و منزلت کیجاتی ہے اور سید حسین کو بالعموم ایک برگزیدہ مرد تصور کرتے ہیں۔

جیسے ہی کوئی سیاح تارہ گڈھ پر جانیکا ارادہ کرتا ہے تو ایک موکل دروازہ پر ملتا ہے جو غیر مسلمین کے سروں پر عمامہ اور پیروں میں گھٹیلا نہ پہنے کیلئے پیش کرتا ہے اور جب سیاح اسطرح پر مسلمان صورت ہو جاتا ہے اسوقت وکیل (گائیڈ) تارہ گڈھ کا چپہ چپہ دکھلاتا ہے اکثر فرنگی سیاح اسکو دیکھنے جایا کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ تارہ گڈھ کی زمین سے مسلمانوں کے خون کی بو اب بھی آتی ہے بغاوت کے بعد مدتوں تک مسلمانوں اور ہندوؤں (راجپوتوں) میں اس قلعہ کے متعلق لڑائیاں ہوئیں اور ہر فریق اس قلعہ کو اپنا جایز حق تصور کرتے قبضہ کرنے کا ارادہ کرتا لیکن کامیابی نہ ہو گی۔ لیکن سترہویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشرہ میں مغلیہ حکومت کے عہد میں اس قدیم بغاوت کی یاد تازہ کی گئی اور اسوقت سے یہ قلعہ مسلمانوں کے قبضہ اقتدار میں آیا سید حسین کا مقبرہ ۱۶۲۳ء میں تعمیر کیا گیا اور اوسی وقت سے ہندو و مسلمان دونوں اس مزار کی قدر و منزلت بھی کرنے لگے اور دونوں سید حسین کی واجب التعظیم شہید جانتے ہیں ہزارہا سیاح جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے فلک اشتباہ بارگاہ پر حاضری دیتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس قلعہ کو نہ دیکھتا ہو۔ اب عام طور سے یہ قلعہ سید صاحب تارہ گڈھی کے مزار کے نام سے مشہور ہے اجمیر شریف کی طرح یہاں بھی بڑی بڑی دیگیں چڑھی ہوتی ہیں جن میں عقیدت مند افراد اپنی مرادوں کے بر آنے کے بعد کھانا پکوا کر غربا و مساکین کو تقسیم کرتے ہیں اس میں کسی مذہب کی تخصیص نہیں ہے۔ میں نے خود ہزارہا ہندوؤں و مسلمانوں کو بہ یک وقت اپنی مرادوں کے پورے ہونے کے بعد اس قسم کی دعوت کا انتظام کرتے ہوئے دیکھا ہے حقیقی طور سے ہندو مسلم اتحاد کا نظارہ اجمیر شریف و تارہ گڈھ میں نظر آتا ہے۔

سید شہید کے مزار کی مذہبی تقدس کے علاوہ اس قلعہ کی آثار صنادید کے لحاظ سے بہت قدر و منزلت کی جاتی ہے کیونکہ راجپوتانہ میں ارکیالاجیکل حیثیت یہ قلعہ دوسرے نمبر پر ہے سرنگوں اور محلوں میں چوہان خاندان کی جنگی یادگاریں اب تک دنیا کو محو حیرت بنانے کے لئے کافی ہیں۔

قلعہ کے وادی میں ایک چشمہ نور چشمہ کے نام سے جاری ہے دور وسطیٰ کے ماہرین فن کا خیال تھا کہ انجینیری کا ابھی نمونہ پیش کیا جاتے اور اس چشمہ کے ذریعہ سے قلعہ پر پانی پہنچایا جائے لیکن افسوس ہے کہ یہ اسکیم مکمل نہ ہو سکی ورنہ آج دنیا میں بھی یہ زندہ عجائبات میں تصور کی جاتی قلعہ بہ قدر محفوظ تھا کہ سنا ہے لارڈ ولیم بینٹنک نے ۱۸۳۲ء میں اسکو منہدم کرنیکا حکم صادر کیا تھا اس قلعہ پر ایک تاریخی مضمون ٹائمس آف انڈیا میں شایع ہو چکا ہے۔

(خاص)

تیج

زندگی کا مقصد

(جناب لالہ رام لال ورما، ایڈیٹر "تیج" دہلی)

انگریزی میں ایک مقولہ ہے

مطلب۔ کھاؤ، پیو اور خوش رہو۔ گویا زندگی کا مقصد کھانا پینا اور خوش رہنا ہے میرا خیال ہے کہ کسی دانا انسان نے زندگی کا مقصد اس طرح واضح کرکے بنی نوع انسان کی کوئی خدمت نہیں کی ہے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ انسانی مفاد کو الٹا نقصان پہنچا یا ہو۔ اگر زندگی کا مدعا کھانا پینا اور خوش رہنا ہے تو بلاشبہ دنیا میں تقریباً ہر قوم و ہر ملک کے لوگوں کو زندگی کا یہ مقصد حاصل ہے۔ ایسی حالت میں یہ ایک معمہ معلوم ہوگا کہ زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد حاصل ہوجانے کے باوجود دنیا کے ایک بڑے انسانی طبقہ کو وہ اطمینان و سکون حاصل نہیں ہے جو زندگی کا مقصد حاصل ہوجانے کے بعد انھیں نصیب ہونا چاہئے برعکس دنیا میں بے چینی و اضطراب۔ بدامنی انتشار زیادہ نظر آتا ہے۔ لوگ امن و سکون کی ہر چند جستجو کرتے ہیں مگر انھیں امن و سکون نہیں ملتا۔ اور ملے بھی تو کہاں سے۔ جب انھوں نے زندگی کا مطلب ہی نہیں سمجھا ہے۔ زندگی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی تعریف الفاظ میں کی جاسکے۔ زندگی صحیح معنوں میں محض ایک عمل ہے جسے ہم سب شب و روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ موت بھی زندگی کا ہی ایک پہلو ہے۔ بسا اوقات موت ہی زندگی کا موجب بنتی ہے۔ یا یوں کہو کہ موت سے ہی زندگی برآمد ہوتی ہے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بعض مشاہیر کا نام نا معلوم زمانہ سے بڑی عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ لوگ اپنے دلوں کے اندر اور بیرونی مظاہرات کے ذریعہ بھی ان کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ مشاہیر کون تھے۔ ہماری طرح ذی روح انسان۔ مگر ہم میں سے بہت سے روز پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ کوئی پرسان بھی نہیں ہوتا کہ کون آیا اور کون گیا۔ دنیا کے بڑے لوگوں کی زندگی اکثر محض کلفت و مصیبت میں ہی کٹتی ہے۔ بلکہ انھیں بڑائی نصیب ہی اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی زندگی کو قربان کردیتے ہیں جسے کھانا پینا اور خوش رہنا کہتے ہیں وہ انھیں خواب میں بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس معمولی انسانوں کو کھانے پینے اور خوش رہنے کی جملہ سہولت حاصل ہیں ہم دریافت کرتے ہیں کہ ان دونوں میں سے حقیقی زندگی اور اس کا مقصد کسے حاصل ہوا۔ یہی کہا جائیگا کہ اُسے جس نے راحت و آرام کے بجائے رنج و مصیبت میں کسی بڑے کار کے لئے اپنی زندگی وقف کی۔ پس ظاہر ہوا کہ کھانا پینا اور خوش رہنا زندگی کا مقصد نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ بات ہے تو دریافت کیا جاسکتا ہے کہ دنیا میں کھانے پینے اور خوش رہنے کو اس قدر غیر معمولی اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔ اس کا جواب صاف ہے۔ کھانا پینا اور خوش رہنا زندگی کا ذریعہ ہے۔ مقصد اور ذریعہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہی فرق کھانے پینے اور خوش رہنے کی اہمیت بلاشبہ بہت زیادہ ہے۔ مگر اسی حد تک کہ زندگی کا عمل جاری رہ سکے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے۔ زندگی میرے خیال میں بجائے خود اپنا مقصد ہے۔ انسانی زندگی کا بہترین مقصد یہی ہے کہ وہ زندہ رہے اور اپنی زندگی کو قائم و برقرار رکھے۔ ہندو دھرم میں موکش اسلام میں نجات اور مسیحی مذہب میں (Salnatian) کو زندگی کا آخری مدعا مانا گیا ہے۔ تینوں الفاظ کے معنی ایک ہی ہیں۔ ہندو دھرم میں عام طور پر موکش کا یہی مفہوم لیا جاتا ہے کہ آواگون یعنی بار بار پیدا ہونے اور مرنے سے چھٹکارا پانا۔ میں مذہبی عقائد پر فلسفیانہ یا عالمانہ بحث کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور نہ ہی ایسا کرنا میرا مقصد ہے۔ میرا مقصود صرف یہ واضح کرنا ہے کہ دینی یا دنیوی طور پر زندگی کے بالعموم جو مقصد سمجھا جاتا ہے وہ ہماری عملی زندگی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچاتا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ موکش موت کے بعد ہی مل سکتی ہے۔ زندگی میں نہیں گویا زندگی ختم کر کے زندگی کا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے ہم واقف کرتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ انسان موکش کی تلاش میں اپنی زندگی کو کھودے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ زندگی میں ہی موکش پراپت کرے میری ناقص رائے میں موکش زندگی سے نجات کا نام نہیں۔ بلکہ حقیقی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ وہ لوگ غلطی پر ہیں جو زندگی سے نفرت و حقارت کا سلوک کرتے ہیں اور موت میں موکش کا راز تلاش کرتے ہیں۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی اپنا مقصد آپ ہے وہ زندگی سے نفرت نہیں کرتے۔ وہ زندگی سے چھٹکارا پانے کی خواہش نہیں کرتے وہ اپنی زندگی کو حقیقی زندگی بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ رام و کرشن کو اس لئے حیات جاودانی نصیب نہیں ہوئی ان کا نام آج اس لئے زندہ نہیں ہے کہ انھوں نے کسی ایسی نادیدنی و نامعلوم شے کی تلاش میں جسے موکش کہتے ہیں اپنی جان دی تھی ان کا نام اس لئے زندہ ہے اور تا ابد زندہ رہے گا کہ انھوں نے زندگی کے حقیقی معنی کو سمجھا۔ انھوں نے زندگی کی اہمیت کو سمجھا اور انھوں نے اپنی زندگی کو مکمل بنایا۔ رام کرشن پر ہی کچھ موقوف نہیں۔ دنیا کے تمام مشاہیر کا طریق عمل یہی رہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ موجودہ زمانہ کی اس عظیم ترین ہستی مہاتما گاندھی کو جو ابھی ہمارے درمیان موجود ہے زندگی میں ہی موکش حاصل نہیں ہے خود غرضی سے بالاتر تعیش پسندی سے پرے تیاگ و قربانی کا مجسمہ مکر و فریب کا دشمن حق و صداقت کا دوست۔ اگر ایسے شخص کی زندگی کا نام ہی موکش نہیں تو میں کہونگا کہ موکش کوئی بڑی مشکوک شے ہے جس کی فکر میں اپنی زندگی کو گھلا دینا کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے مہاتما گاندھی نے کھانے پینے اور خوش رہنے کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بنایا بلکہ زندگی کا محض ایک ذریعہ سمجھا۔ انھوں نے موکش یا حیات جاودانی کی تلاش میں زندگی سے نفرت و حقارت کا سلوک بھی نہیں کیا اور نہ ہی اس سے چھٹکارا پانے کی سعی کی۔ ان کی زندگی پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ ان کی زندگی عمل کا ایک وسیع میدان ہے اسی عمل نے ان کی زندگی کو مکمل مفید سبق آموز اور حقیقی زندگی بنایا۔ بلاشبہ وہ اپنی زندگی کو قربان کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ زندگی کو ایک وبال یا موکش کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ زندگی کی قدر و اہمیت اور اُسے قائم و برقرار رکھنے کی قیمت سے واقف ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ زندگی کو حقیقی زندگی بنانے کیلئے بسا اوقات زندگی کو قربان کرنا پڑتا ہے۔

میرا خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ ہے کہ اگر لوگ (میرا مطلب ہندوستانیوں سے ہی نہیں ہے کیونکہ موکش کا مسئلہ سب سے زیادہ انہیں کو پریشان کرتا ہے) یہ محسوس کرلیں کہ موکش حقیقی زندگی کا ہی دوسرا نام ہے۔ زندگی اپنا مقصد آپ ہے۔ اور کہ زندگی عمل کا دوسرا نام ہے تو وہ زندگی سے نفرت کرنے یا اُسے لاپرواہی و بے سود کاری سے لاحاصل باتوں میں گذارنے کے بجائے زندگی کی قدر و منزلت سمجھ سکتے ہیں جو شخص زندگی کی قدر و منزلت سے واقف ہے وہی اُسے مکمل مفید و کامیاب بنانے کی صحیح کوشش بھی کر سکتا ہے موکش کے طلبگاروں کو یہ سمجھنے کی ازلیس ضرورت ہے کہ موکش مکمل زندگی ہی کا نام ہے اور مکمل زندگی زبانی دماغی عبادت سے نہیں بلکہ عمل سے نصیب ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مغربی خاتون نے ہندوستان کی سیاحت کے بعد ایک نمائندہ اخبار سے ہندوستانیوں کو ان الفاظ میں اپنا الوداعی پیغام دیا تھا!

"کام زیادہ کرو۔ عبادت کم بس یہی موکش کا راز ہے یہی زندگی اور یہی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ کاش کہ لوگ ان سادہ الفاظ کے معنی و مفہوم کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں"۔

(خاص)

بام اوج

(جناب ٹھاکر جگن سنگھ سب ایڈیٹر روزانہ تیج دہلی)

انگلستان کا مشہور فسانہ نویس سر والٹر سکاٹ بلا کا ان تھک اور پرلے درجہ کا محنتی شخص گذرا ہے وہ اپنے بیٹے چارلس کو جو ایک مدرسہ میں پڑھتا تھا ایک خط میں ان الفاظ میں بیش قیمت نصیحت کرتا ہے "بیٹیا" ہم خواہ زندگی کے کسی طبقہ یا حالت میں ہوں محنت ہی ایک ایسی شرط ہے جو ایشور نے ہم سب کے لئے لازم کر رکھی ہے میں اس بات کو تمہارے ذہن نشین کرنیکے لئے جس قدر زیادہ کوشش کروں اتنا ہی کم ہے۔ یاد رکھو کہ زندگی میں کوئی قیمتی اور قابل قدر چیز ایسی نہیں جو محنت کئے بغیر حاصل ہو سکے۔ دل کی زرخیز زمین میں محنت کئے بغیر علم کا پودا لگانے کا خیال کرنا ایسا ہی نکما اور بیہودہ ہے جیسا کہ ہل چلانے کے بغیر اناج کے کھیت کو کاٹنے کی توقع رکھنا۔

عزیز۔ جو کام کر دل کی ساری قوت ادھر لگا دے۔ وہ کام تیری موت اور زندگی کا سوال بن جائے۔ اگر تجھے جبر و مقابلہ نہیں آتے تو اپنے دل کی تہ میں گھس کر اس سے پوچھ وہ تجھے بہت واضح جواب دیگا اور مجھے بتلا دیگا کہ نہ تو ان کے سیکھنے کے لئے تیری زبردست خواہش ہے اور نہ ہی تو نے اس طرف مضبوط توجہ دی ہے۔ مجال کیا کہ انسان کسی بات کی خواہش کرے اور وہ پوری نہ ہو جائے۔

پس بیٹیا تو تحصیل کمالات اور کسب فضائل میں اپنی تمام قوت ارادی لگا کر محنت کر اور اپنے قیمتی وقت سے فائدہ اٹھا۔ عالم جوانی کو غنیمت سمجھ اگر تو اپنی جوانی کو جو زندگی کی نوبہار ہے یوں ہی ضائع کر دے گا تو عمر کا دلربا گلشن لق و دق جنگل سے زیادہ وحشتناک اور بدتر نظر آئے گا۔

انگلستان کے مشہور و معروف پہلوان مسٹر ہنڈو نے اپنی ایک کتاب میں تحریر کیا ہے کہ انسان محض ورزش کرنے سے طاقتور نہیں ہوتا بلکہ اس خیال سے ہوتا ہے کہ وہ ورزش کرتے وقت اپنے دل میں اس بات کا مضبوط یقین کرلے کہ وہ ورزش کرنے سے طاقتور ہو رہا ہے۔ اگر محض ورزش کرنے سے ہی آدمی طاقتور ہو سکتا تو سڑکوں پر کام کرنے والے مزدور سب سے بڑھ کر طاقتور ہوتے۔

مذکورہ بالا مثالوں سے معلوم ہوا کہ خیال کی طاقت بہت زبردست ہے اور بام اوج تک پہنچنے کے لئے اس طاقت کا موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر کسی شخص کو اپنے خیال اپنے دل اور اپنے ارادہ پر کامل یقین نہیں تو سمجھ لو کہ وہ زندگی کی دوڑ

میں پیچھے رہ جائے گا اور دنیا اس کو اپنے پاؤں کا فٹ بال بنا دے گی اگر ایک شخص نے اپنی قوت ارادی کو زبردست بنا لیا ہے تو اگر وہ تندرستی کا خواہاں ہوگا تو محض اپنے ارادے سے دنیا کی تندرستی کے ذرات کھینچ کھینچ کر جزو بدن بنا کر پہلوان ہو جائے گا۔ اگر وہ دولت کا خواہش مند ہے تو محض خیال کی دوڑ سے خزانہ کو کھینچتا ہوا اپنے پاؤں تلے لا کر ڈال لیگا۔ اگر وہ عزت و رسوخ کی جانب متوجہ ہوگا تو قانون خیال کے زیر اثر اپنے اندر ایسی حالت پیدا کرے گا کہ دنیا اس کی عزت کرے اور اس کے پاؤں پڑنے کے لئے مجبور ہو۔ نپولین بونا پارٹ کی تصویر کو جن لوگوں نے دیکھا ہے ان کو معلوم ہوگا کہ وہ لنبا ہڈیوں کا ایک پنجر نظر آتا ہے لیکن اس نے اپنی قوت ارادی کے ذریعہ وہ کمالات کر دکھائے کہ اس کی ہمت و مردانگی کا لوہا تمام دنیا جان گئی۔ اصل طاقت خیالات کی مضبوطی میں ہے جس وقت خیال کی طاقت بڑھ گئی۔ پھر انسان شیر کے جبڑے پکڑ کر پھاڑ ڈالنے کی ہمت کر سکتا ہے یہی ایک چیز بام اوج کی پہلی منزل ہے

ایک مریض کو جلاب کی گولی دے دیجئے اور اس کو کہہ دیجئے کہ گولی قابض ہے اگر اس مریض نے اس کے قابض ہونے کو دل میں جگہ دیدی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کو دست نہیں آتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی پاتا ہے لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ جو جیسا چاہتا ہے ویسا پا لیتا ہے کیونکہ چاہنا بھی ایک قسم کا فعل ہے۔

جو لوگ دنیا میں باعزت اور معزز ہیں کیا تم سمجھتے ہو کہ شروع سے ہی ایشور نے ان کو معزز پیدا کیا ہے۔ نہیں انھوں نے معزز بننے کی کوشش کی اور اپنے دل کی تمام قوتوں کو اس طرف لگا دیا اور وقت آیا جبکہ دنیا اس کے قدم چومنے کے لئے مجبور ہو گئی۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ تم جو چاہتے ہو وہی بن جاتے ہو۔ یہ لفظ بلفظ صحیح ہے لیکن ہر شخص کو کامیابی نصیب کیوں نہیں ہوتی اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ زبانی تو کسی چیز کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنے دل و دماغ کی تمام طاقتوں کو اس جانب رجوع نہیں کرتے اگر ہماری خواہش زبردست ہو تو جس طرح گنے کا پودا زمین سے مٹھاس کے ذرات کھینچ کر اپنے اندر ملا لیتا ہے اسی طرح اگر ہم چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ مسیح نے کہا کہ مانگو اور تم کو ملے گا کھٹکھٹاؤ اور تمہارے لئے دروازہ کھولا جائیگا۔ اگر ہم دنیا آ کر کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتے تو یہ ہمارا قصور ہے تم ایک ہاتھ پھیلاؤ ایشور تم کو ہزار ہاتھوں سے دینا چاہے گا۔ لیکن اس بات کا دل میں یقین کر لو کہ ایشور ان کی ہی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتا ہے۔

دل میں کسی بات کی خواہش کا پیدا کرنا در اصل ترقی کا بیج بونا ہے جس وقت خیال پکتے پکتے مضبوط ہو جاتا ہے تو پھر اظہار کے لئے راہ نکالنے کی خواہش مند ہوتا ہے اور آخر اس کی تکمیل کر لیتا ہے یہ ایک اٹل قانون ہے کہ ہم محض مرکز بن کر اپنی زبردست کشش سے جس چیز کو چاہیں کھینچ کر لا سکتے ہیں ایشور عالم ہے اور نہ وہ بڑا فیاض ہے اس کی بخشش کا ہاتھ ہر وقت کھلا رہتا ہے اگر ہم کو اس کے عطیات میسر نہیں ہیں تو یہ اس کا نہیں بلکہ ہمارا اپنا قصور ہے جاہ و حشمت کی دیوی مسکراتی ہوئی تمام سامان لئے ہوئے کھڑی ہے لیکن تم اس کو اس حالت میں ہی حاصل کر سکتے ہو۔ جبکہ ہمارے اندر زبردست خواہش موجود ہو اور اپنے دل و دماغ کی تمام قوتیں اس پر صرف کر دو۔

اگر آج ہماری زندگی شاندار نہیں ہے تو مت گھبراؤ۔ ہمت سے کام لو۔ اور اپنی قوت ارادی کو مضبوط کر لو۔ اپنے مقصد کی تکمیل میں لگ جاؤ کل تم دنیا میں ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے نظر آؤ گے۔ تم جو آج دکھی ہو کچھ پرواہ نہ کرو اپنے دل کی قوت جانو اور سمجھ بوجھ کر کام میں لاؤ۔ تمہارا دکھ درد کل ہی دور ہو جائیگا۔ بام اوج پر پہنچنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے مقصد کی تکمیل میں سرگرمی کے ساتھ مصروف ہو جائیں۔ اور اس اصول کو دل میں مضبوطی سے جگہ دیں کہ خدا انھیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی آپ مدد کرتے ہیں۔

(خاص)

جام جہاں نما

سکوت شب

[مولینا سید آفقر موہانی وارثی مینجنگ ایڈیٹر رسالہ جام جہاں نما لکھنؤ]

(۱)

ہم کیا بتائیں کیا ہیں بیچینیاں ہماری
جینے نہ دیگی ہمکو آہ و فغاں ہماری
سوئی ہوئی ہے دنیا کھویا ہوا ہے عالم
اب کون ہے جو دیکھے بیداریاں ہماری
پرساں نہیں ہے کوئی روئے زمیں پر اپنا
فریاد تو ہی سُن لے اے آسماں ہماری
تو دیکھتا ہے ہمکو ہم دیکھتے ہیں تجکو
بِللّٰہ سُن لے ہم سے اب داستاں ہماری
تجکو دکھا رہی ہیں نیرنگیوں کا منظر
خوش خوابیاں کسی کی بیداریاں ہماری
بگڑا ہوا ہے نقشہ بدلا ہوا زمانہ
ہمکو ستا رہی ہے جائے اماں ہماری
ظلمت نصیبیوں نے روئے سحر چھپایا
مجبور زندگی ہے عمر رواں ہماری
مونس نہیں ہے کوئی ہمدم نہیں ہے اپنا
ہاں اے "سکوت شب" کر دلداریاں ہماری
خاموش ہم بھی ہیں یاں ساکت ہے تو بھی اسدم
دونوں کا اک روش پر ٹھہرا ہوا ہے عالم

(۲)

جاگے نصیب اپنے دیکھی جو تیری صورت
تجکو بنائیں گے اب اپنا رفیق صحبت
حسرت نصیبیوں نے دل کی ہمیں بنایا
محروم صبح عشرت محکوم شام فرقت
جوش جنوں نے بخشے کیا کیا خطاب ہمکو
گم کردۂ طریقت آوارۂ محبت
محو سکوت ہم بھی تیری طرح ہیں اے شب
کرتے ہیں دل سے لیکن تیری بیان عظمت
تاریکیوں میں تیری پنہاں ہے ساز ہستی
خاموشیوں میں تیری روپوش ہے قیامت
حُسن سواد تیرا آشوب چشم لیلےٰ
زلف سیاہ تیری مجنوں کے دل کی وحشت
وسعت سے تیری عاجز تفسیر روز محشر
رفعت سے پشت تیری ہے عرصۂ قیامت
پردہ میں تیرے پنہاں اسرار کس سپرسی
ظلمت سے تیری ظاہر آثار دشت غربت
قدرت بنا چکی جب عبرت کا تجکو منظر
فطرت نے خود لگائی مُہر سکوت لب پر

(۳)

ہاں اے "سکوت شب" سن عرض نیازِ عالم
ہر اک گھڑی ہے تیری رازِ جہاں کی محرم
تو نے کرم سے اپنے مُنہ مجرموں کا ڈھانکا
اے رازدارِ دُنیا اے پردہ پوشِ عالم
ظاہر کیا نہ تو نے قاتل کو کہہ سکے قاتل
مقتول کا کیا گو ظلمت کدہ میں ماتم
تو نے زباں سے اپنی کچھ بھی کہا نہ لیکن
کرتا رہا زمانہ ہر چند جور پیہم
مانگی پناہ جس نے تو نے اوسے بچایا
اہلِ نشاط ہو یا کوئی ہو صاحبِ غم
ہے تیرے ہاتھ عزت دنیائے آرزو کی
ناکامیوں پہ دل کی ہے تیری چشم پُرنم
جنکا نہیں ہے کوئی غمخوار بیکسی میں
مایوسیوں میں اونکی تو ہے انیس و ہمدم
القصہ ذکر تیرا حکمت کی داستاں ہے
تیری کہانیاں ہیں وجہِ سکونِ عالم
پاتے ہیں اہلِ بینش درسِ فراغ تجھسے
افقر کا دل ہمیشہ ہے باغ باغ تجھسے

(خاص)

غزل

[جناب محمد اسحاق صاحب رہبر رکن ادارۂ رسالۂ جام جہاں نما لکھنؤ]

کہاں تک آرزوے دید میں اہلِ نظر جاتے
تو کیا کرتا جو راہِ شوق میں تیری نہ مرجاتے
اشاروں پر ترے عمرِ رواں کو ختم کر جاتے
ہمیں تجھے اپنی ہستی سے جو جیتے جی گذر جاتے

یہ جھگڑا ابھی کوئی جھگڑا ہے یہ ضد بھی کوئی ضد ہے
نہ جاتے شب بخیر اسوقت تم وقتِ سحر جاتے
مرے نالوں کی تاثیریں کسی نے چھین لیں جیسے
کہ دل سے پُر اثر آتے زباں سے بے اثر جاتے
کہا تھا کب یہ تم نے ہم نہیں پابند وعدہ کے
نہ جاتے غیر کے گھر ہم مگر اس بات پر جاتے
اگر مایوس ہو کر چارہ گر اُٹھے تھے اُٹھے تھے
مری بالیں سے لیکن تم نہ یوں مُنہ پھیر کر جاتے
اشاروں پر ترے قائم صفیں تھیں اہلِ محشر کی
اِدھر مجمع سمٹ آتا ترے ناوک جدھر جاتے
وہی آخر ہوا رہبر کہ بھولے راہ ناصح بھی
انھیں لازم تھا سوئے بتکدہ دل تھام کر جاتے

(خاص)

مناظرِ فطرت

[جناب مرزا جمیل بیگ صاحب منتظر لکھنوی رکن ارادت رسالۂ جام جہاں نما لکھنؤ]

پہلے اے قاتل مرے ذوقِ نیازِ سر کو دیکھ
پھر جو دیکھا جائے تو آبِ دمِ خنجر کو دیکھ
میں نہیں کہتا مرے حالِ دلِ مضطر کو دیکھ
تو مگر اپنے ذرا بدلے ہوئے تیور کو دیکھ
کھینچنے والے خدا کے واسطے جلدی نہ کر
تیر سے پہلے ذرا میرے دلِ مضطر کو دیکھ

گر پڑے ساقی کے قدموں پر دفورِ شوق میں
ایسے بیخود ہو گئے ہم شیشہ و ساغر کو دیکھ

تم تو کہتے تھے نہیں ہم قائل دردِ دروں
کیوں بھر آیا دل تمہارا میری چشمِ تر کو دیکھ

خاکسارانِ جہاں کو دیکھ کر کہنا پڑا
ذرہ ذرہ میں شعاعِ خسروِ خاور کو دیکھ

وائے ناکامی کہ چھوٹے بھی قفس سے ہم تو کیا
ہو گئے مجبور اپنے بازوے بے پر کو دیکھ

وحشیوں کی اپنے دیکھیں آپ شوریدہ سری
دوڑتے ہیں دور ہی سے دشت میں پتھر کو دیکھ

کھنچ رہی ہیں اب طنابیں آفتابِ حشر کی
منکرِ روزِ قیامت عرصۂ محشر کو دیکھ

پھر اُٹھایا سر نہ سنگِ آستانِ یار سے
ہم سبکسر ہو گئے سجدہ میں اپنے سر کو دیکھ

رسم منزل اور ہے رسم سفر کچھ اور ہے
راہ کو کیا دیکھتا ہے بے خبر رہبر کو دیکھ

دیکھنے والے کہاں ہیں آخری دیدار کے
بند آنکھیں کر لے میرے نزع کے منظر کو دیکھ

جس کو دعویٰ ہو سخنگوئی کا منظر دیکھ لے
اس طرح کہتے غزل ہیں اہلِ دل دلبر کو دیکھ

(خاص)

ادب اُردو

[جناب محفوظ الحسن رکن ادارہ جام جہاں نما لکھنؤ]

ایک مدت سے اہلِ زبان اور زباندان کا مسئلہ ادبی مضامین زیرِ بحث ہے مگر آج تک اسکا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا کہ پالا کس کے ہاتھ رہا۔ دہلی اور لکھنؤ کی مرکزیت مٹانے والے افراد آج بھی کافی تعداد میں اپنی ہٹ دھرمی پر تلے ہیں کہ اب کسی مرکز کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کا ہر شخص اہلِ زبان اور ہر مقام قصر الادب ہے۔ اسکے لئے نہ دہلی کا سرٹیفکٹ درکار ہے نہ لکھنؤ کی سند کی ضرورت۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ مدعیانِ ادب ہیں کتنے پانی میں جب اُنکی اخلاقی۔ ادبی اور اصطلاحی اہلیت و قابلیت کا اندازہ کیا جاتا ہے تو ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ع

زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

وہ وہ الفاظ اور محاورے سننے میں آتے ہیں کہ الامان۔ اُنکا اجتہاد۔ اختراع۔ اور ذوقِ ادب لکھنؤ اور دہلی سے ایک جداگانہ وضعی نوعیت رکھتا ہے۔ جسکو نہ اُردو زبان سے واسطہ نہ اُردو ادب سے تعلق۔ ایسی ناہموار اور ناموزوں حالت میں ہندوستان بھر کو اُردو کا مرکز سمجھ لینا یقینی زبان اور ادب پر اُلٹی چھری پھیرنا ہے۔

آج ہندوستان میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شاعری اولیت کا مرتبہ رکھتی ہے اور وہ ہندوستان کے واحد شاعر مانے جاتے ہیں مگر جسقدر عبور اور اہمیت اُنکی تخئیل کو ہے کیا وہی مرتبہ اُنکی زبان اور محاوروں کو بھی حاصل ہے ہرگز نہیں اون کے کلام میں زبان اور محاورات کی جسقدر صریحی غلطیاں ہوتی ہیں شاید ہی کسی نومشق کے کلام میں ہوتی ہوں بشرطیکہ وہ دہلی یا لکھنؤ کا باشندہ ہو۔ اور یہ مسلمہ ہے جسکا اقبال خود مسٹر اقبال نے ایک سے زائد مرتبہ کیا ہے اونکو نہ اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ ہے نہ زباندانی

پر غزہ۔ اور یہی وجہ ہے کہ اونکو لکھنؤ یا دہلی میں شاعر نہیں مانا گیا۔ پس ظاہر ہے کہ آج ڈاکٹر اقبال کے مقابل کون علم بردار شعر و سخن مدعی زبان ہو سکتا ہے اور اس صورت میں کہ وہ دونوں مرکزی مقامات سے دور افتادہ ہو۔

کیا قیامت ہے کہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ لکھنؤ اور دہلی کا صدقہ ہے وہیں کے اوستادوں کی جوتیاں سیدھی کرنے اور اونکی چلمیں بھرنے کا یہ ادنیٰ فیض ہے کہ ہم آج غوں غاں کر لیتے ہیں مگر کسقدر ناانصافی اور ہٹ دھرمی ہے کہ اونھیں مرکزوں کو مٹایا جا رہا ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو تختۂ مشق بنا کر بجائے خود علم اوستادی بلند کیا جاتا ہے حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ ؎

نہیں داغ آسان یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

پنجاب نے غیر معمولی ترقی کی دکن کا دوسرا نمبر ہے کہ اردو زبان میں کافی سے زیادہ انہماک و سعی کر رہا ہے۔ آگرہ۔ میرٹھ۔ وغیرہ بھی خوشہ چینی سے باز نہیں رہے۔ مگر ان تمام مقلد مقامات کی ایک حد ہونی چاہئے۔ دہلی اور لکھنؤ کی مرکزیت کے باوجود آج بھی وہاں ادب اُردو کا ایک معیار ہے۔ زبان کے اصول ہیں۔ محاوروں کی حد ہے۔ اس صورت میں جو کچھ بھی طبع آزمائی ہوتی ہے وہ اصولاً غلط اور قابل ملامت نہیں ہو سکتی مگر دوسرے مقامات میں کوئی اصول موجود نہیں۔ اجتہاد ہے تو بے پناہ۔ طباعی ہے تو بے پایاں۔ نہ زبان کی قید ہے نہ قواعد کی پابندی۔ ایک جگہ اگر دکنا نا۔ کھانا۔ پینا۔ وغیرہ مصادر محض آخر میں نا کی تخصیص سے جائز اور جاری کر دئے گئے۔ تو دوسری جگہ "ہمت مشرح بیان رکھدی" نہایت چمکدار جوہر تسلیم کر لیا گیا۔ گنگا پار والوں نے اگر اوسط درجہ کے علمی لوگوں نے کا جملہ تراش کر اُردوے معلیٰ بنائی تو جمنا پاریوں نے:۔

(۱) مشاعرہ پڑھوالو۔ (یعنی مشاعرہ کردو)
(۲) کیا مصرعہ دیا ہے۔ (کیا خوب مصرعہ لگایا ہے)
(۳) کیا کہنے ہیں۔ (کیا کہنا ہے)
(۴) محبت کی فاتحہ۔ { محبت کا فاتحہ۔
عشق کی مزار۔ { عشق کا مزار۔
(۵) گُنیاں کی یادیں۔ (سیلی یا سکھی کی یادیں)
(۶) سورج کے اوجالوں میں۔ (سورج کی روشنی یا سورج کے اوجالے میں)۔
(۷) برق پاش۔ تبسم ریز۔ سنسی خیز۔ شعریت بدوش۔ سجدہ ریز۔ وغیرہ وغیرہ طلسمی اجتہادات سے قصر الادب کی بنیاد ڈالدی۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کونسی اردو ہوئی جسکی نظیر نہ کبھی تھی نہ اب ہو سکتی ہے۔ فارسی تراکیب کا اجتہادی ٹھیکہ آپ نے کس سے اور کب لیا اور یہ حق آپ کو کہاں سے حاصل ہو گیا جو فارس کے اہل زبان اساتذہ کو بھی اونکی عمر میں نہ تھا فردوسی سے لیکر جامی۔ اور خسرو تک کی تمام کائنات دیکھ جائے مگر کہیں نہ برق پاشی نظر آئیگی نہ تبسم ریزی۔ نہ شعریت بدوش لہریں دکھائی دینگی نہ سجدہ ریزی کی کیفیت۔

اب غور کیجئے کہ یہ اختراع اجتہاد اُردو زبان کو کہاں سے

کہاں پہنچا رہا ہے۔ اور اس طرح اردو کی خدمات اور ادب کی
اصلاحات بجائے مفید ثابت ہونے کے کس درجہ مسموم
وضرر رساں ہیں۔

اس عام ہر بونگ کی صرف ایک وجہ ہے جو اوپر
بیان کی جا چکی ہے یعنی کسی اصول معیار کا نہ قائم کیا جانا
اور غیر محدود وبے قواعد ہذیان کا نام زبان رکھ لینا۔ ایسے
منہ زور اور بیباک آزاد رو اہل زبان کے لئے حقیقتاً
نہایت سخت گیر خاردار لگام کی ضرورت ہے جسکا نفاذ
جلد سے جلد ہونا چاہیئے ورنہ یہ اپنی دریدہ دہنی سے اُردو
زبان کو یقیناً بلوچی اور پشتو زبان کی مترادف بنادیں گے۔
اور بعد کو جسکا دفعیہ نہ صرف محال بلکہ ناممکن ہوگا۔ ہمیں
افسوس ہے کہ اسوقت ملک کے ذمہ دار حضرات جنکے قلم
اور زبان کی جنبش سے اُردو ادب کی صحیح طور پر اصلاح
ہوسکتی ہے اور آج کے دن زبان اور محاورے اون کے
خداداد خزانہ ہیں کچھ اس طرح خاموش اور بے نیاز ہیں
کہ یہ خود رو طبقہ اور زیادہ جسارت پر آمادہ نظر آتا ہے
کاش وہ کبھی کبھی تو اصلاحی کروٹ لے لیا کریں تاکہ
ان مدعیان ادب نے جو کچھ پروپیگنڈے کے زور بل
پر ایک سال میں شہرت کا ذبہ حاصل کرکے زبان کے ساتھ
اجتہاد کیا ہے وہ یکدم کالعدم ہوجایا کرے اور اس طرح انکے
بنائے ہوئے قصر الادب کی بنیادیں نقش بر آب ہوجائیں
جو حقیقتاً اس سے زائد ہیں بھی نہیں۔

ان دشمنان ادب سے کون کہے کہ آج کے دن جن مرکزی
اساتذہ اور اہل زبان کی توجہات سے تم اس مرتبہ کو پہنچے
کہ قصر الادب اور باب الادب کی عمارتیں تیار کررہے ہو۔
اور جن کے تصدق اور طفیل میں مجتہد عصر بننے کے مدعی ہو
کاش اون کے بنائے ہوئے قواعد اور اصول کی پوری پوری
پابندی کرکے زبان اور ادب کی اصلاحی خدمات انجام دو۔
اور ایک انچ بھی اپنی کم مائیگی اور تنگ ظرفی سے آگے نہ بڑھو
ورنہ نہ تمہارا کوئی مستقر رہیگا نہ تم خود دنیائے ادب میں
نظر آؤ گے۔ ہماری دلی تمنا تھی اور ہے کہ اس اجتہاد لایعنی
سے زبان اُردو کو محفوظ رکھا جائے اور اُردو کو اوسکے حدود
انضباطی اور اصول وضعی کے تحت وسعت و ترقی دیجائے
جسکا کافی میدان اہل نظر کے نزدیک خالی ہے زبان اُردو
کی ترقی اور خدمات اس جدید تراش خراش اور خودساختہ
ہر بونگ کے نظر انداز کئے جانے پر بھی قواعد مقررہ کے اندر اُس سے
کہیں زائد باقاعدہ اور اصولی طور پر انجام دیجا سکتی ہیں
جس قدر آج تبسم ریزیوں اور سورج کے اوجالوں سے غلط نگاری
کا بازار گرم کیا جارہا ہے۔ میں مجبوراً پھر یہی عرض کرونگا کہ اس
عام بد مذاقی اور شورش کی حقیقی وجہ اہل ادب اور اہل زبان
حضرات کی خاموشی اور غفلت ہے۔ اونھوں نے ان بازاری
مذاق والوں کی پشتو :-

(۱) دھویں پار کردئے (۲) شعر کو ڈوب دیا۔
(۳) کیا شعر چھوڑا ہے (۴) زور بل (۵) مطلع کی منزل
(۶) ریاح المجانین۔ وغیرہ وغیرہ سن سن کر اونکے مقابل
آنا اور اونکو اپنا صحیح مخاطب بنانا اپنی انتہائی ذلت اور
توہین سمجھی اور جب یہ دیکھ لیا کہ دور حاضرہ کے مشاعرے
اور جرائد و رسائل ایسے ہی بد مذاقوں کے آماجگاہ ہیں تو
اونھوں نے گوشۂ عافیت کو غنیمت سمجھا اور ایک حرف
بھی لکھنے کی قسم کھائی گو اس صورت میں اونکی جان تو

بچ گئی اور وہ ان حوادث زمانہ سے بڑی حد تک اپنے
پوزیشن کو بچالے گئے مگر غریب زبان اور ادب پران غاصبوں
کا جارحانہ قبضہ ہوگیا اور میدان صاف دیکھکر یہ لوگ
بجائے خود ملک الشعراء اور سلطان الادب بن بیٹھے۔ اب
ان کے دور حکومت میں اُردو کا جو حشر ہونا چاہیئے وہ ہو رہا ہے۔
زبان مسخ ہو رہی ہے۔ ادب نااہلیوں سے بدل رہا ہے۔
شاہی و بیگماتی ٹکسالی محاورے بازاری غنڈوں کی اصطلاحات
سے تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ "ہتھنی آتا ہے گھوڑا بھاگی"
پر آردوے معلیٰ کا اطلاق ہے۔ جس طرح شاعروں کی کمی
نہیں اوسی طرح آج کے دن نہ ایڈیٹروں کی قوم کی حد ہے
نہ ادیبوں کی پناہ۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جس فن کی کثرت ہوگی
وہ بالآخر پیشہ کی صورت اختیار کرلیگا۔ اور وہی فن ذریعہ
معاش بنجائیگا۔ آج کسی رئیس والیِ ملک امیر کبیر کے ہاں
کوئی جلسہ۔ کوئی تقریب ایسی نہیں جہاں ایڈیٹروں کی
قوم "خدا سلامت رکھے" کہنے نہ جائے۔ گو اس جماعت میں
زیادہ تر پیشہ ور افراد ہوتے ہیں مگر طبقۂ ادارت کی پوری
پوری ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے بمصداق ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد — نہ کہہ را منزلت ماند نہ مہ را

بھانڈوں۔ طوائفوں اور خنیاگروں کے طائفے شاید نہ
بھی جائیں مگر شاعروں اور ایڈیٹروں کا مجرا لازمی ہوگا۔
ان حضرات کا مجرا بھی اون کے بنائے ہوئے ادبی محل کے
مرتبہ کا ہوتا ہے ایک کو دوسرے پر رشک و حسد ہے
کہ اوسکو ڈیڑھ سو کیوں ملا ہمکو تو صرف پچیس ہی ملے۔
کاش فلاں نہ آتا تو ہمکو زائد رقم ملتی۔ فلاں کا اخبار یا
رسالہ تو دو سال سے بند ہے پھر اوسکو کیا حق ہے کہ وہ مجرا کیے۔

فلاں نالائق اور جاہل ہے ہم زبان کے واحد مالک اور بلا شرکت
غیرے ادب کے دعویدار ہیں۔ ہمارے ڈیڑھ سو شاگرد ہیں
ہم سے کون بازی لے جا سکتا ہے۔ ہمارے تین تین اخبار چل
رہے ہیں جسکو جو جی چاہیگا لکھ مارینگے فلاں کیا کرسکتا ہے۔
رئیس صاحب کی مدح و ثنا میں کالم کے کالم سیاہ کردئے ہیں
آج خدا نے وہ دن دکھایا ہے کہ ساری محنت کا صلہ مل جائیگا
اور منہ مانگی مراد پائیں گے۔ ہم تو خاص مشیر کار ہیں جب سب
درباری ایڈیٹر رخصت ہوجائیں گے اوسکے بعد ہم اپنی
معاملت کریں گے۔ اس مرتبہ کے بعد ولیعہد صاحب کے
ختنہ میں آنا ہوگا لہذا اپنا نام خاص مصاحبین میں لکھا دینا چاہیئے
کہ داشتہ آید بکار کا مصداق ہو۔ غرضکہ اس قسم کی ادب سوز
اور حیا شکن زباندرازیوں کا نام ادبی خدمات ہے اور ان خادمانِ
ادب کا نام ایڈیٹر۔ ادیب۔ شاعر۔ مدیر اعزازی۔ اہل زبان
اور زباندان ہے۔ جس ملک کی غیرت اور معاشرت کا یہ عالم ہو
وہ ملک کہاں تک زبان۔ ادب۔ لٹریچر اور شرافت کا محافظ
کہا جاسکتا ہے۔ نتیجہ معلوم۔ ادبی رسالوں کو دیکھئے ورق سیاہ
نظر آئیں گے مگر کس بحث سے صرف اپنی خودستائی زباندان۔
ہمہ گیری اور اعلیٰ قابلیت کی ناکام کوششوں اور اجتہاد سے
یا دوسروں کی مذمت۔ شماتت۔ اور غیبت سے۔ نہ کوئی
نہ کوئی ادبی مکالمہ ہے نہ اصلاحی بحث۔ نہ اصولی تنقید اور
نہ عالمانہ تبصرہ۔ اور ہو تو کیونکر جس کے لکھنے والے ایسے ایسے
قابل پیشہ ور مضامین نویس ہوں اون سے اس مزخرفات
بے ادبانہ کے سوا امید ہی کیا ہوسکتی ہے۔ آخر اونکا ذریعہ معاش
ہی کیا ہے وہ غریب کسی نہ کسی طرح اپنا پیٹ
پالیں گے ضرور۔

رسالہ چاند اُردو زبان اور ادب کا مصلح بن کر نکلا ملک اور قوم نے کافی ہمت افزائی کی ڈیڑھ سو صفحات کا حجم ہر ماہ ہوتا ہے تصاویر اور کارٹوں مزید براں۔ مگر افسوس کہ اہل قلم حضرات نے معمولی توجہ بھی نہ فرمائی جن پر ایک ادبی رسالہ کی حیات و موت کا انحصار ہے جن اہل قلم حضرات نے چاند کی قلمی امداد کی وہ اون کے ادبی ذوق اور صحیح مذاق ادب کی دلیل ہے، پھر بھی ضرورت ہے اور بڑی ضرورت کہ رسالۂ چاند کو اُردو زبان کا ایسا جامع اور مستند پرچہ بنایا جاے جیسا کہ وہ اپنی مالی قربانیوں۔ دلی انہماک۔ اور حوصلا افزا مقاصد کے باعث اوسکا مستحق ہے۔ اور زبان اُردو کی خدمت و اصلاح ادب کا نہ صرف زبانی بلکہ عملاً علمبردار رہے۔ کاش ملک کے مشاہیر ادب اور ذمہ دار ارباب سخن زبان کی اصلاح اور درستی کا ایک خاص نظام قائم کرتے ہوئے "چاند" کو آسمان صحافت و ادارت کا نیر تاباں بنانے میں متحدہ طور پر عمل پیرا ہوں۔ ہم اس مختصر میعاد اشاعت میں چاند کو اوسکی قلیل سے قلیل کامیابی پر بھی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اوسکے لائق و محترم ایڈیٹر و دیگر ذمہ دار اراکین اشاعت کے ادبی مقاصد کا احترام کرتے ہوئے متوقع ہیں کہ وہ اپنے استقلال اور انہماک سے بہت جلد رسالۂ چاند کو تمام ہندوستان کا ادبی آرگن بنانے میں کامیابی حاصل کریں گے۔ اور یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں ہے بمصداق ؎

دل بیتاب کا سنبھالنا کیا
دیکھ لو پیار کی نگاہوں سے

(خاص)

غزل

[جناب سید احمد حسین صاحب محضرؔ رکن ادارت جام جہاں نما لکھنؤ]

کیونکر ترے خیال سے مر کر جدا ہوں میں
اکثر گناہگارِ محبت رہا ہوں میں

میں نے یہ کب کہا کہ ترا آشنا ہوں میں
دنیا یہ کہہ رہی ہے کہ تجھپر فدا ہوں میں

میں کہہ رہا ہوں اون سے محبت کی داستاں
وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ بے مدعا ہوں میں

پہلے تم اس کو اپنی اداؤں سے پوچھ لو
پھر میں بتاؤنگا تمہیں کیونکر مٹاؤں میں

جو چاہے وہ کہیں مجھے۔ اونکی ہے اور بات
دنیا یہ کیوں کہے کہ بُرا یا بھلا ہوں میں

پامال یوں کیا ہے زمانہ کی چال نے
رُخ پر ہوائے دہر کے اب اُڑ رہا ہوں میں

دیوانہ کہہ رہی ہے مجھے گو زبان خلق
تم بھی تو اپنے مُنہ سے کہو کچھ کہ کیا ہوں میں

جو کھو چکا ہوں دل کو نہیں اوسکی کچھ خبر
جو کچھ ملے گا عشق میں وہ جانتا ہوں میں

پوچھو نہ مجھسے راہِ طلب کی نمائشیں
ہر ہر قدم پہ نقشِ تمنا ہوں میں

ہشیار بنگیا کبھی دیوانہ بنگیا
محضرؔ نہ پوچھو عشق میں کیا کیا بنا ہوں میں

(خاص)

چاند (اردو)

انگلینڈ اور امریکہ میں عورتوں کے قانونی حقوق

(کنھیا لال ایڈیٹر "چاند" (اُردو) الہ آباد)

آج سے کئی صدیوں پیشتر کا ذکر ہے کہ مغربی و مشرقی دونوں ممالک میں مرد عورتوں کو اپنی جائیداد منقولہ سمجھتے رہے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سقراط ـــــ یونانی فلسفی نے اپنی منکوحہ بیوی کو عارتیاً چند روز کے لئے دوستوں کو دیدیا تھا۔ یونان کی مشہور سلطنتیں ایتھنس و اسپارٹا میں عورتوں کو ریاست کے اندر کوئی حقوق نہیں تھے۔ بلکہ اسپارٹا میں شروع شروع میں عورت بچہ پیدا کرنے کی بہترین مشین سمجھی جاتی تھی۔ ایسی حرکات سے صاف ظاہر ہے کہ مرد کے نزدیک عورتوں کی کوئی شخصی زندگی نہیں ہو سکتی تھی اور اُن کے نقطۂ نظر سے عورت گرہستی کے آرام و آسائش کے ضروری سامان میں سے ایک چیز تھی۔ یہ قصہ تو حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے قبل کا ہے۔ لیکن بعد میں جب کہ عیسوی مذہب کا اشتہار مغربی ممالک میں ہونے لگا تہذیب کا نیا چاند ادبی دنیا کے افق سے اوپر اٹھا تو عوام الناس کے خیالات رسم و رواج میں خاص تبدیلیاں واقع ہوئیں اور رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ہستی و حقوق میں بھی بہت کچھ تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ لیکن اس وقت بھی عورتوں کی حالت کسی قدر قابل رحم تھی۔ رہنمائے مذہب نے ان کے ساتھ کسی بھی ہمدردی کا اظہار نہ کیا۔ کسی نے ان کو جہنم کا راستہ قرار دیا تو کسی نے اُن کو عقل و تمیز سے بے بہرہ تصور کیا۔ بعضوں نے اس پر بھی قناعت نہ کی۔ ان کا قول یہ تھا کہ عورتوں کو خدا نے کوئی روح نہیں عطا کی۔

اس قسم کی حالت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی، آخر کار حقیقت نے پردۂ باطل چاک کیا اور عورتوں نے بھی مدتوں کی برداشت غلامی کے بعد گھر گرہستی کے بندھنوں کو توڑنے لگیں اول اول تو مردوں نے ان کی سخت مخالفت کی جس گھر میں کہ مرد صدیوں سے حکومت کرتے تھے وہ کس طرح سے آسانی سے عورتوں کو شریک حکومت بنانے کے لئے تیار ہوتے؟ اس آزادی کے لئے عورتوں کی پہلی کوشش امریکہ میں ہوئی۔ ۱۸۴۸ء میں انھوں نے ملک کے اندر مردوں کو شرعاً حقوق دینے کے لئے مجبور کیا۔ لیکن بہت عرصہ تک کامیابی نہ ہو سکی شاید اس کی خاص وجہ ممالک متحدہ کا کانسٹی ٹیوشن تھا۔ انگلینڈ کے اندر ملکہ وکٹوریہ کے دوران سلطنت میں عورتوں کو ملکی انتظامات کے اندر مجلس اور بل کے ذریعہ سے بہت سے حقوق عطا کئے گئے۔

سنہ ۱۹۱۰ء لغایت سنہ ۱۹۲۰ء تک عورتوں کی سیاسی زندگی میں ایک خاص انقلاب واقع ہوا جس سے کہ یورپ کے ممالک کی سیاسی فضا ایک طرح سے بالکل کایا پلٹ ہو گئی۔ اس کی خاص وجہ یورپ کی جنگ عظیم تھی۔ دوران جنگ میں فرانس کی مشرقی سرحد پر مردوں کی مانگ روز بروز بڑھنے کی وجہ سے گھر کا انتظام عورتوں کے ہاتھ میں سپرد کیا گیا۔ اور اس درمیان میں عورتوں نے

ذمہ داری کے کاموں کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ مردوں کو میدان جنگ سے واپس آکر ان کی ذہانت اور لیاقت کا لوہا ماننا پڑا۔ صلح ہونے کے ساتھ ہی انقلاب کی جو آگ اب تک سلگ رہی تھی اس کے شعلے بھڑک اٹھے لہذا ۱۹۱۸ء کے آغاز میں پارلیمنٹ کی کارپردازان کی سرد مہری میں حرارت کے خون کا دور دورہ ہوا ایک خاص لجسلشن کے ذریعہ سے تیس برس کی عمر کی عورتوں کو پارلیمنٹ کے اندر ووٹ دینے کا اختیار دے دیا گیا۔ اس ووٹ دینے کے معاملہ میں کنواری شادی شدہ وبیوہ عورتوں کی تمیز نہیں رکھی گئی تھی۔

ایک بار جب اس طرح ملک کے اندر ترقی کا دروازہ کھول دیا گیا تو عورتوں کی آزادی روکنا مردوں کا قابو سے باہر ہو گیا۔ لہذا ۱۹۱۹ء کے آخری مہینہ میں عورتوں کو برطانیہ سلطنت کے اندر اونچے اور ذمہ داری کے عہدوں پر مامور ہونے کا حق حاصل ہو گیا ۱۹۲۰ء کے بعد ملک برطانیہ کے اندر عام طور پر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ مرد اور عورت حکومت کے ترازو پر ہم پلہ تھے اور اس زمانہ سے اب تک سول قانون کے اندر مرد اور عورت میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ جائداد کا جہاں تک سوال ہے پرانے قوانین کے لحاظ سے بھی بیوہ اور غیر شادی شدہ عورتوں کو مردوں کی طرح یکساں حقوق حاصل تھے' اس کو اپنی جائداد کا خرید و فروخت کرنے کا پورا اختیار تھا' وہ مردوں کی طرح اپنا ذاتی وصیت نامہ تیار کرا سکتی تھی لیکن شادی شدہ عورتوں کی حالت اپنی خاوند کی زندگی میں ۱۹۱۲ء کے پیشتر بالکل دوسری تھی۔ ایک مشہور و نامی انگریز بیرسٹر کا یہ قول ہے کہ عورت کو اپنی شوہر کی زندگی میں کسی سے اقرار نامہ لکھنے کا قطعی اختیار نہ تھا حقیقت تو یوں تھی کہ شوہر کی حیات میں قانون کے روبرو اس کا کوئی وجود ہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ ملک کا ضابطہ قانون اس معاملہ میں اس قدر محدود تھا کہ عورت بازار سے قرض پر اپنی ضروریات کی چیزیں بھی نہیں خرید سکتی تھی لیکن جنگ کے اختتام کے بعد اس ناقابلیت و بے اختیاری کا خاتمہ کر دیا گیا۔

اب ہر عورت کو اپنی خاوند کی مدت حیات کے اندر اپنی جائداد پیدا کرنے کا حق ہے اور اب تو قانون اس قدر کشادہ اور وسیع ہو گیا ہے کہ اگر مرد اور عورت دونوں ایک جگہ پر ایک ہی مکان میں نہ رہتے ہوں تو ان میں سے ایک دوسرے پر چوری کا الزام لگا سکتا ہے۔

اب برطانیہ کی عورتیں نیز منکوحہ و غیر منکوحہ و بیوہ اپنا ذاتی وصیت نامہ تیار کر سکتی ہے یا اپنے حسب خواہش اپنی جائداد کو فروخت کر سکتی ہیں غرض یہ کہ ان کو اپنی جائداد پر کلی اختیار دے دیا گیا ہے۔ انگلینڈ کے اندر خاوند یا اولاد کسی کو بھی عورت کی جائداد پر کوئی حق شرعاً نہیں عطا کیا گیا۔ لیکن اگر عورت بغیر کسی وصیت نامہ کے انتقال کر گئی ہے تب ایسی حالت میں شوہر اور اس کی اولاد کو ترکہ کی جائداد پر حق حاصل ہوتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے اندر اولاد والدین کے وفات کے بعد قانون کے رو سے ایسی جائداد کے مستحق قرار دئے گئے ہیں۔ انگلینڈ میں منکوحہ عورت کو اپنا وصیت نامہ لکھوانے کے لئے اپنے شوہر کی اجازت ضروری نہیں ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بیوی کو کامل اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنے شوہر کو اپنی جائداد ترکہ میں چھوڑنا نہیں چاہتی تو شرعاً مرد اس کو مجبور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ امیر طبقہ کی منکوحہ عورتوں کے درمیان اس بات میں ذرا سا فرق ہے اور وہ شادی کی شرائط پر مبنی ہوتا ہے۔ شرائط زیادہ تر ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جائداد کا سرمایہ امانت داروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور آمدنی قسط کے طور پر برابر ملتی رہتی ہے لیکن بیوی کو بیوی کی وفات کے بعد شوہر کو تاحیات یہ آمدنی ملتی رہتی ہے اور اگر اولادیں بھی ہوئیں تو یہ آمدنی برابر برابر حصوں

میں تقسیم کر دی جاتی ہے اور اگر کوئی بھی اولاد نہ ہوئی یا آمدنی کا کوئی بھی حق دار زندہ نہیں رہا تب جائداد بیوی کے رشتہ داروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور اگر بیوی نے اپنی وفات کے وقت اپنا وصیت نامہ لکھ دیا تھا تو اس کی ہدایتوں کے مطابق عدالت کو کام کرنا پڑتا ہے

۱۹۲۱ء میں باوجودیکہ عورتیں کے حقوق پہچاننے میں اس قسم کی بہت کوشش کی گئی تھی لیکن ابھی ایک کمی باقی رہ گئی تھی اگر کسی وقت مرد اور عورت میں اختلاف رائے ہو جائے تو اولاد کی نگہداشت ماں سے اکثر چھین کر باپ کے حوالہ کی جاتی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ ترکہ کی جائداد میں شوہر اور بھائیوں کے مقابلہ اس کے حقوق کم سمجھے جاتے تھے۔ اگر عورت بغیر وصیت نامہ کے انتقال کر جاتی تھی تو اس کی کل جائداد زمین کے علاوہ شوہر کے قبضہ میں آجاتی تھی۔ لیکن اگر شوہر بغیر کسی وصیت نامہ کے انتقال کر جائے تو بیوی کو اولاد کی موجودگی میں صرف اس کی جائداد کا ایک تہائی حصہ ملتا تھا ۱۹۲۱ء میں پارلیمنٹ کے اندر نہایت غور سے تکمیل کیا ہوا ایک بل عورت کو اپنے بھائیوں کے برابر آئینی حصہ دلانے کے لئے پیش کیا گیا اور اس وقت سے عورتوں کے حقوق ملکی قوانین کے ہر شاخ میں تقریباً مردوں کے برابر ہوگئے ہیں

باوجودیکہ امریکہ کے اندر عورتوں نے انیسویں صدی کے شروع میں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے ملک کے اندر اس قسم کی تحریک شروع کی تھی تاہم اول اول کوئی کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ خانہ داری میں اور گرہستی کے دائرہ کے اندر پرانے رسم و رواج و مذہبی اصولوں کی وجہ سے مردوں کے مقابلہ اُن کا درجہ نیچا تھا چونکہ ایک زمانہ قدیم سے یہ رواج — غلط ہو یا صحیح چلا آتا ہے کہ عورتیں خانہ داری کے معاملات میں مردوں کی دست نگر رہتی ہیں۔ لڑکپن میں والدین کے زیر نگہداشت شادی ہو جانے پر خاوند کی زیر حفاظت و بیوہ ہونے پر اولادوں کی زیر حکومت میں اُن کی نشو و نما ہوتی چلی آتی ہے لہٰذا ان خیالات کے مستحکم بنیاد کو یکایک ہلا دینا و سوسائٹی کے دفتر کو درہم و برہم کر دینا غیر ممکن نہیں تو بیشک ناممکن تھا۔ اس ناکامیابی کی دوسری تصویر اس سے بھی صاف ظاہر تھی کہ جسمانی طاقت میں وہ مردوں کا مقابلہ زنہار نہیں کر سکتی تھیں۔ قانون نے اس زمانہ میں اتنی اشاعت نہیں پائی تھی کہ سوسائٹی کے ہر پہلو پر حاوی ہو سکتا۔ پرانی مثل مشہور ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، ملک کے اندر روزانہ کی مزدوری میں اُن کی تنخواہیں کم رکھی گئی تھیں۔ ان کے کام کرنے کے گھنٹے کم تھے۔

والدین اور اولاد

معمولی قانون کے روبرو باپ کی زندگی میں کمسن بچے کے اوپر ماں کا اختیار نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی کتابوں کے اندر اسی قسم کا قانون مندرج ہے۔ لیکن مروجہ قانون بالکل اس سے مختلف ہے۔ اب ماں اور باپ دونوں کو بچہ کو تعلیم دینے کا اپنی اپنی رائے کے مطابق حق حاصل ہے ۱۹۱۶ء میں اس قسم کے معاملہ پر عدالت کا فیصلہ یوں ہوا تھا۔ ماں اور باپ کے مختلف الرائے ہونے پر باپ کو شرعاً اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے نابالغ کمسن لڑکے کو اپنے مذہب کی تعلیم دے سکتا ہے۔

چاند (ہندی)

سودیشی

(جناب رام رکھ سنگھ سہگل چیف ایڈیٹر "چاند" ہندی الٰہ آباد)

ہندوستان کی موجودہ آزادی کی جنگ صرف دو ہتھیاروں سے لڑی جا رہی ہے سودیشی کا پرچار، اور غیر ملکی چیزوں کا مقاطعہ۔ آج کل کوئی بھی نئی چیز خرید کر گھر لائیے۔ بی بی، نوکر، دوست یار سبھی یہی سوال کرتے ہیں سودیشی ہے کہ بدیشی؟ — غرض یہ کہ سودیشی ہندوستان کی آزادی کا ایک بہت بڑا ہتھیار ہے لیکن مثل مشہور ہے گھر کی مرغی دال برابر اپنے یہاں کی چیزوں میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور نظر آتا ہے۔ یہ عیب جوئی کس حد تک ملک کی صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے کارآمد و مفید ہے — حکما کی رائے ہے کہ دشمن سے دوستی کرنے میں اپنی اصلاح کا اچھا موقع ملتا ہے۔

اکثر سننے میں آیا ہے کہ مغربی ممالک میں ہندوستان کی اول اول شہرت، یہاں کی ہنر و دستکاری کی وجہ سے ہوئی تھی یہاں کے ڈھاکہ کی ململ جب ولایت پہونچی تھی۔ دیکھنے والے کہتے تھے، "یا خدا! ایک تھان کپڑا ایک بوتل کے اندر —" بادشاہ، دربار ی اور رؤسا و امراء یہاں کے کپڑوں کا لباس پہننا اپنے لئے باعث عزت و شان سمجھتے تھے۔ ہندوستان کا فلسفہ اور مذہب ہندوستان کی صنعت و حرفت کے بعد مشہور ہوا ہے۔ یہ ہندوستان کے مادی اسباب تھے جنھوں نے تمام یورپ کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ لیکن اب اس کی ہستی کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔ پھول مرجھا گیا لیکن اب بھی خوشبو باقی ہے جب سے ملک کی صنعت و حرفت کو زوال ہونے لگا۔ تب سے مفلسی و تنگدستی ہندوستانیوں کے گلے کا طوق بن گئی ہے۔

سنہ ۱۸۰۶ء میں جب کہ نپولین اعظم نے جرمن کو شکست دے کر اس کی شان کرکری کر دی۔ ملک کے رہنماؤں نے یہ سوچا کہ قوم کی کھوئی ہوئی عزت اب تعلیم کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ علم ایک ایسی بیش بہا شے ہے کہ جس کی بدولت جاہل ترین قوم بھی اپنی بزرگی کا سکہ دنیا والوں کے دل پر نقش کر سکتی ہے۔ علم ہر ملک کیلئے روح رواں ہے۔ بغیر اس کے ملک کے اندر فارغ البالی امن و امان مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے۔ لیکن صرف اکیڈمک انجمنوں کی پرورش و ترقی سے ملک کی تنگدستی و فاقہ کشی نہیں مٹائی جا سکتی۔ اس کے لئے صنعت و حرفت کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ تہذیب کے سرفرازی کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی ترقی ضروری ہے۔ کیونکہ تہذیب کے اسپ تیز گام پر سوار ہونے کے لئے مضبوط لگام و کاٹھی کی ضرورت ہوتی ہے اس خیال کو مدنظر رکھکر جرمن نے ایسی انجمنوں کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی جس سے کہ ملک کی تجارت میں اضافہ ہو، اور اپنے یہاں کی بنی ہوئی چیزیں دنیا کے بازار میں اپنی جگہ کر لیں کتابوں کے کیڑے بننے سے زیادہ فائدہ نظر نہ آیا، لہذا اُس نے مادی چیزوں کی ایجاد کرنا شروع کیں — یہ بات قابل یاد رکھنے

کے ہے کہ تعلیم و سودیشی کا استعمال دو نوں ترقی کے میدان میں بالکل متوازی ہیں ——" سودیشی صرف آزادی کا ایک خاص ہتھیار ہی نہیں یا حب الوطنی کا اظہار جوش و خروش ہی نہیں بلکہ قوم کی جسم کا ایک خاص عضو ہے۔

گو کہ سودیشی تحریک انگریزوں کو ہوش و ہواس میں لانے کیلئے ایک حکمی تحلہ ہے۔ لیکن سودیشی کا کام صرف ودیشی چیزوں سے پرہیز ہی نہیں ہے۔ بلکہ اپنے ملک کی صنعت و حرفت کی محافظت کا ایک بہت پائیدار چیز ہے۔ عوام الناس کو یہ ذہن نشین کرانا آسان نہیں ہے کہ مہنگی یا سستی، اپنے ملک کی چیز اپنی ہے۔ چند روزہ پرہیز کرنے سے آزادی کا خدا نہیں مل سکتا۔ ممکن ہے کہ اس کی جھلک دکھلائی دے، لیکن اگر قوم مستقل طور پر اس راہ پر ثابت قدم نہ رہ سکی۔ تو بلاشبہ وہ پھر آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ بعد پھر ملک غلامی کی تاریکی میں ہاتھ پیر مارنے لگے گا۔

انگلینڈ کی طرف نگاہ دوڑائیے وہ ہندوستان سے صرف اُن چیزوں کو خریدتا ہے۔ جس کی پیداوار وہاں تو ناممکن ہے یا بآسانی نہیں کیجا سکتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی حالت اس کے بالکل متضاد ہے۔ وہ باہر سے ایسی چیزوں کو خریدتا ہے۔ جس کو کہ وہ خود زیادہ آسانی سے ارزاں طریقہ پر اپنے ہی گھر میں تیار کر سکتا ہے۔ اس کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ ملک کے اندر بیکاری کا مسئلہ روز بروز اہم ہوجاتا رہا ہے۔

دوسری بات اس کے اندر قابل ذکر یہ ہے کہ ہندوستان کے اندر مزدوری کم ہے۔ لہذا جو مال کہ انگلینڈ یہاں سے خرید کر لیجاتا ہے وہ نسبتاً کم قیمت پر مل جاتا ہے۔ لیکن اُسی مال کو جب کہ ہندوستان انگلینڈ سے خرید کرتا ہے تو آٹھ گنا دس گنا دام صرف وہاں مزدوری زیادہ ہونے کی وجہ سے دینا پڑتا ہے۔

چند سال پیشتر پریسیڈنٹ ولسن نے اپنی ایک تقریر میں یہ کہا تھا کہ دنیا کی جنگ کی سب سے بڑی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تجار غیر ممالک تجارت کے منافع پر آپس میں دشمنی رکھتے ہیں۔ لہذا صلح قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حتی المکان ہر قوم اپنی ضروریات کو خود اپنے ہی گھر میں تیار کیا کرے گو کہ مختلف قوموں کے درمیان تجارت بہت ضروری ہے۔ لیکن چیزوں کو فضول ادھر اُدھر لیجانا جس کو وہ خود اپنے گھر میں بنا سکتے ہیں۔ محض حماقت ہے۔

اس ملک کی قدیمی صنعت و حرفت کا ذکر میرے لئے فضول ہے۔ ہر تعلیم یافتہ پر یہ بات روشن ہے کہ زمانہ گذشتہ میں جب دور دور سے لوگ اس سرزمین پر آئے، ہندوستان کی صنعت و دستکاری کا ستارہ ترقی پر چمک رہا تھا۔ اس کی تجارت عالمگیر تھی۔ اس کی کاریگری شہرۂ آفاق اور اس میں شبہ نہیں، کہ ہندوستان پھر اُسی پایہ ترقی کو پہونچ سکتا ہے۔ کاش کہ قوم کے دل میں سودیشی جگہ کرتے۔ اس کے لئے اول بات ضروری تو یہ ہے کہ ملک کے اندر سودیشی چیزوں کے قدرداں پیدا ہوں محض قدرداں ہی نہیں بلکہ ایسے لوگ ہوں —— وہ بھی چند نہیں، بلکہ تمام قوم جو کہ سودیشی چیزوں کا استعمال اپنے لئے باعث عزت و فخر سمجھیں۔ غرض یہ کہ تمام ملک اپنی چیزوں کا خریدار بن جائے۔ جب چیزوں کی مانگ میں ترقی ہوگی۔ اکنامکس کا اصول ہے۔ کہ اُس مانگ کو پورا کرنے کے لئے ضروریات کی چیزیں بازار میں فراہم کیجائیں گی ہمارے یہاں کے ہر مرد و ہر عورت کو یہ بات ذہن نشین ہونا چاہیئے کہ اپنی دولت اگر اپنے ہی ملک کے بازار میں چکر لگائے تو بہتر ہے بہ نسبت اس کے غیر ممالک کے تجار اُس دولت کو لوٹ کر باہر لیجائیں اور وہ پھر لوٹ کر کبھی اس ملک کا درشن نہ کر سکے۔

اس سودیشی تجارت کو حقیقت میں کامیابی بخشنے کے لئے

میرا مضمون شائع ہوجائے۔ اور بار بار مانگ کر پرچہ پڑھنے میں دقت پیش ہوتی تھی۔ بندہ بھی ایسے شائقین کی ہمت افزائی کردیا کرتا تھا خاص کر جب روکھی خوشامدوں کے علاوہ کچھ نقدی فائدہ میں ہونے لگا۔ مضمون کی اچھائی و برائی کی تحقیق کرنا محض اپنی اوقات خراب کرنا ہے۔ کیونکہ جس طرح عالم شباب میں پہونچکر ایک گدھی بھی پریکا بن جاتی ہے۔ اس طرح سبھی مضمون چھپنے پر مضمون ہوجاتے ہیں پھر بھی ایک لاچاری تھی۔ اس بیوقوفی کے زمانہ میں چند نامہ نگاروں نے اپنے نام کو شیطان کی طرح مشہور کرکے کس دعا یا تعویز کے اثر سے پڑھنے والوں پر ایسا جادو ڈال رکھتا ہے کہ وے لوگ ایک دو ایک مضمون ان لوگوں کا ہر پرچہ میں ضرور دیکھنا چاہتے ہیں ورنہ بلے دُم کے جانور کی طرح پرچہ کی وقعت گھٹ جاتی ہے۔ مگر یہ حضرت مضامین دینے میں وہ وہ شتر غمزے دکھلاتے ہیں۔ کہ کلیجہ جل کر خاک ہوجاتا ہے۔ جب ملک میں ہزاروں شائقین ایسے پڑے ہیں کہ جو سو سو خوشامدوں کے ساتھ مضمون دیکر اس کی چھپائی وغیرہ تک کے اخراجات بھی دینے کو تیار ہیں۔ تو ان لوگوں کو اپنا مضمون دینے میں اتنے نخرے دکھلانا اور الٹے مجھی سے اس کے بدلے میں کچھ وصول کرنے کی امید کرنا لاحول و لا قوۃ کس قدر بیجائی اور ناشائستہ حرکت ہے، خیر! میں بھی ان لوگوں کا استاد ہوں جب دیکھا کہ آرزو منت خوشامد سے کام نہیں چلتا تب سچائی کو دور بھگا کر انھیں اجرت دینے کے لئے ایک سے ایک بڑھکر وعدہ کرتا ہوں، اور اپنے عذر لنگ میں ایسے سبز باغ دکھلاتا ہوں کہ اُن کا دماغ پھر جاتا ہے۔ اگر یہ ترکیب بھی نہ کارگر ہوئی تو ان کی کس مشہور اور معروف کتاب پر کلی کلی نکتہ چینی کرنے اور ان کا کارٹون نکالنے لگتا ہوں۔

بس حضرت نرم پڑ جاتے ہیں کیونکہ مثل مشہور ہے کہ پاجی سے اللہ میاں بھی ڈرتے ہیں، اور سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا ہے پھر کیا، جہاں مضمون ہاتھ آگیا، پھر بندہ اپنے وعدوں کا تو ذکر ہی کیا، اُن کے خطوط کا جواب بھی دینا بھول جاتا ہے اور ان کی قدر ویسے ہی کرتا ہوں جیسے واپس کے براتی اوٹ دے چکنے پر اولڑ یا گزرے ہوئے گواہ کی ہوتی ہے۔

حال ہی میں ایک بیڈھب سے پالا پڑ گیا تھا مانگتا تو وہ بہت تھا، خیر کسی نہ کسی طرح اُسے چار آنہ صفحہ کے حساب سے اجرت دے کر اپنی جان چھڑائی۔ لیکن یہ بات بُری لگی۔ کیونکہ میں تو اس کے مضمون کے پورے بنڈل کے لئے دو پیسہ بھی نہ دیتا۔ خیر بعد کو میں نے اُس مضمون کو الگ ایک کتاب کی شکل میں شائع کرکے اپنے دس گنے سے تعدادمیں سیدھے کر لئے تب تو وہ بہت گھبرایا کہنے لگا کہ میں نے اسے اخبار میں دینے کا دام لیا تھا اس کا کوئی کتابی حق نہیں فروخت کیا تھا۔ مگر اس کا سر ہمارے پرچہ کی شرائط میں صاف طور سے لکھا ہے کہ جو مضمون اس میں شائع ہوا اس پر جملہ حقوق ایڈیٹر کا ہے حضرت اپنا منھ سالے کر رہ گئے۔

چیدہ خبروں کے لئے کسی کی بھی خوشامد نہیں کرنی پڑتی تھی کیونکہ ہمارا چپراسی جس وقت چنڈو کی نگالی منھ میں لگاتا ہے۔ اسی وقت اُسے الہام ہوتا ہے اور وہ بے تار کی خبر کی طرح دنیا بھر کی عجیب و غریب چیزیں سنانے لگتا ہے۔ انھیں کو بندہ ذرا حاشیہ لگا کر پڑھنے والوں کے سامنے پیش کردیتا ہے ایک دفعہ اس نے پینگ میں بتلایا، کہ ایک عورت کی ناک سے گدھے کا بچہ پیدا ہوا ہے میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ عورت افریقہ کی ہوگی۔ بس یہ خبر اخبار میں دیدی۔ پھر تو اس کی یہ دھوم مچی کہ دس بیس اخباروں نے اس کی نقل کی۔ اور مہینہ بھر تک کافی سنسنی رہی یہاں تک کہ کچھ لوگ افریقہ جاکر اس عورت کی زیارت کرنے کیلئے تیار بھی ہوگئے تھے۔

مضامین درست کرنے کے واسطے کچھ ترمیم کرنا ایڈیٹر کے لئے ضروری ہوتا ہے مگر اس میں مجھکو زیادہ وقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ طالب علم کی عمر میں میں نے ضرورت سے زیادہ پڑھنے کی زحمت کبھی نہیں اٹھائی تھی۔ دو چار ناولیں پڑھ لیں تھیں جس سے اخبار اور کتاب میں استعمال کرنے والے الفاظ مجھے بخوبی معلوم ہو گئے تھے مثلاً گھر میں اگر پانی کو پانی باپ کو باپ کہو تو اخبار میں پانی کو آب اور باپ کو پدر کہو ان کے علاوہ صرف و نحو کا ایک قاعدہ بھی جانتا تھا ہر جملہ کے شروع میں فاعل تب مفعول اس کے بعد فعل ہونا چاہئے۔ شاعری کے مصرع ناپنے کے لئے میرے پاس پہلے ہی سے ایک پرکار تھا ہی۔ بس اتنی باتیں ایڈیٹری کا کام سرانجام دینے کے لئے کافی تھیں اور باقی تو سب تجربہ پر منحصر ہے۔ کرتے کرتے آ ہی جاتا ہے۔ اور اسی بل کے بوتے پر میں سرخرد اور اپنی برتقلم انگلیوں میں پکڑتا تھا اس کے لئے اور تو کوئی نہیں۔ مگر نامی نامہ نگار بڑی چل پوں مچاتے تھے ان کی دنیا میں ایک کہرام مچ جاتا تھا۔ حالانکہ یہ لوگ لاپرواہی کی وجہ سے قواعد کی سب سے زیادہ غلطیاں کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر ان کا ایک جملہ خود ہی دیکھ لیجئے ــ "جس میں پری تھی تو بولنے میں کوئل تھی" ــ اصل میں یہ ایک نہیں دو جملے ہیں دونوں میں فاعل غائب ہے۔ اور دوسرے میں فعل بھی ندارد ہے۔ اس لئے ان کو اس طور پر جمع ہی کرنا پڑتا تھا کہ ــ "وہ حسن میں پری تھی تو وہ بولنے میں کوئل تھی"۔ اسی طرح ایک کہانی لکھنے والے نے اپنی کہانی میں ایک آدمی کے منھ سے جو ڈنڈوں سے پیٹا جا رہا تھا کہلا دیا ــ "ارے باپ رے، باپ" میں نے اسے جھٹ کاٹ کر ــ "اے! پدر رے پدر" کر دیا اس پر نامہ نگار صاحب بہت برہم ہوئے۔ خفا ہوں میری بلا سے آخر ہم ایڈیٹر ہیں کس لئے

ایڈیٹوریل لکھنے میں پریشانی ضرور ہوتی تھی۔ اس لئے بندہ اس جھگڑے میں پڑتا ہی نہ تھا اسے میں ہمیشہ شاگردوں کے ذمہ چھوڑ دیتا تھا اور انھیں لوگوں سے انگریزی اخبار اور ناولوں کے ترجمے بھی کرواتا تھا۔ شاگرد میرے پاس کافی تعداد میں تھے کیونکہ کاروبار بڑھنے کے ساتھ آدمیوں کی جب ضرورت ہوئی اور میری آمدنی کے بجٹ میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ معقول اجرت دے کر میں کسی سے کام لوں۔ تب بندہ نے فن ایڈیٹری سکھلانے کی نوٹس دے دی۔ بس درجنوں کالج کے تعلیم یافتہ لوگ میری شاگردی کے لئے روز ہی ٹپکنے لگے۔ اور میرا تمام کاروبار اب مفت میں ہونے لگا۔ اگر کبھی بندہ ہی کو ایڈیٹوریل لکھنا پڑے گا تو بندہ اخبار میز پر رکھ لیتا ہے اور ہر ایک کے ایڈیٹوریل میں سے ایک ایک کام نکال کر اپنا مضمون تیار کر لیتا ہے۔ اسی سے میری پالسی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ حقیقت تو یوں ہے کہ پالسی ہی کیا جو سمجھ میں آ جائے۔ اور اگر اب بھی آپ نہ سمجھیں تو میرا قصور نہیں۔

نوٹ۔ جناب مہربانی کر کے آئندہ سال کا چندہ آپ فوراً بھیج دیں کیونکہ اخبار اب پرانا ہو چکا ہے اس کی کایا پلٹ ضروری ہے۔ اس لئے ہفتہ عشرہ میں انشاءاللہ تعالیٰ اس کا نکلنا میں ایک دم بند کر دوں گا۔ فقط آپ کے چندے کا انتظار ہے!

(خاص)

چترگپت سماچار

غزل

(جناب ڈاکٹر سرن شنکر صاحب سب ایڈیٹر چترگپت سماچار آگرہ)

اپنی نظر میں کعبہ و بتخانہ ایک ہے ٭ پردہ میں دل کے جلوۂ جانانہ ایک ہے
جانبازی میں یگانہ و بیگانہ ایک ہے ٭ اس معرکہ میں دشمنی یارانہ ایک ہے
دشت جنوں میں لیلیٰ و مجنوں کا فرق کیا ٭ جانسوزی ہے تو شمع و پروانہ ایک ہے
ٹھوکر ہے ہر قدم پہ نشیب و فراز کی ٭ راہ طلب میں عاقل و دیوانہ ایک ہے
وحدت کا ذکر بزم میں کثرت کے ساتھ ہے ٭ قصے ہیں بیشمار پر افسانہ ایک ہے
ساقی سے لو آفتاب چمکا ہے ہر جام میں ٭ بادہ ہزار رنگ ہے پیمانہ ایک ہے
نیرنگی جہاں میں ہے یکرنگ اپنا رنگ ٭ شایق بھی اپنے رنگ کا مستانہ ایک ہے
(خاص)

[صفحہ ۶۲۲ کا بقیہ]

انگریزی زبان میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ نہایت بہترین اور غیر معمولی ہے۔ اس میں مصنف نے جو تعلقات اضافہ کئے ہیں وہ خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب سنہ [illegible]ء میں بمقام وسٹ منسٹر Westminster. دو جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں ٹھاکر چند شاہپوری نے اس کا اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کی بنیاد سٹائین کے انگریزی ترجمہ پر ہے۔ مگر مترجم کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے مختلف ترجموں کی مدد سے تصحیح کے بعد ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ سنہ [illegible] میں دو جلدوں میں چھپ چکا ہے۔

ہرگوپال کول خستہ نے "گلدستۂ کشمیر" کے نام سے کشمیر کی ایک تاریخ اردو زبان میں سنہ [illegible]ء میں لکھی ہے یہ کتاب راج ترنگنی کا ترجمہ ہے جو سنہ [illegible]ء میں آریہ پریس لاہور میں طبع ہوا ہے۔ اسکے مصنف نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے حصے میں کشمیر کا قدیم جغرافیہ دوسری میں تاریخ اور تیسری میں نقشہ جات اور گائیڈ لکھی ہے۔ مصنف نے سنگھ کے عہد حکومت تک کے حالات راج ترنگنی سے اخذ کئے ہیں اسکے بعد کے واقعات کو حیدر ملک کی تصنیف سے لکھا ہے یہ کتاب سنہ [illegible]ء تک کی مسلسل تاریخ ہے جو بڑی محنت سے تصنیف کی گئی ہے۔

ان ترجموں کے ماسوا جوگیش چندر دت نے (جو رومیش چندر دت کے بھائی ہیں) اس کا انگریزی ترجمہ کیا جو کلکتہ میں طبع ہوا۔ اس سے کچھ پہلے کرپا رام نے جو ریاست جموں و کشمیر کے دیوان تھے۔ اُنھوں نے کشمیر کی ایک تاریخ سنہ ۱۸۷۰ء میں گلزار کشمیر کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا بیشتر حصہ اُنھوں نے راج ترنگنی سے اخذ کیا تھا۔

کلہن نے راج ترنگنی کے علاوہ اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جو اب پردہ خفا میں مستور ہیں منجملہ ان کے ایک کا پتہ چلتا ہے۔ جس کا نام نیل مست گرنتھ ہے یہ کتاب کشمیر میں نہایت شوق سے اب بھی پڑھی جاتی ہے[1] (خاص)

[1] ہندو کلاسیکل ڈکشنری صفحہ ۲۲۱۔

چمنستان

غزل

[جناب ظفر ہاشمی ایڈیٹر رسالہ "چمنستان" امرتسر]

دل جو پہلو میں بیقرار ہوا
کیا اشارہ نگاہ یار ہوا

تھا عبث زندگی کا وہ حصّہ
جو نہ وقفِ خیال یار رہا

آپ کے انداز کچھ نرالے ہیں
یوں تو درد ہزار بار ہوا

دل بے تاب کا خدا حافظ
دامن صبر تار تار ہوا

وہ مجھے خاک میں ملا دیتے
خیر گذری کہ خاکسار ہوا

لب بھی پر شورِ اشک بھی غمّاز
کوئی میرا نہ راز دار رہا

اب وفا کرنے کا مزہ نہ رہا
تو جفا کر کے شرمسار ہوا

اسکی رحمت کا لطف اٹھانا تھا
جا نگر میں گنہگار ہوا

تو مقلّد ہے رنگ وحشت کا
اے ظفر سب کو اعتبار ہوا

(خاص)

نمودِ حیات

[خان شاکر غزنوی ایڈیٹر "چمنستان" لاہور]

دنیائے رنگ و بو کی اک حورِ نو بیکم
فردوسِ زندگی کی گلریز سرد پیکر

گلپوش، ناز پرور، نکہت کا اک سراپا
جنت بدوش یعنی عورت کا اک سراپا

بھیگا سا اُلجھا سا صبح کا اک سماں ہے
وادی میں رنگ و بو کی بیٹھی وہ مرقّع

شبنم کے چھوٹے چھوٹے قطرے پڑے ہوئے ہیں
پتّے پہ ہر کنول کے موتی جڑے ہوئے ہیں،

فطرت کا سحر اسکی آنکھوں میں چھا رہا ہے
اور جوشِ بے خودی سے ہر ذرہ گا رہا ہے

اُس مہ جبیں نے توڑا نازک سا ایک پتّہ
جسپر پڑا ہوا تھا شبنم کا ایک قطرہ

جنبش سے انگلیوں کی قطرہ ڈھلک پڑا ہے
پتّے پہ گر کے نیچے پانی میں جا گرا ہے

قطرے کا یوں ڈھلکنا اک سحرِ بیخودی تھا
اس حور کی نظر میں اک رازِ زندگی تھا

قطرے نے گرتے گرتے چپکے سے کچھ کہا ہے
افسردہ جسکو سن کر بے حد وہ مہ لقا ہے

انساں کی زندگی بھی ہے اک نمودِ قطرہ
اس کا وجود بھی ہے گویا وجودِ قطرہ

برگِ حیات پر سے ڈھلکیگا آہ یوں ہی
پیمانہ زندگی کا چھلکیگا آہ یوں ہی

(خاص)

چمن

مجبوری کی شادی

(مترجمہ ڈاکٹر بہزا النوری چیف ایڈیٹر چمن امرتسر)

[مندرجہ ذیل مزاحیہ ڈراما مولیئر نے ۱۶۶۴ء میں لوئیس شاہ فرانس کو خوش کرنے کے لئے لکھا تھا۔ شاہ لوئیس نے خود بھی اس میں پارٹ کیا تھا۔]

افراد

شوکت .... ایک بوڑھا نواب
ببّن .... شوکت کا دوست
نجمہ .... شوکت کی منسوبہ جو گویا بیٹی ہے
کلیم .... ایک فلسفی
نعیم .... ایک فلسفی
مظفر .... نجمہ کا بھائی مشہور پہلوان
دلاور .... نجمہ کا بوڑھا باپ

پردہ اُٹھتا ہے

شوکت۔ آئیے نواب صاحب
ببّن۔ آداب عرض کرتا ہوں۔ کہئے سرکار کے مزاج کیسے ہیں۔
شوکت۔ شکر ہے۔ (دو قدم کے بعد) میں ایک معاملہ میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا تھا۔
ببّن۔ ارشاد۔ ارشاد۔
شوکت۔ بات یہ ہے کہ ....
ببّن۔ فرمائیے۔ فرمائیے۔ آپ رُک کیوں گئے؟

شوکت۔ آپ وعدہ کیجئے کہ اس معاملہ میں بالکل صحیح مشورہ دینگے۔
ببّن۔ بالکل صحیح آپ ارشاد تو فرمائیے۔
شوکت۔ بات یہ ہے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔
ببّن۔ شادی! آپ اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔
شوکت۔ جی!
ببّن۔ تو پہلے یہ ارشاد فرمائیے کہ آپ کی عمر کیا ہے؟
شوکت۔ میری!
ببّن۔ جی
شوکت۔ بھلا آپ کیا خیال کرتے ہیں۔
ببّن۔ یہی ۵۵ یا ۶۰ کے لگ بھگ۔
شوکت۔ ہیج! یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔
ببّن۔ مجھے یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ یا تو آپ کا دماغ پھر گیا ہے۔ یا آپ سٹھیا گئے ہیں آپ کے منہ میں دانت نہیں پیٹ میں آنت نہیں آخر کس امید پر شادی کرتے ہیں۔
شوکت۔ اور مجھے یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ آپ غلطی پر ہیں۔ میں نے ایک ایسی بیوی کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح میرے لئے غیر موزوں نہیں ہو سکتی۔
ببّن۔ تو پھر یہ اور بات ہے کیا آپ اپنی آئندہ بیوی سے محبت کرتے ہیں۔
شوکت۔ قطعی۔ دل و جان سے۔
ببّن۔ دل و جان سے۔ ...
شوکت۔ جی!

ببن - اور وہ!

شوکت - وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے مختصر تو یہ ہے کہ آج میری شادی ہونیوالی

ببن - آج ہی -

شوکت - جی -

ببن - تو پھر بحث بیکار ہے -

شوکت - جی! بھلا آپ خود سوچیں میں کسی سے کم ہوں - اگر چہ میری عمر ۶۰ - ۶۵ کے لگ بھگ ہونے کو آئی لیکن خدا کے فضل سے چہرے پر وہ رونق ہے کہ نوجوانوں کے رنگ مقابلے میں پھیکے معلوم ہوتے ہیں اگر میری ٹانگیں ضعف کے شدت سے لرزتی ہیں لیکن واللہ جب میں رجبس پہنکر ذرا تن کر چلتا ہوں تو پنڈلیوں کا تناسب کیا بہار دیتا ہے -

ببن - (منہ پر ہاتھ رکھکر ہنسی روک کر) بالکل درست واللہ - باللہ آپنے خوب ارشاد فرمایا ضرور شادی کر لیجئے -

شوکت - جی!

ببن - اور وہ خوش نصیب عورت کون ہے جسے آپ اپنی زوجیت میں لائینگے -

شوکت - نجمہ -

ببن - نجمہ حسین و دلربا گرجہ کہ بیٹ پر وہ بھی تو نہیں کرتی وہ -

شوکت - جی وہی -

ببن - واقعی -

شوکت - واقعی -

ببن - وہی نجمہ نا جس کے بھائی کا نام مظفر ہے اور جو مشہور پہلوان ہے -

شوکت - جی! جی! وہی! اب کیا فرماتے ہیں آپ -

ببن - بہت خوب انتخاب ہے لیجئے اجازت مرحمت فرمائے - آداب عرض کرتا ہوں

(علحدہ ہوکر)

نجمہ اور شوکت کی شادی کیا خوب گلاب سے کانٹے کا ملاپ ہے ۲۵

ریشم میں گاڑھے کا پیوند - بدصورتی سے نزاکت کا اجتماع کیا خوب کہاں نجمہ - کہاں شوکت -

شوکت - (علحدہ) واقعی میری شادی مبارک ہے جب کسی شخص کے سامنے اپنی شادی کا ذکر کرتا ہوں، تو وہ ہنسنے لگتا ہے - واقعی مبارک شادی ہے -

نجمہ داخل ہوتی ہے

(نواب شوکت آگے بڑھ کر) پیاری نجمہ کہاں جارہی ہو - آج تو تم ماہ و خورشید کو شرما رہی ہو -

نجمہ - میں بازار سے کچھ سنگار کی چیزیں خریدنے جا رہی تھی -

شوکت - پیاری نجمہ سچ بتاؤ تم کو یہ شادی پسند ہے نا -

نجمہ - پسند کیوں نہ آئے گی؟ میرے والدنے مجھے گویا قفس میں محبوس کر دیا تھا - اگر چہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مجھے آزادی حاصل ہوگئی تھی لیکن پھر بھی میرے طرز عمل پر نکتہ چینی ہوتی رہتی ہے میری حرکات کی نگرانی کی جاتی تھی - خدا کا شکر ہے کہ ان پابندیوں سے رہائی دینے کے لئے آپ آگئے میرا ارادہ ہے کہ شادی کے بعد اپنے آپ کو مسرت و عشرت میں غرق کردوں مجھے کامل امید ہے کہ آپ پرانے زمانے کے شوہروں کی طرح مجھے قفس میں رکھنا پسند نہ کریں گے - مجھ پر اعتبار رکھیں گے - مجھے تو آپ پر کبھی شبہ نہ ہوگا - امید کہ آپ بھی میرے متعلق کبھی اپنے دل میں شبہ کو جگہ نہ دیں گے - لیکن کیا بات ہے - آپ کے چہرے کا رنگ کیوں متغیر ہوگیا -

شوکت - (گھبرا کر) میرے سر میں ذرا درد ہے -

نجمہ - کوئی بات نہیں آج کل عام لوگوں کو درد سر کی شکایت رہتی ہے - خدا حافظ -

نواب ببن داخل ہوتا ہے

ببن - آداب عرض کرتا ہوں شوکت صاحب! آپ فرماتے تھے نا

کہ کسی سنار کی ضرورت ہے۔ لیجئے حاضر ہے۔

سنار کو پیش کرتا ہے

شوکت - شکریہ! شکریہ! لیکن سنئے تو ببن صاحب! میرے دل میں کچھ شک پیدا ہو گیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں کیا نہ کروں شائد میں اپنی شادی کو روک دوں پھر سونار کی کیا ضرورت رہے گی۔

ببن - ہائیں ہائیں - نواب صاحب یہ کیا بات ہے شادی کو روک دوں۔

شوکت - جی رات مجھے ایک عجیب و غریب خواب آیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب تک اس کی تعبیر نہ معلوم ہو جائے ذرا شادی رکی رہے تو بہتر ہے۔

ببن - بہت بہتر اس معاملہ میں آپ فلسفیوں سے مدد لیجئے جو آپ کے ہمسائے میں رہتے ہیں۔

چلا جاتا ہے

شوکت - (اپنے آپ سے) بالکل درست ہے چلوں کسی فلسفی کے پاس۔

کلیم کے مکان میں داخل ہوتا ہے

کلیم کسی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے۔

جاؤ، جاؤ تم منطق کے ابتدائی اصولوں سے بے خبر ہو۔

شوکت - خوب مجھے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔

کلیم نے شوکت کو نہیں دیکھا۔

وہ اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتا ہے

یقیناً تم کیا خیال کرتے ہو۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ میرے پاس بات کے ثبوت میں وزن دار دلائل ہیں میں ارسطو کی تصانیف سے ثابت کروں گا کہ تمہارا استدلال غلط ہے۔

شوکت - (اپنے آپ سے) معلوم ہوتا ہے کہ فلسفی صاحب کسی معقول آدمی سے جھگڑ رہے ہیں۔

(فلسفی سے مخاطب ہو کر) کلیم صاحب! اے کلیم صاحب! قبلہ سنئے تو ذرا

کلیم - کچھ نہیں سنتا - ہاں میں نے مان لیا کہ ارسطا طالیس ٹھیک کہتا ہے لیکن آدمی زادہ طرفہ معجون است۔

شوکت - مولینا آداب عرض کرتا ہوں۔

کلیم - آداب عرض - آئیے کیا ارشاد ہے۔

شوکت - میں چاہتا تھا . . . .

کلیم - (پھر مڑ جاتا ہے اور سلسلہ کلام شروع کر دیتا ہے) تم جانتے ہو تم نے کیا کیا ہے تم نے صغریٰ اور کبریٰ کی ترتیب میں غلطی کی ہے۔

شوکت - میں . . . .

کلیم - تمہارا صغریٰ مہمل ہے کبریٰ غلط اور نظریہ بکواس۔

شوکت - مولینا آپ اس قدر خفا کیوں ہیں۔

کلیم - جناب!

شوکت - یہ خفگی کیسی۔

کلیم - بات یہ ہوئی کہ ایک جاہل مطلق نے ایک ایسی بات کہی جو خطرناک خوفناک مہلک حد تک غلط ہے۔

شوکت - کیا میں پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اس نے کیا کہا۔

کلیم - اس نے کہا تھا "ٹوپی کی صورت"

شوکت - تو اس نے کون سا جرم کیا۔

کلیم - جرم سا جرم جناب عالی آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ "شکل اور صورت" میں زمین اور آسمان کا فرق ہے - صورت جاندار اشیا کی ظاہری ہیئت کا نام ہے - بے جان اشیا کے مظاہر کو شکل کے نام سے پکارتے ہیں۔ (پھر مڑ کر)

تم جاہل مطلق ہو - تم یہ بھی نہیں جانتے کہ استدلال کس بلا کا نام ہے

شوکت - مولینا حوصلے سے کام لیجیے۔ اس بیوقوف پر رحم کیجیے جو یہ بھی نہیں جانتا کہ شکل اور صورت میں کیا فرق ہے

کلیم - (سنی ان سنی ایک کر کے) ایسی غلطی کا ارتکاب . . . .

شوکت - یقیناً - اس نے غلط کہا لیکن سنئے تو -
کلیم - میں کہتا ہوں کہ ارسطو کے نظام فلسفہ میں - - - -
شوکت - مولینا! میں آپ سے ایک اہم کام کے متعلق مشورہ لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں - بات یہ ہے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں - میری انتخاب کردہ محبوبہ حسین ہے سرجمال ہے - پڑھی لکھی ہے - میں آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ وہ مجھے دغا تو نہ دیگی - بے وفا تو نہ ثابت ہوگی -
کلیم - بجائے یہ کہنے کے کہ ٹوپی کی ....
شوکت - مولینا - میری بات بھی سنئے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے اور آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں -
کلیم - (شوکت سے مخاطب ہوکر) معاف کیجئے مجھے اس وقت سخت غصہ ہے اور غصہ بھی بجا طور پر -
شوکت - اب غصہ تھوک ڈالئے اور میری بات سنئے میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں -
کلیم - آپ کونسی زبان استعمال کریں گے ؟
شوکت - کونسی زبان -
کلیم - جی ؟
شوکت - لاحول ولاقوت! وہی زبان جو میرے منہ میں ہے اور کونسی زبان استعمال کر سکتا ہوں میں -
کلیم - میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کس زبان میں باتیں کرینگے
شوکت - یہ دوسرا سوال ہے -
کلیم - آپ اطالوی زبان میں باتیں کرینگے ؟
شوکت - نہیں -
کلیم - ہسپانوی ؟
شوکت - نہیں !
کلیم - انگریزی -
شوکت - نہیں -
کلیم - لاطینی ؟
شوکت - نہیں !
کلیم - دلندیزی ؟
شوکت - نہیں -
کلیم - یونانی ؟
شوکت - نہیں -
کلیم - ترکی ؟
شوکت - نہیں !
کلیم - عربی ؟
شوکت - نہیں
کلیم - فارسی ؟
شوکت - نہیں -
کلیم - سنسکرت ؟
شوکت - نہیں - اُردو! اُردو! اُردو!!!
کلیم - بہت خوب تو ذرا دائیں طرف آجائے - بایاں کان صرف غیر زبانوں کے لئے مخصوص ہے - مادری زبان کیلئے میں نے دایاں کان رکھا ہے
شوکت - بہت خوب! تو بات یہ ہے کہ میں ایک حسین مہ جبین سے شادی کرنا چاہتا ہوں - مجھے اس - - -
کلیم - (اپنے آپ سے) کلام ذریعہ اظہار مطالب ہے عین اسطرح جس طرح تصورات اشیاء کے آئینہ دار ہیں - الفاظ تصورات کے آئینہ دار ہیں -

شوکت اپنے ہاتھ سے کلیم کا منہ بند کر دیتا ہے

کلیم ہاتھ ہٹا کر سلسلہ کلام جاری رکھتا ہے

تاہم الفاظ میں اور دوسرے مظاہر کائنات میں بڑا فرق ہے -

الفاظ اصل کی نقل بھی ہیں اور اصل بھی۔ دوسرے مظاہر صرف اصل
کا ایک پرتو ہوتے ہیں۔
شوکت۔ خدا فلسفے کو غارت کرے۔

کلیم مکان کے اندرونی حصے میں داخل ہوتا ہوا کہتا جاتا ہے۔

یقیناً الفاظ دلی جذبات کا آئینہ ہیں۔ روح کا عکس ہیں ہماری
شخصیت اسی عکس کے ذریعہ نمودار ہوتی ہے۔

پھر باہر آجاتا ہے۔

(شوکت سے مخاطب ہوکر) از بس کہ الفاظ دلی جذبات و
خیالات کے آئینہ دار ہیں تم بھی اس ذریعہ اظہار سے کام لے کر مجھے اپنے
دل کا راز بتاؤ۔ بتاؤ تمہارے دل میں کیا خیالات موجزن ہیں۔
شوکت۔ یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔ لیکن آپ میری بات سنیں بھی۔
کلیم۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔ کہو!
شوکت۔ میں کہتا ہوں مولینا!
کلیم۔ اختصار۔ اختصار!!
شوکت۔ قطعی!
کلیم۔ اور طوالت سے پرہیز
شوکت۔ جناب من . . .
کلیم۔ اپنی گفتگو کے حاصل کو ایک مختصر مجموعہ الفاظ میں مقید و
محصور کر دیجئے۔
شوکت۔ در اصل . . . .
کلیم۔ انقطاع کلام یا ترک معللات تنقیح طلب کا جواز مشکوک ہے۔

شوکت ایک پتھر اٹھا لیتا ہے تاکہ فلسفی کے رسید کرے

کلیم۔ کیا تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔ اپنے دلی جذبات کے اظہار کے بجائے
اس لٹھی سے کام لیتے ہو۔ جاؤ۔ جاؤ تم اس گدھے سے بھی زیادہ
احمق ہو جس نے ٹوپی کے متعلق غلط الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ میں
استدلال سے کام لے کر ثابت کر سکتا ہوں کہ تم ہمیشہ سے ایک حیوان
رہے اور حیوان رہوگے۔ اور میں علامہ کلیم ہوں۔ علامہ کلیم تھا اور
علامہ کلیم رہوں گا۔
شوکت۔ جہنمی بکواسی!
کلیم۔ ایک فاضل عصر ایک عالم اجل۔
شوکت۔ اور بھی کچھ؟
کلیم۔ ایک شخص مشخص۔ محقق و مستغرق۔ فاضل علوم حاضرہ۔ مورخ
سائنس داں۔ زباں داں عالم نفسیات ماہر طبیعیات و لسانیات و
سنگیات و جمالیات و اقلیدسات وغیرہ وغیرہ ہم۔

شوکت چلا جاتا ہے

شوکت۔ ان فلسفیوں سے خدا سمجھے اچھا میں نعیم کے پاس جاتا ہوں
شاید اس سے کام نکل آئے۔
نعیم۔ آئیے کیا ارشاد ہے . . . .
شوکت۔ میں آپ سے مشورہ چاہتا ہوں (اپنے آپ سے) خدا کا شکر
ہے۔ یہ فلسفی کسی کو باتیں تو کرنے دیتا ہی نہیں (نعیم سے مخاطب ہوکر)
تو جناب میں اس لئے یہاں آیا ہوں کہ آپ سے مشورہ کروں۔
نعیم۔ شوکت صاحب۔ یہ قطعی طریقہ ادائے مطالب مجھے ناپسند ہے
فلسفہ کی تعلیم ہے کہ ہر بات کے متعلق شک و شبہ کو دل میں جگہ دینی
چاہیئے۔ ہر ایک شے کے متعلق مشکوک آمیز الفاظ استعمال کرنے چاہئیں
یہ کہنے کی بجائے کہ میں اس لئے آیا ہوں آپکو کہنا چاہئے تھا کہ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ میں آیا ہوں۔
شوکت۔ معلوم ہوتا ہے۔
نعیم۔ ہاں۔
شوکت۔ واللہ معلوم تو ہوگا ہی میں آ جو گیا ہوں۔
نعیم۔ ضروری نہیں ہو سکتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ آپ آگئے ہیں

اور دراصل آپ نہ آئے ہوں۔
شوکت۔ تو کیا یہ سچ نہیں کہ میں اس جگہ آ گیا ہوں۔
نعیم۔ مشکوک ہے۔ مجھے ہر بات کے متعلق شک ہے۔
شوکت۔ تو کیا میں اس جگہ موجود نہیں ہوں؟ کیا میں آپ سے باتیں نہیں کر رہا؟
نعیم۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے باتیں کر رہے ہیں اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ یہاں ہیں۔ لیکن یہ یقین نہیں کہ یہ دونوں باتیں واقعی ہیں۔
شوکت۔ یہ خوب رہی میں موجود ہوں اور آپ مجھ سے باتیں کر رہے ہیں اور پھر بھی یہ دونوں باتیں یقینی نہیں۔ خوب صاحب! خوب! خیر یہ تکلفات برطرف آپ مجھے صلاح تو دیجئے۔ بات یہ ہے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔
نعیم۔ مجھے اس بات کے متعلق کوئی علم نہیں۔
شوکت۔ میں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اب تو آپ کو معلوم ہو گیا۔
نعیم۔ شاید ایسا ہی ہو۔
شوکت۔ میری منسوبہ حسین ہے ماہ جبین ہے۔
نعیم۔ دونوں باتیں ممکن ہیں۔
شوکت۔ اگر میں اپنی منسوبہ سے شادی کرلوں تو اچھی بات ہوگی یا بُری۔
نعیم۔ اچھی یا بُری۔
شوکت۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس بات میں میرے لئے بھلائی ہے یا بُرائی
نعیم۔ جیسا بھی ہو۔
شوکت۔ کیا میری شادی کا انجام اچھا نہ ہوگا۔
نعیم۔ جو کچھ بھی ہو۔

شوکت۔ از راہ کرم میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دیجئے۔
نعیم۔ میرا ارادہ یہی ہے۔
شوکت۔ میں اپنی منسوبہ سے محبت کرتا ہوں۔
نعیم۔ ممکن ہے۔
شوکت۔ اس کا والد رضامند ہے۔
نعیم۔ ہوگا!
شوکت۔ لیکن مجھے خوف ہے کہ وہ بے وفا ثابت ہوگی۔
نعیم۔ یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہے۔
شوکت۔ آپ کا کیا خیال ہے۔
نعیم۔ یہ بات ناممکن نہیں ہے۔
شوکت۔ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے۔
نعیم۔ معلوم نہیں۔
شوکت۔ آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں۔
نعیم۔ جو آپ کا جی چاہے کیجئے۔
شوکت۔ میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔
نعیم۔ مجھے اس سے کیا کام!
شوکت۔ (اپنے آپ سے) اچھا ذرا اسے مزا چکھاتا ہوں۔ نعیم کو مارنا شروع کر دیتا ہے۔
نعیم۔ مار ڈالا۔ مار ڈالا۔
شوکت۔ اب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ تم نے اپنے "ممکن ہے" اور "ناممکن نہیں ہے" سے میرا دل کباب کر دیا تھا۔
نعیم۔ یہ کیا گستاخی ہے۔ آپ نے ایک عالم اجل و فاضل عصر کو کیوں مارا۔
شوکت۔ عالم صاحب! الفاظ کا صحیح انتخاب کیجئے۔ ہر بات کے متعلق شک سے کام لیجئے۔ یہ کہنے کی بجائے کہ میں نے آپ کو مارا ہے آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے آپ

کو دھپید مپایا ہے۔

نعیم۔ میں آپ کے خلاف استغاثہ کروں گا۔

شوکت۔ مجھے اس سے کیا کام۔

نعیم۔ میرے جسم پر مار کے نشان موجود ہیں۔

شوکت۔ ممکن ہے۔

نعیم۔ تم جانتے ہو کہ تم نے مجھے مارا ہے۔

شوکت۔ یہ بات ناممکن نہیں ہے۔

نعیم۔ میں تمہارے نام وارنٹ نکلوا دوں گا۔

شوکت۔ مجھے اس بات کے متعلق کوئی علم نہیں

نعیم۔ تم سزا پا جاؤ گے

شوکت۔ جیسا بھی ہو۔

(نعیم چلا جاتا ہے)

شوکت (تنہائی میں) اب کیا کرنا چاہئے۔ بے شک میرے لئے یہ شادی نامناسب معلوم نہیں ہوتی۔ چلتا ہوں اور دلاور سے ملتا ہوں۔ شاید اس مخمصے سے نجات پانے کی کوئی صورت نکل آئے

دلاور کے مکان میں داخل ہوتا ہے۔

دلاور۔ آؤ بیٹا۔

شوکت۔ جناب عالی قبلہ و کعبہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ

دلاور۔ کہو بیٹا کیا بات ہے۔

شوکت۔ جناب عالی بات یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں آپ کی حسین و جمیل دختر نیک اختر کے لئے مناسب شوہر نہیں ہوں۔

دلاور۔ کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔ تم ہر طرح سے اس کے لائق ہو۔

شوکت۔ نہیں نہیں یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے اور اس کے علاوہ مجھے ایک ایسی بیماری ہے جس کی وجہ سے میرے اچانک مر جانے کا اندیشہ ہے۔ ایسی حالت میں میرا شادی کرنے کا خیال یقیناً حماقت ہے۔

دلاور۔ بہت اچھا میں اپنے بیٹے سے اس بات کا ذکر کرتا ہوں۔

تھوڑے عرصہ کے بعد مظفر داخل ہوتا ہے اس کے ہاتھ میں ایک قمچی ہے

مظفر۔ جناب میں سنتا ہوں کہ آپ میری ہمشیرہ سے شادی کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

(قمچی دکھاتا ہے)

شوکت۔ (گھبرا کر) جناب . . . .

مظفر۔ جناب وناب کچھ نہیں آپ شادی کریں گے یا نہیں۔

شوکت۔ کروں گا۔ پردہ گرتا ہے

(خاص)

سیر فلک

(مریخ کی دنیا کا ایک افسانہ)

(جناب لالہ چمن لال صاحب ایڈیٹر چمن امرتسر)

رشید نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

یہ واقعہ ۱۹۲۴ء کا ہے۔ اس وقت مریخ زمین سے نزدیک تر تھا میں دو ماہ تک اس دنیا سے دور رہا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں میں ان دنوں کہاں تھا ؟ میرے پاس مسلسل دو ماہ تک پرواز کرنے کے لئے ہیلی کاپٹر نہ تھا۔

اب مجھے بھی اس واقعہ کی تفصیلات یاد آگئیں۔ واقعی ایک شخص نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ مریخ تک ہو آیا ہے۔ لوگوں نے اس کے افسانہ پر اعتبار نہ کیا تھا اور اس نے تفصیلات دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اب میں نے رشید کی طرف غور سے دیکھا۔ میری اس سے واقفیت پرانی تو نہ تھی لیکن دوستی کے ابتدائی مراحل سے گذر کر پائیدار و استوار حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

میں نے کہا "ہاں کچھ یاد تو آتا ہے۔"

رشید نے کہا۔ آپ لوگوں نے بالاتفاق مجھے جھوٹا اور فریبی بنایا اس کے میں خاموش ہوگیا۔ ورنہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ کسی سیاح کی نظر سے نہیں گذرا۔ چاند کی چشم جہاں بیں نے بھی ایسے نظارے کم دیکھے ہوں گے۔

اصل واقعہ یوں ہے۔

میں شروع سے مریخ تک پرواز کرنے کا آرزومند تھا۔ ۱۹۲۰ میں جب یہ ستارہ زمین سے قریب ہونا شروع ہوا تو میرے ارادوں میں پختگی اور استقلال پیدا ہوگیا۔ میں نے حساب کرنا شروع کیا تین سال تک میں حساب میں مصروف رہا۔ ابھی تک وہ اعداد و شمار میرے قبضے میں ہے۔ میں آپ کو اُن کے مطالعہ کی زحمت نہ دوں گا۔ مختصراً عرض کردوں کہ میرے تمام کام کا مرکزی خیال یہ تھا کہ دنیا میں صرف ایک طاقت ہے جو مجھے مریخ تک پہونچا سکتی ہے اور وہ زمین کی گردش ہے ہوائی جہاز دو سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے زیادہ پرواز کرسکتا ہے اور میں نے اپنے ہوائی جہاز میں ایسے راکٹ لگائے تھے جن کی وجہ سے اسکی رفتار ۳۰۰ میل فی گھنٹہ ہوگئی تھی۔ پھر بھی میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ رفتار کتنی ہی سریع کیوں نہ ہوجائے۔ مریخ تک پہونچتے پہونچتے میرے خورد و نوش کا سامان ختم ہوجائے گا اور میں بھوکا مر جاؤں گا۔ الغرض میں اسی نتیجے پر پہونچا تھا کہ زمین کی حرکت و گردش سے کام لیکر میں کسی نہ کسی طرح مریخ تک پہونچ سکتا ہوں۔

زمین جو سورج سے ۹۲ ملین میل دار ہے۔ ایک سال میں اس شمع فروزاں کے گرد گھوم جاتی ہے اور اس تیز رفتاری سے گردش کرتی ہے کہ دنیا کی سطح پر کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی میں نے اپنے پٹرول اور راکٹ سے صرف اتنا کام لیا کہ کشش ثقل سے آزاد ہوگیا یعنی زمین کی قوت جذب نے مجھے متاثر کرنا چھوڑ دیا۔ اور بس مریخ تک میں اُسی طاقت کے ذریعہ پہونچا جو اس وقت آپ کو ۱۰۰۰ میل فی منٹ کے حساب سے پھرا رہی ہے۔ زمین سے علٰحدہ ہوجانے پر حرکت کا ہیجان علٰحدہ نہیں ہوجاتا۔ اسی طرح قائم رہتا ہے میں چاہتا تھا کہ اس بے پناہ قوت فرب سے کوئی کام لوں اور اسی کے ذریعہ مریخ تک جا پہونچوں۔ آخر کار میرے انتظام مکمل ہوگئے۔

میں نے مریخ تک پہونچنے اور وہاں سے واپس آنے کی تمام تفصیلات معلوم کرلیں۔ میں نے دو ماہ کے لئے کھانے کی چیزیں جمع کی ہیں پانی بوجھل معلوم ہوتا تھا اس لئے صرف اتنا ذخیرہ لیا جو ایک ماہ کے لئے کافی ہو میں سمجھتا تھا کہ پانی مریخ میں مل جائے گا۔ دوربینوں کے ذریعہ مریخ میں پانی دیکھا گیا ہے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ میں اس ذریعہ حیات سے محروم رہوں۔

سلنڈروں کا انتظام بھی ہوگیا میں نے ان میں ہوا بھری اب مریخ نزدیک آ رہا تھا۔ نزدیک تر آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ خدا کا نام لیکر چل کھڑا ہوں۔ میں نے کسی سے اپنے ارادے کا ذکر نہیں کیا۔ مجھے ڈینگ اور شیخی سے نفرت ہے۔ ہر شام میں مریخ کی طرف دیکھتا تھا اب وہ سرخ رنگ کا ہالہ سا معلوم ہوتا تھا۔

جس رات میں نے زمین کو خیرباد کہا اس رات مریخ اہل زمین سے ۴۰ ملین میل دور تھا۔ میں آپ کو حساب جغرافیہ اور اقلیدس کی اکتا دینے والی تفصیلات نہیں بتانا چاہتا۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ میں نے اپنے جہاز کو ایک گولی سمجھا اور اس سے مریخ کی طرف اسی طرح نشانہ باندھا جسطرح قادر انداز نشانہ باز کبوتر یا تیتر کا نشانہ باندھتا ہے اور پھر ہوائی جہاز میں سوار ہوکر چل پڑا میں نے اپنے گرد پیٹیاں باندھیں تاکہ جب زمین سے آزاد ہونے کے بعد ہوا کا دباؤ کم ہوجائے تو میرے اندرونی دباؤ کی وجہ سے میرا جسم دب کر نہ رہ جائے اور مجھے کوئی تکلیف نہ ہو اس کے علاوہ میرے پاس گرم کپڑے تھے تاکہ مکان کی بے تہا

سردی سے محفوظ رہ سکوں۔ مہ سردی کے تیز و تند تھپیڑوں سے بچانا اور پیٹھ کو سورج کی آتش فشاں کرنوں سے محفوظ رکھنا میرا فرض تھا۔ ممکن تھا کہ دفعتاً سردی سے میرا کوئی عضو گرجائے اور گرمی سے میرا دماغ خراب ہو جائے۔ میرے سامنے مکان کی سردی تھی اور پیچھے سورج کی ظالم روشنی اور گرمی۔

زمین کے اثر سے آزاد ہو کر میں نے محسوس کیا کہ میرے چاروں طرف سکوت مطلق حکمراں ہے۔ سردی بے پناہ۔ کھانا مشکل۔ غیرآباد فضا کے مہیب خلد کا منظر خوفناک۔ کوئی اور ہوتا تو خوف کے مارے اس کا دم نکل جاتا۔ لیکن میں جما رہا۔ میں نے جو ہوا بھری تھی اب اس سے کام لینا شروع کیا۔

میں یقیناً پریشانیوں اور تکلیفوں سے مرجاتا۔ لیکن یکایک سامنے مجھے مریخ نظر آیا۔ دن کی روشنی میں ایک زرد سفیدی مائل دائرہ نظر پڑا۔ چھوٹے سے چاند کی طرح۔ ذرا دائیں طرف اپنی محنتوں کو بارآور ہوتے دیکھ کر میری جان میں جان آگئی آج تک انسان کی آنکھ نے ایسا منظر نہ دیکھا ہوگا۔

آہستہ آہستہ مریخ کی نہریں دکھائی دینے لگیں۔ پھر سمندر نظر آئے۔ اب چاند کی طرح ہوگیا۔ بڑا ہوتا چلا گیا۔ اب پہاڑ صاف نظر آرہے تھے۔ دریا۔ ندیاں۔ اور مریخ کا راز جو آج تک تخیل کا سائنس دانوں کی نکتہ آفرینیوں کا موضوع خاص رہا ہے۔ میرے لئے ایک کھلی ہونی بات تھی مجھے نیند آگئی۔

آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ اب مریخ زمین کی طرح نظر آتا ہے۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ سیارہ میرے نیچے ہے۔ اب سیارے نے میرے جہاز کو اپنی طرف جذب کرنا شروع کیا۔ میں ایک وادی میں اترا۔ کیونکہ وہاں میں اپنے جہاز کو پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔ اب زمین سے چلے ہوئے مجھے ایک ماہ کا عرصہ ہوگیا تھا۔ میں جہاز سے باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ مریخ زمین سے مختلف نہیں ہے میں نے بعض درختوں کی شاخیں توڑ کر جہاز میں رکھ لیں اور پانی کے حوض کو بھر لیا۔ پانی مصفا اور خوش گوار تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنے بدن کو پٹیوں کے بوجھ سے آزاد کیا۔ اور ندی میں نہانے کے ارادے سے اتر گیا۔ نہانے کے بعد میں نے اپنا ریوالور لیا اور اپنے دور کے بھائیوں سے ملاقات کی خاطر چل پڑا۔ جنگل میں سے ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے ایک عمارت نظر آئی۔ یہ عمارت مستطیل تھی۔ ۱۵ فٹ بلند اور دس فٹ وسیع اس کے بعض حصے دھات کے تھے۔ مضبوط دھات کی جالی کے اور اندر کا حصہ صاف نظر آتا تھا۔ اب میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس عمارت کے اندر کچھ لوگ چل پھر رہے ہیں میں نے آج تک ایسے لطیف ایسے نفیس شگفتہ اور نازک آدمی نہیں دیکھے عورتیں ایسی سبک اور خوبصورت تھیں گویا پھولوں کی پتیاں۔ اُن کے خرام میں ایک سادگی ایک وقار تھا جو دل میں پیوست ہوا جاتا تھا جب میں نے یہ دھات کی دیوار دیکھی تو مجھے یقین ہوگیا کہ ان لوگوں نے کسی جانور سے محفوظ رہنے کے لئے مکانوں کو اس طرح تعمیر کیا ہے۔ اور میں نے اپنا ریوالور سنبھال لیا۔ میں عمارت کے قریب گیا جھکا اور سلام کیا۔ انھوں نے میرے اشارے کو فوراً سمجھ لیا میں ان کے مقابلے میں ایک وحشی جانور معلوم ہوتا تھا۔ ان کی تہذیب ان کی خوش اخلاقی ان کی نفاست الفاظ کے ذریعے ادا نہیں ہو سکتی۔

میں دھات کی جالی کے ساتھ کھڑا ہوا ان سے باتیں کرتا رہا اگر اشاروں کے ذریعے مفہوم واضح کرنا باتوں میں داخل کیا جاسکتا ہے۔

میں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں جہاں رات کو وہ زمین کو چمکتا ہوا اکثر دیکھتے ہونگے۔ وہ فوراً میرا مطلب سمجھ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے اپنی زندگی کے متعلق
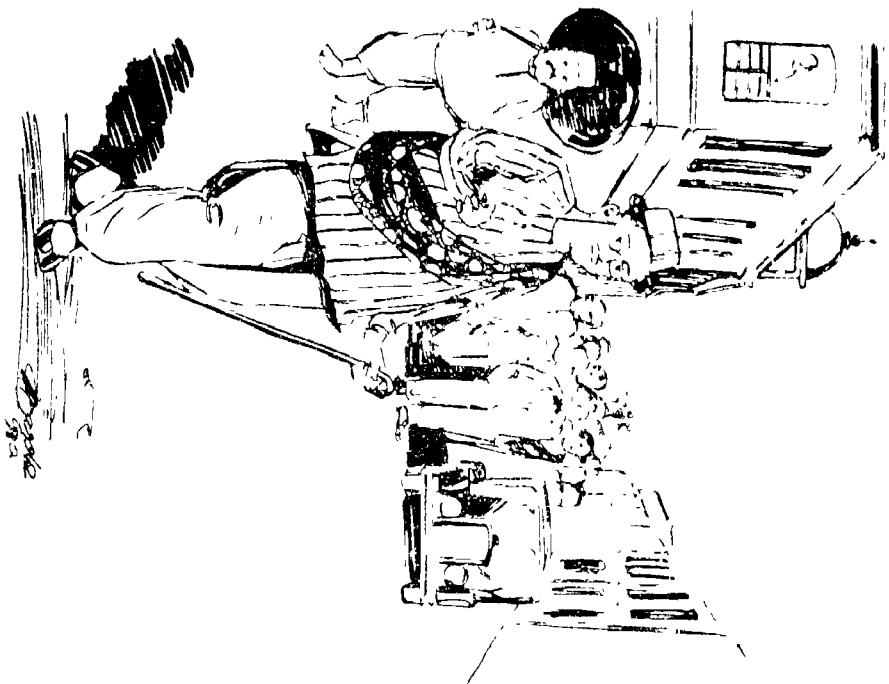
(بقیہ ۶۷۴ صفحہ پر دیکھئے)

ایڈیٹر 'بہار عالم' — ۱

'' میں بہت ہی لائق آدمی ہوں' میرا رسالہ بہترین رسالہ ہے - وغیرہ وغیرہ.........(سوچتے ہیں)........
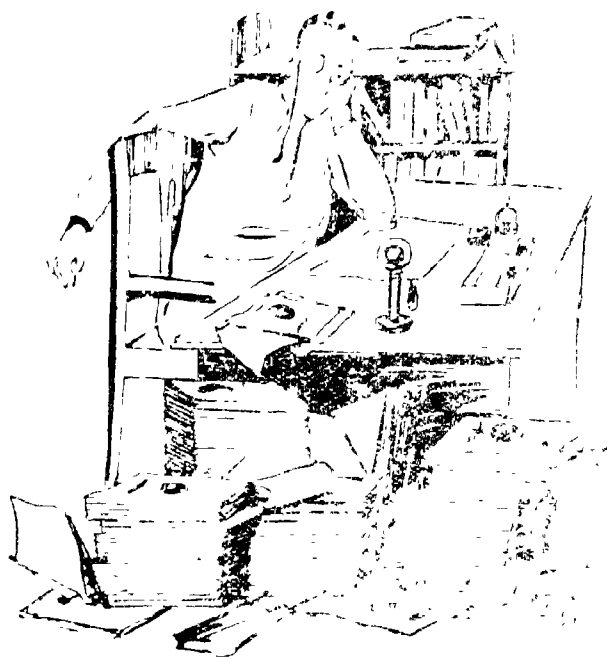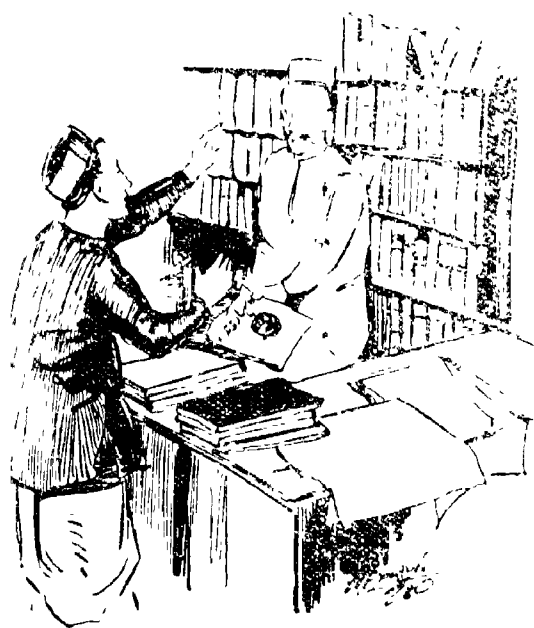
ایڈیٹر '' بہار عالم '' — ۲

''......کہ میں جب راستے پر چلتا ہونگا' سب کی نگاہیں مجھہی پر پڑتی ہونگی' کیونکہ میں ہوں ایڈیٹر 'بہار عالم'!

'بہار عالم' کی قدردانی — ۱
ردی کی ٹوکری میں!

'بہار عالم' کی قدردانی — ۲
خریدار -- معاف کیجئے، مجھے اس رسالہ کی ضرورت نہیں!

'بہار عالم' کی قدردانی — ۳
لائبریری میں علاوہ 'بہار عالم' کے سب رسالے دیکھے جاتے ھیں

'بہار عالم' کی قدردانی — ۴
وی - پی لینے سے انکار

بیچارہ اڈیٹر

یہ سمجھ کر سوچ کر بھرئیے اب مضمون میں
آپ نے کچھ لکھ دیا اور آگئے قانون میں

—بسمل الہ آبادی

"پریس یونین" — ۱
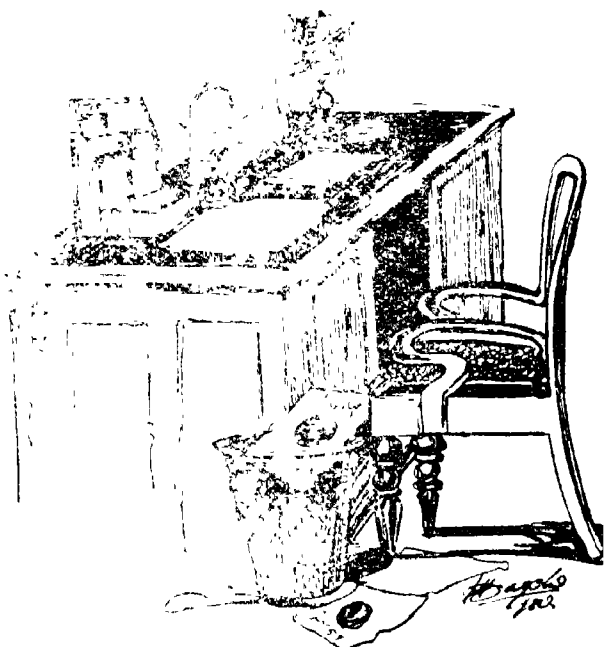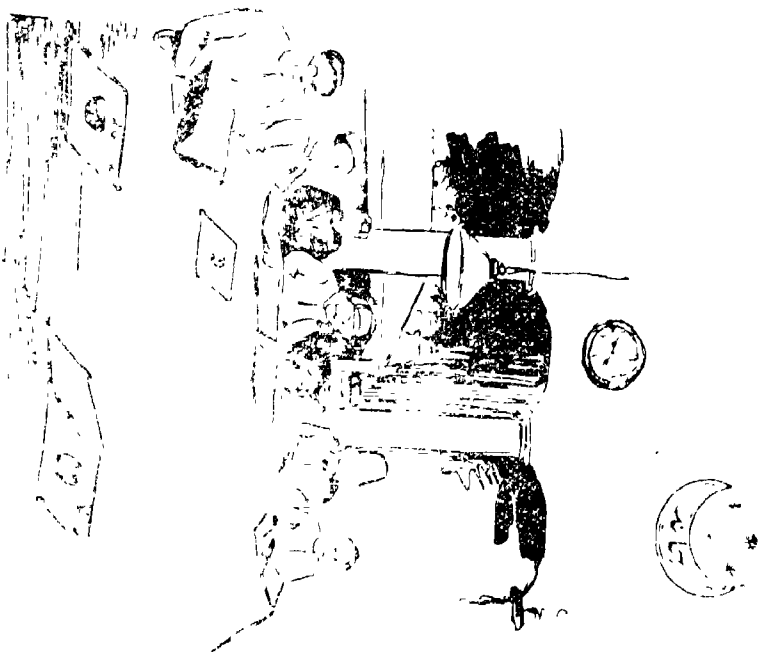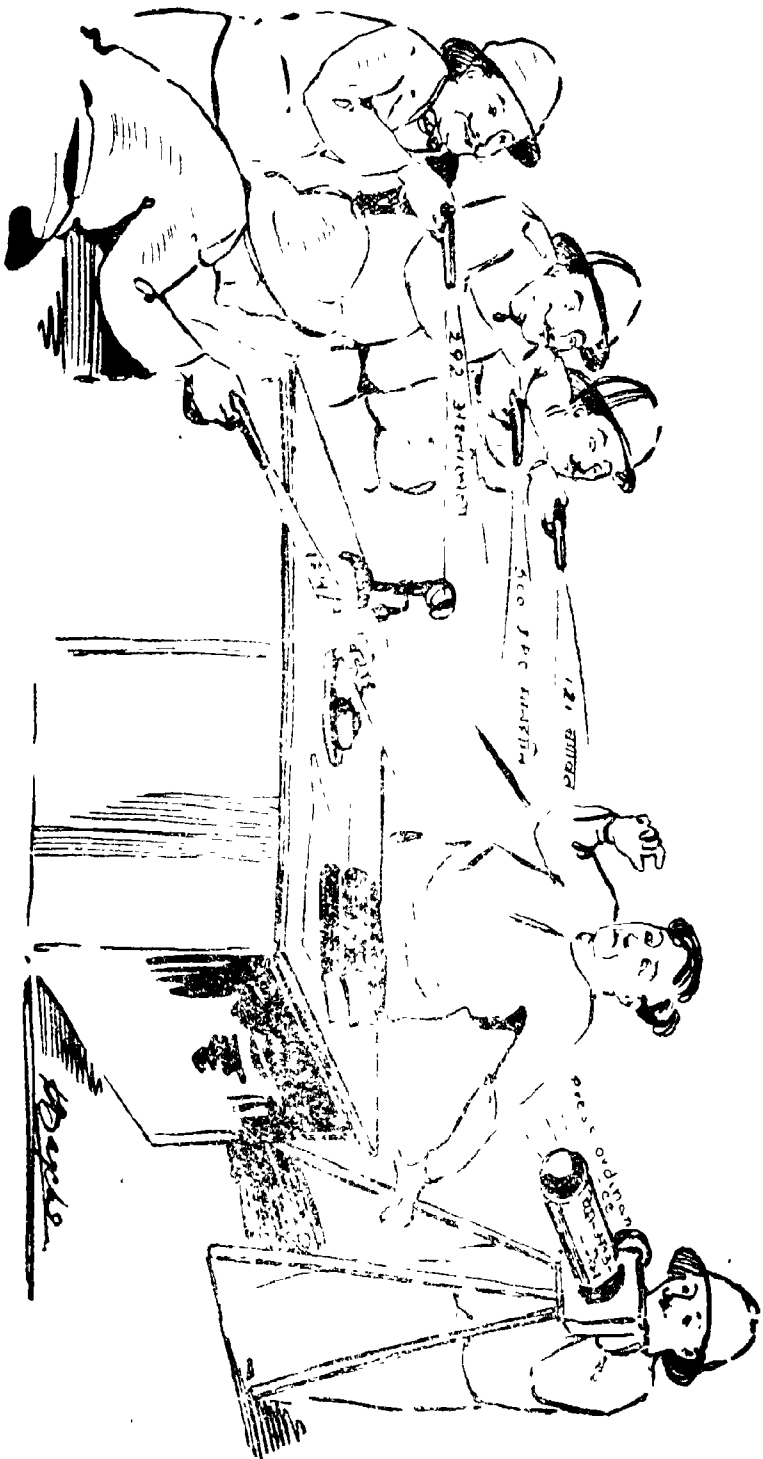
ہندوستان میں پریس یونین کی کوئی پروا نہیں کرتا، ایڈیٹروں میں خود میل جول نہیں ہے۔
اگر کہیں پریس یونین کی میٹنگ ہوتی تو انسان کا کہیں نام بھی نہیں ہوتا۔

"پریس یونین" — ۲

انگلینڈ میں پریس میں اتنا اتفاق ہے کہ
'جان بل' پریس یونین کے نام سے
کانپتے ہیں۔
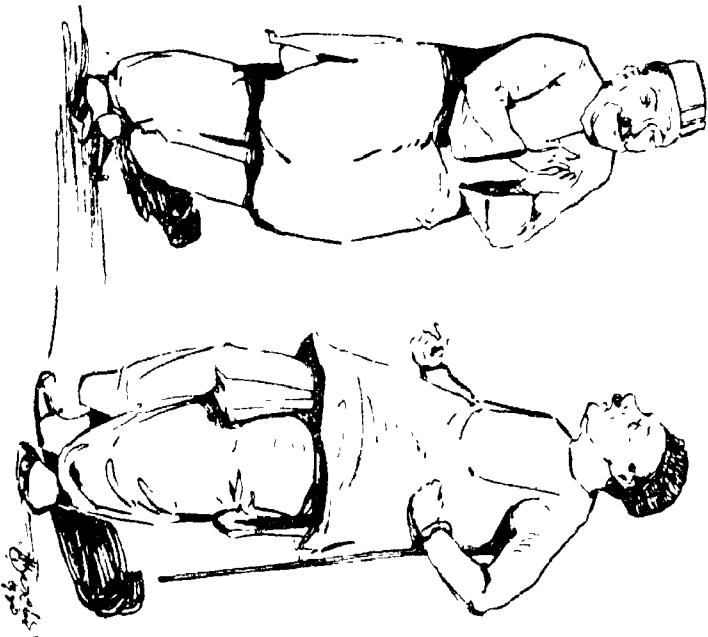
ایک تصویر کے دو رخ — ۱
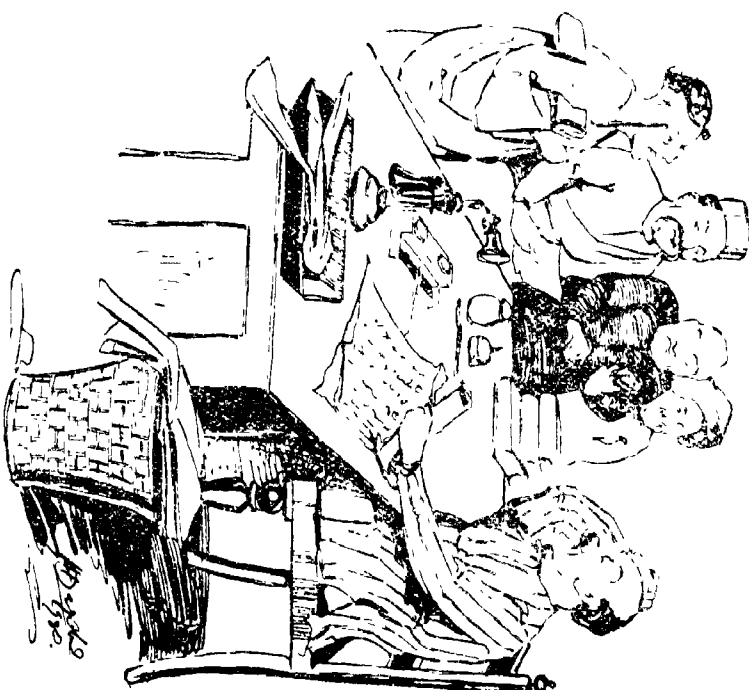
ایڈیٹر — میں آپ لوگوں سے عاجز آگیا هوں ' مجھے آپ کے
مضامین اور غزلوں کي مطلق ضرورت نہیں هے '

ایک تصویر کے دو رخ — ۲

ایڈیٹر — مجھے اس مرتبہ معاف کردیجئے ' اب کبھي آپ
کا مضموں بغیر آپ کے نام کے نہ چھاپونگا '

مالک - ایڈیٹر کی مصیبت — ۱
گورنمنٹ نے ضمانت طلب کی ہے............از ....

مالک - ایڈیٹر کی مصیبت — ۲
پریس بند کرنے پر سیکڑوں کے بھوکوں مرنے کا انتظام ہو جاتا ہے!
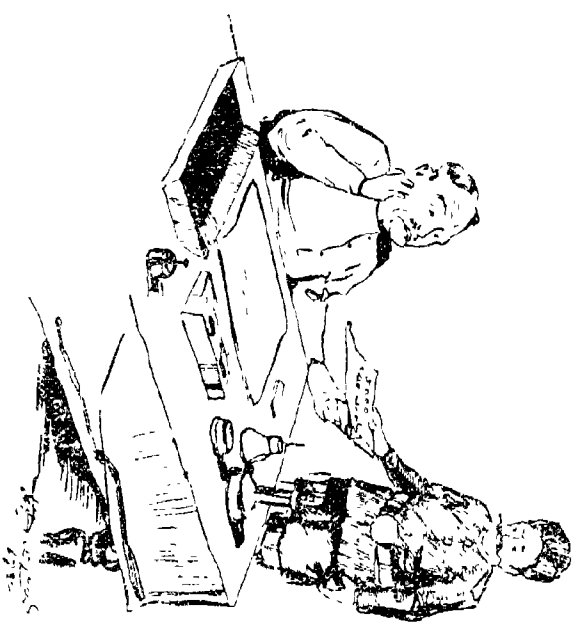
رسالہ جاری کرنے پر ——

اسکے ایک سال بعد!
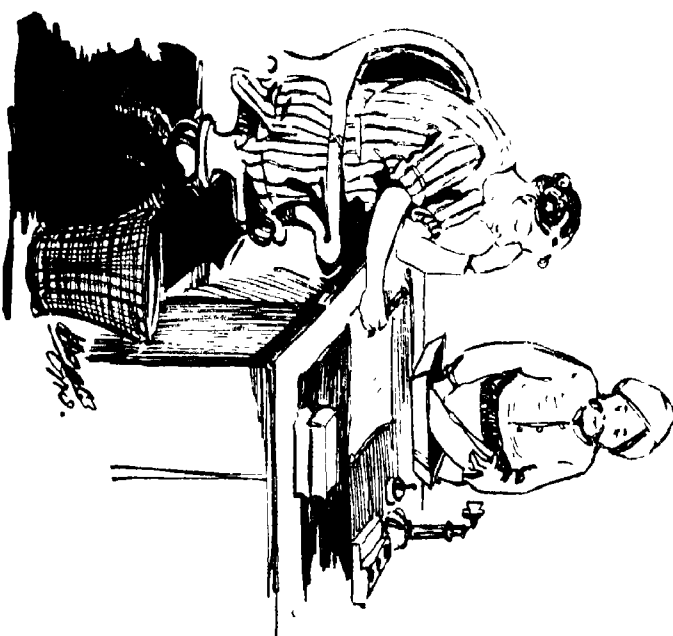
حسن خیال

اصنام العرب
یا
عربوں کے مشہور بت

[جناب پروفیسر محمد حسین صاحب محوی سابق ایڈیٹر حسن خیال اورنگ آباد]

زمانہ جاہلیت میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عربوں کی بت پرستی مشہور آفاق ہے، اگرچہ آپ کی نبوت سے پہلے سرزمین عرب میں اور بھی کئی مذہب رائج تھے، مگر بت پرستی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ عربوں کا سب سے بڑا بتوں کا مرکز خانہ کعبہ تھا۔ زمین عرب میں کئی بت بہت نامور اور خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان میں لات اور عزیٰ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بت خدائی کے منصب جلیل پر فائز رہ چکے ہیں۔ ان کے مختصر حالات حوالہ رقم کئے جاتے ہیں۔ طائف کا مشہور قبیلہ ثقیف جس نے اسلام کو بہت قوت اور امداد پہونچائی ہے، اسلام لانے سے قبل دو بتوں کی پرستش کرتا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام لات تھا اور دوسرے کا عزیٰ۔ یہ ان کے ایسے ہی معبود تھے جس طرح عربوں کے ہر قبیلے کا ایک الگ بت ہوا کرتا تھا کہ جاہل لوگ تو انھیں خدائے مطلق سمجھتے تھے۔ لیکن عقلمند ان بتوں کو صرف قربت الٰہی کا ذریعہ جانتے تھے۔

۱۔ لات: علمائے تاریخ کا بیان ہے کہ یہ لات ایک سفید چوکور چٹان تھی جس پر ایک شخص بیٹھکر ان حاجیوں کے ہاتھ گھی اور دودھ فروخت کیا کرتا تھا۔ جو ابتدائے جاہلیت کے زمانے میں حج کے لئے اطراف ملک سے آیا کرتے تھے۔ پھر بعد کو قبیلہ ثقیف کا یہ اعتقاد ہوگیا کہ ان کا حقیقی معبود اسمیں داخل ہوگیا ہے۔ انہوں نے اس پتھر کے اوپر ایک شاندار عمارت (بت خانہ) بنادی۔ اور اس کی باقاعدہ عبادت کرنے لگے۔ اس کے حاجب (پردہ دار یا دربان) اور خادم مقرر کئے اور یہ لوگ طواف کیا کرتے تھے۔ اور اس کو کعبہ کا مماثل سمجھنے لگے تھے۔ ایک قیمتی غلاف تیار کرکے اسے اُڑھا دیا تھا اور اس کے قرب وجوار میں شکار حرام و ناجائز سمجھتے تھے۔

جب قبیلہ ثقیف اسلام لے آیا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک محترم صحابی مغیرہ بن شعبہ رض کو طائف بھیجا مغیرہ رض نے جاکر اسکی عمارت کو ڈھادیا۔ اور اسے آگ لگادی۔ یاقوت حموی کا بیان ہے کہ: یہ بت ہنوز (یعنی اس کے زمانے میں) مسجد طائف کے نیچے پڑا ہے" مگر یہ شاید اس چٹان کا کوئی ٹکڑا ہوگا۔ جو اس عمارت کے جلانے اور ڈھانے کے بعد بچ رہا تھا۔ اس بت کے اوپر بنائی گئی تھی۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا اصلی نام "لاہ" تھا۔ اسلام سے کچھ پہلے (ہ) کو ت سے بدلکر لات کر لیا گیا۔

۲۔ العزّیٰ: یہ لفظ اعزّ کا مونث ہے، مورخین اور عرب کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ معزز بت عورت کی

صورت کا تھا، جو اپنے بال اور زلفیں بکھیرے ہوئے تھی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں کاندھوں پر رکھے ہوئے تھی۔ اور اپنی پنڈلیوں کو چم گھڑا رہی تھی۔

یہ بت مقام نخلہ شامیہ کی وادی میں تھا۔ جو مکہ سے کئی روز کے فاصلے پر، عراق کی جانب مصعد کی داہنی طرف ہے ظالم بن اسعد نامی ایک شخص نے اس بت کے نصب کر کے اس پر ایک مکان تعمیر کیا تھا۔ یہ بت قدامت کے لحاظ سے لات اور مناۃ سے نیا ہے یہ بت قریش کے نزدیک سب سے بڑا اور معزز تھا۔ وہ خصوصیت کے ساتھ اس کی زیارت کو آتے تھے۔ اس کے لئے تحفے طائف بھیجتے تھے اور قربانیاں کر کے اس کا تقرب حاصل کرتے تھے اس کی عزت و عظمت قریش میں بہ نسبت اور بتوں کے بہت زیادہ تھے۔ انھوں نے اس کے مصارف کے لئے وادی حراض کا ایک خاص ٹکڑا مخصوص کر دیا تھا۔ جس کا نام ستام تھا۔ اور اس کو کعبہ کے برابری ومساوات کا درجہ دیتے تھے۔

عزّیٰ بت کے خاص خادم۔ و حاجب شیبان بن جابر کی اولاد کے لوگ تھے اور اس بت کا سب سے بڑا پرستار سب سے پکا معتقد اور سب سے زیادہ مستقل عبادت گزار عاصی بن امید کا بیٹا ابواُحیحہ سعید تھا۔ یہ شخص مکہ میں مقیم اور قریش کو بہت عزیز تھا کسی کی یہ ہمت نہ تھی کہ جس رنگ کا عمامہ وہ باندھتا تھا کوئی اور اس رنگ کا باندھتا جب اسلام کی شوکت و قوت غالب ہوئی تو رسول اللہ صلعم نے خالد بن ولید سیف اللہ کو جو اسلام کے زبردست سپہ سالار تھے۔ عزّیٰ کے خاتمہ کے لئے بھیجا آپ نے جا کر اس کا سر توڑ دیا۔ اور اس کے مجاور دبیّہ بن حرمی سلمیٰ کو قتل کر دیا ۱۳۴۱ھ میں خیرالدین زرکلی شام کے مشہور ادیب و اہل قلم اور نامور شاعر و مصنف نے سفر حجاز کیا، اور اپنا ایک سفر نامہ شایع کیا ہے اس میں لکھتے ہیں۔ کہ ہیکل عزّیٰ کی نسبت طائف کے لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ ابھی تھوڑے عرصہ تک یہیں تھا۔ مگر جب محمد علی پاشا اور وہابیوں میں جنگ ہوئی تو یہ بت وہابیوں کے ہاتھ لگ گیا انہوں نے اس کا سر توڑ پھوڑ کر حضرت مسجد عباسی کے قریب باہر ڈال دیا۔ ابھی چند روز پہلے تک یہیں پڑا ہوا تھا۔ مگر کچھ عرصے سے نظر نہیں آتا ہے"۔ بعض لوگوں نے زرکلی سے یہ بھی بیان کیا کہ سیل کے راستے میں جو مکہ اور طائف کے درمیان میں ایک مقام ہے۔ ایک مجسمے کا نشان ملتا ہے جس پر گذرنے والے کو دور سے ایک انسانی صورت نظر آتی ہیں۔ جو ایک پتھر کی چٹان پر کھدی ہوئی ہے مگر جب اس کے قریب جاتا ہے تو لکیروں کے نشانوں اور چند اینڈے بینڈے مگر بہت دھندلے نقوش کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

۳۔ مناۃ: یہ بت یثرب (مدینہ منورہ) میں تھا اور جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ عرب کے بتوں میں بہت قدیم بت ہے اس بت کے سب سے زیادہ معتقد، تمام عرب قبائل سے زیادہ پجاری اوس اور خزرج کے قبیلے تھے۔ یہ دونوں قبیلے مدینہ کے نہایت ممتاز اور مشہور قبیلے تھے۔ اور جو قبائل یثرب اور اسکے جوار میں رہتے تھے جو اوس و خزرج کے قبیلے کے تھے۔ وہ سب اسی بت کی پرستش کرتے تھے۔ یہ لوگ کعبہ کا حج کرنے کے لئے مکہ میں آتے تھے، تمام مواقف ٹھہرنے کی جگہوں میں ٹھہرتے اور تمام مراسم حج ادا کرتے تھے۔ مگر سروں کو منڈاتے نہ تھے۔ حج سے فارغ ہوکر سیدھے

مناۃ کے پاس آتے اور اس کے اطراف میں ٹھہر کر سروں
کو منڈاتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ بغیر اس کے حج کی تکمیل نہیں
ہوتی۔ یہی حج کا تکملہ ہے۔ قریش اور دوسرے تمام عرب
بھی مناۃ کی تعظیم کرتے تھے۔

سنہ ۸ھ میں آنحضرت جو عام فتح کے دن تشریف
لائے تو آپ نے صحابہ کو مع ابوسفیان بن حرب کے بھیجا تاکہ مناۃ کی معبودیت
ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔ اصحاب نے جاکر حکم رسول کی
تعمیل کی اور جو کچھ اس کی ملکیت تھی وہ سب بھی لے آئے
اس بت کے پاس انھیں دو تلواریں بھی ملیں۔ یہ تلواریں
عرب کے ایک غسانی سردار حارث بن ابی شمر نے اس بت
کی خدمت میں ہدیہ بکمال عقیدت کیساتھ پیش کی تھیں۔
ان میں سے ایک تلوار کا نام مخذم تھا (کاٹ ڈالنے والی)
اور دوسری کا نام (رسوب) (اندر تک گھس جانے والی)
یہ دونوں تلواریں عرب کی مشہور آفاق تلواروں میں سے
تھیں۔ اس کے علاوہ مناۃ کے متعلق کوئی اور خاص
بات قابل تذکرہ نہیں معلوم ہوتی۔

۴۔ ھبل۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ بت سرخ عقیق اور
انسانی صورت کا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا۔ قریش
نے اسی حالت میں کہیں سے اسے پایا تھا۔ پھر انہوں نے اس
کا یہ ہاتھ سونے کا بنوا دیا۔ اور اس کو سطح کعبہ میں رکھا۔
جس شخص نے سب سے پہلے اسے نصب کیا تھا اس کا نام خزیمہ
بن مدرکہ ہے۔ اسی نسبت سے اس بت کو قریش "ھبل خزیمہ"
کہتے تھے۔ قریش کے بت وسط کعبہ میں اور اطراف کعبہ میں یوں
تو بہت سے تھے مگر ان کے نزدیک ہبل ہی سب سے بڑا بت تھا
اسکے خاص پرستار قبیلہ بنی کنانہ کے لوگ تھے، یہ قبیلہ انہیں
بتوں کی پرستش کرتا تھا۔ جیسے قریش پوجتے تھے۔
یہ بت بھی فتح مکہ کے دن اور بتوں کے ساتھ حضرت علی
کے ہاتھ سے ٹوٹا۔ رسول اللہ صلعم کے کاندھوں پر حضرت علی سوار تھے
اور بتوں کو توڑتے جاتے تھے۔

۵۔ وُدّ۔ اس بت کا ذکر قران شریف میں بھی آیا ہے
یہ ایک مرد کا بہت بڑا مجسمہ تھا۔ اسپر دو کپڑے منقوش تھے
ایک کپڑا تو پہنے ہوئے تھا اور دوسرا اوڑھے ہوئے گلے میں
تلوار حمائل تھی۔ ایک بڑی کمان پر کہنی ٹکائے تھا۔ اس کے
سامنے ایک نیزہ تھا جس میں جھنڈا لگا ہوا تھا، اور ایک
ترکش (تیر دان) بھی تھا جس میں تیر تھے۔ یہ بت خاص
طور پر قبیلہ "بنی وبرہ" کا تھا اور مقام دومۃ الجندل میں رکھا تھا
یہ مقام تاریخ اسلام میں مشہور اور آج کل جوف کے نام
سے معروف ہے۔ شام سے مشرق میں ذرا جنوب کی طرف
ہے اس کی دربانی (حجابت) کی معزز خدمت بنی فرافصہ
بن الاحوص کو حاصل تھی۔ یہ لوگ اصل میں کلبی خاندان
کے تھے۔ اسے بھی فتح مکہ کے دن توڑ کر ختم کر دیا۔

۶۔ سواع۔ یہ مقام ینبع میں تھا اور "ہذیل" اس کے
اصلی پرستار تھے۔ اس کی مجاورت اور دربانی کا شرف
بنو لحیان کو حاصل تھا۔

۷۔ یغوث۔ یہ بہت قدیم بت ہے اور قبیلہ مذحج کے
لوگ اس کے پرستار و عبادت گزار تھے۔ یہ بت یمن میں
ایک ٹیلے پر تھا" اور یہ ٹیلہ کے نام ہی سے معروف ہو گیا
تھا۔ بعد کو وہاں سے نجران پہونچا دیا گیا تھا۔

۸۔ یعوق: یہ بھی بہت قدیم ہے، یہ پہلے یمن میں تھا
اور ہمدان کا معبود تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے یہ صنعار

سے ایک گاؤں حیوان نامی میں تھا، اور یہ مقام مکہ سے دو روز کے فاصلے پر واقع ہے

یاقوت حموی کا بیان ہے کہ ہمدان یا کسی اور قبیلے کا کوئی شعر اس بت کے متعلق میرے سننے میں نہیں آیا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ جو لوگ جو اس بت کے اصلی پرستار اور عبادت گزار تھے۔ صنعا کے قریب رہتے تھے اور قبیلہ حمیر میں بہت زیادہ گھل مل گئے تھے۔ پھر انھیں کے ساتھ یہودیت کا مذہب اختیار کرلیا تھا کیونکہ حمیر کے سردار ذو نواس نے جب یہودیت کو اختیار کیا تو اس کے ساتھ حمیر کے سب لوگ یہودی ہوگئے تھے ۔

۹۔ نسر ۔ یہ بھی عرب کے قدیم بتوں میں سے ہے۔ ملک سبا یمن میں ایک مشہور مقام ہے جہاں کی ملکہ بلقیس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے ۔ اس کے علاقے کے ایک گاؤں میں یہ بت تھا قبیلہ حمیر اس کی پرستش اور پوجا کرتے تھے اور یہاں کے والیان حکومت بھی جب تک یہ لوگ ذو نواس کے ساتھ یہودی نہ ہوئے ۔ اس وقت تک برابر اس کے پرستار رہے مگر ان کے یہودی ہوتے ہی نسر کی خدائی کا خاتمہ بھی ہوگیا۔

۱۰۔ اساف : یہ بھی عرب کے قدیم ترین اصنام میں تھا یہ بت مکہ میں کوہ صفا پر تھا، اسے بھی آنحضرت کے اصحاب نے فتح مکہ کے دن توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔

۱۱۔ نائلہ : یہ بھی بہت پرانا بت تھا مکہ کے مشہور پہاڑ مردہ پر رکھا تھا یہ عورت کی شکل کا تھا جاہلیت کے زمانے میں جب لوگوں کو موقع ملتا اسے چھو جایا کرتے تھے یہ بھی فتح مکہ کے دن توڑ ڈالا گیا

۱۲۔ ذوالخلصۃ : مشہور بت ہے مگر مورخین کا اسمیں بہت اختلاف ہے کہ یہ کس مقام پر تھا اور اس کی کیا صورت تھی ۔ زیادہ خیال اور غالباً صحیح بھی یہی ہے کہ یہ ایک سخت سفید منقوش پتھر تھا واس کے سر پر تاج سا تھا یہ بت مقام تبالہ میں تھا ۔ جو مکہ اور یمن کے درمیان میں مکے سے سات روز کے فاصلے پر ہے اسکی دربانی کا منصب بنی اُمامہ کو حاصل تھا یہ قبیلہ باہلہ کا ایک بطنی قبیلہ تھا. خثعم، بجیلہ، ازد السراۃ وغیرہ قبائل اسکی عظمت کرتے اور اس کے لئے تحفے تحائف بھیجا کرتے تھے ۔ اس بت کو جریر بن عبداللہ نے اسلام لانے کے بعد ڈھایا۔ اور اسکی عمارت میں آگ لگا دی ۔ اس طرح ان تمام بتوں اور ان کی خدائی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا ۔

(خاص)

[صفحہ ۶۶۱ کا بقیہ]

اور شیراز جنت طراز کی بہار کے مزے لوٹ!

مینو سواد شاہجہاں آباد کی مجلس آرائیاں تجھکو نہ بھائیں نہ سہی ہندوستان کا تازہ آفرین ہندوستان کی قدر و منزلت تجھے نہ پسند آئی نہ سہی! اس میں تیرا قصور کچھ نہیں! تیرا آب و دانہ ہی اس سرزمین سے اٹھ گیا تھا! خیر خارستان ہند کا چھوڑنا خدا تجھے راس لائے۔ بوستان فارس میں جانا مبارک ہو! کوہ ہمالیہ کے باغ و ملاغ میں تیرا اٹھکھیلا آشیانہ بھی یاد رہے گا! یاران چمن کو تیرا آخری سلام ہے مغلیہ سلطنت کیلئے موت کا پیغام ہوگیا۔ بس۔ بس اب اسکے خیال سے بھی دل دکھتا اچھا۔ اے تخت طاؤس رخصت! یاد رکھ ایرانی بھی خاطر تواضع کرنا خوب جانتے ہیں! ان کو تیرا چاؤ پیار آتا ہے! انکی مہمان نوازی سے سب خوش ہوتے ہیں تو بھی خوش رہے گا! انکی عزت سے تو نیک نام ہوگا! تیری دولت کے وہ اصلی حقدار ہیں تو بھی انکو اپنا اہل سمجھ۔ میرا غم نہ کر! میں بھی اپنے دل پر سنگ صبر رکھ کر خاموش ہو جاؤں گا! اچھا خدا حافظ!

(خاص)

خاتون

تخت طاؤس سے خطاب

(مولوی مرزا مظفر حسین سیفی دہلوی سابق ایڈیٹر رسالہ خاتون)

آہ! اے تخت طاؤس آج تو کہاں ہے۔ تیری صورت کس کنج عزلت میں پنہاں ہے۔ ہاں! ہاں تو نے ہندوستان جنت نشان کو کیوں خیرباد کہہ دیا! تو نے کون سے گلستان میں اپنا آشیاں بنایا ہے! میں تجھ کو کدھر ڈھونڈوں! کہاں پاؤں! اُف تجھے کیا معلوم کہ تیری یاد نے اس وقت میرے دل میں کیسی تڑپ پیدا کر دی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ابو المظفر جلال الدین اکبر اعظم کے نامور پوتے شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ نے تجھکو اپنے جاہ و جلال کے اظہار کی غرض سے بنوایا تھا اُس نے تخت جہانگیر پر قدم رکھتے ہی بے بدل خاں کی نگرانی میں بڑے اہتمام سے تیری تیاری کا حکم دیا تھا۔ ہائے۔ پھر کیوں نہ تو بے بدل ہوتا! ایشیا بھر میں تیری دھوم تھی۔ بلکہ دنیا کے شاید ہی کسی بادشاہ کو ایسا بے نظیر تخت نصیب ہوا ہو۔

تواریخ میں تیری تعریف آئی ہے کہ یہ تخت سوا تین گز طویل ڈھائی گز عریض اور پانچ گز بلند تھا اور چھیاسی لاکھ کی مالیت کے منتخب جواہرات موقع بموقع نصب کئے گئے تھے جس میں ایک لاکھ تولہ خالص سونا جو اس وقت چودہ لاکھ روپئے کا ہوتا تھا صرف ہوا تھا۔ تخت پر چڑھنے کے واسطے تین سیڑھیوں کا ایک مرصع زینہ تھا اور اس کے اوپر ایک میناکاری چھتر بارہ زمردین ستونوں پر قائم کیا گیا تھا۔ گویا وہ ایک پُر تکلف بارہ دری تھی۔ جس میں تاجداران ہند خاص خاص موقعوں پر نزول اجلال فرمایا کرتے تھے۔

چھتر کے بالائی جانب دو مرصع طاؤس بنائے گئے تھے ان کے درمیان موتی و یاقوت۔ نیلم و زمرد کے پھول پتّوں سے سجا کر ایک خوبصورت درخت کھڑا کیا گیا تھا جو غالباً طاؤس کی منقار کا قائم مقام ہوگا۔ ان میں بیشتر وہ بیش بہا ہیرے اور جواہرات تھے جو قطب الملت والدین اعلیٰ حضرت امیر تیمور صاحب قران کے عہد سے امرائے دربار وقتاً فوقتاً اپنے ولی نعمتوں کی خدمت میں بطور نذر گذرانتے چلے آئے تھے اور ان کی ایک کثیر تعداد زمانۂ دراز سے شاہان مغلیہ کے خزانۂ شاہی میں جمع ہو گئی تھی۔

طاؤس کی دُم جو حالت رقص میں دکھائی گئی تھی سلطان کی خاص تکیہ گاہ کا کام دیتی تھی جو دس لاکھ کی لاگت سے تیار کی گئی تھی۔ اُس کے وسط میں ایک نہایت درخشاں لعل پیوست تھا مگر دراصل اس لعل کی تاریخ بھی عجوبہ روزگار ہے اول اول اس لعل پر خاندان مغلیہ کے مورث اعلیٰ حضرت امیر تیمور صاحبقران و مرزا الغ بیگ کے اسمائے گرامی منقوش تھے۔ انقلاب زمانہ سے یہ گوہر مقصود شاہ عباس صفوی شاہ ایران کے ہاتھ لگ گیا تو اس نے اپنا نام بھی اس پر نقش کرا دیا تھا مگر بعد میں اس نے اس لعل کو مغل اعظم شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں تحفۂ ہندوستان بھیجدیا۔ نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ نے اپنا اور اپنے پدر بزرگوار جنت مکانی کا نام نامی کندہ کرا کے شاہزادہ خرم شاہ جہاں

کو فتح دکن کی خوشی میں مرحمت کر دیا تھا جب اعلیٰ حضرت شاہجہاں بادشاہ ہفت اقلیم و شہنشاہ تخت و دیہم قرار پائے تو اس لعل پر اپنے اسم گرامی کا اضافہ کر کے اُسے تخت طاؤس کی زینت افزائی کے واسطے عنایت فرما دیا۔ گویا جملہ سات مہریں اس لعل بے بہا پر ثبت ہو سکیں۔ علیٰ ہذا القیاس بانی شاہجہاں آباد و موجد تخت طاؤس کے بعد اس خاندان کے صرف سات بادشاہوں کو اس عنقائے روزگار تخت پر سریر آرائی کرنا نصیب ہوئی!

تخت طاؤس کے گرد گیارہ تختوں کی آئینہ بندی رشک تخت سلیماں تھی، جس کے اندرونی جانب ملک الشعراء حاجی محمد جان قدسی کا ایک فارسی قصیدہ درج تھا جس کے بیسویں شعر کے آخری الفاظ اورنگ شاہنشاہ عادل تھے۔ اور اس سے ۱۰۴۴ھ ہجری تخت شاہجہانی کی مادہ تاریخ نکلتی ہے۔

سبحان اللہ! خاقان الممالک سلطان حضرت صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی نے تیرے لئے اس ارض مقدس کو تجویز کیا جو ابتدائے تاریخ سے شاہان ذی اقتدار کا پایہ تخت رہا ہے۔ نور علیٰ نور تیرے رہنے کے واسطے وہ گلستان ارم تعمیر کرایا جس پر یہ شعر حرف بحرف مصداق تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اللہ! اللہ! وہ بھی کیا زمانہ ہوگا جب عمدۃ الملک وزیر سعد اللہ خاں علامی نے تیری پابوسی کے بعد سب سے پہلے وفاداری کا حلف اٹھایا ہوگا! وہ بھی کیا آنکھیں ہونگیں جنھوں نے اس بہشتی دربار کی بہار لوٹی ہوگی۔ شہزادہ سپہر جاہ محمد دارا شکوہ کی تجھ پر تسلط جمانے کیلئے خفیہ سازشوں کے باوجود شاہجہاں کا سب سے لائق فرزند محی الدین محمد اورنگ زیب شہنشاہ عالمگیر کے لقب سے تجھ پر بصد شان و شکوہ متمکن ہوا ہوگا۔ یہی نہیں، بلکہ امیر الامراء... جیسا دکن کا سب سے بڑا سیاست داں تیرے حلقہ بگوش غلاموں میں نظر آتا ہوگا! آہ! ایسے ایسے دلچسپ اور عبرت انگیز تماشے سامنے ہوں اور تو ان نظاروں میں محو ہو کر تصویر حیرت بنا کھڑا رہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ جنگل میں مور ناچا کسی نے نہ دیکھا! مگر نہیں تو تو آبادی میں ناچا! سلاطین کے بھرے درباروں میں ناچا! جشن و طرب کی محفلوں میں ناچا! تخت نشین و سالگرہ کے جلسوں میں ناچا اور ایسا ناچا کہ دیکھنے والوں کو مدہوش اور دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔

لیکن ہاں یہ تو بتا کہ تو ناراض کیوں ہو گیا؟ کس چیز نے تجھے ترک وطن کرنے پر مجبور کیا؟ آخر ہندوستان سے بیزاری کی کوئی وجہ بھی؟ شاید ایک بار خلد بریں سے نکلنے کے بعد پھر جنت ارضی سے رُخ پھیر کر چلے جانا تیری فطرت ثانیہ بن گئی کہ جہاں کوئی نیا "سبز باغ" دیکھا اور اپنے قدیمی گلشن سے اُڑ گیا! پھر بھی تیری یہ بے رُخی۔ یہ بے اعتنائی اچھی نہیں اپنوں ہی سے یہ طوطا چشمی!

فردوس مکانی صاحب قران ثانی نے تجھکو کس کس ناز و نعمت سے پالا! انھوں نے تیری کیا کیا نازبرداری نہ کی۔ کوئی دانہ کھلاتا ہے۔ مگر تیرے آقاؤں نے تیری چونچ موتیوں سے بھر دی! تیرے نام میں ایک کرور روپیہ کا خرچ لکھا ہوا ہے! سچ کہنا کیا تیرے پیروں میں زمرد لعل، نیلم اور ہیرے نہیں ٹھکے ہوئے تھے! اس سے زیادہ کیا کوئی تجھے سونے میں تولیگا!

حضرت شفق عماد پوری نے ذیل کے بہر بند گویا تیری ہی شان میں لکھے ہیں اور کیا خوب فرمایا ہیں۔

تو پرندہ ہے بہشتی خوبصورت خوش جمال
سر زبرجد کا ہے پر نیلم کے ، آنکھیں لعل کی
عضو سانچے میں جواہر کے ڈھلے ہیں بیمثال
حور کی چوٹی ہے تیرا طرۂ تاج زری!
گو پرندوں میں ہما کا نام فرخ فال ہے
تو بھی خوش طالع، مبارک پے، ہمایوں بخت ہے
کب بر و بال ہما سے کم ترا اقبال ہے!
تجھ سے مشہور آج تک شاہ جہاں کا تخت ہے
اب کہاں وہ تخت والوں اب کہاں وہ شہریار
روتے ہیں ہم اپنے اجڑے بام و در کو دیکھکر
صفحۂ ہستی سے کیا کیا مٹ گئے نقش و نگار
مست ہے تو اپنے حسن بال و پر کو دیکھ کر

آہ! سر چشمۂ سلاطین حضرت ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے نام کی عزت تیری بدولت قائم تھی! سلطان نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ کی دشت نوردی کی یاد تیرے طفیل لوگوں کے دلوں سے محو ہو چکی تھی۔ شاہ جہاں کے تاج کی رونق تجھ سے تھی اورنگ زیب کے تخت کی زینت تجھ سے تھی۔ مگر اُف! تو بڑا احسان فراموش نکلا! تجھ سے ہرگز ایسی بے وفائی کی اُمید نہ تھی۔

کہتے ہیں کہ جب مور کے پر گرنے کا وقت آتا ہے تو وہ غیرت و شرم سے مجبور ہو کر باغ کے تاریک ترین گوشوں میں روپوش ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے دنیا کی نظروں سے تیرے اوجھل ہونے کی یہی وجہ ہو! بہرصورت تو بھی جانور ہی تھا۔ وہ بھی بھولا بھالا! دنیا کی ہوا تجھ کو نہیں لگی تھی! تو ایک اجنبی صیاد کے دام فریب میں پھنس گیا۔ لاچار و بے بس تھا۔ آخر کر بھی کیا سکتا تھا!
مگر نہیں۔ نہیں۔ میں سخت غلطی کر رہا ہوں تو بڑا سمجھدار ہے۔ بالغ نظری اور دور اندیشی تیرا ہی حصہ ہے۔ بادلوں کی آواز کو تو دور ہی سے سن لیتا ہے۔ تو نے ہند کے غبار آلود مطلع میں اپنے قدردانوں کی قسمت کا فیصلہ پہلے ہی پڑھ لیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ سلطان محمد معظم بہادر شاہ اوّل کی نا عاقبت اندیشی ملک معز الدین جہاندار شاہ کی خود فراموشی اور فرخ سیر شاہ جہاں کی شہادت نوشی نے تجھکو یکلخت برداشتہ خاطر کر دیا تھا اگرچہ سید عبداللہ و سید حسین علی جیسے بازیگروں کی کٹھ پتلیاں شاہزادہ رفیع الدرجات و رفیع الدولہ وغیرہ روز ایک نیا تماشہ تیرے روبرو پیش کرتی ہونگیں نیز سلطان جہان عالم محمد شاہ رنگیلے کی عشرت پرستیاں ہر ہر طرح سے لبھانے کی کوشش میں رہتی ہوں گی۔ لیکن یہاں تو تیرا دل ہی اچاٹ ہو چکا تھا۔ تو مرغ رشتہ بپا! کی مثال ہر وقت بے چین و بیکل تھا

آخر خدا بے زبانوں کی بھی سنتا ہے! تیری مراد پوری ہوئی تیری کشش نے اثر دکھایا اور قہر خداوندی نادر شاہ درانی کے بھیس میں دلّی کی پرانی بستی پر آنا زل ہوا! نادری فوج شاہجہاں آباد کی سر فلک شہر پناہ میں خراماں خراماں داخل ہوتی ہے! عیش و عشرت کی بساط اُلٹ جاتی ہے! دلّی نئی نویلی دلی پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس کا برسہا برس کا سہاگ چشم زدن میں لٹ جاتا ہے۔ دوست دشمن برابر کھڑے منہ پھیر پھیر کر ہنستے ہیں اور ہندوستان کے اس عروس البلاد کی بد قسمتی پر کوئی دو آنسو بھی بہانے نہیں آتا! تو بھی یاران وطن کی اس بے مہری کو خاموش کھڑا دیکھتا ہے۔ چنانچہ اسی طرح سر جھکائے حیرت و استعجاب کے سمندر میں غرق تو اپنے ایرانی مہمان کے ہمراہ ہو لیتا ہے ......!

الوداع! اے شاہان مغلیہ کے مایہ ناز الوداع! جا جا ایران کے عشرت کدوں میں جا! کجکلاہوں کے محلوں میں جا! طہران گلستان کی تفریح سے دل بہلا اصفہان مینا سواد کی ہوا کھا

(بقیہ ۶۵۸ صفحہ پر دیکھئے)

خبردار

ہندو خواتین اور مسئلۂ طلاق

[جناب چودھری ہربلوک سنگھ صاحب زندہ دل دہلوی ایڈیٹر خبردار بلند شہر]

ہندو خواتین کے اس حلقہ میں جو مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر ہے آجکل مسئلہ طلاق پر ضرورت سے زیادہ غور و خوض کیا جا رہا ہے اور ملک کے کم و بیش ہر ایک گوشہ سے حکومت ہند کو اس کے متعلق وفد روانہ کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فی زمانہ ہندو خواتین کی حالت واقعی ناگفتہ بہ ہے اور ایسی صورت میں اگر ان کو اپنے ناقابل شوہروں کے طلاق کی اجازت دیدی جائے تو یہ موجودہ صورتِ حالات کو دیکھتے ہوئے کچھ بیجا نہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے جب ہم مغربی ممالک کی سوشل تواریخ کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان ممالک کے باشندگان اپنی اپنی ملکی حکومتوں سے رسم طلاق کے کالعدم کرانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ جن ممالک یا مذاہب نے صنف نازک کو طلاق کے حقوق دئے ہیں ان میں شوہر پرستی اور محبت کے پاک جذبات مفقود ہیں اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہاں شادی کی زنجیریں اس قدر کمزور اور غیر مستحکم ہیں کہ جن کو ذرا سی شکر رنجی کے باعث ٹکڑے ٹکڑے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے اہل ہنود میں یہ زنجیر شوہر اور بیوی کی عمر تک قائم رہتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات اس فرقہ میں بھی ایک بیوی کے ہوتے ہوئے شوہر دوسری شادی کر لیتا ہے۔ لیکن وہ زنجیر پھر بھی ان کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے رہتی ہے۔

اہل ہنود کی تاریخ کے صفحات کو جتنا اس ملک کے وطن پرست بہادروں اور دھارمک ستیوں نے مزین کیا ہے اس سے کہیں زیادہ ہماری خواتین نے اپنی لازوال شوہر پرستی محبت اور بھگتی سے ان کو چار چاند لگا رکھے ہیں۔ اگر درحقیقت غور سے دیکھا جائے تو کسی ملک یا مذہب کی تواریخ ایسی مثالیں پیش نہیں کر سکتی۔ مس میو نے اپنی بدنام زمانہ تصنیف "مدر انڈیا" میں ہماری خواتین کی بہت سی مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم پر ایک ناقابل برداشت ضرب لگائی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کو تعلیم نہیں دیجاتی اگر مس میو کا اشارہ ہماری موجودہ خواتین کی طرف ہے تو ہم اس اعتراض کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن مس میو کا یہ کہنا کہ اہل ہنود نے صنف نازک کے اس استحقاق کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا سرتاپا لغو و بےبنیاد ہے سیتا۔ دروپدی۔ دمینتی۔ لیلاوتی۔ بھان متی۔ میرا بائی۔ تارا بائی۔ پدما بائی سانول دیوی اور کرشن کماری وغیرہ وغیرہ وہ خواتین ہیں کہ جن پر ہم کو فخر ہے اور رہیگا۔ زمانہ کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ ہماری خواتین میں بھی ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ اس ملک میں تقریباً آٹھ سو سال اہل اسلام کی حکومت رہی اور اس طویل عرصہ میں ہندوؤں نے اپنے ان حکمرانوں کی تہذیب کو بہت کچھ سیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئے دن کے جھگڑے قتل اور غارتگری کے باعث نہ تو مسلمانوں نے ہی اپنی خواتین کی تعلیم کی طرف کچھ زیادہ توجہ دی اور نہ اہل ہنود نے ہی کچھ اس پر غور کیا۔ رفتہ رفتہ اس ملک میں جہالت کے باعث عورتوں کا درجہ پاؤں کی جوتوں کے برابر سمجھا جانے لگا۔ اس کے بعد اس ملک میں اہل انگلستان تشریف لائے اور وہ اپنی تہذیب پھیلانے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن

مسلم تہذیب اور اس مغربی تہذیب میں ایک فرق تھا۔ اہل اسلام صرف اپنی ہی تہذیب پھیلانے کے دلدادہ تھے اور انگریز علاوہ تہذیب کے اپنی ہر قسم کی تجارت کو بھی فروغ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کی خواتین کے دو طبقے ہو گئے ایک وہ جو مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر ہے اور دوسرا وہ جسکو غربت کے باعث ابھی تک اس کی ہوا نہیں لگی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مس میو نے موخرالذکر فرقہ کی حالت کا مطالعہ کر کے ہی " مدر انڈیا " کو تصنیف کیا۔

اس سے کسی ملک کو انحراف نہیں ہو سکتا کہ فرقہ اناث کے لئے تعلیم نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ کس قسم کی ہونی چاہیئے؟ یہ ایک سوال ہے اور اس کا حل کرنا ہمارا فرض ہے۔ انگریزی لٹریچر میں معدودے چند کتابوں کے سوا شاید ہی ایسی کوئی کتاب ہو کہ جس کے صفحات عشقیہ مضامین سے رنگے ہوئے نہ ہوں جس کا اثر نوجوان طلبہ پر مہلک پڑتا ہے۔ یہی حال اردو لٹریچر کا ہے۔ کیونکہ اس نے بھی انگریزی کے ساتھ ہی ساتھ نشوونما پائی ہے۔ اگرچہ اردو زبان میں آجکل ایک تبدیلی کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس کی شاعری میں ایک گونہ انقلاب ہو رہا ہے۔ لیکن ابھی اسکو معیار پر پہنچنے میں عرصہ درکار ہے۔ ہندی نثر اور بالخصوص اسکی نظم بھی تک عشق مجازی سے پاک نہیں تو کسی قدر مبرا ضرور ہیں۔ لیکن موجودہ طریقہ تعلیم کچھ اس قسم کا ہے کہ انگریزی کتب فیشن اور تہذیب تینوں ملکر ہندی کے پاک اثر کو زایل کر دیتی ہیں۔

چونکہ ہمارے ملک کی خواتین ولایت کے اکثر اخبارات میں روز یہ خبریں پڑھتی رہتی ہیں کہ فلاں عورت نے اپنے شوہر کو زہر دیدیا۔ فلاں عورت نے اپنے شوہر کو زدوکوب کر ڈالی فلاں عورت نے اپنے شوہر کو طلاق دیدیا۔ چنانچہ اس قسم کی خبروں۔ انگریزی تعلیم اور تہذیب۔ فیشن اور اثر بالخصوص اپنے شوہروں کی لاپرواہی۔ کمزوری اور غربت نے ہماری خواتین کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ حکومت ہند کے سامنے مسئلہ طلاق کو پیش کریں۔

اہل ہنود میں شوہر کا درجہ ایشور کے بعد رکھا گیا ہے۔ اور یہی ایک وجہ ہے کہ ہماری خواتین بہ نسبت اور مذاہب کی خواتین کے زیادہ غنیمت ہیں۔ اگر طلاق کا بل پاس کر دیا گیا تو یقیناً اس مذہب میں بھی بہت کچھ وبا پھیل جانے کا خطرہ ہے۔ اس لئے ہمارے دینی رہبروں کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے اصلاحی ذرایع اختیار کریں کہ جن سے ہماری خواتین کو مسئلہ طلاق پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے کہ جب ان کی جملہ مشکلات حل کر دی جائیں۔ زہریلے درخت کی شاخیں چھانٹنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو جڑ سے ہی کاٹ دیا جائے۔ جو بد رسمیں اس وقت بدقسمتی سے ہماری ترقی میں سد راہ ہیں سب سے پہلے ان کا دور کرنا ضروری ہے۔ اور اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یقیناً ہماری وہ خواتین جو اس وقت طلاق لینے کے لئے مصر ہیں خود بھی یہ کہنے لگیں گی کہ

" شوہر پرستی عورتوں کا فرض اولین ہے "

(خاص)

خضر راہ

یہ نہیں وہ

(جناب حسن آمد ندوی ایڈیٹر رسالہ خضر راہ لکھنؤ)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی شخص ایک عرصہ دراز تک کسی مرض میں مبتلا رہتا ہے تو اس کے قوائے جسمانی پر ایک عام ضعف طاری ہو جاتا ہے اور ہر ہر عضو جسم اپنے فرائض متعلقہ کے انجام دینے میں کوتاہی کرنے لگتا ہے — آنکھ دیکھنے سے کان سننے سے زبان بولنے سے اور دماغ سوچنے سے عاری ہو جاتے ہیں ——

بالکل یہی حالت ہوتی ہے اس قوم کی جو غلامی کے مرض میں مبتلا ہوتی ہے اور محکومیت کے جراثیم جس کے رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں۔

انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ غلام ہو دوسروں کا دست نگر بنے اور اغیار کی جنبش ابرو کا منتظر رہے۔

غلامی کا روگ ایک ایسا مرض متعدی ہے کہ جو اعمال و افعال کے حدود سے گزر کر عقائد و خیالات تک پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔ اور اس کے مضر اثرات قلوب انسانی کی ان گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں بجز ایمان و یقین کے اور کسی شے کی رسائی نہ ہونی چاہیئے۔

غلامی نہ صرف عقائد و خیالات میں تزلزل اعمال و افعال میں تساہل اور عادات و خصائل میں برائی پیدا کر دیتی ہے بلکہ اُن صفات حمیدہ سے جو شرف انسانی اور طرۂ امتیاز کئے جاتے ہیں یکسر خالی و محروم کر دیتی ہے اولوالعزمی علو ہمت معاملہ فہمی دور اندیشی۔ خودداری خود اعتمادی ایفائے عہد پابندی قول اس کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتے حتیٰ کہ ایمان و یقین بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اس میں بھی ایک قسم کا ضعف پیدا ہو جاتا ہے جس کے روح عمل اور جذبہ کار مفقود ہو جاتے ہیں کہ جس کے بعد انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں رہتا یقین مانئے کہ یہی روح عمل اور جذبہ کار ہے کہ جس کے عدم وجود پر قوموں کی بقاء اور ممالک کی ترقی کا انحصار ہے۔ پھر جس طرح ایک نیند کے متوالے کو جب جھنجھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ نیم مدہوشی کے عالم میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح خواب غفلت سے بیدار ہونے والی اقوام اور غلامی کے مرض سے نجات حاصل کرنے کی خواہش مند ملل جن میں آزادی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور جنھیں غلامی کے مضر اثرات محسوس ہونے لگتے ہیں غیر شعوری طریقہ پر سامنے آنے والی چیز کو ھٰذا ربی سے مخاطب کرنے لگتی ہے ذرا حضرت ابراہیم کا قصہ یاد کیجئے وہاں بھی تو یہی ہوا تھا — سامنے آنے والی با عظمت چیز کو ہذا ربی یہی میرا پروردگار ہے۔ کہا جاتا تھا تمام اس سے کہ وہ سورج ہو یا چاند آفتاب ہو یا ماہتاب — پھر وہاں تائید ایزدی شامل حال تھی اور نور ہدایت رہنمائی کر رہا تھا جس سے ہر ہر قدم پر سنبھل جاتے تھے اور ہر ہر لغزش پر متنبہ ہو جاتے تھے لیکن یہ اقوام بہت سی ٹھوکریں کھانے اور بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانے کے بعد کہیں اس درجہ پر پہنچتی ہیں۔

یہ احساس جس کا میں نے تذکرہ کیا قوموں کے لئے بڑا ہی خطرناک اور دوراثر گوں ثابت ہوتا ہے قومی ضروریات اور وقتی احتیاجات کی بنا پر سیکڑوں مدعیان ہدایت اور رہنمایان

رہنمایاں طریقت برساتی مینڈک کی طرح پیدا ہوجاتے ہیں جو قوم کی ناواقفیت و نادانی سے فائدہ اٹھاتے اور آزادی و ترقی کی دیویوں کو خاطر بظاہر ہر قسم کے ایثار اور ہر طرح کی قربانی کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں اور راہ کی ہر دشواری مصیبت کا جوانمردی سے مقابلہ کرتے ہیں گو ان کی زبان پر ہر وقت قوم! قوم!! اور دیس دیس!! ہوتا ہے لیکن اگر اُن کے قلوب کو ٹٹولا جائے اور اُن کے جذبات کی پردہ دری کیجائے تو سوائے عزت و غفلت حشمت و شوکت کی خواہش اور مال و زر ہوس کی فراہمی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ابتداً قوم ان گندم نما جو فروش حضرات کے فریب میں آجاتی ہے لیکن زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ دل کا کھوٹ زبان پر آجاتا ہے اور خبث باطنی کا مظاہرہ مختلف پیرائوں میں ہونے لگتا ہے۔

ان حریت نوازان قوام دعویداران ریاست و امارت اور مدعیان نجابت و شرافت کیلئے وہ وقت نہایت ہی اہم اور نازک ہوتا ہے۔ جبکہ ایک دوسرے کی پردہ دری شروع کردیتا ہے اور بزعم خود دوسرے کے اثر و اقتدار کو ہمیشہ کیلئے ختم کردیتا ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ یہ حربہ جو دوسرے کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ خود اس کے اثر و رسوخ کو فنا کردیتا ہے۔

مدعیان رشد و ہدایت کی ان بے عنوانیوں اور رہنمایان ملک و قوم کی اس بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم ان کے راز درون سے واقف ہوجاتی ہے۔ اور ان کی بداعمالیوں اور خودغرضیوں کے باعث اُن سے بیزار ہوجاتی ہے اور اپنی پیروں پر خود کھڑے ہونے کی کوشش کرتی ہے — یہ آزادی کی دوسری منزل طلب میں دق کی بدیہی مثال اور کامیابی کی جانب پہلا قدم ہے۔ جب قوم اس حد تک بیدار ہوجاتی ہے اور احساس ترقی اس میں اس درجہ قوی ہوجاتا ہے تو اُسے ایک بار پھر ابتلا و آزمائش کا شکار ہونا پڑتا ہے قوموں کی تاریخ میں یہ زمانہ نہایت ہی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اس وقت ترقی یافتہ اقوام کی تقلید و تتبع کا مرض مہلک ظہور پذیر ہوتا ہے اور اس کے اثرات قوم سے منتقل افراد قوم تک میں سرایت کرجاتے ہیں، زبان و لباس سے لیکر خانگی حالات اور ذاتی تک میں اس کی جھلک نظر آنے لگتی ہے —— یہی وہ زمانہ ہے کہ جس کے متعلق اس سے قبل میں لکھ آیا ہوں کہ جب غلامی کے مضر اثرات محسوس ہونے لگتے ہیں تو غیر شعوری طریقہ پر ابتقاضائے فطرت انسانی ہر آنے والی چیز کو بذاربی (یہی ترقی کا راز ہے) سے مخاطب کیا جانے لگتا ہے۔ لیکن جب کسی ایک چیز کی تقلید اور کسی خاصی شے کے تتبع سے مقصد حاصل نہیں ہوتا اور دل کی مراد بر نہیں آتی تو کسی دوسری چیز کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور یہ نہیں دہ کہکر اس سے دل کو تسلی دے لی جاتی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی اور اصلاحی تحریکیں اسکی بہترین مثال ہیں اور ہماری انفرادی زندگی اس کی کامیاب نظیر ہے۔ (خاص)

خواجہ اسکول گزٹ

خواجہ حسن نظامی

[جناب سید ابن عربی ایڈیٹر خواجہ اسکول گزٹ دہلی]

خواجہ حسن نظامی کے دادا حضرت مولینا سید بدرالدین اسحاق رضہ بخارا سے دہلی میں آئے تھے اور ۶۶۹ ہجری میں بمقام پاک پٹن ضلع منٹگمری میں انتقال ہوا اور انکی اولاد کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رح نے دہلی میں لاکر پرورش کیا اور خواجہ حسن نظامی کا خاندان اسی وجہ سے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا میں چھ سو برس سے آباد ہے۔

خواجہ صاحب ۲ محرم ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے انہوں نے کسی اسکول میں تعلیم نہیں پائی۔ عربی فارسی کی تعلیم دیسی مدرسوں میں ہوئی۔ بچپن میں ان کے والدین کا انتقال ہوگیا اور انہوں نے ۱۵ سال کی عمر سے اخباروں میں مضامین نویسی شروع کی اور ۱۹۰۸ء میں اپنا ایک ماہوار رسالہ نظام المشائخ جاری کیا جو آج تک جاری ہے۔ اسکے بعد بہت سے ماہوار رسالے اور ہفتہ وار اور روزانہ اخبار اردو زبان میں انہوں نے جاری کئے اور ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا۔ اس وقت تک ان کی لکھی ہوئی اور تالیف کردہ کتابوں کی تعداد ایک سو ستائیس تک پہنچ چکی ہے۔ اب ان کی عمر ۵۴ سال کی ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا

روزنامچہ

ہندوستان میں کوئی لٹریری آدمی ایسا نہیں ہے یا کم از کم مجھے معلوم نہیں ہے جسکا روزنامچہ اخباروں میں شائع ہوتا ہو اور جسکو لاکھوں آدمی پڑھتے ہوں۔ یورپ اور امریکہ میں ایسے بہت سے مشہور آدمی ہیں جن کے روزنامچے شائع ہوتے ہیں مگر ان کی اشاعت بھی غالباً مسلسل نہیں ہوتی۔ کسی خاص زمانہ یا کسی خاص ضرورت کے وقت کسی مشہور آدمی کا روزنامچہ شائع کردیا جاتا ہے مگر خواجہ صاحب کا روزنامچہ سالہا سال سے ہندوستان میں شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۰۳ء سے روزنامچہ لکھتے ہیں اور یہ سب روزنامچے قلمی موجود ہیں صرف ۱۹۰۸ء کے روزنامچہ کا اقتباس سفرنامہ ہندوستان کے نام سے ایک کتاب میں شائع ہوا ہے۔ ۱۹۱۲ء سے ان کا روزنامچہ رسالہ دین دنیا دہلی میں شائع ہونا شروع ہوا یہ پرچہ ماہوار ہے۔ اس کے بعد پندرہ روزہ رسالہ درویش دہلی میں یہ روزنامچہ چھپنے لگا۔ اور اتنا مقبول ہوا کہ درویش کی اشاعت چند مہینے میں سات ہزار ہوگئی۔ پھر ہفتہ وار اخبار منادی میں چھپنے لگا اور یہ اخبار بھی بہت جلد پانچ ہزار کی اشاعت تک پہنچ گیا۔ گجراتی زبان میں ایک مشہور اخبار احمد آباد سے نکلتا ہے جسکا نام "دین" ہے اور جو خواجہ صاحب کے ایک مرید کا اخبار ہے اس اخبار میں بھی یہ روزنامچہ

گجراتی میں ترجمہ ہوکر ہمیشہ شائع ہوتا ہے اور اس روزنامچہ کی وجہ سے اخبار مذکور کی اشاعت گجرات کاٹھیاوار اور برما اور ایسٹ افریقہ اور ساؤتھ افریقہ میں بہت بڑھ گئی ہے۔

سندھی زبان میں یہ روزنامچہ اخبار "تنظیم" جاگن میں بھی شائع ہوتا تھا۔ مگر اب وہ اخبار بند ہو گیا ہے۔ آج کل یہ روزنامچہ ماہوار رسالہ نظام المشائخ دہلی میں شائع ہوتا ہے اور رسالہ مذکور کے مالک مُلّا واحدی صاحب نے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے جسکا نام ہی روزنامچہ ہوگا۔ کیونکہ روزنامچہ کے شائقین اس کو ہفتہ وار دیکھنا چاہتے ہیں۔

روزنامچہ کی خصوصیات

خواجہ صاحب کے روزنامچہ میں ذاتی حالات ہوتے ہیں۔ جنکا تعلق دوسروں سے بہت کم ہوتا ہے مگر اس کے باوجود خواجہ صاحب کے مخالف اور موافق دونوں نہایت شوق اور بے تابی سے روزنامچہ مسلسل پڑھنا چاہتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ سوال شائع ہوا تھا کہ روزنامچہ کیوں پسند کیا جاتا ہے اور بہت لوگوں نے اسکے عجیب و غریب جواب دئے تھے۔ مگر ایک مخالف نے نہایت دلچسپ جواب دیا تھا کہ روزنامچہ میں شاید افیون کا ست ملا دیا جاتا ہے کہ جو ایک دفعہ پڑھ لیتا ہے پھر وہ افیون کی طرح روزنامچہ پڑھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ میں جب روزنامچہ پڑھتا ہوں تو مجھے خواجہ صاحب پر بہت غصہ آتا ہے مگر کیا کروں کہ میرا دماغ چٹورا ہو گیا ہے روزنامچہ کی چاٹ چھوڑ نہیں سکتا"۔ اب خواجہ صاحب نے روزنامچہ کے عنوان مقرر کر دئے ہیں۔ سیاسی اور قومی اور فلسفۂ حیات اور ذاتی عنوانوں کے ماتحت روزنامچہ کے حصے تقسیم کر دئے ہیں۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس مضمون کے ساتھ آج کے روزنامچہ کی ایک کاپی رکھدی ہے تاکہ آپ کے ناظرین روزنامچہ کا نمونہ دیکھ سکیں۔ جہانتک میرا خیال ہے یہ نمونہ کوئی اچھا نمونہ نہیں ہے۔ کیونکہ خواجہ صاحب آج بیمار ہیں اور بیماری کی وجہ سے اُنہوں نے وہ دلچسپ فقرے نہیں لکھے جن کو ہمیشہ روزنامچہ پڑھنے والے بارہ مصالحہ کی چاٹ سمجھ کر ڈھونڈھتے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین چاند کے لئے میری یہ نئی تحریر کافی ہوگی۔

---

۷ ستمبر ۱۹۳۰ء کا روزنامچہ

سیاسی کل کے اخباروں نے گاندھی جی اور گورنمنٹ کی اس خط و کتابت کو مکمل طریقہ سے شائع کیا ہے جو صلح کی گفتگو کے سلسلہ میں ہوئی تھی اور ہر جگہ اِس خط و کتابت پر رائے زنی ہو رہی ہے۔

آج دہلی میں سرکاری حمایت کا ایک بڑا جلوس نکلا تھا۔ نواب شیخ فریدالدین صاحب رئیس میرٹھ اور ایک اور مسلمان اور ہندو انگریزی جھنڈے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ اور ایک بڑا ہجوم ان کے ساتھ تھا۔ کانگریسی لوگ کہتے ہیں دیہات کے چماروں اور زمینداروں کو جمع کر لیا گیا تھا۔ اور جب یہ جلوس بازاروں میں آیا تو ہندو مسلمانوں نے دوکانیں بند کر دی تھیں۔ سرکار کے وفادار کہتے ہیں یہ جلوس طبقۂ عوام کے خیالات کو ظاہر کرتا تھا کہ وہ سب گورنمنٹ کے خیر خواہ ہیں۔ صاحب رائے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کوشش

وقت کے بعد ہوئی ہے۔ جب کانگریسی تحریک کے سیلاب کی شروعات تھی۔ اُس وقت اِس قسم کے کام مفید ہوسکتے تھے۔ آج کل جبکہ ہر جگہ کانگریس کا اثر قائم ہوگیا ہے یہ کوشش ایسی ہی ہے جیسے زوردار سیلاب کے سامنے سیلاب بنانا۔

قومی | الہ آباد کے ایک کانگریسی لیڈر سید زین العابدین صاحب سہروردی نے ایک اعلان شائع کیا ہے جسمیں ۱۸ سوال شوکت علی صاحب سے کئے ہیں اِن سوالات کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے آپ آزادی کے سپہ سالار تھے۔ اور اب آپ سرکاری آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ اسکی کیا وجہ ہے؟۔ ان سوالوں میں شوکت علی صاحب کی گذشتہ تحریروں کے اقتباسات بھی دئے گئے ہیں۔ طرزِ تحریر شائستہ اور مہذب اور موثر ہے۔

آج کے اخباروں میں یہ بھی شائع ہوا ہے کہ صلح کی ناکامی مسٹر جناح کی وجہ سے ہوئی۔ اُنہوں نے وائسرائے کو صلح سے روک دیا۔ مسلمان کہتے ہیں مسٹر جناح پر یہ بہتان ہے کیونکہ مسٹر جناح مسلمانوں کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر اور سیاست میں بہت آزاد خیال مدبّر ہیں۔

فلسفۂ حیات | روپئے کی محبت سے ہر مذہب نے روکا ہے۔ مگر روپئے کی محبت دنیا کی ہر قوم میں موجود ہے۔ عرب۔ افغانستان۔ اور یہودی اور ہندو اور امریکن روپئے کی محبت میں زیادہ مشہور ہیں۔ روپئے کی محبت اور چیز ہے اور ضرورت کے لئے روپیہ حاصل کرنا اور چیز ہے۔ جو قومیں روپئے سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔ اُن کے اندر خود غرضی اور دل کی بے اطمینانی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور سوائے عربوں اور افغانوں کے یہودی اور ہندو اور امریکن روپئے کی محبت کی وجہ سے جنگی جذبات میں بھی کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ اور زندگی اُس شخص کی کامیاب ہے جو رزم میں بھی مضبوط ہو اور بزم کی اہلیت بھی رکھتا ہو اور یہ دونو صفتیں اُسی انسان میں ہوتی ہیں جو روپئے سے محبت اور نفرت نہ رکھتا ہو کیونکہ نفرت بھی وہی لوگ کرتے ہیں جن کا دل کمزور ہو۔ روپیہ جمع کرنا انسان کے لئے کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ اور روپیہ کا بے ضرورت خرچ کرنا یا بے موقع خرچ کرنا بھی بہت بُرا ہے جو قومیں جسم کی آرایش کے لئے لباس پہنتی ہیں وہ زندگی کی آسایش سے محروم ہوجاتی ہیں۔ روپیہ کا حقیقی مقصد آسایش دل کا اطمینان ہے جو روپیہ حاصل کرکے اسکو مقررہ مقصد کے موافق خرچ کرنا جانتا ہے۔

ذاتی | نزلہ کی تکلیف بہت زیادہ ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے تک اسی حالت میں تحریری کام کرتا رہا پھر خواجہ بانو کے ساتھ دہلی گیا۔ وہ ایک بیمار خاتون کی عیادت کے لئے گئی تھیں جو سبزی منڈی میں رہتی ہیں۔ میں بھیا فقیر عشقی کے ہمراہ خان بہادر سید بہاءالدین صاحب کے مکان پر گیا جہاں مولینا سید سلیمان اشرف صاحب ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا بیان تھا۔ دہلی کے بہت سے عمائد جمع تھے مولینا نے دو گھنٹے مسلسل میلاد شریف کا بیان کیا۔ اُنکی تقریر کی روانی تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ بیان بہت موثر تھا۔ بارہ بجے مجلس ختم ہوئی۔ اور میں بازار گیا۔ دو بجے تک عرس کا سامان خریدا۔ پھر خواجہ بانو اور بچوں کو ساتھ لیکر درگاہ میں واپس آیا۔ اور عرس کے انتظامات میں شام تک معروف رہا۔ شام کو کشوری لال صاحب اور لالہ کرم چند صاحب ایڈیٹر پارس اور پرائیوٹ سکرٹری مانا وور اور حکیم ماہر صاحب وغیرہ احباب ملنے آئے۔ برما والے توکلی شاہ نظامی سے رات کے دس بجے تک باتیں کیں اور برما کے کام کی رپورٹ سُنی۔ دلیپ چوانڈہ پی کر سوگیا۔ پانچ بجے سو بردنگ ہاؤس میں آیا۔ بارہ ۱۸ درجہ پر تھا۔ رات کو نزلہ کی تکلیف کم رہی۔

(خاص)

خیابان

ہم گور غریباں میں

(۱)

مزار انشا کی تحقیق

[مسٹر شہنشاہ حسین رضوی ایم ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل بی علیگ ایم ۔ آر ۔ اے ۔ ایس ایڈوکیٹ و سابق مدیر خیابان لکھنؤ]

کم و بیش تین برس ہوئے جب سید جالب صاحب مرحوم کی فرمایش سے میں نے ایک طویل سلسلہ بعنوان بالا روز نامۂ ہمت کی ابتدائی اشاعتوں میں لکھا تھا۔ اور خدائے سخن میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا کے مزاروں کی تحقیق کی تھی۔ سلسلہ بہت مقبول ہوا آخر کار اسکو دوبارہ ترتیب دیکر ایک چھوٹی کتاب کی صورت میں پریس بھیجدیا ہے شایع ہونے کے بعد پھر پیش کروں گا۔ قصد یہ تھا کہ لکھنؤ کے تمام بے نشان مشاہیر شعرا کی قبروں کو ڈھونڈ کر نکالوں اور پبلک سے اپیل کروں کہ اگر یہ استحقاق رکھتے ہیں کہ انکے مزارات برقرار رکھے جاویں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو حوادث کے نظر کرم پر چھوڑ دیا جاوے۔

خیر آمدم بر سر مطلب!

سید انشا اللہ خاں انشا نے لکھنؤ ہی میں وفات پائی اور لکھنؤ ہی میں دفن بھی ہوئے۔ وہ کس پایہ کے شاعر تھے اور اردو شاعری میں انکا کیا رتبہ تھا اس میں ہمکو بحث نہیں ہم کو صرف اس سے تعلق ہے کہ وہ کس مقام پر دفن ہوئے اور کونسی قبر ہے۔ اسی کی ہم تحقیق کرینگے اور بس! میں نے مزار سودا کے تحت میں امام باڑہ آغا باقر علیخاں کا تذکرہ کیا ہے۔ امام باڑہ مذکور مڈیمین مارکٹ کے عقب MEDIMAN MARKET. میں کنگ جارج ہاسپٹل کے سامنے اور رکینگ اسٹریٹ کا ٹکڑا جو بند کیا جا رہا ہے اسکے نیچے نشیب میں واقع ہے۔ تاریخی قدامت کے اعتبار سے امام باڑہ آغا باقر لکھنؤ میں دوسرا امام باڑہ ہے۔ امام باڑہ آصفیہ اسکے بعد تعمیر ہوا ہے۔ کسی زمانہ میں عقیدت کیش افراد میں یہ بہت مقبول ہوگیا تھا۔ اور اب بھی بہت مقبول متصور کیا جاتا ہے۔ ہر پنجشنبہ کو اجتماع ہوتا ہے نوچندی کو مخصوص ہوتی ہے۔ غدر سے پہلے اسکی امارت بھی تھی لیکن آثار قدیمہ میں اب کچھ بھی باقی نہیں۔ امام باڑہ کے صحن اور گرد و پیش میں قبریں تھیں۔ اور اب بھی ہیں لیکن قیصر التواریخ پر بھروسہ کرکے کہا جاسکتا ہے کہ غدر میں پہلے تمام صحن خفتگان خاک کے مقابر سے مملو ہو چکا تھا۔ بیرونی حصہ میں کچھ قبریں نمایاں ہیں یہ سب غدر کے بعد کی ہیں۔ پرانی قبروں کے آثار باقی نہیں لیکن کوئی چپہ یا گوشہ ایسا نہیں جس میں قبر نہ ہو۔ جس زمانہ میں اپنے مقصد کے حصول کے لئے میں پرانے قبرستانوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا تو بعض کہن سال بزرگوں کو میرے اس مشن سے گونہ ہمدردی ہوگئی تھی۔

میں اس ہمدردی کا شکرگذار ہوں جسکی اعانت سے مجھے کامیابی ہوئی حاجی سید عابد حسین صاحب سید انشا مرحوم کے پوتے بقید حیات ہیں۔ انہوں نے متعدد بار حج کیا ہے اور تقریباً ہر سال حج کرتے ہیں۔ حاجی عابد حسین صاحب وہ جگہ بتاتے ہیں جہاں سید انشار کی قبر تھی۔ یہ اندر کے صحن میں واقع ہے جو بالکل ہموار اور مسطح ہے اور کسی ایک قبر کا بھی نشان باقی نہیں ہے۔

عابد حسین صاحب کے بچپن میں قبر باقی تھی اور وہ اپنے والد مرحوم کے ساتھ گاہے گاہے فاتحہ پڑھنے آیا کرتے تھے میں نے صرف عابد حسین صاحب کی شہادت پر جو ہر اعتبار سے موثق ترین ہیں اکتفا نہیں کی ہے بلکہ دوسرے باخبر اصحاب کی اطلاعات بھی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی شہادت نواب افضل الدولہ بہادر میر افضل علیخاں صاحب افضل عرف چھوٹے بھیا صاحب خلف نواب مظفر الدولہ بہادر مظفر علیخاں صاحب اسیر مرحوم کی ہے۔ نواب افضل الدولہ بہادر نے تقریباً دو سال ہوئے انتقال کیا۔ اسیر سے ہمارا موروثی تلمذ ہے۔ چنانچہ چھوٹے بھیا صاحب مرتے دم تک ہمارے بزرگوں اور ہم سے اپنی قدیم وضع نبھاتے رہے۔

افضل مرحوم کو مزارات کی تحقیق میں خاطر خواہ دلچسپی تھی اور وہ اس موضوع پر بہت دیر گفتگو کیا کرتے تھے۔ انکو بھی سید انشا مرحوم کی قبر معلوم تھی لیکن اسطرف نشانات مزار کے معدوم ہو جانے سے صرف جگہ بتا سکتے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ امام باڑہ جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن جو پتہ کہ وہ بتاتے تھے وہ عابد حسین صاحب کے پتہ سے مطابق ہے۔ دوسری شہادت جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر کی ہے۔ محشر صاحب کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں۔ محشر صاحب بھی سید انشار کی قبر کو امام باڑہ کے اندرونی صحن میں بتلاتے ہیں لیکن یقینی مقام کرنے سے قاصر ہیں اس تمام تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ شہادتیں قابل اعتبار و وثوق ہیں اور ہم انکے بھروسہ پر یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں کہ سید انشاء اللہ خان انشا مرحوم امام باڑہ آغا باقر کے اندرونی صحن مشرقی شمالی دیوار سے متصل مدفون تھے۔

میں لکھنؤ کی ادبی انجمنوں سے بالعموم اور ہندوستانی اکاڈمی سے بالخصوص اپیل کرتا ہوں کہ وہ میری ان کوششوں میں میرا ہاتھ بٹائینگی اور حوصلہ افزائی کرینگی اگر میں ان بے نشانوں میں سے کسی کا نشان اور دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاوں تو کم از کم اس قبر پر ایک تقطیع یا لوح کندہ کر کے لگا دی جائے تاکہ مزار پھر بے نشان نہ ہونے پائے

(۲)
مزار آتش کی تحقیق

سید انشار کی طرح خواجہ حیدر علی آتش نے بھی لکھنؤ ہی میں انتقال کیا اور لکھنؤ ہی میں مدفون ہوئے۔

خواجہ آتش اس اعتبار سے ضرور خوش قسمت ہیں کہ دور حاضر میں اکثر با مذاق ادبا کو نہ صرف انکے کلام بلکہ انکی لائف میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ آج سے بہت پہلے لکھنؤ میں آتش پرستی کی تحریک زندہ ہو چکی تھی۔ حامد علی خان حامد مرحوم (بیرسٹر) حکمت مرحوم جو ہمارے دیکھتے دیکھتے ابھرے اور لکھنؤ کے سرمایہ افتخار ہوئے آتش کے کلام پر سر دھنے لگے تھے لیکن انصاف یہ

ہے کہ آتش کی لاالفنی کی طرف انہیں سے ایک نے بھی کوئی توجہ نہ کی تھی۔ مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی ثم یگانہ لکھنوی وہ شخص ہے جس نے لکھنؤ میں وارد ہوتے ہی آتش کا نقارۂ شہرت بجانا شروع کر دیا۔ لکھنؤ کی شاعر پارٹی انکی مخالف تھی جس کے وجوہ دوسرے تھے مگر انصاف یہ ہے کہ یاس نے آتش کی زندگی اور کلام کو بہت اُچھالا۔ متعدد مضامین لکھے۔ ادبی صحبتوں میں تذکرے کئے باخبر لوگوں سے ملتے اور گفتگو کرتے پھرے نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کس و ناکس کے دل میں آتش کی طرف سے عزت و وقار پیدا ہو گیا۔ اور ہر ہر زبان پر نام آنے لگا۔ مجھے اس موضوع پر ایک حرف لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسلئے کہ یہ سب میرے بحث سے خارج ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ خواجہ ہی وہ شخص ہے جس نے لکھنؤ کی پھیکی بے کیف شاعری میں چاشنی پیدا کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر آتش نہ ہوتا تو اس کی گذری حالت پر دہلی کے شعرا کا پلہ اسقدر بھاری تھا کہ دوسرے پلہ میں لکھنؤ کچھ کبھی نہیں تل سکتا تھا۔ خیر مجھے خوب یاد ہے کہ مرزا یاس سے اور مجھ سے بہر دن آتش کے مزار کے متعلق بھی گفتگو رہی ہے۔ یاس نے تحقیق کی تھی کہ وہ پرانے قبرستان کی خاک چھانتے پھرے تھے انھوں نے اگلے زمانہ والوں کی یادگاروں کے پاس جاجا کر استفسار حال کیا تھا۔ لہذا انکی مساعی ضرور قابل شکریہ اور قابل وقعت تھیں اور ہیں۔

لہذا مرزا یاس کی تحقیق پہلی شہادت ہے۔ انکی رائے میں خواجہ کا مزار باقی نہیں لیکن اتنا ضرور تحقیق ہے کہ منصور نگر کے قریب ایک چوہا ہائی ہے اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک احاطہ سا ملتا ہے۔ اسی احاطہ میں خواجہ کا مکان تھا۔ اور اب مزار بھی ہے

یہ واضح رہے کہ خواجہ فقیر منش بزرگ تھے اور اسی فقر پسندی کے سبب سے انہوں نے سلطنت اودھ کی شان و شوکت کو لات مار دی۔ گھر میں تنہا رہتے تھے۔ غالباً ایک چارپائی ایک کمل اور ایک مدہ یا حقہ انکی تمام کائنات تھا۔ نواب محمد تقی خان رند ایسے امرا ہر وقت حاضر باش رہتے تھے۔ لیکن بھلا وہ استغنا کا کہ وہ کسی کے بھی دست نگر نہ تھے۔

آتش کا مکان یا اسکے قرب وجوار میں کوئی مکان اب باقی نہیں۔ ایک لق و دق مکان پڑا ہے۔ اس میں قبروں کے آثار ضرور ہیں۔ لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آتش کی قبر کونسی ہے

دوسری شہادت حضرت لسان القوم مولانا صفی کی ہے آپ نے اپنے بچپن میں اس احاطہ میں خواجہ کی قبر دیکھی تھی۔ لیکن اب یاد نہیں کہ وہ قبر کہاں پر تھی۔ اس کے علاوہ کوئی شہادت ممکن نہیں بہر کیف یہ امر محقق ہے کہ آتش کا مکان بھی یہیں تھا اور وہ دفن بھی یہیں ہوئے۔ لیکن کونسی قبر ہے یہ اللہ جانے۔

ایک نکتہ قابل لحاظ ہے قدیم لکھنؤ کے حالات و معاشرت سے ناواقف اصحاب خیال کرینگے کہ جب شہر میں متعدد کربلائیں امام باڑے قبرستان موجود تھے تو آتش کے ایک احاطہ میں مدفون ہونے کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔ پہلے نہ کوئی میونسپلٹی تھی نہ حفظان صحت کی کمیٹی تھی۔ جو کسی جگہ پر میت دفن کرنے پر پابندیاں عائد کرتی۔ لکھنؤ کے اکثر پرانے مکانوں میں لوگوں کی قبریں ہیں اس امر میں کامل آزادی تھی۔ نیز اکثر خاندانوں میں ہر والیں تھیں لہذا بہت ممکن ہے کہ یہ احاطہ جو خواجہ کے مکان کے سامنے تھا وہاں کا خاندانی قبرستان ہو ایسے حالات میں جبکہ کوئی دوسری مخالف شہادت موجود نہیں ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ مذکورہ بالا ثبوت پر فیصلہ کر دیں کہ خواجہ حیدر علی آتش منصور نگر کی چوہا ہائی پہ اس احاطہ میں دفن ہیں۔ افسوس!

"خفتگان خاک کا ملتا نہیں کچھ بھی نشان" (خاص)

خیالستان

دل کی ویرانی

(جناب اختر شیرانی ایڈیٹر "خیالستان" لاہور)

نوحہ زارِ عبرت ہے شہرِ دل کی ویرانی
رُوح کی پریشانی
ظلمت آدمی میں گم ہے شمع عرفانی
نورِ عقل انسانی

شوق ہے عمارت کا کائنات میں اب بھی
شش جہات میں اب بھی
خندہ زن ہیں انجم پر کاخہائے سلطانی
رشکِ باغِ رضوانی

بے چراغ اب لیکن روح و دل کے ایواں ہیں
تیرہ ناک و ویراں ہیں
ظلمتوں میں خوابیدہ ہے دیارِ انسانی
خلد زارِ انسانی

اب بھی باغ و بستاں ہیں نوبہار سے رنگیں
سبزہ زار سے رنگیں
شاخسار پر رقصاں ہے شمیم بستانی
نکہتِ گلستانی

پر بدل گئی حالت بزمِ قلبِ انساں کی
نوبہارِ امکاں کی
بن گئی ہے مٹ مٹ کر ایک نقش ویرانی
ایک داغِ حرمانی

کوہسار ہیں اب بھی شاخسار سے آباد
برگ و بار سے آباد
دامنوں میں لرزاں ہیں آبشارِ نورانی
جوئبارِ نورانی

روح و دل میں ہیں لیکن سخت آفتیں برپا
ہاں قیامتیں برپا
ہو چکی ہے اب غارت وہ فضائے بستانی
وہ صفائے روحانی

اب بھی ساغرِ خورشید جلوہ زارِ ایمن ہے
نور کا نشیمن ہے
اب بھی ہے شعاعوں میں اسکی شعلہ سامانی
موجِ رنگ و تابانی

روح و دل سے ہیں لیکن کل حرارتیں رخصت
وہ لطافتیں رخصت
رہ گئے ہیں سینوں میں قطرہ ہائے بارانی
پرتوِ گلستانی

اب بھی ہوتی ہے زینت ہر مکان و ایواں کی
مسکن و شبستاں کی
ہر مقام سے روشن ہے فروغ نورانی
رونق و درخشانی

چھوڑ دی ہے انساں نے لیکن ایک مدت سے
اپنی جہل و غفلت سے

روح و دل کے ایوانوں کی بہار سامانی
زینت گلستانی

سازِ دہر سے جاری فسق کے ترانے ہیں
حرص کے فسانے ہیں

مٹ گیا ہے دنیا سے ذوق پاک دامانی
نفس جذبِ روحانی

ہو رہی ہے انساں میں خوئے شیطنت بیدار
اک بہیمیت بیدار

منظروں پہ عریاں ہیں پھر قوائے شیطانی
جذبہ ہائے حیوانی

برہمن سے رخصت ہیں آج گیان کی باتیں
اور دھیان کی باتیں

شیخ میں نہیں باقی، شیوۂ مسلمانی
پاسِ ذوقِ ایمانی

حرص و آز کی دنیا بستی ہے خیالوں میں
بستی ہے خیالوں میں

بحرِ دل میں طوفاں زن ہے ہوس کی طغیانی
فسق کی فراوانی

دل نہیں ہیں سینوں میں عصمتوں کے مدفن ہیں
عصمتوں کے مدفن ہیں

روح جسم میں ہے یا پیکرِ ہوس رانی
موجِ خونِ نفسانی

چھا رہے ہیں غفلت کے پردے ہر چشم انساں پر
کل فضائے امکاں پر

چند روزہ ہے مہماں عہد عشرتِ فانی
دورۂ تن آسانی

نوحہ زارِ عبرت ہے شہرِ دل کی ویرانی
روح کی پریشانی

ظلمتِ وادی میں گم ہے شمع عصرِ فانی
نورِ عقلِ انسانی

(خاص)

مشرق

(مسٹر محمد حسن لطیفی، بی، اے، معاون ادارہ سالنامہ خیالستان)

تو مجاہد ہے نہ کر موت کی پروا مشرق
عزم بیباک سے ہو معرکہ آرا مشرق

نور پنہاں ہے ازل سے جو ترے سینے میں
ظلمتِ دہر سے کر اس کو ہویدا مشرق

قصرِ ہستی کی بنا ڈال نئی صورت سے
تیرے دشمن تجھے کہتے ہیں "پرانا مشرق!"

جس کی تلچھٹ میں بھی ہو حبِ وطن کی مستی
اپنے رندوں کو پلا دے وہی صہبا مشرق

دیکھ وہ پردہ اٹھا صورتِ آزادی سے
دیدۂ شوق سے ہو محوِ تماشا مشرق

خود گرینگے تجھے آنکھوں سے گرانے والے
ہم سمجھتے ہیں تجھے آنکھ کا تارا مشرق

شب پرستوں کو وہ لاتا نہیں خاطر میں کبھی
جو ہوا تیری سحرگاہ کا شیدا مشرق

سرفروشی کا اسی مرد کے سر ہے سہرا
جو ہوا تیری سحرگاہ کا شیدا مشرق

یہ لطیفی کی دعا ہے کہ خدایانِ فرنگ
تیرے در پر ہوں صدا ناصیہ فرسا مشرق

(خاص)

ذرۂ عمر

غزل

(جناب ظفر تاباں صاحب ایڈیٹر ذرۂ عمر دہلی)

کسقدر نازش مقصود تھی باطل میری ÷ ڈوبنے آئی تھی کشتی لب ساحل میری
اب وہ لیتکدۂ سوز محبت ہے جگر ÷ دل پہ موقوف نہ تھی گرمیٔ محفل میری
میری مشکل میں اگر سلسلہ جنباں تو ہے ÷ یاالٰہی کبھی آساں نہ ہو مشکل میری
ہے درازی رہِ الفت کی بقدر ہمت ÷ رہ گئے پاؤں جہاں ہو وہی منزل میری
انتہائے سفر شوق نہ تھی میری فنا ÷ مر کے دیکھا تو ابھی دور ہے منزل میری
کچھ تو پیدا ہو سکوں جوش طلب میں تاباں ÷ میرے امکاں ہے اگر دور ہو منزل میری
(خاص)

[بقیہ صفحہ ۶۵۴]

کچھ سمجھانا چاہا۔ ان کے اشاروں کے ذریعے میں سمجھا کہ مریخ میں دو چاند ہیں۔ اور ایک تو زمین سے اس قدر قریب ہے کہ اسکی کشش سے مٹی کھینچ کر اس کے ساتھ جاتی ہے اور پانی سے دلدل پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے ہم نہریں کہتے ہیں وہ پچاس پچاس میل چوڑے دلدل ہیں جو چاند کی کشش سے معرض ظہور میں آئے ہیں۔

ان میں ایک نازنین بہت خوبصورت تھی۔ اس کے حسن کے بیان کے لئے عاشق کا تخیل اور شاعر کی قوت بیان درکار ہے۔ اور مجھ میں دونوں باتیں مفقود۔ اس کے خاموش رہنا زیادہ مناسب ہے۔ وہ میرے اشاروں کو تمام و کمال سمجھتی تھی۔ تا اینکہ ہر لفظ کے معنی جان لیتی تھی۔

یکایک اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ کوئی شے جنگل میں سے نکل کر اس طرف آ رہی تھی وہ کیا چیز تھی میں نہیں جانتا کیونکہ اس سے ملتا جلتا اس چیز کی دو پتلی پتلی بانہیں تھیں اور دو پتلی پتلی ٹانگیں۔ اس کا پیٹ بہت بڑا تھا اس کا منہ خوفناک حد تک وسیع تھا۔ یہ شے چھلانگیں مارتی ہوئی دھات کی جالی کے پاس پہونچی میں فوراً ایک طرف ہو گیا۔ بیشتر اس کے کہ مجھے کچھ سمجھ آئے اس بلا نے دھات کا جالی کا ڈھکن اُٹھایا۔ اور اندر سے ایک عورت کو باہر کھینچ لیا۔ اس کے بعد اس بلا نے اپنی گردن مروڑی اور پاؤں کے نیچے رکھ دیا۔ میں دوڑا تاکہ گولی سے اس کا خاتمہ کر دوں لیکن اس عرصہ میں اس نے ایک نوجوان آدمی کو کھینچ لیا اور اس کی بھی گردن مروڑ کے رکھدی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ باقی تمام لوگ چپ چاپ سے دیکھ رہے تھے وہ اپنے ہم جنسوں کو بچانے کے لئے ذرا بھی ہاتھ پاؤں نہ ہلاتے تھے۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ مریخ پر انسانوں کی حکومت نہیں ہے وہاں وحشی جانور حکمراں ہیں۔ انسان ان کا غلام ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ انسان دم نہیں مار سکتا۔ میں نے دو تین گولیاں ماریں وہ بلا تڑ کھڑا کے گر پڑی۔

اب میں نے پنجرے کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ مرے ہوئے جانور کی طرف سے تعجب سے دیکھ رہے تھے اب مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں نے غلطی کی ہے۔ جو لڑکی میرے ہر لفظ کو سمجھتی تھی اس نے جلدی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ بھاگ جاؤ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مریخ میں انسان جانوروں کے اس قدر مطیع ہیں کہ ان کے خلاف کچھ کر ہی نہیں سکتے۔

میں نے خدا حافظ کہا۔ اور وہاں سے رخصت ہوا۔

میں بھاگتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک شور سا سنائی دیا۔ جس بلا کو میں نے مار دیا تھا اس کے ساتھ کی کئی بلائیں مرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں نے پٹیاں باندھیں اور جہاز پر چڑھ بیٹھا جسطرح مریخ تک پہونچا تھا اسی طرح زمین پر واپس گیا۔ (خاص)

دکن پنچ

ہندی اور مغربی ناٹکوں کی امتیازی خصوصیات

[جناب ڈاکٹر۔ ایچ جگناتھ پرشاد۔ ایچ۔ ایم۔ بی وکیل
ہائی کورٹ۔ ایڈیٹر "دکن پنچ" حیدر آباد دکن]

عموماً ہندو ناٹکوں میں بھی کچھ حصہ نثر اور کچھ حصہ نظم کا ہوتا ہے اور سنسکرت و پراکرت زبانیں مخلوط ہوتی ہیں۔ ہندو ناٹکوں کی زبان بھی بہت شستہ ہوتی ہے۔

خاص طور پر قابل ذکر بات اور امتیازی خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں زناکاری کا جو یوروپی ناٹکوں کا ماسٹر پیس ہے شاذونادر ہی ذکر ہوتا ہے۔ بعض ناٹکوں میں حسن و عشق کی رنگینیاں ضرور ہوتی ہیں لیکن عشق کا نتیجہ لازمی طور پر پاکبازانہ ہوتا ہے۔ دوسرے کی بیوی سے تعلق پیدا کرنا اس زمانہ میں بہت بڑا پاپ اور اخلاقی جرم سمجھا جاتا تھا۔

یوروپی ڈراموں کی طرح ہمارے ناٹکوں میں بھی طوائف کا عنصر موجود ہے۔ لیکن ہندی طوائف میں وہ عریانی نہیں تھی جو یوروپی طوائف کا جزو لاینفک ہے۔ اس کے سوا اس وقت ہندو طوائف وہی حیثیت رکھتی ہیں جیسے یونان میں ہیٹرا۔ اور اپنی اعلیٰ تعلیم و قابلیت کے لحاظ سے ان کا رتبہ یوروپی طوائف سے بہت زیادہ تھا۔ کیونکہ تفریحی دلبستگیوں کے علاوہ وہ ترتیب اطفال کی بھی سرد اریتیں۔

ہندو ناٹکوں میں البتہ واقعات خرق عادت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور خود دیوتا اور دیویاں ان میں شریک ہوتی ہیں اور جب کسی محل و قوع پر کوئی سخت مصیبت اور مشکل آپڑتی ہے۔ تو دیوتا ہی ان مشکلات کو آسان کرتے ہیں۔

انشا کے لحاظ سے بھی ہندو ناٹک کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان میں کلیات کی طرف زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات جزئیات پر کوئی توجہ نہیں دیجاتی۔ اگرچہ بعض محققین کی رائے ہے کہ ہندو ناٹک یونانی سے ماخوذ ہے لیکن واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔

ہندوؤں میں ایکٹروں کا درجہ اسوقت بہت اونچا سمجھا جاتا تھا اور ایکٹ بھی نہایت مہذب طریقہ پر کیا جاتا تھا۔ ناٹک کے مصنفین تو نہایت ہی بلند پایہ اور بلند خیال ہوا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات بادشاہ خود ڈرامے لکھتے تھے۔ چنانچہ مٹی کے گاڑی کا جو سنسکرت ڈراموں میں ایک بہترین ڈرامہ ہے اس کا مصنف شودرک نگرہ کا بادشاہ ہے۔

یوں تو ہندو ناٹکوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کی فہرست بھی مرتب کرنا مشکل امر ہے۔ ہم صرف بعض مشہور و معروف ناٹکوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

کالیداس کے ڈراموں میں میگھ دوت۔ کمار سنبھو۔ وکرم اورشی شکنتلا وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان سب میں شکنتلا زیادہ تر مشہور و مقبول ہے۔ اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا ہے۔ خود فرانسیسی میں کئی تراجم موجود ہیں۔ اس ناٹک نے یورپ میں عام مقبولیت حاصل کی۔ گیوئی اور لامارٹین جیسے قابل ڈراما نسٹ نے اس پر عش عش کیا۔ اس ناٹک سے ہندو مصنفین کے اوصاف کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس میں سادگی ہے اور دوسرے مغربی ناٹکوں کی طرح اس میں مبالغہ آمیزیاں نہیں ہیں۔ طرز بیان

[بقیہ ۶۷۶ صفحہ پر دیکھئے]

دلفریب

یادگذشتہ

(جناب ہادی قریشی سابق ایڈیٹر "دلفریب" رہتک)

پھر کسی بھولے ہوئے کی یاد آئی ہے مجھے : شکل ماضی پھر تصور نے دکھائی ہے مجھے
آہ ایام گزشتہ، آہ وہ جان حیات : جب کہ تھا میرے لئے موجود سامان حیات
یاد ہیں وہ دن کہ جب تم آہ میرے پاس تھیں : دو جہاں کی نعمتیں تھیں یعنی پہلو میں مرے
جب تمہارے نشۂ الفت سے دل مخمور تھا : جب تمہاری یاد سے سینہ مرا معمور تھا
تم سے ملکر چین پاتا تھا مرا قلب نزار : تم سے ملنے کیلئے رہتا تھا ہر دم بیقرار
روح بڑھ جاتی تھی جس دم سامنے آتی تھیں تم : جب دل بیتاب کو جلوہ دکھا جاتے تھے تم
سچ بتادو وہ زمانہ کچھ تمہیں بھی یاد ہے : یاد ہے جسکی مری دنیائے دل آباد ہے
وہ زمانہ! آہ جب ہم رنج سے آزاد تھے : سادہ اور معصوم دل بیفکر تھے دلشاد تھے
روئے انور پر تمہارے وہ صباحت ریزیاں : جلوۂ معصوم سے ظاہر تجلی خیزیاں
جب شباب و کمسنی کا پیکر رعنا تھے تم : سادگی دوشیزگی کا یعنی اک جلوہ تھیں تم
وہ تمہاری بھولی باتیں وہ تمہاری سادگی : وہ تمہاری سادگی وہ سادگی میں دلکشی
آہ وہ دن کسقدر پر کیف تھے معصوم تھے : اب حقیقت میں ہوا ظاہر کہ سب موہوم تھے
یاد ہے وہ چاندنی راتوں میں اکثر بیٹھنا : آہ بیفکری سے گھنٹوں اپنا ملکر بیٹھنا
کالی کالی وہ گھٹائیں باغ پر چھائی ہوئی : جیسے پریاں اُڑ رہی ہوں بال بکھرائی ہوئی
صحن گلشن میں سراپا کیف سا چھایا ہوا : جوش مستی میں کھڑا ہر نخل اترایا ہوا
آم پر بیٹھی ہوئی کوئل کی وہ دلکش صدا : نالۂ رنگیں سے دیتی تھی ہمارے دل ہلا
شام کو بادل گرجنے پر کبھی چلائے مور : رات کو نغمہ سناتا تھا کبھی مینڈک کا شور
وہ اندھیری شب میں جگنو کا چمک جانا کبھی : وہ ہمارا دوڑ کر ان کو پکڑ لانا کبھی
اب کہاں تم اب کہاں میں وہ زمانہ اب کہاں : عیش و عشرت کا وہ الفت کا نشانہ اب کہاں
خواب میں بھی اب تو وہ دن بھولکر آتے نہیں : عہد ماضی کی جھلک تک آ کے دکھلاتے نہیں
کیا خبر تھی آہ ایسا تفرقہ ہو جائے گا : یہ زمانہ آہ، وہ دن میں ہوا ہو جائیگا
تم ہی بتلاؤ کہ وہ دن پھر کبھی آئینگے کیا : مہرباں ہو کر مجھے پھر آپ بلوائیں گے کیا

(خاص)

کالیستھ کانفرنس گزٹ

مقدس یہی مریم آسا یہی ہیں

(خواتین سے مراد)

[جناب ڈاکٹر چھدامی لال قیصر (دہلوی)، ایڈیٹر کالیستھ کانفرنس گزٹ گوالیار]

ہر اک کلفت و غم کا چارہ یہی ہیں : ہر اک درد و دکھ کا مداوا یہی ہیں
مریضان غم کے مسیحا یہی ہیں : مقدس یہی مریم آسا یہی ہیں
یہ جن سے مردوں کی ہیں شادمانیاں : شریک غم و رنج دنیا یہی ہیں
انھیں کی ہی مایا کا پرتاپ ہے سب : یہی آن ویا۔ اور بل وا یہی ہیں
اگر یہ نہ ہوں۔ تو وطن بھی ہے مرگھٹ : وسیلہ بڑا زندگی کا یہی ہیں
نہ ہوں یہ تو گلزار ہستی ہے ویران : نسیم گلستان دنیا یہی ہیں
یگانہ نہیں کوئی دنیا میں اپنا : کہ بیگانوں کی یگانہ یہی ہیں
یہی جان آدم۔ یہی جان عالم : یہی چارہ گر ہیں مسیحا یہی ہیں
اسے غم ہو کیا غم۔ جو غمخوار ہوں یہ : کہ سامان عشرت سراپا یہی ہیں
زبان پر نہیں ان کی شکوہ شکایت : مجسم قناعت کا پتلا یہی ہیں
بھرا جن میں صانع نے رنگ وفا ہے : یہی ہیں وہ تمثال زیبا یہی ہیں
مصیبت کی کٹتی ہیں گھڑیاں انھیں سے : کہ جینے کا دکھ میں سہارا یہی ہیں
قمر یہ جو غمخوار ہوں غم ہو شادی : شب غم میں صبح تمنا یہی ہیں

(خاص)

دور آزاد

[جناب لطف لکھنوی ایڈیٹر "دور آزاد" لکھنؤ۔]

ہو موت کا احسان یہ منظور نہیں ہے — نزدیک ہے ہستی سے عدم دور نہیں ہے
پھر مائل بیداد ہوا ہے وہ ستمگر — رونا ہے اب اس کا دل رنجور نہیں ہے
تربت کی طرح نام عاشق کا بنا دو — آئین محبت کا یہ دستور نہیں ہے
درد و غم فرقت سے جو مر جائیں تو اچھا — ہو ضبط یہ امکان کا مقدور نہیں ہے
توبہ نہ کرے پی کے بھی بہکی ہوئی باتیں — وہ مست نہیں اور وہ مخمور نہیں ہے
احسان خوشی کا نہ رہا خوگر غم کو — دل وصل کی امید سے مسرور نہیں ہے

افسانۂ موسیٰ میں عجب لطف ہے اے لطف
کس پر اثر تذکرۂ طور نہیں ہے۔

(خاص)

[صفحہ ۶۷۵ کا بقیہ]

دلکش اور کہانی دلچسپ و دل کو لگنے والی ہے۔

اس کے بعد پراکرت ناٹکوں میں راجہ ہرشچندر۔ نل دمن۔ ستیہ ساوتری۔ ستیہ وتی۔ دیوہ یانا۔ انسویا۔ پرہلاد۔ سارنگہ دھر۔ سامداس وغیرہ وغیرہ یہ سب ناٹک ایسے ہیں کہ جو اخلاق۔ عصمت۔ وفاداری اور فرمانبرداری کے احساسات و جذبات سے سراپا لبریز ہیں۔ آج کل کے یوروپی ناٹکوں کی طرح اس میں عشق اور مخرب اخلاق باتوں کا شائبہ تک نہیں ہے۔ بلکہ جو کوئی بھی انسان خواہ مرد ہو یا عورت جوان ہو یا بوڑھا۔ ان ناٹکوں کے دیکھنے سے ایک گونہ اخلاقی سبق حاصل کر سکتا ہے۔ برخلاف اس کے یوروپی ناٹکوں اور سنیماؤں کے دیکھنے سے آج کل ہمارے ملک کے نوجوان عورتوں اور مردوں کے عادات اور اطوار جیسا کچھ ناگفتہ بہ اثر پڑ رہا ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

اگرچہ ڈرامہ کے فن میں یورپ نے قابل قدر اضافہ کیا ہے اور حسیات و نفسیات کی دلچسپ ترجمانی کی ہے۔ لیکن حسن و محبت کو اس قدر ناز یبا پیرایہ میں ظاہر کیا ہے کہ بجائے کسی مفید درس عمل کے مطالعہ کرنے والی نگاہوں اور مشاہدہ کرنے والے دماغوں کو شہوانی جذبات کے پیکار پیغامات ملتے ہیں جن کے اثرات سے نوجوانوں کا محفوظ رہنا محالات سے ہے۔ لیکن ہندی ڈراموں میں حسن و عشق کی تفسیر ضرور کی گئی ہے مگر ایسے مہذب پیرایہ میں کہ حقاً نفس کے بعد حصول خود داری اور تحفظ کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

بعض ہندو ڈراموں میں مشکل کے وقت فوق العادات قوتوں یعنی دیوتاؤں وغیرہ کی جو بر وقت امداد دکھائی گئی ہے ممکن ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اس کو مبالغہ خیال کریں لیکن اس کو مبالغہ خیال کرنے کے بعد بھی خدا ترسی اور ہمدردی انسانی کا سبق ضرور ملتا ہے۔

یہاں ہم نے ان چند ہندو ناٹکوں کے نام صرف بطور نمونہ پیش کئے ہیں اور اگر ہم اپنی ناٹکوں کی تفصیل بتلانا چاہیں تو ہر ایک ناٹک کی جزئی تفصیل بھی ایک دفتر چاہیگی اسلئے ہم بخوف طوالت صرف اجمالی تشریح پر ہی اکتفا کرتے ہوئے اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ (خاص)

ذوالقرنین

موجودہ صحافت

(جناب مولوی نظام الدین حسین نظامی ایڈیٹر "ذوالقرنین" بدایوں)

ہندوستان میں اخبار نویسی کا چرچا مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنک کے عہد میں پریس کی آزادی کا قانون پاس ہوا۔ اس کے تیسرے ہی برس یعنی ۱۸۳۸ء میں اردو اخبار کے نام سے ایک ہفتہ وار پرچہ دہلی سے نکالا گیا۔ غالباً اردو میں یہی پہلا اخبار تھا۔ اس کے بعد آگرہ سے ایک اخبار جاری ہوا جس کا نام "سعد الاخبار" تھا۔ ۱۸۵۰ء میں لاہور کا مشہور پرچہ "کوہ نور" جاری ہوا۔ اور اب یہ سب پرچے ملک عدم کا راستہ اختیار کر چکے ہیں ان کے بعد ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ سے اودھ اخبار جاری ہوا جو اب تک جاری ہے۔

اس صوبہ کے علاوہ اسی زمانہ میں بمبئی سے "کشف الاخبار" اور مدراس سے "جریدۂ روزگار" وغیرہ نکلے۔ "اخبار عام" لاہور بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے جو اب تک جاری ہے۔ رسالوں میں "دلگداز" سب سے پرانا پرچہ ہے جس نے اردو ادب کی بہترین خدمت انجام دی۔ مخزن لاہور بھی جو شیخ عبدالقادر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا ان نامور پرچوں میں شمار ہوتا ہے۔ جن پر اردو ادب کو ناز ہے۔ "ادیب" الہ آباد اور العصر لکھنؤ بھی اپنے اپنے وقت پر بہت کام کر گئے دکن ریویو اور رسالہ حسن حیدرآباد کی پرانی جلدیں آج تک قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ صبح امید نے جو لکھنؤ سے نکلا تھا اور پبلک کو سیاسی تربیت دینا جس کا خاص مقصد تھا بہت تھوڑی عمر پائی ورنہ آج تک وہ اردو داں پبلک میں صحیح سیاسی مذاق پیدا کرنے پر بجا فخر کر سکتا تھا۔ موجودہ رسالوں میں "زمانہ" کانپور۔ "الناظر" لکھنؤ "ہمایوں" لاہور۔ "معارف" اعظم گڑھ کے سوا اور بہت سے پرچے عالم وجود میں آگئے ہیں۔ حال ہی میں صوبہ متحدہ کے دار السلطنت الہ آباد سے "چاند" نے اپنی روشنی پھیلائی ہے جس میں تصاویر اور مضامین کا خاص انتظام کیا جاتا ہے یہ تمام پرچے زیادہ تر ادبی مذاق کی اشاعت کے مدعی ہیں لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اخباروں اور رسالوں کے مضامین میں بعض اوقات ایسی زبان استعمال کی جاتی ہے جو ٹکسالی اردو سے کہیں علحدہ ہوتی ہے مثلاً حکام ان۔ رہائش بمعنی گھر وغیرہ الفاظ یا مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر لکھنا اردو میں غیر معروف الفاظ عربی اور سنسکرت کے داخل کرنا یہ رائے قائم کر دینے پر مجبور کرتا ہے کہ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا
کار طفلاں تمام خواہد شد

گذشتہ ستمبر میں ایک رسالہ نے تذکیر و تانیث کے لئے مخصوص مضمون شائع کیا ہے۔ جس میں ڈھول جانگیہ۔ قلم تراش۔ میلاد۔ وعظ وغیرہ کو مونث اور قمیض نال سطح وغیرہ کو مذکر لکھا ہے حالانکہ اردو میں یہ بولنا کہ ڈھول بجی۔ جانگیہ پھٹ گئی۔ قلم تراش جاتی رہی۔ میلاد ہوئی وعظ کہی یا قمیض پھٹ گیا۔ بندوق کی نال خراب ہو گیا۔ سطح ناہموار ہو گیا۔ کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

ادبی نقطۂ خیال کو علحدہ کر کے خبروں کی جامعیت اور تازگی کے لحاظ سے بھی اردو اخبارات بہت پیچھے ہیں اس ضمن میں ہم اپنے روزانہ اخباروں پر نظر ڈالتے ہیں تو دلی اور لاہور کے معدودے

چند اخبارات نے اگرچہ فری پریس یا ایسوسی ایٹڈ پریس سے براہ راست خبریں حاصل کرنے کا انتظام کر لیا ہے لیکن پھر بھی انگریزی اخبارات تو درکنار ہمارے اردو روزانہ اخبار گجراتی اور بنگالی اخباروں سے بھی مقابلہ نہیں کر سکتے حجم کے لحاظ سے بھی وہ ان کی برابر نہیں ہوتے۔ لیکن قیمت اردو روزانہ بھی انگریزی اخبارات کی برابر ہی وصول کرتے ہیں۔

ہفتہ وار اخبارات کی تو نہایت ہی ردی حالت ہے۔ ہفتہ وار اخبار روزانہ سے بالکل جداگانہ چیز ہیں۔ اور ماہوار رسالوں سے بھی علیحدہ۔ ہفتہ وار ان دونوں کے درمیان ایک خاص حیثیت رکھنے والا موقت الشیوع پرچہ ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہفتہ وار اخبار دو ایک پرچوں کے سوا ظاہری صورت شکل مضامین اور خبروں وغیرہ کی ترتیب کے لحاظ سے روزانہ کے مقلد ہوتے ہیں۔ چند سالہائے گذشتہ میں ہمعصر ریاست اخبار۔ مشیر سلطنت وغیرہ نے انگریزی ہفتہ وار اخباروں کے نمونے پر اردو دان پبلک میں اپنے ہفتہ وار پرچے پیش کئے جس میں اس زمانے کے ماہوار رسالوں کی طرح تصاویر کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس ملک میں خصوصاً ہمارے صوبہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو دوسرے ملک کے پریسوں کو حاصل ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ جب امریکہ میں مسٹر ولسن کا صدارت پر انتخاب ہوا تو انھوں نے اخبار نویسوں کے ۹ نمائندے مدعو کر کے ان سے یہ کہا تھا کہ وہ پبلک شکایتوں اور ملکی ضروریات کو اس طرح شائع کریں جس سے حکومت کو یہ معلوم ہو جائے کہ پبلک کی واقعی ضروریات کیا ہیں اور اس طرح وہ گورنمنٹ کو عوام کی ضروریات کے مطابق پالیسی قائم کرنے میں مدد دیں۔ انگلستان میں بھی پریس کو ایک بڑی قوت سمجھا جاتا ہے۔ وہاں جو سیاسی پارٹی برسر اقتدار ہوتی ہے۔ اس کا اقتدار اس پارٹی کے اخبارات کی قوت پر منحصر ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں اردو اخبارات کی نہ کوئی قوت ہے نہ اُن کا کچھ اقتدار اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ یہاں اخبارات کی ملکیت اور ادارت زیادہ تر ایسے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو اس کے اہل نہیں ہوتے۔ نہ ان کے پاس کافی سرمایہ ہوتا ہے جو اعلیٰ پیمانے پر اخبار چلا سکیں نہ اُن کے دل میں قوم اور ملک کا سچا درد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض وقت وہ صحیح راستے سے ڈگمگا جاتے ہیں سنسکرت میں ایک کہاوت ہے "بھُبھُکشتا کنگ نہ کروتی پاپم" جس کے معنی یہ ہیں وہ کونسا گناہ ہے جو مفلس آدمی نہیں کر گزرتا۔

سب سے بڑا گناہ جو اخباری برادری کے بعض ناعاقبت اندیش لوگوں سے صادر ہوتا ہے۔ وہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے بڑے لمبے چوڑے وعدے کر کے اخبار جاری کرتے ہیں اور پیشگی چندہ وصول ہو جانے کے بعد اخبار بند ہو جاتا ہے اور جو لوگ چندہ دے دیتے ہیں وہ اپنے داموں کو صبر کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے اس طرز عمل سے تمام اخباری دنیا سے پبلک کو بدگمانی ہو جاتی ہے۔

دوسرا گناہ ہمارے بعض بھائیوں کا یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑے بڑے لوگوں پر اپنی صحافت کا ناجائز دباؤ ڈال کر ان سے ناجائز فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ بعض کا اصل مقصد صرف یہی ہوتا ہے۔

تیسرا گناہ اخبار نویسی کا یہ ہے کہ اپنے ذاتی عناد یا کسی دوسرے کی ناجائز طرفداری کے جوش میں بعض اخبار نویس ایسے بدحواس ہو جاتے ہیں کہ انھیں صحافت کی ذمہ داریوں کا احساس بالکل نہیں رہتا مذکورہ بالا اقسام کے صحیفہ نگاروں یا اخبار والوں کو جب اپنے کرتوت کی وجہ سے کسی مصیبت کا سامنا ہو جاتا ہے تو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی فنڈ بھی نہیں ہوتا۔

ان تمام خرابیوں کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ ایک پریس ایسوسی ایشن قائم کی جائے جو وقتاً فوقتاً خرابیوں سے بچنے

(بقیہ ۵۰۳ صفحہ پر ملاحظہ)

رہبر

انقلاب

[جناب شاہ سید احمد سعید خانصاحب طاہر ایڈیٹر رہبر جونپور]

انقلاب آ ہی گیا لو انقلاب آ ہی گیا
بات پر اپنی دل خانہ خراب آ ہی گیا

اس لفظ انقلاب نے ایک خاص سیاسی معنویت کا جامہ اختیار کر لیا ہے حالانکہ اگر بہ امعان نظر دیکھا جائے تو آفرینش کا ذرہ ذرہ بلکہ سالمہ سالمہ ہر لمحہ انقلاب پذیر ہے۔ جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمکو اس عالم کون و فساد میں تمام اشیاء دنیا اس رنگ سے گذرتی نظر آتی ہیں کہ ہر لمحہ ایک جداگانہ رنگ میں دکھائی دیتی ہیں وہ جداگانہ رنگ عالم مرئیات میں ہو یا غیر مرئیات میں۔

ایک قطرۂ آب کو لیجئے ایک خاص درجہ حرارت پر ہو نچکر وہ انقلاب پذیر ہو جاتا ہے۔ حرارت قبول کرتے کرتے جب ۲۱۲ (الف) درجہ تک گرم ہوگا تو غاز کی صورت اختیار کر لے گا اور دوش ہوا پر سیر کناں نہیں معلوم وہ کہاں کہاں اڑتا پھرے گا۔ اور وہی قطرہ آب جب ۳۲ (الف) درجہ حرارت پر پہونچے گا تو ایک منجمد صورت اختیار کرے گا۔

اسی طرح کائنات کی تمام چیزیں انقلاب پذیر ہیں انسان پیدا ہونے سے لیکر عالم کہولت تک صدہا مدارج طے کرتا ہے اور جیسا کہ حکیم الٰہی نے فرمایا ہے بجائے خود ایک عالم صغیر ہے اور عالم کون و فساد کے تمام انقلابات کی ایک مثال پیش کرتا ہے۔ اسی طرح نمونہ کے طریقہ پر ہم صدہا چیزیں لے سکتے ہیں۔

اس موقعہ پر میں محض انقلاب کی مخصوص کیفیتوں اور اُن کے اثرات کا بالاختصار ذکر کرنا چاہتا ہوں اور نمونہ کے طور پر عالم مادی یعنی طبعی مثالیں دوں گا۔

انقلاب ہمارے سامنے دو صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے فوری اور تدریجی۔ فوری انقلاب کا اثر فوراً ظاہر ہو جاتا ہے اور تدریجی انقلاب کے نتائج جو مختلف تغیرات کی صورت میں جلوہ نما ہوتے ہیں اپنی کنہ کو ظاہر نہیں کرتے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہر انقلاب اپنے دامن میں تعمیری اور تخریبی پہلو لئے ہوئے ہے۔

کوہ وقار ایک عام محاورہ ہے جسمیں ظاہر بظاہر اس امر کا اشارہ ہے کہ کوہستان انقلابات اثر قبول نہیں کرتے۔ فوری انقلاب کو اگر کہئے تو یہ فی الجملہ صحیح ہے۔

قریب قریب تمام دنیا کی شاعری نے اس حقیقت کی جانب طبع آزمائی کی ہے کہ چاہے کتنا ہی ابر باراں ہو کیسا ہی طوفان ہو کیسی ہی بجلیاں چمکیں مگر اک پہاڑ ہے کہ اس کو ذرا سی جنبش نہیں ہوتی مگر یہ غلط ہے۔ برف پوش ہمالیہ کی حالت کو خیال کیجئے ایک ہو کا عالم ایک سناٹا نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہزارہا سال سے یہ کیفیت ہے اور ہزارہا سال تک یہ کیفیت رہے گی۔ لیکن ایک انقلاب ہے کہ ہر لمحہ کارفرما ہے۔ برف کی بالائی تہیں ایک جانب اپنے اوپر کی ہوا کو بارد کر کے منجمد کرتی جا رہی ہیں اور اپنے ضغطہ اور فشار سے دوسری جانب زیریں تہوں کو مائی شکل میں منقلب کرتی رہتی ہیں۔ اسی مثال میں تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو انقلاب کے نمایاں ہیں ایک جانب برف

یونہی بڑھتی جاتی ہے نیچے کی تہیں پانی ہوکر بہتی جاتی ہیں اسی طرح سے خود پہاڑ کی سطح دن کی گرمی رات کی سردی۔ بارش۔ ہوا۔ نباتی زندگی اور سیل آب کے باعث گھٹتی جاتی ہیں یہ فرسودگی اپنا اثر اس حد تک ظاہر کرتی ہے کہ ایک مدت گذرنے کے بعد جبلی ہئیت بالکل منقلب ہو جاتی ہے۔

اس انقلاب نے محض تخریبی عمل کو ظاہر کیا تعمیری پہلو یہ ہے کہ اسی تخریب کی بدولت میدانوں کی تفصیل ہوتی ہے براکین یعنی جبال آتش فشاں میں جب التہاب پیدا ہوتا ہے تو شعلہ ہائے جوالہ ہوا میں اڑ کر ایک سیلابی کیفیت اختیار کرتے ہیں اور یلغار مارتے ہوئے جدھر بڑھتے ہیں جو چیز ان کی راہ میں آتی ہے اُسے خاک وسیاہ کر دیتے ہیں لیکن بطون ارض سے جو مادہ خارج ہوتا ہے یہ اسی کی انقلابی کیفیت اختیار کرتے ہیں اور یلغار مارتے ہوئے جدھر بڑھتے ہیں جو چیز ان کی راہ میں آتی ہے اُسے خاک وسیاہ کر دیتے ہیں لیکن بطونِ ارض سے جو مادہ خارج ہوتا ہے یہ گویا کہ انقلابی برکت ہے کہ ہمیں فلزات سونا۔ چاندی یا دوسری معدنی اشیا گندھک وغیرہ ملتے ہیں جو ہزارہا تغیرات کے باعث طبقات ارض میں صحورنا ریہ میں پائے جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ہم کو عالم صغیر میں نظر آتا ہے یوم تولد سے لیکر یوم وفات تک اس کے مختلف اجزائے حیات کی تولید اور بالیدگی اور آخر دور حیات میں ان کی تعفین اور فرسودگی ہمارے سمجھنے کے لئے انقلاب کا بہترین نمونہ ہے یہ مثال تدریجی انقلاب کی تھی فوری انقلاب کی مثالیں ہم کو انسانی زندگی کے ناگہانی اور غیر معمولی واقعات میں نظر آتی ہیں۔ اکثر ایک نشاط انگیز واقعہ جسم میں ایک بالیدگی پیدا کر دیتا ہے اسی طرح ایک صدمہ خیز حادثہ اپنی تباہ کاری کے اثرات فوراً ظاہر کرتا ہے۔ یہ مثال تر انسان کے عالم جسمانی کی تھی۔

ہم انسان کے عالم روحانی۔ عالم ذہنی اور عالم اخلاقی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ماحول کے اثر سے بہتر سے بہتر افراد نہایت ہی ابتر صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بدتر سے بدتر افراد خوبی وخوش اسلوبی کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہیں اسی طرح سے انقلاب کے معلومات ہم کو انسان کی ہئیت اجتماعی میں نظر آتے ہیں۔ سخت انقلابی واقعات جب بہ یکدفعہ رونما ہوتے ہیں تو انسان کے معاشرتی نظام میں تغیر عظیم واقع ہو جاتا ہے اور یہ تغیر کہا جاسکتا ہے کہ اپنے ابتدائی مارج میں بلا استثناء نہایت ہی مہیب اور ہولناک نتائج پیش کرتا ہے۔ خواہ اس کے دور رس اثرات میں انسانی معاشرت کے بہتری کا راز مضمر ہے۔

(خاص)

صفحہ ۶۸۴ کا بقیہ

حیاتِ جاوداں آئی ہے جاں بازوں کے حصے میں
ہمیشہ جینے والے ہیں یہ جینے مرنے والے ہیں
محبت میں گراں پا ہو نہ اتنا خوف رہزن سے
جو اس رستے میں لٹ جائیں بڑی تقدیر والے ہیں
غمِ دنیا کو نسبت ہی نہیں غم ہائے الفت سے
یہ غم سب سے الگ سب سے جدا سب سے نرالے ہیں
دکھایا جس جگہ سب اس کو رحمت کی سند سمجھے
ہزاروں کام ہم نے داغِ عصیاں سے نکالے ہیں
نہ پوچھ اے شوقِ منزل تو بیانِ دوریِ منزل
کہ یہ ساتوں فلک پائے طلب کے سات چھالے ہیں
لحاظِ ناتوانی سے یہی مقبول ہوں یارب
یہ چار اشکِ ندامت بھی مصیبت سے نکالے ہیں
ملیگی جوشؔ تم کو ہنر کی داد محفل میں
مضامیں عشق کے بتھے حسن کے سانچے میں ڈھالے ہیں

(خاص)

رہنمائے تعلیم

تحریک عمل اشتراک

کواپریٹو سوسائیٹیز و مدراس

[جناب لالہ لچھمی چند ودیا رتھی، بی۔اے۔بی۔ٹی، ایم۔او۔جی۔اے چیف ایڈیٹر رہنمائے تعلیم لاہور]

تحریک عمل اشتراک ایک خاص صوبہ تک محدود نہیں۔ بلکہ ملک ہند کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلی ہوئی ہے۔ مختلف صوبہ جات کے اعداد سے ظاہر ہے۔ کہ یہ مدراس۔ بمبئی۔ پنجاب اور شائد بنگال میں بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ۔

(۱) بمبئی میں ۷ء۲۲ فی ہزار (۲) پنجاب میں ۱۹ء۳ فی ہزار (۳) مدراس میں ۱۷ء۶ ہزار (۴) برما میں ۶ء ۱۱ ہزار (۵) اور بنگال میں ۶ء ۹ فی ہزار۔ آبادی پر اس کے ممبران پائے جاتے ہیں۔ ۲۶-۱۹۲۵ء میں ہندوستان بھر میں تعداد ممبران ۳ کروڑ تھی۔

اس تحریک کی اہمیت۔ مقاصد۔ طریق عمل عوام سے ایک حد تک پوشیدہ رہے ہیں۔ اسکی زیادہ تر یہ وجہ ہے۔ کہ تحریک ہذا کا حلقۂ اثر زیادہ تر دیہاتی ہے۔ کارکنان زیادہ تر زمیندار طبقہ کے لوگ ہیں۔ بالخصوص زراعتی کواپریٹو سوسائٹیوں اور اُن کے متعلقہ زراعتی بینک وغیرہ کی یہی حالت ہے۔ اگرچہ انڈسٹریل کواپریٹو سوسائیٹی کے متعلق ان امور کا اعادہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ چنداں کامیاب ثابت نہیں ہوئیں۔

آرٹیکل زیر بحث میں تحریک ہذا کے متعلق کچھ امور روشنی میں لائے جائیں گے۔ اور یہ ثابت کیا جائے گا۔ کہ مدراس میں یہ تحریک کس قدر مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ اسکے لئے اول اسکے معنی۔ اہمیت اور گزشتہ تاریخ پر سرسری نظر ڈالیں گے۔

انگریزی زبان کے لفظ .OPERATION کے معنی عمل کے ہیں۔ CO (کو) ایک پری فکس .PREFIX ہے۔ جسکے معنی اشتراک (باہمی۔ مشترکہ) کے ہیں۔ پس .CO-OPERATION (کواپریشن) کے معنے عمل اشتراک کے ہیں۔ سوسائیٹی مجموعۂ افراد ہے۔ جب ایک مجموعہ افراد اشتراک عمل سے کام کرے۔ تو اُسے کواپریٹو سوسائیٹی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ قدرت نے یہ عمل انسانی خصلت میں رکھا ہے۔ اس کائنات کی بناوٹ اس امر کی دلیل ہے۔ ہر فرد بشر (انسان وحیوان۔ چرند و پرند) اس کی عملی مثال ہے۔ انسانی جسم کی بناوٹ اس کی زندہ نظیر ہے۔ مختلف اعضائے اپنا اپنا کام کرکے

انگلستان میں تھوک فروشی کی سوسائٹیاں ۱۸۶۴ء میں انفرادی طریق پر چند ممبران پر محمول تھی لیکن ۱۹۱۰ء میں اسکے اعداد قابل غور ہیں۔

سرمایہ ۴۶۵ و ۸۱۵ و ۴ پونڈ۔ فروختگی ۳ ۸۳۳ و ۵۶۷ و ۲۶۹ پونڈ۔ منافع ۷۶۰ و ۷۴ و ۵ پونڈ۔

سکاٹلینڈ میں اسی طرح سے سنہ ۱۹۱۶ء میں اِن سوسائٹیوں کا مشترکہ سرمایہ ۵۷۳ و ۸۳۶ و ۲ پونڈ فروختگی ۱۵۸ و ۷۳۸ و ۷ پونڈ۔ منافع ۸۲۳ و ۲۹۴ پونڈ۔

ہندوستان میں تاریخ کواپریٹو تحریک۔ اعداد متعلقہ کو فی الحال پیش کرنا ضروری نہیں۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہ تحریک نے اہلِ ہند کی زراعتی آبادی کو ایک حد تک مستفیض کیا ہے۔ دیگر شعبوں میں اس قدر ہر دلعزیز ثابت نہیں ہوئی۔ اسکی وجوہات ہیں۔ جن پر باموقع بحث کیجائیگی۔

تحریک کواپریٹو نے زراعتی شعبہ میں کیا کام کیا ہے۔ اور کن اصولات پر مبنی ہے؟ اِن سوالوں کا مختصر جواب یہ ہے۔ کہ پنجاب کے دار الخلافہ لاہور میں پنجاب بھر کے لئے ایک منزل کواپریٹو سوسائٹی ہے۔ جن کی شاخیں پنجاب بھر کے مختلف اضلاع میں قائم ہیں۔ ہر ایک سوسائٹی کے ساتھ کواپریٹو بینک ہے۔ جس میں سوسائٹی کا سرمایہ جمع رہتا ہے۔ اِن بنکوں کا تعلق سنٹرل کواپریٹو بینک لاہور سے ہے۔ پنجاب میں ایک افسرِ اعلیٰ رجسٹرار کواپریٹو سوسائٹیز ہے۔ اس کے ماتحت اضلاع میں انسپکٹران و سب انسپکٹران ہیں۔ ضلع کی ہر ایک سوسائٹی میں سرکاری یا غیر سرکاری پریزیڈنٹ ہوتا ہے۔ سوسائٹی کے ممبران زراعت پیشہ اصحاب ہیں۔ اُنکا سرمایہ مقرر ہے۔ جو حصص پہ تقسیم ہے۔ خریداران حصص ممبر بن جاتے ہیں۔ خاص رقوم کے خریداران حصص ڈائرکٹر بنتے ہیں۔ ممبران اُن میں سے منتظمان سوسائٹی انتخاب کر لیتے ہیں۔

جمع شدہ سرمایہ بینک میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ اُسی روپیہ سے زمینداروں کو سود پر روپیہ قرض دیا جاتا ہے۔ اور آسان اقساط میں واپس لے لیا جاتا ہے۔ روپیہ کی ضمانت کاشتکاران و زمینداران کی زمین ہوتی ہے۔ ممبران کو ان کے حصص پر سالانہ منافع ملتا ہے۔ اُدھر زمینداران کی مشکلات متعلقہ قرضہ۔ بیج۔ مویشی وغیرہ حل ہو جاتی ہیں۔ اِس تحریک کے زیرِ اثر اناج کی دکانیں بھی کھل گئی ہیں۔ زمیندار کی پیداوار سوسائٹی خرید کر فروخت کرتی ہے۔ اِسمیں دلّال خود سوسائٹی ہے۔ منافع حاصل کردہ ممبران سوسائٹی میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت کواپریٹو تعلیمی سوسائٹیاں اور کواپریٹو موسیقی سوسائٹیاں قائم کی گئی ہیں۔

(رضا میں)

غزل

[پنڈت بھو رام صاحب جوش ملیانی منشی فاضل ادیب فاضل ایڈیٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور]

بڑی تاثیر والے تیرے دیوانوں کے نالے ہیں
چمن والوں نے بھی اپنے گریباں پھاڑ ڈالے ہیں

ہر اک پردے میں سو جلوے ہر ایک جلوے میں سو پردے
کرشمے حسنِ بے پایاں کے جتنے ہیں نرالے ہیں

نہ پایا ایک بھی جوہر وفاداری و الفت کا
تری تیغِ ادا کے ہم نے کوچے چھان ڈالے ہیں

فغاں میں برقِ سوزاں کا اثر پیدا کرے بلبل
یہ آہیں کوئی آہیں ہیں یہ نالے کوئی نالے ہیں

[بقیہ صفحہ ۶۸۱ پر دیکھئے]

رہنما

پیارے صاحب کی کارستانی

(جناب خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی سابق ایڈیٹر رہنما توہانہ)

پیارے صاحب شریف زادے نامور باپ کے بیٹے تھے لیکن طبیعت بچپنے سے ایسی پائی تھی کہ محلے کے پنج ذات کے لونڈوں کی صحبت پسند آتی تھی (۱) پھر گلی ڈنڈا، معولہ گٹی، گولیاں کھیلا کرتے تھے، اور اس میں بھی دھاندلی کر جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ انٹی باز مشہور ہو گئے، باپ نے بہت کچھ چاہا کہ صاحبزادۂ بلند اقبال کچھ معمولی تعلیم حاصل کریں۔ تاکہ شرفا کی صحبت میں بیٹھنے کے قابل ہو جائیں۔ دو برس تک زبردستی اسکول بھیجا۔ لیکن صاحبزادے نے آخر یہ بوجھ اپنے سر سے اتار کر پھینک دیا۔

باپ کی صحبت میں "شین قاف" درست ہو گیا تھا۔ اور کچھ انگریزی الفاظ ایک خانساماں سے معمولی گفتگو کے یاد کر لئے تھے۔ اس سبب سے شرفا کی صحبت میں بیٹھنے کے لائق ہو گئے تھے۔ والد مرحوم نے اتنی عقلمندی سے ایک شریف خاندان کی لڑکی سے انکی شادی کمسنی میں کر دی تھی، جو بچاس روپیہ ماہوار کی وثیقہ دار تھی۔ ان کا خیال تھا کہ فرزند صالح تو تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔ اور میرے بعد بھیک مانگنے کی نوبت آئیگی۔ اس لئے یہ پچاس روپیہ ماہوار اس کی فاقہ شکنی کو کافی ہوگا پیارے صاحب نے پنج ذات کی صحبت کے اثر سے ایک فن حاصل کر لیا تھا، جسے بزبان عام دغابازی کہتے ہیں۔ اور باپ کی صحبت سے ایک فیض پایا کہ اچھی پوشاک پہن کر شرفا میں بیٹھ سکتے تھے یہ دونوں ہنر آپ کی آیندہ زندگی میں مفید ثابت ہوئے۔

باپ کے مرنے کے بعد بیوی سے اَن بَن رہنے لگی۔ لکھنؤ محلہ مصاحب گنج میں انکا مکان تھا۔ مکان کے عقب میں ایک باغیچہ تھا۔ جو اُن کو باپ کی طرف سے ورثہ میں ملا تھا۔ بی بی چاہتی تھی، کہ میاں نیکنامی کی زندگی بسر کریں، اور شرفا کا چلن اختیار کریں، میاں کی صحبت میں دنیا بھر کے جواری بٹیر باز جیلئے جمع رہتے تھے۔

اسی پر جھگڑا ہوتا تھا، تو اکثر ناراض ہو کر گھر سے نکل جاتے تھے۔ پردیس میں لوگوں کو چھان دیکر کچھ ٹھگ لاتے تھے ایک دفعہ کا ذکر ہے، کہ گھر میں کچھ تکرار ہوئی۔ آپ ہینڈ بیگ لے کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور فیض آباد کے اسٹیشن پر اُتر پڑے۔ وہاں کے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی اخبار بھی نکلتا ہے۔ ایک صاحب نے کہا، کہ اخبار "صلح کل (روزانہ)" یہاں کا بہت مشہور ہے۔ اس کے ایڈیٹر اور مالک مولوی ابو صالح رئیس فیض آباد ہیں۔ پوچھا کس محلہ میں مکان ہے۔ معلوم ہوا کہ رکاب گنج میں بہت بھاری املاک ہے۔ اسی وقت کرایہ کی بگھی کر کے مولوی ابو صالح کے مکان پر پہونچے۔ مولوی صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد کہا۔ شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں رسالہ "رنگین" کا ایڈیٹر ہوں۔ کریم یار خاں میرا نام ہے۔ اس وقت رسالہ

رنگین کی اشاعت پا بجز رہے۔ کچہری میں ایک مقدمہ کی پیشی ہے۔ اس لئے یہاں آیا ہوں۔ ہینڈ بیگ ان کے سپرد کر کے کچھ کاغذات نکالکر کچہری پہنچے، وہاں سے واپس آکر ایک تار کا خرچ مولوی صاحب کو دیا، اور کہا: "مسٹر ابوالخیر کے نام ابھی ایک تار بھجوا دیجئے۔ کہ فوراً بذریعہ تار دوسو روپیہ روانہ کر دو۔" شام کا کھانا مولوی صاحب کے ساتھ کھایا۔

صبح کو دس بجے تک تار کا انتظار کیا۔ جب روپیہ نہ آیا تو مولوی صاحب سے کہا: "کچہری کا وقت جاتا ہے۔ میرا مقدمہ خراب ہو جائیگا۔ آپ مہربانی سے مجھے دوسو روپیہ مرحمت فرمائیے۔ غالباً میرا روپیہ کل آتا ہوگا۔ وہ آپ لے لیجئیگا۔" مولوی صاحب نے بے عذر روپیہ حوالے کر دیا۔

آپ وہاں سے لکھنؤ کا ٹکٹ لیکر مع الخیر مکان واپس آ گئے۔ ایک مہینہ بھر بڑی فیاضی سے زندگی بسر کی۔

جب شام کو پیارے صاحب مولوی صاحب کے یہاں واپس نہ آئے۔ تو ان کو کسی قدر تشویش ہوئی۔ فوراً ایڈیٹر رسالہ "رنگین" مسٹر کریم یار خاں کے نام خط بھیجا۔ "غالباً آپ کسی سخت ضرورت سے لکھنؤ واپس چلے گئے۔ مہربانی کر کے میرا دوسو روپیہ فوراً بھیجدیجئے، سخت ضرورت ہے۔"

وہاں سے جواب آیا: "میں تو اس مہینے میں کہیں نہیں گیا۔ نہ کسی سے کبھی روپیہ قرض لیا۔ آپ کو شک ہوا ہوگا۔"

مولوی ابو صالح اس جواب سے خاموش رہے، اور اپنی حماقت پر افسوس کیا۔

دو چار مہینے کے بعد پھر پیسے سے تنگ ہوئے، تو دور کی سوجھی۔ انگریزی کپڑے بنوائے۔ عینک خریدی، جیب گھڑی مول لی۔ ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیکر ایک ستار ساتھ لیکر الہ آباد پہونچے، وہاں نورجہاں طوائف کے مکان پر گئے۔ اور اس سے کہا: "غالباً تم مجھے جانتی ہو۔ میں ریشم پری کا سگا بھائی ہوں۔ حیدر آباد میں جب تم گئی تھیں، تو ہماری مہمان ہوئی تھیں۔ اس لحاظ سے مجھے تمھارے پاس آنیکا موقع ملا۔ بھاول پور کے رئیس میرے شاگرد ہیں، ان کے پاس جا رہا تھا۔ راستہ میں میرا منی بیگ سوتے میں کسی نے نکال لیا۔ اس میں ایک ہزار روپیہ تھا۔ اب ایک پیسہ نہیں رہا۔ رئیس نے روپیہ کچھ سامان خریدنے کو بھیجا تھا۔ میرا خیال تھا کہ لکھنؤ میں دو دن قیام کر کے سب چیزیں خرید لونگا۔ اب سخت پریشانی کا سامنا ہے۔ اس وقت دوسو روپیہ مجھے قرض دیدو، میں اپنی بہن کو ابھی تار دئیے دیتا ہوں۔ وہ تم کو روپیہ بھیجدیگی۔" نورجہاں نے خیال کیا، کہ "ریشم پری نے حیدر آباد میں ہماری بہت خاطر مدارات کی تھی۔ اگر یہ اُسی کا بھائی ہے، تو اس قدر بے مروتی اچھی نہیں۔ اور پھر جب وہ اسی وقت تار دینے کو موجود ہے، تو ہمارا روپیہ بھی آجائیگا۔" اس لحاظ سے اس نے روپیہ دیدیا۔ اس نے فوراً ریشم پری کو ایک تار بھجوایا۔ اور آپ چلتے ہوئے۔

نورجہاں کے پاس روپیہ نہیں آیا۔ تو وہ سمجھ گئی، کسی دغاباز نے دھوکا دیا۔

پیارے صاحب اپنے گھر واپس آگئے، اور کچھ دنوں آرام سے زندگی بسر کی۔

ان کے محلّے میں ایک رئیس مر گئے۔ ان کے بیٹوں میں تقسیم جائداد کا جھگڑا ہوا۔ ابھی آپس میں فیصلہ

نہیں ہوا تھا، کہ پیارے صاحب نے ایک بات سوچی۔ ایک مفلس سید رہتے تھے، ان سے کہا "تم ایک نوٹس خدابخش کو دو۔ کہ الٰہی بخش میری بی بی کے والد تھے۔ اس لئے انکی ورثہ کا دو ہزار روپیہ مجھے دیدو۔ ورنہ عدالت میں نالش کی جائیگی۔ یہ لڑکی زوجۂ اولیٰ سے ہے۔

خدابخش ابھی اپنے بہن بھائیوں سے فیصلہ نہیں کرچکا تھا، کہ ایک آفت اس کے سر اور پڑ گئی۔ میر صاحب کو بہت کچھ سمجھایا کہ آپ کی بی بی سے ہم سے کیا تعلق۔ ہم لوگ شیخ ہیں اور وہ سیدانی ہیں۔ میر صاحب نے کہا "تم ابھی صاحبزادے ہو، تمھارے باپ نے ایک شادی پہلے سیدانی سے کی تھی۔ اس سے یہ لڑکی ہے۔ تمھارے والد نے خود میرے ساتھ اس کی شادی کی۔

جب نوٹس کا جواب نہیں ملا، تو پیارے صاحب نے کچھ روپیہ میر صاحب کو اس وعدہ پر دیا۔ کہ عدالت سے جب روپیہ آپ کو ملے تو نصف میرا حصہ ہوگا، اقرارنامہ لکھوا کر مقدمہ عدالت میں دائر کر دیا۔

اب پیارے صاحب مدعا علیہ کے پاس آئے، اور اس سے کہنے لگے۔ میر صاحب نے تو زبردستی تم پر مقدمہ دائر کر دیا۔ اگرچہ فی الحقیقت مختلف البطن وہ تمھاری بہن ہے، مگر تم اندیشہ نہ کرو۔ اس مقدمہ کو میں خود اپنی طرف سے لڑونگا۔ تمھارا اس میں دو سو روپیہ خرچ ہوگا سو روپیہ مجھے اس وقت دو، کہ وکیل کرکے جواب دعویٰ لکھدوں، اور سو روپیہ بعد مقدمہ جیتنے کے دینا۔ اگر مقدمہ تمھارے خلاف فیصل ہو، تو تمھارا روپیہ واپس کر دونگا۔ اور گواہ بھی محلے کے شریف لوگوں کو لکھوا دونگا

خدابخش نے دیکھا، کہ مقدمہ تو بہرحال لڑنا پڑیگا مجبور ہو کے سو روپیہ پیارے صاحب کے حوالے کیا پیارے صاحب نے جواب دعویٰ میں لکھوایا: "حسینی بیگم ہماری بہن نہیں ہے۔ ہمارے باپ نے کوئی شادی پہلے نہیں کی تھی۔ البتہ ایک ماما ہمارے یہاں کھانا پکانے پر نوکر تھی۔ اس کی بیٹی کا نام حسینی تھا۔

نہ ہمارے باپ نے اس قدر جائداد چھوڑی ہے، جس میں اس کا حصہ دو ہزار کا ہو سکتا ہو۔ متوفی کی جائداد دو ہزار ہے۔ جسمیں دو لڑکے اور دو لڑکیاں وارث حقیقی ہیں"

تنقیح قائم ہونے کے بعد پیارے صاحب نے خدابخش سے تقاضا شروع کیا۔ اور کہا "میں تو اس وقت بیمار ہوں۔ روپیہ دلوائیے تو مقدمہ کی پیروی کر سکتا ہوں" خدابخش نے لاکھ لاکھ کہا کہ "آپ سے ہم سے تو بعد فیصلہ عدالت کے سو روپیہ دینے کا وعدہ ہے۔ اب آپ پہلے سے روپیہ کیوں مانگتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مقدمہ ہار گیا، تو ہم آپ سے روپیہ کس طرح وصول کر سکتے ہیں"

پیارے صاحب نے کہا "ہم آپ کو تحریر دے سکتے ہیں، آپ ہماری جائداد سے روپیہ وصول کر لیجئیگا۔

خدابخش نے دیکھا، کہ پیارے صاحب نے آج تک وکیل کو ایک پیسہ بھی نہیں دیا، وہ اپنی فیس ہم سے طلب کرتا ہے۔ اب سو روپیہ دیکر اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑیگا۔ مجبور ہو کر مدعی سے کچھ روپیہ دیکر باہمی فیصلہ کر لیا۔

اس مقدمہ کے فیصلے کے روز مدعی اپنے کاغذات عدالت میں لے گیا تھا۔ جب رجسٹری ہو چکی۔ تو اس کے کاغذات ایک عزیز نے انھیں حضرت کے اغواء سے اڑا دیئے

وہ بیچارہ بہت حیران ہوا۔ اس کے عزیز قدرت اللہ نے بہت افسوس ظاہر کیا۔ اور کہا: پانچ روپیہ دیکر اخبار میں چھپوا دو، کہ ہمارے کاغذات عدالت دیوانی میں گم ہو گئے ہیں، جو کوئی ہم کو کاغذ لا کر دیگا، اسے بیس روپیہ انعام دیا جائیگا۔ چار روز تک اخبار میں اشتہار جاری رہا۔ آخر بیچارے نے قصد کیا، کہ پولیس میں رپورٹ لکھوا کر ڈھنڈورا پٹوایا جائے، اور انعام مقرر کیا جائے، اُسی روز قدرت اللہ نے کاغذات لا کر دیئے، اور کہا: "ایک آدمی لا کر دے گیا۔ ہم نے اُسے بیس روپے انعام کے دیئے غریب خدا بخش نے یہ نقصان بھی اٹھایا۔ اس میں بھی پیارے صاحب کا حصّہ تھا۔

قحط کے زمانے میں پیارے صاحب نے دو لونڈیاں لے کر پالی تھیں۔ جب یہ بڈھے ہوئے، تو وہ جوان ہوئیں۔ صورت دار حسین تھیں۔ آپ نے ان کے لئے پوشاکیں تیار کیں۔ ایک ہندو تھی، اس کا نام "پاربتی" تھا۔ دوسری مسلمان اس کا نام "خوشرنگ" تھا۔ دونوں کو عمدہ لباس سے آراستہ پیراستہ کیا۔ کانپور میں ایک مکان غیر آباد جگہ کرایہ کا لیا۔ پاربتی کو عمدہ لباس سے آراستہ کرکے گنگا جمنی پاندان غلافت چڑھا ہوا دیا۔ اور خوشرنگ کو سونے کا خاصدان سونے کی تشیا دی۔ دونوں زیور سے آراستہ، ہاتھ میں سونے کے کڑے پہنے ہوئے چھم چھم کرتی ہوئی مہاجنوں کی طرف سے نکلیں۔ ایک مہاجن نے ٹوک کر پوچھا: "بی مہری، تم کہاں سے آئی ہو؟" کہنے لگی: "ہم لوگ دہلی کے قریب ایک رانی صاحبہ آباد کی ہیں، انکے ہمراہ سیر کو آئے ہیں۔ بڑی فیاض رانی ہیں۔ اسی طرح دو دن نکلیں، تو ایک مہاجن نے کہا "تمھاری رانی صاحبہ کچھ زیور اور جواہرات کی بھی خریداری کرتی ہیں؟" اُس نے کہا: "کیوں نہیں۔ زیور اور جواہرات کا ان کو بہت شوق ہے۔ مگر لالہ انکے مطلب کے زیور تمھارے یہاں ملنا مشکل ہیں۔ دہلی سے کئی لاکھ روپیہ کا زیور خرید چکی ہیں۔ اور اب بھی انکے مطلب کی چیز مل جائے، تو خرید کر لینگی۔ اچھا کل اُنسے پوچھکر تمکو جواب دینگے۔"

دوسرے دن دونوں مہریاں آئیں۔ اور کہنے لگیں: چلو ہمارے ساتھ اچھے اچھے جڑاؤ زیور لے چلو۔ کئی مہاجن گئے۔ دیکھا، کہ پھاٹک پر زربفت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ انہوں کے کئی عُمدہ عُمدہ زیور پیش کئے، کوئی پسند نہوا۔

دوسرے دن یہ خبر سنکر ایک بڑا اہل مہاجن آیا۔ اس نے قیمتی جواہرات کے زیور دکھائے۔ قیمت طے ہوئی۔ رانی صاحبہ نے پچاس ہزار کی چک الہ آباد بنک کی کاٹ کر اُس کے حوالے کی۔

جب مہاجن چلا گیا، تو پیارے صاحب نے سب اسباب بندھوا کر دونوں مہریوں کو میلے کپڑے پہنا کر لکھنؤ روانہ کیا آپ مکان خالی کرکے سرا میں قیام پذیر ہوئے۔

مہاجن نے اُسی روز کانپور کی شاخ میں الہ آباد بنک کی چک پیش کی۔ بنیکر نے کہا۔ اس پر اپنی دستخط کردو۔ الہ آباد سے دریافت کرکے تم کو روپیہ دیا جائیگا۔ مہاجن چک دیکر چلا گیا۔ چار روز کے بعد الہ آباد سے جواب آیا "اِن رانی صاحبہ کا کوئی روپیہ بنیک میں نہیں ہے لہذا روپیہ نہ دیا جائے۔ چک جعلی ہے۔"

اب مہاجن یہ خبر سنتے ہی بہت پریشان ہوا۔ اسی مکان پر دوڑا ہوا گیا۔ دیکھا مکان خالی ہے۔ صاحب مکان

پوچھا۔ اس نے کہا "ایک معمولی آدمی اور دو غریب عورتیں اس مکان میں اترے تھے۔ ایک مہینہ کا کرایہ پیشگی ادا کردیا تھا۔ بیس دن کے بعد چلے گئے۔ ہم کو نہیں معلوم کہاں گئے" پولیس میں رپورٹ کی گئی۔ کچھ پتہ نہ ملا۔

پیارے صاحب نے دیکھا جب کانپور کی شورش فرو ہوگئی۔ اور اب کچھ کھٹکا نہیں رہا۔ تو بخیر و عافیت اپنے گھر واپس آئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد زیور کے جواہرات الگ الگ فروخت کرلئے۔ لونڈیاں بھی عیش کرتی تھیں۔ آپ کھاتی تھیں، اپنے آشناؤں کو کھلاتی تھیں پیارے صاحب بھی عزت سے زندگی بسر کرتے تھے

کلن خان جھوٹے جواہر بنانے میں مشہور تھے، مگر کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں بیچتے تھے۔ پیارے صاحب نے فرمائش کرکے کچھ جواہرات اُن سے بنوائے۔ اور سونے کے زیورات پر انکو جڑوا کر کلکتہ پہنچے۔ یہی دونوں مہریاں ساتھ لیں۔ مٹیا برج میں قیام کیا۔ دونوں شام کے وقت مہاجنی بازار میں ہوا کھانے نکلتی تھیں۔ اور بڑے ٹھسّے سے نکلتی تھیں۔ بعض دوکانداروں نے پوچھا "کیوں بی مہری! کہاں سے آنا ہوا" تو کہتی تھیں "نواب خورشید محل بادشاہ کی پہلی بیگم لکھنؤ سے آئی ہیں۔ انھیں کے ساتھ ہم لوگ بھی ہیں۔" پوچھا "کتنے نوکر ہیں" کہنے لگیں "پچاس تو صرف مہریاں ہیں۔ باقی تمام عملہ ساتھ آیا ہے۔ ہم لوگ دس پندرہ دن میں واپس جائینگے۔ کسی کسی نے پوچھا "کچھ زیور کی خریداری ہوگی" کہا "نہیں۔ زیور بیچاری کیا خریدینگی۔ ان کی تنخواہ پانچسو روپیہ ماہوار ہے۔ خود ہر مہینے میں دو چار زیور بیچکر خرچ چلاتی ہیں۔" مہاجن نے کہا "کوئی چیز نکالیں، تو ہم سے کہنا"

ایکدن شام کو آئیں۔ اور کہا "ہماری بیگم صاحبہ کل تک جانے والی ہیں۔ یہاں کچھ قرضدار ہوگئی ہیں۔ دو چار چیزیں فروخت کرنا چاہتی ہیں۔ تم کو خریدنا ہوں۔ تو ہمارے ساتھ چلکر لے لو۔ ۔۔ ۔۔

دو ایک مہاجن آئے۔ مہریاں اندر سے جواہرات کے دس پانچ زیور لائیں۔ بہت حجت کے بعد سودا طے ہوا۔ پچیس ہزار کا مال مہاجنوں نے خرید لیا۔ ایک مہاجن وہیں بیٹھا رہا۔ دوسرا روپیہ لے کر آیا۔ زیور لے کر گھر گیا۔

دوسرے مہاجنوں نے بھی دیکھا۔ ایک نے کہا " یہ سب مال جھوٹا ہے۔ اب خریدنے والے کے پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھانے لگے۔ اچھی طرح جانچا ایک ہیرے کو زیور سے نکال کر دیکھا، تو شیشے کا تھا۔ اُسی وقت پیٹ پکڑے ہوئے کوتوالی دوڑا گیا۔ مٹیا برج میں دوڑ لایا۔ مکان مسکونہ کو خالی پایا۔ مالک مکان کو دریافت کرکے اُن سے پتہ پوچھا۔ انھوں نے کہا "کوئی بیگم تو اس میں نہیں تھیں۔ ایک غریب سید اپنے ساتھ دو لڑکیوں کو لیکر آئے تھے۔ بادشاہ کی خدمت میں باریابی چاہتے تھے۔ کوئی ذریعہ نہ ملا۔ کل مکان خالی کرکے چلے گئے ہمیں نہیں معلوم کہاں گئے" سب مہاجنوں نے مل کر بہت خاک چھانی۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا، اس لئے کہ پیارے صاحب تو صاحب گنج میں آرہے۔ اور لونڈیوں کو اپنے گانوں شیخ پورہ میں بھیج دیا۔

پیارے صاحب نے قانونی جعل پیدا کیا۔ سیتاپور میں ایک چھوٹا سا مکان مول لیا۔ اور وہیں ایک ہبہ نامہ اپنی بی بی کے نام اس طرح رجسٹری کرایا۔ کہ یہ مکان سیتاپور کا

جسکی جوحدی اتنی ہے۔ معہ اس مکان اور باغ کے جو میری ملکیت کا لکھنؤ میں ہے جس کی چوحدی یہ ہے۔ بعوض دین مہر کے ہبہ کرتا ہوں"۔

جب مکان ہبہ کر چکے، تو لکھنؤ میں ایک مہاجن کے ہاتھ اپنا مکان معہ باغ کے پانچ ہزار روپیہ کو فروخت کیا۔

مہاجن نے ان کی بی بی سے تخلیہ مکان کو کہا۔ بی بی نے جواب دیا "مکان تو میرے دین مہر میں ہے۔ خالی کرنا کیسا؟" اس نے کہا "میں نے خریداری سے پہلے مکان کی رجسٹری کے متعلق دیکھ لیا تھا۔ کہیں ہبہ، رہن اور بیع نہیں ہے۔ سیدھی طرح مکان خالی کر دو"

بی بی نے کہا " لالہ تم نالش کرو، مکان میں خالی نہیں کرونگی"

مہاجن نے عدالت میں دعویٰ کیا۔ بی بی نے جواب میں رجسٹری شدہ ہبہ نامہ جسکی رجسٹری سیتاپور میں ہوئی تھی، پیش کیا۔ عدالت نے بی بی کی ملکیت قرار دیکر مہاجن کا دعویٰ خارج کر دیا۔ گانوں پہلے سے رہن رکھ چکے تھے۔ مہاجن اپنے روپیہ سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ ایسے شوہر کی بی بی ایسی ایماندار تھی، کہ میاں کی کمائی کے پیسے کو نجس اور ناجائز سمجھتی تھی۔ صرف پچاس روپیہ مہینہ جو وثیقہ کا آتا تھا۔ اُسے اپنی ذات پر صرف کرتی تھی۔

پیارے صاحب ہمیشہ ایسے ہی جعل کیا کرتے تھے، اور زندگی خوشحالی سے بسر کرتے تھے۔ جھوٹے گواہ اُن کی جیب میں پڑے ہوئے تھے۔

اتنے میں ایک استاد نجو خاں نوجوان مدراس کے علاقہ سے آئے، یہ چھیلا و باز تھے۔ لکھنؤ میں آکر چھیلا و بازوں سے بڑی سیر چشمی سے روپیہ خرچ کرتے تھے۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ نہ لکھے نہ پڑھے۔ نہ کوئی سوداگری کرتے ہیں نہ کسی محکمہ میں نوکر ہیں۔ جاہل آدمی اس قدر روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ کہ تمام نشہ باز انکو گھیرے رہتے ہیں۔ آخر پتہ لگاتے لگاتے ان کے ایک گہرے دوست کو معلوم ہو گیا، کہ استاد نجو خاں جو دو پہر تک گھر کے اندر سے باہر نہیں نکلتے، اور کسی سے ملاقات بھی نہیں کرتے، کچھ بناتے ضرور ہیں۔ استاد نجو خاں نے ایک دن اُن کو دس روپیہ کا نوٹ دیا، کہ اسے خوردہ کرا لاؤ۔ یہ دو پیسہ دیکر روپیہ لے آئے۔ چار روز کے بعد پھر ایک نوٹ بھنانے کو دیا یہ پھر روپیہ لے آئے۔ اسی طرح دو چار مرتبہ نوٹ بھنانے کو گئے، تو انھوں نے نظر کی، کہ ان نوٹوں میں کوئی پُرانا فرسودہ نہیں ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ابھی تازہ نیا بنک سے نکلکر آیا ہے۔ خیال ہوا، کہ ہو نہ ہو استاد نجو خاں دس روپیہ کا نوٹ بناتے ہیں۔ اسی خوف سے ایک دن انھوں نے کہا "استاد میں نوٹ بھنانے نہیں جاؤنگا۔ آپ کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ بھیجد یجئے"۔ منشی جوہر علی ان کے دوست تھے، ان کو نوٹ دیدیا گیا، وہ روپیہ لے آئے۔ لیکن جوہر علی نے دیکھا، کہ ہمیشہ دس روپیہ کا تازہ نوٹ استاد خوردہ کراتے ہیں۔ نہ کبھی پانچ کا ہوتا ہے، نہ بیس کا۔ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔ اب جوہر علی نے اپنے دوستوں سے تذکرہ کرنا شروع کیا۔ پیارے صاحب تک یہ خبر پہنچی، وہ سمجھ گئے کہ استاد نجو کاریگر ہیں۔ بہت تپاک سے آکر ملے۔ نہایت دھوم سے اپنے یہاں اُن کی دعوت کی۔ بڑی گہری دوستی

کرکے کہنے لگے، ہم بھی اس پیشہ میں کچھ واقفیت رکھتے ہیں۔ مگر استاد تم بُرا کرتے ہو، جو دس دس روپے کے کاغذ بنا کر لونڈوں کے ہاتھ خوردہ کراتے ہو۔ اس میں اندیشہ ہے۔ اوّل تو ایسے آدمی کو شہر میں رہنا نہیں چاہیئے، دوسرے لمبی رقم بنا کر کچھ دنوں تو کھایا کرو جیسے دس کے ویسے پانچسو کے محنت۔ تم دس نوٹ پانچ پانچ سو کے بنا دو، میں روپیہ نقد لا دونگا پہلے تو استاد نے اس امر کو چھپایا۔ آخر جب پیارے صاحب نے بہت سی قسمیں کھائیں، تو راز کھُل گیا۔ اور ایک مہینے میں دس نوٹ پانچ پانچ سو کے بنا کر پیارے صاحب کو دیئے۔ انھوں نے آٹھ روز روپیہ لا دیا۔ اور کہا "میری رائے یہ ہے، کہ تم مع اپنے احباب کے ایک ویران مقام میں رہو" اب یہ تمام چانڈو بازوں کو لیکر بنارس پہنچے۔ اور مقام فاطمان میں ایک مقبرہ کے اندر سب نے قیام کیا۔ دل کھول کر نوٹ بنانے لگے، اور یار دوست دوسرے شہر میں جا کر روپیہ لانے لگے اس میں ایک اور استاد بھی آ گئے، جو چونیاں بناتے تھے، مگر اس چونی بنانے والے کا اشتہار گورنمنٹ سے ہو چکا تھا، اور خفیہ پولیس اسکی تاک میں تھی۔

سب سے پہلے یہ خبر پیارے صاحب لے کر آئے اور کہا "ان چونی بنانے والے استاد کو فوراً کسی دوسرے مقام پر بھیجدو، پولیس انکی تلاش میں ہے" چانڈو باز تو کاہل ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا "میں اپنے اوزار باندھ کر رکھے دیتا ہوں۔ پرسوں یہاں سے چلا جاؤنگا۔" ... ...

پیارے صاحب اور استاد نجو خاں تو لکھنؤ چلے آئے۔ پولیس کو خدا جانے کیسے خبر مل گئی کہ دوڑ لے کر پہنچی۔ چونی بنانے والے استاد بھی بازار کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔ انھیں جو معلوم ہوا، کہ فاطمان میں پولیس دوڑ لے کر گئی ہے وہ تو وہیں سے رفوچکر ہوئے۔ پولیس نے جاتے ہی سب چانڈو بازوں کو گرفتار کر لیا جو بالکل بے قصور تھے۔ ان میں ایک شریف خاندان میرصاحب کے فرزند بھی تھے، بیچارے یہ خبر سنتے ہی لکھنؤ سے دوڑے گئے، اور پولیس سے ملکر رؤسائے شہر کی سفارش کرا کے اپنے فرزند کو حوالات سے بمشکل رہا کرایا۔ باقی سب کو چھ چھ مہینے کی اعانت جُرم میں سزا ہو گئی۔ اصل سکّہ بنانے والے کا پتہ نہ لگا۔ پیارے صاحب اپنے گھر میں بہت دنوں تک چھپے بیٹھے رہے۔ (خاص)

ریاست

شکست کی آواز

[جناب حنیف ہاشمی اسسٹنٹ ایڈیٹر "ریاست" دہلی]

سردیوں کی ایک شام، کلیسا اور جنرل پوسٹ آفس کے سامنے مال روڈ پر ایک کمرہ۔ بجلی کا قمقمہ روشن ہے۔ دریچے بند کر کے ہلکے سبز رنگ کے پردے چھوڑ دئے گئے ہیں صرف تین جانب ایک کھڑکی کھلی ہے اس کھڑکی کے پاس ایک پیانو رکھا ہے جس کے پہلو میں ایک قدیم وضع کی منقش کرسی ہے۔ کمرہ کے دوسرے کونہ میں سنگار میز ہے جس پر ایک ہینڈ بیگ، ایک آئینہ، ایک ارغوانی سمور، ایک بلور اور ایک ہیرپن ہے اور یہ سب چیزیں ایک بے ترتیبی کے عالم میں پڑی ہیں۔ اس میز کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی چوکی ہے۔ کمرہ کے درمیان میں ایک چھوٹی میز ہے اور بالمقابل دیوار کے قریب نیلگوں صوفہ اور دو کرسیاں ہیں۔

سنگار میز کے اوپر ایک بڑی سی رنگین تصویر آویزاں ہے۔ سائیکی نیم برہنگی کی حالت میں پھولوں کے ایک کوچ پر دراز ہے۔ تصویر میں صرف اُسکی پشت دکھائی گئی ہے لیکن ایک بڑے سے آئینہ میں جو سائیکی کے سامنے رکھا ہے اسکا چہرہ، گلا، اور سینہ کا اُبھار دکھائی دیتا ہے۔ پشت پر گھٹنوں سے کچھ اوپر سے لیکر ریڑھ کی ہڈی کے زیریں سرے تک حلوان کی چادر پڑی ہے۔ سائیکی کے پاؤں کی جانب کیوپڈ محویت کے عالم میں کھڑا ہے پہلو میں ترکش ہے لیکن کمان ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی ہے۔

آہستہ سے دائیں جانب کا دروازہ کھلتا ہے اور ۱۷ یا ۱۸ سال کا ایک لڑکا داخل ہوتا ہے۔ لڑکا نہایت خوبصورت ہے اور انگریزی لباس میں ملبوس ہے چہرہ سے ایک شاعر یا مفکر معلوم ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ میں گل بنفشہ کا ایک ننھا سا بٹن ہے۔ انداز سے ایک خمار اور والہانہ پن برستا ہے اندر داخل ہوتے ہی انگریزی وضع کی ٹوپی کو بے پروائی سے پیانوں پر پھینک دیتا ہے پھولوں کے بٹن کو سنگار میز پر رکھ کر آئینہ میں ٹائی کی گرہ دیکھتا ہے۔ بوٹ کی ٹو پر سے مٹی کے داغ کو رومال سے جھاڑتا ہے اور مضطربانہ کمرہ کے طول میں ٹہلنا شروع کرتا ہے آنکھوں میں غیر انسانی چمک ہے اور معلوم ہوتا ہے وہ خواب کی وادی میں پھر رہا ہے یکایک سنگار میز کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سمور کو اُٹھا کر بوسہ دیتا ہے اور دیر تک اسے منہ سے لگائے رکھتا ہے اسکی خوشبو میں سانس لیتا ہے پھر بلور کو اٹھاتا ہے اسکو چومتا ہے، ہیرپن کو بوسہ دیتا ہے اور پھر کرسی پر گھٹنوں پر کہنیاں رکھکر بیٹھ جاتا ہے اور قالین کے پھولوں پر نگاہ گاڑ دیتا ہے۔ لبوں پر ایک جانب دلکش سی مسکراہٹ ظاہر ہو ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔ ایک

ہاتھ آنکھوں پر رکھکر سر جھکا لیتا ہے۔ مبہم سی آواز میں کچھ کہتا ہوا اُٹھتا ہے اور سائیکی کی تصویر کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے ہونٹ بھنچے جاتے ہیں۔ چہرہ پر درد و کرب کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ پیشانی پر شکن پڑ جاتے ہیں ایک طویل آہ بھرتا ہے اور پھر آ کر کرسی پر گر جاتا ہے۔

پوسٹ آفس سے آٹھ بجے کی گونج سنائی دیتی ہے بائیں جانب کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک سرو قد نوجوان عورت داخل ہوتی ہے عمر تیس کے قریب ہے، بینگلوں خاکستری رنگ کی ساری میں ملبوس ہے باہیں کہنیوں تک عریاں ہیں۔

لڑکا ایک گھٹنہ ٹیک کر بنفشہ کا شگوفہ پیش کرتا ہے اور وہ لیکر پھر سنگار میز پر رکھ دیتی ہے۔ لڑکا وفور جذبات کے ساتھ اسکے ہاتھ کو، ساری کو، کلائیوں کو، بار بار بوسہ دیتا ہے ساری کے آنچل کو سینہ سے لگاتا ہے عورت ساتھ کی کرسی پر بے اختیاری کے ساتھ گر جاتی ہے اور لڑکا اُسکے سامنے قالین پر دو زانو سا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنا سر اُسکے زانوں پر رکھکر کیوپڈ اور سائیکی کی تصویر کو دیکھتا ہے۔

لڑکا۔ آہ! میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس عالم خاکی سے متعلق نہیں۔

(عورت بے چینی سے پہلو بدلتی ہے)

میری ناہید تو دیکھتی ہے۔ سائیکی او لمپیا کی بلند ترین چوٹی پر تختہ ہائے گل پر دراز ہے یہ تو ہے میری پیاری اور وہ کھڑا ہے کیوپڈ لرزاں و ترساں، کمان ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے اور قریب ہے کہ وہ اپنا سر سائیکی کے قدموں پر رکھدے ..... کیا یہ تیرا قمر نہیں!

(عورت مضطربانہ حرکت کرتی ہے۔ ایک ہاتھ لڑکے کے بالوں پر پھیرتی ہے)

ہاں تیرا قمر۔ کیا میں تجھے اپنے پر شوق نغمات عشق کے بازوؤں پر آسمانوں کی بلند ترین مملکتوں میں نہیں لے گیا؟۔ اور کیا میں نے بھی کیوپڈ کی مانند تیری پرستش کے لئے ایک معبد تعمیر نہیں کیا اپنے جذبات الفت سے، اپنی ہنگامہ آمیز آوازوں سے، اپنی ولولہ انگیز تمناؤں سے، تو جانتی ہے وہ معبد کہاں ہے میری ناہید وہ آسمان سحری کے ایک تاریک گوشہ پر نہیں جہاں ہر کس و ناکس کی نگاہیں تیری ضیائے حسن کو دیکھیں۔ دیکھیں اور اپنے خیالات کو ارضی تمناؤں سے ملوث کریں۔

[عورت کا ہاتھ اپنے تھرتھراتے ہوئے لبوں سے لگاتا ہے اور لگائے رکھتا ہے عورت اسکے تنفس کی حدت محسوس کرتی ہے اور آہستہ سے ہاتھ کھینچ لیتی ہے]

تیرا مندر تو میرا دل ہے، ناہید، اور تو دیوی ہے، اس مندر کی الٰہتہ الجمال میں لایا ہوں اپنے گیت کہ تیرے پاؤں پر نچھاور کردوں اور اُن کے تعطر سے قصر عشق کی فضا کو مہکا دوں۔ پھول مرجھا جاتے ہیں۔ کلیاں کمہلا جاتی ہیں اور خزاں کی زرد پتیاں دوش صبا پر منتشر ہوتی ہیں، میری پیاری، لیکن یہ پھول، جو تیری مقدس بارگاہ میں لایا ہوں ابدی ہیں کیونکہ یہ محبت اور پاکیزگی سے پنپے گئے ہیں اُنھوں نے تیرے غیر فانی حسن سے اکتساب رنگ کیا ہے۔ اُن میں تیرے سنبلیں گیسوؤں کی مہک ہے تیری خمار انگیز نگاہوں کی مستی اور ایک مدہوشانہ سرور ہے جو زندگی بخش اور

شاداب ہونٹوں کی جان آفرینی، صرف یہی نہیں بلکہ میری محبت کی پاکیزگی، تانبا کی اور شعلہ سامانی بھی موجود ہے آہ! وہی تانبا کی اور شعلہ سامانی جو آج سے پیشتر صرف ایک بار اس دنیا میں آسمانوں سے اتری اور وہ جنت عدن کی فضاؤں میں اسوقت جب پیکر لطافت کو آدم کے پہلو سے تخلیق کیا گیا۔ آج میں وہی تانبا کی محسوس کرتا ہوں۔ وہی قیامت بداماتی اس لئے کہ میں محبت کرتا ہوں۔ اولین آدم کی مانند اور میری محبت عظیم ہے اس کی محبت کی طرح اور تجھ سے محبت کیجاتی ہے اسے نسائیت کی گل رعنا اولین بار، پہلے تجھ سے کبھی محبت نہیں کی گئی حالانکہ تیرا دل ایک سمندر تھا محبت کا بے پایاں اور بے کراں، اتھاہ، ابدیت کا عمیق اور دریائے وقت کی موجوں کا ناپائیدار کنار!

عورت۔ (چہرہ سے اضطراب برستا ہے) قمر!

لڑکا۔ (چونک کر جیسے کسی نے خواب گراں سے بیدار کردیا ہے) قمر! کس نے کہا قمر! ناہید آہ میرے خواب ہائے رنگین کی تعمیر!

عورت۔ قمر! (چہرہ سے اضطراب وغم کے ساتھ ایک گونہ تفکر بھی ظاہر ہوتا ہے)

لڑکا۔ قمر! ہمیشہ کے لئے تیرا قمر، عورت اور زندگی کے لئے دنیا اور ماورا کے لئے۔

عورت۔ میں جانتی ہوں لیکن ....

لڑکا۔ (چونک کر) لیکن............

عورت۔ ایک خوفناک واقعہ ہوگیا ہے۔

لڑکا۔ (بے پروائی سے) ہونے دے میری حور، میری ملکت خیال کی ملکہ ہونے دے، طوفان آئیں۔ بجلیاں کڑکیں، آسمان ٹوٹ پڑے مجھے کیا پروا ہے۔ کیا یہ میرے لئے کافی نہیں کہ میں محبت کرتا ہوں اور اس جمیل ہستی سے محبت کرتا ہوں جو اگر چاہتی تو ایک ادائے استغنا سے مجھے محروم حیات کردیتی۔ لیکن اُس نے پذیرائی کی میرے اشک ہائے الفت کی اور اُن کو جگہ دی پاکیزہ جان کر اپنے دامن میں ناہید۔ ———

عورت۔ (گھبراکر) قمر!

لڑکا۔ ناہید! کہدے کیا میں نے اعتراف نہیں کیا کیا میں نے سر کو تیرے حضور میں خم کرتے ہوئے نہیں کہا کہ میری زندگی تشنۂ تکمیل تھی۔ میں نہ جانتا تھا زندگی کیا ہے اور اسکا مصرف کیا ہے۔ اب تک میری زندگی الٰہیات اور فلسفہ کی دشوار گذار گھاٹیوں میں گذری۔ میں نے علم الادویا کا مطالعہ کیا، زورق خیال پر بیٹھکر مابعد الطبعیات کی پہنھائیوں میں کھو گیا ——— اور کیا دنیا نے اسکا اعتراف نہیں کیا؟ کیا بڑی بڑی مجالس میں میری طرف اشارے نہیں ہوئے! کیا بزم مکالمہ میں میری آواز کو احترام کے ساتھ نہیں سنا گیا؟ اور کیا اس امر پر اظہار تعجب نہیں کیا گیا کہ میں نے اس نوعمری میں اسقدر علم وفضل حاصل کرلیا ہے؟ یہ سب کچھ تھا لیکن میری کیفیت بالکل ایک محبوس پرندہ کی سی تھی۔ میں ناآشنا تھا زندگی کے اس مقصد عظیم سے، جس سے تو نے مجھے متعارف کیا اور تو بھی تو اے دنیائے محبت کی شاہکار یہ نہ جانتی تھی کہ تیرے دل میں عشق و محبت کا کس قدر گراں بہا خزانہ مدفون ہے۔

عورت ۔ خدا کے لئے مجھے پریشان نہ کرو میری بات سنو!۔

لڑکا ۔ ناہید کیا ہوگیا ہے تمھیں ۔ یہ تو میری ناہید کی آواز نہیں ۔

عورت ۔ میں کہہ رہی ہوں ایک خوفناک بات واقع ہوگئی ہے !

لڑکا ۔ آہ! اس نے تجھے پریشان کر رکھا ہے کیا یہ امر تیرے لئے باعث اطمینان نہیں کہ قمر تیرے پاؤں میں بیٹھا ہے ؟ کیا کوئی اور شے تیرے سکون کو برہم کرسکتی ہے ؟

عورت ۔ تمھاری نظموں کا مسودہ غائب ہوگیا ہے ۔

لڑکا ۔ آہ! یہ امر تجھے بے چین کئے ہوئے تھا' ناہید' تو زندگی کی تیئس بہاریں دیکھ چکی ہے لیکن بھولے پن اور سادگی میں معلوم ہوتا ہے نیلوفر کے اس پھول کی مانند ہے جو سر شام جھیل کے پانی میں ہچکولے تو کھاتا ہے لیکن اُس کی پتیاں ابھی شب ماہ کے قطرات شبنم سے آشنا نہیں ہوتیں کیا مضائقہ ہے اگر وہ نظمیں ضایع ہوگئیں ہیں وہ شایاں نہ تھیں' اے حسن و معصومیت کی دیوی تیری بارگاہ قدس کے یہ ایک نذر تھی جو میں لایا تھا کہ تیرے پاؤں پر نچھاور کردوں

عورت ۔ قمر! انکا ضایع ہونا معمولی بات نہیں ہے۔

لڑکا ۔ بھولی لڑکی تو خیال کرتی ہے میں اپنے تمام الفاظ ان نظموں پر صرف کرچکا ہوں اور محبت کے جذبات فراواں اب ہجوم کرکے نوک خامہ پر نہیں آسکتے ؟ کیا تیری نگاہ اب دنیائے خیال میں ہیجان برپا نہیں کرسکتی! کیا میرے احساسات لطیف مردہ ہوچکے ہیں اور میں پھر وہی بے جان اور غیر ذی روح مخلوق ہوں جو تیری آمد سے پیشتر تاریکی میں بھٹک رہی تھی ؟

عورت ۔ (عفو آمیز لہجہ میں) قمر! مجھے تمھاری وہی اکتسابی قابلیت کا اعتراف ہے ۔ مجھے صرف یہی فکر ہے اگر وہ نظمیں کسی کو مل گئیں تو لوگ کیا کہینگے ؟

لڑکا ۔ یہی کہ ایک مرد نے وفور جذبات اور دل کی پاکیزگی کے ساتھ ایک عورت سے محبت کی بالکل اسی طرح جس طرح قیس عامری نے لیلیٰ کو چاہا' جسطرح وامق نے عذرا سے محبت کی' جس طرح فرہاد نے شیریں کے لئے جان دیدی' لیکن کوئی نہ جان سکیگا کہ وہ مرد کون تھا!

عورت ۔ لیکن میں تو رسوا ہوجاؤنگی ۔

لڑکا ۔ ڈرتی ہے رسوائی سے! لیکن تو کیوں رسوا ہوگی؟

عورت ۔ تم نے اِن نظموں میں مجھے ایام دوشیزگی کے نام سے مخاطب کیا ہے ۔

لڑکا ۔ کیا ہے !

عورت ۔ تمھاری اولین نظم جس میں تم نے اپنے خواب کی سی آرزوں کا اظہار کیا ہے "ناہید کی بارگاہ میں" ہے

لڑکا ۔ ہاں "ناہید کی بارگاہ میں" مجھے یاد ہے ۔

عورت ۔ اور میرا خیال ہے نظم سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اعترافات الفت کا مخاطب ناہید کو ٹھہرایا گیا ہے ۔

لڑکا ۔ ہاں ناہید کی بارگاہ میں ہی سہرا ختم کیا گیا ہے ۔

عورت ۔ اور دنیا جانتی ہے ناہید میرے کنوارپنے کا نام ہے ۔

لڑکا (برافروختہ ہوکر) احمق عورت! تو مجھ سے توقع کر سکتی تھی میں تجھے اس نام سے مخاطب کرتا جس کا تیری مرضی کے خلاف تجھے حامل بنایا گیا؟ اور تو نے بھی اسے بادل ناخواستہ اختیار کیا کہ تو رسوم و قیود کی زنجیروں کو توڑنے کی قوت نہ رکھتی تھی۔ کیا تو نے اس شام جب "دہقان" کی تصویر دیکھنے کے بعد میں تجھے گھر چھوڑنے جا رہا تھا مجھے نہیں بتایا تھا کہ تمہاری شادی میں ارمان کا کوئی عنصر نہ تھا۔ ان تعلقات کی بنا دولت اور مرتبہ کا لحاظ تھا' تجھے پرویز سے محبت نہ تھی اور پرویز نے کبھی محبت کو افتادگی اور نیاز کے ساتھ تیرے حضور میں پیش نہیں کیا تو نے اعتراف کیا تھا' یاد ہے' تجھے نا امید کر تو اس وقت تک محبت کی دولت فراواں سے بالکل تہی دامن تھی جب تک کہ ایک اجنبی' محض اجنبی' نے آکر تجھے مملکت سماوی پیغام نہیں دیا (فکر یک لمحہ کے بعد) اور وہ اجنبی میں تھا! یہ لمحہ کس طرح آیا میں نہیں جانتا مجھے اسکا خیال بھی نہ تھا۔

عورت۔ (خیالات میں کھو کر) کیا ہو گیا تھا قمر! تم نے یہ جرأت کیوں کی تھی؟

لڑکا۔ میں نے جرأت کیوں کی تھی' تو پوچھتی ہے؟ میں نہیں جانتا' میں نے تیرے شباب کو غمزدہ دیکھا اگرچہ یہ اب بھی شگفتہ شادمان تھا لیکن میں نے محسوس کیا جوانی کی امنگیں کسی فریب کی نذر ہو چکی ہیں۔ کسی نے تیرا دل دکھا ڈالا ہے۔ لیکن تیرا فسانۂ غم ابھی محروم ہے ذوق خوانندگی اور التفات پرسش سے تیری روح شعریت تو زندہ ہے لیکن فضا میں ایک پژمردگی اور درماندگی ہے' مسموم اور حیات سوز۔ تیرا دل مرقد تو تھا موسیقی کا لیکن ویران و برباد اور خوں گشتہ۔ تو اپنے شباب کی تمام تر آرزو انگیزیوں اور حسن کی تفکر آمیز صباحتوں کے ساتھ ایک پیکر تھی مایوسی اور ناکامرانی کا۔ درد و بیچارگی کی ایک تمثال' بیتا اور دکھ کا ایک بول اور آہ!۔۔۔ ایک ڈھیر مٹی ہوئی آرزوؤں اور پر شباب تمناؤں کا۔۔۔ (سوچتا ہے) ۔۔۔ تیرے ایام تاریک تھے' ابدی ظلمت کی مانند' اس وقت میں آیا اور تو نے کہا کہ خدا نے ایک نو عمر لڑکے کو بھیجا کہ تیری زندگی کی تاریکیوں کو آفتاب مسرت کے نور سے تازیانہ سے منتشر کر دے۔ اُن کو بھگا دے۔ کیا تو نے نہیں کہا تھا دیکھو تکمیل ہوئی جاتی ہے میرے خوابہائے پریشاں کی۔

عورت۔ تو قمر یہ محبت نہ تھی؟ ہمدردی کے جذبات تھے' تم وثوق سے کہہ سکتے ہو؟ میں ان جذبات کا تجربہ نہیں کر سکتا۔ یہ صرف ہمدردی کے جذبات نہ تھے کیونکہ اس سے پیشتر بھی میں نے محسوس کیا تھا کوئی شئے ہے جو مجھے تیری جانب کھینچ رہی ہے اگرچہ تیری روح کی مظلومیت اس وقت بھی میرے سامنے ایک تمثال ترحم بن کر آتی تھی اور میں بھی اپنے جذبات کی گہرائیوں میں ایک ہیجان تلطف محسوس کرتا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس روحی ارتعاش کا انجام محبت کے پُرکیف اور سماوی جذبہ پر ہوگا۔ (سوچتا ہے اور عورت اسکے پریشان بالوں میں انگلیوں کو حرکت دیتی ہے ایک لفظ کہے بغیر آہستہ سے جھٹکتی ہے اور اپنے لبوں کو اسکے بالوں سے مس کرتی ہے لڑکا اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگاتا ہے)

عورت ۔ قمر! مجھے اعتراف ہے میں مردہ تھی خدا نے میرے جلانے کے لئے تجھے بھیجا میرے پروانے تو میرے ہی لئے تخلیق ہوا تھا۔

لڑکا ۔ اور کیا تو میرے لئے تخلیق نہیں ہوئی تھی اک وحشی درندے کے لئے تجھے بنایا گیا تھا؟ ناہید میں معافی چاہتا ہوں اگر میں اسی شخص کے لئے یہ الفاظ استعمال کروں جس کو تجھ سے محبت تھی لیکن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عورت ۔ نہیں ۔ اس کو مجھ سے محبت نہ تھی ۔ وہ محض اپنے جذبات کی تسکین چاہتا تھا اور اگر میری بجائے کوئی اور عورت ہوتی تو یہ بہت ہی ممکن تھا۔

لڑکا ۔ لیکن یہ احمقانہ انسانی خواہشات کی ستم ظریفی تضحیک تھی کہ ایک نازک نسوانی دل کو معاشرتی مراتب کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا پرویز کی نگاہیں الفت کے اس بے پایاں خزینہ کو نہ دیکھ سکتی تھیں جو قضا و قدر نے میرے لئے ودیعت کیا تھا کیونکہ وہ اسکا متلاشی نہ تھا اور وہ مستحق نہ تھا اس پاک خلوص و عبودیت کا جو تیرے سینہ میں متحرک ہے جس کی دھڑک کو میں نے ہم آہنگ پایا ہے اپنے دل کی دھڑک سے اسوقت جب نگاہیں ساکت تھیں لبوں پر مہر سکوت تھی لیکن ایک روح ہم آغوش ہو رہی تھی دوسری روح سے ۔ جب میری روح گھبرا گئی تھی کاوش و تفکر سے' بیزار ہو گئی تھی دنیا کی آلودگیوں کے بھیانک منظر سے ۔ جب تاریکی نے چاہا اس پر قبضہ جمائے میں نے اپنے گرد قوس قزح کا دھندلا سا غبار دیکھکر چاہا کہ میں بھی اپنے تئیں اس کے سپرد کر دوں ۔ اس وقت اسے میری محبوب ترین حور تیرے تصور نے میری رہنمائی کی اور میرے سر کو دنیا کے متحرک و مرتعش نقوش کے درمیان محض تیرے پُر گداز سینہ پر امان ملی ۔

عورت ۔ آہ وہ اولین بلا انگیز جذبات!

لڑکا ۔ اور تو نے دیکھا ناہید عمر کے اس تفاوت کے باوجود میں نے کس استغراق کے ساتھ تجھ سے محبت کی!

عورت ۔ میں محسوس کرتی تھی وقت کا دریا اپنی رہگذر پر لوٹ گیا ہے ۔ میں آج سے پندرہ سال پیشتر کی ناہید ہوں اسقدر سحر کار تھی تیری محبت اور اسقدر قوی تھا تیرا جذبۂ عشق!

لڑکا ۔ لیکن ۔۔۔۔۔۔۔۔!

[کلیسا کے گھڑیال سے نصف گھنٹہ کی ضرب فضا میں گونجتی ہے اور عورت چونک کر کھڑی ہو جاتی ہے ۔ جلدی سے کھڑکی کے باہر جھانکتی ہے]

عورت ۔ قمر! تم کسقدر بے پروا لڑکے ہو!

لڑکا ۔ کیوں کیا ہے؟

عورت ۔ تم میری مصیبت کا تو خیال ہی نہیں کرتے!

لڑکا ۔ کیا ہوا ہے ناہید' کیا تمہاری مصیبت میری مصیبت نہیں!

عورت ۔ تمہیں مطلق پروا ہی نہیں ۔ آج تمہاری محبت خواب کے افسانے معلوم ہوتی ہے ۔

لڑکا ۔ میرے خدا! میری محبت محض خواب کے افسانے! ناہید جو تیرے نزدیک کچھ عرصہ پیشتر ایک

حقیقت تھی ناقابل انکار اٹل اور سر عزیز متزلزل!

عورت - ہاں محض خواب کے افسانے تخیل کی ناکارہ جولانیاں (لڑکا حیرانی سے اس کے چہرہ کو تکتا ہے) اے کاش تم وہ نظمیں نہ لکھتے!

لڑکا - ناہید ——— کیا تم میری ناہید نہیں؟ (آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں آواز بھرا جاتی ہے)

فضا مجھ پر تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ انجام میری وا لہانہ عبودیت کا۔ (خاموش ہو جاتا ہے دو آنسو قابین پر گرتے ہیں) (عورت پھر آ کر صوفہ پر بیٹھ جاتی ہے اسکا سر اپنے گھٹنوں پر رکھکر آنسو پونچھتی ہے)

عورت - میرے محبوب! برا نہ مان لیکن ذرا خیال تو کر۔ اگر وہ نظمیں کسی کو مل گئیں تو لوگ کیا کہینگے۔ میں نے مانا کوئی شاعر کے نام سے واقف نہ ہوگا۔ میں تو بدنام ہو جاؤنگی۔

لڑکا - لیکن کون جان سکے گا ان میں مجھے مخاطب کیا گیا ہے۔

عورت - کیوں ناہید میرا نام نہیں سب کو معلوم ہے۔ اور پھر لاہور میں میرے علاوہ کوئی بھی ناہید نہیں

لڑکا - کوئی بھی ناہید نہیں۔

عورت - ہاں کوئی ناہید نہیں اور تمام جانتے ہیں میرے قمر!

لڑکا - آہ تو مجھے ملزم گردانتی ہے۔ حالانکہ یہ نتیجہ ہے تیری بے اعتنائی اور لاپروائی کا کیا تو ان نظموں کو حفاظت سے نہ رکھ سکتی تھی؟ کیا میرے اعترافات الفت کی تیرے دل میں اسقدر ہی منزلت تھی کہ وہ گم ہو کر ضایع ہو جائیں!

عورت - (غور طلب لہجہ میں) میرے پیارے قمر! میں انھیں فرصت کے لمحات میں پڑھنا چاہتی تھی۔ میں نے انھیں اپنے بیگ میں رکھا تھا۔

لڑکا - بیگ سے کہاں جا سکتی ہیں، ممکن ہے کہ روپیہ نکالتے میں گر پڑی ہوں۔

عورت - میرا شبہہ تو پرویز کی بہن زہرہ پر ہے

لڑکا - زہرہ پر! وہ یہ جرأت کر سکتی ہے کہ تمہارے بیگ میں سے کچھ نکال سکے۔

عورت - تم زہرہ کو نہیں جانتے وہ صورت کی مسکین ہے لیکن نہایت کمینہ خصلت لڑکی ہے۔

لڑکا - تمہارے شک کی وجہ؟ کیوں ایک معصوم لڑکی کو متہم کرتی ہو۔

عورت - رہنے بھی دو معصوم لڑکی کو متہم کیوں کرتی ہو جانتے بھی ہو کچھ۔

لڑکا - میں نہیں جانتا لیکن میں کوئی وجہ بھی نہیں دیکھتا کہ زہرہ نے ایسی ذلیل حرکت کی ہو۔

عورت - کیا تم نے کبھی نہیں دیکھا وہ تمھیں کن نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ کیا اسے رشک نہ تھا ہماری محبت پر؟ کیا وہ نہ چاہتی تھی کہ میرے بجائے تمہاری امیدوں اور تمناؤں کا مرکز وہ ہو؟ کیا تم نے کبھی غور نہیں کیا؟

لڑکا - مجھے احساس نہیں۔ میں نے کبھی خیال نہیں کیا کہ زہرہ میرے متعلق یہ جذبات بھی پرورش کر سکتی ہے .... اگر یہ بھی ہو تو تم کس طرح کہہ سکتی ہو نظموں کا مسودہ اُس نے چرا لیا ہے۔

عورت۔ ابھی چند روز ہوئے پرویز نے اسے ایک روحانی افسانہ کا فلم دیکھنے کی دعوت دی اُس نے سینما کو مخرب اخلاق بتایا اور کہا وہ ایسی شادی شدہ عورتوں کو جانتی ہے۔ جو نوعمر لڑکوں کے ساتھ سینما جاتی ہیں اور ان کے دل میں عشق و محبت کے جذبات پیدا کرکے اپنی زلف و رخسار کی تعریف میں اشعار سننا پسند کرتی ہیں۔

لڑکا۔ تو اُس نے کبھی مجھے تیرے پاؤں میں بیٹھکر نظمیں سنانے دیکھا ہے ؟

عورت۔ دیکھا ہوگا ورنہ کیسے کہہ سکتی تھی اور وہ اس وقت مجھے استہزا آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی (لڑکا خاموش ہو جاتا ہے) خدا کے لئے قمر! کوئی تدبیر سوچو مجھے رسوائی سے بچاؤ۔

لڑکا۔ میں کیا کرسکتا ہوں ؟

عورت۔ کیا تم کوئی اور ناہید تلاش نہیں کرسکتے؟ (لڑکا تڑپ کر اُٹھتا ہے اور عورت کے مقابل کھڑا ہوکر اُسے غضبناک نگاہوں سے دیکھتا ہے)

لڑکا۔ کیا میں تیری محبت سے انکار کر دوں۔ یہ چاہتی ہے تو ؟

عورت۔ قمر دیکھو میں رسوا ہو جاؤنگی۔

لڑکا۔ آہ رسوائی کا خوف ہے اور میری محبت تیرے نزدیک کچھ نہیں۔

عورت۔ تمہاری محبت! تمہاری محبت پر میں ہر شے قربان کرسکتی ہوں لیکن رسوائی مجھے گوارا نہیں۔ میں سوسائٹی میں ذلیل ہونا نہیں چاہتی!

لڑکا۔ کیا کہا ہے تو نے کہ ذلیل ہو سوسائٹی میں! یہی کہ محبت کی ہے۔ اور سوسائٹی کی ذلت کی باعث ہی کیا ہے۔ محبت جرم ہے ؟

عورت۔ سادہ لوح لڑکے تو واقعات کی اہمیت کا اندازہ نہیں کرسکتا تو نہیں جانتا تو کس جرم کا مرتکب ہے۔

لڑکا۔ آہ! کیا تو بھی مجھے مجرم خیال کرتی ہے۔ ہاں میں مجرم ہوں۔ میں مجرم ہوں اور اپنے جرم کی سزا چاہتا ہوں ناہید لیکن تیری بارگاہ سے۔ تجھے یاد ہے الفت کے اولین ایام کی تکرار۔ میں کہتا تھا۔ تم میری محبوب ہو اور تو مصر تھی میں محبوب ہوں۔ آہ! آج تو نے بھی اعتراف کرلیا۔ تو محبوب ہوا مجھے تجھ سے عشق ہے۔ غمزۂ جانستاں سے میرا دل نخچیر ہوا پڑا ہے۔ ناز بے پناہ کا ناوک میرے جگر میں ترازو ہے اور بارگاہ حسن و عشق میں میری حیثیت ایک کشتنی اور گردن زدنی مجرم کی سی ہے۔

عورت۔ ہاں تم یقیناً مجرم ہو۔ تمھیں خیال کرنا چاہئے تم کس سے عشق کر رہے ہو۔

لڑکا۔ میں جانتا تھا! میں اپنے راہنما ستارے کو جانتا تھا!

عورت۔ (نرمی سے) پیارے قمر! تمھیں اظہار جذبات سے بیشتر انجام پر غور کرنا چاہئے تھا۔

لڑکا۔ تاکہ محبت ممنون ہوتی مصلحت کوشی کی ؟

عورت۔ تمھیں خیال کرنا چاہئے تھا۔ تم ایک شادی شدہ عورت سے محبت کر رہے ہو۔

لڑکا۔ کیا ہوگیا ہے تمھیں آج ناہید! تم میری ناہید نہیں ہو (سر پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

عورت۔ میں بدل نہیں گئی قمر! لیکن تمھیں

مجھ سے قطعاً ہمدردی نہیں۔

لڑکا۔ بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں

عورت۔ غور کرو کوئی تدبیر سوچو جس سے میں رسوائی سے بچ جاؤں اور تم پر بھی حرف نہ آئے۔

لڑکا۔ میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں مجھے جس طرح کہو میں کرنے کو تیار ہوں۔

عورت۔ مجھے بار بار یہی خیال آتا ہے، کاش تم وہ نظمیں نہ لکھتے کیا تمہارا فکر اس ذہن اس وقت کوئی تدبیر بھی نہیں سوچ سکتا؟

لڑکا۔ ہاں ایک تدبیر ہے۔ نہایت آسان اور سادہ۔ اور وہ یہ کہ جب پرویز آئے ہم اُسے واقعہ سنا دیں۔

عورت۔ نادان لڑکے تو جانتا ہے پرویز یہ سن سکیگا؟

لڑکا۔ میں نہیں جانتا لیکن اُسے سننا ہوگا۔ ہم سب کچھ اسے بتا دینگے اور میں اسے کہدونگا پرویز تم ناہید کے شریک زندگی نہیں ہو سکتے تم اسکے صوری اور روحی محاسن دیکھنے میں ناکام رہے ہو تم محبت اور التفات حسن کے اہل نہیں۔ اس لئے ناہید میرے ساتھ جاتی ہے اسے مجھ سے محبت ہے۔ میں اسے کہدونگا پرویز ہم دونوں تمہارے ممنون ہیں کہ تم ہم دونوں کے ساتھ نہایت نہایت مہربانی سے پیش آئے۔ لیکن کیا کیا جائے میں ناہید کی محبت پرور روح کو ان تصنعات پر قربان نہیں کرسکتا وہ میرے لئے پیدا ہوئی تھی اور آخر میں نے اُسے پا لیا ہے۔ ہم یہ کہینگے اور آج رات اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو جائیں گے۔

عورت۔ پرویز مجھے جانے دیگا! کیسی باتیں کرتے ہو

لڑکا۔ جانے کیوں نہ دے گا وہ تجھے محبت پر مجبور نہیں کرسکتا اُس کی حیثیت ایک مجرم کی سی ہے۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے لیکن اُس شخص کو بصارت سے یقیناً محروم کر دیا جائیگا جو اس کی حیات بخش شعاعوں سے اپنے خانۂ چشم کو روشن نہیں کرتا۔ جس شخص میں یہ صلاحیت نہیں کہ ایک گل رعنا و نازک کو دیکھکر ایک لمحہ اُس کی رنگینیوں کے لئے وقف کر دے۔ جس کا پہلو خالی ہے اس درد آشنا دل سے جو اس کی رہگذر کو فردوس شعر و خیال بنا سکے۔ اور۔۔۔۔آہ ۔۔۔۔۔ جو محروم ہے اس ذوق وارفتگی اور تپش پر ملتمس و التفات سے جس سے آنکھیں ایک اشک خون دامن میں لیکر جہاں ہیں اور دل فیض بلا انگیزی سے۔ راز دار ہیبت وجود ہو جاتا ہے اور روح محسوس کرتی ہے کہ وہ ایک ارضی مخلوق کی تمنائے مرتعش ہی نہیں ہے بلکہ ایک جزو لاینفک بن گئی ہے۔ روح کا ۔۔۔۔۔۔آہ۔۔۔۔۔۔۔۔زندگی کچھ بھی اس شخص کو نذر نہیں کرسکتی اور زندگی کے دامن میں اس شخص کے لئے حقیقتاً کچھ نہیں ہے جس کی جبین ناآشنا ہے سجدہ ہائے عبودیت سے عورت کا دل مقدس ترین معبد ہے خدائے "بہمن المتکبر القدوس" کا اس عالم آب و گل میں۔ کیونکہ وہ شاہکار ہے شبہات ازل کے نقاش کا۔ اور جب ہماری نگاہیں تھرتھراتی ہوئی پلکوں، لرزتے ہوئے ہونٹوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جھک جاتی ہیں اس بارگاہ الوہیت میں، تو فرشتے فردوس سماوی سے مسرت بے پایاں اور نکہت جاودانی کے پھول برساتے ہیں۔ اور ٹھیک اُس لمحہ پرستار کی روح "لامحدود" اور "غیر فانی" ہو جاتی ہے "محدود" اور "فانی" سے لیکن افسوس کہ

اس شخص پر جو اس معبد کو دیکھتا تو ہے لیکن اسکا دل تاریک ہے، تاریک کہ قربانگاہ کے چراغ کی شعاعیں اسے منور کرسکیں۔ اور اس شخص کا انجام!...... ناہید مجھے مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے اس تابندہ روح عظیم کے الفاظ میں جس کے پرستار "محبت" کو خدا کہتے ہیں۔ اسے ابدی تاریکی میں ڈالدیا جائیگا جہاں رونا اور دانتوں کا پسینا ہوتا ہے۔ اور یہی انجام ہے نابینا اور ظالم پرویز کا جو تیری محبت کو "گناہ" سے گناہ کو آلودہ کرنے کا مرتکب ہوا ہے۔

عورت۔ میرے نادان شاعر! یہ خواب کی باتیں ہیں ان کا اعادہ تجھے پرویز کی موجودگی میں نہیں کرنا چاہیئے۔

لڑکا۔ کیوں؟ کیوں نہ کرنا چاہیئے۔ جب میں محسوس کرتا ہوں میرے پاس ایک پیام ہے جو مجھے اس ناکارہ اور بیہودہ کار دنیا کو دینا ہے جس کے سینہ میں اب زندگی کی ایک چنگاری بھی باقی نہیں تو پھر اس کا ہر جگہ اور ہر وقت اعادہ کیوں نہ کروں۔ کیوں میں اسکا اعلان بام کلیسہ سے نہ کروں۔ میں نے مانا کہ وہ ایک راز ہے "اسرار خلیل" سے لیکن اسے "آذر نہادوں" سے "پنہاں" کیوں رکھوں؟ محض اس لئے کہ وہ روشن تر ہے "جان جبرئیل" سے اور اندیشہ ہے کہ یہ سوختنی دنیا بھڑک نہ اُٹھے؟

عورت۔ پرویز مغلوب الغضب ہے۔ تم اس کی طبیعت سے اچھی طرح آشنا نہیں۔

لڑکا۔ میں بھی اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ایک پاکیزہ اور محبت بھری روح پر میری موجودگی میں ظلم کیا جائے میں دیکھوں گا کیا کہتا ہے وہ وحشی درندہ ——— (دانت پیستا ہے اور مکے کو صوفہ کے بازو پر مارتا ہے)

عورت۔ (قمر کے نزدیک جاکر اس کے شانوں پر اپنا لمبا بازو رکھ دیتی ہے اور اسکا سر اپنے سینہ سے لگاتی ہے) خدا کے لئے قمر کوئی ہنگامہ برپا نہ کرنا ——— تم جاؤ میں یہ مصیبت خود اُٹھالوں گی۔ تم محض ایک نادان بچے ہو۔ ایک نوخیز فلسفی اور شاعر۔ بید مجنوں یا شاخ یاسمین کے سے اعضا لئے ہوئے اور پرویز ایک مضبوط توانا دیوہیکل کاروباری مرد ہے...... میں ڈرتی ہوں کہیں.......!

لڑکا۔ کہیں کیا! میرا فلسفہ ذہنی اور روحی نشوونما کے ساتھ عضوی تربیت کو بھی نظرانداز نہیں کرتا۔ اس کی بنیاد بقائے اصلح کے اصول پر ہے۔ میں لکڑی چلا سکتا ہوں۔ میں نے بڑے بڑے پہلوانوں کو نیچا دکھا دیا ہے...... اور آج کی رات پرویز کو بھی مدت تک یاد رہیگی۔

عورت۔ (لڑکے کے شانوں سے فوراً بازو اُٹھاکر اسکے سر کو اپنے سینہ پر سے ڈھکیل دیتی ہے) خدا کی پناہ! اسقدر بھیانک ارادے تم رکھتے ہو اپنے دل میں..... میں نے تم سے محبت کی ہے؟

لڑکا۔ (حیران ہو کر دیکھتا ہے) یعنی! میں قاصر ہوں تیرا مفہوم سمجھنے سے!

عورت۔ آپ معاف رکھنا مسٹر جعفری! اس اس قابل نہیں کہ کوئی خاتون آپ کے متعلق دل میں

لطیف جذبات کو جگہ دے!

لڑکا۔ (چہرہ پر درد و کرب کے آثار لئے ہوئے اور ہونٹ کو دانت سے کاٹتے ہوئے) میں اسقدر ذلیل ہوں آج تیری نگاہوں میں ناہید ——— کیا میں تیرا قمر نہیں؟!

عورت۔ نہیں ——— میں کتنی ہوں نہیں۔ میں آپ کو ایک فلسفی اور شاعر خیال کرتی تھی شاخ گل کا سا ایک پیارا بچہ اور میں نے آپ سے محبت کی اپنے دل میں جگہ دی۔ لیکن اب جب آپ نے شاعر کے رنگین اور دلآویز ملبوس کو اتار کر ایک طرف پھینکدیا ہے اور ایک وحشی درندے کی طرح حریف کو میدان میں للکارنا چاہا ہے۔ تو بہت اچھا کیا معلوم ہوگیا مجھے کہ آپ بے ضرر دوست نہیں ہیں، اور اس "پیام الفت" کی حقیقت کیا ہے جو آپ دنیا کو دینا چاہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ بہت اچھا کیا!

لڑکا۔ میری ناہید۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (چکرا کر صوفہ پر گرتا ہے) ——— میری ناہید خدا کے لئے! تو نے، تیری محبت نے مجھے آسمان تک پہنچایا۔ میں اس بلندی پر سے دنیا کو دیکھکر ہنستا تھا اب مجھے خاک پر نہ گرا۔ ناہید میری محبت کے قصر ہائے رنگین کو مسمار نہ کر۔ خدا کے لئے اگر محبت فریب ہے تو مجھے اس فریب ہی میں مبتلا رہنے دے۔

عورت۔ مسٹر جعفری آپ اس امر کو نظر انداز نہ فرمائیں کہ آپ ایک کتخدا خاتون سے ہمکلام ہیں اس لئے میں ممنون ہونگی اگر آپ مجھے مسز پرویز کے نام سے مخاطب فرمائیں۔

لڑکا۔ آہ! ——— تصنعات اور تکلفات! میں نے ایک خواب دیکھا۔ دلفریب و کیف انگیز۔ میں نے دیکھا۔ ہم دونوں نے کیوپڈ اور سائیکی کا روپ بدلا (پھر تصویر کو دیکھکر) ہم محبت کے بازوؤں پر اولمپیا کی رفعتوں پر پرواز کر گئے میں اور تو "فدائے عشق" اور "الٰہتہ الجمال" تھیں ناہید۔ لیکن اب وہ بلندی کہاں! میں اپنے تئیں تحت الثریٰ میں پاتا ہوں اسقدر عظیم ہبوط ہے میرا اور اب میں وہ قمر نہیں جو ایک وقت "نامعلوم" سے روشنی کی ایک کرن کی طرح آیا تھا۔

عورت۔ یقیناً وہ قمر ہیں۔ وہ قمر تو ایک فرشتہ تھا معصومیت اور نیکی کا۔ اسمیں یہ بربریت کہاں تھی۔

لڑکا۔ وہ قمر نہیں لیکن وہ ناہید بھی تو نہیں میں تو اس ناہید کا ماتم کرتا ہوں۔ اس ناہید نے مجھے چھوڑ دیا ہے ——— آوارہ اور سرگرداں ——— اور میں پھر وہی پیکر بے جان ہوں ——— مسز پرویز!

عورت۔ (خندۂ زیر لب کے ساتھ) شکریہ! آپکی ممنون ہوں! آپ نے مجھے اس نام سے مخاطب کیا۔

لڑکا۔ شکریہ! لیکن میں اس تذلیل و محرومی کا سزاوار نہ تھا۔

عورت۔ مجھے افسوس ہے ..... لیکن اب آپ ایک شریف مرد کی حیثیت سے میری ہمدردی ———

(باہر سے کسی کے زینوں پر چڑھنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

عورت۔ مسٹر پرویز آرہے ہیں آپ سنبھل کر بیٹھ جائیں۔ میں پیانوں پر آجاتی ہوں۔ فرمائیے کون سی تان بلند کروں۔ ان پھولوں کو ایک طرف ہٹا دیجئے۔ اٹھئے۔ خدا کے لئے میری رسوائی کا خیال کیجئے۔

(لڑکا اٹھتا ہے۔ لیکن اب اس کے ہاتھ پاؤں میں

سکت نہیں ہے میز پر سے گل بنفشہ کے بٹن کو ایک جانب
رکھ دیتا ہے اور خود ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ کوٹ
کے شکن درست کرتا ہے پھر اٹھ کر آئینہ میں نکٹائی کی
گرہ دیکھتا ہے۔ بکھرے ہوئے پریشان بالوں کو ہاتھ سے
ایک جانب کرتا ہے اور پھر آہ بھر کر کرسی پر بیٹھ جاتا
ہے۔ ناہید پیانو کے مقابل بیٹھ کر ایک ہلکا سر بلند کرتی
ہے۔ لوہے کے زینہ پر چڑھنے کی آواز نزدیک آتی جاتی
ہے۔ ناہید گنگناتی ہے اور دروازہ کھلتا ہے ایک جسیم و
تسحیم شخص اندر داخل ہوتا ہے اس کی چالیس سے
متجاوز ہوگی ایک ڈھیلی پتلون اور اونچا کوٹ پہنے
ہوئے ہے۔ ایک ہاتھ میں چھڑی ہے دوسرے میں
کاروباری آدمیوں کا سا ایک بیگ۔ توند کچھ بڑھی
ہوئی آنکھیں کرنجی چہرے کے نقش و نگار بھدے سے
انداز سے سست اور کاہل الوجود لیکن نگاہوں سے
حرص و آز اور عیاری جھانکتی ہے۔ سر پر سیاہ رنگ
کی وہ ٹوپی ہے جسے "بابو کیپ" کہا جا سکتا ہے۔ عورت
اسے دیکھکر پیانو پر ایک بار زور سے انگلیاں مارتی
ہے اور چھوڑ دیتی ہے)

نو وارد (چہرہ پر تفکر و مسکراہٹ لئے ہوئے) آہا
مسٹر جعفری۔ میں تو خیال کر رہا تھا آپ مسز پرویز کو
ایکسلیٹر میں لے گئے ہونگے۔ "ژان جان" دکھایا جا رہا ہے
آج شب۔ آپ کا جوش و غضب دوبالا ہو جاتا اہل دنیا
کے خلاف۔

(قمر مسکراتا ہے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن ہونٹ تھرتھرا
کر رہ جاتے ہیں۔ پرویز اپنے بیگ کو اور چھڑی کو میز پر
رکھ دیتا ہے)

عورت۔ ہاں ہمارا ارادہ تھا لیکن ہم نے اپنا
خیال بدل دیا۔ آج ہم تیرے لئے نہیں گئے طبیعت پژمردہ
سی ہے کچھ۔ تم دوپہر کے کھانے پر کھانے پر کیوں نہیں آئے آج۔

پرویز۔ مجھے زہرہ نے ایک ضروری کام کے لئے
بلایا تھا میں نے کھانا بھی وہیں کھایا۔

عورت۔ آہ بیچاری زہرہ کسقدر مصروف رہتی
ہے اور اسے تمہارا کسقدر خیال رہتا ہے تمہاری بہتری
کے لئے کسی امر کے لئے بلایا ہوگا؟

پرویز۔ ہاں میری اور تمہاری بہتری کے لئے
(ناہید مستفسرانہ نگاہوں سے نیری طرف دیکھتی
ہے) آپ دوسرے "شو" میں بھی نہیں جا رہے ہیں کیوں! تو
مسٹر جعفری مجھے آپ سے ایک ضروری امر پر گفتگو کرنا ہے
آئیے آپ میرے کمرے میں آجائیے ہم مسز پرویز کو تکلیف
نہیں دینگے۔

عورت۔ نہیں میرے جواہرات کھلے پڑے ہیں
میں انھیں جا کر بند کرتی ہوں آپ یہیں گفتگو کر لیجئے۔
مسٹر جعفری آپ کافی کی ایک پیالی ناپسند تو نہیں
کرینگے اور تم ——

لڑکا۔ شکریہ! میں محسوس نہیں کرتا کہ میں
اسے اسوقت پسند کرونگا۔

(عورت میز پر سے اپنا سامان دستانے، سمور اور
گل بنفشہ کا بٹن اٹھاتی ہے اور جس دروازہ سے آئی
تھی چلی جاتی ہے۔ پرویز ایک کرسی کھینچ کر قمر کے سامنے
بیٹھ جاتا ہے بیگ میں سے ایک مسودہ نکال کر اس

انداز میں پڑھتا ہے گویا وہ قمر کو دکھانا چاہتا ہے۔ لیکن
قمر بے اعتنائی کے ساتھ بیٹھا رہتا ہے اور مسودہ کی جانب
نہیں دیکھتا۔ اپنے انداز سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ پرویز
کے ذاتی کاغذات کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ آخر پرویز ہی
تنگ آکر سلسلہ گفتگو شروع کرتا ہے)

پرویز۔ یہ مسودہ آپ کا ہے مسٹر جعفری!

لڑکا۔ دیکھوں تو!

(پرویز غیر مہذب انداز میں قمر کے سامنے پھینک دیتا ہے)

لڑکا۔ (مسودہ کو اُٹھا کر حجاب و تعجب آمیز مسرت
کے ساتھ) یہ تو میری نظمیں ہیں دیکھا۔ میں تو پہلے ہی
کہتا تھا مسز پرویز یہ نظمیں آپ کو دکھا دیں گی۔ لیکن انھوں
نے وعدہ کیا تھا کہ آپکو نہیں دکھائینگی۔ یہ میری ابتدائی
نظمیں ہیں مسٹر پرویز۔

پرویز۔ نظمیں آپ کی ہی ہیں!

لڑکا۔ میں نے نظامی گنجوی اور ورجل کی تصنیفات
کے مطالعہ کے بعد لکھی تھیں کوشش یہ تھی کہ دونوں کے
انداز بیان کے بین بین ایک شگفتہ طرز ادا میں مطالب
کا اظہار کیا جائے۔ یونانی شعرا نے قصائد میں اپنے
علم الاصنام کے خداوندوں کو مخاطب کیا ہے۔ میں نے
ان نظموں میں رقاصۂ فلک ناہید کو مرکزی شخصیت
دی ہے۔

پرویز۔ ان نظموں میں کسی زندہ عورت سے
اظہار تعشق نہیں کیا گیا۔

لڑکا۔ (کچھ شرماکر) نہیں جب مسز پرویز نے
مجھے بتایا کہ ان کا ایام دوشیزگی کا نام بھی ناہید تھا
تو میں نے اُن سے ان نظموں کا تذکرہ کیا۔ اور کہا انکا
پڑھنا شاید مسٹر پرویز کے لئے باعث تفریح ہو ——
لیکن مسز پرویز نے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ نظمیں کسی کو
نہ دکھائینگی میرا خیال ہے فن کے لحاظ سے اُن میں کچھ
فروگذاشتیں ہیں جن کی اصلاح میں نے اس خیال
سے نہیں کی کہ یہ طلوع شباب سے پیشتر کی یادگار رہینگی
—— آپ جانتے ہیں اب میں ان سے بہتر لکھ
سکتا ہوں۔

پرویز۔ (غضبناک ہوکر) آپ ان سے بہتر
نہیں لکھ سکتے۔

لڑکا۔ (کچھ سراسیم ہوکر) کیوں آپ۔۔۔۔۔

پرویز۔ ان نظموں میں جنسی جذبات اپنے تمامتر
بلا انگیزی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ایک طوفان ہے
لطافت و سرگشتگی کا کہ امڈا چلا آتا ہے۔ شاعر کے بربط
روح کا ایک ایک تار لرزاں ہے یہ نغمہ دل کی گہرائیوں
سے نکلا ہے۔ ایک عمیق تفکر اور کیفیت انگیز موسیقی لئے
ہوئے شاعر کو اولین جذبۂ عشق کا احساس ہوا ہے
اور اُس نے معصومیت و پاکیزگی کے ساتھ اس کو نذر
قرطاس کر دیا ہے۔ جذبات و خیالات اُمنڈ کر نوک
خامہ پر آگئے ہیں۔ اور ایک بحر بے کراں کی طرح بہے چلے
جاتے ہیں۔ ان میں مدہوشانہ جذبات کا احساس، سوز
دروں کی تلخی، سب کچھ ہے۔ سرور ہے آہ ہے نالہ ہے
فغاں ہے!

لڑکا۔ (لبوں پر مردہ سی مسکراہٹ لئے ہوئے
شکستہ الفاظ میں) آپکا خیال ہے مسٹر پرویز۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔ محض

دو زندہ جاوید شعرا کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔

پرویز۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان میں میری بیوی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

(لڑکے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ دل زور زور سے دھڑکتا ہے)

پرویز۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان میں میری بیوی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

لڑکا۔ نہیں! یہ صحیح نہیں!

پرویز۔ اپنی تفکر انگیزی، قادر الکلامی آسمان پیما تخیل کو کیوں معتوب کرتے ہو؟ ان جذبات حسیات کی تخلیق انسانی دل میں کوئی فرضی دیوی نہیں کر سکتی میرے پاس کافی وجوہ یہ تسلیم کر لینے کے لئے موجود ہیں کہ ان کا مخاطب تمہاری طرح گوشت و پوست کی ایک مخلوق ہے جس کے دل میں بھی وہی جذبات الفت موجزن ہیں جن کا اظہار تم نے کیا ہے ورنہ تمہارے گیت تمام کے تمام بے معنی اور لغو ٹھہرتے ہیں جس کو تسلیم کرنے کے لئے میں تیار نہیں۔

لڑکا۔ میں احتجاج کرتا ہوں...... مسٹر پرویز ان جذبات کی خالق نہیں۔ ایک نادرہ کار آرٹسٹ کا کمال یہی ہے کہ وہ جذبات کو اس طرح پر خامہ کرے گویا وہ تمام تر اس پر طاری و ساری ہیں ——— مسٹر ——— مسٹر پرویز ان نظموں کی مرکزی شخصیت نہیں ہو سکتیں۔

پرویز۔ کیوں؟ وہ حسین نہیں ہے؟

لڑکا۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو اس روشنی میں نہیں دیکھا...... مسٹر پرویز آپ کو خیال کرنا چاہئے آپ اس نیکدل خاتون کے متعلق کس جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

پرویز (غضبناک ہو کر کرسی پر سے اٹھتا ہے اور پیانو کے پاس کھڑا ہوتا ہے) میں نہیں جانتا میں نے کہدیا ہے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں ناہید ان نظموں کی مرکزی شخصیت کیوں نہیں ہو سکتی!

لڑکا۔ (سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے) کیونکہ انھیں دیکھکر میرے دل میں کبھی فریفتگی کے جذبات پیدا نہیں ہوئے .... میں اس قسم کی بیہودہ گفتگو کے لئے تیار نہیں مسٹر پرویز۔

پرویز۔ (برآفروختہ ہو کر) اچھا تیرے دل میں کبھی فریفتگی کے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ ناہید کو دیکھکر ناہید کا حسن و جمال، اس کی حیا آمیز تمکنت تیرے دل کو تسخیر نہیں بنا سکتی۔ تو ہے کون؟

لڑکا۔ ہاں میں اس کی سراپا حسن و تمکنت کا اسیر نہیں ہو سکا۔ تمھیں معلوم ہونا چاہئے ہماری دوستی ان جذبات سے بلند تر اور ان حسیات سے منزہ ہے۔

پرویز۔ اس نے تیرے دل میں عشق کے بلا انگیز جذبات کی تخلیق نہیں کی تجھے ناہید سے محبت نہیں وہ تیری تمنا کا مرکز نہیں!

لڑکا۔ نہیں وہ میری آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز نہیں ہو سکتیں۔

پرویز۔ ذلیل کتے تو میرے سامنے ناہید کی توہین کرتا ہے۔

لڑکا۔ (گھبرا کر) اگر تم میری توہین کرنا چاہتے ہو تو تمھیں پشیمان ہونا پڑیگا۔

پرویز - حقیر و نابکار! تو ہے کون جس کے دل کے ناہید کی سحرکار نگاہیں تسخیر نہ کرسکیں - سمجھا کیا ہے تو اپنے آپ کو (قمر کی جانب بڑھتا ہے اور بالکل اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے قمر کا سر اُسکی ٹھوڑی کے قریب آتا ہے) پھر کہہ کیا کہتا ہے - ناہید تیری آرزوں اور تمناؤں کا مرکز نہیں ہوسکتی - بڑا دل لیکر آیا ہے کہیں سے! ان کی دوستی بلند تر ہے جذبات عشق سے یہ فرشتہ کھڑا ہے میرے سامنے' جذبات وحسیات سے معرا ناہید کا حسن و جمال' اس کی تمکنت' حیا آمیز اور پُر وقار تمکنت' جس نے کہیں بھی صید نہیں چھوڑا - جس کی نگاہوں کے ساتھ کیوپڈ اڑتا ہوا جاتا ہے - وہ بے پناہ نگاہیں اس کے دل میں فریفتگی کے جذبات کو تخلیق نہ کرسکیں -

[پرویز ایک ایک قدم آگے بڑھتا ہے' قمر پیچھے ہٹتا جاتا ہے یہانتک کہ اس کی پشت دیوار سے لگ جاتی ہے وہ مُکا تانکر قمر کو رسید کرتا ہے]

پرویز - ایک مرتبہ گدھا' دو' تین لے' اور لے گا!

(قمر بھی مکے مارتا ہے جتنے مکے میں پرویز ایک لگاتا ہے وہ دو رسید کر دیتا ہے اس دوران میں قمر کو کمرہ کے درمیان کی میز سے ٹھوکر لگتی ہے - پرویز دوڑکر اُسے دبانا چاہتا ہے لیکن جلدی میں سنگار میز کا کونہ اُس کی ران پر زور سے لگتا ہے اور وہ آہ کرکے بیٹھ جاتا ہے -
دروازہ کھلتا ہے اور ناہید پریشان بالوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

عورت - بچ جانا پرویز یہ لاٹھی چلا سکتا ہے - چھوڑو خدا کے لئے کیا ہوگیا ہے تمھیں تم تو حیوان سے بدتر نہیں -

(قمر اُٹھتا ہے اور پھر پرویز پر جھپٹنا چاہتا ہے ادھر سے پرویز اُٹھکر آتا ہے - ناہید دونوں کے بیچ میں آجاتی ہے اور قمر کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

(مسٹر جعفری شرم نہیں آتی ایک خاتون کی موجودگی میں دست وگریباں ہوتے ہو -

لڑکا - اور وہ دیکھو پرویز نے اب چھڑی اٹھائی ہے مجھے مجبوراً مدافعت کرنی پڑتی ہے - میں اس شخص پر ہاتھ اُٹھانا نہیں چاہتا جس کا نام آپ نے اختیار کر رکھا ہے -

عورت - پیارے پرویز! رکھ چھڑی ایک جانب ---- آہ ---- میرے خدا ---- تم دونوں نے ایسا شرمناک منظر پیش کیا ہے (پرویز کو ایک کرسی پر بٹھاتی ہے اور قمر کا بازو اپنے بازو میں لیکر دوسری پر لیجاتی ہے)

لڑکا - میرے شانے میں شدید درد ہو رہا ہے

عورت - (شانے کو پیار سے تھپکتی ہے) ناداں شاعر کسقدر شریر لڑکے ہو تم! اُٹھو پرویز سے صلح کرو -

لڑکا - میں تو صلح کے لئے تیار ہوں - وہی گھور رہا ہے ابھی تک -

عورت - مسکرا کر ---- پرویز آؤ مسٹر جعفری سے مصافحہ کرو -

(پرویز اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے اور قمر کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھتا ہے)

لڑکا (اچانک جذبہ سے جوش میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے) پرویز تو پاجی ہے - ---- پاجی اور گدھا -

(پرویز بھی اُٹھتا ہے)

میں کہتا ہوں گدھا۔ مجھے ناہید سے محبت ہے۔ میں اسے اپنے تمام تر دل کے ساتھ چاہتا ہوں وہ میری آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہے!

(پرویز پھر بیٹھ جاتا ہے) چہرہ سے اطمینان ظاہر ہوتا ہے۔ سنتے ہو وہ میری آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہے ہم دل وجان سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ یہ نظمیں ——— یہ نذر عقیدت ہیں میری "محبت" کی بارگاہ میں۔ میں جانتا ہوں یہ اسکے شایان شان نہیں۔ لیکن جو کچھ میرے سینہ میں ہے سرود ہے یا درد وکرب کی آواز خندہ بالا ہے یا نالہ، جانگاہ میں نے اس کے پاؤں پر نچھاور کر دیا سن لیا تم نے۔ ہم نے ارادہ کیا تھا آج شام جب تم آؤ گے ہم دونوں ہمیشہ کے لئے چلے جائیں گے۔ تم اس قابل نہیں کہ ناہید کی سی خاتون تمہاری بیوی کہلائے۔

پرویز (اُٹھکر پرویز کے پاس جاتا ہے) مجھے آج رات کے واقعہ پر افسوس ہے میں جسقدر چاہتا ہوں مسٹر جعفری معاف کر دو مجھے لیکن اس کی ذمہ داری مجھ پر عاید نہیں ہوتی یہ تم بھی کہو گے میں خوش ہوں تم نے اعتراف کر لیا۔ مجھے ناہید کے جانستان حسن وجمال اور بے پناہ نگاہوں پر اعتماد ہے اور میں جانتا ہوں کوئی شخص اُن کی زد میں آکر دل دئے بغیر واپس نہیں جاسکتا رہا ناہید کا تمہارے ساتھ جانا ......یہ ناہید ہی سے پوچھ لو۔

(قمر سر جھکا کر اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کا رنگ زرد ہوتا ہے ہونٹ خشک اور سانس اکھڑی اکھڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کرسی پر سے اُٹھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے روشنی سے اس کی نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں۔ لڑکھڑاتا ہوا میز کے پاس پہنچ کر اُسپر سے اپنی ہیٹ اُٹھاتا ہے اور باہر جانا چاہتا ہے۔ پھر مڑتا ہے۔ ناہید کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اسکے روبرو گھٹنے ٹیک کر ہاتھ چومتا ہے۔ ہاتھ پر آنسو کے دو قطرے گرتے ہیں)

لڑکا۔ الوداع! ناہید الوداع موت اور زندگی کے لئے الوداع!

[مڑکر جاتا اور دروازہ کھولتا ہے]

پرویز۔ مسٹر جعفری میری ایک درخواست ہو۔ میں اِن نظموں کو کتاب کی صورت میں چھپوانا چاہتا ہوں تم اسے ناہید کے نام سے معنون کرنے کی اجازت دیتے ہو۔ کتاب کی ظاہری آرائش کی طرف سے اطمینان رکھو۔

لڑکا۔ (مڑکر دیکھے بغیر) بدل وجان۔

عورت۔ اور اُس کا نام کیا ہوگا ——— پیارے قمر!

لڑکا۔ "شکست کی آواز"

(لڑکھڑاتا ہوا چلا جاتا ہے)

(خاص)

ریاض الاخبار

بیل کی سرگزشت

(حضرت ریاضؔ خیرآبادی سابق ایڈیٹر "ریاض الاخبار")

بیل بنکر کس مصیبت میں پھنسے ہم ناتواں ✽ سرگزشت اپنی بیاں کس سے کریں ہم جاں نثار
دودھ میں مل کے ہوئے ہم قوم کی بھائی شریک ✽ بھائی بنکر بھی نہ یہ سمجھے کہ میں ہوں شیرخوار
رکھ کے بھوکا ہم کو اپنا پیٹ سب بھرتے رہے ✽ کہہ کے ماتا دھو کے دیتے تھے اُسے بھی بار بار
اسکو آتی تھی محبت منہ ہمارا دیکھ کر ✽ چاٹتی تھی پیار سے کسطرح وہ الفت شعار
دودھ اترے ماں کا وہ منہ ہم نے مارے ہیں لئے ✽ ورنہ یہ منہ تھا ہمارا دودھ کرتے زہر مار
ہم بندھے رہتے تھے تھن کے پاس ماں کے پاؤں سے ✽ منہ کے بدلے ہاں کھلی رہتی تھی چشم انتظار
دور تھا منہ سے ہمارے تھن بھی ظرفِ شیر بھی ✽ اور ظرفِ شیر سے باہر نہ جاتی کوئی دھار
ساتھ مل کے جب چلے منہ پر چڑھی جاتی فروہ ✽ اب ترس آتا ہے کس کو لاکھ ہم ہوں بیقرار
آنکھ پر سب کے چڑھے جب کچھ نکالی ہاتھ پاؤں ✽ سینگ بھی آنے نہ پائی ہو گئی نظروں میں خار
نوجوانی رنگ بھی لائی تو کس آفت کا رنگ ✽ کیا کہیں اپنی خزاں ہم کیا کہیں اپنی بہار
ایک آفت جوتنے کو ہل میں ہم جوتے گئے ✽ ہر طرف ہل چل گئے کیا ہو گئے وہ سبزہ زار
کھینچنا وہ ہل جو چلتے ہوں زمیں کو پھاڑ کر ✽ گو زمیں پتھر سے بھی ہو سخت ایسے لوک دار
ایک حالت پر گذر جانے لگے دو دو پہر ✽ ماں کے تھن کا دودھ آیا ہو تو ٹھہرے فرو فشار
آ گیا بھاری جوا گاڑی کا گردن پر کبھی ✽ ہم نے گو میدان جیتے پھر بھی سمجھے اپنی ہار
ہم نے کیسے کیسے چھکڑے کھینچے دلدل کے پھنسے ✽ بوجھ ہم نے یوں اٹھایا جیسے عصیاں کا بار
کھانے پینے کا نہ کوئی وقت تھا آرام کا ✽ ٹھوکریں کھا کھا کے گرنا اور چلنا بار بار
موسم گرما میں جان کی دھوپ کیسی سخت و تیز ✽ موسم سرما میں شب کی اوس کیسی ناگوار
ہم اگر جھک کر کبھی بیٹھے تو منہ چلتا رہا ✽ تھا ہماری زندگانی پر جگالی کا مدار
خون سوکھے دیکھکر کھانے کو ایسی خشک گھاس ✽ جس کو پی کر خون پانی ہو وہ آب ناگوار
جیتے جی گویا بھرا جاتا تھا بھوسا کھال میں ✽ سوکھے ڈنٹھل بھوک کی شدت میں کرنا زہر مار
پگھلے چربی جس سے کولھو میں کھلی اُس تیل کی ✽ وہ بھی قسمت سے مہینے میں کبھی دو چار بار
دانہ بن جائیں تو بن جائیں بدن کی پھنسیاں ✽ اس کا بدلہ بھی بھگتنا ہم کو تا روز شمار
آندھی آ جائے پانی برسے ہمکو چلنا رات دن ✽ ساتھ دے تو اس طرح دے گردشِ لیل و نہار
ہائے وہ سوجے ہوئے پھوڑے ہوئے کاندھوں کا زخم ✽ بوجھ بھاری سخت منزل اونچی نیچی رہگزار
بے سکت پالنگ لاغر ناتوان زار و نحیف ✽ بھوک پیاس سے زخم خوردہ سینہ ریش و دل فگار
رفتہ رفتہ دے دیا طاقت نے بھی بالکل جواب ✽ بیٹھکر اٹھنا ہوا مشکل ہمیں انجام کار
جان بچنے کے ذریعے جس قدر تھے سب مٹے ✽ رحم کے قابل نہیں ہے یہ بھی ہمارا حال زار
باندھ کر بیچ ہے کھلائے کون بوڑھے بیل کو ✽ کون پالے ہمکو اس حالت میں اے پروردگار
وقت نازک عمر آخر جان دوبھر، حال غیر ✽ سر پر اب قصاب پہنچے لے کے چھریاں اور کٹار
بات کہتے کر دئے ہر عضو کے ٹکڑے جدا ✽ قیمہ قیمہ کر دیا بیدردیوں سے جسم زار
ریشے ریشے پر ہمارے دانت تھا ہر ایک کا ✽ آدمی کیا چیل کوے ٹوٹے ہم پر بیشمار
حصے بخرے ہو گئے کچھ بٹ گیا کچھ لٹ گیا ✽ گوشت اپنا تکے بوٹی ہو گیا انجام کار
کھال باقی رہ گئی تھی اسکے نقارے منڈھے ✽ شامت اعمال سے پڑتی ہے اب اس پر بھی مار
ایک ناکردہ گنہ کا حال یہ ہے اے ریاضؔ ✽ وہ بھی اک بے عقل بے بس بے زباں بے اختیار

دیکھئے ہوتا ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا حشر
دیکھئے پاتے ہیں کیا پاداش ہم سے زشت کار

(خاص)

زوالوجیکل میگزین

انسانی اخلاق کا ارتقاء

(جناب محمد افضال حسین قادری بی ایس سی ایڈیٹر زوالوجیکل میگزین علی گڑھ)

انسان اپنی جبلت کو رو سے ترقی نہ کرنے کا عادی نہیں۔ وہ اتنا بد اخلاق نہیں جتنا کہ وہ اخلاق سے لاعلم ہے۔ کیونکہ جہاں سوسائٹی نہیں وہاں جرائم بھی نہیں ہوتے لہٰذا اچھائی اور برائی کا انحصار انسان کے ساتھیوں کے تعلقات پر ہے۔ اخلاق یا مارل کا خیال اور نیک نیتی انسان کے سوشل ہونے کا نتیجہ ہیں اجتماعی مفاد کا اقتضا یہ ہے کہ وہ کام برائی پر جائے جس سے سب کا نقصان ہو اور اس کو اچھا اور قابل تعریف کیا جائے جو سب کو فائدہ پہونچائے۔ اسی تعریف اور خدمت کے اعتبار سے قوانین اخلاق مرتب ہوئے ہیں۔ سوسائٹی کو ہر فرد کی طرح (جس سے کہ وہ مرکب ہوتی ہے) اپنی زندگی کے لئے لڑنا اور جھگڑنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کے سب ابتدائی قوانین اس کے بقا اور تحفظ کے لئے ہی بنائے جاتے ہیں۔ ایک فرقہ یا جتھے کی حفاظت اور بقا کا انحصار اس کے افراد کی باہمی ہمدردی اور محبت پر ہوتا ہے اور یہی اخلاق کی بنیاد ہے۔ جو چیز اس کو فائدہ پہونچائے اچھی ہے اور جو نقصان دہ ہو وہ بری۔

اگرچہ یک جہتی سے انسان پر کچھ بندشیں اور رکاوٹیں عائد ہو جاتی ہیں۔ یعنی ایک شخص اپنی ہر خواہش کو پورا نہیں کر سکتا (انسان نے اپنے ذاتی حقوق کی اہمیت کا خیال اپنی سوسائٹی کے حقوق کی اہمیت سے حاصل کیا) مگر سوسائٹی جب ہی قائم رہ سکتی ہے۔ جبتک انسان اپنے ساتھیوں کے ساتھ سچا رہے۔ انسانی ارتقاء DESCENT OF MAN میں ڈارون اخلاق کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ کس طرح سے انسان کی فطری ہمدردی اس کو اپنے ساتھیوں کی عزت کرنے کی طرف لیجاتی ہے اور کس طرح اس کے کام ان کی خواہشوں سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ اگرچہ انسان کی بہیمی اسفل عادتیں مثلاً بھوک۔ سستی اور جذبۂ انتقام کافی زوردار ہوتی ہیں مگر اتنی دیرپا اور اطمینان دہ نہیں ہوتیں جتنی اس کی اعلیٰ جبلتیں جو اس کو سوشل اور ہمدرد بناتی ہیں۔ بری خواہشوں سے دب جانا اگرچہ وقتی مسرت بہم پہونچاتا ہے مگر اس کے بعد انسان اس کمزوری پر افسوس کرتا ہے اور آئندہ کو اس کے خلاف کام کرنے کا تہیہ کرنے لگتا ہے۔ آخرکار انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے لئے دیرپا حسیات کی متابعت ضروری ہے۔ انسان کی یہ خولعینی جرم یا برائی پر پشیمان ہونا جو کہ اس کے کردار اور افعال پر خیال کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ جانوروں کا اخلاق صرف اس حد تک ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو عمل میں لائیں یا اس سے پرہیز کریں جو انھیں خود کو پرلطف یا تکلیف دہ یاد رہے۔

فرقہ یا جتھے میں اصلی قدر اس بہادری یا ایثار کی کی جاتی ہے جس سے سب کو فائدہ ہو۔ عزت اور تعریف اس کام کرنے والے کا انعام ہے جس سے افراد کے دلوں میں اپنی جماعتوں کی محبت پیدا ہوتی ہے اس طرح سے ملکی محبت کا بیج دلوں میں بویا جاتا ہے۔ کیونکہ جو شخص اپنے شہر کے ساتھ اچھا نہیں اپنے ملک کا ہمدرد نہیں ہو سکتا اور

جو وطن پرست نہیں وہ مخلوق انسانی کا خیر خواہ نہیں۔ یہ تخیلات جن سے یہ وسیع ظرف پیدا ہو بہت آہستہ آہستہ رونما ہوتے ہیں کیونکہ ایک بڑے زمانے تک اچھائی اور برائی صرف وہی چیز رہی جو اپنے جتے یا فرقہ کو فائدہ اور نقصان پہونچائے۔ یہاں تک کہ وہی کام کہ جو اگر اپنی جماعت میں کیا جاتا تو جرم خیال ہوتا اگر جماعت سے باہر عمل میں لایا جاتا تھا تو اچھائی شمار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ قیصر کا یہ مشہور مقولہ جو اس نے قدیم جرمنوں سے کہا تھا کہ چوری یا ڈکیتی جو اپنے ملک سے باہر کی جائے باعث ذلت نہیں بلکہ ایک لحاظ سے قابل تعریف ہے کیونکہ اس سے ملک کے نوجوانوں میں امنگ پیدا ہوتی ہے اور کاہلی اور سستی کم ہوتی ہے اب تک بہت سی خونخوار وحشی قوموں ہی میں رائج نہیں بلکہ کچھ نہ کچھ متعصب مہذب قوموں میں بھی نمایاں ہے۔

اخلاق کا کوئی مقرر معیار نہیں جس سے کہ ہر زمانے کے اچھے اور برے کاموں کی جانچ کی جائے۔ اخلاق کا قانون انسانی نسل کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ اور انسانی ضمیر روز بروز روشن تر ہوتی جاتی ہے۔ باوجودیکہ قدیمی روایات اس قدر مقدس اور پاک قرار دی جایا کرتی ہیں اور نئی تبدیلی کا خیال نہایت برا سمجھا جاتا ہے (مثلاً بعض اشیا موزونی کا امتناع بعض دنوں کا احترام ذات پات کی پابندیاں)، مگر سوسائٹی اپنی ابتدائی زمانے کی چیزوں کو رفتہ رفتہ ترک کر دیتی ہے۔

ابتدائی زمانے میں جرائم کی سزائیں ظلم اور خونخواری کی حد تک پہونچ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ یورپ میں جعلی سکہ بنانے والوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ لندن میں لاکھوں قیدی روزانہ نظر آتے تھے اور ہزاروں حبشی آئے دن نیلام ہوا کرتے تھے بہت عرصہ تک ان سزاؤں کو لوگ جائز سمجھتے رہے۔ مگر ان کا سد باب ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا جو انسان کے حقوق میں وسیع النظری کو کام میں لاتے تھے اور جن کی وجہ سے نرم اور شریفانہ گفتگو پھیلی۔ مہذب طرز گفتگو کے پھیلانے میں سائنس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی نام صرف قدرتی لحاظ سے ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ انسانی زندگی کے مختلف اغراض اور کل انسانی مخلوق کے ارتباط کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ وسیع النظری انسانی ہمدردی کا حلقہ بڑھاتی ہے اور انسان کو نہ صرف بنی نوع انسان کی خدمت پر مجبور کرتی ہے بلکہ کمتر درجہ کے جانوروں کی محبت بھی اس کے دل میں پیدا کرتی ہے اگر چہ وہ برے کام جو خود غرض انسان علم کو غلط طور پر استعمال کر کے عمل میں لاتا ہے بیحد خوفناک ہوتے ہیں۔ لیکن ان فائدوں کے مقابلے میں جو دنیا کو علم سے پہونچتا ہے وہ برابر بھی نہیں۔ کسی قوم یا فرقہ کا طرز عمل خود غرضانہ یا وحشیانہ ہمیشہ تک نہیں رہ سکتا۔ بلکہ آخر میں وہ دنیا کے پسند کے موافق ہو جاتا ہے سائنس نے ہر کام کا سبب اور اس کا لازمی نتیجہ بتا کر بہت سی اخلاقی برائیوں کا علاج بتا دیا علاوہ بریں وہ کام جو جرم کہلاتا ہے۔ اکثر انسانی چیزوں کی صحیح نسبت نہ جاننے کی وجہ سے کر بیٹھتا ہے۔ یا کبھی کبھی اس میں تخیلات IMAGINATION نہ ہونے کی وجہ سے ہو جاتا ہے "برے کاموں کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔ برے کاموں کی وجہ تخیل کی کمی اور جذبات کی کمزوری ہے" ـــــ ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ دنیا پر حکومت کرنا یا اس میں انقلاب برپا کرنا ان جذبات کا کام ہے جن کی رہبری تخیل کیا کرتا ہے۔

چونکہ اخلاق انسان کے معقول ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ لہذا اعلیٰ ترین اخلاق ان لوگوں میں پایا جاتا ہے جو سب لوگوں کی زندگی میں حصہ لیتے ہیں۔ دنیا کے بڑے کام اس طرح سے کم ہو سکتے ہیں کہ ایک شخص کی ان فکروں میں جو انسان کی خدمت کے لئے مناسب ہوں اور ان خیالات میں جنکی خود غرضی دوسروں کو مضر ہو صحیح توازن قائم کیا جائے۔ ہم ابھی تک علم کی پہلی سیڑھی

(بقیہ ۲۴ صفحہ پر دیکھئے)

ساقی

فریب عشق

[جناب شاہد احمد صاحب بی۔اے (آنرز) ایڈیٹر ساقی دہلی]

شہنشاہ اکبر اعظم کی متعدد بیگمات تھیں تعداد ازواج کی خاص وجہ یہ تھی کہ اُس نے مختلف ہندو والیانِ ریاست کی بیٹیوں کو اپنے حرم میں داخل کرکے اُن راجہ مہاراجاؤں کو اپنا کرلیا تھا۔ شاہی حرم مختلف نسلوں اور مذاہب کی خوبصورت عورتوں سے پُر تھا۔ اِن ہی میں ایک حسین و جمیل راجپوت مہارانی بھی تھی۔

حسین مہارانی ایک نامور راجپوت گھرانے کی لڑکی تھی۔ پُرانے رسم و رواج کے مطابق مہاراجہ نے اپنی بیٹی کے لئے کئی سہیلیاں۔ خواصیں۔ غلام۔ رکاب بردار اور گویئے غرضکہ جملہ سامان عیش و نشاط فراہم کرکے ساتھ کر دئے تھے تاکہ زندگی کے اس نئے دور میں اُس نازوں کی پالی لڑکی کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔

راجپوت مہارانی نے اپنے بچپن کے گھر کو چھوڑا۔ اپنی سہیلیوں سے بچشم گریاں جدا ہوئی۔ سلطنت مغلیہ کے دارالسلطنت آگرہ میں شادی رچائی گئی۔ جسوقت مہارانی شاہی حرم میں داخل ہوئی تو اکبر کی دیگر ازواج نے بنظر استعجاب اس کمسن لڑکی کا مشاہدہ کیا جو اکبر کی محبت میں انکی برابر یا شاید کچھ زیادہ ہی کی شریک قرار پائی تھی۔ بعض نے اس عروس نوکے بھولے چہرے کو جسمیں کہ بچپن جھلک رہی تھی دیکھکر چہ میگوئیاں شروع کیں اور دل میں خوش تھیں کہ اس بچی سے کسی قسم کے سوکناپے کا خطرہ نہیں کہ وہ کمسن اُنکے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت نہ رکھتی تھی۔

نوعمر مہارانی اکبر کی بیویوں کو دیکھکر پہنچی جاتی تھی۔ اُن میں سے بعض کسقدر خوبصورت اور کسقدر شاندار تھیں! بعض کسقدر جامہ زیب اور بعض کسقدر جمیل تھیں! پھر یہ کہ سب کی سب اُس سے عمر میں کہیں بڑی تھیں۔ مہارانی اپنے شاہی دولہ کو ایک بار پھر دیکھنے کی متمنی تھی۔ جس کی سحر بار آنکھوں نے اس کی اقلیم دل کو اُسی وقت فتح کرلیا تھا جبکہ وہ پہلی ہی بار چار ہوئی تھیں تھوڑی ہی دیر بعد اکبر حرم شاہی میں داخل ہوا اور راجپوت مہارانی ہی کو انتخاب سے سرفراز فرمایا۔ اُنکی یکجائی نے جلد ہی محبت کی صورت اختیار کرلی۔ اور بیگمات یہ سن کر تک تک رہ گئیں کہ وہ شرمیلی کمعمر دلھن بادشاہ سلامت کی منظور نظر بن گئی۔

راجپوت مہارانی کی خواصوں میں ایک مغنیہ بھی تھی۔ یہ خواص اپنی مہارانی کی طرح نہایت خاموش اور کم سخن تھی۔ اپنے خداداد کمال موسیقی سے مہارانی کی دلجوئی کیا کرتی تھی۔ اُس کی سریلی آواز کا ترنم اُن کانوں میں

ایک روح پھونک دیتا تھا جنہیں کہ راجپوت شجاعت
کے کارناموں اور مہارانی کے وطن کا تذکرہ ہوتا تھا.
اُسکے گانے بجانے میں مہارانی کچھ اسقدر محو ہو جاتی تھی
کہ اُسکو دنیا و ما فیہا کی کچھ بھی خبر نہ رہتی تھی۔ راجپوت
مہارانی کی تنہائی کی گھڑیاں ایسی انہماک میں گزر جاتی
تھیں حاسد بیگمات اُسکی پُرکیف حالت کو غور سے دیکھتی
تھیں۔ مسکراتی تھیں۔ اور کانا پھوسی کیا کرتی تھیں اکبر
کے کان بھرے گئے۔ اُسے بھی کچھ شبہ گذرا اور ایک دن
مہارانی سے ذکر چھیڑ ہی دیا۔

اکبر۔ میری پیاری راجپوت بیگم! مجھے تمہاری
اس خواص سے کچھ نفرت سی ہو گئی ہے۔

مہارانی۔ جہاں پناہ! اگر سوء ادب نہ ہو تو میں
پوچھوں کہ اس منافرت کے اسباب کیا ہیں؟ آخر اس
بیچاری نے ایسی کونسی خطا کی ہے جو حضور کی ناگواری خاطر
کی باعث ہیں؟

اکبر۔ نہیں! کچھ نہیں!! صرف یہ کہ تم اُسپر بہت
مہربان ہو۔ جب کبھی وہ اپنا ستار بجا کر گاتی ہے تو تم
مجھ کو بھول جاتی ہو۔ اور وہ ہے کہ ہر وقت تمہارے
دم کے ساتھ رہتی ہے۔ مجھے تمہاری اسقدر محویت بُری
معلوم ہوتی ہے کہ تم مجھ کو بھی فراموش کر بیٹھو۔

مہارانی۔ حضور پر نور! مجھے موسیقی سے عشق
ہے۔ جب آنجناب میرے پاس نہیں ہوتے تو پہاڑ سا
وقت کاٹے نہیں کٹتا اس عذر سے شہنشاہ کی کچھ تسلی
ہو گئی اور کچھ عرصہ تک اکبر نے خواص کا ذکر نہ کیا۔ مگر
حرم کی افواہیں بڑھتی گئیں۔ اکبر نے پھر مہارانی سے
شکایت کی اور تاکید بھی کی کہ اُس خواص کو ہر وقت اپنے
ساتھ نہ رہنے دے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ اُس خواص سے
بہتر گانے بجانے والوں کی موجودگی میں خصوصیت کے
ساتھ اُسی مغنیہ کو ترجیح دی جائے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ راجپوت بیگم کے محل میں وہی
خواص بیٹھی ستار کے ساتھ وقت کے راگ الاپ رہی تھی
ستار پر خواص کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔ اُس کی آواز
میں ایک خاص لوچ اور درد تھا جس میں کہ مردانہ سوز و
گداز کی سی رنگینی تھی۔ اس پر راجپوت شجاعت کے کارناموں
کا ذکر اور بھی قیامت ڈھا رہا تھا۔ مہارانی پر کیفیت
طاری تھی۔ ایک ایک لفظ اُس کے دل میں اترا جاتا تھا۔
مہارانی ایسی حالت گم شدگی میں تھی کہ ناگاہ اکبر اُس کے
محل میں داخل ہوا۔ مہارانی اپنے نازک ہاتھ سے سر کو
سہارا دے بیٹھی تھی۔ اور اپنی نرگسی آنکھوں سے شبنم ریزی
کر رہی تھی۔ اکبر کی نظریں پھر خواص پر پڑیں۔ اُس کی
اونچی پاٹ دار آواز کمرے میں گونج رہی تھی اور اسکی نظریں
مہارانی کے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں۔ اکبر نے دل میں
طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔ "کیا اسقدر بھاری اور اونچی
آواز ایک عورت کی ہو سکتی ہے؟"

اکبر نے آگے بڑھکر خواص کو ہٹ جانے کا حکم دیا
وہ گھبرا کر جلدی سے کھڑی ہوئی اور لڑکھڑاتی ہوئی کمرے
سے نکل گئی۔ اکبر نے پھر اپنی بیوی سے سختی کے لہجہ میں کہا۔
"مجھے اس لڑکی سے نفرت ہے آئندہ میں اسکو تمہارے
پاس نہ دیکھوں"

مہارانی مسکرائی اور اکبر کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں

لے کر کہنے لگی۔

جہاں پناہ! آخر اسقدر عتاب کس لئے ہے؟ عالیجاہ کیا آپ کی آنکھوں پر محبت کا ایسا گہرہ پردہ پڑ گیا؟ کیا حضور ملاحظہ نہیں فرماتے کہ صرف آپ ہی میری عالم زندگی کے آفتاب درخشاں ہیں۔ میں تو صرف موسیقی کی وجہ اسکو پسند کرتی ہوں۔ میرے پیارے آقا! آپ مجھ کو اس دلبستگی سے محروم نہ فرمائینگے حضور کی عدم موجودگی میں میرا وقت اسی کی وجہ سے گزر جاتا ہے۔ مگر اکبر کا دل نہ پسیجا۔

اکبر۔ مجھے اس لڑکی سے قطعی نفرت ہے۔ خبردار آئندہ اسکو اپنے محل میں نہ بلانا۔

راجپوت بیگم نے ملتجی نگاہوں سے اکبر کی طرف دیکھا۔

مہارانی۔ میرے اچھے آقا! آپ ناراض نہ ہوں جب آپ نہیں ہوتے تو وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ اور تنہائی کی گھڑیاں میرا دم الٹا دیتی ہیں۔ حضور میری تقصیر سے درگزر فرمائیں اور میری اس دلی آرزو کو رد نہ کریں۔ اُس کے گانے سے میرا جی بہلتا ہے۔ آہ! میرے مالک! میرے پیارے سرتاج! مجھے صرف آپ ہی سے عشق ہے۔ وہ خواص ہماری محبت میں ہرگز مخل نہیں ہو سکتی۔

مہارانی کے محبت آمیز کلمات اسکے بھولے چہرے اور بچپن کی سادگی نے اکبر کے چہرے سے خفگی کے آثار کو مٹا دیا اور بات گئی گزری ہو گئی۔

چند ہی دن بعد اکبر یکایک پھر داخل ہوا۔ مہارانی مسہری پر نیم دراز تھی اور اُسکے قدموں کے قریب وہ خواص بیٹھی ہوئی بدستور سابق گا بجا رہی تھی۔ ایک شعر مہارانی کے قلب و جگر میں تازہ ہو رہا تھا۔ اور اکبر کے داخل ہونے کی اسکو مطلق خبر نہ ہوئی۔ کچھ دیر تک اکبر ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ پھر مسہری کی طرف بڑھکر اُس نے کڑک کر کہا۔

"حکم عدولی! یہ خواص یہاں کیوں آئی؟"

مہارانی بادشاہ کی آواز سن کر چونک پڑی اور جلدی سے تعظیم کے لئے سرو قد کھڑی ہو گئی۔

مہارانی۔ جہاں پناہ! خطا معاف! میں نے حضور کو تشریف لاتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

اکبر۔ ہاں! اس سے تمھیں کیا سروکار کہ میں آؤں یا نہ آؤں۔

مہارانی کی مسکراہٹ اکبر کے تیور دیکھکر معدوم ہو گئی۔

اکبر۔ وہ خواص یہاں کیوں گا رہی تھی۔ جب میں نے تمکو منع کر دیا تھا کہ اُسکو یہاں نہ بلانا تو پھر تم نے کیسے اُسے یہاں دوبارہ آنے دیا؟ کیا میرا حکم اتنی بھی وقعت نہیں رکھتا؟ میرے حکم سے سرتابی!

مہارانی۔ جہاں پناہ! میرے سرتاج! میری التجا سنئے۔

مہارانی کی آواز خوف سے رک گئی اکبر کے چہرہ پر نفرت اور غصہ کے آثار نمایاں تھے۔

اکبر (گرجکر) میں تمہارا کوئی عذر سننا نہیں چاہتا۔ تم نے حکم عدولی کی اور بس مجھے تمہارے باہمی طرز اختلاط اور بے تکلفی کی بنا پر یقین ہے کہ تمہاری مغنیہ عورت نہیں ہے بلکہ تمہارا کوئی عاشق زنانہ بھیس میں ہے اور تم ایک عصمت فروش بیوی ہو۔"

کسی پر بجلی گرنے کا وہ اثر نہ ہوتا جو اکبر کی اس

مختصر تقریر نے مہارانی پر کیا۔ مہارانی ایک سکتہ کے عالم میں
کھڑی اکبر کے مُنہ کو تکتی رہی بہزار دقت سنبھلی اور اکبر کے
ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر کہنے لگی۔

میرے سرتاج! میرے مجازی خدا! بادشاہ سلامت
آپ کیا فرما رہے ہیں"؟

مگر غضب آلود اکبر نے اُس کے ہاتھوں کو جھٹک کر کہا۔

بس! بس! خاموش!! مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارا عاشق ہے

اکبر کا غصہ بڑھتا گیا اور اُسکے منہ سے سخت کلمات
جاری تھے۔ مہارانی دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھامے
ہوئے کھڑی اپنے چہیتے شوہر کے اتہامات سُن رہی تھی۔
مگر اکبر اور مہارانی کے تعجب و حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی
جب اُنھوں نے دیکھا کہ مغنیہ آگے بڑھکر کہنے لگی۔

جہاں پناہ بجا ارشاد فرماتے ہیں میں مرد ہی ہوں"

مہارانی مغلوب الغضب بادشاہ کے قدموں میں گر پڑی
اور اپنی معصومیت کا اظہار کرنے لگی مگر اکبر کے چہرے پر
ایک حقارت آمیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور یہ
کہتا ہوا الگ ہٹ گیا کہ :-

"مجھے اس کی حقیقت معلوم تھی"

مغنیّہ نے مودبانہ عرض کیا جہاں پناہ اگر جان بخشی
فرمائیں تو اصل واقعہ بیان کروں اور آپ دونوں کی
غلط فہمی دور ہو جائے

اکبر۔ دونوں کی! تم نے سوانگ خوب بھرا ہے
اچھی بات ہے۔ ہم اس تماشہ کا آخری منظر بھی دیکھنا
چاہتے ہیں۔ تمھیں جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو۔"

مصنوعی مغنیہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کرنا شروع کیا!-

بادشاہ سلامت! جب مہارانی صاحبہ کا بچپن تھا
میں راج محل میں روزآنہ آیا جایا کرتا تھا۔ مہارانی۔ راجہ
اور اُنکے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ مہارانی صاحبہ
کی طرف میرا دل کھنچا جاتا تھا۔ اُنکا خیال ہر وقت میرے دلمیں
رہنے لگا۔ مہارانی صاحبہ کو اسکا علم نہ تھا کہ میں خفیہ طور
پر اُنکو دیوی سمجھتا ہوں اور اُنکی پرستش کرتا ہوں۔
زمانہ گزرتا گیا اور ہماری عمریں بھی بڑھ گئیں۔ مجھے راج محل میں
جانے سے روک دیا گیا۔ مگر اس سے میری پرستش میں کمی
نہیں ہوئی بلکہ آگ اور بھڑک اُٹھی۔ مہارانی صاحبہ گو
آنکھوں سے دور تھیں مگر میرے دل میں ہر وقت موجود
تھیں۔ جب یہ خبر پھیلی کہ مہارانی صاحبہ آپ سے منسوب
ہونے والی ہیں اور مہارانی صاحبہ کی دلآویزی کے لئے
ایک مغنیہ کی ضرورت ہے تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ
خواہ مجھے اپنی جان سے ہاتھ ہی دھونے پڑیں مگر میں
مغنیہ کا بھیس بدل کر ضرور مہارانی کے ساتھ جاؤنگا۔
میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا۔ نہ اسمیں کسی نے میری
امداد کی اور نہ کسی کو کانوں کان اس واقعہ کی خبر ہوئی
یہاں تک کہ مہارانی صاحبہ کو بھی آج سے پہلے اس کا علم
نہ تھا۔ مہارانی صاحبہ قطعی معصوم ہیں مجھ ہی کو مورد عتاب
قرار دیجیے۔ ان کے دل پر صرف حضور ہی کی محبت طاری
وساری ہے۔ میرے لئے صرف اُنکی قربت اور موسیقی سے
اُن کی دلجوئی کرنا کافی تھا۔ جہاں پناہ یقین فرمائیں میرا
ایک ایک لفظ صحیح ہے۔

مصنوعی مغنیہ خاموش ہو گئی مگر اکبر کا غصہ اب بھی
کم نہ ہوا تھا۔ سختی سے بولا۔

تم دونوں نے نہایت چالاکی سے اپنا اپنا پارٹ
ادا کیا۔ مگر اب یہ کرشمہ سازیاں ظاہر ہوگئی ہیں۔
کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری جھوٹی کہانی کا یقین کر لونگا؟

مغنی۔ جہاں پناہ کو اختیار ہے میری کہانی سچی ہے
مہارانی صاحبہ کو میرے بھیس کی خبر نہ تھی۔ وہ قطعی بیگناہ
ہیں۔ مہارانی صاحبہ آپکا۔ اور صرف آپ ہی کا دم بھرتی ہیں۔

مغنی آبدیدہ آنکھوں سے فرش پر پڑی ہوئی مہارانی
کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اپنا ستارے کر کمرہ سے باہر نکل
گیا۔ اکبر کو اس عجیب وغریب کہانی کا یقین نہ آتا تھا۔
اُس نے مہارانی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھا۔ مہارانی
کی ایک آنکھ ساون اور ایک بھادوں بنی ہوئی تھی۔

اکبر۔ مجھے غلط فہمی تھی کہ تمکو مجھ سے محبت ہے اور
تم ایک باعصمت بیوی ہو مگر تم مجھ کو ابتک دھوکہ دیتی رہیں
اور میں تم سے محبت کرتا رہا۔

مہارانی۔ میرے سرتاج! میں پرماتما کو حاضر ناظر
جان کر کہتی ہوں کہ مغنی نے جو کچھ کہا سچ ہے۔ میں بےقصور
ہوں۔ مجھ کو ہرگز ہرگز اُس کی شخصیت کا علم نہ تھا۔ مجھے
صرف آپ سے محبت ہے اور مرتے دم تک رہیگی۔

مہارانی نے ایک بار پھر اکبر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں
لینا چاہا مگر اکبر جھٹک کر الگ ہوگیا۔

اکبر۔ خبردار! خبردار! میرے قریب نہ آؤ۔ مجھکو
مت چھوؤ۔ مجھے یہ تریاچرتر پسند نہیں۔ میں نے تمہاری
عفت مآبی پر اعتماد کیا تھا مگر تم نے اپنی عصمت فروشی
کا یقین دلا دیا۔

مہارانی۔ (روکر) نہیں! نہیں! جہاں پناہ میں
آپ کی وفادار بیوی ہوں۔ میں نے آپکو دھوکہ نہیں دیا۔
پرماتما مجھے اس گھڑی موت۔ میری زندگی صرف آپ کی
محبت سے وابستہ ہے۔ اس دل میں صرف ایک چیز ہے
اور وہ آپ کی محبت ہے۔

اکبر۔ پھر تم نے میرا حکم کیوں نہ مانا؟ جب میں نے
ایک دفعہ تم کو منع کر دیا تھا کہ مغنیہ کو یہاں نہ آنے دینا
تو تم نے سرتابی کیسے کی؟

مہارانی۔ جہاں پناہ! مجھے موسیقی سے عشق ہے
آپ کی عدم موجودگی میں میرا وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا
اس سوہان روح کا واحد علاج موسیقی ہی ثابت ہوئی
آپ کو یاد ہوگا جسدن مغنیہ کی ممانعت آپ نے کی تھی
میں نے آپ سے پرزور التجا کی تھی آپ نے کوئی جواب
نہیں بخشا جسکو میں نے الخاموشی نیم رضا پر محمول کیا ورنہ
حکم عدولی کی مجھے کب مجال ہے۔

اکبر۔ نہیں! نہیں! مجھے تمہارا اعتبار نہیں ہے
ثبوت پورا پورا مل چکا ہے۔ آئندہ میں کبھی تمہارے پاس
نہ آؤنگا اور نہ تمکو دیکھونگا۔"

مہارانی۔ ہائے ایسا نہ کہئے۔ آپ ہی میری رُوح رواں
ہیں۔ آپ بغیر میرا خیال محال ہے۔ مجھ پر اعتبار کیجئے یقین
کیجئے اور۔۔۔۔۔۔۔۔"

اکبر۔ خاموش! یہ غمزے مجھ پر کامیاب نہ ہونگے
میں کبھی درگزر نہیں کرسکتا۔

اکبر نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور باہر نکل گیا
اکبر کے چلے جانے کے بعد مہارانی فرش پر سے اُٹھی
اُس کے حسین چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اور اُس کی

غزالی آنکھیں روحانی اذیت کی غمازی کر رہی تھیں۔

اس واقعہ اور شہنشاہ کے عتاب کی خبر آگ کی سرعت سے شاہی حرم میں پھیل گئی۔ کنیز اور بیگمات مہارانی کے محل میں داخل ہونے لگیں یہاں تک کہ محل بھر گیا باوجود اتنے بڑے اجتماع کے کسی متنفس کے بولنے کی آواز نہ آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہارانی کے اندوہگیں چہرے نے اُنکے لبوں پر مہر سکوت ثبت کر دی تھی۔

مہارانی نے ایک کنیز کو قلم اور کاغذ لانے کا اشارہ کیا۔ پھر ایک حسرت آمیز نگاہ اُنپر ڈالی جو اُس کو گھیرے ہوئے کھڑی تھیں اور زہرہ گداز لہجہ میں کہنے لگی۔

"میں اپنے سرتاج کو اپنی محبت کا ثبوت دیتی ہوں"

مہارانی نے تیزی سے اپنا ایک بازو عریاں کیا اور اپنی کمر سے ایک مرصع پیش قبض نکال کر اپنے نقرئی بازو میں پیوست کر دیا۔ خون تلّل تلّل بہنے لگا۔ مہارانی نے قلم میں خون کا شوب لیا اور لکھا:۔

"میرے سرتاج! میرے مالک! میں اپنی عصمت اور عفت پر جان قربان کر رہی ہوں"

ناظرات میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ مہارانی کا ہاتھ تھام لے۔ مہارانی کا یہ فعل اُس کے بدظن شوہر کی پرستش اور اپنی عفت مآبی کے باب میں تھا۔ مہارانی ثابت کرنا چاہتی ہے کہ اُسکا ہر ہر قطرۂ خون اور اُس کی کائنات ہستی کا ایک ایک ذرہ صرف اکبر اور اکبر ہی کے لئے وقف تھا۔ وہ راجپوت تھی جو عزت کو جان پر ترجیح دیتے ہیں مہارانی کے خون کے ساتھ ساتھ روح بھی سلب ہوتی جا رہی تھی ناظرات مبہوت کھڑی واقعہ کی اہمیت کو سمجھ رہی تھیں۔ ایسی عورت کی زندگی ہی کیا ہے؟ ایک ہندو نی جس کی عصمت پر مشتبہ نظریں ڈالی گئی ہوں!

مہارانی نے کاغذ ایک کنیز کو دیکر کہا

"بادشاہ سلامت کو پہنچادو کسی اور کو نہ دینا"۔

کنیز نامۂ خونی لیکر اُڑی اور چشم زدن میں اکبر کی حضوری میں جا پہنچی۔ اکبر نے غضب آلود آنکھوں سے اُسکا مطالعہ کیا ــــ دوبارہ پڑھا ــ مہلک حقیقت حال اُسپر منکشف ہوکر سوہان روح بن گئی۔ اکبر خود نیم راجپوت تھا۔ اُس نے اب مہارانی کی معصومیت کو محسوس کیا۔ رنج و غم سے مغلوب ہوکر وہ رقت تمام مہارانی کے محل میں داخل ہوا۔

مہارانی مسہری پر دراز تھی۔ خون جاری تھا مگر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک بوند ٹپک جاتی تھی گویا چشمۂ حیات اب بند ہونے والا تھا۔ اکبر نے موت سے ہمکنار مہارانی کو اپنی آغوش میں لیا اور اپنی زود اعتقادی اور کوتاہ فہمی پر اظہار ندامت کرتا رہا۔ پھر رقت آمیز لہجہ میں کہنے لگا "میری راجپوت بیگم! للہ مجھے معاف کرو۔ میں ایسے گناہ کا مرتکب ہوا ہوں جس کا کفارہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا آہ میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا"۔

اکبر کے خفیف ہی سے مہارانی کے چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُس کی آنکھیں کمزوری سے بند ہوگئی تھیں مگر اکبر کی آواز سنتے ہی کھل گئیں ــ آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ اکبر عرق انفعال میں غرق ہوگیا۔ مہارانی کے زرد لبوں میں ایک خفیف سی جنبش ہوئی ۔

ایک آہ سرد ــ ایک ارتعاش جسدی ــ اور

[بقیہ صفحہ ۶۱۷ پر دیکھئے]

سدرشن

زمزمۂ تغزل

[جناب والا امر چند قیس جالندھری ایڈیٹر انجمن ”سدرشن“ لاہور]

سمجھا اسے جو درد سمجھ کا قصور تھا + اتنا ہی وہ قریب تھا جتنا کہ دور تھا

مستی میں جن دنوں دل مدہوش چُور تھا + ہر پیکر خیال مجسم سرور تھا

سر اپنا آپ پھوڑ لیا بے شعور تھا + فرہاد کے دماغ میں شاید فتور تھا

دیکھا نہ غور سے یہ نظر کا قصور تھا + ہر ذرہ درنہ غیرت صد کوہ طور تھا

کچھ اسکا پاس بھی تجھے ساقی ضرور تھا + جو وقت میکشی تری محفل سے دور تھا

دوری کا مجھکو یار سے شکوہ ضرور تھا + لیکن یہ پاس وضع محبت سے دور تھا

ایفائے عہد غیر سے مانا ضرور تھا + کچھ ہم سے بھی تو آپکا وعدہ حضور تھا

رکھی نگاہ لطف کی امید آپ سے + یہ اس قصور وار کا پہلا قصور تھا

وہ اک نگاہ ناز کی گردش دکھا گئی + جو انقلاب گردش دوراں سے دور تھا

روٹھے ہوئے کو خاک میں مل کر منا گیا + مرحوم طفل اشک بڑا با شعور تھا

تم جس سے کہہ رہے تھے ذرا دیر صبر کر + کس خوش نصیب کا وہ دل ناصبور تھا

مرتے ہیں آپ پر یہ ہمارا قصور تھا + مرتے تھے آپ پر یہ ہمارا قصور تھا

اب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں اے نگاہ شوق + تیرے ہی نور سے مری آنکھوں میں نور تھا

غم ہو کہ درد ہو کہ کسی کا خیال ہو + جو دل میں رہ گیا وہی دلکا سرور تھا

شوخی کسی کی خاک میں اسکو ملا گئی + جس دل پہ ناز تھا مجھے جس پر غرور تھا

تم بے قصور تھے مری جاں بے قصور ہو + ہم ہیں قصور وار ہمارا قصور تھا

یوں ہی پڑے ہیں مے سے قرابے بھرے ہوئے + ساقی کا آج بزم میں ہونا ضرور تھا

سچ ہے شگفتگی بھی خوشی کی دلیل ہے + جو چور تھا نشے میں وہی پر سرور تھا

جو کچھ ہوئیں ہمیں سے خطائیں ہوئیں درست + جو کچھ قصور تھا وہ ہمارا قصور تھا

یہ سب نگاہ اہل نظر ہی کا فیض ہے + انداز و ناز کا تمہیں کس دن شعور تھا

آج اک نگاہ ناز نے دیوانہ کر دیا + کل کی ہے بات قیس بڑا با شعور تھا

(خاص)

[صفحہ ۷۱۵ کا بقیہ]

مہارانی کی منزہ و معصوم روح عناصر کی قیود سے آزاد ہوگئی اور ایک ملکوتی تبسم اُس کے چہرے پر چھا گیا

بیگمات اور کنیزیں خاموشی سے باہر نکل آئیں اور اکبر مردہ مہارانی کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔

اکبر کے حسین چہرے سے ایک عرصہ تک حرمان و اندوہ کے آثار ترشح ہوتے رہے۔ خوبصورت راجپوت بیگم ----- جس سے اُسے عشق تھا اور جس کی موت کا باعث اُس کی بدگمانی ہوئی ----- کی یادگار میں ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔ اکثر رات کے سناٹے میں اُس مقبرہ کی سمت سے نقلی مغنیہ کی سامعہ نواز آواز اُس کے ستار کا پر کیف ترنم اکبر کے کانوں میں گونجا کرتا تھا۔ ستار کا ہر زخمہ اکبر کے تارِ رگِ جاں پر مضراب ستم کا کام کرتا تھا اور یہ کیفیت عرصۂ دراز تک جاری رہی۔

(خاص)

سحبان

مریم زناریہ ڈرامہ کا ایک سین

(جناب مولوی کیفی صاحب چڑیاکوٹی سابق ایڈیٹر سحبان و المعلم وغیرہ)

(شہزادی مریم قید خانے میں بیڑی اور ہتھکڑی کے ساتھ)

شہزادی مریم۔ آہ! پیارے نور الدین تم دنیا میں نہیں، شہید ہو کر عشق کی راہ سے حوروں کی آغوش میں پہونچ گئے تم خون میں نہا کر دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو گئے اور خدا کے سامنے سرخرو ہو گئے۔

تمہارا وہ خون جو زمین پر بیگناہ گرایا گیا۔ قیامت تک ظلم و ستم کے افسانوں کی سرخیاں بنے گا۔

اے شہید نور الدین کی پاک روح! مریم، مجبور اور مایوس مریم، زندگی سے بیزار مریم! تیرے عشق میں ان زنجیروں کو وفاداری کی شان سمجھتی ہے۔ اے فرشتو! میری آواز میرے سچے جذبات جنت میں نور الدین کے پاس پہونچا دو اور بتا دو کہ جب تک دم میں دم ہے۔ مریم عشق میں ثابت قدم ہے اور جب دنیا سے آئے گی تو تمہاری محبت کو زاد راہ بنائے گی۔ ہائے

(غزل)

یوں قفس سے زور دست باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا ہم بے زباں دیکھا کئے

آشیاں جس شاخ پر تھا بجلیاں گرتی رہیں
روز ہم حسرت سے سوئے آسماں دیکھا کئے

اس کی محفل میں ہے یہ آداب خودداری کا رنگ
ہم سلگ کر بجھ گئے اور مہرباں دیکھا کئے

اس کے در پر بات رکھ لی اضطراب شوق نے
سر پٹک کر مر گئے ہم پاسباں دیکھا کئے

آہ! بندہ کس قدر مجبور ہے، زمین سخت ہے آسمان دور ہے سہ:—

غم فراق کی مجھ کو دوا نہیں ملتی
تمام ڈھونڈھ رہی ہوں قضا نہیں ملتی

(بختیار ک آتا ہے)

بختیار ک۔ (مسکرا کر) شہزادی صاحبہ! اب آپ کی زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے۔

شہزادی۔ خدا کی پناہ! یہ کیا کہا۔ فانی انسان کسی کی موت اور حیات کا مختار شان پروردگار۔

بختیار ک۔ کیا آپ نے دیکھا اور سنا نہیں ہے بادشاہ نے جو کچھ کہا بر ملا نہیں ہے۔

شہزادی بیشک! بر ملا ہے لیکن یہ سب کچھ خدا ہی کی مرضی ہے۔ انسان اگر زمانیت کا دعویٰ کرے تو جھوٹے غرور کی خود غرضی ہے۔

بختیار ک۔ میں آپ کے ساتھ ہر قسم کی رعایت کرنے کو تیار ہوں بلکہ بادشاہ سے معافی دلوانے کا ذمہ دار ہوں لیکن —

شہزادی۔ (تعجب سے) لیکن کیا؟

بختیارک - یہ کہ میری محبت قبول کیجئے۔
شہزادی - (غضب ناک ہوکر) اُف! او ظالم! بوالہوسی کے شیطان مجسم تو نے یہ کیا کہا۔
بختیارک - میں نے جو کچھ کہا اب بھی کہتا ہوں اور کہتا رہوں گا یہاں تک کہ آپ ماننے پر مجبور ہوں۔
شہزادی - یہ خیال ناممکن! محال او ملعون تو دنیا میں مایوسی سے عمر بھر سر ٹکرائیگا اور جب دنیا سے جائے گا تو رو سیاہ ہوجائے گا۔
بختیارک - کیا میں اس سوداگر بچے ٹکر گدا سے بہتر نہیں۔
شہزادی - او نابکار۔ بوالہوسی کے مقابلے میں عشق صادق کو ذلیل کرتا ہے۔ بچوں کی سی دلیل کرتا ہے۔
بختیارک - رسی جل گئی اور بل نہ گیا۔ ابھی سودائے خام کا خلل گیا۔ کیا تجھکو معلوم نہیں کہ میرے ایک اشارے میں تیری بدزبانی خاک میں مل جائے گی آناً فاناً جان سے جائے گی۔
شہزادی - تو جان لینے کی دھمکی اس کو دیتا ہے جس کو زندگی وبال ہو
بختیارک - اچھا میں دیکھتا ہوں اس کا کہاں تک خیال ہے۔

(دستک دیتا ہے مسرور آتا ہے)

بختیارک - (مسرور سے) مسرور! جا اور کوڑے لیکر دو جلادوں کو بلا لا۔ (مسرور جاتا ہے)
بختیارک - (شہزادی سے) شہزادی صاحبہ! اپنی جوانی پر رحم کیجئے۔ اب بھی کہنا مان لیجئے۔ ورنہ پچھتائے گا۔
شہزادی - او عذاب کے فرشتے! دنیا کے کتے۔ دسترخوان کی چھوٹی ہوئی جھوٹی ہڈیوں کے چبانے والے تو نے دیکھے کہاں ہیں جان پر کھیل جانے والے۔

(مسرور جلادوں کو لیکر آتا ہے)

بختیارک - کہئے اب شہزادی صاحبہ! اب کیا رائے ہے۔
شہزادی - وہی جو پہلے تھی؛
بختیارک - (مسرور سے) اس کو قید خانے سے باہر لا؛

(مسرور باہر لاتا ہے)

بختیارک - اس طرح نہ مانے گی۔ اچھا جلاد و! اس کے ہاتھوں پیٹھ اور گردن پر کوڑے لگاؤ۔

(جلاد مارتے ہیں اور خون کے فوارے اڑتے ہیں)

شہزادی - (استقلال سے) ؎

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

بہے ہوئے خون کو چہرے پر ملتی ہے اور کہتی ہے عشق کی نماز کے لئے یہی وضو ہے ؎

نہ نماز آتی ہے ہمکو نہ وضو آتا ہے
سجدہ کر لیتے ہیں جب سامنے تو آتا ہے

عشق کی زینت کے لئے یہ گلکاری۔ اصلی شان ہماری ہے ؎

بھرے جیب و دامن میں اپنے لہو ہیں۔
ادھر دیکھ! اے عشق، ہم سرخرو ہیں

اے فلک پیر، اے خوبی تقدیر، للہ کل کے لئے کچھ اٹھا نہ رکھ۔ تسمہ بھی لگا نہ رکھ۔ اے محبت کی آزمائشوں کی آگ دنیا کی آلائشوں کو جلا دے۔ زر خالص بنا دے۔ تاکہ کل ہم خدا کے سامنے پاک صاف ہوکر جائیں۔

بختیارک - (جلادوں سے) آج اتنا ہی کافی ہے (مسرور سے) مسرور! لیجا اس چڑیل کو پھر اسی جہنم میں بھر دے۔

(مسرور حریم کو قید خانے میں لیجاکر بند کر دیتا ہے)
(مسرور۔ جلاد۔ بختیارک جاتے ہیں)

(خاص)

سروش

یادِ محبوب

[جناب محمد عنایت خان صاحب حیرتؔ ایڈیٹر رسالہ "سروش" لاہور]

پارہائے دل تھے میرے دیدۂ خونبار میں :: اور میں تنہا کھڑی تھی دامنِ کہسار میں

پھول چنتا تھا محبت کے دلِ کیف آشنا :: ہر بنِ مو سے نکلتی تھی ترنم کی صدا

چھپ گیا مغرب میں جا کر آفتابِ زرنگار :: ہو گئی معمورِ ظلمت سے فضائے کوہسار

خوابِ راحت کے مزے لیتی تھی حسینِ کائنات :: میں نے آنکھوں میں گزاری آہ وہ فرقت کی رات

چودھویں کا چاند بامِ فلک پر ضو فشاں :: جنت الفردوس تھا انوار سے سارا جہاں

ایک دنیا جب شرابِ عیش سے مدہوش تھی :: میں تری یادِ محبت زا سے ہم آغوش تھی

نغمۂ مرغِ سحر تھا دعوتِ کامِ حیات :: دے رہا تھا غلغل انسانوں کو پیغامِ حیات

مہر کی آمد تھی شب کی تیرگی میں انحطاط :: اس تغیر سے نہ ٹوٹا وہ طلسمِ ارتباط

کیف تھا اک طائروں کے نغمۂ امداد میں

یہ شبِ آخر بھی گذری آہ تری یاد میں

(خاص)

صبح

[جناب اخگرؔ جالندھری بی۔ اے مدیر رسالہ "سروش" لاہور]

کس ادا سے کس ناز سے ہے صبحِ صادق کی نمود :: اک طلسمِ نور نے توڑا ہے دنیا کا جمود

کھل گئیں آنکھیں ہوا جب نورِ قدرت کا ورود :: تختۂ گلشن بنا آئینۂ بزمِ وجود

واہ کیا دلکش ہے منظر واہ کیا نظارہ ہے :: ہر گل صحنِ چمن اک نور کا فوارہ ہے

کچھ نئی سج دھج نرالی شان سے آئی ہے تو :: روح کو میری پیامِ زندگی لائی ہے تو

مضطرب حالوں کا سامانِ شکیبائی ہے تو :: گوشِ گل کے واسطے آوازِ شہنائی ہے تو

رونقِ گلزار ہے تو رنگ بن کر گل میں ہے :: درد کی صورت میں پنہاں شیونِ بلبل میں ہے

آفتابِ صبح نکلا وہ اُفق سے دیکھ لو :: روشنی اس میں ہوا چودہ طبق سے دیکھ لو

کیسا منظر ہے یہ تمِ رنگ شفق سے دیکھ لو :: دیکھ لو اے ہمدمو چشمِ حق سے دیکھ لو

کس قدر ہے فرحت افزا صبحِ صادق کی بہار :: ہے تراوٹ آنکھ کو ایسی ہوا ہے خوشگوار

کیسا دلکش ہے یہ نظارہ کہ جس کو دیکھ کر :: روح ہوتی ہے تر و تازہ تو خوش قلب و جگر

دیکھنے والوں کو بھی رہتی نہیں اپنی خبر :: ہم نے اکثر یہ فضائے صبح کا دیکھا اثر

صبحِ صادق کی ہواؤں میں تاثیرِ شراب

ساغرِ صہبا کا ہم پلّہ ہے جامِ آفتاب

(خاص)

پریم مندر

[جناب خواجہ عبدالکریم ایم۔ اے۔ رکن ادارہ "سروش" لاہور]

پنڈت پران ناتھ جی دبلے پتلے مگر دراز قد تھے، جب دیکھو فکروں کے اتھاہ سمندروں میں غوطہ زن ہیں۔ مگر بڑے راسخ الاعتقاد، کیا مجال کہ کبھی لغزش ہوتی ہو۔ انھیں بڑا مان تھا، ایشور کی خواہشات، ایشور کی مرضی، ایشور کے مقاصد سے واقف،

جب اپنے مندر کے گرد لہلہاتے کھیتوں کے قریب سے نکلتے ہوئے گزرتے تو اُن کے دل میں اکثر یہ سوال دھوئیں کی طرح اٹھتا۔ "ایشور نے ایسا کیوں کیا ہے؟" اور اِس کے جواب کے لئے بہت دیر تک سر دھنتے ہوئے خود ایشور بنجاتے اور جواب پا لیتے۔ کبھی اُن کی زبان سے یہ نہ نکلا تھا "ہے پرمیشر، تیرے ارادوں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا" بلکہ یہ کہتے "میں پرمیشر کا داسی ہوں، اور میرا یہ فرض ہے کہ اُس کی قدرتوں کو دلائل سے ثابت کروں، قدرت کی ہر چیز اُن کے نزدیک کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی تھی، دماغ میں ہر وقت "کیوں اور کیونکہ" کی کشمکش رہتی، "صبح صادق اس لئے بنائی گئی ہے کہ ہم جاگتے ہی باغ باغ ہوجائیں۔ دن فصلوں کے پکانے کے لئے۔ مینہ کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے، شام نیند کی تیاری کے لئے۔ اور کالی راتیں سونے کے لئے،

چاروں موسم زراعت کی کل ضروریات کے لئے کافی تھے، پنڈت جی کو کبھی خیال نہ آیا تھا کہ قدرت یونہی بلاوجہ کام کرتی ہے۔ اور تمام ذی جان چیزیں وقت و موسم کے سنگین قوانین کے تابع ہیں۔

انھیں عورت سے نفرت تھی ــــ دلی بَیر و حقارت "عورت، مجھے تجھ سے کیا کام؟" وہ ناک بھوں چڑھا کر کہا کرتے۔ "سچ ہے عورت دیکھتے ہی انسان کو خیال گذرتا ہے۔ پرماتما بھی عورت کو اپنے ہاتھوں سے بنا کر پچھتاتے ہونگے" ارے ــــ یہ عورت . . . . عورت ذات . . . . کبھی پوتر نہیں ہو سکتی۔ یہ وہی ہے جس نے دنیا کے سب سے پہلے انسان کو گمراہ کیا تھا۔ اور آج بھی یہ اُسی طرح مردوں کو تباہ کرنے کا کام کرتی ہے . . . . ایک کمزور و ناتوان . . . . . . خوبصورت ناگن . . . . خطرناک . . . . اس کے شیریں ہونٹوں میں زہر بھری ہے"۔

پنڈت جی کو کئی بار اقتباس ہوا تھا کہ عورتوں نے انھیں ترچھی نگاہوں سے دیکھا ہے ــــ مگر وہ اپنے آپ کو ایسا مضبوط و مستحکم قلعہ سمجھتے تھے کہ یہ تیر و تفنگ بیکار رہتے۔ اُن کی رائے میں عورت کے پاس سے گزرنا بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ وہ کہا کرتے "جب عورت اپنے پھول سے نازک ہونٹ کھولتی ہے اور ہرن سے چمکدار آنکھوں سے تیر پھینکتی ہے تو شکار خود بخود اُس کے بازوؤں میں آجاتا ہے . . . . ہے رام . . . . عورت ایک جال ہے . . . . جال جس میں مرد کا قابو میں آجانا کوئی مشکل نہیں۔

اگر انھیں عورتوں سے کچھ لگاؤ بھی تھا تو دیودی داسیوں سے، جنھیں وعدوں اور حلفوں نے بے ضرر کر رکھا تھا۔ مگر یہ اُن سے بھی ترش روئی سے پیش آتے کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے "اُن کے عاجز و زنجیر بستہ دلوں کی

عمیق گہرائیوں میں ابھی تک وہ ابدی محبت ہے جو مجھ ایسے ایشور بھگت تک پہنچ جاتی ہے۔

"ہے پرماتما ان کی بلوری سی آنکھوں میں پوتر گنگا جھلکتی ہے، جب یہ مسکراتی ہیں تو پھول شرما جاتے ہیں۔ ان کی ہنسی مندر کی گھنٹیوں کی آواز سے زیادہ دلکش ہے.... مگر یہ عورتیں ہیں.... اور ان کے سینوں میں وہ پریم ہے.... جو گنگا جل کی طرح پوتر نہیں ہو سکتی.... پر نہیں ہو سکتی.... دیوی کی پوجا.... ایشور کی بھگتی....! ان میں نہیں ہو سکتی۔ یہ میری جھڑکیاں سنکر آنکھیں نیچی کر لیتی ہیں، اور امرت بھرے نینوں سے آنسو موتی بن کر گلاب سے ہونٹوں پر اوس کی طرح پڑتے ہیں.... تو کبھی ترس آجاتا ہے.... آہ مگر یہ عورت ذات ہیں۔ دیوی کے چرنوں میں چکلا ریپشانیاں رگڑ رگڑ کر مندر کا پوتر فرش بھرسٹ کر دیتی ہیں"۔

بس پنڈت جی کو ان سے ایسی نفرت ہو چکی تھی کہ جب کسی عورت کا سایہ بھی ان پر پڑ جاتا تو جلدی جلدی گنگا کنارے جا کر اشنان کرتے۔

پنڈت جی کی ایک بھانجی تھی جو قریب ایک جھونپڑے میں اپنی ماں کے پاس رہتی۔ پنڈت جی کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح یہ لڑکی بھی دیوی داسیوں میں شامل ہو جائے۔

یہ من موہنی۔ کامنی سی۔ چینی کی مورت ابھی بہار کے نوشگفتہ پھول کی طرح تھی۔ جب پنڈت جی اپنا دیا کھیان سناتے تو یہ ہنس دیتی، اور جب تیور بدل کر اسے گھورتے تو یہ ان سے چمٹ جاتی — اور جب یہ اُسے اپنے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتے تو بدن میں پدری محبت کی ایک لہر بجلی کی طرح دوڑ جاتی جو ہر آدمی کے دل میں سو رہی ہوتی ہے"۔

جب وہ ہرے ہرے کھیتوں میں سے گذرتے، اور لڑکی ساتھ ساتھ ہوتی تو وہ اُس سے ایشور.... اپنے ایشور کے گُن گاتے۔ مگر یہ لڑکی پنڈت جی کی باتیں دل کے کانوں سے سننے کے بجائے۔ یہ کاس کے نیلے منڈلی سبز مخملی گھاس۔ خوشنما پھولوں کو دیکھتی جاتی۔ خوشی سے چہرہ کھلا ہوتا۔ اور آنکھوں میں بھی خوشی جھلملاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ کبھی کسی اُڑتی تتلی اور کبھی کالے بھنورے کو پکڑ کر لے آتی۔ "دیکھو ماموں جی، یہ کس قدر خوبصورت ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اسے چومتی رہوں"، پنڈت جی لڑکی کو کیڑے مکوڑے اور پھول چومتے دیکھ کر بگڑ جاتے۔ دل ہی دل میں کہتے:-

"سچ ہے، عورت کا دل کونپل کی طرح نازک ہوتا ہے"

ایک دن بوڑھی لکشمی نے، ہانپتے کانپتے پنڈت جی سے آکر کہا۔ "تمہاری بھانجی.... مہاراج... ایک نوجوان سے محبت کرتی ہے"۔

پنڈت جی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ رنج و غصہ سے سانس نہ نکلتا تھا۔ آنکھیں آگ کے انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ ہاتھ سے چاندی کی گڑگڑی گر پڑی۔

جب ذرا حواس درست ہوئے تو چلّا اُٹھے۔

او سی کم بخت.... تم کیا بک رہی ہو.... اور خواہ مخواہ جھوٹ مت بولو۔ رام تمھیں غارت کر دینگے"۔

مگر بڑھیا نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:- پنڈت جی مہاراج، پرماتما مجھے کوڑھی کرے اگر میں جھوٹ بولوں۔ میں سچ کہتی ہوں۔ جب مہاراج ...... تمہاری بہن رات نیند کی گود میں سو رہی ہوتی ہے تو یہ سُندر لڑکی دبے پاؤں چوری چوری گھر سے باہر نکل جاتی ہے۔ اور دریا کے قریب اُس پاپی نوجوان سے جا ملتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم میرا یونہی اعتبار کر لو بلکہ رات خود اپنی آنکھوں سے بارہ اور دو بجے کے درمیان جا کر لیلا دیکھ لو۔

پنڈت جی لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے میں جلدی جلدی ٹہلنے لگے۔

آج دن پہاڑ ہو گیا۔ دیوی کی پوجا بھی یاد نہ رہی۔ کھانا بھی نہ کھایا۔ "میری بچی کو کوئی دھوکا دے رہا ہے۔ آہ اُسے پاپ کے غار میں دھکیل رہا ہے۔ بدنصیب.. ... ماں باپ سے پوچھے بغیر خود ہی رشتہ کر رہی ہے۔ دنیا کیا کہیگی، پنڈت جی کی بھانجی ....

رات دس بجے تو پنڈت جی نے ایک موٹا ڈنڈا اُٹھا لیا۔ اور باہر جانے کو اپنی قوت بازو کے آزمانے کا خیال آیا۔ پاس ایک چارپائی پڑی تھی۔ گھما کر ڈنڈا اُس پر اتنے زور سے مارا کہ چارپائی ٹوٹ گئی .... اور فاتحانہ انداز سے گھر سے باہر نکل آئے۔

باہر چاندنی کی نوری چادر چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آہا! چاندنی نے کیا جادو کر رکھا ہے۔ سیاہ درخت ... رنگین پھول .... دھانی کھیت۔ مندر کے سنہری کلس، غریب کی جھونپڑی۔ امیر کی حویلی .... سب یکساں نہا رہے ہیں۔ پھلوں سے لدے ہوئے درخت قطار در قطار کھڑے ایک دوسرے کے گلوں میں باہیں ڈالے خوشی سے جھوم رہے ہیں۔"

اِن خیالوں میں مگن پنڈت جی کو اپنی بھانجی بھی بھول گئی۔ جب کھلے میدانوں میں پہنچے تو ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ اور چاندنی کی بہار سے لطف اندوز ہونے لگے۔ پپیہے اور دور سے بلبلوں کی آواز دل میں موسیقی پیدا کر رہی تھی۔ آنکھیں نشۂ نیند سے مخمور ہونے لگیں۔

پنڈت جی چلے جا رہے تھے۔ ایشور جانے دل کیوں بیٹھا جا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی۔ جی میں آئی کہ یہیں بیٹھ کر اس سنسار کے مالک کی بھگتی کریں۔

آگے ایک گاتی اور ناچتی ہوئی ندی کے ساتھ ساتھ سفیدے کے درخت دست بستہ کھڑے تھے۔ اور پتوں میں سے چاندنی کی سنہری کرنیں چھن چھن کے ندی کے چمکدار موتیوں سے لپٹ رہی تھیں۔

پھر پنڈت جی رُک گئے۔ اور اُن کی روح کی گہرائیوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا ....

"ایشور نے یہ چاندنی رات کیوں بنائی ہے؟ رات تو سونے کے لئے ہے۔ سب کچھ بھول جانے کے لئے۔ اِن سے کیوں زیادہ پیاری ہے؟ صبح اور شام سے زیادہ سہانی، زیادہ دلکش، اور یہ چاند اس قدر حسین، اس قدر شاندار ..... سورج تو جُھلس دیتا ہے۔ دن کی روشنی میں یہ لطف کہاں! ... نازک نازک پھول۔ ہری ہری کونپلیں۔ ندی کی اُچھلتی ہوئی چاندنی، سب اس رات کی دلہن سے لپٹ جانے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ یہ خوش الحان پرندے ایسی رات میں کیوں نہیں

آرام کی نیند سو جاتے ؟ یہ کیسے گانا سنا رہے ہیں ؟ ؟
دُنیا نے یہ آدھا گھونگٹ کیوں لے رکھا ہے ؟ دل کیوں دھک دھک کرتا ہے ۔ روح کیوں تڑپ رہی ہے ؟ جسم پر کیوں کپکپی طاری ہے ؟ ؟
انسان کو یہ سندر رات کے جلوے دیکھنے کیوں نصیب نہیں ہوتے ؟ نیند انھیں اپنی گود میں کیوں سلائے رکھتی ہے ؟ یہ نظارے، یہ دلکش چھپے کس لئے ہیں ؟ نیلا آسمان کیوں حُسن برسا رہا ہے ؟
پنڈت جی حیران تھے ۔
دُور . . . . ندی کی دوسری جانب . . . .
دو درخت بغلگیر ہو رہے تھے اور اُن کے نیچے دو سائے ۔
مرد دراز قد تھا ۔ اور اپنی محبوبہ کے گلے میں باہیں ڈالے کھڑا تھا ۔ نوری پیشانی جو دیوی کے چرنوں میں ہزاروں بار جھک چکی تھی اُس کے بار بار بوسے لیتا ۔ اُنھوں نے اس بے جان منظر میں یک لخت جان ڈال دی ۔ یہی معلوم ہوتا تھا گویا دست قدرت نے خاص ان محبت کے متوالوں کے لئے یہ جوکھٹ بنائی ہے ۔ دونوں ہی اس دنیا کے باشندے تھے ۔ جن کے لئے یہ سحر آفریں سکون اور رات بنائے گئے تھے ۔ اور دونوں ہی پنڈت جی کی جانب خراماں خراماں بڑھنے لگے ۔ گویا پرماتما کی طرف سے پنڈت جی کے پرانے سوال ۔ ایشور نے یہ کیوں بنایا ہے ؟ کا مجسم جواب تھے ۔

پنڈت جی مُورت بنے کھڑے رہے . . . . . .
حیران و پریشان . . . . ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے ۔ دل دھک دھک کر رہا تھا . . . . . . او ہے بھگوان یہ کون ہیں . . . . . . کرشن مہاراج ! . . اور اُن کی رادھا ! ندیا کنارے اپنی پریم بنسری کا راگ چھیڑیں گے ؟
پنڈت جی کی رگ رگ میں خوشی اور محبت کی لہر موجزن ہو گئی ۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگے ۔
"شاید پرماتما نے اپنی دیا سے یہ راتیں اپنے بندوں کے پریم کی پردہ پوشی کے لئے بنائی ہیں "۔
پنڈت جی انھیں ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے آتے دیکھ کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گئے ۔ یقیناً اُن کی بھانجی تھی، مگر انہیں خیال پیدا ہوا کہ یہ کوئی پاپ نہیں کر رہی ۔ پاپن اور پاپی بھگوان کے دربار میں جہاں چندرما نے اپنی نورتر چادر بچھائی ہے ۔ جہاں بوڑھے بوڑھے درخت دربان بن کر کھڑے ہیں، جہاں کہ تر ندی ناچ رہی ہے، پرندے . . . . بھگوان کے گن گا رہے ہیں . . . . . کوئی پاپی نہیں ہوسکتا، یہاں میں ہی پاپی ہوں، یہ وہ مندر ہے جہاں بھگوان کی پوجا ہوتی ہے ۔ یہ پریم مندر ہے ۔ میرے یہاں پاؤں جل جائیں گے "۔
پنڈت جی درختوں کے پیچھے پیچھے ہوتے ہوئے سر پر پاؤں رکھ کر ایسے بھاگے کہ پھر مڑ کر بھی نہ دیکھا ۔
(خاص)

قلعۂ گولکنڈہ

(چند لمحے قلعہ گولکنڈہ کی ویران فضاؤں میں)

[جناب محشر عابدی آنریری ایڈیٹر سروش]

تک رہا ہوں کچھ عجب عالم میں قلعہ کے کھنڈر
اک سکوتِ مضمحل سا چھا رہا ہے قلب پر

شورشِ دنیا کے ہنگامے یہاں خوابیدہ ہیں
نغمۂ و مے کے پری خانے یہاں خوابیدہ ہیں

قہقہۂ امرار کے سب زمزمے خوابیدہ ہیں
رنجش و پیکار کے سب ہمہمے خوابیدہ ہیں

جوشِ نصرت اور دولت کی ہوس خوابیدہ ہے
رُوح دل خوابیدہ ہے تارِ نفس خوابیدہ ہے

جذبۂ تمکین و نخوت کا جہاں خوابیدہ ہے
ہر مکیں خوابیدہ ہے ہر اک مکاں خوابیدہ ہے

زندگی کی کشمکش، شوقِ بقا خوابیدہ ہے
ظلم و نفرت اور غم کا بھی خدا خوابیدہ ہے

سطح پر بحرِ اَلم کی بلبلے اٹھتے نہیں
قافلے ارمان و خواہش کے یہاں لٹتے نہیں

دھرم ہے عالم میں پتھر کے انھیں انبار کی
ہاں انھیں کہنہ، شکستہ سے در و دیوار کی

چپہ چپہ نشۂ عظمت سے یاں سرشار ہے
گوشہ گوشہ رزمِ شاہی کا علم بردار ہے

اب بھی ہر گل سے یہاں آتی ہے بوئے تمکنت
پتہ پتہ ہے یہاں کا رازدارِ سلطنت

اس پہ قرباں نوعِ انسانی ہوئی ہے بیشمار
اس کی خاطر خون کے دریا بہے ہیں لاکھ بار

مظہرِ شانِ شہی ہے قلعہ کا بالاحصار
اک فنا کا درس ہے جاہ و حشم کا یہ مزار

نازنیں شہزادیاں زینت دہِ گلزار تھیں
اِن ہی گلزاروں میں سجتی بزمِ بادہ خوار تھیں

حسرت اک پیہم ٹپکتی ہے در و دیوار سے
اک صدائے غم نکلتی ہے در و دیوار سے

سازِ عشرت میں نوا پیرا ہیں نغمے سوگوار
دامنِ اقبال ہے زد میں فلک کی تار تار

نغمۂ بہجت سے ہر دم گونجتی تھی جو فضا
اُس پہ ہر جانب سحابِ یاس ہے چھایا ہوا

قصر سب سنسان ہیں باغ و چمن ویران ہیں
بیگموں کے خوشنما اُجڑے پڑے دالان ہیں

ذرہ ذرہ میں صدائے دردیہ مستور ہے
یعنی جو پیدا ہوا مرنے پہ وہ مجبور ہے

پتہ پتہ اس چمن کا ہے سراپا اک زباں
جو نہاں خاموشی ہی میں ہے یوں افسانہ خواں

[بقیہ ۶۲۷ صفحہ پر دیکھئے]

سہیل یمن

یاد رفتگان

[جناب مولینا سید ظفر مہدی صاحب گہر ایڈیٹر رسالہ سہیل یمن لکھنؤ]

میرے زندگی کے روشن لمحات افکار و مصائب کے تاریک گھٹاوں سے دھندھلے ہو چکے تھے، اور میرے قلم کی گردشیں حوادث کی تیز تصادم سے مضمحل ہو چکی تھیں، نہ وہ اگلے سے محرکات باقی تھے جو میدان عمل کی خاک چھنوائیں اور نہ وہ پہلے سے جذبات ہی تھے جو معرکۂ صحافت کی یکہ تازی کو دوسروں سے منوائیں۔ میری نبض شاعری دود چراغ کشتہ تھی۔ اور میرا تخیل پریشانیوں کی منزل، ایسی صورت میں مضمون نگاری کیسی، اور شعر طرازی کیا، مگر بھلا ہو اُن لوگوں کا جنکے پے در پے خطوط اور پیہم اصرار نے راتوں کی نیند حرام کر دی۔ جناب منشی کنہیا لال صاحب ایڈوکیٹ مدیر رسالہ "چاند" کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے مجھ ایسے حیرت سامان کی پریشانیوں میں اس جمعیت خاطر کا اضافہ اپنے اصرار پیہم سے فرمایا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

تو کیا لکھوں، آجکل کی عریاں ادبیت میرے نزدیک بے نتیجہ اور تشنۂ انجام ہے، اسکے نگار خانۂ چین ہی کے لئے چھوڑئے ــــــ پھر کیا ــــــ یہی کہ ایک سلسلہ ایسا قائم کروں کہ دنیا ان گزرے ہوئے افراد کے کارناموں کو دیکھ کر اپنے معلومات میں اضافہ کرے اور جسمیں "ادب" اور تاریخ دونوں ہوں۔

شاعری اور اوسکے لوازم سے بحث نہ کرونگا کیونکہ یہ بحد سیراب ہے اور پھر تشنہ، ہے، اُن کا تذکرہ کروں گا جنکو دنیا بھول گئی اور اُنکے اُبھارے ہوئے نقوش ورق عالم کے ساتھ الٹ بھی گئے اور فنا بھی ہوتے جاتے ہیں۔

درحقیقت زبان اُردو فارسی شاعری اور فارسی زبان کی ممنوع احسان ہے، آج اگر وہ اپنا دامن کھینچ لے تو پھر ورق سادہ نظر آتا ہے، لہذا ان لوگونکا تذکرہ اس محل پر معیوب نہ ہوگا جنھوں نے اسمیں حصہ لیا۔

مجھے ان محققین سے بھی تعجب ہے جنھوں نے شعر العجم لکھتے ہوئے صرف مشاہیر شعرا کا خیال رکھا اور سیکڑوں ایسے آئینے جن پر زمانے کے انقلاب نے گمنامی کا غبار ڈال دیا تھا، اُنکو نظرانداز کر دیا، لہذا جو کچھ بھی لکھا گیا وہ غیر لبسیط اور تشنۂ ہل من مزید ہے۔

ضمیری کی شاعری

شہر اصفہان میں اس شاعر کی ولادت ہوئی انکا نام کمال الدین حسین تھا، انکا کلام پاکیزگی جذبات

نمکینیٔ کلام، شیرینیٔ مذاق، سلاست بیان، باریکی مضامین، اور ظرافت طبع کا ایک بسوط مجموعہ تھا، چونکہ علم رمل کے ماہر تھے لہذا اسی مناسبت سے اپنا تخلص "ضمیری" رکھا۔ آپ کے تصنیفات کی فہرست طویل ہے مگر افسوس ہے کہ آج انمیں سے ایک کا بھی پتہ نہیں۔ ان کی چھ مثنویاں حسب ذیل تھیں۔

ناز و نیاز۔ بہار و خزاں۔ وامق و عذرا۔ لیلیٰ و مجنوں۔ حسنۃ الاخبار۔ سکندر نامہ۔ آپ کا مدون کلام بڑی جستجو کے بعد سات دیوانوں میں منقسم ہوکر پایا جاسکا جنکے نام یہ ہیں اور جو مفقود ہیں۔ سفینۂ اقبال، صورت حال، کنز الاقوال، عشق بیزوال، صیقل ملال، عذر مقال، قدس خیال۔

اسکے علاوہ بھی سعدی کے کلام کے مقابلہ میں انھوں نے چار دیوان مرتب کئے جو طاہرات، صنائع بدائع الشعر، اور نہایۃ السحر کے نام سے موسوم ہوئے۔

یونہیں خواجہ حافظ کے دیوان کے مقابلہ میں ایک دیوان مرتب کیا جسکا نام "عیون الزلال" رکھا۔ آصفی مروی کے دیوان کے مقابلہ میں جو کلام تھا اُسکا نام "سحر حلال" رکھا۔ بابا شہیدی قمی کے کلام کے مقابلہ میں جو دیوان تھا اُسکا نام "خجستہ فال" رکھا، امیر ہمایوں اسفرائنی کے دیوان کا مقابلہ "لوامع خیال" سے کیا، مرزا اشرف جہاں کے دیوان کا مقابل، دیوان "ہدایت وصال" کو بنایا، "منتہائے کمال" اس دیوان کا نام رکھا جو کمال خجندی کے مقابلہ میں لکھا، اور امیر خسرو دہلوی اور میر حسن دہلوی کے مقابلے میں جو دو دادین مرتب کئے اُن کا نام "معشوق لایزال" اور "حسن مآل" رکھا۔

غرضکہ اسقدر مبسوط کلام اور مصنفات کا پتہ چلتا ہے کہ انسان کی عمر انکے دیکھنے کے لئے کافی نہیں ہوسکتی انکی پُرگوئی اور ان کا زور کلام تبادیہ مراد و معانی انکے اشعار کے دیکھنے سے واضح و آشکار ہے یہاں چند شعر ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

ایک جگہ پر برگشتگی قسمت اپنوں کی بیوفائی، آہ کا الٹا اثر، اور ناکامی دل کو اس پیرایہ میں بیان فرماتے ہیں۔

سیلاب سرشک از در ادمی بردم آہ
عمرے اثر گریہ بے حاصلم این است

کہیں معشوق کی بیوفائی اور اپنی وفا کا تذکرہ اس انداز سے ہوتا ہے کہ اس سے بہتر طریقہ ادا ناممکن ہے، فرماتے ہیں۔

ہرگاہ میسر و م کہ شکایت کنم ز تو
چوں گوش میکنم بزبانم دعائے تست

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ محبوب دوسرے کا غصہ اس پر اُتارتا ہے، جسکو سمجھتا ہے کہ یہ میرے بار ناز کا متحمل ہے، اس مطلب کو یوں ادا کرتے ہیں۔

رود یا دیگراں درخشم و برمن دامن افشاند
غبار در دل از ہر کس کہ دارد برمن افشاند

کبھی تسلی یاس اور تسکین نومیدی کے لئے حسن تعلیل سے یوں مدد لیتے ہیں۔

شادم کہ دادۂ وعدہ بفردا سے محترم
کاں روز ہیچ وعدہ بفردا نمی شود

کبھی جذبات صحیح عشق اور واردات قلب اور واقعہ نگاری پر یوں صیقل کرتے ہیں کہ دل اس کے باریکی

معانی سے عمدہ برآنہیں ہوسکتا۔ فرماتے ہیں۔

فریاد ازاں لحظہ کہ در دلم آن شوخ
پرسد زمن و قوتِ گفتار نباشد

کبھی معشوق کی بیوفائی کو وفا کے سانچے میں ڈھال کے صورت تسکین پیدا کرتے ہیں۔

نہ دادہ وعدہ وصلم بروز حشر ضمیری
زبیم آنکہ مبادا امید وار بمیرم

کبھی ناکام حسرت بنکر نامرادی کا ماتم کرتے ہیں اور کچھ اس انداز میں جذبۂ دل کا اظہار ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ فرماتے ہیں۔

علاج درد ضمیری نہ شد نمی دانم
کہ گفتہ بود کہ دردش دوا پذیر مباد

معشوق کا اخلاق یاس انجام اور محبوب کا بعد وفا بے وفا ہوجانا پہلے کرم والطاف دلچسپ نظارے پھر دلشکن عدم التفات کے نتائج، اس پیرایہ میں بیان کئے جاتے ہیں جو محبوب کے کیرکٹر پر یا یوں کہوں کہ فطرت معشوق پر روشنی ڈالتے ہیں، درحقیقت ضمیری سے بہتر آج تک اس مطلب کو کسی شاعر نے نہیں ادا کیا، چنانچہ کہتے ہیں۔

چو می بینم کسے از کوے او دل شاد می آید
فریبے کز وے اول خوردہ بودم یاد می آید

اس شعر کو بعض نامور مورخین نے نظیری کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ یہ ایک بڑی لغزش ہے درحقیقت یہ شعر ضمیری کا ہے ایسی لغزشیں ایک تیر دل اور جسور محقق و مورخ سے بکثرت ہوئی ہیں، انشاء اللہ کبھی وقت آئیگا کہ وہ اولی دنیا کے سامنے پیش کی جائیں۔

(خاص)

[صفحہ ۴۲۱ کا بقیہ]

دیدۂ بینا اگر ہے نور سے دیکھو ہمیں
لوحِ دل پر نقش کرلو، تم سے جو کچھ ہم کہیں

اک زمانہ تھا کہ ہم میں تابش و تنویر تھی
ہستیٔ ناچیز رخشاں حُسن کی تصویر تھی

ہم نے دیکھا ہے عروج و عظمتِ صد تاجدار
اور دلکش محفلیں رنگ و طرب کی بیشمار

دبدبہ اور رعب سے جنکے لرزتا تھا جہاں
جنکے غصہ سے سہم کر کانپتے تھے آسماں

عظمتوں کے کارنامے جنکے سب بیدار ہیں
حکمرانی کے فسانے جنکے سب بیدار ہیں

آج لیکن تاجور اور تخت وہ باقی نہیں
مٹ گئی سب شان و شوکت وہ شہنشاہی نہیں

وہ نگاریں قصر سارے ہوگئے معدوم اب
قلعہ اور اُس کے نظارے ہوگئے معدوم اب

بعض گنبد کہہ رہے ہیں یہ زبانِ حال سے
عارضی تھی ان کی ثروت عارضی اقبال تھے

اے بشر تجھ میں نہاں ہے جاودانی زندگی
دہر کی رنگینیاں ہیں ایک فانی زندگی

ساتھ تیرے کچھ سوا نیکی کے جاسکتا نہیں
سرمدی، فانی کو تو، ہرگز بنا سکتا نہیں

(خاص)

سیاست

کامریڈ لینن

محسن عالم

[جناب حکیم مظفر حسین اجہر دہلوی سابق ایڈیٹر ریاست]

تختۂ مشقِ ستم ، سرمایہ کا مزدور تھا — روس کیا ؟ سارا جہاں ہی ظلم سے معمور تھا
کیا بتاؤں ! کیا تھی دنیا سے زبوں کی کیفیت — حیف ! وقفِ جبر و استبداد تھی انسانیت
دفعتاً لینن کے دل میں درد انسانی اٹھا — حال اہل مزد کا اس سے نہیں دیکھا گیا
زر پرستوں کے مقابل آ ڈٹا بس وہ جری — اس نے اہل مزد کی ، دہقان کی تنظیم کی
رشاہی" نے باندھی ظلم پر کس کر کمر — خیر اب اس کو حکومت نہ آتی تھی نظر
دوستوں نے اس کے جھیلیں ! آہ کیا کیا سختیاں — قید کاٹی ، اور پائیں اکثروں نے پھانسیاں
آہ کیا کیا ظلم اس محبوب انساں پہ ہوا — آخرش لینن کو بھیجا زار نے سیبریا
کون واقف ہے کہ زار روس نے کیا کیا کیا — قدرت حق کو مگر کچھ اور ہی منظور تھا
دفعتاً کھایا جو پلٹا انقلاب دہر نے — زار کو غارت کیا فوراً خدا کے قہر نے

روس میں لینن کا تازہ شان سے جھنڈا اٹھا
بول بالا ہو گیا دنیا میں بس مزدور کا

(خاص)

[صفحہ ۶۰۹ کا بقیہ]

پرہیں لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اپنے گذشتہ زمانے کی خدمات کا اعتراف کریں اور آیندہ کے لئے اپنے فرائض کو پہچانیں۔ ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اچھائیوں کو ترقی اور برائیوں کو دبائیں۔ تاکہ انسانی نسل کا مستقبل ہمارے ہاتھوں سے تباہ نہ ہو۔ نفس پر فتحیابی کا ذریعہ اطاعت مندی ہے اور اطاعت مندی علم سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس کا علم ہے کہ ایک انسان دوسروں کی زندگی کو خوشگوار اور پریشان بنا سکتا ہے ہم میں صحیح کام کی رغبت پیدا نہیں کر سکتا تو پھر اور کوئی طریقہ نیک کام کی رغبت دلانے کا نہیں ہو سکتا۔ زندگی بعد موت کی جزا اور سزا کا یقین بھی اب انسان میں دن بدن کم ہو رہا ہے۔ ان کے دور ہونے سے اُن کی قوت کو گھٹا دیا ہے۔ زندگی کیلئے چھوٹے چھوٹے اصول کافی ہیں۔ تمام قوانین اور تمام علم اخلاقیات کے سبق اس زریں اصول میں پوشیدہ ہیں کہ اگر انسان اپنے ضمیر کے ساتھ سچا ہے تو وہ دوسروں کے ساتھ بُرا نہیں ہو سکتا ۔

(خاص)

قلب انساں کے لیے جو باعث تسخیر تھا
حسن [illegible] کا وہ پہلا تیر تھا

شاعر

حُسن کا پہلا تیر

(متعلق تصویر)

(جناب منظر صدیقی، اکبرآبادی، ایڈیٹر "شاعر" آگرہ)

جب مذاقِ آدمیت میں خلش پیدا نہ تھی
جب دلوں میں درد کی کوئی روش پیدا نہ تھی
لذتِ بیداد سے جب آدمی واقف نہ تھا
"ہائے و ہُو" سے جب نظامِ زندگی واقف نہ تھا
جب فقط پھولوں کی خوشبو مایۂ تفریح تھی
فطرتِ خارِ محبت تشنۂ تشریح تھی
جب چمن میں پھول تھے اور نہ تھا ان میں گداز
تھی صدائے نغمہ لیکن سوزِ غم سے بے نیاز
جب نہ تھا آگاہ کوئی درد کی رُوداد سے
کان تھے ناآشنا ہنگامۂ فریاد سے
دل تھے سینوں میں مگر، ان میں کوئی جذبہ نہ تھا
زندگانی تھی مگر، اسمیں کوئی جلوہ نہ تھا
جب نہ تھی پرواز کی طاقت تخیُّل کے لئے
کوئی دامن تھا نہ اشکوں کے تحمل کے لئے
جب نہ تھی خلوت کدوں میں کیف و رعنائی کی بُو
تھے سبُو، لیکن نہ کرتا تھا کوئی اُن سے وضو
کائناتِ سادہ سادہ تشنۂ جذبات تھی
روح پر ہر وقت طاری اک اندھیری رات تھی

دفعتًا انگڑائی سی لی عظمتِ تخلیق نے
درد کی بنیاد ڈالی فطرتِ تخلیق نے
عشق کا ناوک ڈبو کر روح میں انسان کی
بجلیاں چمکائیں سینوں میں انوکھی شان کی
آدمی کو کر دیا لذت شناسِ زندگی
حسن کو پہنا دیا رنگیں لباسِ زندگی
تیراندازی کے جذبے حُسن پر طاری کئے
درد کے پیغام بزمِ عشق میں جاری کئے
حُسن کا چہرہ خطوطِ رنگ و بُو سے بھر دیا
آئینے کو پھول کلیوں کا مرقع کر دیا
بخشدیں رعنائیاں ہر پیکرِ معصوم کو
کر دیا وابستہ اُن سے عشق کے مقسوم کو
بے حجابانہ شبابِ حُسن و رعنائی بڑھا
انجمن در انجمن لے لے کے انگڑائی بڑھا

حُسنِ غارتگر جب اس ترکیب سے قائل ہوا
ہستیٔ عالم کی جانب ناگہاں مائل ہوا
تیر تاروں سے لئے اور چاند سے مانگی کماں
اس ادا سے پھر نظر آیا قریبِ کہکشاں
بزمِ عالم پر نظر کی، کھینچ کر اک تیر کو
کر لیا آخر ترازو عشق کی تصویر کو
حُسن نے اک تیر پھینکا آزمانے کے لئے
تھا وہی کافی مگر سارے زمانے کے لئے
ہوگیا انسان لذت آشنائے دردِ دل
شب کی خاموشی میں گونج اُٹھی صدائے دردِ دل
خلش ہر دل میں تھی، دل تھا خلش اندوزِ عشق
ناوکِ دلدوزِ حسن و سینۂ پُر سوزِ عشق

قلبِ انساں کے لئے جو باعثِ تسخیر تھا
حُسن کے رنگین ترکش کا وہ پہلا تیر تھا

(خاص)

شعاع

تابش جمال

(جناب جگیشور ناتھ ورما، بیتاب سابق جوائنٹ ایڈیٹر شعاع بریلی)

جھٹپٹے کا وقت ہو اور ڈوبتا ہو آفتاب
آتی ہو لیلائے شب بھی اوڑھ کر کالی نقاب
اور شکستہ جھونپڑے میں کوئی مجنوں بھی کہیں
منتظر ہو دمبدم بڑھتا ہو اس کا اضطراب
کرمک شب تاب اُڑ کر یک بیک ہو شعلہ بار
ہنس پڑے ناکام الفت دیکھ کر دیوانہ وار
آہ! بساط نیلگوں سے دھندلے تارے ٹوٹ کر
پھر بڑھا دیں دل جلے شوریدہ سر کا انتشار
زرد رد آغوش گردوں میں ہو لرزاں ماہتاب
چاندنی کی سرد لہریں کھا رہی ہوں پیچ و تاب
طالب دیدار جاناں کا مگر ہو رنگ غیر
اُس کی نظروں میں یہ منظر آہ ہو مثل حباب

(قطعہ بند)

زار و گریاں حسرت و غم کا چڑھا کر اک ایاغ
تھرتھراتے ہاتھ سے روشن کرے ٹوٹا چراغ
ڈالے زلف عنبریں شانوں پہ کالے کی طرح
نازنیں اک آ کے کر دے مضطرب کو باغ باغ
چشم مجنوں ٹھہر جائے سامنے اس کے محال
تاب کس کی ہے کہ دیکھے تابش حسن جمال

(خاص)

وشواش

منزل کا پتہ ملتا نہیں

(جناب لالہ امرناتھ سیٹھا ایڈیٹر روزانہ "وشواش" دہلی)

کون کہتا ہے کہ محنت کا صلہ ملتا نہیں
ڈھونڈھنے پر آئے جب انساں تو کیا ملتا نہیں
ہیں سر منزل مگر سودائیان جستجو
پھر بھی کہتے ہیں کہ منزل کا پتہ ملتا نہیں
کل تھا اٹھا ولولہ جس دل میں ہائے آج وہ
ڈھونڈھتا ہوں اس کو میں اس کا پتہ ملتا نہیں
رنگ لائے گی کسی دن یہ تو محنت آپ کی
اس گھڑی مانا کہ کوئی آسرا ملتا نہیں
مت ذرا گھبراؤ ہو گر راہ سے بھٹکے ہوئے
خضر مل جاتے ہیں جس کو راستہ ملتا نہیں

(خاص)

صبح بنارس

گورِ غریباں

(جناب نواب سید اسد اللہ خاں صاحب شوق سابق رکن ادارہ اخبار صبح بنارس)

چشم عبرت سے ذرا دیکھو سوئے نقش و نگار ؛ آپ ہو جائے گا روشن کہ دو روزہ ہے بہار
غور سے کیجئے تو گورِ غریباں ہے نظر ؛ ذرہ ذرہ میں تڑپتے ہیں ہزاروں دل زار
جھاڑ کانٹوں کے اوگی ہیں سرِ بالیں اُن کے ؛ جو شب و روز کیا کرتے تھے سیر گلزار
کہیں اکھڑے ہوئے تعویز لحد کے ہیں پڑے ؛ دل صد چاک کی صورت کہیں تربت ہیں فگار
داغ حسرت کہیں ٹوٹے ہوئے رکھے ہیں چراغ ؛ کہیں بکھرے ہوئے پروانوں کے پر عبرت زار
دل کے ذروں کی نمائش ہے کہو نہیں کہیں ؛ استخواں سے کہیں رہ رہ کے نکلتے ہیں بخار
بے ثباتی کہیں مدفن ہے لحد پر آ کر ؛ سوزش غم سے کہیں شمع لحد پر خونبار
بیکسی خاک اُڑاتی ہے کہیں تربت پر ؛ برگ خشکیدہ چڑھاتی ہے کہیں باد بہار
ہو گئی چاند سی وہ شکل تہ خاک نہاں ؛ سامنے رکھ کے جو آئینہ کو کرتے تھے سنگار
ایک حالت میں بسر کرتے ہیں سلطان و گدا ؛ کوئی محکوم کسی کا نہ کسی کا سردار
انقلابات زمانہ سے یہ دل مردہ ہیں ؛ صبحدم بھی کبھی سبزہ کو نہ دیکھا بیدار
نہ تو آئینہ کی حاجت ہے نہ شانہ سے غرض ؛ ساری آرائشیں دنیا کی یہاں ہے بیکار
مسکرا کر لب خاموش سے گُل کہتے ہیں ؛ کیا ہوئی آج تمہارے وہ جوانی کی بہار
صاحب قبر سے یہ دیکھ کے پوچھا میں نے ؛ خواب راحت میں ہو مدہوش کہ کچھ ہو ہشیار

کبھی آتے ہیں اس عالم میں نظر شمس و قمر ؛ شمع جلتی ہے کبھی رہتا ہے یا تیرہ و تار
کیسی آبادی ہے کیسی ہے یہاں کی خلقت ؛ پھول کس رنگ کے کیسے ہیں یہاں کے گلزار
ملنے جلنے کیلئے آتے ہیں احباب کبھی ؛ کون دیتا ہے تجھے آب و غذا اے غمخوار
آئی آواز کہ سب حال ہے تجھ پر روشن ؛ بس کہ ناگفتہ ہیں اے دوست یہاں کے اسرار
ہمنشیں ہے کوئی اپنا نہ انیس و ہمدم ؛ ساتھ ہیں اپنے عمل اور لحد تیرہ و تار
یاد تو ہوگی تجھے وہ مری نازک بدنی ؛ ہار بھی پھولوں کا ہوتا تھا وہاں مجھ پہ بار
جانتا خوب ہے تو سب وہ نفاست میری ؛ صاف پوشاک بدلتا تھا میں دن میں کئی بار
بال اُلجھے ہوئے ہیں کون کرے شانہ کشی ؛ نہ تو مشاطہ ہے کوئی نہ کوئی آئینہ دار
پرسش اعمال کی اور قبر کی وہ تاریکی ؛ یہ سمجھتے تھے ملیگا ہمیں مرتے پہ قرار
شمع تربت ہے نہ کچھ پھول کی چادر سے غرض ؛ ہم نے مانا کہ لحد پر ہے گلوں کا انبار
ڈال دے لا کے کوئی پھول کی چادر ہے کیا ؛ اپنے اجڑے ہوئے گلشن میں آئیگی بہار
شمع بالیں پہ جو جلتی ہے جلیگی کب تک ؛ وہ بھی ہو جائے گی رو رو کے سحر تک بیکار
غیر تو غیر ہے اپنوں کی پھری ہیں آنکھیں ؛ فاتحہ کو کوئی آئے یہ بہت ہے دشوار
نہ ہمیں تاب سخن تم کو نہ فرصت اتنی ؛ کہ کروں حال گذشتہ کا کچھ اپنے اظہار
لیکن اے دوست مری تجھ سے غرض ہے اتنی ؛ فاتحہ پڑھ کے مری قبر پہ جانا اک بار
بات رہ جائے گی اور وقت گذر جائے گا ؛ کہ زمانہ کو نہیں ہے کسی صورت سے قرار
جانتے سب ہیں کہ انجام یہی ہے سب کا ؛ کیسی غفلت ہے کہ اب بھی نہیں ہوتے بیدار

(خاص)

صحیفہ

رباعیات

[جناب میرزا یگانہ لکھنوی سابق ایڈیٹر "صحیفہ" و "اودھ اخبار" لکھنؤ]

دل کے ہاتھوں خراب رہتے ہی بنی ۔ افتاد پڑی جیسی سہتے ہی بنی
ہم تیری تلاش میں کہیں کے نہ رہے ۔ کعبہ کو بھی خیر بات کہتے ہی بنی

ولہ
مر مر کے مسافر سر منزل پہونچا ۔ پہونچا تو سہی مگر بہ مشکل پہونچا
دیکھے کوئی اس درد طلب کی پرواز ۔ دل ایک تڑپ میں تا در دل پہونچا

ولہ
دل تھا غنچہ مگر بکسنے کے لیئے ۔ ہنستوں کو دیکھکر ترسنے کے لیئے
کھلنے کی ہوس میں اور چہرہ بگڑا ۔ منہ چاہیئے کھل کھلا کے ہنسنے کے لیئے

ولہ
دکھ درد کے ماروں کا نصیبہ جاگا ۔ گھر بولتا ہے آج دلدّر بھاگا
دن کاٹے ہیں گن گن کے اسی دن کیلیئے ۔ ساجن آتے ہیں راستا دے کاگا

ولہ
آرام سے سوتا ہے کوئی کمل میں ۔ منگل کوئی گاتا ہے پڑا جنگل میں
میں ماہی بے آب مجھے چین کہاں ۔ اک موج پریشاں ہوں عجب ہلچل میں

ولہ
کرنا جو کچھ تھا کرچکے اپنے حساب ۔ بھرنا جو کچھ تھا بھر چکے اپنے حساب
اب دل ہی نہیں تو موت کا ڈر کیسا ۔ مرنا برحق ہے مرچکے اپنے حساب

(خاص)

[صفحہ ۳۵۷ کا بقیہ]

اور زنجاری بھی رکھتا ہے۔ جو کہ اس سے صرف اسکی ذات کسی طرح محبت کرتے ہیں۔ اس کے وعدوں کیلیئے نہیں۔ اس کی سنگین ضرب جب انھیں گرا دیتی ہے۔ تو یہ اس کی پرستش میں سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ یہ معبود بیرحمی سے انھیں تلاش برباد بناتا ہے۔ اور وہ الزام اپنے سر تھوپتے ہیں۔ اپنے دیوتا پر نہیں۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ میں بری طرح کھیلا۔ اپنی ذات کو وہ نکتہ چینی کا مورد بناتے ہیں۔ مگر اپنے خدا کے خلاف ایک حرف بھی زبان پر نہیں لاتے۔ (خاص)

صوفی

آپ بیتی

[جناب محمد الدین ایڈیٹر "صوفی" پنڈی بہاؤالدین]

میری زندگی بہت سے نوجوان کیلئے سبق آموز ثابت ہوگی۔ اسلئے کسی مضمون لکھنے کی نسبت میں اپنے حالات بعض اندراج بھیج رہا ہوں۔ میں خود ساختہ یا آدمی ہوں گو میرا عقیدہ یہ ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور کوئی آدمی اپنی شاندار مستقبل کو خود نہیں بنا سکتا لیکن یہ امر علیحدہ بحث طلب ہے۔

میں ضلع گجرات کے ایک گاؤں کلاں میں جون ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوا۔ بچپن میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مکانات اور زرعی آراضی دریائے چناب کی سیلاب و طغیانی کی نذر ہو گئے۔ اور میں بالکل بے دست و پارہ گیا مڈل کے امتحان میں پنجاب بھر میں اول رہا۔ اور سرکاری وظیفہ حاصل کر کے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا۔ اپنی تعلیم کے دوران میں گھر سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ کیونکہ والدین زندہ نہ تھے اور گھر و بار برباد ہوگیا تھا۔ جب دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ تو عبدالرحمٰن مرحوم کے حالات زندگی اردو میں لکھے۔

امیر مرحوم کے میر منشی چودھری سلطان محمد خاں بیرسٹر کابل سے بھاگ کر آئے تو ان کے پاس امیر مرحوم کے حالات کے نوٹ تھے۔ جو ان کے برادر چودھری ضیاء الدین صاحب کی مہربانی سے جو میرے کلاس فیلو تھے۔ مجھے ۴۰ گھنٹہ کے لئے عاریتاً ملگئے انکی مدد سے میں نے امیر عبدالرحمن والی افغانستان کے حالات پر ایک کتاب لکھی جو $\frac{۳۰×۲۲}{۱۶}$ کے قریباً ڈیڑھ سو صفحوں پر اخبار عام نے جو اس زمانہ میں پنجاب صرف واحد روزانہ اردو اخبار تھا کتاب کا حق تصنیف لیکر آٹھ سو روپیہ ملا۔ یہ میری پہلی تصنیف اور امیر صاحب کے متعلق پہلی کتاب تھی۔ جو چھپ کر شایع ہوئی۔ اسکے بعد اسکے متعدد شایع ہوئے اور پھر انگریزی اور اسکے بعد فارسی اور اردو زبانوں میں مختلف لوگوں نے آپ کے حالات لکھے۔ طالب علمی کے ایام میں اخبار عام کے کئی انگریزی مضامین کے تراجم اجرت پر کر کے اپنا خرچ چلاتا تھا۔

تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے ایک معمولی سی سرکاری ملازمت کر لی۔ لیکن اسکو اپنے طبیعت کے موافق نہ پاکر مستعفی ہوگیا۔ اور اخبار ہندوستان کے دفتر میں لالہ دینا ناتھ جی کے ساتھ بصدارت ایڈیٹر کام کرنے گیا۔ چند یوم کے بعد مجھے اخبار کا منیجر مقرر کیا گیا۔ یہاں مجھے ایک دوست نے آب حیات کا نسخہ بتایا۔ لالہ دینا ناتھ جی کی اجازت سے میں نے اپنا کام بھی ساتھ ساتھ شروع کر دیا۔ تین ماہ کے بعد میرے پاس ایک ہزار روپیہ جمع ہوگیا۔ اور میں نے ہندوستان کی منیجری لالہ دینا ناتھ جو ایڈیٹر دفتر ہمانہ ہندوستان کے مشورہ سے آپکے چھوٹے بھائی کے حوالہ کر کے خورشیدی

غیاث الدین میں آب حیات کا کام جاری کیا۔ اور تین روپیہ ماہوار کا ایک مکان کرایہ پر لیا۔ پہلے میں اپنے کام کا خود ہی مالک۔ خود ہی کلرک خود ہی بیرا اور چپراسی تھا۔ آج کے سے قریباً پچیس ۲۵ آدمی میرے دفتر میں کام کرتے تھے آب حیات کی کامیابی سے مجھے اپنا علیحدہ پرچہ جاری کرنیکا خیال پیدا ہوا۔ اور جنوری ۱۹۰۹ء میں صوفی جاری کیا۔ ابتدا میں ملک کے تمام مشہور مضمون نگار اسمیں مضمون لکھے تھے۔ کیونکہ زمانہ خوبی اور صوفی ہی قابل ذکر پرچے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں صوفی کی مستقل اشاعت دس ہزار ہوگئی۔ کہیں پر متعدد پرچے نکلتے جانے سے اسکی اشاعت کو بہت نقصان پہونچا۔ لیکن پھر بھی پانچ ہزار چھپتا ہے۔ میرے آب حیات اور صوفی کی آمد سے قریباً دس ہزار روپیہ کی آراضی خریدی گئی کچھ مکانات بنوائے ملک محمد اسلم صاحب کو تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجا۔ جہاں سے وہ کیمبرج یونیورسٹی کا ایم۔ اے اور اید نبرا کا بیرسٹر ایٹ لا ہو کر پچھلے سال واپس آیا ہے۔

میں خود اس پچاس سال کی عمر میں بھی اسی طرح محنت کرتا ہوں جیسا کہ جوانی میں محنت کرتا تھا۔ گرمیوں میں بھی رات کو مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا کام کرتا تھا۔

۱۹۲۶ء میں میں نے صوفی پرنٹنگ کمپنی اینڈ کو کے نام سے ایک تجارتی فرم قائم کیا۔ جس نے بہت سے مفید کتابیں شایع کیں۔ اور ملک کے تمام اخبارات اور جرائد اور بڑے آدمیوں سے اپنی مفید خدمات کی وجہ سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ۱۹۲۸ء میں اس کمپنی کی ایک شاخ لاہور میں قایم کی گئی جہاں آتشزدگی سے کئی ہزار کا مال جل گیا اور کمپنی کے کاروبار کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔ خدا کرے یہ کمپنی جلد پھر سے اپنی سابق حالت پر آجاوے۔ میری کامیابی میں خدا کے فضل کے ساتھ میری شبانہ روز محنت اور استقلال کو بہت کچھ دخل ہے۔ آج کل میں عدالت پنچایت اور لوکل زمیندار بنک کا پریسیڈنٹ کواپریٹو کمیشن شاپ کا منیجنگ ڈائرکٹر اور اپنے شہر کا میونسپل کمشنر ہوں۔ (خاص)

قماربازی

[مترجمہ ملک محمد اکرام خاں (مرحوم) سابق ایڈیٹر "صوفی"]

قمار باز کیلئے قمار بازی روح رواں اور سرچشمۂ حیات سے کم نہیں۔ اسکے لئے یہ ایسی ہی اہم اور ضروری شئے ہے جیسے عاشق کیلئے معشوق اور مے خوار کیلیے شراب۔ کچھ لوگ قمار بازی کا حلف اسطرح اٹھاتے ہیں جسطرح کہ عشاق محبت اور وفاداری کا۔

مجھے یہ علم نہیں کہ کس شخص نے دو جہاز رانوں کے قصہ کو ایجاد کیا جو کہ جوا کھیلنے کے اتنے مشتاق تھے۔ کہ جب ایک مرتبہ ان کا جہاز غرق ہوگیا۔ اور وہ بے شمار مصائب کا سامنا کرنے کے بعد ایک دیل مچھل پر سوار ہونے میں کامیاب ہوئے تو جونہی وہ وہاں بیٹھے۔ انہوں نے کھیلنے کا سامان جیبوں سے نکالا اور کھیلنا شروع کر دیا۔ اس قصہ میں اصلیت سے بھی زیادہ سچائی ہے۔ ہر ایک جوا باز ان جہاز رانوں کی مانند ہے۔

دراصل کھیل میں ہی کوئی ایسا راز پنہاں ہے۔ جو جری اشخاص کے جذبات کو نہایت شدت سے برانگیختہ کرتا ہے کیا دوست کو دعوت دینا کوئی معمولی سی خوشی ہے۔ کیا یہ خوشی کیف و لذت سے خالی ہو سکتی ہے۔ جبکہ کھلاڑی

ایک سکینڈ میں سال ہا سال بلکہ عمر بھر کے امید وبیم کے خطرات کی منازل طے کر دیتا ہے۔

میری عمر ابھی دس سال کی نہیں تھی۔ جبکہ ہماری چوتھے کلاس کے ماسٹر ایم۔ گریپی نیٹ نے ہمیں آدمی اور جن کا افسانہ پڑھکر سنایا۔ اب بھی مجھے یہ قصہ اسی طرح یاد ہے۔ جیسے کہ میں نے اسے کل ہی پڑھا تھا۔

جن ایک لڑکے کو دھاگے کا گولا دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہ تمہارا رشتۂ حیات ہے۔ اسے پہن اور جب تمہیں کسی مصیبت کا سامنا ہو۔ اسے نکالو اور کھولنا شروع کرو کہ تمہارے دن جلدی یا آہستہ اسی نسبت سے گذر ینگے جسطرح کہ تم اسے جلدی یا آہستہ کھولوگے۔ لیکن اگر تم اس سے کام نہیں لوگے تو تمہاری عمر میں کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوگی۔ لڑکے نے دھاگا لے لیا۔ اور اسے کھولا۔ وہ فوراً عالم شباب میں پہنچ گیا۔ پھر اسنے اور زیادہ کھولا اور اپنی محبوبہ سے شادی کرلی۔ اسکے بعد اسنے اور زیادہ کھولا تو اپنے بچوں کو عالم شباب میں عزت وشہرت حاصل کرتے دیکھا۔ مصائب اور بیماری کا زمانہ ختم کرنے کیلئے پھر اسنے کھولا تو اپنے کو عالم پیری میں پایا۔ جن سے ملاقات کے بعد وہ صرف چار ماہ اور چھ دن زندہ رہا۔ ہاں تو یہ کھیل کیا ہے۔ ایک فن ہے جو کہ ایک سکینڈ کے اندر ایسے ایسے تغیرات عمل میں لاتا ہے۔ جن سے تقدیر گھنٹوں۔ مہینوں۔ اور سالوں میں عہدہ برآ ہوسکتی ہے۔ یہ ایک ہنر ہے جن سے عمر بھر کے منتشر جذبات و حسیات ایک لمحہ کے اندر یکجا جمع ہوجاتے ہیں۔ چند لمحوں میں تمام عمر زندگی بسر کرنے کا یہ ایک بھید ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جن کے دھاگے کا گولا ہے۔ کھیل کیا ہے قسمت سے سینہ بہ سینہ جنگ ہے۔ اس میں متنازعہ چیز روپیہ ہوتا ہے۔ جو کہ تھوڑے عرصے میں ہر شے کا آرام و آسائیش بہم پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ ہر کھیلاڑی کا یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید دوسرا کارڈ تبدیل ہو اور گیند اسطرح گردش کرکے کہ اسے باغات۔ جنگلات۔ محلات۔ قلع اور جاگیرین مل جاویں۔ ہاں اس چھوٹے سے گیند کے رقص کے اندر وسیع جاگیرین اور فلک پوش محلات پنہاں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسکے اندر خزانہ ہائے فن و ہنر۔ بیش بہا اشیا اور گراں بہا جواہر موجود ہیں۔ نہیں بلکہ اس کے اندر اس سے بھی زیادہ نعمتیں موجود ہیں۔ اس کے اندر ان سب چیزوں کا خواب اور پیشنگوئی میں موجود ہے۔ اور آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے کھیلنا چھوڑ دوں کھلاڑی کو کھیل اگر غیر محدود امید بن ملاتا رہتا۔ اور ہر بار اس کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا کرتا۔ تو یقیناً اس سے ایسی مجنونانہ محنت نہ کی جاتی۔ لیکن اس کے ناخن آہنی ہیں۔ یہ ظالم اور خوفناک ہے۔ معمولی سی ادا پر اس کا عطیہ مفلسی۔ بربادی اور رسوائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکے پجاری اس کی پرستش کرتے ہیں۔ تمام زبردست ارادوں اور خواہشوں کی تہ میں خطرہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو دلکشی کا سبب ہوتا ہے۔ مسرت کبھی تکمیل نہیں پاسکتی جب تک کہ قصر مذلت پیش نظر نہ ہو۔ قعرے اور مسرت کی آمیزش ہی مخموری کا باعث ہے۔ اور اس کھیل سے کوئی چیز زیادہ خطرناک نہیں۔ یہ عطا کرتا ہے پھر واپس لے لیتا ہے۔ اس کی منطق عام انسانوں کی منطق نہیں ہے یہ گونگا۔ اندھا۔ بہرہ ہے۔ یہ سب سے زیادہ زبردست قوت ہے۔ یہ ان کا خدا ہے۔ یہ اپنے معتقد

[بقیہ صفحہ ۷۴۲ پر دیکھئے]

نسیم سحر

شب ماہتاب

(جناب عنایت اللہ شوق سابق ایڈیٹر نسیم سحر راولپنڈی)

سکوت شب کی فسوں نے اہل جہاں کو مدہوش کر دیا ہے ؛ نظام فطرت کے دبدبے نے فضا کو خاموش کر دیا ہے
خمار آلود چشم ساقی نشاط مے سے جھپک رہی ہے ؛ شباب کی نیند آ رہی ہے نظر سے مستی ٹپک رہی ہے
جہاں کی ہر چیز کو سیاہی نے اپنی رنگت میں رنگ دیا ہے ؛ عروس شب کو جہاں نے اپنی کنار الفت میں لے لیا ہے
چمن میں پھولوں کو لوریاں دیکے خلوتی کو سلا دیا ہے ؛ ہر ایک غنچے پہ سطوت شب نے اپنا سکہ بٹھا دیا ہے

جہاں خاموش بن گئی ہے فضائے ہنگامہ زار دنیا
طلسم حیرت بنا ہوا ہے سکوت بے اختیار دنیا

فلک پہ سیارگان بیتاب نے سجائی ہے اپنی محفل ؛ بٹھا لیا مسند حکومت کے تخت زریں پہ ماہ کامل
بہار میں چاندنی کے کھیتوں کی لطف جنت کا مل رہا ہے ؛ نظر میں ہے فردوس کا عالم شگوفہ نور کھل رہا ہے
خمار چشم نرگسیں میں جھلک اٹھا بادۂ ازل کا ؛ نگاہ ساقی سے ٹپکا پڑتا ہے ذوق کیف تماغول کا
طلسم بستہ ہے چاندنی میں فضائے دلچسپ کا گلستاں ؛ ہیں جس کے دامن میں سو رہی محو خواب فطرت کی ننھی پریاں
کہیں درختوں کی پتیوں سے قمر کی تنویر چھن رہی ہے ؛ زمیں لباس عروس کا نقشہ قلمکار بن رہی ہے
بنے ہوئے فیض نور مہتاب سے ہیں سب برگ و بار یکساں ؛ کہ جیسے پھولوں پہ باغ عالم کے آ گئی ہو بہار یکساں
چمک سے کلیوں نے اپنی اپنی رگ رگ میں نور کا رنگ بھر لیا ہے ؛ شکوہ مہتاب نے فضائے جہاں کو تسخیر کر لیا ہے
حریف بجلی کی رو بہی ہے تیز آساں آب رود گل کدہ کہ سبزہ ساحل کا چمکے ہی جھلکیاں لے رہا ہے دل کی
لئے ہوئے دامن بیکسی میں مزار ہا موتیوں کا عالم ؛ کہ ماہ تاباں کے نور سے جگمگا اٹھے قطرہ ہائے شبنم
اثر کے عکس لطیف آب رواں میں دریائے نور بنکر ؛ فضائے روشن میں چاند کا یہ سماں جھلکتا ہے خود بخود منظر
ہوا کی جنبش نے عکس میں بھر دیا ہے بیتابیوں کا جو ہر ؛ کہ اپنے دامن میں جیسے لہریں لئے ہو سیماب کا سمندر
خموش صحرا کی وادیوں میں لطیف چلنے لگیں ہوائیں ؛ سرود افروز ہو گئی ہے زمین نغمہ میں سائیں سائیں
نظام فطرت سے ارض صحرا پہ نور کی چادریں بچھائیں ؛ لطیف سا ایک رقص کرنے کو حوریں عرش بریں سے آئیں
اٹھا لئے مطربان عرشی نے اپنے اپنے لطیف بربط ؛ فضائے ہر دو جہاں کو مسحور کرنے والی ہے نغمہ
لطیف تار شعاع مہتاب پر جو مضراب چل رہی ہے ؛ کچھ ایسے نغمے نکل رہے ہیں کہ روح فطرت مچل رہی ہے

زمیں سے عرش بریں تلک ایک نور پھیلا ہوا ہے گویا
کہ جس کی گہرائیوں میں کچھ دیکھتے ہی بیتاب ہے کلیجا

تصور ان کا لئے ہوئے جنگلوں میں سرگرم جستجو ہوں ؛ غضب خدا کا بہار کیف انتہا میں ناکام آرزو ہوں
یہ منزلیں عشق فتنہ ساماں کی لائیں ہیں ساتھ دیدنی ہیں ؛ بہار فردوس کی جہاں پا رہا ہوں میں نکہتیں گلوں میں
کس کا حسن لطیف دینے شوق میں مطلع نظر ہے ؛ لطافتوں کا لحاظ ہے چاندنی محبت میں ہم سفر ہے

وہ چاند چشم لطافتوں کا کہ نور جس سے ابل رہا ہے
فضائے خاموش دشت کو عالم منور بنا چکا ہے

کہیں المختصر چاندنی کے کھیتوں میں کاش ہم چھوڑ پڑ جائیں ؛ فضا میں پھر اس کی ایک پیدا ہو چاندنی کی چاندنی
کرے محبت کا درد پیدا دلوں میں لہروں کی نغمہ ریزی ؛ سمائے آنکھوں میں حسن بے لوث کی فضاؤں کی لطف خیزی
وہ متحد اتفاق پیدا ہو تا ابد پھر نہ ہم جدا ہوں ؛ بقا میں روحوں کا وصل ہو جو مجھے فلک پر نہ ہو

مگر کہاں شوق میری قسمت کہ پاؤں یہ رفعت مقدر
ہجوم بیتابیوں کا ہے اور رہ چلا ہوں تڑپ تڑپ کر

(خاص)

عربک کالج میگزین

بدنصیب کا خط

(جناب پروفیسر سید منظور حسن صاحب ایم اے چیف ایڈیٹر عربک کالج میگزین دہلی)

ہندوستان کی مذموم رسومات میں سب سے زیادہ بری رسم نارضامندی کی شادی اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کو جاہل شوہروں کے سپرد کردینا ہے۔ ہماری آنکھوں میں جہالت کا ایسا پردہ پڑا ہے کہ پیش بینی اور تمیز نیک و بد نگاہوں سے قطعاً مفقود ہوگئی ہے لیکن اس ناعاقبت اندیشی کا شکار وہ ناکردہ گناہ خواتین بنتی ہیں جو اپنے انفاس زندگی جہالت اور ظلم کی تاریکی میں گذار رہی ہیں۔

ذیل میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی کا خط درج کیا جاتا ہے جو والدین کی طمع اور حرص کے باعث ایک ظالم شوہر کے ہاتھوں میں پڑگئی ہے اور اپنی بے بسی اور بیکسی کی حالت کا نقشہ ایک لڑکپن کی سہیلی کے سامنے کھینچتی ہے۔ گو نقار خانے میں طوطی کی آواز کا سنائی دینا تو ناممکن ہے۔ لیکن شاید یہ جذبات کسی حد تک اہل ملک کے قلوب سے انصاف اور رحم کی درخواست کریں۔ فاعتبروا یا اولوالابصار۔

مانا دلیل سود اگر ہے فضول بکنا
دیوانہ تھا اگر میں ناصح کو کیا ہوا تھا

پیاری حمیدہ۔ خدا تمہارے دل کو اطمینان اور خوشی سے معمور رکھے تمہارا نامۂ محبت آج صبح کو ملا کیا کہوں تمہارے خطوط کے آنے سے دل کو کس قدر خوشی ہوتی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ بچپن کا طریق زندگی پچھلی رات کے خواب کی طرح نظر کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ ہائے وہ آزادانہ زندگی، ہم عمر اور پاکباز سہیلیوں کا مجمع۔ وہ مذاق وہ شوخیاں آئینہ ہوجاتی ہیں تمہاری شادی کے واقعات جو صفحۂ دل پر نہ مٹنے والے نقش و نگار بنکر جم گئے ہیں یاد آآکر تڑپا دیتے ہیں۔ وہ چوتھی کی شب کو ہم سب کا تمہارے کمرے میں اکٹھا ہوکر تم کو چھیڑنا تمہارا بگڑکر منہ پھیر لینا۔ لیکن میرے گدگدانے سے لب لعلیں کے پردوں سے دُرِ دنداں کی لڑیوں کا عیاں ہونا اور دست تبسم سے شیشۂ سکوت کا پاش پاش ہوجانا۔ جب یاد آتا ہے تو کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ ہماری حمیدہ سچ پوچھو تو میں اس وقت تمہاری قسمت پر رشک کرتی تھی۔ ہاں ہاں صاف کیوں نہ کہوں رشک کرتی تھی کس لئے اس کا جواب تم اپنے دل سے پوچھو!

حمیدہ! خدا نے جیسا قابل اور محنتی شوہر تم کو دیا ہے اگر اس سے نصف لائق شوہر بھی مجھکو مل جاتا تو میں خود کو نہایت خوش قسمت خیال کرتی اور خداوند کریم کا ہزار ہزار شکر کرتی لیکن افسوس والدین کے ظلم سے۔ نہیں نہیں میری بدقسمتی سے مجھکو ایسے کے پالے ڈالا جو تمہارے قابل شوہر کی ضد ہے۔ ہائے کیا کیا امنگیں اور کیا کیا ولولے تھے جن کو قسمت نے پامال کر ڈالا۔

تمہارا پیارا خط آتا ہے۔ میرا دل ہزار رنج و تعب میں بھی

گرفتار ہوتا ہے لیکن لفافہ کے ہاتھ میں آتے ہی کسی کی زلفہائے عنبریں کی عطر بیز امواج خوشبو اس کو شگفتہ کر دیتی ہے۔ اس کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے میں نہ معلوم کونسا برقی اثر پوشیدہ ہے جو بحر خوں میں تلاطم۔ دماغ کی امواج تخیل میں مدوجزر اور سست رفتار دل کی حرکت میں تیزی پیدا کر دیتا ہے۔ میں ممکن الوجود احتیاط سے اس کو کھولتی ہوں تو اُف! کسی کے پان خوردہ دہن کا سُرخ سُرخ لعاب نظر کے سامنے آکر جسم و جاں کو ہیجان میں لے آتا ہے۔ اس ایک لمحہ میں چشم زدن میں طائر تخیل نہ معلوم کہاں سے کہاں پرواز کر جاتا ہے اور نظر کے سامنے واقعات گذشتہ کے نہ معلوم کتنے مرقع آجاتے ہیں۔ میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر لکھنے کی میز کی طرف جاتی ہوں۔ کرسی پر بیٹھتی ہوں نگاہیں بجلی کی طرح سرنامہ پر پڑتی ہیں تو از دلی کے الفاظ لکھے ہوئے پاتی ہوں۔ ہائے وہ دلی جس کو مجھے بھی کبھی وطن کہنے کا استحقاق حاصل تھا۔ جس کی سرزمیں ہمارے ارمانوں اور امیدوں کا گہوارہ تھی۔ جس سے جدا ہونے کا خیال تو درکنار ہمارے خیالات بھی صرف اس کے چند محلّوں تک محدود تھے۔ پیاری حمیدہ! اب خیال آتا ہے کہ اس کی خاک کا ذرّہ ذرّہ بوسہ دینے کے قابل تھا اس کے ہر ہر حصّہ زمین سے محبت اور وفا کی بو آتی تھی۔ افسوس میرے ناقدر شناس دل نے اس بہشت بہا سرزمیں کی کچھ قدر نہ کی۔ اف! اب دلّی کو وطن کہتے ہوئے بھی نہ معلوم کیوں طبیعت میں وحشت پیدا ہوتی ہے۔ پیاری حمیدہ! کیا اچھا ہوتا اگر تم اس نام کو سرنامہ پر لکھ کر میرے زخمہائے دل پر نمک پاشی نہ کریں۔

قفس میں برگ گل دکھلانے سے اے صیاد کیا حاصل
ولانا بلبلوں کو پھر چمن کی یاد کیا حاصل

سرنامہ سے القاب پر نظر پہونچتی ہے تو پہلی سطر دیکھکر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اُف لکھا ہے۔ "پیاری رشیدہ اللہ العالمین تمہارے دل کو دائمی راحت اور اطمینان بخشے"۔ ہائے حمیدہ! تم میرے مزاج سے واقف ہوتے پر بھی مجھکو ایسی دعا دیتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تمہارے پاک اور صاف دل سے نکلے ہوئے سچے الفاظ ہیں لیکن آہ! میرا دل رنج سہتے سہتے اور صدمات اٹھاتے اٹھاتے ان کا اس قدر عادی ہوگیا ہے کہ خوشی اور اطمینان کے نام سے بھی متنفر ہے۔

حمیدہ! اگر راحت اور اطمینان میری قسمت میں ہوتا تو میرا رشتہ زندگی بھی تمہارے شوہر کے ایسے کسی قابل خاوند کے دامن سے وابستہ ہوتا لیکن اب مجھکو یقین ہو گیا ہے کہ میں دنیا میں صرف مصیبتیں سہنے اور ہلاکشی کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہوں اور ان ہر دو فرائض کو میں صبر اور شکر کے ساتھ انجام دوں گی۔

حمیدہ۔ عورت کی زندگی مثل ایک کشتی کے ہے۔ جسطرح کشتی کی رفتار کو قائم رکھنے کے لئے اچھے ملاح اور موافق ہوا کی ضرورت ہوتی ہے عورت کی زندگی کے لئے بھی اچھے شوہر اور اسباب فارغ البالی کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر اس کا ساحل اطمینان کو پہنچنا ناممکن ہے۔ خدا کا شکر کرو کہ اس نے یہ دونوں چیزیں تمکو عطا فرمائی ہیں لیکن میری عمر کی کشتی ایک مہروش ناخدا کے ہاتھ میں ہے جس میں دنیا کے بدترین عیوب شراب خواری اور عیاشی موجود ہیں۔

آہ حمیدہ اس بات کو میرا ہی دل خوب سمجھ سکتا ہے کہ شوہر کے چال چلن کی خرابی زیادہ جانکاہ ہوتی ہے یا مال و دولت کی عدم موجودگی۔ خدا نے اپنے لاانتہا احسان سے

مجھکو کافی دولت عطا فرمائی ہے لیکن شوہر کے چال چلن کی خرابی کے باعث یہ دولت مثل اسی مصنوعی آنکھ کے ہے جسمیں مطلقاً قوت بینائی نہ ہو یا وہ شمع جس میں زور نہ ہو آہ سودا کے یہ اشعار مجھ پر کتنے صادق آتے ہیں۔

نے بلبل چمن نہ گل نودمیدہ ہوں ٭ میں موسم بہار میں شاخ بریدہ ہوں
خواں بہ شکل شیشہ وگریاں بشکل جام ٭ اس میکدہ میں آہ عبث آفریدہ ہوں

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقول درد
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

حمیدہ میری یہ حالت اُن والدین کے لئے قابل عزت ہے جو مال و دولت کے عوض اپنی لڑکیوں کو بدچلنی شوہروں کے ہاتھ فروخت کردیتے ہیں لیکن میں سوائے اپنی تقدیر کی شکایت کرنے کے اور کسی کا کیا گلا کرسکتی ہوں۔

کچھ خطا گل کی ہے اصغر نہ قصور صیاد
سب کرشمہ یہ مری گردش تقدیر کے ہیں

آگے چل کر تم لکھتی ہو عرصہ سے تمہاری خیریت نہ معلوم ہونے کے باعث دل از حد متفکر ہے نہ معلوم تاخیر جواب کا کیا باعث ہے۔ ہائے حمیدہ تمہارے ان الفاظ کا جواب لکھتے ہوئے جسم میں رعشہ پیدا ہوتا ہے اور قلم ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ یہ تو تم جانتی ہو کہ تمہارے دولہا بھائی کی علمی قابلیت کتنی وسیع ہے۔ اس کو پورے طور پر واضح کرنے کے لئے صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اگر وہ مجھکو کبھی کسی کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں تو اس کو فوراً بلا سوچے سمجھے چاک کردیتے ہیں کہ نہ معلوم اس تحریر میں میں کون سے بڑے بڑے راز پنہاں ہوں اور کس کے نام ہو یہی حال اس خط کا ہوا جو میں تم کو بھیجنا چاہتی تھی۔ قریباً دس روز کا عرصہ گذرا دوپہر کا وقت تھا۔ تمام مکان سنسان تھا میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تمہارے محبت نامہ کا جواب لکھ رہی تھی کہ یکایک ڈیوڑھی سے بھاری بھاری قدموں کی آواز آئی اور میں ہوش بھی نہ سنبھالنے پائی تھی۔ کہ وہ شراب کے نشہ میں مست جھومتے ہوئے میری طرف آئے۔ خط دیکھکر غصہ کی نگاہ سے میری طرف دیکھا جس سے میرا تمام جسم کانپ گیا۔ خط کو چھینا اور چاک کرکے پھینکدیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ قلم کو توڑ ڈالا۔ شیشہ کے قلمدان کو زمین پر پٹک کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور قہر کی نگاہوں سے مجھکو گھورتے رہے بلا کچھ کہے سنے باہر چلے گئے

آہ حمیدہ غور تو کرو جس شخص کا تین دن کے بعد گھر میں آنے پر بھی بیوی سے یہ برتاؤ ہو اس کی محبت اور وقعت ایک شریف خاتون کے دل میں کہاں تک ہوسکتی ہے افسوس ایسی ایسی ہزارہا مثالوں کے روزانہ دیکھنے پر بھی صدہا والدین اپنی لڑکیوں کو مال و دولت کے اوپر قربان کردیتے ہیں۔ کاش خداوند کریم ان کے دماغوں میں پیش بینی کی قوت عطا فرمائے اور ایسے جاہل شوہروں کے دلوں میں معاملہ فہمی اور عقل سلیم کا مادہ پیدا کرے ہائے ہندوستانی خواتین جو ایسے موقعوں پر زبان سے کوئی حرف شکایت نکالنے سے بھی مجبور رہیں۔

پیاری حمیدہ دیکھ لینا یہ آفتیں جواب میرے لئے عذاب جان اور سوہان روح ہو رہی ہیں ایک دن میری جان لیکر جائیں گی۔

تمہارے خط کا سلسلہ آگے ایسے شروع ہوتا ہے آجکل عذرا اور لیلیٰ یہاں آئی ہوئی ہیں تین سال قبل کی صحبتوں کا کچھ کچھ لطف آرہا ہے۔ تم ہوتیں تو یقیناً اس سے بھی

زیادہ لطف حاصل ہوتا افسوس تمہارے نہ ہونے سے ہماری محبت بالکل پژمردہ ہے کیا تم براہ مہربانی جواباً تحریر کر سکتی ہو کہ اس موقعہ پر تمہارا آنا ممکن ہے یا نہیں عذرا اور لیلیٰ تسلیم عرض کرتی ہیں۔

عذرا اور لیلیٰ کی موجودگی سے میں جانتی ہوں کہ کیا لطف ہوگا اور یقیناً اگر میری زندگی تین سال قبل کی زندگی ہوتی تو ایسے موقعہ پر میرا یہاں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ لیکن اول تو تمہارے دولھا بھائی کی وحشت بھری طبیعت ہی سے تمہارے پاس پہونچنے کی اجازت حاصل کرنا ناممکن ہے دوسرے اب میری زندگی پہلی سی زندگی نہیں رہی۔

حمیدہ رشیدہ اب پہلی سی رشیدہ نہیں رہی اس کے مذاق نالہائے غم سے اس کے اندازانہ قہقہے رنج آمیز اور سرد آہوں سے اس کی عیش و راحت رنج و مصیبت میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میں تمہاری آزادانہ صحبت میں شریک بھی ہوئی تو بجائے رونق محفل ہونے کے سبب آزردگی اور موجب پریشانی ہوں گی کیونکہ کسی نے کہا ہے

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

عذرا اور لیلیٰ کی یاد آوری کی ممنون ہوں۔ افسوس طبیعت تم سے اور اُن سے ملنے کے لئے بہت بیچین ہے لیکن اسباب خانگی سدراہ ہیں اگر گردش تقدیر نے کبھی مہلت دی تو شاید ملاقات ہو جائے ورنہ نارسائی بخت کے سوا کسی کی کیا شکایت۔

خط کو ختم کرنے سے پہلے میری نگاہ تمہارے محبت نامہ کے حصّہ زریں پر پڑتی ہے تو بے اختیار دل بھر آتا ہے سینہ سے ایک عجیب قسم کا درد اٹھتا ہے اور طبیعت بیساختہ رونے کو چاہتی ہے۔ "تمہاری بچپن کی سہیلی حمیدہ" یہ الفاظ دل پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔ وہ عیش اور خوشیاں مٹ گئیں۔ اب تو غم و الم رنج و مصیبت کے نشتر ہیں اور تمہاری رشیدہ کی رگ جان افسوس شادی ہونے سے پہلے میں شادی کو کیا چیز سمجھتی تھی۔ لیکن یہ شادی میرے حق میں غمی کا موجب ہوئی۔ آہ جو مرقعۂ زندگی قوت متخیلہ سے صفحۂ دل پر کھینچا تھا وہ نقش برآب ثابت ہوا۔ اب معلوم ہوا کہ۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

خیر اب گذشتہ زمانہ کی یاد سے زخمہائے جگر پر نمک پاشی کرنے سے کیا فائدہ۔ قسمت کی تحریر پوری ہو چکی۔ میں راہ رضا پر چلوں گی اور اپنے بقیہ انفاس زندگی کو جسطرح بھی ہوگا گزار دوں گی۔

حمیدہ۔ میں سچ کہتی ہوں کہ اس جاں ستان زندگی سے عاجز آکر بارہا میں نے خودکشی کا ارادہ بھی کیا۔ صرف ارادہ ہی نہیں بلکہ زہر ہلاہل کا پیالہ میرے لبوں تک پہونچ چکا ہے۔ میرا دل مطلقاً موت سے ہراساں نہ تھا اور میں پوری طرح اپنے دم واپسیں تک اس کے ساتھ استقلال اور صبر سے لڑنے کو تیار تھی۔ لیکن یکایک مذہب اور شرع کی پابندیوں نے میرے ہاتھ کو روک لیا اور مجھکو رنج و الم کے تنگ و تاریک غار میں گھٹ گھٹ کر مر جانے کے لئے چھوڑ دیا۔

آہ حمیدہ! کیا اچھا ہوتا اگر میں خودکشی کرکے زبردست اور ناعاقبت اندیش والدین کیلئے ایک سبق آموز داستان چھوڑ جاتی سچ کہنا کیا اس وقت بھی ابا جان اپنے کئے پر پشیمان نہ ہوتے۔ نہیں نہیں ہوتے اور ضرور ہوتے۔

آخر میں اب میں تم سے اس قدر سمع خراشی کی معافی چاہتی ہوں لیکن ان باتوں کا اظہار بجز تمہارے دوسرے سے ہونا ناممکن تھا اس واسطے افسانۂ دل سنانے میں تم ہی کو مخاطب کیا۔ (والسلام) (ناصر)

عزیز

عزیز اماں

(جناب بشیر احمد صاحب بشری پوردہنی ایڈیٹر رسالہ عزیز بمبئی)

شفیق اماں!

تمہارے دم کی شمع جو اس شفقت محبت اور غمخواری کے تیل سے جل رہی ہے اس کی روشنی میں میں اپنی طوفان رسیدہ کشتی حیات کو بحر عوادث کی بے پایاں وسعتوں میں گھر کر زیست کی پردآلام و متلاطم منزلیں طے کر رہا ہوں۔

اماں! افکار و ترددات کی طوفانی موجیں میری زندگی کی ناؤ کو زیر و زبر کر رہی ہیں۔ اور اندوہ و صعوبات کی بے پناہ لہروں کے تھپیڑوں سے میری ننھی ناؤ ہچکولے کھائے جا رہی ہے۔

لیکن اماں۔ میں ان میں سے کسی ایک کی پروا نہیں کرتا۔ کیونکہ تمہارے دم کا دیا برابر جل رہا ہے۔ سمندر میں لاکھ طوفان آئیں۔ ہزار تلاطم پیدا ہوں۔ موجیں خطرناک صورت اختیار کر کے دیو ہیکل بن جائیں۔ مجھے ان میں سے کسی ایک کی پروا نہیں۔ کیونکہ اماں! تمہاری شمع حیات برابر جل رہی ہے میں اپنی کشتی کو سمندر کی خوفناک گرداب میں برابر چلائے جاؤں گا۔ طوفان کی خطرناکیوں اور ان کی زبردست طاقتوں سے کھیلوں گا اور مہلک موجوں و کوہ پیکر لہروں کے سینوں کو چیرتا ہوا اپنی مسافت طے کرتا رہوں گا۔

مگر پیاری اماں۔ یہ سب اس وقت تک جبتک تمہاری زندگی کا دیا جل کر اپنی مقدس و شفاف روشنی سے میری ڈھارس قائم کئے ہوئے ہے۔ لیکن اماں جوں ہی یہ شمع بجھ کر سمندر میں تاریکی پھیل جائے گی۔

تو میں اپنی کشتی کو چلانے سے قطعی قاصر ہو جاؤں گا۔ اور پھر نہ معلوم میری کشتی اس وقت اپنے منزل کے رُخ سے ہٹ کر کہاں کہاں بھٹکی پھرے گی۔ اس لئے ....

عزیز اماں! میری آرزو ہے کہ تمہارے شمع حیات کے بجھ جانے سے پہلے میری زندگی کی ناؤ موت کے چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے اور بحر عدم کی گہرائیاں میری زندگی کی ناؤ کے پرزوں کو اپنی بے کراں وسعتوں میں ایسا جذب کر لیں کہ خدا کی مقدس زمین میری کشتئ حیات کے تنکر تنکر سے پاک ہو جائے۔

(خاص)

عزت دولت میں نہیں قابلیت میں ہے

(جناب بدیع الزماں صاحب ایڈیٹر عزیز گورکھپور)

بادشاہ نہیں، وزیر نہیں، راجہ مہاراجہ نہیں تعلقہ دار نہیں، مگر دنیا، دنیا کے بڑے بڑے لوگ عام پبلک کیا چیز ہے رؤساء و تعلقہ دار کس گنتی شمار میں ہیں۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ والیان ملک کو بھی طاق پر رکھئے ہاجرمنی فرانس انگلینڈ روس اور دنیا کے تمام آزاد اور عزت رکھنے والے مقامات کی اونچی اونچی شخصیتیں جن کی بلند نگاہوں کے سامنے

عرش کے تارے نیچے ہیں۔ بُلا بُلا کے اس میہمان کے لئے بچھے بچھ جاتے ہیں۔ آنکھیں بچھاتے ہیں۔ دل بچھا دیتے ہیں کہ۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

وہ ممالک جہاں کے عام لوگ ہمارے نوابوں سے کہیں زیادہ آن بان سے رہتے ہیں۔ ہاں وہ ممالک جہاں دولت پھٹ پڑی ہے۔ جہاں چوبیس گھنٹے آٹھ پہر مِن برستا رہتا ہے۔ اس مفلس ہندوستان کی وہ شاہانہ آؤ بھگت کرتے ہیں کہ بڑے بڑے راجاؤں کو نصیب نہیں۔ سمجھتے ہیں کہ آنے والے نے اُن کی زمین کو چار چاند لگا دئے آسمان پر پہنچا دیا آسمان بنا دیا۔ ذروں نے تلوؤں کو نہیں جوتوں کے تلوں کو چوم کر تاروں کی چمک پائی۔ دمک اُٹھے یہ کیوں کہ۔

عزت دولت میں نہیں قابلیت میں ہے

گاندھی، فاقوں پر فاقے کرنے والا گاندھی بھکاری گاندھی غریب ہندوستان کا رہنے والا گاندھی۔ تاجداروں سے ٹکر لیتا ہے۔ نہیں نہیں ٹکر دیتا ہے۔ بہتوں کو ماں لینا پڑتا ہے کہ آجکل یہی لنگوٹی باز دنیا کا سب سے بڑا آدمی ہے۔

بڑی بڑی شانیں رکھنے والے شہنشاہ جن کی مٹھی میں دنیا ہے اس سے ملتے ہیں اور کس تکلف سے اور بے تکلف ملتے ہیں اور گھڑیوں بات چیت کرتے ہیں دنیا کے معاملات پر سلطنتوں کے بارے میں قوم و ملک کے واسطے۔

ہے کوئی راجہ مہاراجہ کہ اس مثال میں پیش کیا جا سکے اس لئے کہ :-

عزت دولت میں نہیں قابلیت میں ہے

زندۂ جاوید! مگر چار دن کی زندگی میں دھتکاریں اور پھٹکاریں سننے والا سرسید ملعون و مردود کا خطاب پانے والا سرسید، فاجر نہیں کافر ٹھہرایا جانے والا سرسید اپنوں اور بیگانوں کے بیجا .... طعنے سننے والا سرسید زندگی بھر رات دن اپنی قوم مگر خون کی پیاسی قوم کے لئے تلملانے والا سرسید اٹھتا ہے اور کچھ کر گزرتا ہے کہ شاہی قوتیں رکھنے والوں سے نہ بن پڑتا۔ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بگڑی ہوئی قوم مٹتی ہوئی قوم کے درد کا درماں بنا جاتا ہے درماں بھی تیر تکا نہیں تیر بہدف۔

آج یہی پاک روح علم بن کر پھیلی ہوئی ہے عزت کے رنگ میں نظر آ رہی ہے۔

آج وقار کی کرسیوں پر بیٹھنے والا معزز عہدوں پر ممتاز ہونے والا عزت کا تاج سر پر رکھنے والا مسلمان اسی کی عظمت کا گواہ ہے۔

وہ نہیں ہے مگر آج بھی اس کی عزت اور محبت اپنے پرائے سب کے دل میں ہے یہ کیوں؟ اس لئے کہ۔

عزت دولت سے نہیں قابلیت سے ہے

نام کسی نے کاہے کو سنا ہوگا بندول ایک گمنام گاؤں کا رہنے والا شبلی اعلیٰ لیاقتیں اور طرح طرح کے علم و فن سے مالا مال ہو کر عمل کے میدان میں قدم رکھتا ہے کہ عزت کے انمول موتیوں سے شہرت کا دامن بھر دیا جاتا ہے جس کا ایک ایک کارنامہ چاند بنکر چمک رہا ہے اور دنیا کو جگمگا رہا ہے۔

شہرت، دنیا تک کی شہرت عزت فاضلوں کے دلوں میں رہنے والی عزت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دامن سے بندھ گئی یہ کیوں اس لئے کہ۔

عزت دولت میں نہیں قابلیت میں ہے

تاجوروں کو دنیا بھلا دے گی لیکن ان خاک نشینوں کی یاد پتھر کی لکیر ہے یہ نام مٹنے کیلئے نہیں ابھرے ہیں۔ یہ لالچ کی عزت نہیں۔ ڈر دباؤ کی عزت نہیں مروت و قدرت کی عزت نہیں۔ علم و فضل کی عزت ہے۔
علم خدا کی عنایت ہے اور یہ عزت خدا کی دین یہی عزت عزتوں کا تاج اور تاجوں کی عزت ہے۔

(خاص)

علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

ریل سے کچلے ہوئے ایک مزدور کو دیکھکر

(پروفیسر ضیاء احمد صاحب ایم اے چیف ایڈیٹر علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج میگزین)

اے ہلاک شیوۂ بے مہرئے سرمایہ دار ؛ اے قتیل خنجر جور و جفائے روزگار
خود ہے ایذا کش مگر دنیا کو راحت بخش ہے ؛ گرچہ تو مزدور ہے شاہوں کی دولت بخش ہے
کامیاب رزم ہستی میں تیری آزرم سے ؛ کشت ہے سرسبز ان کے تیرے خون گرم سے
اُن کے حق میں نغمۂ شادی فغان درد ہے ؛ گرمیٔ محفل کا باعث تیرے آہ سرد ہے
قہقہوں میں ہے تیرے سوز غم کی روشنی ؛ کارخانوں میں ہے اُن کے تیرے دم کی روشنی
تو مصاف زندگانی میں ہے گرم سعی کار ؛ تو نہو گر تو بدل جائے نظام کارزار
تو نے دنیا سے مٹایا ہے عمل پندار کا ؛ تو نے انساں کو سکھایا ہے سبق ایثار کا
تیرے طرز کار سے گو سب کو اکراہ ہے ؛ تو جتاتا ہے کہ الکاسب حبیب اللہ ہے
خاک و خوں میں دیکھکر تیرے تن مجروح کو ؛ کیا بتاؤں کس قدر صدمہ ہے میری روح کو
کر رہا تھا بے خبر تو ریل کی پٹری پہ کام ؛ آگئی اتنے میں گاڑی موت کا لیکر پیام
کار کن بھی خواب میں تھے تیرے قسمت کی طرح ؛ ریل بھی تیزی پہ تھی میری طبیعت کی طرح
گرچہ کی بچنے کی کوشش تو نے ہر انداز سے ؛ ہوگیا پامال انجن کے خرام ناز سے
آہ تیری شکل اس پر مردنی چھائی ہوئی ؛ حسرت آگیں یہ نظر آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی
تیرے اعضائے نحیف اور جسم ناتواں ؛ دے رہے ہیں صاف تیرے فقر و فاقہ کا نشاں
چند گز کے ایک لنگ کہنہ تیرے جسم پر ؛ ہے ترے روداد ناداری کی شرح مختصر
سانس یہ اکھڑی ہوئی یہ مرتے دم کی ہچکیاں ؛ ہیں تری ناکام ہستی کی مکمل داستاں
شام کو ہوں گے زن و فرزند تیرے بیقرار ؛ راہ دیکھیں گی تری ہو کر سراپا انتظار
کیا خبر ہوگی انھیں یوں ان کی قسمت سوگئی ؛ ان کے امیدوں کی بستی آج ویراں ہوگئی
کوئی دولتمند جب کرتا ہے دنیا سے سفر ؛ محو ماتم ہوتا ہے ہر شخص اس کے موت پر
ملک میں ہوتا ہے اک ہنگامۂ محشر بپا ؛ رسم ماتم کیلئے ہوتے ہیں جلسے جا بجا
مرثیوں میں کرتے ہیں سخن اظہار یاس ؛ ہر طرف سے تعزیت کی ہوتی ہے تجویز پاس
اک تری میت ہے جس پر رونے والا بھی نہیں ؛ آکے دو آنسو بہاتا کوئی اتنا بھی نہیں
بیکسی ہے وقف ماتم بیکر صد پاش پر ؛ بادل شاعر ہے جو گلاں ہے تیری لاش پر

(خاص)

علی گڈھ پنچ

ناک میں دم

[جناب جمال صابری مدیر علی گڈہ پنچ " علی گڈہ "]

برف سے زیادہ ٹھنڈی اور روئی سے بہت زیادہ ملائم ہوا میں ہم پلنگ کو گلے لگائے پڑے تھے اور پلنگ ہمیں کہ ہماری پڑوسن کی مرغی کے پرپی مرغ نے بھجن کی ٹیپ لگانی شروع کر دی۔

نیند ایکدم ہماری آنکھوں کے در بارسے نکل کر بھاگی لہذا ہم فوراً ہی ہوشیار ہو گئے اور کروٹ بدلکر دانتوں کو پیسکر پھر ہم نے نیند کو دبالیا اور بند کر دی۔ مگر صاحب وہ پھر نکل گئی ہم نے پھر وہی عمل کیا۔

اُدھر بے صبر مرغا اپنی بے سُری راگنی الاپتا رہا اور ادھر ہم مزے مزے میں پلنگ پر بیلن بنکر دری اور چادر کی پوریاں اور روٹیاں بناتے اور بیلتے رہے۔ ابھی ہمارا بیلن ختم بھی نہ ہوا تھا کہ دوسری پڑوسن کا مرغا بھی میدان جنگ میں کود پڑا اور لگا نے لگا نعرے پہ نعرہ بلند کرنے لگا آسمان کیطرف تھوتڑی اٹھا اٹھا کر وہی حرکت ناشائستہ جو پہلا مرغا کر رہا تھا۔

اپنی مرغی کے نانا کی قسم یہ سلسلہ تار کے کھمبوں کی طرح بڑھتا ہی چلا گیا۔ جسکے گھٹنے کم ہونے اور ختم ہونے کا کوئی موقع نہ رہا۔ جب ہم مرغوں کی اس گلے بازی اور تا تا روں روں سے تنگ آنے لگے تو مجبوراً منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جماہی لیتے ہوئے انگلیاں چٹخاتے ہوئے اور بال بھٹکارتے ہوئے پلنگ سے اچھل کر کرسی پر جلوہ گر ہو گئے یا جاڑے یا براحمان ہو گئے اور پھر سمجھنے لگے کہ ہم بھی ہیں کچھ۔

ہماری قسمت کی برائی دیکھیئے کہ مرغے اب بھی وہی گیت گا رہے تھے۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ واقعی مرغے تو مرغے ہی ہوتے ہیں وہ کبھی کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ چاہے کوئی سو رہا ہو یا رو رہا ہو مر رہا ہو یا جی رہا ہو۔۔۔۔ انھیں اپنے وقت پر گلا پھاڑنے سے مطلب اور غرض۔ ہم بہت عرصہ تک سن سنکر تلملاتے رہے۔ آخر مرغ یہاں تک مزے میں آئے کہ انہوں نے اپنے اپنے حلق کو توپیں بنا بنا کر آواز کے گولے چلانے شروع کر دیئے۔ ہمارے جی میں آیا کہ جھاڑو کے تنکوں کی سنگینیں لیکر ہم بھی باقاعدہ جنگ شروع کر دیں اور ان مرغوں کو بتا دیں کہ ہماری طاقت بھی روس اور جرمنی سے کم نہیں ہے۔ مگر ہمیں یکایک ہندوستان کی غریبی اور مفلسی کا خیال آگیا۔ اور آخر یہ کہتے ہوئے کمرہ کے اندر روانہ ہو گئے کہ

ان مرغوں نے تو ناک میں دم کر دیا۔

ہم ابھی سگریٹ کے دھوئیں سے کمرہ کے اندر بادل بنا رہے تھے کہ ہماری " وہ " بھی اپنی دراز چوٹی اور اسکے ساتھ کیا کیا سنبھالتی ہوئی اٹھکر بیٹھ گئیں اور بالکل انگریزی کا حرف " سا " بن گئیں۔ آنکھیں ملکر آواز کی گردن پر سوار ہوتی نظر آئیں۔ تیزی سے بولیں۔

" ارے ننواں پانی لا "

ہم چپکے بیٹھے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اللہ خیر کیجو کہیں بیگم صاحبہ سگریٹ کا دھواں نہ دیکھ لیں ورنہ بزرگوں سے زیادہ ناراض ہونا اپنا فرض سمجھ لیں گی اور بتا دینگی کہ کسی جورو کا خاوند بیٹے کا باپ، خسر کا داماد، سالے کا بہنوئی بننا معمولی بات نہیں۔ یہ ڈگری ٹانگوں کی جگہ سر اور سر کی جگہ ٹانگیں ہو جانے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارے نوکر تنخواں کی مالکہ اور ہمارے خسر صاحب طول عمرہٗ کی چہیتی بیوی کے پیارے بیٹے کی حقیقی بہن بڑے ہی ناز و انداز اور نخروں کو لئے ہوئے ہماری طرف اس طرح تشریف لائیں جس طرح کسی پر ملیریا سوار ہوتا ہے۔

یہ دیکھ کر ہم باقاعدہ ہو گئے اور فوراً کرسی چھوڑ کر سلوٹ بجا لائے۔ ہماری اس تمیز اور شرافت کا انھیں ذرہ بھر خیال نہ ہوا کیونکہ وہ لڑتے لڑتے سو گئی تھیں بھلا اب جاگ کر کیوں نہ لڑتیں آخر بگڑ کر بولیں۔

کیوں جی ساری ابھی تک نہیں آئی رات کو بھی بھول آئے اچھا اب بازار جا کر فوراً لا دو ورنہ آدھی روٹی ملیگی۔

یہ سنکر ہم اسطرح کانپنے لگے جیسے کہ کوئی پرانا موٹر اسٹارٹ کر دیا جاتا ہے۔ اسی حالت میں ہم نے گذارش کی کہ۔ کیا واقعی اگر ہم اسوقت ساری نہ لائے تو آدھی ملیگی۔

انہوں نے کہا:-

"ہاں ہاں ہاں ہاں ——"

ہم نے خوشامد کے ساتھ کہا۔

"اجی شام کو لا دینگے۔"

انہوں نے غصہ پر سوار ہو کر کہا۔

"ابھی ابھی ابھی ابھی ابھی"

ہم مجبور ہو کر بولے ا——

"ذرا ٹھہر تو جائیے۔"

وہ بھڑک کر بولیں ا——

"نہیں نہیں نہیں نہیں نہیں نہیں نہیں۔"

ہم نے دل ہی دل میں ہاتھ جوڑ کر عرض کیا ——

"سن تو لیجئے" "دیکھئے" شام کو"

وہ آگ بگولہ ہو کر کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں ا——

"نہیں سنتے نہیں سنتے نہیں سنتے نہیں سنتے"

جب ہم نے دیکھا کہ ہماری بیگم صاحبہ زاد لطفہٗ کا دماغ اسوقت ہاف بوائل انڈے کیطرح آدھا کچا آدھا پکا ہو رہا ہے اور اگر اب ہم نے زیادہ کہا سنا تو ضرور ہمیں اپنی کھوپڑی۔ این۔ ڈبلیو۔ آر۔ کے ورکشاپ میں مرمت کے لئے بھیجنی پڑیگی تو بس فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے بازار کی طرف ناک کی سیدھ میں چل دیئے کہ

تم نے تو ناک میں دم کر دیا

ساری لاکر ساری روٹی کھا کر اسطرح اپنے دفتر کی کرسی پر آکر ڈٹ گئے جیسے کہ بلجیم کا قلعہ فتح کر کے آئے ہیں۔ یہاں آکر ہم نے خواہ مخواہ الٹ پلٹ شروع کر دی ابھی اس الٹ پلٹ کو تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی سنکر ہمارا پتلون ڈھیلا ہو گیا۔ سمجھا کہ شاید پھر بیوی صاحبہ مدظلہا کی کوئی فرمائش ٹیلیفون لیکر آئی مگر شکر کہ خیال غلط نکلا ٹیلیفون پر کوئی دوسرا تھا۔

پہلے وہی رسمی ہلو ہلو ہوئی اس کے بعد کسی نے ہم سے سوال کیا سنا ہے کہ آج صبح اٹلی میں زبردست زلزلہ آیا ہے آپ کو اس کے متعلق کچھ معلوم ہے۔

ہم حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ یہ سوال کرنے والا

[بقیہ صفحہ ۷۵۷ پر دیکھئے]

علی گڈھ یونیورسٹی میگزین

حُبّ الوطنی

[مترجمہ جناب زکریا فیاضی ایم۔اے، ایڈیٹر علی گڈھ یونیورسٹی میگزین]

جمہوریہ جرمنی کا صدر جو شاہی زمانہ میں جرمن افواج کا سپہ سالار تھا اپنی کرسی میں بھکا اور ایک نئے سگار کو روشن کیا۔

فیلڈ مارشل بیرن ارخ نے دھوئیں کے بادل اڑاتے ہوئے کہا "ہاں تو آپکا یہ خیال ہے کہ فرانسیسی دوسری قوتوں کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ آخر قلب میں اس یکایک تبدیلی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟"

وزیر خارجہ جو گھٹنوں پر کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے پریشانی کے عالم میں کہا "جناب والا آپکو معلوم ہے کہ ان لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ ہمارے نئے جنگی جہازوں کی موجودگی صلحنامہ کے بالکل خلاف ہے اور اسپرلسترن وراف کی جوشیلی تقریریں۔ اس نے یہ جملہ اس طرح ادا کیا کہ گویا وہ اس مسئلہ پر زیادہ گفتگو فضول سمجھتا تھا۔ اُس نے کہا کہ دراصل بات یہ ہے کہ وہ ہم سے خوف زدہ ہیں اور اُن کو ذرا سا بہانہ بھی دریائے رائن اور اُس کے پل پر زیادہ مدت تک قابض رہنے کے لئے عذر معقول ہوگا۔"

"آہ" بڈھے سپاہی نے اپنی تیز مغولسلی آنکھوں سے جنکے بڑے بڑے افسر کانپ اُٹھتے تھے۔ وزیر کو تکتے ہوئے [illegible] علم تو انھیں مہینوں سے ہے۔ اور یہ تبدیلی جو واقع ہوئی ہے ابھی دو ہفتہ کی بات ہے۔ اسکا سبب کچھ اور ہی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم اس سے واقف ہو" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس سیاست داں کو اُس نظر سے دیکھتا رہا جس میں محبت آمیز تعظیم اور تمسخر انگیز نفرت دونوں شامل تھیں۔ اُس نے کہا۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ تم سب سیاست داں لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ایک سپاہی جو سیاست میں داخل رہتا ہے اس ہاتھی کی مانند ہے جو پیانو بجانے کی کوشش کرتا ہے" وہ ایک کھسیانی ہنسی سے کہتا رہا۔ لیکن حضرات آپکو مجھ پر بھروسہ کرنا ہی ہوگا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی امداد کروں۔ میں ریاست کا سردار ہوں اور میں آپ سے تمام واقعات کو معلوم کرنا چاہتا ہوں" اس نے سخت لہجہ میں کہا۔

وزیر خارجہ نے کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اس کے سردار نے اس کی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لیا تھا۔ اسکو تمام عمر اس بات کی تعلیم دی گئی تھی کہ سپاہی سوائے معمولی کام کرنے کے اہم ذمہ داریوں کے اہل نہیں ہوا کرتے اسلئے وہ ہمیشہ بھول جاتا تھا کہ جتنا تیز زندہ ہوتا ہے اتنا ہی مضبوط ہاتھ اسکے پکڑنے کو بھی ہونا چاہئے۔ وان پیرش۔ صدر جمہوریہ کو اس کی دماغی قابلیت کی کمی کے باعث زیادہ وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کئے ہوئے تھا کہ ایسے آدمی کی امداد کے بغیر جیسا کہ اسٹرمنبرگ ہے اور جو عام طور پر قابل اعتماد ہے اور سب لوگ اُس کی تعظیم کرتے ہیں۔ وہ خود بھی اس عزت سے کچھ عرصہ پیشتر الگ ہوگیا تھا

وہ فوراً اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا "مجھے امید ہے کہ مجھے کبھی اس امر کی ضرورت پیش نہیں آئیگی کہ کوئی یہ بتائے کہ صدر جمہوریہ کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے اور میرے کیا فرائض ہیں"۔ یہ کہکر اُس نے خوب جھک کر سلام کیا۔ اگر میں ایسا بدنصیب ہوں کہ جناب والا اعتبار کے قابل نہیں سمجھتے"۔ اس موقعہ پر دان اسٹرہبرگ نے دخل دیتے ہوئے کہا "میرے عزیز دوست!" اُس کے جُھریوں والے چہرہ سے اُس فاتحانہ تبسم کا اظہار ہوا جس کے باعث وہ ہر طبقہ کے لوگوں میں ہر دلعزیز تھا۔ ذرا تشریف تو رکھیئے۔ لیجئے یہ دوسرا شکار موجود ہے ہاں تو مجھ جیسے معمر سیاہی کو دماغ کی بڑی ضرورت ہے اور جو ایسا خوش قسمت ہو اُس کے خیر خواہ تشیر تم جیسے شخص ہوں"۔

وان پرش نے دوبارہ سلام کیا۔ ہنسا اور بیٹھ گیا وہ اس تعریف سے خوش تو تھا۔ مگر اُسے غصّہ تھا کہ اُس نے ایسے شخص سے تکلم کیا جسے وہ ہمیشہ قابل نفرت خیال کرتا تھا۔ جب وہ آیا تھا تو اُس کا ارادہ زیادہ دیر گفتگو کرنیکا نہ تھا۔ لیکن اب کوئی مفر نہ تھا۔ اُس نے اپنی پریشانی کو امتحان کے بہانے سے چھپانا چاہا۔ اور جب دونوں اطمینان سے آرام کرسیوں پر جو انگیٹھی کے پاس بچھی تھیں بیٹھ گئے تو اُس نے بالآخر کہا۔ جناب کا خیال ٹھیک ہے کہ کوئی اور ہی وجہ ہے لیکن وہ ایسی غیر یقینی ہے کہ اُس کے متعلق گفتگو کرنا تحصیل حاصل ہے۔

"تاہم میں سُننا چاہتا ہوں"۔

مجھے خیال ہے کہ آپ کی اپنے بھانجے کاؤنٹ ارنم سے جبکہ وہ ایک ماہ کا عرصہ ہوا برلن میں موجود تھا۔ خوب ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ایک عجیب سا سوال معلوم ہوتا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنے اُسکے خیالات کا کیا جائزہ لیا"۔ صدر نے غور کیا "اُس کے خیالات! ہوں۔ لیکن پرش صاحب میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے آپ کی کیا غرض ہے۔ مگر چونکہ آپ مجھ سے دریافت کرتے ہیں تو میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ بالکل آزاد خیال اور خوش و خرم نظر آتا تھا۔ اور گذشتہ ایام کی بہ نسبت اب زیادہ ہوشیار معلوم ہوتا تھا"۔ بالکل بجا ارشاد ہے۔ کاؤنٹ جیسے علمدوست شخص کے متعلق جو کہ پچھلے دو سال سے متعلق ہے اپنے عمل واقع سائنشیا میں ہر وقت مصروف تحقیقات رہتا ہے اور اپنے خاندان کے علاوہ کسی فرد سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ یہ خیال کر کے آپ کو تعجب نہیں ہوتا کہ اُس کا میلان طبع اس طرف کیوں رجوع ہو گیا۔

بیشک پھر اسکا کیا مطلب ہے"؟ سیاست داں آگے کی طرف جھکا۔ اور کہا "کیا ایسے آدمی میں اس قسم کی تبدیلی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے مقصد میں جسکی اُسے مدت سے تلاش تھی کامیاب ہو گیا ہے اب ایک کامیاب تجربہ کے بعد چھٹیاں منا رہا ہے"۔

"ہوں۔ لیکن وہ کس مقصد کی تلاش میں تھا جہانتک مجھے علم ہے لڑائی کے ابتدا سے اُس نے اپنی تمام توجہ زراعتی کیمیا اور اجزاء زرخیزی وغیرہ کے معلوم کرنے کی طرف منعطف کر دی تھی"۔

بجا ہے۔ لیکن ذرا اسے بھی تو سن لیجئے جب وہ شہر میں تھا تو اُس نے رات کے وقت دعوت کی اور مدعوئین

میں میرا نوجوان سکریٹری جارج مان اور ہلدا ہسلنگ ایکٹرس
بھی شامل تھیں" آہا ہا۔ وہ عورت"۔ بوڑھے نے اپنی بھنوؤں
کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن دوان برش نے اس فقرہ کو نظر
نظرانداز کردیا۔ کاؤنٹ ارنم کے دوستوں سے اسے کوئی
دلچسپی نہ تھی اگر اُنکا موضوع گفتگو غیر ملکی سیاست سے
نہ ہوتا۔ شام نہایت خوشگوار اور فرحت بخش تھی اور کاؤنٹ
نے اپنا حق مہمان نوازی ادا کردیا۔ لیکن شراب کے دور کے
بعد آپ کے بھانجے صاحب نے ایک عجیب بات کہی۔ اُس نے
کہا کہ دشمنان جرمنی کو خبردار رہنا چاہیئے کہ اُن پر یکایک
تباہی نازل ہونے والی ہے جیسا کہ صاف آسمان میں بجلی
کڑکتی ہے۔

صاف آسمان میں بجلی کڑکتی ہے" آخر اس سے اُس کا
کیا مطلب تھا۔ اسٹرینبرگ نے پریشان ہوکر دریافت
کیا۔ کارل نہ تو مذہبی آدمی ہے اور نہ شر المقام کے موقعہ
پر شیخی بگھارنے کا عادی۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ کیا اُس نے
یہ کچھ اور بھی کہا تھا؟

"اور تو کچھ نہیں۔ کیونکہ اُس نے فوراً محسوس کیا کہ
اُس کا طرز عمل ناشائستہ تھا۔ اُسنے لبوں پر مہر خاموشی لگالی"۔

میں اُس کی تہ تک پہنچ کر رہونگا" اسٹرینبرگ نے
کہا" اچھا پھر بعد میں کیا واقعہ ہوا؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ
پچھلے دو ہفتوں میں کاؤنٹ کے محل میں زبردستی داخل
ہونے کی دو مرتبہ کوششیں کی گئی ہیں پہلی دفعہ تو عادی اور
پیشہ ور چور تھا۔ جس نے اقرار کیا کہ اُسے ایک مشہور
بین الاقوامی جاسوس نے ہدایت کی تھی۔ اور دوسری
مرتبہ خود جاسوس بنا جسے کاؤنٹ کے کتے نے قریب قریب
پھاڑ ڈالا ہوتا۔ اور میرا خیال ہے کہ خود کاؤنٹ بھی ابھی تک
خطرے سے باہر نہیں ہوا وزیر نے کہا۔

۔ اب میں تمام معاملہ کے نزدیک پہنچ گیا۔ معلوم
ہوتا ہے کہ کسی غیر شخص نے اس گفتگو کو سن لیا صدر نے سیٹی
بجاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں زیادہ کدو کاوش کی ضرورت پیش نہیں آئی"۔
برش نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا" ہلدا اور فرانسیسی فوجی
سکریٹری کے جو ایک چالاک شخص ہے بہت گہرے تعلقات ہیں۔

تھوڑی دیر خاموش رہی۔ اسی اثناء میں اسٹرنبرگ
نے اسی حیرت انگیز انکشاف کو باغ میں محفوظ کرنے کی
کوشش کی۔" مجھے فوراً کارل سے ملاقات کرنی چاہیئے اور
اس حقیقت کو معلوم کرنا چاہیئے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ
چاہے اصل معاملہ کچھ ہی ہو جو کچھ اسوقت معلوم ہوا ہے یہ
بین الاقوامی تعلقات کی موجودہ صورت میں بہت اہمیت
پکڑ جانے والا معاملہ ہے"۔ اس نے پاس والی گھنٹی کو بجایا
ایک سکریٹری ہاتھ میں لفافہ لئے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اور صدر
کو دیکھکر کہا حضور والا یہ تار ابھی ابھی موصول ہوا ہے"۔
اور حکم کا منتظر رہا۔ بڈھے سردار نے لفافہ کھولا۔ اور حیرت
سے سانس لینے لگا۔" برش۔ لو سنو!! وہ گھبرا کر بولا اس سے
زیادہ حیرت افزا خوش نصیبی کا موقع دوسرا نہیں ہو سکتا۔
لیکن ٹھہرو" وہ فوراً بولا جب اُسے یہ خیال کہ کمرہ میں وہ
دونوں تنہا نہ تھے۔ "تم خود اسے پڑھ لو"۔ وزیر خارجہ نے
تار کو لیا اور پڑھا۔

ہز ایکسلنسی صدر صاحب برلن

میں آج برلن آؤنگا۔ کیا آپ مجھ سے فوراً ایک ضروری بین الاقوامی مسئلہ پر گفتگو کر سکتے ہیں۔

کارل ارنم:۔

اسٹربنرگ نے سکریٹری سے خطاب کرتے ہوئے کہا "دیکھو جب ارنم یہاں آئیں تو فوراً اطلاع کرنا وہ آج تشریف لانے والے ہیں" نوجوان نے سلام کیا اور چلا گیا۔ اور پھر دوسرے لمحہ داخل ہوا۔ "جناب عالی کاؤنٹ تشریف لے آئے ہیں" اُس نے کہا۔ صدر نے مستفسرانہ انداز میں پرنش کی طرف دیکھا۔ جسے پاؤ گھنٹہ کے بعد دوج وزیر سے ملاقات کے وعدہ کا خیال آگیا۔ وہ اُٹھا اور سلام کے بعد زور دیکر کہنے لگا۔ "مجھے توقع ہے کہ حضور والا عنقریب کوئی خوشخبری سنائیں گے"۔ صدر بھی کھڑا ہو گیا "بیشک مجھے بھی یہی امید ہے"۔ اُس نے جواب دیا۔ پھر اُس نے سکریٹری کو حکم دیا کہ وزیر کو باہر جانے دو اور کاؤنٹ آنے دے۔ ایک نہایت مختصر واقعہ کے بعد مندرجہ ذیل بحث کا کمرہ میں آغاز ہوا۔

کاؤنٹ کارل وان آرنم۔ اسٹربنرگ کی عزیز بہن کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کی عمر تخمیناً ۴۰ سال تھی لیکن عمر کے لحاظ سے زیادہ معمر معلوم ہوتا تھا اُسکے بال پیشانی پر سے سفید ہو چکے تھے اور چہرے پر جھریاں پڑ چکی تھیں۔ اور اگر ایک طرف اُس کی بلند پیشانی اُس کی عقلمندی اور دماغی طاقتوں کی مظہر تھی تو دوسری طرف گہری سیاہ آنکھیں عمیق جوانی کی آگ ہمیشہ روشن رہتی تھی۔ اور سیدھی ناک باریک اور سوتواں ہونٹوں اور سخت جبڑے سے پختگی ارادہ کا پتہ چلتا تھا۔ وہ بالکل سیدھا ساکت کھڑا رہا۔ حالانکہ زخم کے باعث جو اُسے جرمن محافظ کی بندوق سے ایک موقع پر پہنچا تھا۔ اُسکی ٹانگ لنگ کرتی تھی۔ کیمیاوی تحقیقات میں کام کرنے سے اُسے نمایاں خدمات وطن کی انجام دی تھیں۔ صلح کے بعد وہ پھر ایک مرتبہ سلیشیا کے قلعہ میں جاگزیں ہو گیا۔ تاکہ تنہائی و غربت میں اپنی زندگی مکمل میں گزار دے۔ وہ خاموش طبیعے سنجیدہ مزاج اور متفکر قسم کا آدمی تھا۔

صدر نے اپنے خواہر زادہ کو تپاک سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ "پیارے کارل" اُس نے متبسمانہ انداز میں کہا "یہ کیا دلکش تعجب ہے کہ پہلے تو تمہارا تار ملا اور پھر فوراً ہی تم خود آگئے۔ اچھا اب گھر کی خیریت بتاؤ۔ سیسلی۔ بچے اور میری عزیزہ مینا کا کیا رنگ ڈھنگ ہے"۔ اور اُسے کرسی پر کھینچ بٹھایا۔ اور سگار اور شراب سے اسکی تواضع کی۔

"وہ سب بخیریت ہیں اور آپ کو سلام عرض کیا ہے" کاؤنٹ نے مختصر الفاظ میں جواب دیا "آخر لمحہ میں نے طیارہ سے آنے کے لئے طے کیا تاکہ وقت کی بچت ہو سکے کل میں نے رائین لینڈ اور فرانسیسیوں کے جھگڑے کی بابت پڑھا تھا اور اسی لئے میں حاضر ہوا ہوں" "فرنچ اور رائین لینڈ؟" اُسکے ماموں نے پوچھا۔ "یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن بھلا برلن میں تمہاری موجودگی سے جمہوریت کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ میرے عزیز پہلے اس کا جواب دو۔ یکایک اُس کی نگاہ ایک بڑے صندوق پر پڑی۔ جو بادامی کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ اور جو کارل نے کرسی کے قریب رکھدیا تھا۔

"اوہو۔ کیا یہ کوئی تحفہ ہے جو تم میرے لئے لائے ہو" اس نے دریافت کیا۔ کیا اس میں وہ سامان موجود ہے جسکی بدولت مجھے برلن کی نمائش سے اناج کا انعام ملے گا۔ یا یہ کوئی پر اسرار شعاع ہے جس کے ذریعہ تم مادر وطن کے دشمنوں کی دھجیاں فضائے آسمان تک اڑا دوگے" یہ کہکر وہ کرسی میں لیٹ گیا۔

"لیکن ان لفظوں کا اثر مہمان پر غیر معمولی ہوا۔ وہ اچھل پڑا اس کے چہرے پر کسی قسم کے رنگ کا اثر نہ تھا وہ اپنے ماموں کی طرف منہ کھولے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر دروازہ کی طرف جھپٹا اسکو مقفل کیا اور کنجی اپنی جیب میں رکھ لی۔ بڈھے نے اس حرکت پر کچھ زیادہ استعجاب کا اظہار نہیں کیا آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "ہوں پہلے اسکو ٹھکانے سر لگایا ایک بڈھے بیوقوف سپاہی کے لئے یہی بس ہے۔

اس کا بھانجہ بھی اپنی کرسی پر لیٹ گیا۔ اور شراب اور پانی کا ایک گلاس چڑھا کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سگار کو روشن کرنے لگا "خدا محفوظ رکھے" اس نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ راز افشا ہو گیا ورنہ آپکو کیسے علم ہوا"۔

"میرے بچے صبر کرو صبر۔ پریشانی کی کوئی وجہ نہیں" بڈھے نے ہنستے ہوئے کہا "خوش قسمتی یا محض اتفاقیہ انکشاف جو چاہو سمجھو۔ میں تمھیں اس واقعہ سے مطلع کئے دیتا ہوں" اور اس نے اپنی اور وزیر خارجہ کی گفتگو کا خلاصہ بتانا شروع کیا۔

کاؤنٹ کو اب قدرے سکون ہوا "اگر کل حقیقت یہی ہے تو پھر خطرے کی کوئی بات نہیں"۔ اس نے کہا "لیکن میرے خواب وخیال میں بھی کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ شخص ایسے چلتے پرزے ہیں خدا ہی ان سے سمجھے۔ ان کے جوجی میں آئے کریں اب ان کا وقت قریب ہی آگیا ہے"۔ وہ کرسی میں آگے کی طرف جھکا اور اس کی آواز پست ہو گئی۔ "جناب آپکو معلوم ہے کہ ناقابل مقابلہ طاقت اجتماع کے کیا معنی ہیں؟ ان بیوقار موتمروں کا خاتمہ اور پیرس میں ہماری شرائط کی جیت انشاء اللہ۔

ناقابل شکست طاقت۔ کارل اس سے تمہارا یہ مطلب تو نہیں:

"جی ہاں۔ صلح کے بعد سے اسی ادھیڑ بن میں منہمک ہوں۔ ابھی ایک ماہ کا عرصہ ہوا کہ محض اتفاقیہ طور پر مجھ پر اسکا انکشاف ہوا پچاس پچاس میل کے گردے کے ہر قسم کے آتش گیر آلۂ حرب کو میں نے ناقابل استعمال کر دیا ہے۔

کیا وہ بھیگ گیا"۔

بھیگ گیا نہیں تو۔ ایسی تباہ کن اور حیرت انگیز مذاقیہ چیز کوئی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر وہ مسالہ جس پر شعاع کا اثر ہو جائے گا کام نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اسکے اجزاء کی خاصیت ہی میں تبدیلی ہو جائیگی۔ مجھے افسوس ہے کہ معاملہ ذرا ٹھہرا ہے۔ لیکن آپکو صندوق کے تمام کاغذات سے ضروری حالات بجز چند نازک و دقیق مسائل کے معلوم ہو جائینگے"۔

اشٹربرگ نے چہرہ کو صاف کیا۔ ہاں یہ ہی ایک سپاہی کا جو سنگ پارس جو فوجی اختراعات کا باوا آدم ہے اور جواب اسکے ہاتھ اور وہ تذبذب میں تھا کہ آیا اسے اس کی ضرورت تھی یا نہیں۔ اپنی غیر محدود اور لاتعداد ذمہ داریوں کا احساس کر کے جو اس بڑی عمر میں اس پر عائد تھیں جبکہ بہت سے آدمی قبروں میں سوتے ہیں یا گھروں میں معمولی زندگی بسر کرتے ہیں اور جو نہ صرف دوسرں مصیبت کا باعث

ہوتے ہیں بلکہ خود اُن کی جان عذاب میں ہو جاتی ہے۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اسکو محسوس ہوا کہ ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ اُسکے چہرہ پر ہے اُس نے آہستہ سے کہا "کارل بڑی گرمی معلوم ہو رہی ہے۔ ذرا کھڑکی تو کھولدو۔ اور مجھے تھوڑی شراب پانی میں ملاکر دو۔

کاؤنٹ نے ویسا ہی کیا۔ جب کہیں آدھے منٹ کے بعد اُسکے ماموں کے ہوش ٹھکانے ہوئے۔ ماموں جان معاف فرمائیے۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے سوچ سمجھ کر یہ بات کہنی چاہئے تھی۔ جب آپ اس مطلب کو سمجھ جائینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ایجاد سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور جس لمحہ اس شعاع کا عمل ظاہر ہوگا موجودہ بحث و تمحیص کا بالکل خاتمہ ہوجائیگا۔ لیکن اس بات کا سمجھ لینا آسان کام نہیں ہے۔

کیا تمھیں یقین ہے کہ تمہارا دعویٰ بالکل درست ہے۔"

بڈھے نے اپنے مخصوص انداز میں دریافت کیا اس سوال کا جواب دینے کے لئے آرنم نے برسلا گزٹ کا ایک پرچہ نکالا اور ماموں کے ہاتھ میں دیکر کہا "دیکھئے جہاں میری انگلی ہے اسے ملاحظہ کیجئے"۔ اسٹربنرگ نے عینک لگائی اور پڑھنا شروع کیا۔

اوپل سے ایک عجیب واقعہ کی خبر آئی ہے۔ وہاں پہلے جمعہ کو فوج کے ایک دستہ نے اپنے سالانہ چاندماری کی نصف کے قریب گولیاں اچھی ثابت ہوئیں لیکن بقیہ میں کچھ ایسا حیرت انگیز نقص واقع ہوگیا اُسکے بعد بندوقوں سے ایک گولی بھی نہ چھوٹ سکی۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس واقعہ کی تحقیقات کی جارہی ہے"۔ بڈھے نے اپنے بھانجے کی طرف مستفسرانہ انداز میں دیکھا مجھے یقین ہے کہ تم نے ایسا نہیں ..... اُسنے کہا

لیکن کارل نے فوراً ہی اسکو چپ کردیا۔ "ہاں ہاں"۔ وہ فوراً چلایا "یہ تو خداداد موقع تھا۔ اور میں نے اس سے فائدہ اُٹھایا میرے مکان سے اوپل کے میدانوں میں جہاں چاندماری کا انتظام تھا پچاس میل کا فاصلہ ہے لیکن ایک دوست نے جو اس دستہ میں ملازم ہے مجھے چاندماری کے وقت سے اطلاع دی تھی۔ اور اس سے بہتر اور کون موقع مل سکتا تھا"۔

صدر کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ زیادہ دیر تاب مفارقت نہ لاسکیگا۔ اسکے بھانجے کی ہیبت انگیز شخصیت اسکو ایک چھتہ کی طرح اپنے میں پوشیدہ کئے لیتی تھی۔ جس سے اُس کی غور فکر کی قوت سلب ہوتی جاتی تھی۔ اب مجھے یہاں سے الگ ہونا چاہئے اور پھر اطمینان سے کل معاملہ کے متعلق غور کرنا چاہئے یہ تمام واقعہ کسقدر عجیب اور پریشان کن ہے لیکن تاہم اسکا مقابلہ کرنا اور اُسکی فوجی سیاسی اور روحانی غرض ہر طریقہ سے جانچ پرتال کرنے کی ضرورت ہے"۔ وہ اپنے دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ پھر یکایک کارل سے کہنے لگا۔ کارل دیکھو مجھے ابھی تھوڑی دیر پھر ایک شخص سے ملاقات کرنی ہے اور پھر ایک دعوت کی تیاری۔ تم یہ کاغذات میرے پاس چھوڑ جاؤ تاکہ میں اطمینان سے دیکھ لوں اور پھر آٹھ بجے رات کے میرے ساتھ کھانے میں شرکت کرو۔ اسوقت اس مسئلہ پر غور کرینگے۔

کارل اُٹھ کھڑا ہوا "شکریہ جناب"۔ اُس نے کہا "مجھے یہ بات منظور ہے۔ آپ کو اس صندوق میں وہ تمام ہدایتیں ملجائینگی جن سے آپ خود اگر میں کسی سبب سے رات کیوقت حاضر نہ بھی ہوسکا۔ اس عجیب ایجاد کا حال جان جائینگے"۔ اس نے گچھے میں سے ایک کنجی نکال کر صدر کی نظر کی: "پیارے تم اپنی حفاظت بھی کرو۔ بڈھے نے گھبراتے ہوئے کہا "اگر دشمن اس عبارت

کا ان الفاظ سے جو تم نے دعوت کے موقعہ پر ادا کئے تھے مقابلہ کرینگے تو وہ پریشان ہوجائینگے اور کیا عجب ہے کہ وہ پہلے تمھیں کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کریں۔

کارل ہنسا "میں نہیں سمجھتا کہ کوئی زیادہ اندیشہ کی بات ہے۔ لیکن میں بیوقوف نہیں ہوں میں دوپہر کے وقت برسٹل میں اپنے کمرے ہی میں رہوں گا۔ تو پھر میں آٹھ بجے تمہارا انتظار کرونگا صدر نے کہا۔

کاؤنٹ نے سلام کیا اور رخصت ہوا۔ بڈھا قائد اعظم اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف ہوگیا۔ وہ زیادہ تر اپنے ہی خیالات میں مستغرق رہا۔

اسکا سر جھکا ہوا تھا۔ ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے تھے اور وہ خیالات میں محو اپنے پیارے پھولوں کے تختوں سہ پہر کی ساری دھوپ میں ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ اُس نے بغور اُن مسودات کو جنکا تعلق اس ایجاد سے تھا۔ پڑھ لیا تھا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا جس کی تصدیق اُسکے بھانجے کے اخلاق و عادات سے جن سے وہ بخوبی واقف تھا ہوگئی کہ ارنم کے دعاؤں کی بلند آہنگی میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ جرمنی کے پاس ایک اسلحہ تھا جسکو استعمال کرکے وہ نہ صرف اُس انصاف کو حاصل کرسکتی تھی جس کی اُسے ضرورت تھی بلکہ جس سے جنگ کے فیصلہ کو اُلٹا جاسکتا تھا اور اُن مقاصد میں کامیابی حاصل کیجا سکتی تھی جنکا تخئیل بھی جرمنی کے قبل از جنگ سیاست والوں کے دماغ میں موجود نہ تھا اور اس طرح اب جرمنی بلکہ کسی جنگ کے ناقابل مقابلہ قوت دنیا کی بن سکتی تھی اگر اس کو استعمال کیا گیا۔ کس طرح اُسکا پرانا رفیق لٹنرڈ وارفن امیر البحر ترالو اور اُن کے ہمراہی اس شئے کے خیال ہی سے حیرت میں رہ جائینگے۔

کیونکہ وہ خود بھی دس سال بیشتر بلکہ پانچ سال قبل ہی جبکہ جمہوریت کا صدر نہیں ہوا تھا۔ اس قسم کے مسئلہ کسی صداقت پر بمشکل یقین کرسکتا۔ لیکن وہ کوئی مصلح قوم نہ تھا تو پھر اُسے پریشان کیوں ہونا چاہئے تھا۔ اُس نے ہماری دماغی حالت کا جائزہ لینا شروع کیا۔

یہ ظاہر ہے کہ دول متحدہ نے جرمنی کو قوت کے ذریعہ زیر کیا اور قوت ہی سے ابتک قابض بھی ہیں۔ لیکن اگر جنگ میں جرمنی کو فتح نصیب ہوجاتی تو نقشہ دوسرا ہی ہوتا اور تلافی نقصان کا رخ دوسری سمت میں ہوتا۔ ٹھیک اسی طرح ہر شکست خوردہ فریق کو جنگ کے از سر نو جاری کرنے کا حق حاصل ہے۔ جب وہ جنگ کے قابل ہوجائے اور جتنی حقیر شرائط صلح فاتح قائم کرنا چاہتا ہے اسی قدر مفتوح کے لئے یہ امر ناگزیر ہوجاتا ہے کہ وہ جنگ کے فیصلہ کو جلد ترالٹ دینے کی کوشش کرے۔ مزید براں اسکا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جوں ہی طاقتور ہتھیار ہاتھ میں آئے تو بڑے بڑے شہروں کو یک قلم تباہ کردیا جائے اس حکمت کے خلاف خود اسکا ذہن ہی بہ حیثیت ایک شریف انسان اور سپاہی ہونے کے بغاوت پر آمادہ ہوجاتا۔ لہذا دونوں طرف ایک جان کا بھی نقصان نہ ہونا چاہئے۔ جب تک کہ دشمن بالکل آپے سے باہر نہ ہوجائے۔ اس ایجاد کے ایک مختصر سے مظاہرے سے معاہدہ لوکارنو اور کیلاگ صلحنامہ کی موجودگی کے باوجود بھی بڑی سے بڑی طاقت کو زیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک نہایت موثر اور پرامن طریقہ ہے جس سے بحالات موجودہ ہم اپنی خواہش کو دشمنوں سے تسلیم کرا سکتے ہیں۔

لیکن اس سے موثر ہونیکے متعلق ہی شک تھا۔ پہلے

زمانہ میں لڑائیوں میں ہوشیار و فہیم فاتح شاید ہی ایک خاص حد سے تجاوز ہوتے تھے۔ یا تو اس خوف سے کہ کہیں مفتوح قوم عاجزی کی حد تک نہ پہنچ جائے اور یا تمام غیر جانبدار اقوام اسکے خلاف میدان میں نہ آجائیں۔ لیکن اب تو کوئی ایسی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکے گی۔ ایک قوم تو کیا اگر بہت سی قومیں بھی ملجائیں اور تمام مہذب وغیرہ مہذب دنیا اس کے خلاف جنگ آزما ہو تو بھی جسکے ہاتھ میں یہ طلسم ہوگا سب اُسکے عاجز اور ماندہ نظر آئینگے۔

وہ اس دنیا کی اتنی منزلیں اسلئے طے نہیں کرچکا تھا کہ اس ذراسی بات کو بھی نہ سمجھے کہ چاہے دوسری اقوام کچھ ہی کیوں نہ ہوں اُس کی اپنی قوم اس قابل نہ تھی کہ اگر اسکو پورے پورے اختیارات دیدیئے جائیں تو وہ اُنکا ناجائزہ استعمال نہیں کریگی مزید براں قوم میں مطلق العنانی ہرگز نہ ہونی چاہیئے۔ اس جمہوریت کا ایک فرد بھی اس طاقت کے فائدہ سے محروم نہ رہ سکے گا۔ لیکن اب ایک آدمی یا چند آدمیوں ایک گروہ جو کہ شعاع کے بھید سے واقف ہوگا باقی تمام انسانوں پر اپنی لاانتہا طاقت سے غلبہ پائے گا۔ چاہے سیاسی وجوہات کے باعث وہ اس پنجۂ فولاد کو کتنا ہی کیوں نہ چھپائے۔ دراصل اُسکے معنی اٹلی سے بھی زیادہ مطلق العنان حکومت قائم کرنے کے ہیں اور اسطرح ایک آدمی دیوتا کے مانند دنیا پر حکمران ہوگا۔ اور لوگ اس سے دیوتا ہی کی طرح خوف کھائینگے۔ انکی پوجا کرینگے اور اس سے متنفر بھی ہونگے۔

اُسے صاف صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسکا کیا انجام ہونے والا ہے جرمنوں کے علاوہ ہر ایک سائینس داں اور جہانتک اس مسئلہ کا تعلق ہے خود اس کی اپنی قوم کا ہر ایک علمدوست شخص جو اخلاقی آئیڈیلزم کا دلدادہ ہے ذرات زمین دور یا دور دراز فاصلہ پر معملات میں کام کرے گا تاکہ اس شعاع کا توڑ معلوم کر سکے یا اس سے زیادہ اثر انگیز شعاع پیدا کرے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک ہفتہ بھی نہ گذرنے پائیگا کہ اس راز کو چرالینے یا خرید لینے کی کوششیں ہونے لگیں گی۔ اور کیا عجب ہے کہ ایک قرن کے بعد۔ یا شاید نصف صدی گزر جانے پر یہ کوششیں کامیاب بھی ہوجائیں۔ اور مظلوم اقوام اس طاقت سے جس نے اُنپر ظلم توڑے ایسا بدلا لیں گی کہ اُس کے خیال ہی سے کپکپی چڑھ آئے گی۔ تمدنی اور روحانی لحاظ سے قطع نظر کرکے اگر محض سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس ہتھیار کے استعمال سے جو خطرات لاحق ہیں وہ اُن فوری منافع سے کہیں زیادہ ہیں جو اسکے استعمال سے حاصل ہو سکیں گے۔

اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اسکا کچھ استعمال سیاسی چالوں میں کیا جا سکے؟ لیکن ایک لمحہ کے بعد یہ خیال بھی ذہن سے نکل گیا۔ کیونکہ چاہ کندن را چاہ درپیش کا معاملہ بڑا ٹھہرا ہے۔ بُرائی کرتے وقت ہمیں خود بُرائی کے نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور یہ پہلی دلیل کی رو سے ناممکن ہے۔ بخلاف اسکے خفیہ شرارتوں اور پوشیدہ ستم رانیوں سے خود اسکی طاقت کمزور ہوتی جائیگی۔ لہذا اگر بآسانی کوئی نیک کام کیا جا سکتا ہے تو وہ اُرکم کو اس راز کے تباہ کر دینے کی ترغیب دینا ہے۔ اور ایک مضبوط قسم کے ذریعہ سے اُس سے عہد لے لینا کہ وہ اسکو پھر کبھی کسی پر ظاہر نہ کرے اور نہ اُسکو معرض تحریر میں لائے۔

اسٹرنبرگ ایک سایہ دار درخت کے نیچے زمین ہی پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا" بھانجے کو سمجھانا گویا بنگالی چیتے کو رام کرنا ہے اور اس میں کامیابی کا امکان معلوم"۔ کارل پرانی کا محب وطن تھا جسکو جرمنی کی ہر چیز سے جس پر انقلاب کا اثر نہ ہوا تھا

محبت تھی۔ بڈھے نے ایک انتہائی انہماک کو بھی طرح محسوس کیا جو شکست کی ان گھڑیوں میں جبکہ ہر شے مائل بہ انتشار تھی نہایت اطمینان سے اس اسلحہ کے تیار کرنے میں مصروف تھا۔ جس سے زبردست طاقت کے فیصلہ کا رد کیا جا سکے۔ وہ کامل نو برس تک چھپے چھپے کام کرتا رہا اور بالآخر کامیاب ہوگیا۔ اسکے قریب میں دوستوں حتیٰ کہ اُس کی بیوی کو بھی اُس کا علم نہ ہوا۔ اندریں حالات کیا یہ امر قرین قیاس تھا کہ یہ اپنی دو ایک گھنٹے کی دلیل و برہان سے اسکے زندگی بھر کے اعتقادات کو بدل سکے گا بخلاف اس بات کا قوی امکان تھا کہ کارل اس کے رد میں یہ خیال کرنے لگا کہ وہ بڈھا ہوگیا ہے اور اُس کے ہوش و حواس بجا نہیں ہیں اور وہ لٹنرن وارف یا تراپو کو اپنا ہم خیال بنالے گا۔

جتنا زیادہ وہ اس مسئلہ پر غور کرتا تھا اسکو یقین ہوتا جاتا تھا کہ یہ ضرور وقوع پذیر ہوگا۔ آج دنیا تباہی و بربادی کے سب سے زیادہ عظیم خطرے میں تھی اور کوئی انسانی طاقت اسکا انسداد نہیں کر سکتی تھی۔ اس عالم یاس میں وہ بڈھا چلا اُٹھا "یا اللہ میں کیا کروں؟"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور محل کی طرف قدم اُٹھائے "جب تذبذب میں ہو تو دوسرا کام چھیڑ دو اور خدا کی روشنی تمہاری رہبری کرے گی" یہ تھا اُسکا اصول جس پر وہ تمام عمر کار بند رہا تھا۔ اب رات ہو چلی تھی۔ اسے گھر جا کر کھانے کی تیاری کرنی چاہیئے تھی۔ جب وہ شاندار پیاری جھاڑیوں کے درمیان سے جن پر برلن رشک کرتا تھا گزر رہا تھا۔ تو اُس نے ایک جانور کو راستہ کاٹتے دیکھا۔ غریب جانور جب اُسکا پاؤں اُس کی دُم پر پڑا تو معلوم ہوا "دیکھو اسے بھی زندگی پیاری ہے لیکن میرے پھول تو اس سے بھی زیادہ عزیز ہیں" اور وہ محل میں داخل ہوگیا فوراً کپڑے تبدیل کئے اور آگ کے سامنے تاپ تاپ کر جسم کو گرمانے لگا۔ اور کارل کا منتظر رہا کہ یکایک روشنی آئی اور اُس نے اپنے فرض کو پہچان لیا

کھانے پر قریب قریب خاموشی طاری تھی۔ اور بے لذت معلوم ہو رہا تھا۔ خدمت گاروں کو موجودگی میں صرف چند غیر متعلق باتوں پر گفتگو ہوئی اور وہ بھی چند لمحوں کے لئے۔ ارنم کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس نے اپنے ماموں کو بیشتر کبھی ایسا سن رسیدہ اور پریشان نہیں دیکھا ہے "کیا اب وہ پیرانہ سالی کی حد میں داخل ہوچکا ہے"۔ اُسے سخت تعجب تھا اور کیا اسّی برس کی عمر میں اُسمیں اتنی طاقت ہے کہ وہ اس قسم کے مشکل مسائل پر غور کر سکے"۔ اسے افسوس تھا کہ کیوں اُسے پہلے لمحہ میں لٹنرن وارف سے جو ایک بے خطر جانباز وزیر ہے اپنی اس ترکیب کا تذکرہ نہ کر دیا۔ اس کے شبہات کی فوراً تصدیق ہوگئی کیونکہ جوں ہی وہ دونوں دارالمطالعہ میں آگ کے سامنے اطمینان سے بیٹھے۔ تو صدر نے اپنی مخصوص پیرایہ میں اپنا قطعی فیصلہ سنا دیا۔

"کارل" اُس نے اپنے بھانجے کے چہرے پر آنکھیں گڑو کر کہا۔ جرمن قوم کے نام کا پاس کرتے ہوئے میں تمھیں مادر وطن کی حد تک بے لاگ خدمت کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور کوشش کرونگا کہ تمھیں اسکا معقول اجر ملے۔ لیکن اُن وجوہ کے باعث جو میں تمھیں بتاؤنگا اور جنکی بابت میرا خیال ہے کہ وہ معقول و مناسب ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ملک اس طاقت کے استعمال سے جو تم اسکو تفویض کرتے ہو بہرہ مند نہیں ہو سکتا" یہ کہا اور شراب کا ایک گہرا گھونٹ پیا۔ اور اپنے منہ کو صاف کرنے لگا۔ کیا اُسے امید تھی کہ کارل اس صدمہ کو بخاموشی برداشت

کرسکے گا"۔ لیکن کاونٹ کو ذرا بھی تشویش نہیں ہوئی۔ اگر وہ ذرا ڈگمگایا بھی تو ایک لمحہ کے لئے۔ "جنابعالی کیا میں ان وجوہ کو سننے کا خواہشمند ہوں؟" اُس نے نہایت خاموشی سے عرض کیا۔

اسٹربنرگ نے خیالات کے اس سلسلہ کو دہرانا شروع کیا جس میں سے وہ دوپہر کے وقت گذرا تھا۔ اس کا بھانجا خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اُس نے بڈھے کے چہرے پر سے ایک منٹ کے لئے بھی نگاہ دور نہیں کی صدر نے بغور دیکھا کہ وہ زرد پڑ گیا ہے۔ اور اُس کا بایاں ہاتھ کرسی کے ہتھے کو اس مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے کہ گویا اس سے خون نکل آئیگا جب وہ ختم کرچکا تو نوجوان نے سگار کو آگ کی نذر کردیا اور اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا "جناب والا۔ مجھے امید تھی کہ آپ وطن کے لئے اپنی خدمات کو پایۂ تکمیل کو پہنچا دینگے اور وہ خدمات جن کو فرمانبردار جرمن کبھی فراموش نہیں کرسکتے جب آپ ملک کی اس ایجاد سے اس کامیابی کی طرف رہنمائی کرینگے جو اُس کی راہ تک رہی ہے۔ مجھے سخت ناامیدی ہوئی کہ آپ مختلف خیال قائم کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ لیکن میری یہ جرأت نہیں ہوسکتی کہ میں اُس شخص سے جو میرے خاندان اور حکومت دونوں کا سردار ہے۔ اگرچہ مجھے اس پر افسوس آتا ہے لیکن ذرا بھی شک نہیں ہے کہ آپ اپنے خیالات میں بالکل حق بجانب ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ ملکی مفاد کی خاطر ایسا کر رہے ہیں۔ اگر آپ براہ کرم اُن کاغذات کو واپس کردیں جنمیں اس ایجاد کا ذکر ہے تو میں رخصت ہوں"۔

بڈھا تیزی سے آگے بڑھا اور اسکو دونوں ہاتھوں سے قبضہ میں کرلیا۔ کارل میرے پیارے بچے! میں تمھیں تکلیف دوں ناممکن ہے۔ درحقیقت اب میں تم سے پہلے کی بہ نسبت زیادہ محبت کرتا اور تمھیں زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں لیکن اس طرح تو میں نہ جانے دونگا۔ اور یہی نہیں کہ میں خود اسکو استعمال نہیں کرسکتا بلکہ کسی دوسرے کو بھی استعمال نہ کرنے دونگا۔ کاش تم بھی اس نکتہ کو سمجھتے" "تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے"؟

"پہلے تو مجھے ان کاغذات کو جلانے دو"۔

"اس سے کیا نقصان ہوگا"؟

تو تم میرے سامنے بہ حیثیت ایک سردار ایک شریف جرمن اور فری میسن کے قسم کھاؤ کہ تم تمام تراکیب مسودات اور نمونوں کو جو اس شعاع سے متعلق ہیں تباہ کردو گے۔ اور کبھی اس کے متعلق کچھ نہ لکھوگے اور نہ دنیا کے کسی فرد پر اس راز کو ظاہر کروگے۔ ان سب چیزوں کے متعلق تمھیں قسم کھانی ہوگی۔ اور اسی انجیل مقدس پر ہاتھ رکھ کر جو کیسل میں تمہارے فری میسن برادری میں داخل ہوتے وقت استعمال کی گئی تھی"۔ یہ کہتے ہی وہ کتابوں کی الماری کے پاس گیا اور ایک بڑی سیاہ جلد نکالی اور میز پر لاکر رکھدی۔ پھر دروازے کو مقفل کرکے کنجی جیب میں رکھ لی۔ اور احتیاطاً دونوں کھڑکیوں کو بھی مضبوطی سے بند کردیا۔ بھانجا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُسکا رنگ زرد ہو رہا تھا اور چہرے پر مردنی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ وہ ہونٹھوں کو چبا رہا تھا اور ان سے خون نکل آیا۔

"کارل لو اب تیار ہوجاؤ" بڈھے نے نہایت سنجیدگی سے کہا لیکن ارنم بے قابو ہو کر کرسی پر گر پڑا اور زار زار رونے لگا اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا۔ اسکا جسم سسکیوں کے زور سے کپکپا رہا تھا۔ اسٹربنرگ کچھ دیر تک تو دیکھتا رہا پھر ناک صاف کرکے "خدا ہمپر رحم کرے" کا نعرہ بلند کیا اور شراب کا نصف گلاس

ایک سانس میں چڑھا گیا۔ اب کاؤنٹ بھی سیدھا ہو بیٹھا اور آنکھیں کھول لیں۔ کچھ کہے بغیر صدر نے جام کی طرف اشارہ کیا۔ "مجھے اسپر قابو پانا چاہئے"۔ اس نے دلمیں سوچا "ابھی تو موقعہ ہے گو نہایت نازک ہے"۔ کارل نے سر ہلایا۔ آنکھوں کو رومال سے خشک کیا اور کھڑا ہو گیا "جناب۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی ایسی قسم کھانے کے لئے تیار نہیں"

"تو پھر کوئی دوسری رائے بتاؤ جس سے ملک کو قوم پرستوں کے ہاتھ سے بچایا جاسکے" صدر نے کہا "کوئی بھی نہیں۔ جب تک کہ آپ اپنے ذاتی اثر کو کام میں لاکر حکومت کو اس شعاع کے استعمال کرنے پر مجبور نہ کر دیں۔

میں آخری بات کہتا ہوں کہ یہ قطعی ناممکن ہے"۔

"تو پھر مجھے بھی کامل آزادی ہے اور میں اپنے فعل کا مجاز ہوں"

"سچ ارنم"۔ بڈھے کی آواز میں سختی پیدا ہو گئی۔ "یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جہاں اکثریت کے مفاد کو ایک فرد واحد کی خواہش پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ اگر تمہاری رائے پر عمل کیا گیا تو لوگوں کے مصالح کو کسقدر نقصان پہنچے گا۔ میں اب ان دلائل کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن ایک بات بتائی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے کبھی خود صدر جمہوریت بننے کی کوشش نہیں کی اور محض اس لئے اس عہدہ کو قبول کیا کہ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ میں دوسرے اشخاص کے مقابلہ میں قوم کو زیادہ مستعد رکھ سکونگا۔ اس وقت میں نے قسم کھائی تھی کہ میں جمہوریت اور دستور کو برقرار رکھنے کی کوشش کرونگا۔ چاہے اس میں مجھے اپنی عزیز ترین معتقدات و خیالات کی قربانی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ کچھ عرصہ بعد مجھے یقین ہو گیا کہ قوم کی کثرت رائے جمہوریت کے حق میں تھی۔ وہ اب ملوکیت کے بہ نسبت زیادہ خوش حال ہے اور چونکہ اس قانون کی رو سے اکثریت حکمران ہے میں ایسا کوئی فعل نہیں کر سکتا جو اس کی مرضی کے خلاف ہو جب تک کہ اپنی قسم کو نہ توڑ دوں اندر میں حالات کیا تم انکار کر سکتے ہو کہ جرمنی کی کامیابی کا پہلا نتیجہ جمہوریت کی بربادی ہو گا۔

ارنم نے فرش کی طرف دیکھا۔ اس منطق کا اُسکے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سوائے اسکے کہ وہ کہتا کہ "کوئی دستور اساسی ایسا اٹل اور مستقل نہیں ہے کہ اس میں تبدیلی نہ ہو سکے۔

نہ ہو۔ لیکن قسم کے متعلق تو ضرور ہے۔ اس تیز آلہ کو پوشیدہ ہی رکھنا بہتر ہوتا ہے۔ اس لئے تمھیں لوگوں پر اظہار راز کئے بغیر کام کرنا چاہئے۔ ورنہ اسکا مطلب انقلاب ہوگا تمھیں خوب معلوم ہے کہ موجودہ کاملہ اور ایشتاگ میری بہ نسبت کہیں زیادہ انقلاب پسند واقع ہوئی ہیں۔ اب اگر میں کسی صورت میں بھی انقلاب کو رونما ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ میں نے اپنی مقدس قسم کو توڑ دیا۔ اور وہ قسم تمہاری قسم سے یقیناً زیادہ وقیع ہے اچھا حضرت اب ۱۱ بجتے ہیں دس منٹ باقی ہیں میں تمھیں گھنٹہ بجنے تک کی مہلت دیتا ہوں اس عرصہ میں تم قسم کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر میں انکار کر دوں"۔

"تو تم مجھے ایسی تدابیر اختیار کرنے کے لئے مجبور کر دگے جو میں ریاست کے حق میں مناسب سمجھتا ہوں' اس کا کیا مطلب ہے۔

میں اس معاملہ میں کچھ کہنا بے سود سمجھتا ہوں کیونکہ اسکا مطلب تشدد و تہدید ہوگا لیکن میں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ انجام خوفناک ہوگا"۔

کوئی قسم جو مجبوری کھائی جائے۔ انسان کو مجبور یا بندی نہیں کر سکتی"۔ کوئی مجبوری بھی نہیں۔ ارنم میں تمہاری رگ رگ سے بخوبی واقف ہوں۔ اگر میں سمجھتا کہ تم قسم رکھاکر توڑ بھی ڈالتی ہو۔ تو دوسری تدبیر عمل میں لاتا۔ دیکھو پانچ منٹ اور باقی ہیں۔ اب میں آخری بار تم سے کہتا ہوں کہ غور کرو آیا تم قسم کھانے کے لئے تیار ہو"۔

ایک طویل خاموشی طاری ہوگئی۔ کمرہ میں صرف دو شخصوں کے سانس کی آواز تھی یا گھڑی کی ٹک ٹاک جس سے خاموشی ٹوٹتی تھی۔ اسٹرنبرگ آگ کی طرف پشت کئے ہوئے کھڑا تھا اور کمرہ کی دوسری طرف ٹہلتے ہوئے گھڑی اور اپنے بھانجے کی شکل کے درمیان دیکھتا جاتا تھا گھنٹہ بجا اور دونوں ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ اُن کے درمیان ایک گز کا فاصلہ تھا۔

"اچھا" بڈھے فیلڈ مارشل کی آواز صاف اور مستقل تھی لیکن اُسکا چہرہ بے رونق ہو گیا تھا۔ جناب عالی، مجھے ملک کی خدمت کا احساس ہے میں کوئی ایسی قسم نہیں کھا سکتا" کیا تم نے اپنے خاندان اور اپنی ذات کا جس سے تم جمہوریت کو فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ خوب خیال کر لیا۔ اور تم میرے فیصلہ پر یقین کرنے کے لئے کوئی قطعی رائے قائم نہیں کرسکتے" کاؤنٹ نے سر ہلایا۔ میں نے آخری بات عرض کر دی۔ آپ جو چاہیں کریں آپ کو اختیار ہے۔ تو خدا ہم دونوں کو معاف کرے۔ اور وہ اور دنیا ہم دونوں کے درمیان صحیح صحیح فیصلہ کر سکے میرے اوپر بھی ملک کا فرض ہے"۔ یہ کہا اور پتلون کی جیب سے کوئی چیز نکالی۔

ارنم کے چہرے پر تلخ تبسم کے آثار تھے جب اُسنے پستول کو دیکھا۔ وہ چلایا۔ کہا اسی طرح حب الوطنی کی قدر کیجاتی ہے ماموں جان معاف فرمائیے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کی پیرانہ سالی کا زمانہ ہے۔ تمام عزیز و اقارب کو آپ کی سپرد کرتا ہوں اور وہ مردہ زمین پر گر پڑا اُسکے دل پر گولی لگی۔

دوسرے دن صبح کے وقت جب لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ صدر میز کے پاس ڈھیر ہوا پڑا تھا اور اُسکی بیجان اُنگلیوں میں ایک قلم ابھی تک موجود تھا۔ بلاٹنگ پر ایک یادداشت پڑی تھی۔ جو اُسکے دلکش انداز میں لکھے ہوئے تھے۔ اور جسمیں اُسکی اپنے بھانجے کے ساتھ دونوں ملاقاتوں کی مفصل کیفیت درج تھی۔ اور اس طرح پر ختم ہوئی تھی۔ "میں نے تمام کاغذ جلا دئے ہیں اور اب اپنے تئیں ملک کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہوں خدا کرے وہ...! پھر موت کا فرشتہ آن پہنچا۔ کیونکہ نیچے ایک کاغذ پر ایک بدڈھنگی سی تحریر میں یہ لفظ تھے "خداوندا میرا دل ......"

وان پرش وزیر خارجہ نے اپنے آقا کی اُس آخری یادگار کو اُٹھا لیا۔ اور احتیاط سے جیب میں رکھ لیا اور کہا اے خدا معاف کر۔ اگر میں نے بیوقوفی سے کبھی اسکو پریشان کیا ہو۔ اور رنج و افسوس سے بے تاب ہو گیا۔ (خاص)

غالب

غزل

[جناب مرزا شجاع سابق ایڈیٹر غالب امرتسر]

ہائے وہ چشم سرمسا کیا ہے ہائے وہ گیسوئے دوتا کیا ہے

مژدۂ فصلِ گل اسیری میں بے محل چھیڑ یہ صبا کیا ہے

وہم ہے زندگی اگر اپنی اے خدا پھر یہ ماجرا کیا ہے

حسن اور عشق کا طلسم ہے کیوں یہ جفا کیا ہے یہ وفا کیا ہے

ابر کس واسطے ہے توبہ شکن کیف انگیز ہے ہوا کیا ہے

یہ عدم اور وجود کیسے ہیں یہ فنا اور یہ بقا کیا ہے

لے رہی ہے قدم قیامت بھی تیری رفتار فتنہ زا کیا ہے

مجھ پہ یہ جور بے محل کیوں ہے مجھ پہ یہ ظلم نا روا کیا ہے

اس قدر اجتناب شیون سے آخر اے مرگ یہ ادا کیا ہے

[صفحہ ۷۴۵ کا بقیہ] (خاص)

پاگل معلوم ہوتا ہے۔

ہم نے جواب دیا۔

جناب یہ اخبار کا دفتر ہے اللہ میاں کا گھر نہیں ہے کہ آج ہی آملی کی خبر یہاں آجاتی۔

اس جواب پر لاحول کی آواز آئی اور ٹیلیفون بند۔

ایک منٹ کے بعد پھر ٹیلیفون کھڑکھڑایا گیا۔ ہم پھر پہونچ گئے آواز آئی۔ ــــ

گذشتہ شب کو جاپان میں کوہ آتش فشاں پھٹا ہے کیا آپ کو اس کے متعلق کچھ پتہ ہے۔

ہم نے جلد کہا کہ ــــ

ہاں ہاں فرشتوں کو خبر لانے کے لئے روانہ کیا ہے۔

اس جواب پر بھی ٹیلیفون لاحول کی آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔

آدھے منٹ کے بعد پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور کسی نے سوال کیا: ــــ

آپ کو معلوم ہے کہ کل کی تاریخ میں بحر ہند میں کتنی لہریں اٹھیں تھیں ــ

ہم یہ سوال سنکر غصّہ میں آگئے جی میں آیا کہ ٹیلیفون سوالی کے منہ پر ماردیں۔ مگر مجبور تھے۔ آخر ہم دفتر میں اپنی جوتیاں چھوڑکر گھر کی طرف یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ: ــــ

ٹیلیفون کے تو ان کیڑوں نے تو ناک میں دم کردیا۔

(خاص)

فردوس

سارہ مارٹن

[جناب محمد عبداللہ قریشی۔ سابق مدیر اعزازی رسالہ فردوس،
تصوف، اور قوس قزح لاہور]

وہ غریب ماں باپ کی لڑکی تھی۔ اور ابھی کم سن ہی تھی کہ اس کے والدین اسے داغ یتیمی دے گئے۔ اس کی دادی نے کیسٹر کے مقام پر اس کی پرورش اور تربیت کی وہ حصول معاش کی خاطر امیر گھرانوں میں جاتی۔ وہاں سے سلائی کا کام لاتی اور اس طرح ایک آدھ شلنگ روزانہ پیدا کر کے اپنا اور اپنی پوتی کا پیٹ پالتی۔
۱۸۱۹ء کا واقعہ ہے کہ ایک عورت کو عدالت نے اس جرم کی بنا پر کہ اس نے اپنے لڑکے کو نہایت بے دردی سے زد و کوب کیا تھا اور خود بدچلن ہو گئی تھی۔ یارموت کے جیلخانہ میں قید کرنے کا حکم دیدیا اس کے گناہوں کے قصے تمام یارموت میں فسانۂ بزم و انجمن بن گئے۔ سارہ مارٹن اس واقعہ سے اتنی متاثر ہوئی کہ اس کے دل میں اس عورت سے ملاقات کرنے اور اسے جادۂ ہدایت پر لانے کی خواہش پیدا ہو گئی۔

اس کے پیشتر بھی وہ جب کبھی قیدخانہ کی دیوار کے پاس سے گذرتی تھی تو اس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی تھی کہ کسی طرح وہ اجازت حاصل کر کے اندر جائے اور وہاں کے ساکنین سے ملاقات کر کے انھیں دین کی مقدس کتابیں پڑھ کر سنائیں۔ ان کے اخلاق کی اصلاح کرے اور اس جماعت کی حالت کو جو قانون سے برگشتہ ہو چکی تھی۔ یک قلم بدل دے۔ اب اس کے شوق کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ اس عورت سے ملاقات کرنے میں اپنی خودداری کو قائم نہ رکھ سکی۔ اس نے قیدخانہ کی دہلیز میں داخل ہو کر دروازہ کھٹکھٹایا اور قیدخانہ کے نگرانوں سے اندر جانے کی اجازت مانگی محافظوں نے پہلے تو اسے روکا مگر جب اس نے بہت اصرار کیا تو اسے اندر جانے کی اجازت دیدی۔

جونہی سارہ مارٹن نے اس عورت سے ملاقات کی اور اسے اپنی آمد کی وجہ بتائی۔ عورت اس قدر متاثر ہوئی کہ رو پڑی اور گڑگڑا کر اپنے شکریہ کا اظہار کرنے لگی۔ اس کی اشک پاشی اور شکریہ نے سارہ کی زندگی کی رو کو بدل دیا اور اس نے اسی وقت عہد کر لیا کہ اس کا جتنا وقت سینے پرونے اور گھر کے کام کاج سے بچے گا وہ قیدیوں سے ملاقات اور انکی اصلاح میں صرف کریگی۔

ان دنوں آج کل کی طرح واعظ اور معلم نہیں ہوتے تھے سارہ انھیں مقدس کتابیں پڑھ کر سناتی اور انھیں لکھنا پڑھنا سکھاتی۔ اس نے اتوار اور ایک دن کی فرصت کے سوا باقی تمام وقت ان کے لئے وقف کر دیا۔ چنانچہ وہ خود کہتی ہے کہ۔
"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت میرے شامل حال ہے"

وہ قیدخانہ کی عورتوں کو سینے پرونے اور کتر بیونت کی تعلیم دیتی اور جو کچھ وہ بناتیں انہیں فروخت کر کے ان کی آمدنی سے دوسری چیزیں خریدتی۔ اسی طرح وہ مردوں سے مختلف قسم کی ٹوپیاں بنواتی تاکہ وہ سستی اور بیکاری سے بچے رہیں اور بیہودہ خیالات میں گرفتار نہ ہوں۔

آہستہ آہستہ صنعت و حرفت کا رواج قیدیوں میں عام ہو گیا اور وہ اس سے مانوس ہو کر اپنے لئے کچھ نہ کچھ آمدنی پیدا کرنے لگے۔ سارہ نے ایک امانتی صندوق بنایا اور ہر ایک کی

آمدنی اس میں جمع کرنی شروع کی جب قیدی قید کی میعاد ختم کر کے آزاد کرتے تو وہ ان کا حصہ ان کے حوالہ کر دیتی۔ تاکہ وہ ان کے ذریعہ دنیا کی جد وجہد میں حصہ لیکر صادقانہ زندگی بسر کر سکیں۔

اب چونکہ سارہ مارٹن سارا سارا دن انہیں کاموں میں منہمک رہتی تھی اس کا اپنا کام بالکل ماند پڑ گیا۔ اور یہ مسئلہ پیش آیا کہ وہ محض اسی کام کی ہو رہے یا قید خانہ کے کام سے ہاتھ اٹھائے چنانچہ اس کا اپنا بیان ہے کہ:۔

"میں نے دونوں باتوں پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ اگر حقائق کو دوسروں پر واضح کرتی ہوں تو اپنی روزی کے لئے دوسروں کی محتاج ہو جاتی ہوں پھر خیال آتا ہے کہ اس مقدس کام (یعنی متابعت کردگار اور دوسروں کی آسایش رسانی) کی کوئی چیز بھی برابری نہیں کر سکتی۔"

اس دن سے اس نے چھ سات گھنٹہ روزانہ قیدیوں کی خدمت کے لئے وقف کر دئے۔ اور وہ قیدی بھی جو بیکاری کی وجہ سے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ایک خاص نظام کے ماتحت اپنا وقت نہایت مفید کاموں میں صرف کرنے لگے۔ بعض اوقات نئے قیدی سرکشی کرتے مگر سارہ کی حلیم الطبعی اور ملائمیت انہیں فوراً رام کر لیتی۔ وہ لوگ جو اپنی داڑھیاں خباثت میں سفید کر چکے تھے۔ وہ جیب کترے جو لندن میں بیحد مشہور تھے۔ وہ بچے جنکا اخلاق بالکل بگڑ چکا تھا اور وہ عورتیں جو بدکاری میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ سب سارہ کی مہربانیوں کی معترف تھیں۔ اور یہ درست تھا کہ ان میں بیشتر اشخاص ایسے تھے جنہوں میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ قلم ہاتھ میں لیا یا کتاب کے ابتدائی حروف پڑھے تھے۔

آخر کار سارہ مارٹن قیدیوں سے اس درجہ مانوس ہو گئی کہ کبھی تو وہ کسی کے حال پر آنسو بہاتی۔ کبھی کسی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی اور کبھی کسی کے حق میں دعائے خیر کہتی۔ وہ پاکیزہ جذبات کو ان کے دل میں راسخ کر کے یہ کوشش کرتی کہ وہ صراط مستقیم پر قائم رہیں اور ضلالت سے بچیں۔

وہ پاک نفس اور نیکوکار عورت بیس سال تک یہی کام کرتی رہی۔ مگر اس قدر شوق اور محنت کے باوجود اس کی آمدنی میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوا۔ اس کی آمدنی فقط پچاس یا ساٹھ تومان تھی جو اسے دادی کے ترکہ سے حاصل ہوتی تھی۔

سارہ کی مصروفیت کے آخری دنوں میں یہ قانون نافذ ہوا کہ ہر قید خانہ کے لئے ایک واعظ یا معلم مقرر ہونا چاہئے۔ چونکہ قید خانہ کے ارباب حل وعقد یہ سمجھتے تھے کہ اگر سارہ اس کام پر مامور کر دی گئی تو وہ بہت سی زحمتوں سے بچ جائیں گے۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اس خدمت کے معاوضہ میں ان سے ساٹھ تومان سالانہ لے لیا کرے۔ اس تجویز سے سارہ کی تمام خوشی مکدر ہو گئی اور اس نے صاف انکار کر دیا۔ مگر قید خانہ کے کارپردازوں نے اس پر بہت زور دیا۔ اور یہاں تک کہدیا کہ اگر وہ معاوضہ قبول نہ کرے گی تو قید خانہ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے اس پر بند کر دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ دو سال تک قید خانہ میں معلمہ کی حیثیت سے کام کرتی رہی اور قید خانہ کے ارباب لبست وکشاد شکریہ کے طور پر ساٹھ تومان سالانہ اسے عطا کرتے رہے

آخر سارہ بہت ضعیف ہو گئی۔ قید خانہ کی ہوا نے اسے بالکل کمزور کر دیا۔ اور وہ بستر مرگ پر جا لیٹی۔ بیماری کے دوران میں اس نے ان جذبات عالیہ کو جو پہلے کبھی کبھی فرصت کے وقت اسکے دل میں پیدا ہوتے تھے کام میں لانا شروع کیا۔ اس نے بہت سے مذہبی خیالات کو نظم کے سانچے میں ڈھالا۔ اور ہر چند اس کے اشعار قواعد عروض کے لحاظ سے چنداں قابل ستایش نہیں تاہم بہت سے اشعار عشق خداوندی اور شرافت حقیقی کے حامل ہیں۔

(خاص)

فصیح الملک

ایک ہندی اور صاحب بہادر

[جناب پروفیسر احسن مارہروی سابق ایڈیٹر "فصیح الملک" حیدر آباد]

ایک ہندی نے کہا صاحب بہادر سے خطاب دیس سے پردیس میں تشریف لائے کیوں جناب
کیا طبیعت کے مخالف تھی وہاں کی بود و باش یا خلل انداز تھا کوئی حریف خواجہ تاش
تھی ستم آلودہ فضا، یا تھی خراب آب و ہوا یا مرض تھا کوئی یورپ میں نہ تھی جسکی دوا
رہنے سہنے کو نہ تھی کافی ولایت کی زمیں ہند کے کالوں سے یا بہتر نہ تھے گورے حسیں

کیوں ہوئی مرغوب یہ غربت وطن رکھتے ہوئے
کس لئے صحرا نوردی کی چمن رکھتے ہوئے

یہ تکلم یہ تخاطب منقطع جب ہو چکا ہنس کے یوں صاحب بہادر نے مخاطب سے کہا
ان سوالوں پر مجھے رہ رہ کے آتی ہے ہنسی آپ کی گردن ہے کن چیزوں کے پھندوں میں پھنسی
بود و باش ملک سے کیوں دل ہمارا تنگ ہو تخت جمہوری میں کیونکر انفرادی جنگ ہو
فرحت افزا ہے فضا، آب و ہوا بھی ہے مفید ہر دوا موجود ہے، اکثر مرض ہیں نا پدید
ہیں تمدن اور معیشت کے ہزاروں راستے حسن کے نظارے بھی ہیں عام اپنے واسطے
جس کو غربت آپ کہتے ہیں وہ ہے راحت فزا دیس کا پردیس میں رہ کر اٹھاتے ہیں مزا

ان سوالوں پر تعجب ہی نہیں حیرت بھی ہے
ایسے فہم و ہوش کی اس عہد میں خلقت بھی ہے

کوششیں رہتی ہیں جاری اپنی وسعت کے لئے ہم سفر کرتے ہیں توسیع حکومت کے لئے
فکر رہتی ہے ترقی کی ہمیں شام و سحر بے ترقی کے جئے انساں تو ہے وہ جانور
خدمت ملکی و قومی اپنا فرض عین ہے فرد فرد اس سعی و کوشش کیلئے بے چین ہے
ہم کہیں ہوں لیکن اپنے ملک کے ہیں جاں نثار ہر طرح ہر حال میں ہیں قوم کی خدمت گذار
یہ حقیقت کیا وہ سمجھیں ہیں جو مجبوروں کے پیٹ ان سے پوچھو جن کو ہوں دن رات ایسے مشغلے
آج مغرب میں نہاں ہیں کل ہیں مشرق میں عیاں کرتے رہتے ہیں زمیں سے اڑ کے سیر آسماں

قصہ کوتہ ہے یہی گھر سے نکلنے کی غرض
ورنہ ہم کو ملک سے نفرت نہ ہے کوئی مرض

سن کے ہندی نے یہ سب صاحب بہادر سے کہا جانتے ہیں آپ جب پردیس کو گھر سے سوا
پھر یہ کیسی اجنبیت ہے کہ رہتے ہیں جہاں ہے معیشت کی وہاں سے نفرت کلی عیاں
ہے جدا طرز تکلم ہے الگ جائے قیام ہے نیا ملبوس جسمی ہے نئی قسم طعام
ہند کی آب و ہوا میں جو نہیں موزوں لباس ہر گھڑی ہر دم اسی کا آپکو رہتا ہے پاس
کس طرح ہوگا موافق یہ مخالف امتزاج گرم خطے میں رہے کیوں سرد ملکوں کا رواج

سانگ سے بدتر نہ کیوں ہر ایک بدیسی بھیس ہو
بھیس ہونا چاہئے ویسا ہی جیسا دیس ہو

سن کے یہ تقریر پھر صاحب بہادر نے کہا آپنے جو کچھ کہا وہ ایک حد تک ہے بجا
سنئے اب اس کی حقیقت کیجئے رجا حواس ہم کہیں رہ کر بدل سکتے نہیں اپنا لباس
حدت گرما ہو یا ہو شدت سرما کہیں حسیات اعتباری پر ہمیں تکیہ نہیں
عادتوں پر ہوتی ہیں سب ایسی باتیں منحصر جس کو سمجھو ہے مفید اور جس کو سمجھو ہے مضر
اپنی رسمیں کیوں بدل دیں وہ پرآدیس میں جو بدل لیتے ہوں پردیسی کو اپنے بھیس میں

ہے اثر چاروں طرف اپنا یہ پھیلایا ہوا
ساری دنیا پر ہمارا رنگ ہے چھایا ہوا

عبرت اے اہل خرد! ہشیار اے ہندوستاں ہوتے ہیں دنیا میں اس صورت کے اثباتے نشاں
جس جگہ، جس ملک میں، جس دیس میں پہنچے وہ اپنی دھن میں اور اپنے بھیس میں رہتے ہیں وہ
اہل یورپ کی ہے یہ قومی خصوصیت عیاں بیش و کم دو سو برس سے ہند پر ہیں حکمراں
لیکن اس عرصے میں اپنا ڈھنگ بدلا نہیں رنگ جیسا صاف تھا ویسا ہی ہے گدلا نہیں
سخت ہو کتنا ہی جاڑا تیز ہو کتنی ہی دھوپ ان کا ہر موسم میں رہتا ہے ہمیشہ ایک روپ
جوتیاں دہلی کی ہوں یا لکھنؤ کی ٹوپیاں ساڑیاں کاشی کی جنکو باندھتی ہیں گوپیاں
کتنی ہی اچھی وہ ہوں لیکن انہیں بھاتی نہیں ان کے استعمال میں اشیائے ہند آتی نہیں

ایک ملبوسات و ماکولات و شرب و بات کیا جملہ قول و فعل میں پرہیز ہے ہر بات کا
علم و فن کے حامی و ناشر وہ بیشک ہیں مگر اپنے لٹریچر پہ ہے انکی توجہ سربسر
جو زبانیں ہند میں مشہور ہیں بَینُ العَوَام بُرج بھاشا کہیئے یا اُردو کہ ہندی رکھئے نام
اِن زبانوں میں کسی سے بھی انھیں مطلب نہیں
بولتے ہیں کس طرح ان کو کچھ اسکا ڈھب نہیں
اب میں کہنا چاہتا ہوں بے تعصب ایک بات حُبِ قومی کے مطابق ہے یہ ساری واردات
درحقیقت قوم بنتی ہے انھیں آثار سے ملتی ہے راہِ ترقی بھی اسی رفتار سے
ہم کہ پاس ملک و حُبِ قوم کے ہیں مدعی اپنے کاموں میں نہیں کرتے ہیں سعی واقعی
یاد ہیں باتیں بنانے کے ہزاروں داؤ پیچ لیکن از روئے عمل دیکھو تو گویا ہم ہیں ہیچ
وضع و صورت رسم و عادت گفتگو و ماند و بود سب میں ہے انداز یورپ کی نمائش اور نمود
ٹائی کالر سوٹ مفلر ہر جگہ موجود ہیں ٹوپی کرتے بے کفنوں کے بشیر مفقود ہیں
دیکھئے صورت تو اس سے سادہ لوحی ہے عیاں عورتوں کا سربسر مردوں پہ ہوتا ہے گماں
ملکیوں میں اُردو ہندی پہ جھگڑا ہے بہم لیکن انگریزی سے رغبت بڑھ رہی ہے دم بدم
جمعہ یا شکر سنیچر شنبہ کہنا ہے گراں سنڈے منڈے تھرس ڈے ہے خوب کھلتی ہے زباں
انجمن سازی آج ہیں افرادِ ملکی جس قدر بولتے ہیں سب کے سب ٹرکی بانی ہی گھر
موجِ تقریر لیکن جب مقرر کو ملے صرف انگریزی کے لفظوں پر ہیں گویا چلے
کوئی صوبہ کوئی شہر ایسا نہیں آتا نظر جس میں اہلِ ملک کی ہو وضع یکساں سربسر
صوبہ جات متحد ہوں ڈھاکہ یا بنگال ہو یا جنوب ہند یا پنجاب یا نیپال ہو
ہر جگہ اوضاع و اطوار اک نئی صورت میں ہیں جو اڑیسہ میں ہیں شکلیں وہ کہاں گجرات میں ہیں
لکھنؤ کی واللہ باللہ حیدر آبادی سلام جھنگ اور سرہند کی جنگانہ آہنگ کلام
زبان پورب کی تشدیدیں سہارن پور کی ہیں یہ تشبیہات گویا سنگ اور بلور کی
یہ دکھاتا ہے بہت کم اختلافِ صوبہ وار شرح کیجائے تو ہوجائے وہ از یک تا ہزار
صوبہ واری اجنبیت سے جو ہو قطعِ نظر پھر بھی وضعی اختلافات اس قدر ہیں جلوہ گر
دیکھکر جن کو بجا رہتے نہیں ہوش و حواس ایک ملک اور اس میں اتنا اختلافِ ذی قیاس
ایک گھر میں رہیں اگر دو بھائی ماں جائے یتیم خانہ جنگی کے سبب آپس میں ہیں گویا غنیم
کلمہ گو آقا و خادم ایک ہی ہادی کے ہیں لیکن از روئے عمل دشمن وہ آزادی کے ہیں
ایک دسترخوان پر دونوں بہم آتے نہیں جان کر تو بین کھانا ملکے وہ کھاتے نہیں
اک طرف وہ اک طرف یہ نفرتِ شرب طعام بھائی بھائی کی رسوئی کا الگ ہے انتظام
جب یہ حالت ہو تو کیونکر کس طرح ایکا ہو سکے ایک ایکا ہو تو سوراجوں کا ٹھیکا ہو سکے
آہ کہتا ہوں بحسرت دیکھ کر یہ افتراق
الفراق اے حُبِ قومی! الوداع اے اتفاق
(خاص)

تحفۂ سرحد

محروم کا وطن

(جناب منشی تلوک چند صاحب محروم سابق ایڈیٹر "تحفۂ سرحد" بنوں)

اپنے وطن کی شان میں کہتا ہوں چند شعر ہر چند شعریت سے ہے عاری یہ سرزمین
دوزخ عزیزِ اہلِ عقوبت کو ہو اگر اہلِ جہاں! ہمیں بھی ہے پیاری یہ سرزمیں
آتا خوشی سے کون ہے ایسے مقام پر پیدا یہاں کئے گئے ہم بختِ شوم سے
موزوں تھی بوم و زاغ و زغن کیلئے یہ جا دشتِ عدم ہی خوب تھا اس زاد بوم سے
راحت نہ مل سکیگی مسافر یہاں تجھے قریوں میں لوگ۔ راہ میں کانٹے اُلجھتے ہیں
میداں میں دیکھ بھال کے آ داں اُٹھا یاں دامنِ نگاہ میں کانٹے اُلجھتے ہیں
ہم سا بھی تلخکام زمانے میں ہے کوئی پینے کو آبِ شور بقسمت ملا ہمیں
قابل تھے ہم اسی کے مقدر میں تھا یہی کچھ صانعِ ازل سے نہیں ہے گلا ہمیں
موسم خدا نے دو ہی دیئے سرد اور گرم معدوم اس جگہ ہیں بہار اور برشگال
سرما میں ہے یہ خطہ فزوں زمہریر سے گرما میں اس سے آتشِ دوزخ کو انفعال
ڈاکو وہ سنگدل۔ وہ درندے پہاڑ کے انساں نے گوشت کی جنھیں لت ہے لگی یہاں
تسکیں ہے دن کو وقت نہ ہے چین رات کو محفوظ مال و جان ہے نہ ہے آبرو یہاں
اور اس پہ طرّہ یہ کہ جہالت کے زور میں ہر کوئی ان میں سے یہاں طرّہ باز خاں
وہ سب سے مفتخر ہے جو سب سے زیادہ ہے بدخو و بد سگال و بد اعمال و بدزباں
مٹی خراب حسن لطافت کی ہے یہاں پتھر کے پھول ہیں کہ جفاکش اگرچہ حسیں
پانی سے بھر کے شام و سحر میل میل سے سر پر اٹھا کے لاتے ہیں دو دو گھڑے حسیں
اے سندھ! اوج موج پہ تا حشر تو رہے سے دم کے ایک تیرا نظارہ ہے دلپذیر
ہر چند سبزہ و شجر تر ہیں ناپدید جیون سے مجھکو تیرا کنارہ ہے دلپذیر
پوچھینگے اہلِ ذوق مرے بعد شوق سے کیسا تھا؟ کس طرف کو تھا؟ محروم کا وطن
میرے عزیز کاش فقط نام لیں مرا اس کے بغیر کچھ نہ بتائیں مرا وطن
(خاص)

قوس قزح

پانچ ہزار سال پیشتر کا تمدن

مجموعۂ قوانین بابل

[جناب محمد وحید کیلانی صاحب بی۔ اے ایڈیٹر رسالہ "قوس قزح" لاہور]

سلطنت بابل کے عروج کو کون نہیں جانتا! یہ وہ سرزمین ہے جہاں کا ذرہ ذرہ قدیم تہذیب وعظمت کی ایک روشن تصویر ہے؛ تاریخ قدیم ورق گردانی کرو تو سب سے روشن اور دلچسپ باب وہ ہوگا جسے "تاریخ بابل" کے نام سے موسوم کرتے ہیں باقی دنیا ابھی تمدن سے روشناس بھی نہ ہونے پائی تھی کہ یہاں کے لوگ تہذیب وشائستگی کے تمام مراحل طے کر چکے تھے اگرچہ ہماری دنیا اور بابل کی دنیا کے درمیان ساڑھے چھ ہزار سال کی ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ مگر آفرین ہے اہل مغرب کے ذوق جستجو پہ۔ جنہوں نے اس خوش اسلوبی سے اس خلیج کو عبور کیا کہ ساڑھے چھ ہزار سال کا زمانہ کل کی بات ہو چکا ہے۔

اس عبور قرون میں اہل مغرب کی جو کوشش بروئے کار آئی ہیں وہ یقیناً سزاوار تحسین ہیں۔ لیکن ان قدیم لوگوں کی دقیقہ شناسی بھی قابل ستائش ہے۔ جو ہمارے لئے ایسی ایسی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں۔ جنکی وجہ سے ہمارے علوم میں ایک نہایت دلچسپ اور دانش آموز علم "عراقیات" ASSYRIOLOGY کا اضافہ ہو گیا ہے۔

کون جانتا ہے کہ اس زمین انبیاء ——— عراق عرب کے سینہ میں کسقدر راز محفوظ ہیں! کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ایک نہ ایک راز سربستہ کا انکشاف نہ ہوتا ہو! لیکن جو عظیم الشان راز فرانسیسی مستکشف "ڈی مارگن" نے دسمبر ۱۹۰۱ء میں دریافت کیا تھا۔ اس نے تو بلا مبالغہ دنیائے قدیمیات میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ یہ سنگ خارا کی ایک بہت بڑی اینٹ ہے جو آٹھ فٹ لمبی اور اسی نسبت سے چوڑی اور موٹی ہے اور اسپر دونوں جانب اہل بابل کے قوانین کندہ ہیں۔

اس پتھر نے بیالیس صدیوں تک زمین کی خاموش اور تاریک گہرائیوں میں آسودہ خواب رہ کر ۱۹۰۱ء کے اواخر میں پھر آفتاب کی روشنی دیکھی! اسے حسن اتفاق سمجھئے یا "ڈی مارگن" کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ۔ بہرکیف ایک ایسی چیز دستیاب ہوگئی ہے جسکا کسی کو وہم گمان بھی نہ تھا اور جس نے انسانی تہذیب کے ارتقا کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے کر دی ہے۔ کسی ملک کا صرف نام معلوم کر لینے۔ یا وہاں کے فرمانرواؤں کے نام اور کارناموں کی فہرست مرتب کرنے سے اس ملک کی تہذیب کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر کوئی ایسی چیز دستیاب ہو جائے جس سے وہاں کے باشندوں کی روزمرہ زندگی پر روشنی پڑتی ہو تو اس سے اس ملک کے تمدن ومعاشرت کی جزئی تفصیلات بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ "بابل کا مجموعۂ قوانین" اس قسم کی ایک یادگار ہے اور اس لئے تاریخی دنیا میں اس یادگار

ان پر عملدرآمد نہایت سختی سے کیا جاتا تھا۔ ایچ۔ ایس ویمبر اپنی "تاریخ دنیا" میں رقمطراز ہے کہ اہل بابل کے کئی ایسے قوانین ہیں جو ہمارے موجودہ قوانین کی بنیاد ہیں۔ اس نے ان قوانین پر ایک نہایت عالمانہ تبصرہ سپرد قلم کیا ہے جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ بابلی قوانین یا تعزیرات میں بربریت کا عنصر نہیں تھا۔

اس تمہید کے بعد ہم اس جلیل القدر شہنشاہ حمورابی کے مجموعہ تعزیرات میں سے چند ایک دفعات قلمبند کرتے ہیں۔

۱۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے پر کوئی الزام لگائے اور اسے ثابت نہ کرسکے۔ تو وہ جسکا الزام لگایا گیا ہے۔ دریا پر جائیگا اور پانی میں کود پڑیگا۔ اگر پانی اسے اپنی آغوش میں لے لے (غرق کردے) تو الزام لگانیوالا فوراً جاکر اسکے مکان پر قبضہ کرلیگا۔ لیکن اگر دریا ملزم کو بیگناہ ثابت کرے (اسے غرق نہ کرے) تو الزام لگانے والے کو اسی جگہ قتل کر دیا جائیگا۔ اور اسکی جائداد ملزم کے قبضے میں چلی جائیگی۔

مقدمات کا تفاول سے فیصلہ کرنا درحقیقت خطرناک ہے۔ لیکن اس کا قدیم سے رواج چلا آتا ہے۔

۲۔ اگر کوئی حاکم عدالت کسی (دیوانی) مقدمہ کا فیصلہ سنا دے۔ لیکن پھر اس میں ترمیم کردے۔ تو اسے فوراً معطل کرکے اسپر مقدمہ چلایا جائیگا۔ اور جو سزا اس نے ملزم کیلئے تجویز کی تھی۔ اسکو اس سے بارہ گنا زیادہ سزا دیجائیگی۔ اور وہ ہمیشہ کیلئے عدالت سے برطرف کردیا جائیگا۔

۳۔ اگر کوئی شخص کسی معبد یا شاہی محل سے کوئی چیز چرائے۔ تو اسے فی الفور قتل کر دیا جائیگا۔ اور وہ جس نے اس کی چرائی ہوئی چیز موصول کی ہوگی اسے بھی اس کے پیچھے روانہ کر دیا جائے گا۔

۴۔ اگر کوئی شخص کسی کا بیل۔ گدھا۔ بھیڑ یا ایسا ہی کوئی اور جانور چرائے۔ اور اسکا مالک عمائد سلطنت میں سے کوئی شخص ہو تو اس چور کو مال مسروقہ کا تیس۳۰ گنا معاوضہ دینا ہوگا۔ اور اگر وہ معمولی شہری ہے تو چور دس گنا عوض ادا کریگا، لیکن اگر چور معاوضہ کا انتظام نہ کرسکے تو اسے قتل کر دیا جائیگا۔

چوری کیلئے موت کی سزا بظاہر بے انصافی پر مبنی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت چوری کا سدباب کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی علاج نہیں۔ ایسی حالت میں صرف وہی شخص چوری کا ارتکاب کرسکتا ہے جو اپنی جان سے بیزار ہو

۵۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے غلام (مرد عورت) کو اغوا کرنیکا مرتکب ہو تو اسے قتل کر دیا جائیگا۔

قدیم زمانوں میں لونڈی غلام رکھنے کا بہت رواج تھا طاقتور اشخاص کمزور لوگوں کی لونڈیاں چھین لیا کرتے تھے۔ اسلئے اس قانون کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۶۔ اگر کوئی چور نقب لگاتا ہوا پکڑا جائے تو مالک مکان اسے قتل کر کے اسی نقب میں اسے دفن کر دیگا۔

۷۔ اگر کوئی کسان غلہ بونے کیلئے کسی سے زمین مستعار لے لیکن اس میں کاشت نہ کرے۔ تو مالک زمین اس شخص پر کاہلی کا الزام لگا کر اس سے اتنا غلہ وصول کریگا۔ جتنا اس کے ہمسایہ کے ہم رقبہ کھیت میں پیدا ہوا ہو۔

کاہل الوجود لوگوں کو کام کیلئے مستعد کرنے کیلئے اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں۔ یہ دفعہ فی الواقع شاہ حمورابی کی خیر اندیشی پر دال ہے۔

۸ - اگر کوئی شخص کسی کا مقروض ہو لیکن وہ اپنا قرض ادا نہ کر سکے تو وہ قرضخواہ کو اپنی بیوی - بیٹی یا لونڈی دیکر قرض سے سبکدوش ہو سکتا ہے - لیکن قرض خواہ مقروض کی بیوی - بیٹی یا لونڈی کو تین سال سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھ سکیگا - تین سال کے خاتمے پر وہ اس عورت کو اس مالک کے گھر میں پہنچا دیگا -

قدیم زمانوں میں "عورت" کو مال تجارت سمجھا جاتا تھا - (اور ہندوستان میں تو شاید آجتک اسی قدیم رواج پر عملدر آمد ہو رہا ہے !) اسلئے ضرورت کے وقت گھر کی عورتیں بلا تامل فروخت کر دی جاتی تھیں -

لیکن عجیب بات ہے کہ حمورابی کے زمانہ میں عورت کا کچھ نہ کچھ احترام بھی کیا جاتا تھا - چنانچہ ذیل کی تین دفعات از شمارہ ۹ تا ۱۱ ملاحظہ ہوں -

۹ - اگر کوئی شخص کسی شریف عورت کی طرف انگلی بھی اٹھائیگا تو اسکی پیشانی پر گرم لوہے سے داغ لگایا جائیگا -

۱۰ - اگر کوئی شخص کسی عورت کے لات مار کر اسکا حمل ضائع کر دے - تو اسے دس شیکل (تقریباً بیس روپئے) جرمانہ اس عورت کو ادا کرنا ہو گا -

بیس روپیہ کی آجکل کوئی ہستی نہیں لیکن آج سے پانچھزار سال پہلے بیس روپیہ ایک خطیر رقم سمجھی جاتی تھی - بابلی قانون میں زیادہ سے زیادہ جرمانہ دس شیکل ہوا کرتا تھا -

۱۱ - لیکن اگر وہ عورت لات کی ضرب سے جانبر نہ ہو سکے تو اسکی پاداش میں مجرم کی بیٹی کو قتل کر دیا جائیگا ! اگر اسکے بیٹی نہ ہو تو اسکی بیوی کو اور بیوی بھی نہ ہو تو خود اسے مار ڈالا جائیگا -

اس زمانہ کے ظالم مرد اپنی لونڈیوں اور بعض اوقات اپنی بیویوں سے یہی سلوک کیا کرتے تھے - لونڈی حاملہ ہوتی اور وہ آقا کی بے غیرتی اور ہوس زر کی مزاحمت کرتی - تو وہ سنگدل اسے لاتین گھونسے مار کر اسکا حمل ضائع کر دیتا اس پر یہ قانون نافذ ہوا -

۱۲ - اگر کوئی "ڈاکٹر" کسی شخص کا زخم اچھا کر دے - یا برنجی نشتر سے اسکے کسی عضو پر کامیاب عمل جراحی کرے یا اسکی بیمار آنکھ کو تندرست کر دے - تو شخص زیر علاج اسے ۲۰ روپئے معاوضہ دیگا -

۱۳ - لیکن اگر وہ بیمار دوران معالجہ میں مر جائے - یا اسکی آنکھ ہمیشہ کیلئے خراب ہو جائے - تو اس ڈاکٹر کے دونوں ہاتھ قطع کر دیئے جائینگے -

اگر یہی قانون ہمارے ہندوستان یا کم از کم پنجاب میں نافذ ہو جائے - تو ڈاکٹر لوگ یقیناً عنقا ہو جائیں -

۱۴ - اگر کوئی معالج حیوانات کسی حیوان کا علاج کر کے اسے تندرست کر دے - تو اس حیوان کا مالک معالج کو ۱/۶ شیکل (ڈیڑھ آنہ) فیس ادا کریگا -

۱۵ - لیکن اگر وہ حیوان مر جائے - تو معالج کو مردہ حیوان کی کل قیمت کا چوتھا حصہ بطور جرمانہ اس کے مالک کو ادا کرنا ہو گا -

۱۶ - اگر کوئی معمار کسی شخص کا مکان تعمیر کرتے وقت اچھا مصالحہ استعمال نہ کرے - اور اسکا مکان گر پڑے تو عدالت اس معمار کے دونوں ہاتھ کاٹ دیگی - اور اگر مکان کے گرنے سے مالک مکان یا اس کا کوئی عزیز دب کر مر جائے - تو معمار کو قتل کر دیا جائیگا - !

۱۷۔ اور اگر مکان کی صرف ایک دیوار گرے اور کوئی جانی نقصان نہ ہو تو معمار اپنے خرچ سے اس دیوار کو از سر نو تعمیر کریگا۔

۱۸۔ اگر کسی مکان کو آگ لگ جائے۔ اور کوئی آدمی آگ بجھاتے ہوئے۔ کوئی معمولی سے معمولی چیز بھی چرالے تو اسے اسی آگ میں جھونک دیا جائیگا۔

۱۹۔ اگر کسی شخص کے ہاں ڈاکہ یا چوری کی واردات ہو جائے اور ڈاکو یا چور کا سراغ نہ مل سکے تو اس جگہ کے حاکم اعلیٰ کو اپنی گرہ سے اس شخص کے نقصان کی تلافی کرنا ہوگی۔!

حکام کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس اسطرح ہو سکتا ہے!

۲۰۔ اگر کوئی سرکاری عہدہ دار شراب پینے کی نیت سے شرابخانہ میں داخل ہو یا وہ کسی اور جگہ شراب پیتے ہوئے پکڑا جائے تو اسے زندہ آگ میں جلادیا جائے گا۔

شراب نوشی کا سدباب کرنے کے لئے یہ دفعہ اپنی سختی کے باوجود نہایت خوب ہے۔ حمورابی عوام کو شراب پینے سے نہیں روکتا تھا لیکن سرکاری ملازمین کو شراب پینے کی ہرگز اجازت نہ تھی۔ کیونکہ شراب پیکر وہ اپنے فرائض منصبی کی بجاآوری میں کوتاہی کرسکتے تھے

عجیب بات ہے کہ حمورابی کے زمانہ میں شراب صرف عورتیں بیچ سکتی تھیں! اس مجموعۂ قوانین میں جہاں کہیں میفروشوں کا ذکر آیا ہے انکی ضمیر بصیغۂ مونث ہی استعمال کی گئی ہے!

۲۱۔ اگر کوئی شخص کسی جرم میں ماخوذ ہو کر قیدخانہ میں ڈالدیا جائے۔ اور اسکے گھر میں اتنا اثاثہ نہ ہو کہ اس کی بیوی اسکے واپس آنے تک بسر اوقات کرسکے۔ مگر اسکے باوجود بیوی کسی اور شخص سے شادی کرلے تو بیوی کو دریا میں غرق کردیا جائیگا۔ لیکن اگر قیدی کے گھر میں کوئی چیز نہو تو اسکی بیوی اور شادی کرلینے کی مجاز ہوگی۔

۲۲۔ اگر کوئی امیر آدمی اپنا شیرخوار بچہ کسی دایہ کے سپرد کردے اور اگر وہ دایہ کسی اور شخص کا بچہ بھی اپنی میں لے لے اور دونوں کو دودھ پلانا شروع کردے۔ اور اگر ان میں سے ایک بچہ دودھ کی پوری مقدار نہ ملنے کے باعث کمزور ہو کر بیمار ہو جائے۔ اور مرجائے۔ تو اس کی پاداش میں اس دایہ کی چھاتیاں کاٹ لی جائینگی

ہوس زر یعنی اوقات انسان کو ناجائز طرز عمل پر مجبور کردیتی ہے۔ دودھ پلائیاں اپنے آقا کی اجازت کے بغیر متعدد بچوں کو دودھ پلانے پر رضامند ہوجایا کرتی تھیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی نہ کوئی بچہ کمزور رہ جاتا۔ بابل میں رواج تھا کہ جو بچہ مریض یا کمزور ہوتا اور اطبا کہہ دیتے کہ وہ آیندہ نسل کی جسمانی کمزوری کا باعث ہوگا تو اسے فوراً تلف کردیا جاتا تھا۔ یہی رسم یونانیوں میں بھی تھی

۲۳۔ اگر کوئی غلام اپنے آقا سے یہ کہہ دے کہ "میں تمہارا غلام نہیں ہوں" تو آقا کو اس غلام کے دونوں کان کاٹ لینے کا اختیار رہو گا؟

۲۴۔ اگر کسی شخص کا غلام فرار ہو جائے۔ اور اگر کوئی شخص اسے اپنے ہاں پناہ دے اور پناہ گزیں کے مالک کو اس امر کی اطلاع نہ دے۔ تو اس شخص کے مکان کو آگ لگا دی جائیگی۔!

یہ ہی چند دفعات اس مجموعۂ قوانین میں سے جسے بابلیوں نے ایک ایسی کتاب میں لکھاہے جو قیامت تک محفوظ رہیگی، جسے نہ آگ جلاسکتی ہے، نہ پانی تباہ کرسکتی ہے!

پورے مجموعہ کیلئے ملاحظہ ہو:۔

THE OLDEST LAWS IN THE WORLD.

(خاص)

قیام الدین

جناب حافظ شیرازی کا ایک شعر

[جناب حسن انصاری ایڈیٹر رسالہ "قیام الدین" لکھنؤ]

جنگ ہفتا دو دو ملت ہمہ را عذر بنہ

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

کارخانہ قدرت ایسے اندرونی اسباب و علل سے مربوط و متعلق ہے کہ انسان لاکھ اوس پر قابو حاصل کرنا چاہے اور اپنے منشاء کے تابع بنانا چاہے۔ انسان طبعاً اختلاف کی طرف مائل ہے افراد خیالات افکار، صورت، شکل، طرز معاشرت، بود و باش، ماحول مرز بوم، زمین و آسمان غرضکہ ذرہ ذرہ میں اختلاف کا رنگ ظاہر ہے مگر باوجود اس اختلاف کے "کل حزب بما لدیہم فرحون" کا مصداق ہے۔ اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذاہب میں تفرقہ ہوا۔ ایک ایک مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہوئے۔ باوجود اس اختلاف کے سب اپنے کو حق پر سمجھتے ہیں اسی اختلاف نے مسلمانوں میں رنگ جمایا "و ہفتاد و دو ملت" کی صورت میں اسقدر فرق پیدا ہو گئے۔

ہمارے مضمون کے عنوان میں جناب حافظ شیرازی کا جو شعر درج ہے۔ اس میں اسی مقصد کو بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ تلاش حقیقت میں جو فرقہ سرگرداں ہے اور بصارت و بصیرت دونوں قوتوں کے مجموعہ سے کام لیتا رہتا ہے وہی حق پر ہے باقی سب افسانہ خوان ہیں حقیقت و واقعیت سے بہت دور کی نسبت پانا بھی بہت دشوار ہے چونکہ جناب حافظ کا کلام بیشتر اصطلاحات صوفیہ پر مشتمل ہے اور اہل تصوف نے مثنوی مولانا روم کے بعد کلام شیرازی کو اپنا بہترین وظیفہ سمجھا ہے اسلئے یقیناً یہاں بھی حقیقت سے مراد وہی حقیقت وحدۃ مطلقہ ہے جسکے انوار و تجلیات صوفیائے صافیہ کو ہر شے میں نظر آتے ہیں اور جسکی تلاش تمام عمر اونکو سیر کوہ و دشت میں سرگرداں اور دیہاتوں و شہروں میں بلا گرداں رکھتی ہے۔ اب دیکھنا تو یہ ہے کہ حضرت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کس طریقہ پر تھے کتب حدیث کے مطالعہ سے صاف صاف نظر آتا ہے کہ آنحضرت اور آپکے جاں نثار متبعین کی تمام تر خواہش اس جہاں میں یہ تھی کہ آپ تمام بنی آدم کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیں ہر ذی حق کو اوس کا حق پہونچا دیں اور ایک عالمگیر اتحاد و مودت قائم کرا دیں دیکھئے سب سے پہلے جس شئے کی تعلیم آپنے دی وہ یہ ہے کہ سب کے سب ایک غیر فانی معبود حقیقی کے پرستار بنجاؤ اوسی کے روبرو اپنی گردنیں جھکاؤ اوس سے اپنی آرزوئیں طلب کرو اور اسی کو اپنا ملجا و مامن یقین رکھو ادھر اودھر نہ بھٹکو شجر و حجر، آسمان و زمین، چاند و سورج اور تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ تو اے انسان تیری خود ہستی ہے پھر تو کیوں اپنے سے کمتر کے روبرو اپنا سر جھکاتا ہے انسان کو خود اسکا مرتبہ بتا کر اسکی حقیقت سمجھا کر ایک طرف تو یکسوئی کی تعلیم دی دوسری طرف عظمت و عزت کے معیار کو بلند تر کر کے سمجھا دیا اور بتا دیا کہ بڑائی و برتری، علو و کبریائی صرف اسی ہستی کے لئے ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے جسکی قدرت کاملہ سے ایجاد عالم ہوئی اور جو بلا کسی ادنیٰ زحمت کے انتظام عالم باحسن اسلوب قائم رکھے ہوئے ہے انسان باوجودیکہ اشرف المخلوقات ہے مگر نہایت ضعیف

وناتوان ہے اوسکی اصل ہی ایک معمولی قطرہ سے ہے اوسکو
خود اپنی اور اپنے ہمجنسوں کی پرستش. وانہیں تو اپنے سے
ادنی کی کیسے زیبا ہوسکتی ہے' ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتادیا کہ
اوس پاک و برتر ہستی کے بتائے ہوئے احکام پر چلنے والے
اوس سے اپنے تعلق کو جوڑنے والے اوسکی تمام مخلوقات میں عزت
کے مستحق ہیں ۲ العزۃ للّٰہ ولرسولہ وللمومنین عزت اللہ
ہی کے لئے ہے اور اوس کے رسول کے لئے ہے اور ایمان داروں
کے لئے ہے مگر عبادت صرف اوسی حقیقی عزت والے کی کرنا چاہئے
جسکی نسبت سے دوسروں کو عزت حاصل ہوتی ہے البتہ جو نیکی
و پارسائی کی زندگی بسر کرے اپنے خالق و مالک کے غضب
و جلال سے ڈرے اوسکے رحم و کرم کا ملتجی رہے اوسکی مخلوق
سے عطوفت و مہربانی سے پیش آئے اپنے سب ہمجنسوں کے
لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے واسطے پسند کرتا ہے تو وہ بیشک
عزت والا ہے اسکا اثر انسان کے دلوں میں ہونا چاہئے اور رہتا
ہے اوسکی طاقت کا سرمایہ تمام اولاد آدم کی اوسکے ساتھ ہمدردی
میں مضمر ہے اوسکا رعب و دبدبہ بڑے بڑے لشکر و جاہ و حشم
والوں پر دیکھا گیا ہے۔ خود اس تعلیم کے دینے والے سب سے اچھے
انسان نے دنیا والوں کو دکھا دیا کہ اونے اور اوسکے متبعین کی
قلیل و بے بضاعت جماعت نے بغیر کسی ظاہری ساز و سامان کے
قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے تختے پلٹ دے اور پھر اپنی نیک
سیرت اور برگزیدہ اوصاف سے اپنے دشمنوں کے قلوب
بھی مسخر کر لئے وہی عزت والے تھے اپنا ساد دوسروں کو بنانا
چاہتے تھے اونکو اپنے آقا اور تمام عالم کے نجات دہندہ کے
آخری خطبہ کے کلمات جنہیں صاف طریقہ سے کمال بلند آہنگی
سے فرمادیا گیا تھا کہ تم سب بنی آدم ہو اور آدم مٹی و پانی سے
ہیں کوئی شرف عربی کو عجمی پر اور رومی کو ہندی پر نہیں ہے
شرف و فضیلت نیکی و پارسائی سے ہے خوب یاد رکھتے والے
وہ جہاد بھی نیکی و پارسائی کے دنیا میں قائم رکھنے کیلئے اور
تمام بنی آدم کو ایک سطح پر لانے کیلئے کرتے تھے اونکا مقصد
حیات صرف یہ تھا کہ ایک خدا کی خدائی میں سب امن و
آسائش کیساتھ برادرانہ مساوات اور حسن سلوک کیساتھ
بسر کریں کسی کو کسی پر ظلم و جور کا حق باقی نہ رہے بے حیائی
و بیہودگی کا خاتمہ ہوجائے' ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ اونکے
امیر اور اونکے بادشاہ اونکے گمان میں جب کبھی ذرا راہ
حق سے انحراف کرتے تو وہ بلا تامل بازپرس کرتے اونکو
عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کر کے خدا کی نافرمانیوں پر
بلا رو رعایت سب کو یکساں سزا دیتے موقع نہیں ہے ورنہ
ہم تاریخی مثالیں پیش کرتے مگر افسوس کہ ان کے جانشین ان
کے طریقوں سے منحرف ہوئے خدا کو چھوڑ کر دنیائے فانی سے
دل لگا بیٹھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ پایا تھا سب کھو بیٹھے
اون کے کہئے یا ہمارے اسلاف نے تو سارے جہان کو ایک
کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اخلاف آپس میں (۷۲) سے بھی
زائد فرقوں پر منقسم ہوگئے

"ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا"

(خاص)

کامیابی

سوراج ملنے کے بعد

[جناب ڈاکٹر سعید احمد سعید بریلوی ایڈیٹر کامیابی دہلی]

انقلاب زندہ باد" اور "ہندوستان آزاد" کے فلک شگاف نعروں سے آج اس سرے سے اس سرے تک تمام ہندوستان کی فضا گونج رہی ہے اور قوم کے منچلے جوان اور بوڑھے ایک عالم ذوق و شوق میں حیرت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے کے لئے برابر آگے بڑھے چلے جا رہے ہیں۔

یہ نظارہ یقیناً ہر محب وطن کے لئے بہت ہی دل خوش کن ہے لیکن اس خوشنما اور دیدہ زیب تصویر کے پس پشت جو بھیانک تصویر ہے اس پر بد قسمتی سے کسی کی نگاہ نہیں پڑتی آزادی جیسی نعمت کے لئے جس قدر بھی قربانی کیجائے وہ سب بجا، درست، اور مناسب سہی لیکن یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے جوش کے عالم میں ماسوا کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کریں، اور اس بات کی طرف سے بالکل ہی غافل ہو جائیں کہ اگر ہماری کوششیں بار آور ہوئیں اور ہم سوراج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کے بعد کیا ہوگا۔

آج جو بزرگان قوم اور جو فرزندان وطن جنگ آزادی میں مصروف ہیں ان میں سے بہت ہی کم ایسے خوش نصیب ثابت ہونگے کہ اپنی جد و جہد کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ان میں سے بہت سے گولیوں کا نشانہ بنجائینگے۔ بہت سے پولیس کے ڈنڈوں اور لاٹھیوں کے نذر ہو جائینگے۔ بہت سوں کو جیلخانوں کی ناخوشگوار ہوا، اور مضر صحت غذائیں سل اور دق میں مبتلا کرکے اصلی وطن کی طرف بھیجدینگی، اور معدودے چند خوش قسمت لوگ جو ان تمام آفات ارضی و سماوی سے باقی بچ رہینگے وہ سوراجیہ کے ملنے تک اس قدر بوڑھے اور ضعیف ہو جائینگے کہ اس خوش نصیبی پر پوپلے منہ سے مسکرا دینے کے سوا اور کچھ نہ کر سکیں۔ سوراج اگر کبھی ملا تو وہ ہمارے لئے نہیں بلکہ ہماری اولاد کے لئے ہوگا، اور ہندوستان کی حکومت جب کبھی ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آئی تو وہ ہندوستانی ہم نہیں، بلکہ ہماری آیندہ نسلیں ہونگی۔

آزادی وطن کے خاطر اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کر دینے والوں کا جوش اور ان کے دل کے یہ پاک جذبات لائق صد تحسین و آفرین سہی، لیکن ان کی اس ناعاقبت اندیشی کی داد کسی طرح نہیں دیجا سکتی کہ وہ اپنی آیندہ نسلوں کو اپنے سے بہتر انسان، اور ملک کا انتظام کرنے کے قابل افراد بنانے کی طرف ذرا سی بھی توجہ نہیں کر رہے ہیں۔

ہمارے پرانے طرز کے مکتب، اور نئے انداز کے اسکول اور کالج سب کے سب ایک نہایت ہی غیر اطمینان بخش طریقہ پر چلائے جا رہے ہیں اور ان سے کسی طرح بھی یہ امید نہیں کیجا سکتی کہ وہ دس بیس پچاس سال میں ہماری خالی شدہ جگہوں کو پر کرنے کیلئے ایسے نوجوان دے سکیں جن کے دل وطن کی محبت سے معمور، اور جنکے دماغ بادۂ علم و عقل سے چور ہوں۔

ہمارا موجودہ طریقۂ تعلیم زیادہ تر اس اصول پر مبنی ہے کہ قمچی، بید اور رول کی مدد سے جس طرح بھی ممکن ہو کتاب کی عبارت کو بچوں کے دماغ میں ٹھونس دیا جائے۔ اور جبکہ تعلیم کے مدارس میں اگر قمچیاں اور رول نہیں ہیں تو وہاں فیل ہو جانے اور مدت العمر سرکاری ملازمت سے محروم رہنے کا خوف قمچیوں کا کام انجام دیدیتا ہے۔ ہم پڑھتے ضرور ہیں لیکن تقریباً اسی طرح کہ جیسے ایک طوطا پڑھتا ہے یا یہ کہ جس طرح ڈنڈے کی مار اور بھوک کے خوف سے ایک بندر اور ایک ریچھ ڈگڈگی پر ناچنا سیکھ جاتا ہے ہماری درس گاہیں مسجدوں کے لئے امام، مندروں کے لئے پجاری اور سرکاری دفتروں کے لئے محرر اور کلرک پیدا کر دینے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتیں اور اس خرابی کے لئے مجھے معاف کیا جائے اگر میں کہوں کہ ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ہم نہ معلوم کیوں غلطی سے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ علم صرف ان تھوڑے سے مضامین کا نام ہے جو کسی کتاب میں لکھے ہوئے ہوں اور اسلئے ہم عام طور پر اسی سے خوش رہتے ہیں کہ ہمارا بچہ نہ کھیلے نہ کودے نہ کسی اور طرف توجہ کرے اور بس رات دن اپنی کتاب کے لفظوں کو بیٹھا رٹتا رہے۔ ہمارے پندرہ سولہ سال کے بچے بھی اس قدر عام واقفیت نہیں رکھتے جتنی ترقی یافتہ قوموں کے آٹھ برس کے بچہ کو ہوتی ہے اور اس کا باعث یہ نہیں ہے کہ ہمارے بچوں کے دماغ کی ساخت کچھ ان سے جداگانہ ہے بلکہ یہ کہ ہمارا طرز تعلیم ان سے مختلف ہے۔

ہمیں اکثر اپنے گریجوایٹ نوجوانوں سے یہ شکایت ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں کوئی بڑا کام کیوں نہیں کرتے، کسی قسم کی علمی تحقیقات میں کیوں مصروف نہیں ہوتے اور آئے دن نئی نئی ایجادات سے ملک کو کیوں مستفید نہیں بناتے شکایت بالکل درست اور بجا سہی لیکن کیا یہ شکایت کرنے والے کبھی اس بات کو گوارا کر لیتے ہیں کہ انکا بچہ اپنے دو چار یا چھ گھنٹے روزانہ تتلیاں اور مکڑیاں پکڑنے پر ضائع کرتا پھرے؟ کیا ہمارے ملک کو ماتا کی ماری ماؤں کو کسی طرح یہ بات پسند آسکتی ہے کہ انکے بچے روزمرہ نقلی ہوائی جہاز اور کشتیاں اور موٹریں بنانے میں آری اور بسولے اور ہتوڑے سے اپنے ہاتھ پاؤں زخمی کر لیا کریں اور ان کا سارا دن خون پونچھتے اور پٹیاں باندھتے گزرا کرے؟ اور کیا ہمارے ملک کے نازک مزاج اور مغلوب الغضب والدین اپنے مزاج کو کسی طرح بھی اس وقت قابو میں رکھ سکتے ہیں کہ جب بچہ اپنے ذوق تجسس اور شوق تحقیق میں ان سے بار بار ایک بظاہر مہمل اور لامعنی سوال پوچھے چلا جائے۔ اور اسکی رٹ لگا دے؟ اگر نہیں تو پھر اس ابتدا کے بگڑے ہوئے بلکہ خود اپنے ہاتوں سے بگاڑے ہوئے بچوں سے یہ توقع کہاں تک مناسب اور قرین انصاف ہے کہ جوان ہو کر وہ اولوالعزم طالب علم بنیں؟

ماں کی گود بچہ کے لئے بہترین مدرسہ ہوتی ہے، یہ ایک مسلمہ امر ہے، لیکن ہمارے بچے اپنے اس مدرسے سے صرف یہ سیکھ کر نکلتے ہیں کہ ضرورت کے وقت بلاتکلف جھوٹ بول لیں، ہر چھوٹے سے چھوٹے خطرہ سے ڈر کر بھاگ جائیں اور اپنے آرام اور نفع کے خاطر دوسروں کو نقصان پہونچا دینے میں بھی انھیں کوئی تامل نہو۔ اس کے بعد یہ بچے ابتدائی مدارس میں داخل ہوتے ہیں اور یہاں انہیں ایک ایسے قابل استاد سے سابقہ پڑتا ہے جسکی تنخواہ بمشکل دس یا پندرہ روپئے ہوتی ہے۔ جسے صبح سے شام تک برابر یہی فکر لگی رہتی ہے کہ آج شام کو بیوی بچے کیا کھائینگے، جسکے کپڑے بالعموم بہت ہی میلے

پچھلے ہوتے ہیں اور جو اپنی بہتر سے بہتر کارگذاری اسے خیال کرتا ہے کہ کتاب کے مقررہ الفاظ بچے کو حفظ یاد ہوجائیں بچوں کو کوئی بات بھانے کی نہ اس میں قابلیت اور نہ اپنے افکار سے اسے اتنی فرصت۔ بچے اگر کچھ پوچھ بیٹھیں تو اسکا جواب دینا اسے کبھی پسند نہیں آتا' اور اسکی طبیعت کا چڑچڑاپن کبھی اسے بھی گوارا نہیں کرتا کہ بچے کسی وقت ذرا آپس میں ہنس بول لیں۔ بچے اس کے درجہ میں درحقیقت قیدی ہوتے ہیں۔ اور وہ ایک خوفناک داروغہ اور اب یہاں پہونچکر بچوں میں کچھ اگر ذوق تفتیش باقی رہگیا تھا تو وہ بھی فنا ہوجاتا ہے۔

اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ کہ جو حقیقت سیکھنے کا زمانہ ہوتا ہے ہماری حماقتوں کی بدولت برباد کرکے جب یہ بچے کل کو جوان ہونگے اور ہم سوراج جیسی نعمت ورثہ کے طور پر ان کے ہاتوں مین دینگے تو کیا ہم کسی طرح بھی توقع کرسکتے ہیں کہ ان کے کمزور اور بے طاقت ہاتھ اس بوجھ کو سنبھال سکیں گے۔ اور کیا ہماری روحوں کو یہ ہوش ربا نظارہ پسند آئیگا کہ جس پاک اور مقدس سرزمین کو ہمنے اپنے خون سے سینچا تھا' اور جسے آزاد کرانے کے لئے ہمنے اپنی جانیں قربان کی تھیں وہ دس بیس پچاس برس بھی آزاد نہ رہ سکی پھر کوئی ایرا غیرا آکر اس پہ قابض ہوگیا۔؟

بڑے سے بڑا عذر اپنی اس غفلت اور بے پروائی کیلئے جو ہم پیش کرسکتے ہیں اور جو کسی نہ کسی حد تک قابل لحاظ بھی ہے یہ ہے کہ ہم آج کل آزادی وطن کی جنگ میں مصروف ہیں اور ایسے نازک وقت میں کسی دوسری طرف توجہ منعطف نہیں کیجاسکتی جہانتک اس عذر کے ایک واقعہ اور ایک حقیقت ہونے کا تعلق ہے یقیناً وہ بالکل صحیح ہے لیکن یہ عذر ایک عذر لنگ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ہم جد وجہد میں مصروف ضرور رہیں لیکن نہ اسطرح کہ دنیا کے کسی اور کام کا ہوش ہی نہو' اور قوم کے افراد اس ضروری کام میں منہمک ضرور رہیں لیکن نہ اس حد تک کہ کوئی فرد قوم ان مصروفیت سے الگ ہی نہو۔ ہماری جنگ ہتیاروں کی جنگ نہیں ہے جس میں انہماک بھی زیادہ ہوتا ہے اور جس میں اس بات کی بھی ضرورت رہتی ہے کہ قوم کا ہر صحیح القوی فرد اس میں حصہ لیتا رہے۔ آخر اپنے بچوں کیلئے آب و آذوقہ مہیا کرنے کا فرض ہم اب بھی ادا کر رہے ہیں اور خود یہ تحریک کتنی ہی مدت دراز تک کیوں نہ جاری رہے کرتے ہی رہینگے۔ ان بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کسی طرح بھی انکے روٹی کپڑے سے کم ضروری اور اہم چیز نہیں ہے بلکہ اگر کوئی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو تعلیم روٹی سے زیادہ ضروری چیز ثابت ہوگی کیونکہ اپنی بچوں پر آیندہ نظام حکومت منحصر ہوگا۔

سوراج کے حصول کی کوششوں کے ساتھ ساتھ یہ از حد ضروری ہے کہ ہم اپنے موجودہ درسگاہوں کی اصلاح کا کام بھی اپنے ہاتھوں میں لیں اور ہر ممکن ذریعہ سے انھیں اس قابل بنادیں کہ سوراج ملنے کے بعد ہمارے بچوں کی وہی حالت نہو کہ جو اس بھانڈ کی ہوئی تھی جسے کسی بادشاہ نے خوش ہوکر انعام میں ایک ہاتھی دیدیا تھا اور جسے پالنے کی اپنے آپ میں اہلیت نہ پاکر وہ اس بات پر مجبور ہوا تھا کہ اسکے گلے میں ایک ڈھول باندھ کر چھوڑ دے۔ ہماری آیندہ نسلیں بھی اگر انھیں ابھی سے ہمنے قابل بنانے کی کوشش نہ کی تو اندیشہ ہے کہ کہیں اس ہاتھی کو بھی گلے میں ڈھول باندھ کر چھوڑ دینے پر مجبور نہ ہوجائیں اور پھر اسے کوئی مغربی ساہوکار اپنے دروازہ پر باندھ لے۔

حکومت کے مدرسے اور حکومت کا مقرر کردہ نصاب تعلیم جو کچھ سکھاتا ہے وہ ہم پر اچھی طرح روشن ہے اگر ہم اپنی آیندہ نسلوں کو کچھ کام کی باتیں سکھانا' اور اپنے سے بہتر انسان

[بقیہ صفحہ ۷۷۸ پر دیکھئے]

کشمیری درپن

پُرانی اور نئی تعلیم

(جناب پنڈت منوہر لال صاحب زتشی سابق ایڈیٹر "کشمیری درپن" پرنسپل ٹریننگ کالج لکھنؤ)

بہت سی قابلیتیں ایسی ہیں جو بچوں میں پیدائش کے وقت سے موجود ہوتی ہیں۔ اور جن کا صحیح استعمال وہ بغیر سکھائے کر سکتے ہیں، مثلاً آنکھوں سے دیکھنا، کانوں سے سننا، دودھ پینا، رو کر اپنی تکلیف کا اظہار کرنا۔ اسی طرح مینڈکوں اور مچھلیوں کے بچے انڈے سے نکلتے ہی تیرنے لگتے ہیں۔ اور سانپ کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی رینگنے لگتا ہے۔ پیدا ہونیکے بعد بچہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہونے لگتا ہے، اور اپنے تجربہ سے، اپنے ہاتھ پیر کے استعمال سے، اور اپنی غلطیوں سے فائدہ اٹھاکر نئی نئی باتیں سیکھتا ہے، اس سے اور آگے چل کر ایسی باتیں بھی ہیں، جو ماں باپ بالارادہ اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں، مثلاً شیر اپنے بچوں کو شکار کرنا سکھاتا ہے، بلی اپنے بچہ کو چوہے پکڑنا سکھاتی ہے۔ اور چڑیاں اپنے بچوں کو اڑنا سکھاتی ہیں۔ یہی مختلف مدارج انسانی بچے بھی طے کرتے ہیں۔ اور ان کو طے کر کے مختلف قوتیں اور قابلیتیں حاصل کرتے ہیں۔ فطری قابلیتوں کو چھوڑ کر بچہ جو کچھ اپنے تجربہ یا دوسروں کے سکھانے سے حاصل کرے، اس کو تعلیم کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ اور اس نقطۂ نظر سے تعلیم کے معنی نہایت وسیع ہیں۔

لیکن اس مضمون میں تعلیم کا مفہوم اس سے تنگ تر ہے، علاوہ اس وسیع تعلیم کے جس سے ہر بچہ کم و بیش متاثر ہوتا ہے، جماعت انسانی کے ہر متمدن اور مہذب گروہ نے بچوں کی تربیت کے لئے چند ذرائع ضبط اور انتظام کے ساتھ مقرر کئے ہیں۔ جن کو کہیں مکتب، اور پاٹھ شالہ اور کہیں اسکول اور مدرسہ کہتے ہیں۔ میں اسی تعلیم کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں

ہندوستان میں مختلف درسگاہیں عرصۂ دراز سے جاری ہیں۔ کہا جاتا ہے، کہ زمانۂ قدیم میں رشی اور منی آبادی سے دور جنگلوں میں جا کر رہتے تھے۔ اور جو علم کے طالب اُن کے پاس آتے تھے، اُن کو دنیا اور دین کے علوم کی تعلیم دیتے تھے۔ گوروکل اور رشی کل اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ معمولی کاروبار کی تعلیم غالباً گھروں میں ہوتی ہوگی کیونکہ ہمارے ملک میں ذات کی تفریق قائم تھی۔ اور مہاجن کا بیٹا مہاجن کمھار کا بیٹا کمھار اور بڑھئی کا لڑکا بڑھئی ہوتا تھا۔ جہاں ذات کی تفریق نہ تھی، مثلاً ممالک فرنگ میں وہاں بھی یا تو بیٹا باپ ہی کا پیشہ سیکھتا تھا یا اپرنٹس (APPRENTICE) بن کر کوئی صنعت یا حرفت حاصل کرتا تھا۔ برسوں استاد کی خدمت میں حاضر رہنا پڑتا تھا اور اس کے بعد اپنے اپنے طریقہ پر اپنی اپنی دکان سجانے کی اجازت ملتی تھی۔ اب جو ہندوستان میں یہ نیا دستور قائم ہوا ہے، کہ قانون کا امتحان پاس کرکے نئے وکیل کے واسطے یہ لازمی ہے، کہ وہ برس چھ مہینے کسی پرانے جغادری وکیل کے دفتر میں کام کرے،

اس قاعدہ میں اُسی پرانے رواج کی جھلک نظر آتی ہے۔ بہر حال یورپ ہو یا ہندوستان، مصر ہو یا یونان، ہر مہذب قوم کسی نہ کسی شکل میں تعلیم کے انتظام کو ضروری سمجھتی تھی۔ مُدعا یہ تھا، کہ ایک خاص زمانہ میں ایک خاص نسل نے جس قدر ترقی کی ہو، اگلی نسل اسی کی تعلیم پاکر اور اُس سے فائدہ اُٹھا کر آگے قدم بڑھاوے۔

ہندوستان میں بھی پاٹھ شالہ، مکتب اور مدرسے قائم تھے۔ بہت سے راجہ مہاراجہ، بادشاہ اور نواب ایسے گزرے ہیں، جو خود صاحب علم تھے، علم دوست تھے، عُلما کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ اور توسیع علم کے ذرائع مہیا کرتے تھے، مدرسے قائم کرتے تھے، اور ان کے اخراجات کے واسطے جائدادیں وقف کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اب بھی زمانۂ قدیم کی یادگاریں موجود ہیں۔ اور بنارس اور ندیا دیوبند اور فرنگی محل اپنی پرانی عظمت کے مزاروں پر چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں زمانہ کا ورق پلٹا۔ اور ہندوستان کی سرزمین پر دولت برطانیہ کا عروج شروع ہوا۔ پہلے پہل تو ملک گیری کے مہمات نے تعلیم کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت نہیں دی۔ مگر جب انیسویں صدی کے شروع میں اس طرف توجہ ہوئی تو اس طرح کہ سلطنت کی طرف سے بجٹ میں ایک رقم مقرر کی گئی۔ اور حکم ہوا، کہ یہ رقم سالانہ تعلیم کے اغراض پر خرچ کی جائے۔ رقم قلیل تھی، مگر اس کا نفاذ اس وضع پر ہوا تھا کہ اس سے اُس کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ زمانۂ قدیم کے راجہ، مہاراجہ، سلاطین اور بادشاہ تعلیم اور توسیع تعلیم کے لئے جو کچھ کرتے تھے وہ ان کی ذات سے مخصوص ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں رعایا کی تعلیم اسٹیٹ (STATE) یا حکومت کے فرائض میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ جس طرح دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے واسطے اور امن و امان قائم رکھنے کے لئے فوج کا صیغہ تھا۔ دیوانی اور فوجداری کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے عدالتیں تھیں۔ سرکاری مالگذاری اور محصول کی وصولیابی کے لئے حکام اور دفاتر تھے۔ اسی طرح رعایا کی تعلیم کے واسطے مدرسے اور پاٹھ شالے تھے۔ فوج اور عدالت حکومت کے صیغے تھے۔ مدرسے بھی تھے، مگر انکی حیثیت حکومت کے صیغے کی سی نہ تھی۔ یہ بات تعلیم کو پہلے پہل انگریزی زمانہ میں نصیب ہوئی۔ اور سچ پوچھئے، تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں انگلستان میں بھی یہی حال تھا، آکسفورڈ اور کیمبرج کی درسگاہیں وُزرا اور اُمرا کی قائم کی ہوئی ہیں۔ بعض بعض بادشاہوں کی قائم کی ہوئی ہیں مگر ان میں شاید ایک بھی ایسی نہیں جو اسٹیٹ (STATE) یعنی حکومت کی طرف سے قائم کی گئی ہو۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کو انیسویں صدی کے آخری حصہ میں حکومت کی طرف سے کچھ امداد ملنی شروع ہوئی ہے ورنہ اس کے پیشتر نہ حکومت کی طرف سے ان کو کچھ ملتا تھا۔ نہ حکومت کو انکے انتظام میں کچھ دخل تھا۔ یہ خیال کہ حکومت کو حکومت کی حیثیت سے رعایا کی تعلیم کی فکر کرنی چاہئے نیا خیال ہے۔ انگلستان میں یہ خیال اٹھارھویں صدی میں پیدا ہوا اور یہ دستور کہ ساری قوم کے بچوں کے واسطے جبری تعلیم بلا فیس کے لازمی ہونی چاہئے۔ اس کا قانون تو صرف ساٹھ برس ہوئے ۱۸۷۰ء میں پاس ہوا۔ غرض یہ کہنا ہے کہ یہ خیال اور یہ سیاسی اصول انگلستان میں بھی نیا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب

جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تعلیم کا ذکر چھیڑا
اس کے پہلے قائم اور مقبول ہو چکا تھا۔ اس لئے جب ہمارے
ملک میں انیسویں صدی کے شروع میں حکومت انگریزی
کی طرف سے اس کا چرچا شروع ہوا۔ تو تعلیم کا صیغہ حکومت
کا صیغہ قرار پایا۔ اور تعلیم کا بجٹ حکومت کے بجٹ میں شامل کیا گیا

اب اگر آپ اسکولوں اور مدرسوں کی موجودہ
تعلیم کو دیکھئے۔ اور اس کا پچاس برس پہلے کی حالت
سے مقابلہ کیجئے تو آپ کو کئی باتوں میں بیّن فرق معلوم
ہوگا شاید پہلی بات جس کی طرف آپکی توجہ مبذول ہو یہ
ہوگی کہ زمانۂ قدیم میں تعلیم کا ایک خاص مقصد تھا۔ اور
تعلیم ایک خاص گروہ میں محدود تھی۔ تعلیم کی غرض
تھی حصولِ معاش۔ اور حصولِ معاش کا ذریعہ تھا نوکری
سفید پوش شرفا یا اہل تیغ ہوتے تھے یا اہل قلم۔ عوام
کو تعلیم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ شرفا کے طبقہ سے باہر
جو گروہ رذیل یا نیچ ذات کا کہلاتا تھا۔ انکے لئے تعلیم
منع تھی۔ اور وہ خود اپنے تئیں تعلیم سے دُور رکھتے تھے
اس کے خلاف اب ذات کی بندشیں ٹوٹتی جاتی ہیں۔
شریف اور رذیل کا سوشل فرق مٹا جاتا ہے۔ مساوات
کا ہر طرف چرچا ہے۔ جن کو ہم کل تک اپنے زعم شرافت
میں رذیل سمجھتے تھے، وہ ترقی کرنے لگے ہیں اور تعلیم کو
اپنا اور اپنی اولاد کا حق سمجھتے ہیں۔ اس تغیر کا لازمی
نتیجہ یہ ہے، کہ شرفا کے لڑکوں کے ساتھ ساتھ دوسری
طبقوں کے لڑکے اسکولوں میں آتے ہیں اور شد و مد سے
آتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کے لڑکے کے ساتھ اُن کے
چپراسی کا لڑکا بھی پڑھتا ہے، جو امتحان مصنف صاحب
کا لڑکا دیتا ہے، وہی امتحان مصنف صاحب کے دفتری کا
لڑکا بھی دینے کو تیار ہے، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس
انقلاب نے ایک حد تک اسکولوں کی تعلیم کے معیار کو
گرا دیا ہے۔ چالیس پچاس بلکہ تیس پینتیس برس پہلے تک
زیادہ تر لڑکے تعلیم یافتہ گھروں سے آتے تھے، ان کو
علم کا شوق باپ دادا سے ورثہ میں ملتا تھا۔ اور چونکہ خاندان
کے لوگ لکھے پڑھے ہوتے تھے، اس واسطے ان بچوں کو
گھر پر پڑھنے لکھنے کے زیادہ موقع ملتے تھے۔ بہت سی باتیں
جو انکے لئے سہل تھیں، وہ اب دوسری طبیعتوں کے
لڑکوں کے لئے جن کو وہ موقع اور آسانیاں میسر نہیں ہیں
مشکل معلوم ہوتی ہیں۔ مگر یہ کیفیت ناگزیر ہے، اور اس
لئے... نہیں کہ اب تعلیم محض ذریعۂ معاش نہیں ہے، بلکہ
فرد اور قوم کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ قوم بحیثیت قوم اسی وقت
ترقی کر سکتی ہے، جب اس کا ہر فرد تعلیم یافتہ اور ترقی
پذیر ہو، اور اپنی قدرتی قابلیتوں سے پورا پورا فائدہ
اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ انھیں وجوہات سے اب
فری (بلا فیس) اور جبری تعلیم کا اجرا لازمی قرار پایا ہے
خیر یہ تو دوسری بحث ہے۔ میں عرض یہ کر رہا تھا، کہ ایک
نمایاں تبدیلی جو اسکولوں میں نظر آتی ہے، وہ یہ ہے،
پہلے کم لڑکے آتے تھے، اور ایک خاص گروہ کے لڑکے
آتے تھے۔ اب بڑی تعداد میں آتے ہیں، اور ہر طبقے
اور ہر گروہ سے آتے ہیں۔

ایک اور فرق یہ ہے، کہ پرانی تعلیم محض کتابی
تھی۔ اب کوشش کی جاتی ہے، کہ کتاب کے ساتھ ساتھ
عملی تعلیم بھی دی جائے۔ میں اُس کتابی تعلیم کی مذمت

اپنے محدود دائرہ میں وہ اپنا مقصد حاصل کرلیتی تھی۔ مگر جو معنی تعلیم کے اب سمجھے جاتے ہیں، اور جس چیز کی ہم کو اب ضرورت ہے، وہ اس کے موافق نہیں ہے۔ مثلاً اب یہ سمجھا جاتا ہے، کہ تعلیم میں لڑکوں کی صحت اور تندرستی کا لحاظ بھی ہونا چاہئے۔ اور اس کے واسطے اسکولوں میں ورزش اور کھیل کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بھلا پرانے زمانے میں کسی مکتب کے مولوی یا پاٹھ شالہ کے پنڈت کے سامنے آپ کھیل کا نام بھی لے سکتے تھے؟ مکتب یا پاٹھ شالا کو کھیل سے کیا تعلق۔ اب ہم سمجھتے ہیں، کہ دماغ کے ارتقا کے لئے ضروری ہے، کہ متعلم ہاتھ سے کچھ کام کرے۔ باغ میں زمین کھود کر پودے لگائے، مٹی کے کھلونے بنائے، کاغذ کاٹ کر اور کاغذ کو لپیٹ کر اس سے مختلف شکلوں کی چیزیں تیار کرے، لکڑی کا کام بناوے وغیرہ وغیرہ۔ اس سے یہ غرض نہیں، کہ لڑکے مالی اور دفتری یا کمھار اور بڑھئی کے پیشے سیکھیں، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں، وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جن اسکولوں میں یہ کام سکھائے جاتے ہیں۔ انکا منشا ہرگز یہ نہیں، کہ وہ صنعت و حرفت کی تعلیم دیں۔ یہ کام دوسرے اسکولوں کا ہے، جن کو وکیشنل VOCATIONAL یا انڈسٹریل INDUSTRIAL کہنا چاہئے، اور صنعت و حرفت کی تعلیم انھیں اسکولوں میں ہونی چاہئے، اگر ابتدائی اسکول یا پرائمری اسکول میں کاغذ، مٹی اور لکڑی کا کام بنوایا جاتا ہے، تو وہ اس وجہ سے کہ تجربہ نے بتایا ہے، کہ ہاتھ سے اس طرح کا کام کرنا دماغ کی ترقی کے لئے سودمند ہے۔ تعلیم کے ماہر اب اس بات کو جانتے ہیں، کہ کتابوں کے پڑھانے کے علاوہ مدرسوں میں ایسا انتظام بھی ہونا چاہئے، کہ بچے قدرتی یا انسان کی بنائی ہوئی اشیا کو دیکھ کر اور برت کر تعلیم و تربیت حاصل کرسکیں۔ یہ کافی نہیں، کہ گیہوں کا سبق کتاب سے پڑھا دیا جائے۔ بلکہ ضرورت یہ ہے، کہ بچوں کو گیہوں لاکر دکھا دیا جائے، اور ممکن ہو، تو کلاس کو گیہوں کے کھیت کے گرد لے جاکر جو کچھ گیہوں کے بارہ میں بتلانا ہو بتلایا جائے۔ طلبا ہر چیز کو کتاب سے پڑھ کر یا ماسٹر صاحب سے سن کر نہ مان لیں۔ بلکہ اپنی آنکھ سے دیکھیں، اور اپنے ہاتھ سے کریں۔

چونکہ پرانی تعلیم کتابی تھی۔ اس واسطے حافظہ پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ کتابوں کی کتابیں یاد کرائی جاتی تھیں۔ اور اس بات کا کافی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا، کہ جو کچھ طالب علم یاد کر رہا ہے، وہ اس کے معنی اور مطالب بھی سمجھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا، کہ بہت سی باتیں طلبا محض طوطے کی طرح رٹ لیتے تھے، مگر نہ ان کو سمجھتے تھے اور نہ اُن سے کوئی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ نئی تعلیم میں اس غلطی کی اصلاح کی گئی ہے۔ تعلیم کی غرض اب یہ سمجھی جاتی ہے، کہ جو کچھ طالب علم کو پڑھایا جائے، اس کو وہ سمجھے بھی۔ اور طریقۂ تعلیم ایسا ہو، کہ طالب علم کی دماغی تربیت بھی ہوتی جائے۔ اور اس میں خود سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لئے اُستادوں کا فرض یہ سمجھا جاتا ہے، کہ طلبا کو وہ بتلائیں کم مگر طلبا کے سامنے چیزوں کو اس طرح رکھیں، کہ ان کو دیکھ کر اور ان پر غور کرکے طلبا خود ہی باتیں معلوم کرسکیں۔ یہی وجہ ہے، کہ نئی تعلیم میں حافظہ پر اتنا زور نہیں دیا جاتا، جتنا پہلے دیا جاتا تھا۔ اور سمجھ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے، کہ بعض چیزیں ایسی ہیں، جن کو محض سمجھنے

سے کام نہیں چلتا، بلکہ ان کے لئے یاد کرنا ضروری ہے۔ مثلاً
پہاڑے۔ مگر اس حالت میں بھی کوشش یہ کی جاتی ہے، کہ
جو کچھ یاد کیا جائے، اسکو پہلے سمجھ لیا جائے۔ اور پھر جب
وہ چیز سمجھ میں آجائے، تو اگر ضرورت ہو، تو اس کو رٹ لیا جائے
اگلے زمانے کے استادوں کی تعریف میں کبھی کبھی یہ کہا جاتا
ہے، کہ اُن کو کتابیں نوک زبان ہوتی تھیں۔ اور وہ بغیر کتاب
دیکھے اپنے شاگردوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ یہ اب ممکن نہیں۔
کیونکہ اس وقت علم محدود تھا۔ ایک ہی نصاب تعلیم صدیوں
سے چلا آتا تھا۔ اور کتابوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ اب مدرسوں
میں ایسے علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ جن میں آئے دن نئی
نئی ایجادیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور معلومات کا ذخیرہ بڑھتا جاتا
ہے۔ اور کتابیں لاتعداد ہیں، اور بدلتی رہتی ہیں۔ اگر کوئی شخص
چاہے بھی، تو ان کو حفظ نہیں کر سکتا۔ سچ پوچھئے، تو نئی تعلیم
کے جدید اصولوں کے مطابق مدرسونکا یہ کام نہیں، کہ وہ کسی
تعلیم کی تکمیل کرادیں۔ بلکہ اُنکا کام یہ ہے، کہ طالب علم کے
دل و دماغ کی تہذیب اور تربیت ایسی اچھی طرح کردیں، کہ
اس میں حصولِ علم کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اور طالب علم
جو کچھ حاصل کرنا چاہے، اپنی کوشش سے حاصل کرسکے۔

آخری بات جس کا ذکر میں اس مضمون میں کرنا چاہتا
ہوں۔ جسمانی سزا ہے۔ پُرانی درسگاہوں میں مارپیٹ کا
بہت رواج تھا۔ اور پرانے زمانہ میں "جورِ پدر" سے
کہیں زیادہ "جورِ اُستاذ" کے نظارے دکھائی دیتے تھے۔
خدا بخشے، پینتالیس (۴۵) برس پہلے کے ایک مولوی صاحب کی
تصویر آنکھوں کے سامنے ہے، جو اگر ان کو اور کچھ نہیں
ملتا تھا، تو حُقّے کے نیچے سے مارا کرتے تھے۔ انگریزی
مدرسوں میں بھی مارپیٹ کا بہت چرچا تھا۔ اور بیت لوازمِ
استادی کا جزو لاینفک سمجھا جاتا تھا۔ شکر ہے، کہ مارپیٹ
اب پہلے زمانہ کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے۔ اور ایسے مدرسے
بھی ہیں، جہاں جسمانی سزا بالکل نہیں دی جاتی۔

انگلستان کے اخباروں میں ایسے واقعات بھی پڑھنے
میں آتے ہیں، کہ ہیڈ ماسٹر نے لڑکے کو مارا، چوٹ زیادہ آئی
اور لڑکے کے باپ نے ہیڈ ماسٹر پر فوجداری میں نالش
دائر کردی۔ اب یہ خیال پھیلتا جاتا ہے، کہ مارپیٹ کا طریقہ
ناپسندیدہ اور مذموم ہے، اور اگر بیت کا استعمال کیا بھی جائے
تو بہت کم۔ اور خاص خاص موقعوں کے واسطے۔ اگر غور
کیجئے تو یہ تبدیلی محض اسکولوں میں نہیں، بلکہ گھروں میں بھی
نمایاں ہے، باپ ماں جس طرح بچوں کو پہلے مارتے تھے اب
تعلیم یافتہ گھروں میں وہ کیفیت نظر نہیں آتی۔ معلوم ہوتا
ہے، کہ لوگوں کے سمجھ میں یہ بات آچکی ہے، کہ تعلیم و تربیت
کے لئے اصول قاعدہ اور ضبط ضروری ہے۔ نہ کہ مار
پیٹ۔ محض مارپیٹ بے سود ہی نہیں، بلکہ مضر رساں ہے
اور کبھی کبھی ساری زندگی کے لئے بچہ کو ناکارہ اور
مجہول بنادیتی ہے۔ (خاص)

[صفحہ ۷۷۳ کا بقیہ]
بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے مدرسے خود قائم کرنے اور ان کے لئے مناسب نصاب تعلیم
بنانے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت میرے خیال میں ہماری بہت سی ان ضرورتوں
پر مقدم ہے جن کے پورا کرنے میں آج قوم منہمک نظر آرہی ہے ہندو مسلم اتحاد بھی کہ جس پر
ہندوستان کی موجودہ کوششوں کی کامیابی اور آیندہ زمانہ میں فلاح و بہبود منحصر ہے اگر کسی طرح
حقیقی معنوں میں وقوع پذیر ہو سکتا ہے تو مدرسوں ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ ہمیں آپس میں لڑنا بھی
ایک بڑی حد تک انہیں درسگاہوں نے سکھایا ہے اور اب اگر انکی اصلاح ہو جائے تو صلح و آشتی کا سبق بھی دے سکتی ہیں۔
(خاص)

کوثر

زبانِ اُردو کا مستقبل

[پروفیسر ظفر تاباں، ایڈیٹر "کوثر" دہلی]

تاریخ زبان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دنیا کی اکثر وبیشتر زبانیں سیاسی انقلابات سے ہمیشہ تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ یونانی فتوحات اور انقلابات نے اپنی زبان کو سینکڑوں پہلو بدلنے پر مجبور کیا۔ عرب کا زمانہ جاہلیت ادبی نقطۂ خیال سے کسی طرح دنیا کی دوسری زبانوں سے پیچھے نہ تھا۔ اس زمانہ میں اسقدر ادیب وشعرا پیدا ہوئے، کہ صدیوں تک دنیا کے شاعروں کی مجموعی تعداد وہاں تک نہ پہونچ سکی۔ لیکن انقلاب کے بعد جب نئے تمدن و تہذیب کی بنیاد پڑی، تو عربی اس قدر بدلگئی، کہ قدیم لوگوں کو اس کا سمجھنا بھی دشوار معلوم ہونے لگا۔ یونانی اور دیگر زبانوں سے تراجم کئے گئے جن کے لئے ہزاروں الفاظ تراشے۔ مختلف علوم وفنون کی اصطلاحیں مقرر کی گئیں۔ نئی ایجادات اور آلات کے نام مقرر ہوئے، اور مہذب دنیا نے تسلیم کرلیا کہ عربی زبان اس قدر وسیع ہے، جسمیں تمام دنیا کے علوم وفنون منتقل کئے جاسکتے ہیں۔ فاتحین کے ساتھ اکثر ممالک میں عربی نے پہونچکر اتنی کامیابی حاصل کی، کہ وہاں کی اصلی زبان کا نام ونشان ہی مٹ گیا۔ اسی طرح فارس میں سینکڑوں سیاسی انقلاب آئے، اور فارسی نے سینکڑوں رنگ بدلے۔ جنگ اور بدامنی کے اثر نے روزمرہ کی بول چال میں ہزاروں جنگی اصطلاحیں شامل کردیں۔ سپر انداختن، شمشیر شکستن، کارد باستخوان رسیدن، نیزہ انداختن۔ جیسی ہزارہا تراکیب اور الفاظ کا زبان پر قبضہ ہوگیا۔ جب امن وسکون کا زمانہ آیا۔ اس وقت کی شاعری اور ادب کا مطالعہ کیجئے، تو فارسی زبان الکیماش کی ڈائری معلوم ہوتی ہے۔ عشرت وعیش، شراب وکباب، سیر وتفریح، عشق وعاشقی، گل وبلبل کے سوا کسی اور چیز کی زبان میں گنجائش نہ رہی، اور جب فارسی کا قدم ہندوستان میں جما، اُسوقت کی زبان میں کچھ اور ہی بات نظر آتی ہے، اور فارس میں جو زبان آج بولی جاتی ہے وہ قدیم فارسی سے بالکل مختلف ہے۔ اسیطرح روس اور ترکستان پر نظر ڈالئے، انقلاب کے بعد وہاں کی زبانوں کی حالت کس قدر بدلگئی۔ مصطفیٰ کمال نے تو عربی آمیز ترکی کو بالکل ممنوع قرار دیدیا۔ اور ان قدیم الفاظ کو زبان میں شامل کیا گیا۔ جنھیں اہل زبان متروک خیال کیا کرتے تھے۔ عربی تحریر چھوڑکر لاطینی رسم الخط اختیار کیا۔ اور ملک کی مختلف اقوام کے خیالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ ایک بہترین پالیسی تھی۔ رہی انگریزی تو اس زبان کو بھی انقلابات کا کچھ کم مقابلہ کرنا نہیں پڑا۔ اس کے جس دور پر بھی نظر ڈالئے، طرز تحریر، انداز بیان، اصول نگارش، خیالات اور احساسات میں زمین وآسمان کا فرق نظر آئیگا۔ صدیوں کا ذکر تو جانے دیجئے۔ میرا تو خیال ہے، کہ جو زبان آج بولی جاتی ہے، ایک برس کے بعد اس میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔ اب ذرا اُردو کی بھی سرگذشت سُن لیجئے۔ ۱۸۵۷ء کو

انقلاب نے جہاں تہذیب و تمدن خیالات و ذہنیت میں تبدیلی پیدا کی وہاں اردو کی بھی کایا پلٹ دی۔ قلت الفاظ کی شکایت، زبان کی کمزوریاں ایک حد تک کم ہو گئیں، کتابیں لکھی گئیں۔ تراجم بھی ہوئے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے، تو اردو نے بے نیازانہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا۔ اور ہمیشہ فارسی و عربی کی شرمندۂ احسان رہی۔ یہ اہل زبان کا ناقابل معافی گناہ تھا۔ کہ انھوں نے دوسری زبانوں کی مدد سے کام نکالنا چاہا۔ اور اردو کی ترقی اور کامیابی کے لئے جد و جہد نہ کی، یہی سبب ہے، کہ ابھی تک طب و حکمت، فلسفہ و ہیئت، سیاسی و اقتصادی اصطلاحوں میں سے دو چار اصطلاحوں کا بھی اردو زبان میں ترجمہ نہ ہو سکا۔ اکثر ایسی کتابیں دیکھنے میں آئیں، جنکو انگریزی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ جس میں زیادہ تر عربی و فارسی سے امداد لی گئی ہے۔ ایسے مترجمین کو اپنی کامیابی پر ناز ہو تو ہو۔ مگر میں تو ایسے ترجمہ سے یہ بہتر سمجھتا ہوں، کہ سرے سے کتاب کا عربی و فارسی میں ہی ترجمہ کر دیا جائے۔ ایسے دور از کار الفاظ اور تراکیب سے زبانکو جس قدر نقصان پہنچتا ہے۔ ترجمہ سے اس قدر فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ گو یہ خوشی کا مقام ہے، کہ اس تیس چالیس سال کی مدت میں ہماری زبان نے غیر معمولی عروج حاصل کیا۔ آج اسکی یاں ہزاروں اخبار و رسائل موجود ہیں۔ مگر افسوس ہے، کہ علمی میدان میں ابھی تک اُردو کے پاس کوئی سرمایہ نظر نہیں آتا۔ بہت کم رسائل میں علمی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ جس طرف دیکھئے کہانی اور افسانوں کی بھرمار ہے۔ اور اس کا سبب صرف یہ ہو سکتا ہے، کہ اس کے پڑھنے والے زیادہ تر کم علم یا جاہل ہیں۔ پھر ایسی صورت میں اپنی زبانکو عربی و فارسی سے مخلوط کرنا کس حد تک خطرناک ہے۔ اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اب دنیا کی تمام تعلیم یافتہ قومیں اپنی زبان کو آسان بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ حالانکہ انکا حلقہ زیادہ تر تعلیم یافتہ جماعتوں پر مشتمل ہے، اگر ہندوستان کی اس عالمگیر جہالت میں اُردو کو فارسی قالب میں ڈھالا گیا، تو یقیناً میں اُردو کا مستقبل نہایت خطرناک پاتا ہوں۔

میرے خیال میں ہندوستان کی موجودہ سیاسی انقلاب کے بعد یہ سوال پیدا ہونے والا ہے، کہ ہندوستان کی قومی زبان کسکو قرار دیا جائے۔ یہاں تو فارسی کا ذکر ہی فضول ہے۔ اسکے جاننے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ رہی سنسکرت تو اسکا نام و نشان ہی باقی نہ رہا اب صرف اُردو اور ہندی کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ اور یقیناً ہندی کے سرپرستوں کی تعداد اردو کے بہی خواہوں سے زیادہ پیدا ہو جائیگی۔

غریب اُردو کے لئے موجودہ مشکلات کیا کم ہیں۔ جو اسکی ترقی میں اور رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ کاتبوں نے اسکی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ صفحہ کا تو کیا ذکر ایک سطر ایسی نہیں مل سکتی، جو جاہل کاتبوں کی دست درازی سے محفوظ رہ سکی ہو۔ اس کے پاس ٹائپ نہیں، جسکو زبان کی ترقی کا بہترین ذریعہ کہنا چاہیئے، اور پھر تیسری دشواری جو اُردو کو پیش آنیوالی ہے۔ اسکی ذمہ داری اہل قلم کی اُس جماعت پر ہے، جو آج سیدھی سادھی اُردو کو شہوا بنانا چاہتے ہیں۔ یہ تسکین حسیات، تکلم نوازیاں، شعلہ منجمد، مرغولۂ اغریں اور صفحۂ قرطاس پر رہوار قلم کی مست و خیز جیسی مہمل ترکیبیں آج آپکو بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن آگے چلکر ہندوستان کی وہ قومیں جنھیں عربی اور فارسی سے کوئی نسبت نہیں، ایسی غیر مانوس زبانکو یہاں کی قومی زبان تسلیم کرنیکے لئے کبھی تیار نہونگی۔ تعجب ہے، کہ جب اُردو کو قومی زبان کہا جاتا ہے، تو اس پر صرف ایک ہی قوم کس طرح قبضہ کرنا چاہتی ہے، مانا کہ آپکو اردو زبان میں ایسی تراکیب و الفاظ کے شامل کرنیکا حق حاصل ہے لیکن دوسری جماعتیں سنسکرت کے اس سے زیادہ الفاظ شامل کرنیکا حق رکھتی ہیں۔ کیا آپ اردو کی اس غیر فطری شکل کو دیکھنے کیلئے تیار ہو سکتے ہیں۔"

÷ + + لہذا ضرورت ہے، کہ ایسے فارسی نویسوں کو ایران کا + + ÷

÷ + + پاسپورٹ دلا کر ہندوستان سے ہجرت کر جانے پر مجبور کیا جائے + + (اخلاص)

غزل

(جناب رفیعی اجمیری سابق نگراں "کیف" اجمیر)

حیرتِ چشم تصور قامت دلجوئے دوست ∴ شامتِ تکیر ہے وقفِ زلفِ عنبر بوئے دوست
چاہئے اک عمر بھر تکمیر نگاہِ التفات ∴ ہے بہت دل آشنا افسوس اے دل خوئے دوست
مقتضی بیتابئ دل ادھر یہاں یہ حال ہے ∴ آنکھ اٹھا کر دیکھنا ممکن نہیں ہے سوئے دوست
یار کی آزردگی کا خوف ہے زنجیر پا ∴ چھانئے ہم ورنہ سو سو بار خاک کوئے دوست
کشتۂ الفت کی ہے یہ آرزوئے واپسیں ∴ وقت مردن ہو میسر تکیہ زانوئے دوست

پردہ حائل کا اُٹھ جانا تو کچھ مشکل نہیں
پر رفیعی تم میں ہمت ہے کہ دیکھو روئے دوست　　(خاص)

غزل

(جناب قاضی محمد حبیب فضائی اجمیری سابق چیف ایڈیٹر رسالہ کیف و اخبار اتفاق اجمیر)

عرضِ نیاز بے حاصل سے خجلت پیدا ہوتی ہے ∴ اُن کے لئے تحریکِ نوازش کلفت افزا ہوتی ہے
حرفِ وفا ہی ایک دوا ہے حسن کسے تقسیم کرے ∴ جبکہ مریضِ دردِ محبت ساری دنیا ہوتی ہے
جب یہ وہ سرگرم عنایت وقت ہو وہ مر جانے کا ∴ حرفِ جفا ہی الفت میں جینے کا سہارا ہوتی ہے
عالم عشق و محبت کا جب نشتہ میں بھر جاتا ہے ∴ دنیا دوسرے عالم کی غفلت سے جویا ہوتی ہے

رات فضائی جوشِ غم میں رہتی ہے بھیگی بھیگی
اشکِ حسرت کی طغیانی سے دریا دریا ہوتی ہے　　(خاص)

عفت

بیوہ سے خطاب

(محترمہ امۃ الزہرا بیگم صاحبہ حیا مدیرہ رسالہ عفت دہلی)

دہر میں مرکز بنی آلام کا اے نوجوان ∴ اب ہے پینے کیلئے خونِ جگر اک خستہ جان
آسماں بر پر ترے اک رنج و غم کا پھٹ پڑا ∴ سوگ میں شوہر کے اپنے کو ہے پژمردہ کیا
غم میں شوہر کے لباس ماتمی ہے زیب تن ∴ آگئی کیسی خزاں سب لٹ گیا تیرا چمن
کوئی حامی ہے نہ تیرا اور نہ کوئی غمگسار ∴ ہے نہ کوئی اب شریکِ غم ترا اے سوگوار
حیف ان ایام کو اب کسطرح کاٹے گی تو ∴ اُف دلِ خستہ کو اپنے کیسے بہلائے گی تو
آجکل بیوہ کی دلداری کوئی کرتا نہیں ∴ جز خدا ہرگز نہیں دمساز تیرا اے حسیں
بدلے سرخی کے اداسی رخ پہ ہے اور چشم نم ∴ گھل گیا سارا بدن بھی سہتے سہتے رنج و غم
بنگئی تصویرِ یاس اور محوِ حیرت کس قدر ∴ حیف ارمانوں کا مدفن بن گیا تیرا جگر
ہیں ہنسی کے بدلے لب پر نالہ ہائے دردناک ∴ کرتی ہیں اظہارِ غم کا چشم ہائے نمناک
کس قدر افسردہ خاطر ہے تو اے خستہ تن ∴ اشک ہیں آنکھوں سے جاری وہ قدر رنج و محن
کپڑے میلے بال بکھرے اور ہے چہرہ اداس ∴ عسرت و تنگدستی نے ہے کر دیا تصویرِ یاس
تیرے ارمانوں کا مدفن بن گیا مٹی کا ڈھیر ∴ تیری ناکامی نے تجھکو کر دیا دنیا سے سیر
تیری مایوسی سے ہوتا ہے کلیجہ پاش پاش ∴ کانپ جاتا ہے جگر سنکر صدائے دلخراش

بس حیا خاموش اب ہرگز نہیں تابِ رقم
دل پہ ہوتا ہے تصور سے سوا غم اور ہم　　(خاص)

گلکدہ

ساقی وحدت سے خطاب

(جناب لالہ کرتار ناتھ صاحب شفق صحرائی سابق ایڈیٹر گلکدہ لاہور)

پھر حسن فردوسی پر مشاطۂ فطرت ہے ؛ پھر گلشن عالم میں افزونی زینت ہے
ہر دشت دمن پھر اک گہوارۂ عشرت ہے ؛ ہستی کا ہر اک منظر پُر کیف مسرت ہے

پھر فصل بہار آئی
لا پھول پلا ساقی

پھر لالہ و سوسن کے انداز نرالے ہیں ؛ پھر گیسوئے سنبل نے کچھ پیچ سے ڈالے ہیں
پھر کیف محبت سے معمور یہ پیالے ہیں ؛ مشتاق ترے ہم بھی اے مستیوں والے ہیں

پھر فصل بہار آئی
لا پھول پلا ساقی

پھر خلد بدامن ہے گلشن کا ہر اک منظر ؛ فطرت کے جواں نغمے پھر سارے ہیں یاہر
گھنگھور گھٹائیں ہیں ہر ذرہ ہے مستی پر ؛ نظروں میں سمایا ہے اک شوخ پری پیکر

پھر فصل بہار آئی
لا پھول پلا ساقی

گھیرے ہوئے نظروں کو ہے جلوۂ جانانہ ؛ پھر طور بنا ہر دل پھر شوق ہے دیوانہ
ہر برگ پری سے اور ہر پھول ہے پیمانہ ؛ اندر کا اکھاڑہ ہے عشرت کا یہ گل خانہ

پھر فصل بہار آئی
لا پھول پلا ساقی

چیت چور مرے ساقی اے پیکر مینائی ؛ اے شام مرے کالی اے شرق کی رعنائی
بھگتوں کے پتت پاون اے پریت کی کہنائی ؛ پھر گنگا جلی چھلکے اے محو خود آرائی

پھر فصل بہار آئی
لا پھول پلا ساقی

اے جان شفق آکر مسرور ذرا کر دے ؛ پُر کیف نگاہوں سے مخمور ذرا کر دے
الفت کے ترانوں سے مسحور ذرا کر دے ؛ ظلمت کدہ ہستی کو پُر نور ذرا کر دے

خوں شد دل سودائی
وقت ست کہ باز آئی

(خاص)

[صفحہ ۷۸۹ کا بقیہ]

اٹھا کر ناچتا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ جب مداری ایک طرف سے دوسری طرف باقاعدہ حرکات کرتا ہے تو سانپ حملہ کرنے کی طیاری میں سر اٹھاتا ہے اور ادھر ادھر حرکات کرتا ہے۔

اس بات کے زیادہ ثبوت بہم نہیں ہوئے کہ حیوان انسانی راگ کے شوقین ہوتے ہیں۔ یہ بات تو مانی ہوئی ہے کہ حیوان حیوانی راگ کے بے حد شوقین ہوتے ہیں۔ مثلاً جب پرندوں کے میتھن کا زمانہ آتا ہے تو وہ گانے لگ جاتے ہیں کئی بندر اور لنگور مل کر گاتے ہیں۔ مینڈکوں اور گیدڑوں کا باہم گانا تو مشہور ہی ہے۔ ایک بندر کی قسم کا جانور ہوتا ہے جس کے گلے میں ایک چھوٹی سی تھیلی ہوتی ہے اسے وہ اپنی حسب مرضی ہوا سے بھر لیتا ہے پھر اس تھیلی سے اس قدر زور کی چیخیں نکالتا ہے کہ رات کے وقت میل میل تک سنائی دیتی ہیں۔ صرف مذکر مینڈک ہی گاتے ہیں۔ مونث مینڈک نہیں گاتے۔

جانوروں کے ان حالات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے نہ صرف حضرت انسان میں ہی خوبیاں پیدا کی ہیں بلکہ حیوانوں کے من میں بھی کئی اسی قسم کی خوبیاں پیدا کی ہیں۔ (خاص)

مسٹر رفیعی اجمیری ' نگران ''کیف''

مسٹر محمد عنایت اللہ خان حیرت ' ایڈیٹر ''سروش''

مسٹر محمد جعفر حسین ' ایڈیٹر ''معیار''

مسٹر جے - آر - رائے ' ایڈیٹر ''ہندوستان''

ڈاکٹر چھدمی لال، ایڈیٹر ''کایستھ کانفرنس گزٹ''

مسٹر فیاض نسیم، ایڈیٹر ''ہونہار''

مسٹر بدیع الزمان، ایڈیٹر ''عزیز''

مولانا حسرت موہانی، ایڈیٹر ''اردوئے معلیٰ''

پروفیسر علم الدین سالک ' ایڈیٹر '' امام '' و '' سوراج ''

مسٹر ایس - اے - بریلوی ' ایڈیٹر '' بمبئی راڈیکل ''

پروفیسر ضیاء احمد ' ایڈیٹر '' علیگڈہ انٹر میڈیٹ کالج میگزین ''

خانصاحب محمود علی خان ' ایڈیٹر '' اکبر ''
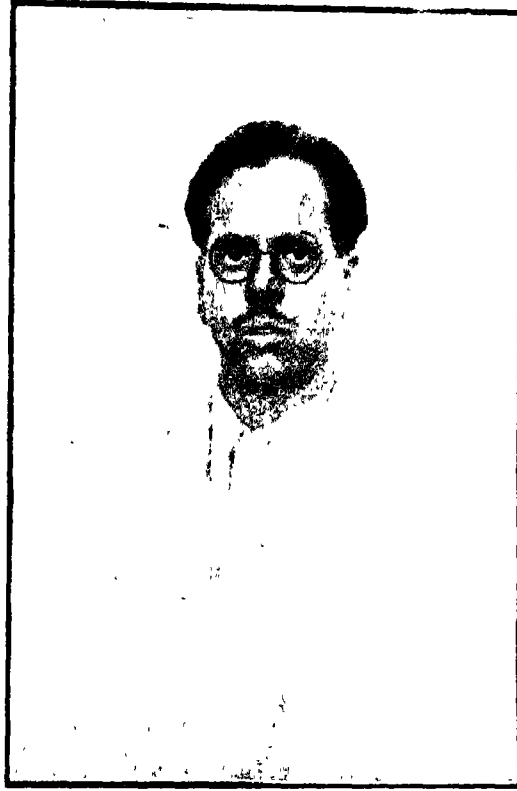
مسٹر چمن لال سیوک ، ایڈیٹر "چمن"

ڈاکٹر اعظم کریوی ، ایڈیٹر "ابر" و "طوفان"

پروفیسر آئی - کے - تاجور ، ایڈیٹر "ادبی دنیا"

پروفیسر سید منظور حسن ' ایڈیٹر '' عربک کالج میگزین ''
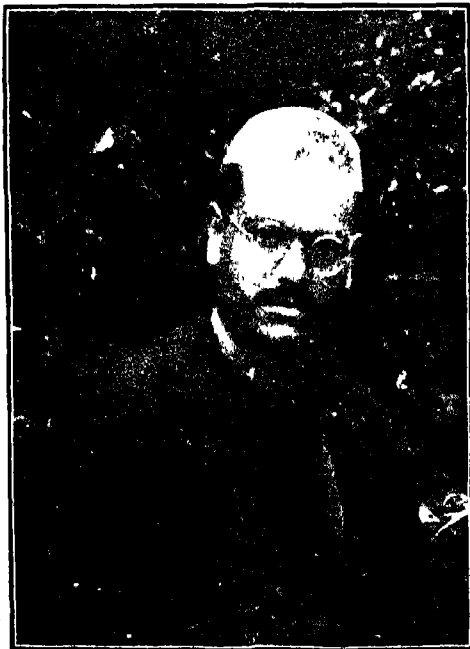
مسٹر گوری شنکر اختر ' ایڈیٹر '' مان سرور ''

مسٹر کوڑے مل آنند ' ایڈیٹر '' ہمدرد قوم ''

مولانا سید ظفر مہدی صاحب گہر ' ایڈیٹر '' سہیل یمن ''

ڈاکٹر سون دنکر شائق ' نائب ایڈیٹر
'' چترگپت سماچار ''

حکیم برہم (مرحوم) ایڈیٹر '' مشرق ''

مسٹرس سالک و مہر ' ایڈیٹرس '' انقلاب ''

مسٹر واحدی ' ایڈیٹر '' نظام المشائخ ''
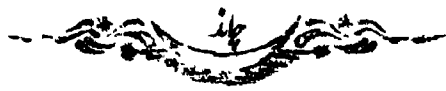
مبصر

مدیران اخبار و رسائل ہی اس مشکل کو حل کریں

(جناب حکیم آشفتہ صاحب مدیر رسالہ مبصر لکھنؤ)

آپ کی ادبی دلچسپیاں اظہر من الشمس ہیں کیونکہ آپ اپنے اوقات عزیز کا بڑا حصہ خدمت ادب میں صرف کرتے ہیں حقیقی ذوق نہ ہونے پر اس زحمت شاقہ کا امکان اگر محال نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

کیا آپ بھی موجودہ دور کو ادب اردو کیلئے دور زریں خیال فرماتے ہیں۔ کیا آپ کی رائے میں بھی اردو علمی زبانوں کی برادری میں بیٹھنے کے قابل ہو گئی۔ کیا آپ کے خیال میں اتنی استعداد اس میں پیدا ہو گئی کہ مستقبل قریب میں یہ امید کیجائے کہ یہ بھی دوسری علمی زبانوں کی طرح عام خصوصیات علمی و ادبی سے مالا مال ہو جائے گی۔

اگر جواب اثبات میں ہے تو میری التماس ہے اپنی ذات گرامی کو بالاتر اور میرے سوالات کے جوابات دینے سے اپنے قلم کو بے نیاز سمجھیگا۔ خدا آپ کو یہ شیخ چلی کی تمنائیں مبارک کرے اور اگر جواب نفی میں ہے تو بحیثیت مدیر آپ بھی کچھ ذمہ داریاں اپنے لئے محسوس کرتے ہیں۔ کچھ آپ کے ذوق ادب نے ایسے بھی فرائض متعلق کئے ہیں؟ تو وہ کیا صرف اس قدر ہیں کہ آپ چند جزو کا رسالہ یا چند ورق کا اخبار نکالدیں اور طرح طرح کے گل بوٹوں اور رنگین ٹائٹل پیجوں سے آراستہ کردیں یا وقتی طور سے دل لبھانے والے چند اوراق تصویروں کے بڑھا دیں اور پرچوں کے اوراق بھرنے کیلئے ہر قسم کے رطب و یابس مضامین عجیب و غریب قسم کی محیر العقول نظمیں جنکے بیشتر اشعار علم معانی و بیان کے ماتحت یا فصاحت و بلاغت کے معیار پر تو کجا "اوزان و قوافی" کی بھی پابندیوں سے بے نیاز ہیں۔ شائع کردیں اگر آپ کی نظر میں یہی خدمت ادب ہے تو ضرور آپ نے زبان کی خدمت کی اور یقیناً آپ کی زبان شاہراہ ترقی پر ہے۔ بیشک اس نقطۂ نظر سے ایک نہ ایک دن ضرور آپ اپنی زبان کو علمی زبانوں کا سرتاج بنادیں گے آپ کے بعد آپ کی آنے والی نسلیں آپ کے ثمرہ محنت سے فیضیاب ہونگی آپ یقیناً ان کے لئے بہت عمدہ زبان کا سرمایہ چھوڑ جائیں گے جس کو بجائے اردو کے تُت پُنجی کہنا زائد مناسب ہوگا جسمیں بھانت بھانت کے الفاظ ہونگے۔ جس میں سنجیدہ اور متین لیست اور سوقی الفاظ میں کوئی امتیاز ہی نہ ہوگا۔ جس کی نثر میں سوائے الجھی ہوئی گتھیوں کے اور کچھ نظر ہی نہ آئے گا۔ جس کی نظموں کو نظم اور نثر دونوں لفظوں سے تعبیر کرنا صحیح ہوگا۔

آپ ملک کے اکثر ادبی پرچوں کو (بعض کو چھوڑ کر) باعتبار مضامین نظم و نثر آخر کس نظر سے دیکھتے ہیں ہر پرچہ پر آپکا نقد و تبصرہ یہ بتاتا ہے کہ ہر پرچہ آپ کی نظر میں ادب اردو کا علم بردار ہے۔ جن پرچوں کے مضامین نظم و نثر میں صدہا موٹے موٹے اغلاط موجود ہیں اُن کی بھی آپ نے حد کی تعریف کی ہے۔ اور ان اغلاط کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ افسوس

یہ آپ نے زبان کی خدمت کی ہے۔
آیئے میں آپ کو آپ کے خدمات کی کچھ معمولی سی تفصیل پھر بتا دوں۔ (۱) آپ نے اکثر مضمون نگاروں کے اغلاط کی تصدیق کر کے اپنی طرف سے ہمیشہ کے لئے زبان میں غلطیوں کا اضافہ کر دیا۔ (۲) پرچوں کے غلط انتخاب اور مدیر کی غلطیوں کو چھپا کر درحقیقت آپ نے مدیر اور رسالہ دونوں کو نقصان پہنچایا آئندہ پھر مضمون نگار اس قسم کے غلط مضامین لکھے گا اور چھاپنے والے چھاپیں گے اور اغلاط کی تقلید کرنے والے تقلید کرینگے اس طرح آپ کی بدولت ایک غلط چیز زبان میں نشر پائے گی۔ سچ بتایئے کہ یہ آپ نے زبان کی خدمت کی اور اس کو سنوارا یا درحقیقت اس کو تباہ و برباد کیا (۳) صاحب مضمون بھی اپنی غلطی پر متنبہ نہوا اور آئندہ اس سے زائد اغلاط کا ارتکاب کرے گا ابھی تو اس کا ایک ہی مضمون اور ایک ہی نظم شائع ہوئی ہے جس کی اشاعت کے قبل وہ یقیناً کسی قدر جھجکتا بھی ہوگا لیکن آپ کی مہر تصدیق کے بعد اب وہ بالکل مطمئن ہے اور اب قریب قریب ہر اخبار اور رسالے میں اس کی "رنگین تیتری" والی نظم اور "عریان بھکارنی والا افسانہ ضرور نظر آئیگا اور چار ہی دن میں رقاصہ تیتری اور ننگی بھکارنی "زبان کے فصیح الفاظ میں شامل ہوجائیں گے۔ (۴) اور ایسی حالت میں جبکہ آپ نے خود بھی اپنے پرچہ میں اسی قسم کے مضامین بغیر انتخاب شائع فرمائے ہیں تو پھر آپ کو نقد و تبصرہ میں بھی کوئی حق اعتراض کا دوسروں پر نہیں رہتا۔ اور بلا واسطہ بجائے تعمیر زبان کے تخریب زبان کی ذمہ داری خود آپ ہی پر عائد ہوتی ہے۔ (۵) اگرچہ اس مسئلہ کا حل کہ کیونکر اصلاح کیجائے اور الفاظ و اصطلاحات جدیدہ میں کون کون الفاظ و محاورات زبان کے لئے قابل قبول و لائق تقلید ہیں اور کون کون قابل ترک ہیں مشکل ہے مگر شاید اس کے تسلیم کرنے میں آپ کو بھی عذر نہ ہوگا کہ اسی مسئلہ پر زبان کی بنیاد اور مستقبل کا دار و مدار ہے۔ (۶) یہ جو روزمرہ نظم و نثر کے سلسلہ میں صدہا غیر مانوس۔ اجنبی۔ مہتند۔ معرب۔ مجہول النسب۔ مجہول الحال غیر لغوی۔ غیر اصطلاحی۔ غلط سلط الفاظ آپ کے ملاحظہ سے گزرتے رہتے ہیں کیا آپ کی رائے میں اردو کے لئے قابل قبول ہیں۔ نہیں اور کبھی نہیں جب یہ مسلم ہے تو آجتک آپ نے کونسا لائحہ عمل اس سیلاب بلا کے روکنے کے واسطے تجویز کیا خاموش خدمت جو انفرادی طور سے انجام دیجا سکتی تھی وہ تو انتخاب اور نقد و تبصرہ کی صورت میں تھی اور ہوسکتی تھی جو کسی قدر آپ کی ذمہ داری کو ہلکا ضرور کردیتی لیکن اگر آپ نے یہ خدمت بھی انجام نہیں دی تو پھر یہ کہنا مشکل ہوگا کہ آپ بہی خواہ اردو ہیں اور اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ (۷) میرے محترم معاصرین تھوڑی دیر کے لئے انصاف کی روشنی میں دماغ اور عقل سے کام لیجئے اور میری گستاخیوں کو معاف کر دیجئے اگر میری التماس صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے تو آیئے ہم آپ ملکر معاصرانہ ذہنیت کے ساتھ ایک کار آمد برادری قائم کریں اور ایک مناسب لائحہ عمل تجویز کرلیں پھر اس پر عمل کرنے کے لئے ملک بھر کے ارباب قلم کو دعوت دیں سب سے بہتر صورت تو یہ تھی کہ سب ایک مقام پر جمع ہو کر اس کا فیصلہ کرتے مگر ہر شخص عدیم الفرصت ہے اور یہ صورت کسی قدر مشکل ہے۔ لہٰذا آسان صورت یہ ہے کہ میرے اس تجویز پر تمام مدیران اخبار و رسائل غور فرمائیں اور مناسب ترمیم و تنسیخ کے بعد ایک نقطہ پر متحد ہوجائیں۔

میری تجویز یہ ہے کہ ابھی صرف ایک جماعت اخبار و رسائل کے مدیران سے منتخب کیجائے جو زبان کے جدید اور مخترع الفاظ کے جائز الاستعمال و ناجائز الاستعمال ہونے کا قطعی فیصلہ کرتی رہے اور اس پر عمل یوں کیا جائے کہ پھر وہ الفاظ خواہ کسی سربرآوردہ شخص ہی کے مضمون میں کیوں نہ ہوں شائع نہ ہو سکیں۔ اور ہر مدیر اپنے اختیارات امتیازی سے اس کو نکالدے۔ اور مہر ماہ ان الفاظ کی ایک فہرست یعنی جو قابل قبول ہیں یا قابل ترک اپنے رسائل و اخبار میں شائع کرتا رہے تھوڑے عرصہ تک یہ صورت ملک میں ضرور قابل اعتراض و نکتہ چینی رہے گی لیکن بعد میں تمام ارباب قلم اس جماعت کا احترام کرنے پر مجبور ہوں گے اور خود بھی اس میں شرکت کی تمنا کریں گے۔

پہلے ایک فہرست مرتب کیجائے پھر اس میں بلاخوف تردید ایمانداری سے ایک مضبوط جماعت کا انتخاب کر لیا جائے اور ان سے استدعا کیجائے۔ میری رائے سے بہتر اگر اور کوئی صورت نکلے تو میں اس کو بسرو چشم منظور کیجائے تاکہ نتیجہ خیز اور اصول پر مبنی ہو — ورنہ انفرادی حیثیت تو کسیطرح کامیاب نہیں ہو سکتی۔

(خاص)

حسن سیرت اور عشق صادق

(جناب سراج الحسن صاحب سراج سعادن عزاری مبر لکھنؤ)

حسن کی تصویر کا اک رُخ ہے لاجواب؛ سچ ہے یہ لیکن توقف کر نگاہ انتخاب

دیکھ ابھی آئینہ حیرت نہ بن دل کی طرح؛ اس نگینے کو پرکھنا چاہئے اچھی طرح

قد آدم ایک آئینہ ہے تیرے سامنے؛ دیکھ تو یہ کونسی دنیا ہے تیرے سامنے

(۲)

کوندتی ہے حسن کی بجلی جھپکتی ہے پلک؛ نرگسی آنکھوں میں ہے روشن ستاروں کی چمک

دانت ہیرے کے نگینے ہیں کہ موتی کی لڑی؛ لب ہیں نازک یا گلابی پھول کی اک پنکھڑی

بجلیوں کی لہر ہے موج تبسم میں نہاں؛ سیکڑوں مفہوم ہیں اک جنبش لب میں عیاں

ہر ادا دلچسپ ہر انداز دل آویز ہے؛ شرم میں ڈوبی ہر انگڑائی قیامت خیز ہے

الغرض دیکھا نہیں جاتا ہے عالم حسن کا؛ ہے جوانی باڑھ پر ہے رنگ بھی نکھرا ہوا

(۳)

یہ تو سب سچ ہے مگر یہ چار دن کی ہے بہار؛ بے مہک یہ پھول ہیں یہ رنگ ہے ناپائیدار

بوالہوس ہے وہ جو ان رنگینیوں پر جان دے؛ بندگی میں ان بتوں کی مفت میں ایمان دے

چار دن کی چاندنی ہے حسن ظاہر کا فریب؛ دل پہ قابو رکھ نہ توڑ آئینہ صبر و شکیب

ایسے عاشق کی محبت کا نہیں کچھ اعتبار؛ جس کی الفت کا ہو ان دلچسپیوں پر انحصار

حسن ظاہر ہی فقط مرکز محبت کا نہیں؛ عشق کی توہین ہے یہ طور الفت کا نہیں

(۴)

وقت جب گزرے گا بدلے گی زمانہ کی ہوا؛ رنگ بھی روغن بھی سب اُڑ جائیگا تصویر کا

رونما جسوقت ہوگا حیرت انگیز انقلاب؛ جب تجھے معلوم ہوگا تھا یہ پانی یا سراب

حسن کے گلزار میں جسدن خزاں آ جائیگی؛ ساری الفت ساری دلچسپی فنا ہو جائیگی

بوالہوس کیا ہوگا پھر تیری محبت کا مآل؛ سیکڑوں پڑ جائیں گے آئینۂ الفت میں بال

(۵)

محو ہے آغاز میں انجام الفت بھی تو دیکھ؛ حسن صورت دیکھتا ہے حسن سیرت بھی تو دیکھ

ہے مگر اک شرط یہ بھی عشق صادق چاہئے؛ شیشہ اس تصویر دلکش کے موافق چاہئے

وہ محبت کیا ہے جو اک حال پر قائم نہ ہو؛ کچھ نہیں کس کام کا وہ کیف جو دائم نہیں

(خاص)

مخزن

کہسار کی دو تصویریں

(جناب حفیظ جالندھری ایڈیٹر مخزن، لاہور)

کس قدر ہنگامہ پرور ہے سکوت کوہسار ؎ کار پردازانِ قدرت ہیں یہاں معروف کار
رفعتوں پر رفعتیں ہیں پستیوں پر پستیاں ؎ اس طرح آباد ہیں نورانیوں کی بستیاں
اک بڑے قانون کی تعمیل ہوتی ہے یہاں ؎ قسمت آب و ہوا تبدیل ہوتی ہے یہاں
گوشے گوشے میں ہیں قائم کارخانے ابر کے ؎ بن رہے ہیں تن رہے ہیں شامیانے ابر کے
وقت بیچارہ یہاں پابند ہے مجبور ہے ؎ اس مشقت گاہ کا ادنیٰ سا اک مزدور ہے
آسماں گردش میں ہیں دو کام کرنے کے لئے ؎ صبح کرنے کے لئے یا شام کرنے کے لئے

(صبح)

صبح کا یہ فرض ہے معمول پر آیا کرے ؎ جس قدر سونا فراہم ہو سکے لایا کرے
لے کے آتی ہے زرِ خالص کی کانیں سر بسحر ؎ لا کے رکھ دیتی ہے سونے کی چٹانیں شرق تا
کیمیا سازانِ چرخ اٹھتے ہیں پا ہے کام کو ؎ آگ کی بھٹی میں رکھتے ہیں طلائے خام کو
دفعتاً شعلے نظر آتے ہیں یا رنگیں دھواں ؎ چوٹیاں مشرق کی ہو جاتی ہیں سب آتش فشاں
دیکھتے ہی دیکھتے ہوتا ہے سونے کا یہ حال ؎ کوئی شے پگھلی ہوئی کچھ قرمزی کچھ لال لال
حکم ہے اس میں جو ناقص ہے چھپ جایا کرے ؎ اور باقی اک طلسمی گنبد بن جایا کرے
بعض چابکدست شاگردان استاد ازل ؎ کرتے ہیں اس گنبد میں نیرنگ پھر یکا عمل
اب پہاڑوں سے ابھرتا ہے یہ لعبۂ نور کا ؎ حسن خود کرتا ہے نظارا قریب و دور کا
کارگہ کا جائزہ لیتے ہیں اٹھ کر نور باف ؎ ذرّے ذرّے پر چڑھا دیتے ہیں نورانی غلاف
یہ طلسمی گنبد برساتی ہے نازآمیز نور ؎ زندگی کی گرم بازاری کا ہوتا ہے ظہور

(شام)

رفتہ رفتہ سرخیوں پر چھا گیا کالا غبار ؎ مٹ گیا رنگ شفق مرجھا گیا یہ لالہ زار
نور کے زریں ایوانوں میں تالے پڑ گئے ؎ ارغوانی بدلیوں کے رنگ کالے پڑ گئے
شام آتی ہے سکوں کا جال پھیلائے ہوئے ؎ ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے
بے زباں خاموشیاں جاگیں صدائیں سو گئیں ؎ شورشیں چپ ہو گئیں خاموشیوں میں کھو گئیں
کوہ پر ظلمات کی پریوں نے پر پھیلا دئے ؎ ہر طرف تاریک دامن کھول کر پھیلا دئے
ایک پر اسرار خاموشی فضا میں بس گئی ؎ اک سبک رفتار خاموشی ہوا میں بس گئی
جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں ؎ بدلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں
اسطرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں ؎ جسطرح دیووں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں
منظر کہسار پر اسدم یہ ہوتا ہے گماں ؎ اونٹ ہیں بیٹھے ہوئے اترا ہوا ہے کارواں
یا گھٹائیں ہیں کہ اٹھیں سرد ہو کر جم گئیں ؎ اور یا پھر آندھیاں ہیں چلتے چلتے تھم گئیں
یا کنارِ چرخ ظاہر ہے اثر برسات کے ؎ خیمہ بوسیدہ میں پیوند ہیں بانات کے

(خاص)

اسرار محبت

(جناب مقبول حسین صاحب وصل بلگرامی ایڈیٹر مرقع لکھنؤ)

ہائے جوانی دیوانی کیسی ظالم ہوتی ہے — جا کر دکھ دیتی ہے آ کر کانٹے بوتی ہے
شمع شام فرقت کو دیکھ کے حسرت ہوتی ہے — میں رونے سے عاجز ہوں اور یہ شب بھر روتی ہے
پھول کسی پر ہنستے ہیں اور شمع کسی پر روتی ہے — ہائے عجب شے عالم حسرت قبر کی منزل ہوتی ہے
آب نرالی رکھتا ہے دانہ دانہ اشکوں کا — راز ابھی یہ مخفی ہے پتھر ہے یا موتی ہے
چشم حقیقت پیدا کر پھر دنیا پر ڈال نظر — ہر صحرا میں گلبن ہے، ہر دریا میں موتی ہے
بلبل خوش گل خنداں، باغ میں ہے دور عشرت — شبنم نے کیا دیکھا ہے تا بہ سحر کیوں روتی ہے
جس عالم میں عاشق ہے بالا ہے وہ دونوں سے — مرنا کس کو کہتے ہیں، ہستی کیسی ہوتی ہے
عشق کے دو سرمائے ہیں چشم پُرنم، اشک غم — موتیوں کا وہ دریا ہے یہ دریا کا موتی ہے
اپنی اپنی قسمت سے سب عاجز ہیں دنیا میں — عشق کی دنیا روتی ہے حسن کی دنیا سوتی ہے
قبر پہ ناحق روتے ہو یادِ عہد ماضی میں — اب چونکے ہو غفلت سے جب میری قسمت سوتی ہے
دامن کیا چھوٹے گا ہاتھ سے خون بلبل کے — ناحق شبنم راتوں کو رنگِ وفا تو دھوتی ہے
کنہ حقیقت پالینا ہوش میں رہ کر ناممکن — کھوتا ہوں تو ملتی ہے ملتا ہوں تو کھوتی ہے
میری تمہاری حالت میں فرق اتنا ہے غور کرو — تم پر دنیا ہنستی ہے مجھکو دنیا روتی ہے
شبنم تیرے آنسو کو اشک سے میرے کیا نسبت — قطرہ پر بھی قطرہ ہے موتی پر بھی موتی ہے

وصل جو کل تک ساتھی تھے آج وہ اپنے دشمن ہیں
دنیا اس کو کہتے ہیں دنیا ایسی ہوتی ہے

(خاص)

مُبلّغ

مسلمان کیوں تباہ ہو رہے ہیں

[جناب مولوی سید علی داد صاحب ایڈیٹر رسالہ "مبلغ" لکھنؤ]

یہ ایک سوال ہے، جو آج اقوامِ عالم کی ہر فرد کی زبان پر ہے اور وہ لوگ جو درد قومی رکھتے ہوئے اسلام دوست ہیں، اسبابِ تنزل دریافت کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس اس کا ہے، کہ جب کوئی سبب بتایا جاتا ہے، تو میدانِ عمل میں ایک بھی نہیں آتا، اور ورق سادہ رہتا ہے۔

اسلام کا سب سے بہتر سبق جو مسلمانوں کی ترقی کے صدہا راز لئے ہوئے تھا "اتحاد" تھا۔ جس کی صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ یہی مسلمانوں کی ترقی کا معیار اور نشوو ارتقا کا آلہ تھا، جسکو ہم نے ایسا بھلایا، کہ کبھی اس کی سمت توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ اپنی جگہ طے ہے کہ دنیا میں متحد رہنے والی قومیں معراج کمال پر پہونچکر ہم سے آگے بڑھ گئی ہیں لیکن ہمارے پیروں میں تغافل کی بیڑیاں ایسی پڑی ہوئی ہیں کہ آگے قدم بڑھنے کا نام نہیں جانتے۔ نظامِ عالم اسی اتحاد پر موقوف ہے۔ پودے سب خوشنما ہیں مگر چمن جب ہی کہا جاتا ہے، جب بیلا، چنبیلی، گلاب ایک کیاری میں ہوں، اور شمیم سے شامہ کو ممنون احسان بنائیں۔ پھول جتنے ہیں، اُن کی بھینی بھینی خوشبو دماغ کو معطر کرتی ہے، مگر گلدستہ اسی وقت ہوگا، جب ایک دوسرے سے منسلک کئے جائیں۔ کوئی عمارت بن کر کبھی تیار نہیں ہوئی، جب تک ایک خشت دوسری خشت کے پہلو میں جگہ نہ پائے۔ اسلام کے افراد کسی ایک نقطۂ خیال پر قائم ہونے سے جیسے نشوونما اور روز بروز مسرت دیکھنے سے محروم ہیں ان کا بکھرا ہوا شیرازہ تا وقتیکہ اجتماعی شکل اختیار نہ کرے نظروں کو اپنی جانب جذب نہیں کر سکتا۔ اور اسلام کا موجودہ قصر اتفاق نہ ہونیکی وجہ کر دینی بنیاد پر قائم نہ ہو کر متزلزل ہے مسلمانو اس عمارت کو منہدم ہونے سے بچاؤ اور شیر و شکر ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاؤ۔ تمہارے اسلام اور بانیٔ اسلام نے یہی سبق دیا تھا، جس کو تم نے بھلا دیا۔ اگر اتفاق کا جوہر تم میں پیدا ہو گیا۔ تو پستی کا روز سیاہ کبھی سامنے نہ آئیگا۔ اب بھی خوابِ غفلت سے چونکو۔ اور مذہب کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچاؤ۔

(خاص)

مَشرِق

غزل

[جناب حکیم برہم صاحب مرحوم ایڈیٹر اخبار "مشرق" گورکھپور]

کان نازک ہیں مرے گلفام کے — بالیاں پتے ہوں ہلکے کام کے

اب تو صورت دیکھ کر میری حسین — بیٹھ جاتے ہیں کلیجا تھام کے

غیر کی ناکامیاں تھیں جس قدر — آگئیں حصے میں مجھ ناکام کے

میری صورت دیکھ کر تم نزع میں — خیر ہے! کیوں چلدیئے دل تھام کے

رفتہ رفتہ دل کو تسکیں ہوگئی — کام آئی یاس مجھ ناکام کے

قاصدوں کو گالیاں دے کر کہا — مستحق تم ہو اسی انعام کے

قبر میں جی بھر کے برہم سوئیے
کٹے بہت ترسے ہوئے آرام کے

(خاص)

موٹر کار

غزل

[جناب خیر بہوروی سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر اخبار "مشرق" و رسالہ "موٹر کار" گورکھپور]

اسے اُڑ کے لینا ہے دامن کسی کا — کرے خاک ادب خاک مدفن کسی کا

بڑھی ہے بہت برق کی بیقراری — ہے مدِ نظر کیا نشیمن کسی کا

رہیگا نہ یہ دُہرے آنچل سے دب کر — بُری طرح اُبھرا ہے جوبن کسی کا

شباب آکے برپا کریگا قیامت — کہ ہے آفتِ جاں لڑکپن کسی کا

انھیں چین سے شب کو سونے نہ دیگا — یہ نالہ کسی کا یہ شیون کسی کا

اٹھائیگا محشر میں شر خیز کیا کیا
جو ہاتھ آگیا اس کے دامن کسی کا

(خاص)

مستانہ جوگی

گانا سننے والے جانور

(جناب عونی لچھمی پرشاد صاحب ایڈیٹر رسالہ مستانہ جوگی لاہور)

راگ اور گانے کا نہ صرف حضرت انسان ہی مشتاق ہے۔ بلکہ جانور اور پرندے بھی گانے کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ تھوڑا عرصہ ہوا لندن کے چڑیا گھر میں چند تجربات کئے گئے تھے۔ گویوں کا ایک گروہ اپنے آواز اور ساز بجاتا ہوا ہر ایک خانے کے قریب جاتا تھا۔

مختلف جانوروں پر گانے کا مختلف اثر ہوتا تھا مثلاً گینڈا بالکل گانے کی طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔ خواہ کوئی سی سُر نکالی جائے۔ شیر ہر ایک راگ کو نہایت شوق سے سنتے تھے۔ خواہ وہ اپنی کھیل میں کس قدر مشغول ہوتے گانا سننے کے لئے وہ کھیل کو ضرور بند کر دیتے تھے۔ گیدڑ جب ساز کی آواز کو سنتے تھے تو منہ آسمان کی طرف کر کے زور سے چیخ لگاتے تھے۔ جب کوئی غم پیدا کرنے والا راگ چیتے کو سنایا جاتا تھا تو وہ غم محسوس کرتا تھا اور جب خوشی کا راگ سنایا جاتا تھا تو وہ خوش ہوتا تھا۔

پانی کے ذخیرے کے پاس جب ساز بجائے گئے تو کچھوے پانی کی سطح پر آ گئے۔ حتیٰ کہ جزیرے کے تمام جانور کناروں کے نزدیک آ گئے اور سر باہر نکال کر آواز کو سننے میں محو ہو گئے۔ کیڑے مکوڑے مثلاً بچھو اور مکڑیاں بھی راگ کی طرف رجوع ہوتی تھیں۔ تمام پرندے راگ کی طرف دھیان نہیں دیتے تھے بلکہ راگ سے تکالیف محسوس کرتے تھے۔

اصلی امر یہ ہے کہ جو لوگ ایک گروہ کو پسند ہوتا ہے وہ دوسروں کو پسند نہیں آتا۔ مثلاً جب بجلی کی مشین چل رہی ہو تو مکر مچھ اس آواز سن کر اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ شاید وہ انجن کی آواز کو مونث مچھر کی آواز سمجھ کر اس کے نزدیک آتے ہیں۔ اور انجن پر بیٹھ کر شہید ہو جاتے ہیں۔

مکڑیاں راگ کو بہت پسند کرتی ہیں۔ کئی سازوں کی آوازیں انھیں ایسی پسند آتی ہیں کہ وہ اپنی چھپنے والی جگہوں سے باہر نکل کر زمین پر ناچنے لگتی ہیں۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک قیدی اپنی تنہائی سے تنگ آ گیا۔ آخر کار وہ گا گا کر اپنا دل خوش کرنے لگا جیل میں ایک مکڑی بھی اس کا گانا سنا کرتی تھی۔ جب وہ قیدی گاتا تو مکڑی اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی۔ آخر کار جیل کے داروغہ کو یہ حال معلوم ہوا اس نے قیدی کو کہا کہ مجھے بھی یہ تماشہ دکھایا جائے۔ جب گانے پرست ہونے والی مکڑی قیدی کے نزدیک آئی تو داروغہ نے اُسے پاؤں سے کچل دیا۔

اس میں بالکل شک نہیں ہے کہ بعض جانوروں پر راگ سے وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ بعض مقدس کتابوں کی کہانیاں انھیں بنیادوں پر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً مقدس پرانوں میں کئی جگہ جانوروں کا راگ کے ذریعہ مست ہو جانا لکھا ہے عام لوگ جانتے ہیں کہ سانپ بین پر مست ہو جاتے ہیں اور مداری اس قسم کا تماشا بھی دکھاتے ہیں۔ لیکن سائنسدانوں نے معلوم کیا ہے کہ کسی قسم کا کوئی سانپ بھی راگ کا شوقین نہیں ہوتا۔ سانپ بین

[بقیہ صفحہ ۸۲۲ پر دیکھئے]

مشاعرہ

صہبائے ہند کے چند جام

(جناب سید ظہیر الدین احمد علوی۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ وکیل مدیر اعزازی رسالہ مشاعرہ فرخ آباد)

اردو دنیائے صحافت میں اردو کے شعرائے سلف کے اکثر تذکرے نظر آتے ہیں اور اردو شاعری کو ایسا اوقات مختلف حیثیتوں سے نمایاں کیا جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ ملک کی قدیم ترین زبان بھاشا اور اس کے سخن گو حضرات کے تذکروں کی صدائیں اس فضا میں کبھی منّت کش گوش نہیں ہوتیں۔ درحقیقت یہ عام بد مذاقی اردو اہل قلم کے دامن معلومات و قدر دانی پر ایک بدنما داغ ہے اگر حضرت نیاز فتحپوری مدیر "نگار" لکھنؤ کی جذبات بھاشا عالم وجود میں نہ آئی ہوتی اور بعض اہل نظر سے ضمناً شعر و شعرائے بھاشا کا ذکر اپنی مؤقر تصانیف میں نہ کیا ہوتا تو اردو عالم تصنیف و تالیف ان جواہر پاروں سے مفلس محض اور اردو پبلک بھاشا کی ایک سرسری جھلک سے بھی قطعی محروم رہ جاتی۔

شاید۔ اسی عام عدم توجہی کا باعث ہے کہ ہماری شاعری یا تو عرب و فارس کی ملکی خصوصیات سے لبریز رہی یا یورپین چاشنی سے ہمکنار ہو کر اب ترقی یافتہ کہلانے لگی ہے حالانکہ اگر قدیم ملکی اجزا سے ٹٹولے جاتے تو طرز ادا تشبیہات۔ تلمیحات اور استعارات کا اسقدر زبردست دیسی سرمایہ ہاتھ آجاتا کہ کہیں بدیشی سازوسامان سے نگارِ اردو کی آرائش و زیبائش کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور غیر نامانوس و خلاف مذاق کیفیات کی پیروی کئے بغیر ہم اپنی شاعری کو اس پایہ پر پہونچا دیتے کہ جو آج شیکسپیر۔ ملٹن۔ ٹی مور۔ گوئٹے اور شیلے وغیرہ ہی کی خوشہ چینی کے بعد بھی میسر نہیں۔

میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اردو شاعری ملکی خصوصیات سے قطعی معرا اور ممالک خارجہ کی ادبی کیفیات کا ایک خوشگوار مرکب ہے۔ کیونکہ اس میں جابجا ملکی آثار و علامات پائے جاتے ہیں اور بیرونی خیالات دیسی سانچہ میں ڈھلکر مانوس ہوگئے ہیں۔ تاہم ملکی شاعری کی کیفیات کو اردو میں حل کرنے کے سلسلہ میں سوادِ اعظم اردو کو دخل نہیں بلکہ یہ چند اُن قدیم مسلم شعرا کی محنتوں کا طفیل ہے جنھوں نے بھاشا میں استادانہ شان پیدا کی۔ یا چند اُن قدیم ہند و شعرا، فارسی کی جگر کاویوں کا صدقہ جنھوں نے فارس کے درخت میں ہندی قلم لگائی تھی۔ عام طور پر کبھی اس طرف توجہ خاص سے کام نہیں لیا گیا۔

کاش اردو دنیا نے ملکی چند در چند پراکرتوں (مثلاً بنگالی مرہٹی۔ اوڑیا تامل۔ تلنگی اور مارواڑی وغیرہ) میں سے صرف قدیم ترقی یافتہ زبان برج بھاشا ہی کو بہ نگاہ غائر مطالعہ کیا ہوتا تو وہ فرسودہ خیالات اور پامال مضامین کے نئے نئے قالبوں میں ڈھالنے اور اسی قسم کی دوسری جدت طرازیوں کے بجائے بیشمار نئے خیالات انوکھے مضامین۔ نئے طرز ادا اچھوتی تشبیہوں۔ جدید استعاروں اور رنگا رنگ جدتوں سے اردو شاعری کو مالامال کرکے برادرانِ وطن کے لئے ایک ایسی وجہ مشترک پیدا کرچکی ہوتی جو اُن کی نظر میں اردو کو اس قدر نہ کھٹکنے دیتی۔

اس کمی اور کوتاہی پر جس قدر خامہ فرسائی کیجائے کم ہے ۔
اس لئے صرف اسی اشارہ پر اکتفا کرتے ہوئے میں اولاً بھاشا کی مختصر
خصوصیات شاعری نذر ناظرین کرتا ہوں اور اُس کے بعد صہبائے
بھاشا کے چند پرکیف جام ۔

خصوصیات بھاشا (۱) بھاشا میں ہر جگہ طور پر عورت مرد سے
اور مرد عورت سے اظہار عشق کرتا ہے اور عموماً عشق جائز یعنی میاں
بی بی سے اور بی بی میاں سے ۔ اس زبان میں اردو فارسی کیطرح
ضمائر کا مصلحتی استعمال اور طرز ادا سامعین کو امرد پرستی کے
مغالطہ میں نہیں ڈالتا ۔

(۲) تخاطب عورت کی جانب سے ہوتا ہے ۔

(۳) سلامت ۔ سادگی ۔ لوچ اور ترنم کی حیثیت سے یہ زبان
روح تغزل ہے ۔

(۴) اس زبان کی تشبیہات باوجود ندرت کے عام فہم ملکی
محسوسات کے مطابق اور ایسی ہوتی ہیں کہ سامع کا ذہن آسانی
کے ساتھ اُن کی طرف منتقل ہوجائے ۔ نہ بعض ہمارے شعراء
اور شعراء فارس کی طرح کہ اُن کی تشبیہیں اور استعارے اپنی
غرابت میں اس قدر بلند اور برتر ہوتے ہیں کہ سننے والا کرتے کرتے
اپنا پلیوں خون خشک کر دے اور نتیجہ میں کوہ کندن و کاہ برآوردن
کے سوا ہیچ ۔ بعض اوقات اتنی بھی لذت ہاتھ نہیں آتی جو
عالم فکر میں جلے ہوئے خون کی کمی کو اپنی دلخوشکن مسرتوں سے
پورا کر دے ۔

(۵) حسن انداز بیان کی بدولت یہ زبان دستاویز تاثیر
ہے ۔ اس کا ہر بات میں ایک بات پیدا کر دیتا ہے ۔ اگر وہ پھیکے کو
فی المثل پھیکا ہی کہے تب بھی اُس میں ایک ایسی ادا ضرور ہوگی کہ
دل لوٹ جائے گا ۔

(۶) اس کی شاعری دائرۂ فطرت سے بال برابر بھی متجاوز
نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ تیر تاثیر آئینہ تمدن اور جام جہاں نمائے ہند ہے

[نوٹ ۔ مجھے خصوصیات بھاشا قلمبند کرنے کے ذیل میں آنجہانی
آزاد اور جذبات بھاشا نیاز فتحپوری سے استفادہ کرنیکا اقرار ہے]

جام اول (جذبات قلب)

(دوہا)

پیا آیو نو بال تن ۔ بار ھیو ہرش بلاس تو پرتھم ۔ بار پیوندن اُٹھے جیوں بسوتی سہبا

ترجمہ ۔ شوہر کے آنے پر اُس عروس دوشیزہ کے جسم میں جذبۂ
وصل اس طرح جوش زن ہوا جیسے پہلی بارش کے قطروں سے تپتی ہوئی
زمین میں (ذات روح) خوشبو اُمنڈنا شروع ہوتی ہیں)
کتنا کیف آور خیال اور جذبات قلبی کی کتنی سچی تصویر ہے
جیوں بسوتی سوہاس کیسی فطری اور بے تکلف تشبیہ ہے ۔

جام دوم (فطری حسن بیخودی اور شباب کا عالم)

کبت

انجن دے نکسے نت ننین ، پہ منجن کے ات رنگ سنوارے
روپ گمان بھری مگ میں ، پگ ہی کے انگوٹھا اوپ سہارے
جوبن کے مد سے متی رام ، بھی متوارن لوگ نہارے
جات چلی یہ بہانت گلی ، بہتری الکن انچرا نہ سنوارے

ترجمہ ۔ سرگیں آنکھوں میں ہمیشہ سرمہ استعمال کرنے والی وہ عفو
بدن کو سادے ہوئے غسل کی غرض سے ۔ وہ مغرور حسن حسینہ راستہ میں
انگوٹھے کی انوٹوں کے سنوارنے کے بہانے سے جابجا جھکتی ہوئی
صہبائے شباب سے سرمست متوالوں کی طرح گلیوں میں ادھر اُدھر
جھومتی جھامتی چلی جا رہی ہے جس کے کھلے ہوئے بال اکندھوں پر پڑے
ہوئے ہیں ، اور سینہ سے آنچل سرکا ہوا ہے (اُسے اسکے سنبھالنے کا بھی خیال نہیں)

(بقیہ صفحہ ۸۰۷ پر دیکھئے)

معیار

شراب

[لسان القوم جناب مولانا سید علی نقی صاحب صفی، رکن ادارت "معیار" لکھنؤ]

محفل ہے گرم، وعظ ہے ترکِ شراب پر برسیگا آج ابرِ قلم آفتاب پر
رندانِ پاکباز کی محفل ہی اور ہے ساقی کا اُس میں دخل، نہ ساغر کا دور ہے
ہیں عقل کے مرید، عقیدت اسی کے ساتھ کھینچے ہوئے ہیں بیعتِ پیرِ مغاں سے ہاتھ
لگتی ہے آگ، بادۂ احمر کو دیکھکر آنکھوں میں خون اترتا ہے ساغر کو دیکھکر
انگور کے سڑے ہوئے شیرے کو یہ مزاج کھینچتا ہے اور، بڑھتے ہیں جب بست احتیاج
خود میگسار، اگر نہ کریں غمگساریاں رل جائیں خاک میں ابھی کُل آبکاریاں
یہ آبِ شر ہے جسکو سمجھتے ہو تم شراب بے شر ہے وہ بشر، جو کرے اس سے اجتناب
کیوں مُنہ لگاؤ عقل سے جو اس سے بیر ہے انسان اس کے شر سے بچے، یہ بخیر ہے
جو چیز آدمی کو بنا دی ہو جانور از روئے عقل ہے، وہ نہایت ہی پُرخطر
طاؤس کے بھی اس میں ہیں، بندر کے بھی خواص کچھ شیر، کچھ سُور کے، خصائل بہ اختصاص
پی کر شراب ہوتی ہے جب نشہ کی ترنگ طاؤس کی بہار، دکھاتا ہے رُخ کا رنگ
بڑھ جاتی ہیں جب اور زرا مے کی برکتیں انسان کرنے لگتا ہے بندر کی حرکتیں
بدمستیوں سے ہوتی ہے جسوقت عقل زیر جھنجھلا کے بادہ خوار جھپٹتا ہے مثلِ شیر
پھر سستیِ خمار کا ہوتا ہے خود شکار مانندِ خوک بدنفسی لب سے آشکار
مست و خراب ہو کے لگاتا ہے جب یہ لوٹ قے میں اتھڑ کے بنتا ہے ناپاکیوں کی پوٹ
رہتا نہیں غریب کو پھر تن بدن کا ہوش منہ کتے چاٹیں، صورتِ تصویر یہ خموش
اک نشۂ شراب میں گویا ہیں چار رنگ میکش بدلتا رہتا ہے بے اختیار رنگ
المختصر یہ ہیں برکاتِ خواصِ مے زر دے کے دردِ سر جو خریدے وہ کون ہے؟
دیسی شراب ہو کہ شراب ولایتی دونوں مضرِ صحت و اخلاق ہیں صفی

جس آبِ تلخ سے ہو عیاں زہر کا اثر کیونکر ہو وہ مفید دماغ و دل و جگر
خانہ خراب شے، کہ سمجھتے ہو جس کو مے سرچشمۂ بےحیائی و دیوانگی کا ہے
ہے بعض بعض عیش پسندوں کا یہ خیال نافع ہے مے، یہ پیئیں اگر اس کو باعتدال
لیکن یہ محض جوشِ خیالاتِ خام ہے پینے میں اعتدال! اسی میں کلام ہے
وہ بادۂ عنب ہو کہ ہو بادۂ مویز پی کر پھر اعتدال کی رہتی نہیں تمیز
پینا شراب کا کوئی فرزانگی نہیں کیا ہے زوالِ عقل جو دیوانگی نہیں
رُسوا ہر ایک مذہب و ملت میں ہے شراب عقلاً بھی یہ خراب ہے، نقلاً بھی یہ خراب
مشہور تھا کہ جنگ میں دیتی ہے یہ مدد یورپ کے واقعات نے اسکی بھی کر دی رد
انگور کیا بُرے ہیں، انھیں کیوں نہ کھائیے؟ پی لیجئے نچوڑ کے رس، کیوں سڑائیے
ہر چیز جب وہ ہو متعفن، خراب ہے سونگھو خمیرِ خمر، کہو کیا جواب ہے؟
ہے گندہ مادے سے مۓ ناب کی کشید اس کا عرق ہو پاک، یہ منطق بھی ہے جدید
جب اس کے مادے میں عفونت بھی بسی ہے خالی حرام ہی یہ نہیں ہے، نجس بھی ہے
اُمّ الخبائث، اس کا لقب ہے اسی لئے ناپاک ہے، مضر ہے، نہ کوئی اسے پیئے
مے کی مضرتوں سے بچیں تاکہ خاص و عام کر دی گئی شریعتِ اسلام میں حرام
ہیں جملہ مسکرات، کم و بیش اسی طرح جائز نہیں ہے ان کا تصرف کسی طرح
انسان کو اکل و شرب میں لازم ہے احتیاط دے رنج دائمی نہ کہیں عارضی نشاط
رکھے جو شغلِ ورزش و پرہیز آدمی ہرگز نہ ہوگی عمرِ طبیعی میں کچھ کمی
آب و غذائے سادہ پہ کرتے ہیں جو بسر آسودہ تندرست، وہ رہتے ہیں عمر بھر
لیکن اگر کسی کی چٹوری ہوئی زباں دولت کا بھی زیاں ہو، صحت کا بھی زیاں
پرہیزگار ایک ہو، اک رندِ بوالہوس وہ سو برس جئیگا، تو یہ ساٹھ ہی برس
دعوت کی میز، جس پہ غذائیں ہوں خشک و تر بیماریوں کا گھر ہے، نہ جاؤ کبھی اُدھر!
ہر جانور کی ایک غذا، اور اسی میں مست ذاتِ شریف حضرتِ انساں شکم پرست

ماہی و مرغ پر نہ بقولات پر یہ بیند کھا جائیں کل چرند اُڑا جائیں سب پرند

ہر چیز نوش جاں انھیں ہوتی ہیں کب یہ سیر حتی کہ تیتر چھوڑتے نہیں بھربیریوں کے بیر

یہ گوشت خوار بھی ہیں نباتات خوار بھی کھیتی کا بھی مزہ انھیں ذوقِ شکار بھی

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی انگور تن کے کھائے تو سوجھی شراب کی

توبہ شکن تھی آتشِ محلول کا مزہ کانٹا لگا تو بھول گئے پھول کا مزہ

ذوقِ سرور ہے تو پھر ایسی پئیں شراب ذرے کو جس کا نشہ بناتا ہے آفتاب

وہ مے کہ جس کے نشہ سے مخمور شاہ تیں وہ مے کہ جس کا نور دو عالم کی زیب و زیں

وہ مے کہ جس کی مد و زمیں کف ہے آسماں سب اس کے جرعہ خوار سبک پا و سر گراں

باندھا جب اس نے ندر گرے گھومنے لگے دریا سے اٹھ کے ابر سیہ جھومنے لگے

ہر موج اسکی مشرب مخصوص بنگئی ہر قوم کو دکھائی اسی نے روش نئی

رضواں کا باغ اسی کا جلوخانہ ایک ہے کوثر اسی شراب کا پیمانہ ایک ہے

وہ مے کہ جسکی اہل طریقت کو جستجو جس کا سبو ہے مجاز و حقیقت سے رنگ و بو

وہ مے جو موجزن ہے فضائے محیط میں طوفاں خروش ظرفِ عمیق و بسیط میں

وہ مے جو آخری ہے ذریعہ نجات کا
لب لباب، خلاصۂ کائنات کا (خاص)

انتظارِ یار

(جناب سید محمد جعفر حسین عرف محمد صاحب بہار مدیر رسالہ "معیار" لکھنؤ)

زیست بھی مشکل ہے میری موت بھی دشوار ہے کشمکش ارماں کی ہے اور انتظارِ یار ہے

درد کیا ہے روح ہے غم کیا ہے نامِ زندگی دل ازل ہی سے حریصِ لذتِ آزار ہے

کیا دھرا ہے طور پر موسیٰ سے کہدو برقِ طور میرے ساتھ آئیں جو دل میں حسرتِ دیدار ہے

وادیٔ ایمن میں جانے کی ضرورت ہی نہیں ذرہ ذرہ کوئے جاناں کا تجلی زار ہے

ہے رہینِ عشق ازل سے میرا قلبِ داغدار خاک ہو جائے مگر پھر مطلعِ انوار ہے

چارہ گر ہے بیخبر میں درد سے بیچین ہوں پردہ پوشِ حالتِ دل زخمِ دامندار ہے

اک زباں کی تیزیوں نے قطع کر دی ہر امید دیکھتا ہوں جس طرف تلوار ہی تلوار ہے

مرنیوالوں پر ابھی سے ہو گیا اپنا شمار زندگی کا لطف جس سے تھا وہ دل بیمار ہے

نارسا ہونے کا صدمہ کیوں نہ ہو سوہانِ روح دل حریصِ شکوہ ہے شکوہ سے وہ بیزار ہے

اے مرے مالو قیامت کا تمھیں کیا انتظار دیکھنا یہ ہے کہ کتنی حسرتِ دیدار ہے

سامنے آ و بھی اب آخر کہاں تک یہ حجاب ہم ادھر ہیں تم ادھر ہو بیچ میں دیوار ہے

نارسا ناموں نے ہم کو پست ہمت کر دیا تم جہاں ہو اس جگہ اپنی پہنچ دشوار ہے

موت کا ہر وقت کھٹکا درد کا ہر وقت ساتھ زندگی اپنی بجائے خود بھی ایک آزار ہے

کوئی دیتا ہے تسلی کوئی دیتا ہے دعا ایک ہنگامہ قریبِ بسترِ بیمار ہے

ہنس دیا کوئی تو کیا رونے لگا کوئی تو کیا ہر طرح سے حالِ دل ناقابلِ اظہار ہے

ناقبولِ خلق تجھ سا کوئی عالم میں نہیں موت کو بھی میرے پاس آنے سے اب انکار ہے

لازمی یہ ہے کہ دنیائے محبت ہو تباہ تیرا ہر تیرِ نگاہِ ناز دل کے پار ہے

دل پریشاں جان مضطر چشم گریاں نیم بسمل الغرض جو کچھ بھی ہے اپنی جگہ پر بار ہے

صورتِ امید آتی ہے نظر رونے کے بعد چارہ سازِ چشمِ گریاں آنسوؤں کا تار ہے

مصلحت سمجھائیں تیری اے مرے غفلت شعار بیخودی میری بتاتی ہے کہ تو ہشیار ہے

انتظارِ یار کا غم ہے بہار اب دم کے ساتھ
ہر نفس اک روگ ہے ہر نالہ اک آزار ہے (خاص)

الکشن

(جناب سید مقبول حسین صاحب ظریف رکن ادارت "معیار" لکھنؤ)

ہوائے مغربی ہے تجھ میں کتنا جذبِ پنہانی دھرم ہندو کا غائب اور مسلماں کی مسلمانی

سمندر پھاند کر اک لہر ایسی ہند میں آئی پہونچکر جس نے ٹھنڈا کر دیا سب جوشِ ایمانی

حیا جامے سے باہر ہو گئی اللہ ری آزادی ابھی تھوڑی سی کچھ شہ پائی تھی تعلیمِ نسوانی

بڑھیگی روشنی جتنی خود اٹھتا جائیگا سایہ نظر آئیگی ہر شے اف ری جلوؤں کی فراوانی

نظر بازو جوانی ہو گی اس کی دید کے قابل ابھی تو گھٹنیوں چلنے لگا ہے شوقِ عریانی

مساوات اس کو کہتے ہیں نئی تعلیم کا کیا کہنا کہ یکساں ہو گئی صورت زنانی اور مردانی

معیار الانشاد

غزل

[جناب ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خانصاحب سائل دہلوی سابق ایڈیٹر معیار الانشاد حیدرآباد]

خوب وہ تعبیر خواب دے بیٹھے کو سنے بے حساب دے بیٹھے
بحر الفت میں ہمکو درس فنا تھا جو دینا حساب دے بیٹھے
لے او ٹھے شیخ داغ سجدہ پہ نقد ایماں جناب دے بیٹھے
ڈالدی ہم نے میکدے کی بنا محتسب کو شراب دے بیٹھے
بے تمنا کیا عدو کو شہید مفت کا تم ثواب دے بیٹھے
غایت لطف سے وہ آج خطاب مجھکو خانہ خراب دے بیٹھے
کس توقع پہ اون سے ہوا سوال جب وہ کورا جواب دے بیٹھے
بزم میں خبر نہیں ساقی کسکو جام شراب دے بیٹھے
تیرے در تک سوا مرے وہاں کہاں موت جسکو جواب دے بیٹھے
وا اگر چشم و دل سے سوز و گداز اک شراب اک کباب دے بیٹھے
لے دہان کا حلہ ہی دیکھ لیا ایک کے سو جواب دے بیٹھے
ہے یہ اندھیر کنند تو یہ نے ہم شب ماہتاب دے بیٹھے
نیستی کی ہوس نہ ہو اتنی جس سے ہستی جواب دے بیٹھے
چشم و دل وہ جو منتظر رہ کر نذر آرام و خواب دے بیٹھے
حکم نشو و نمائے سبزہ و گل قطرہ افشاں سحاب دے بیٹھے
جب کہا کچھ سوال سائل نے آڑا ٹیڑھا جواب دے بیٹھے (سائل)

[صفحہ ۷۵۸ کا بقیہ]

کے مالکان مشترکہ سرمایہ کی کمپنی بنا کر کام چلائیں ۔ تو اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ کا مقولہ ان کے حسب حال صحیح ثابت نہ ہوگا ۔

اگر پانچ آدمی مل کر ایک کارخانہ نہیں چلا سکتے تو دوسو آدمی صوبہ کی حکومت کیسے چلا سکیں گے ۔ قومی اور ملکی معاملات کے اہتمام میں اعتبار باہم اگر امر لابدی ہے ۔ اور وہ آپس میں مل جل کر کام کرنے ہی سے پیدا ہو سکتا ہے !

ہفتہ وار اخبارات بھی جو خاص خاص مقاصد سے جاری ہیں ۔ مشترکہ سرمایہ کی چھوٹی چھوٹی کمپنیاں بنا کر بہت عمدگی سے اخبار چلا سکتے ہیں ۔ اس وقت بہت اخبارات مالی مشکلات کے شکار ہیں ۔ یہ اس آفت سے بآسانی رستگاری حاصل کر سکتے ہیں ۔ اگر سب اخبار والے باہم ملکر اتحاد سے کام کریں ۔ اخبار بجائے خویش ایک مختصر سی ریاست ہے جس کے کئی شعبے ہیں ۔ ایک آدمی پوری توجہ کے ساتھ سارے کام کی نگرانی نہیں کر سکتا ۔ مضامین نگاری کرے ۔ یا کارخانوں اور سوداگروں سے خط و کتابت کر کے اشتہارات حاصل کرے یا شکایتی خطوط کی طرف دھیان دے ۔ مشترکہ کمپنی قائم ہونے کی صورت میں سارا کام منقسم ہو سکتا ہے ۔ حصہ دار بڑے بڑے کام آپس میں بانٹ کر بخوبی چلا سکتے ہیں جس سے نفع کثیر حاصل ہوگا ۔ اور کامیابی یقینی ہے ۔
(خاص)

مکتبہ

شرر اور اردو ناول

(جناب عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ال ال بی ایڈیٹر مکتبہ حیدرآباد)

نقاد کی دوررس نگاہیں ممکن ہے کہ کسی مصنف کو سمجھنے میں غلطی کرجائیں۔ لیکن عوام کی رائے اپنے محبوب اور مقبول مصنف کو ڈھونڈھنے میں بہت کم غلطی کرتی ہے۔ نقاد اپنے ساختہ اصولوں کی الجھن میں پڑکر حقیقت کے راستہ سے بھٹک سکتا ہے۔ میرامن، نذیر احمد، سرشار، شرر وغیرہ کو افسانہ نگاروں کے ایک کثیر گروہ سے سب سے پہلے عوام نے ڈھونڈ نکالا۔ جو تصفیہ یہ پہلے کرچکے ہیں، اب نقاد اس کی توثیق کررہے ہیں۔ شرر اردو کے ان چند غیر فانی ناول نگاروں میں سے ہیں۔ جن کی عظمت پر عوام اور نقاد دونوں متفق ہیں

موجودہ اردو ناول کے پیش رو حافظ نذیر احمد ہیں۔ لیکن سرشار اور شرر نے بھی اس کی بنیادی خدمت انجام دی۔ یہ تینوں اردو کے جدید ناول نگار ہیں لیکن ان کے کارناموں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں ہر لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ حافظ نذیر احمد حقیقت کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ اور سرشار حقیقت کے ساتھ رومانیت کو بھی ہر جگہ برقرار رکھتے ہیں۔ شرر کا میدان عمل ان دونوں سے بالکل مختلف ہے۔

شرر نے اردو ناول کے لئے وہی کام کیا۔ جو سر والٹر اسکاٹ نے انگریزی ناول کے لئے کیا تھا۔ سر والٹر اسکاٹ سے پہلے انگریزی ناول ادبیات کا اہم جزو سمجھا جاتا تھا ادیبوں، نقادوں اور عام قارئین کے دل میں ناول کی ایسی وقعت جاگزیں نہیں تھی جیسی کہ آجکل ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں پہلے تو یہ کہ انگریزی ناول کی ابتدا سے لیکر اسکاٹ کے زمانے تک کوئی ایسا پرجوش، دلچسپی لینے والا اور خصوصی ناول نگار نہیں پیدا ہوا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسکاٹ نے اپنے متقدمین کے مقابلہ میں ناول کے لئے زیادہ اہم اور بے حد مقبول موضوع انتخاب کیا۔ اس کے تقریباً تمام ناول اسکاچستان کی تاریخ پر ہیں یہ چیزیں خود اسکاٹ کے مخصوص اسلوب اور ذاتی خصوصیات کے ساتھ ملکر انگریزی ناول کے لئے عہد آفرین ثابت ہوئیں۔ انگریزی ناول کا رتبہ اس قدر بلند ہوگیا جس قدر ادبیات کی دیگر اصناف جیسے ڈراما یا نظم کا تھا۔ اسکاٹ کی وجہ سے خود ناول نگاروں کے مرتبہ میں بھی زیادتی ہوئی۔

ان امور کو نظر میں رکھ کر شرر اور ان کے کارناموں کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ متذکرہ بالا امور یہاں بھی اتفاق سے تمام و کمال جمع ہوگئے ہیں۔ شرر سے پہلے اردو ناول نے خواہ کتنے ہی مدارج کیوں نہ طے کرلئے ہوں، لیکن اس کی وقعت اور بلند آہنگی کی ابتدا شرر کے عہد سے ہوتی ہے چنانچہ وہ لوگ جو سرشار کو شرر پر ترجیح دینے کی کوشش کرتے ہیں اس کا تصفیہ کرتے وقت ان کے ذہن میں سرشار رمانوس موضوع اور ان کی دلچسپی زیادہ وزنی ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی خیالات کی الجھن اس امر کا تصفیہ کرنے نہیں دیتی کہ خصوصیات میں سرشار۔ شرر پر تفوق رکھتے ہیں اور کونسی خوبیاں ایسی ہیں جو شرر کے کارناموں میں سرشار سے زیادہ موجود ہیں۔ مجموعی حیثیت سے شرر اور سرشار کا مقابلہ بے معنے ہے۔ کیونکہ دونوں

کا میدان عمل اس قدر مختلف ہے جس قدر میر تقی میر اور میر انیس کا۔ حافظ نذیر احمد اور پنڈت رتن ناتھ سرشار اردو ناول کے اولین اور عیسوی دور کی پیداوار ہیں۔ اس لئے ان میں ایسے دور کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ شرر کے کارناموں میں موجودہ ناول زیادہ پختہ صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔

یہاں ایک بات خاص طور پر توجہ طلب یہ ہے کہ تقابلی کارناموں کی اہمیت کو بڑھانے اور گھٹانے میں بڑا اثر رکھتا ہے۔ سرشار کے ناول اپنے تمام خوبیوں کے باوجود اپنے زمانہ میں اہمیت کے اس احساس کو پیدا نہیں کر سکتے تھے، جو شرر کی ناولوں کے شایع ہونے کے بعد پیدا ہوا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مغربی ناول کی تقلید میں لکھنے کی سب سے پہلے کوشش نذیر احمد نے اور اس کے بعد سرشار نے کی۔ اور یہ کہ سرشار کے کارنامے مغربی ناول سے زیادہ مشابہ ہے۔ لیکن ان دونوں میں موجودہ ناول کی پختگی کا فقدان ہے۔ نذیر احمد کی تصانیف سے موجودہ مغربی ناول کا پورا خاکہ کبھی ذہن نشین نہیں ہوسکتا۔ گو وہ فی الجملہ انگریزی سے آگاہی رکھتے تھے۔ اور غالب قیاس یہ ہے کہ وہ انگریزی ناول سے متاثر بھی ہوئے اسی اثر کے تحت انہوں نے حقیقی اور اخلاقی قصوں کی طرف توجہ کی۔ لیکن ناول کے تمام اجزا سے وہ پوری طرح ناآشنا تھے۔ کردار نگاری میں انہیں بہت بڑی مہارت حاصل تھی لیکن کرداروں کی فطری اُٹھان۔ پلاٹ کی ترتیب۔ اور ناول کی مجموعی فضا کا پتہ ان کے قصوں میں نہیں ملتا۔ یہی امور موجودہ ناول کے بڑے اجزا ہیں۔ حافظ صاحب کے قصے قدیم داستان اور موجودہ ناول کی درمیانی کڑی ہیں۔ گو یہ دونوں کا بہترین ماحصل ہی سہی۔ قریب قریب یہی حال سرشار کا بھی ہے۔ موجودہ ناول کی جو کمی ان کے پاس ہے وہ اس فن کے نقاد کی نظر میں آسانی سے نمایاں ہوجاتی ہے۔ کرداروں میں استقلال، ان کا فطری اٹھان، بیانات میں یکسانیت اور تسلسل سرشار کے پاس بھی ایک حد تک مفقود ہے۔ سرشار اپنے زمانہ کی پیداوار تھے اس لئے اس دور کی تمام خصوصیات ان کی ناولوں میں موجود رہیں گی۔ لیکن اس کے باوجود تاریخی حیثیت سے نذیر احمد اور سرشار کے ناول اردو میں اسی قدر اہم جس قدر اسکاٹ اور فیلڈنگ کے انگریزی میں۔ اسکاٹ اور فیلڈنگ کی طرح نذیر احمد اور سرشار کی ناولوں میں بھی موجودہ مکمل ناول کی وہ مجموعی فضا مفقود ہے جو اس کے کافی ارتقا کا لازمی نتیجہ ہے۔ ممکن ہے کہ ناول کے سخت نقاد ان کے کارناموں کو موجودہ ناول کے زمرہ میں شریک کرنے سے بھی پس وپیش کریں۔ قدیم داستانوں کی کافی جھلک ان کے قصوں میں موجود ہے گو یہ قصے عموماً حقیقت اور فطرت پر مبنی کئے گئے ہیں۔ اور فوق فطری عناصر سے بھی ان میں بہت کم کام لیا گیا ہے تاہم یہ پورے مماثل حیات بھی نہیں۔ ان کے پاس اکثر ہیرو ایسے ہیں جن کی زندگی غیر متوقع، غیر معمولی، و غیر عادی واقعات کا ایک سلسلہ معلوم ہوتی ہے اس امر میں سرشار کے ناول خاص طور پر توجہ کے محتاج ہیں "سیر کہسار" ان کی اچھی ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ بھی اس قسم کے بعض اسقام سے بالکل خالی نہیں ہے۔ "سیر کہسار" کے ہیرو نواب عسکری نے پہاڑ جانے میں جس قدر کروٹیں بدلی ہیں وہ بلحاظ فطرت ممکن سہی لیکن عادتاً کبھی ایسا نہیں ہوسکتا۔ پہاڑ کی حالت دریافت کرنے کا جب انہیں

خیال پیدا ہوتا ہے تو پھر مصنف الگا تار ایسے لوگوں کو یکے بعد دیگرے پیش کرتا جاتا ہے جو پہاڑ ہی کی گفتگو چھیڑ دیتے ہیں یہ بہترین ممکن ہے کہ داستان کا حسن ہو۔ لیکن موجودہ ناول ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

شرر، نذیر احمد اور سرشار کے عہد سے قریب ترین ناول نگار ہیں۔ گو منشی سجاد حسین اڈیٹر "اودھ پنچ" ان سے کچھ پہلے صحافت کے میدان میں آچکے تھے۔ لیکن ان کے ناول بعد کی پیداوار ہیں۔ خود ان کا اخبار ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا تھا۔ ان کا پہلا ناول اس کے کچھ عرصے بعد پیش ہوا اس لئے ان کے ناول جدید دور کا پتہ دیتے ہیں۔

انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے زیادہ واقف ہونے کے سبب شرر اپنے ناول کو زیادہ مکمل صورت میں پیش کر سکے ممکن ہے کہ اس وقت زمانہ بھی شرر کے ناولوں کا سرگرم استقبال کرنے کے لئے زیادہ تیار ہو گیا ہو لیکن ہم کسی حال میں بھی شرر کی ذاتی کوششوں کو نہیں بھول سکتے۔ شرر کا اہم تاریخی موضوع، ان کے مخصوص اسلوب کے ساتھ شامل ہو کر ناول کو عوام میں مقبول اور ذی وقعت صنف ادب بنانے میں بے حد کامیاب ہوا۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ متقدمین کے کارناموں کی وقعت بھی شرر اور ان کے معاصر ناول نگاروں کے قصوں کے اضافی اور تقابلی تعلق کی بدولت ہے۔ یہ چیز شاید اس طرح زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آسکے گی۔ نذیر احمد اور سرشار کے بعد ایک شرر کے بجائے انہیں کے جیسے یا انہیں کے مقلد افسانہ نگار پیدا ہوتے تو تکرار اور یکسانیت کی وجہ سے کوئی کسی سے تمیز نہ ہو سکتا۔ نذیر احمد اور سرشار کے قصے بھی ایک انبوہ کثیر کے اجزا بن کر رہ جاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ شرر کی ادبی کوششوں میں سب سے بہتر چیز ان کے تاریخی ناول ہیں۔ ان میں شرر نے اپنا پورا کمال دکھایا ہے۔ اور انہیں کی بدولت شرر کو تحقیقی ناول نگار کا رتبہ ملتا ہے۔ اگر اس قسم کے کارنامے نہ چھوڑتے تو شرر باوجود اپنی مختلف الموضوع تصنیفات کے اردو ادبیات میں عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

شرر کی توجہ تاریخی ناول کی طرف منعطف ہونے کا ایک دلچسپ واقعہ مسٹر سکسینہ نے اپنی قابل قدر تصنیف "تاریخ ادبیات اردو" میں بیان کیا ہے۔ ایک دفعہ شرر ریل میں سفر کر رہے تھے حسن اتفاق سے سر والٹر اسکاٹ کا ناول "طلسمن" ان کے پاس تھا اس میں صلیبی جنگوں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں لیکن اسکاٹ نے انہیں جس طرح موڑ توڑ کر پیش کیا ہے وہ تاریخ اسلام کے متعلم سے مخفی نہیں ہے۔ شرر کو یہ طریقہ نہایت جارحانہ معلوم ہوا اس لئے اولین فرصت میں غلط فہمیوں کو دور کرنے کی غرض سے ناول "ملک العزیز ورجنا" لکھا گیا۔ ممکن ہے کہ وجہ تحریک انتقامی ہو لیکن ناول سے اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ بہر حال اس ناول کی کامیابی نے شرر کے حوصلے بلند کر دئے اور ان کی ادبی مساعی کے لئے ایک بہتر میدان ہاتھ آگیا۔

مسٹر سکسینہ کے قول کے مطابق اردو میں مغربی طرز کا یہ پہلا تاریخی ناول تھا۔ جس میں مغربی ناول کی اکثر و بیشتر مخصوصیات موجود تھیں۔ مسٹر سکسینہ نے بڑی کاوش سے شرر کے کارناموں کو زمانی ترتیب میں بھی پیش کیا ہے۔ موجودہ نقاد کو اس کی سخت ضرورت تھی کہ وہ مصنف کے ذہنی ارتقا کا پتہ چلا سکے

شرر کا پہلا تاریخی ناول ۱۸۸۷ء میں لکھا گیا اور آخری ناول ۱۹۲۶ء میں۔ اس طرح ان کی ادبی مساعی تقریباً تیس سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہم یہاں صرف تاریخی ناولوں کو انکی

زمانی ترتیب میں پیش کرتے ہیں۔
ملک العزیز ورجینا (۱۸۹۲ء) حسن انجلینا (۱۸۹۹ء) منصور موہنا (۱۸۹۰ء) فلورا فلورنڈا (۱۸۹۴ء) فردوس بریں (۱۹۰۰ء) ایام عرب (۱۹۰۱ء) مقدس نازنین (۱۹۰۰ء) شوقین ملکہ (۱۹۰۵ء) قیس و لبنیٰ (۱۹۰۸ء) ماہ ملک (۱۹۰۹ء) فلپانا (۱۹۱۰ء) زوال بغداد (۱۹۱۲ء) رومتہ الکبریٰ (۱۹۱۴ء) الفانسو (۱۹۱۵ء) مفتوح فاتح (۱۹۱۶ء) بابک خرمی (۱۹۱۸ء) جویائے حق (۱۹۱۷-۱۹۱۸ء) لعبت چین (۱۹۱۹ء) عزیزہ مصر (۱۹۲۰ء) طاہرہ (۱۹۲۳ء) مینا بازار (۱۹۲۵ء) نیکی کا پھل (۱۹۲۶ء)

یہ ناولیں سب کی سب تاریخ اسلام پر ہیں۔ ان میں بڑی خوبی یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے کسی نہ کسی عہد آفرین دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ تاریخی واقعات کے لحاظ سے ان کی ترتیب یہ ذیل ہوگی۔

رومتہ الکبریٰ (روم پر مسلمانوں کا حملہ ...) ایام عرب (عرب جاہلیت کی قبل اسلام کی تاریخ) جویائے حق (آنحضرت کی پیدائش سنہ ...) فلپانا (خلافت عثمان سنہ ...) لعبت چین (خلافت راشدہ کے ایک نوجوان عرب کا واقعہ) قیس و لبنیٰ۔ (معاویہ کے زمانہ کا عرفی قصہ) فتح اندلس (اسپین میں اسلامی سلطنت کا آغاز) منصور موہنا (سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر حملے) نیکی کا پھل (خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے عہد کا واقعہ) مفتوح فاتح (سنہ ... میں اسپین کے حالات) بابک خرمی (معتصم باللہ عباسی کی خلافت کا زمانہ) مقدس نازنین (اسلامی اسپین کا زمانہ) عزیزہ مصر (بنی طولون مصر کا زمانہ) ماہ ملک (سلطان غیاث الدین غوری کی دختر کا عشق سعد الملک کے ساتھ سنہ ...) زوال بغداد (بنی عباس کی تباہی کی روداد) فلورا فلورنڈا (زوال اسپین)

حسن انجلینا (روس کی طرف مسلمانوں کی پیش قدمی) ملک العزیز ورجینا (سلطان صلاح الدین کے فرزند کے حالات پہلی صلیبی لڑائی) شوقین ملکہ (دوسری صلیبی جنگ کا ایک عشقیہ قصہ)

اب ہم شرر کی ناولوں کی جانچ اور ان کے فن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ شرر کی عظمت تک پہونچنے کا سب سے سہل طریقہ ہوسکتا ہے کہ ہم ناول کے تمام اجزا اور ان کی خوبی کے معیاروں کو نظر میں رکھ کر شرر کی ناولوں کو ان پر جانچنے کی کوشش کریں۔ اس طرح مجموعی حیثیت سے جو کام مشکل اور پیچیدہ نظر آتا ہے، اس ترکیب سے آسان اور ہلکا ہوجائے گا۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ناول کی تمام معیاری خوبیاں شرر کے پاس مجموعی طور پر موجود ہوں۔ بعض خصوصیات ایسی ہیں جن میں ان کو تخصیصی امتیاز حاصل ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض سقام بھی ان کی ناولوں میں موجود ہیں۔ ہم ان دو پہلوؤں کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش کریں گے کہ ان کا موازنہ بھی ہوجائے۔

موضوع شرر کے اکثر ناولوں کا موضوع تاریخ اسلام ہے۔ اسلامی تاریخ سے انہیں زیادہ دلچسپی تھی لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ جس نقطہ نظر سے ایک تاریخی ناول نگار تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، وہ بالکل مختلف ہے عام مورخین کے نقطہ نظر سے۔ ناول نگار کو سنین، حکمرانوں کے مختلف سلسلوں۔ سلطنت کے عروج و زوال اور حکومت کے سیاسی نظامات سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ وہ ان امور کو اپنے قصے کی صرف عقبی زمین بناتا ہے۔ تاکہ کرداروں کی چلت پھرت کے لئے ایک فضا پیدا ہوجائے۔ وہ اپنے ہیرو اور ہیروئن کی خانگی زندگی پر زیادہ وقت صرف کرتا ہے۔ اس کی مورخ کو قطعاً ضرورت نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ناول نگار کی نظر تمام تر تاریخ کے ایسے گوشوں کی تلاش میں

رہتی ہے، جن سے وہ زیادہ سے زیادہ رومانیت پیدا کر سکے۔ شرر نے جس ہوشیاری سے اپنے موقعوں کا انتخاب کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا خاص لحاظ رکھتے تھے کہ ہر واقعہ ایسا ایسا ہو جس سے کوئی قومی عہد شروع ہوتا ہو مثلاً فتح اندلس، فتح صقلیہ (الفانسو)، زوال بغداد، جویائے حق (آغاز اسلام) فتح سندھ (منصور موہنا) صلیبی جنگوں کے معرکے (ملک العزیز ورجنا، شوقین ملکہ) وغیرہ۔ تاریخ اسلام کی وسیع تحریکات اور قومی عہود سے واقف ہونے کا اگر ایک شخص آسان طریقہ ڈھونڈھنا چاہے تو ہمارے خیال میں وہ شرر کی ناولوں کو اسی ترتیب کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ جس ترتیب میں ہم نے ان کو اوپر جوڑا ہے۔

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ شرر نے تاریخ اسلام کو اپنی ناولوں کا موضوع تو بنایا لیکن انہوں نے تاریخی متابعت کے ساتھ کہاں تک صداقت کو ملحوظ رکھا ہے؟ تاریخی ناول کے متعلق یہ سوال ہمیشہ ضروری ہے اور ناول نگار کی حقیقی عظمت تک پہنچنے کے لئے اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ شرر کی نظر تاریخ اسلام پر بے حد حاوی تھی گو تنقیدی نہ ہو۔ سوائے چند علما کے جن کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ہندوستان میں کوئی قدیم یا جدید عالم تاریخ اسلام کی معلومات میں شرر کا مقابل نہیں تھا۔ پھر شرر کے مذاق ناول نگاری نے انہیں بعض ایسے تاریک گوشوں میں بھی گھسا دیا جہاں سے انہیں کسی رومان خیز واقعہ کے دستیاب ہو جانے کی توقع تھی۔ ممکن ہے کہ ان گوشوں اور زاویوں میں ایک عام مورخ اپنا وقت ضایع کرنا فضول سمجھے لیکن شرر کی حد تک یہ تلاش ان کے لئے مفید اور ضروری تھی۔ اور حق یہ ہے کہ ان کی جستجو اکثر مشاغل میں کامیاب رہی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی معلومات کے لئے شرر عموماً عربی مورخین کے حادی کارناموں کے ممنون منت ہیں۔ عربوں نے جو تاریخ نگاری میں ضرب المثل ہیں، اپنی تاریخوں میں کسی افسانوی ادارے کو نہیں چھوڑا۔ لیکن اس کے باوجود شرر کی تلاش کی اہمیت گھٹ نہیں سکتی۔ خصوصاً جب ہم خیال کرتے ہیں کہ بعض ضمنی مگر مفید مطلب واقعات کے لئے انہیں بیسوں تاریخیں ٹٹولنی پڑی ہونگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شرر نے بہت سے کھانچے اپنی تخیل کی مدد سے پر کئے ہوں لیکن اس سے ان کی ناول نگاری پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ مورخ کو اشخاص کی خانگی زندگیوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اور اسی کی ناول نگار کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس خلیج کو پاٹنے کے لئے نقادان فن نے تاریخی ناول نگار کو اس کی اجازت دے رکھی ہے کہ وہ تاریخی اشخاص قصہ کی خانگی زندگیوں میں حسب ضرورت تبدیلی کر سکتا ہے۔ صرف مخصوص عہد کی اسپرٹ، وسیع تحریکات اور مسلمہ تاریخی حقایق سے تعرض کرنے کی ممانعت ہے۔ اگر کسی مصنف کے ناول میں ان امور کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہو تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اس اعتبار سے شرر خاص عظمت کے مالک ہیں۔ پہلے تو انہوں نے انتخاب ہی ایسے واقعات کا کیا ہے جہاں تاریخ اور رومان دونوں گتھے ہوئے ملتے ہیں۔ تاریخ سے وسیع اور جزئی واقفیت ہونے سے ان کے ناول اختلافات اور تاریخی اغلاط سے قطعاً بری ہیں۔ تاریخی اسپرٹ، تمدن اور معاشرتی حالات کے ساتھ وسیع تطابق کا جو ثبوت یہاں ملتا ہے وہ بہترین مغربی تاریخی ناولوں ہی میں پایا جاتا ہے۔ "ایام عرب" میں جاہلیت کی حقیقی فضا کے جو نقشے یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے پیش ہوتے ہیں وہ حیرت افزا ہیں۔

غرض موضوع کے اعتبار سے تاریخی ناول دوسری ناولوں پر ہمیشہ فوقیت رکھتا ہے۔ اسی لئے اردو ناول نگاروں سے شرر کا مقابلہ کرتے وقت ہم اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

پلاٹ موضوع ناول کے لئے ایک خارجی چیز ہے. لیکن پلاٹ کا تعلق ناول سے ویسا ہی ہے جیسا جسم کا نمو سے۔ شرر پہلے اردو ناول نگار ہیں جو مغربی پلاٹ کی ترتیب کے گر سے فی الجملہ آگاہ تھے۔ شرر کے چند پلاٹ کے سوا جو سادہ ہیں باقی تمام پلاٹ مخلوط ہیں۔ پلاٹ کے لحاظ سے شرر کے جو ناول بہترین سمجھے جا سکتے ہیں وہ مغربی ناولوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں. ان میں وہ تمام خوبیاں، الجھاؤ اور سلجھاؤ اور چالاکی موجود ہے جو مغربی پلاٹوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ شرر مغربی ناولوں کے فن کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔

ماہرین فن افسانہ نے پلاٹوں کو دو طرح پر تقسیم کیا ہے ایک پلاٹ وہ ہے جن میں صرف ایک ہی حیات کے واقعات مسلسل اور بغیر دوسروں کے حالات کی مداخلت کے بیان کئے جائیں ایسے پلاٹ کو سمپل یا سادہ پلاٹ کہتے ہیں۔ لیکن وہ پلاٹ جنہیں کئی اشخاص کے حالات یا کئی زندگیوں کے خاکے ایک دوسرے کے اندر یا باہر بیان کئے جائیں، مخلوط یا "کمپلکس" پلاٹ کہلاتے ہیں قصہ در قصہ بیان کرنا اس میں داخل نہیں ہے۔ یہ قدیم داستانوں کا اصول تھا۔ موجودہ مخلوط پلاٹ ایسے ہو جن میں ایک سلسلۂ واقعات دوسرے کے ساتھ الجھا اور گتھا ہوا ہوتا ہے۔ سادہ پلاٹ کی مثال شرر کا ناول " ایام عرب" ہے۔ مخلوط پلاٹ کئی ناولوں کے ہیں جن میں "فردوس بریں" خاص طور پر قابل ذکر ہے نقادان فن نے مخلوط پلاٹ کو سادہ پلاٹ پر ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس میں مصنف کی چالاکی کا زیادہ کڑا امتحان ہوتا ہے اور پڑھنے والے بھی اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مخلوط پلاٹ کی ترتیب میں ناول نگار کو کئی امور کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے پہلے تو یہ کہ تخلیط ایسی نہ ہو جو بے معنی معمہ ہو جائے یا صبر آزما پیچیدگی معلوم ہونے لگے. اور واقعات کے سلسلے اتنے زیادہ بھی نہ ہوں کہ ذہن وقت واحد میں انہیں محفوظ رکھنے کا بار نہ اٹھا سکے۔ بعض وقت تھوڑی سی بے احتیاطی بھی ایک اچھے پلاٹ کو ضایع کر دیتی ہے. پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول "پی کہاں" کا پلاٹ تو بظاہر مختصر ہے۔ لیکن راز کو آخر تک قائم رکھنے کی مصنف نے جو کوشش کی ہے اس کی وجہ سے ناول ایک معمولی قابلیت والے کو معمہ معلوم ہونے لگتا ہے. بعض امور تو آخر تک صاف ہی نہیں ہوتے تھما (climax) تک اتنے راز جمع ہو گئے ہیں کہ وقت واحد میں سب کو کھول دینے کے لئے بعض میں تکلفات سے کام لینا پڑا ہے

سادہ پلاٹ بعض مرتبہ بے مزہ ہو جاتے ہیں۔ "ایام عرب" کے مناظر میں تنوع رومان اور دلبستگی نہوتی تو اس میں ناول پن بہت کم باقی رہتی۔ اور لحاظ سے یہ ناول کتنا ہی قابل قدر سہی لیکن بہت ادنیٰ ہے۔

شرر کے بہت کم پلاٹ سادہ ہیں۔ "دلکش" "دلچسپ" "جویائے حق" "آغا صادق کی شادی" "بدر النسا کی مصیبت" کے پلاٹ کہلا سکتے ہیں۔ یہ کچھ دلچسپ بھی نہیں ہیں۔ چند ناول ایسے ہیں جن کے پلاٹ مخلوط بھی ہیں لیکن کہیں تکلف کہیں بدمزگی پیدا ہو گئی ہے۔ گو شرر کا مخصوص اسلوب اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن سقم جھلک جاتا ہے" عزیزہ مصر" "ملک العزیز ورجینا" "فلپانا" "یوسف و نجمہ" وغیرہ کے پلاٹ اسی قسم کے ہیں لیکن دو تین کے سوا شرر کے بہترین ناول وہی ہیں، جن کے پلاٹ بھی بہترین ہیں۔ مجموعی حیثیت سے شرر کے پاس اعلیٰ پلاٹ کی تعداد بہت ہے۔ "مقدس نازنین" "فلورا فلورنڈا" "الفانسو" "مفتوح فاتح" "ماہ ملک"

فردوس بریں" وغیرہ بہترین پلاٹ والے قصوں کے اچھے نمونے ہیں۔ یہ پلاٹ سب کے سب مخلوط ہیں اور ان کے واقعات میں اس قدر فطری وابستگی ہے کہ ایک واقعہ دوسرے کا لازمی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

غرض پلاٹ کی خوبی کے لحاظ سے شرر اپنے آگے اور اکثر پچھلے ناول نگاروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ وقت اور مقام کے قیود ان کی یکسانیت قائم رکھنے میں شرر بہت کم غلطی کرتے ہیں

کردار پلاٹ کے علاوہ قصے کا دوسرا اہم رکن کردار ہے۔ پلاٹ درحقیقت کردار ہی کے افعال اور حرکات ماحصل ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اچھے پلاٹ میں بٹھائے ہوئے کردار بھی اچھے ہوں۔ اس کا ثبوت خود شرر کی ناولوں سے ملتا ہے۔ شرر کے پلاٹ یعنی خاکوں کی خوبی تو مسلم ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ شرر جیسا قابل قدر مصنف اور ناول نگار کردار نگاری میں اپنے پیش روؤں سے بھی پیچھے ہے۔ کردار نگاری میں حافظ نذیر احمد کو بہت کم اردو ناول نگار پہنچ سکتے ہیں۔ ان کے بعض ادبی کردار اردو افسانوں اور اردو ادب کا قابل قدر سرمایہ ہیں ہم اس موضوع پر اپنے کسی مضمون میں کافی بحث کر چکے ہیں یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ تقابلی حیثیت سے شرر کی کردار نگاری اہمیت کے کس پایہ پر ہے۔

کردار نگاری میں سرشار شرر سے بہت آگے ہیں۔ ان کے کردار بھی قصے کی زمین میں گہرے جمائے ہوئے ہوتے ہیں ذیلی کرداروں کا تو ذکر نہیں لیکن اصلی کردار عموماً ممتاز خصوصیات سے مملو اور حیات انسانی کا عکس ہوتے ہیں انہیں میں جدت اور ندرت بھی پائی جاتی ہے۔ گو کبھی کبھی یہ ندرت اصول فطرت سے متجاوز ہو گئی ہے۔ فسانہ آزاد کا اصلی کردار آزاد دنیا کے تمام کرداروں سے ممتاز اور اپنا ذاتی اور نمایاں وجود رکھتا ہے۔ یہی چیز کرداروں کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ "سیر کہسار" کا نواب عسکری بھی مثالی (یعنی ہیرو ٹائپ) کردار کا اچھا نمونہ ہے۔ گو مبالغہ سے خالی نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شرر اپنے موضوع کی چھان بین۔ اور تاریخی صداقت کو قائم رکھنے میں اس قدر محو ہو جاتے تھے کہ اپنے کرداروں کو پائدار اور ممتاز بنانے کا انہیں موقع ہی نہ مل سکا۔ اردو میں یہ اپنی طرز کے واحد ناول نگار ہیں۔ ان کا اتباع کسی سے بھی نہ ہو سکا۔ اس لئے یہ بے حد قرین قیاس ہے کہ انہوں نے موضوع ہی پر تمام تر توجہ صرف کر دی۔ لیکن ایک منتقی نقاد کے پاس یہ وجہ عذر بن کر پیش نہیں ہو سکتی۔ گو مورخ اس کو قبول کرنے کے لئے تیار بھی ہو جائے۔

کرداروں کی نوعیت شرر کے کردار مختلف قومیت کے اور مسلمانوں کے مختلف طبقوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں جاہلیت کے عرب بھی ہیں۔ نبی بھی ہیں، خلفاء اور خلافت راشدہ کے مسلمان بھی ہیں۔ افریقی ہیں، حبشی ہیں۔ اسپینی ہیں۔ اطالوی ہیں، یونانی ہیں، ایرانی ہیں، رومی ہیں۔ ترکی اور ہندی ہیں۔ غرض ہر طرح کے مسلمان اور غیر مسلمان سب ہی ہیں۔ پھر ان میں بادشاہ ہیں، امراء ہیں، سپاہی ہیں اور ادنیٰ طبقے کے افراد۔ عمر کے لحاظ سے بھی ان میں بچے ہیں، جوان ہیں اور بوڑھے۔ لیکن اگر وہ کہیں کسی قدر کردار کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو صرف عرب اور ایرانی ہیں۔ ان سے وہ بخوبی واقف تھے۔ یہاں بھی شرر کی خصامی وہ ہے۔ امیروں، بادشاہوں اور ادنیٰ خدمتگاروں سے زیادہ وہ فوجی عہدہ داروں کے کردار خوبی اور صداقت کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ فوجی عہدہ داروں میں

کما حقہ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کام راشد الخیری اور نذیر احمد خوب انجام دیتے ہیں۔

شرر کے نسائی کرداروں کے اس وسیع گروہ نے جو ہموار سطح پیدا کی ہے اس سے اگر کوئی سر ذرا اونچا ہے تو وہ فلورنڈا ہے۔ اس کی کردارکشی میں شرر نے ایک غیر عادی ندت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا سبب حیا فروشی کا اشتمال ہے جو فلورنڈا کی ایک خصوصیت تھی۔

غرض اگر ہم انفرادیت سے قطع نظر کر سکیں تو پھر شرر کے کرداروں کو پسند کرنے کی نظر پیدا کر سکتی ہے۔ عوام ان کے کرداروں کو اب تک پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ نقاد نہیں ہیں۔ وہ یہ نہیں جان سکتے کہ شرر کے کرداروں کی دلچسپی صرف تاریخی اور رومانی فضا کے چھوجانے سے بڑھ گئی ہے۔ اور تاریخی بھی وہ مسلمانوں کے عروج کی ہے!

قوت بیانیہ | شرر کی ناولوں میں پلاٹ سے بھی زیادہ جو چیز زیادہ سرمایہ دار ہے وہ ان کی قوت بیانیہ ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں اردو افسانہ نویس بہت کم شرر کے مقابل ٹھہر سکتے ہیں اچھے اور خوبصورت بیانات نذیر احمد اور پھر سرشار کے قصوں میں موجود ہیں۔ لیکن شرر کے بیانات کی نوعیت ان دونوں سے بالکل جدا ہے۔

شرر سے متعلق قوت بیانیہ کا استعمال ایک مخصوص معنیٰ رکھتا ہے۔ ورنہ جیسے ہم نے ابھی کہا ہے نذیر احمد اور سرشار کے سامنے ان کی پیش نہیں جا سکتی۔ نذیر احمد اپنے اطراف کی اشیاء اور ماحول کی چیزوں کو نہایت جزئی طور پر پیش کر سکتے تھے۔ سرشار بھی کم و بیش کرتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں کمالوں کے بیانات کا تعلق معاصرانہ زندگی سے ہے۔ جس کی آسانی ظاہر ہے۔ اس دار و مدار تمامتر مشاہدے اور انتخاب پر ہے۔ زبان بھی صاف ستھری ہو تو اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن جہاں بیانات کا تعلق ایک بلکہ ڈیڑھ ہزار سال قبل کی تاریخ سے ہو وہاں ناول نگار کا کام کس قدر دشوار ہو جاتا ہے؟ یہاں مشاہدے سے کام چل سکتا ہے اور نہ انتخاب ہی کا موقع ہے۔ اس میں تو مردہ اجسام میں روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ سے صرف اشارے حاصل کر کے قوت تمیز اور قوت تخیل کی مدد سے ان اشاروں کو پھیلانا پڑتا ہے۔ قدیم تاریخی فضا کو اسی دور کے تمدن اور معاشرت سے پُر کرنا ایک با کمال مصنف کے سوا کسی اور سے ناممکن ہے۔ تاریخی ناول نگار کا کام اسی قدر اہم ہے جس قدر اس مصنف کا جو تصویر کے خاکے میں رنگ آمیزی کرتا ہے۔ خاکہ درحقیقت تاریخ ہے اور رنگ اس میں چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ یہ کام اس قدر مہتم بالشان ہے کہ اس کی بدولت اسکاٹ نہ صرف عوام میں عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا بلکہ حکومت سے بھی اس نے خراج سربلندی حاصل کیا۔

شرر کی قوت بیانیہ کے راز سے واقف ہو جانے کے بعد قارئین کو ہم اس کی امتیازی خصوصیات کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس کو غور سے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہی وہ بنیاد ہے جس پر شرر کے ناول کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

اپنی بہت سی جدت طرازیوں کی طرح شرر نے وقت موسم اور مقامی کیفیت کو اپنے خاص اسلوب میں عوام سے بہت مانوس بنا دیتا ہے۔ ناول میں کسی موقع کو سمجھانے، کرداروں کے جذبات کو واضح کرنے یا ماحول کا اثر دکھانے

کی غرض سے گرد و پیش کے حالات، موسمی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ اس طرح کی توضیحات اور بیانات کی خوبی یہ ہے کہ وہ ناول میں کوئی زیادہ اور بے مصرف چیز نہ معلوم ہوں۔ شرر اس گر سے خوب واقف ہیں۔ وہ جا بجا ان چیزوں سے مدد لیتے ہیں۔ گو بعض مقامات پر اپنے بیانات سے ناول کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن جہاں یہ بیانات ناول کا جزو بن جاتے ہیں، خوبی میں اپنی آپ نظیر ہوتے ہیں" زوال بغداد" کا افتتاحی منظر جو دریائے دجلہ کے کنارے پر پیش کیا گیا ہے۔ یا "مفتوح فاتح" کا صحرائی سماں جو کوہ پری نیز کی اصلی دلچسپی کو کئی گونہ بڑھا دیتا ہے۔ مثال کی طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے بیشمار مناظر شرر کی ناولوں میں موجود ہیں۔ شرر کی ناولوں کو پڑھنے والوں میں بڑی تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جو ان سحر طراز بیانات سے متاثر رہے۔ شرر اپنی عبارت آرائی کے ذریعہ ان مناظر کے بیان میں بڑی رومانیت پیدا کر دیتے ہیں۔ توضیح کے لئے انہیں برجستہ تشبیہیں ملجاتی ہیں۔ پھر حسن و عشق کا چٹخارہ بھی ان میں کسی نہ طرح طرح پیدا کر دیا جاتا ہے۔

یہ اسلوب بیان اب سادہ نگار فطرت کے متلاشیوں کو ذرا ناگوار معلوم ہونے لگا ہے۔ کیونکہ اس میں بعض جگہ تکلف کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن رومانیت کے متلاشیوں کو ان سے کبھی سیری نہیں ہوتی، وہ ہر وقت "ہل من مزید" ہی کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی رنگین عبارتوں کا اثر نوجوانوں کے لئے بڑا مسحور کن ہوتا ہے۔ موسم کی کیفیات، وقت کا سماں، فطری مناظر، غرض ہر جگہ شرر نے اس اسلوب کو نبھایا ہے۔ اور اکثر نو عمر مصنفین نے ان کی تقلید کی کوشش کی ہے۔

ایک خاص چیز جس کے پیش کرنے میں شرر کو ید طولی حاصل ہے۔ جگہ اور مقام ہے۔ گذرگاہوں، راستوں اور محلوں کے بیان میں وہ ایسی جزئیات تک پہنچ جاتے ہیں کہ گویا ان کی ساری عمر انہیں مقامات پر بسر ہوئی ہے۔ یہ سب وہ اپنے تخیل کی مدد سے کرتے ہیں۔ لیکن پڑھنے والے کو صداقت کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ممالک اسلامیہ کی نہ صرف تاریخ سے بلکہ اس کے جغرافیہ پر بھی اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ حاوی ہیں، کبھی تو وہ صحرائے عرب کی سیر کراتے ہیں جہاں لق و دق میدانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن جب کبھی کوئی شاداب خطہ نظر آجاتا ہے جان میں جان آجاتی ہے۔ کبھی پری نیز کی گھاسوں میں قاری کو لیکر گھس جاتے ہیں اور جب تک اس کے بہترین گوشے نہ دکھالیں چین نہیں لیتے۔ معتصم باللہ کا بغداد بھی ان سے دور نہیں۔ قسطونیہ، قرطبہ، طلیطلہ کی تمام گلی کوچوں سے یہ واقف ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس حیثیت سے شرر کی ناولوں کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہے۔

معاشرت اور تمدن جیسے اوپر لکھا گیا ہے معاشرت اور تمدن اگر معاصرانہ نہ ہو تو اس کو صداقت کے ساتھ پیش کرنا بہت زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ناول نگار کو صرف مشاہدے اور انتخاب سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن تاریخی ناول نگار کی بساط میں بصارت اور بصیرت دونوں کی ضرورت ہے۔ مطالعہ سے معلوم کرنے کے بعد انہیں از سر نو اور تازہ زندگی عطا کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شرر نے یہ خدمت نہایت خوبی سے انجام دی ہے۔ ان کی بہترین ناولیں سوتا وہی ہیں۔ جن میں یہ بصیرت افروزی منتہا کو پہنچ گئی ہے۔ اس وصف میں "ایام عرب" کو کوئی

منظر نگاری میں ہر جگہ حسن و عشق کی تشبیہات اور استعارات کا استعمال کہیں کہیں بیان کو گھٹا دیتا ہے۔ ایک کمی جو ناول نگار کے پاس قابل معافی نہیں سمجھی جا سکتی یہ ہے کہ شرر کی عبارتوں میں حسن، لطافت اور خوش مذاقی کا فقدان ہے جس سے سارا ناول باوجود رنگینی عبارت کے سنجیدگی اور یکسانیت کا مرقع بنجاتا ہے۔ فن لطف اور ادب لطیف کی ایک بڑی خدمت مسرت انگیزی بھی ہے۔

شرر کی ناولوں کے باقی دوسرے اجزا کوئی خاص طور پر قابل ذکر نہیں۔ ان کے مکالمے سنجیدہ ہیں۔ لیکن نذیر احمد یا سرشار کی طرح زبان اور محاوروں کی طرح دلبستگیوں اور چٹخاروں سے خالی۔ عورتوں کی گفتگو بھی نسائی امتیازات سے بڑی حد تک خالی ہے۔ گو اس چیز کو ہم مکالمے کے سقم میں نہیں گنا سکتے، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی موجودگی شرر کی ناولوں کو زیادہ دلچسپ بنا دیتی۔

بہ حیثیت مجموعی شرر کے افسانوی کارنامے اپنی بعض کوتاہیوں کے باوجود اردو ادب میں عدیم المثال اور اپنی آپ نظیر ہیں۔ وہ افسانہ نویسی کی جس شاہ راہ پر ہیں۔ دوسروں سے خالی ہے۔ یہ راستہ نہایت دشوار گذار تھا لیکن شرر نے اس میں اس قدر دلچسپیاں پیدا کر دی ہیں کہ ہم ہر جگہ نئے تاریخی عجائبات، رنگ برنگ کے نقش و نگار سے دوچار ہوتے رہتے ہیں اور راستہ کی دشواری یعنی موضوع کی خشکی کا خیال لئے بغیر ہی منزلیں طے کر لیتے ہیں۔

یہ خصوصیات ہیں جو شرر کو ایک طرف تو عوام میں مقبول بنا رہی ہیں، دوسری طرف نقادان فن کی محفلوں میں وقعت کی جگہ دلا رہی ہیں۔ نیز سنجیدگی متعلین ادب کی جد و جہد کے لئے بیسیوں نئی بات کھول دیتی ہے۔ یہی خوبیاں ہیں جو ان ادبی شہ کاروں کو اردو زبان کا امتیازی سرمایہ بنا کر نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ خود اپنی ذاتی دلچسپیوں کی بدولت انہیں مدت تک قائم رکھنے کی ذمہ دار بن گئی ہیں۔ (خاص)

[صفحہ ۱۹ کا بقیہ]
عالم شباب کے سادہ بناؤ چناؤ اور الھڑپنے کی مست کیفیات کو بہت ہی عمدگی کے ساتھ نظم کیا گیا ہے طرز ادا ایسا پسندیدہ ہے کہ اس کیفیت کو پڑھتے ہی ایک ایسی مست شباب حسینہ اپنے خرام ناز سے دلوں کو پامال کرتی نظر آنے لگتی ہے۔

جام سوم (فرط شوق) دوہا

آ پیارے نین میں پلک ڈھانپ توئے لوں ۔ نا میں دیکھوں اور کو نا توہی دیکھیں دوں

ترجمہ۔ پیارے مری آنکھوں میں آ جا تاکہ میں تجھکو پلک بند کر کے اپنی آنکھوں میں بٹھالوں (اور) نہ میں تیرے سوا کسی کو دیکھوں اور نہ تجھے کسی کو دیکھنے دوں۔

عاشق کی طبیعت کا فطری تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس کے محبوب کی طرف کوئی نظر نہ ڈالے اور وہ بھی بجز اس کے کسی اور کو نہ دیکھے اس کیفیت کو کتنے سادہ اور دلچسپ طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔

جام چہارم (کمال حسن) دوہا

لکھن بیٹھ جا کی سبیہہ گہہ گہہ گرب گرور ۔ بھئے نہ کیتے جگت کے چتر چتیرے کور

ترجمہ۔ ایک بار نہیں اکثر ایک نہیں (بلکہ) دنیا کے بیشتر معمولی نہیں بلکہ صاحب فہم مصور جنکو اپنے کمال فن پر ناز تھا دعوے کیساتھ اس کی شبیہ کھینچنے کیلئے بیٹھے مگر اظہار عاجزی و اقرار لاچاری کر کے دست کش ہو گئے (بہر حال اس کی) تصویر نہ کھینچنا تھی نہ کھنچی یکتائی معشوق کو کس ندرت کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

(جام پنجم معشوق کی بے اعتنائی) دوہا

ہر رحیم ایسی کری جیم کمان سے شر بود کھینچ اپنی اور کو ڈار یوں دور

ترجمہ۔ پہلے تو معشوق نے نگاہ لطف ڈالکر عاشق کو اپنی طرف مائل کر لیا اور جب عاشق مست محبت ہو گیا تو اس کو اتنی دور کر دیا کہ پھر اسکی خبر تک نہ لی جسطرح تیر کمان میں رکھکر پہلے کان تک کھینچتے ہیں اور پھر جب چھوڑتے ہیں تو وہ اتنی دور گرتا ہے کہ کبھی ان تک پہونچ ہی نہیں سکتا کمان کی تمثیل دیکھئے کس قدر دلفریب اور موثر نازک خیالی سے کام لیا گیا ہے۔

اس امر کی بہت سخت ضرورت ہے کہ اردو سے مذاق رکھنے والی ہستیاں بہت جلد ادب بھاشا کے مطالعہ کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس کے رنگا رنگ مضامین سے گلدستہ اردو کو دلآویز بنانے کی کوشش کریں اس طرح یکایک ایک محیر العقول طریقہ سے اردو ادبیات میں ایک خاص نمایاں اور دلچسپ اضافہ ہو جائیگا جو اسکے محاسن میں چار چاند لگا دے گا۔

(خاص)

منادی

قبرستان کی چاندنی

[جناب مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب سابق ایڈیٹر "منادی" دہلی]

مخلوق کے رنگیلے شہنشاہ محمد شاہ نے ماہتابی جشن رچایا۔ چمن میں چودھویں رات کے چاند کی بہار دیکھی۔ سفید چاندنیاں بچھائی گئیں شہنشاہ نے اور درباریوں نے سفید لباس پہنے انگوٹھیاں بھی چاندی کی سفید تھیں۔ اور ان کے نگینے بھی سفید تھے۔ چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ اور مخلوق کے عیش پرست شہنشاہ کے رنگیلے پن کو دیکھ رہا تھا۔ چاندی کی صراحیاں اور چاندی کے گلاس مجلس میں گردش کر رہے تھے۔ گوری عورتیں ناچ رہی تھیں۔

میں نے تاریخ کے سفید اوراق میں کالے حرفوں کے ذریعہ اس عیاشی کا حال پڑھا' تو زوال سلطنت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی۔ میں سو گیا۔ برسات کی رات تھی تیرھویں تاریخ کا دن ختم ہو گیا تھا۔ آسمان پر بادل نہ تھے۔ پھر وہی چاند چمک رہا تھا جس نے دہلی کے لال قلعہ میں ماہتابی جشن دیکھا تھا رات کے ۲ بجے میں اپنی لوہے کی چارپائی سے اُٹھا مچھر دانی کا پردہ ہٹایا' اور چاند کے مکھڑے کو دیکھنے لگا۔ اس کے دیکھنے سے آدمی بیوقوف بن جاتے ہیں۔ انسانی حکیموں کا یہ قول ہے۔ مگر چاند نے مجھ سے کہا۔ اس بے عقلی کے آس پاس عقل و حکمت بھی موجود ہوتی ہے۔ کوئی چاند کے ذریعہ عقل و حکمت کی طرف چلتا ہے' اور کوئی بے عقلی قبول کر لیتا ہے۔ میں اُٹھا۔ بالاخانہ سے اترا۔ جو درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے برابر ہے' اور درگاہ میں گیا۔ حضرت کے مزار کے پائیں محمد شاہ بادشاہ کی قبر ہے' اور سنگ مرمر کا نہایت خوبصورت مقبرہ بنا ہوا ہے کواڑ بھی سنگ مرمر کے ہیں۔ اس کے قریب شہنشاہ شاہجہاں کی فلاسفر بیٹی جہاں آرا بیگم سوتی تھی' جس کے سرہانے یہ شعر لکھا ہوا ہے

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

بائیں طرف مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ابوظفر کے دو بھائی مرزا سلیم اور مرزا بابر کی قبریں تھیں۔ اور یہ سب سفید سنگ مرمر کا سامان تھا۔ اور چودھویں رات کی چاندنی سنگ مرمر کی سفیدی کو جگمگا رہی تھی۔ درگاہ کے درویش کچھ سوتے تھے' کچھ یاد الٰہی میں مصروف تھے۔ میں چپ چاپ محمد شاہ رنگیلے اور جہاں آرا بیگم اور مرزا سلیم کی قبروں کو کھڑا دیکھتا رہا۔ چاند آسمان سے اپنی دھیمی اور سُریلی آواز میں ان مرنے والوں کو پکار رہا تھا۔ مگر اُن میں سے کوئی بھی جواب نہ دیتا تھا۔ ہر چیز چُپ تھی۔ پانسو برس کا پرانا کھرنی کا درخت بھی چپ تھا۔ ہوا بند تھی پتہ بھی نہ ہلتا تھا۔ البتہ گذشتہ تاریخ بول رہی تھی۔ مگر اُس کی آواز بھی خاموش تھی۔ یکایک میں نے دیکھا' کہ چھوٹی چھوٹی چند مینڈکیاں شہنشاہ ہند کی قبر پر پھر رہی ہیں۔ کبھی اُچھل کر سرہانے جاتی ہیں' کبھی پُھدک کر پائینتی آتی ہیں شہنشاہ کی روح خبر نہیں کہاں ہے' اس کے درباری معلوم نہیں کن قبروں میں دفن ہیں۔ کوئی چوبدار کوئی درباری نوکر پاس نہیں ہے۔ مگر میں ہوں بشکل انسان۔ ڈارون کی تحقیقات کے بموجب میں بھی پہلے مینڈک تھا۔ بڑھتے بڑھتے بندر بنا۔ پھر آدمی مشہور

(بقیہ صفحہ "۸۰۹" پر دیکھئے)

مان سرور

کفّارہ

(افسانہ)

(جناب منشی گوری شنکر لال صاحب اختر رئیس زادہ ایڈیٹر رسالہ "مان سرور" لاہور)

مرن منی نے ہنستے ہنستے کتنے ہی زیور پہنے۔ خوش وضع اور قیمتی لباس زیب تن کیا۔ اور شوہر کے ساتھ موٹر میں سوار ہوئی۔ اس نے اتنا عطر لگایا، کہ جس طرف سے موٹر نکل جاتا تھا۔ تمام راستہ معطر ہو جاتا تھا۔ اس کا شوہر تیزی سے موٹر چلا رہا تھا۔

شوہر اُسے بہت پیار کرتا تھا۔ دم بھر کے لئے آنکھوں سے جُدا نہ ہونے دیتا۔ اس کے بناؤ سنگار کے لئے نئی نئی چیزیں تلاش کر کے بازار سے لاتا۔ مگر اہل برادری کے خوف، اور محلہ والوں کی چہ میگوئیوں کے خیال سے اسے کبھی حوصلہ نہ ہوتا، کہ اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر سیر کے لئے لے جائے۔ آج بہت دنوں کے بعد یہ موقع نصیب ہوا۔ وہ پھولی نہ سماتی تھی۔ خوشی کی انتہا نہ تھی۔

قلعہ کے میدان میں مرن منی نے کتنے ہی نظارے دیکھے، صاحب، میم، پارسی، عیسائی، مارواڑی غرض ہر قوم کے لوگ سیر کر رہے تھے۔ الہ آباد جیسے عظیم الشان شہر میں دیکھنے، اور ان سے محظوظ ہونے والے مناظر کی کمی کہاں؟ دیکھنے کو مرن منی نے بہت کچھ دیکھا۔ مگر سمجھ میں بہت کم آیا۔ کیونکہ اُس کا شوہر

[بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے]

[صفحہ ۸۰۰ کا بقیہ]

اب دیکھتا ہوں، کہ مینڈکوں کی شکل میں بھی یہاں ہوں۔ اور آدمی کی صورت میں بھی یہاں ہوں، اور محمد شاہ کے انجام کو دیکھ رہا ہوں یہ ایسا انجام ہے، کہ ہر بادشاہ کو چاہے وہ عاقل ہو یا غافل ہو، اور ہر فلاسفر کو، اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو، اور ہر حسین و بدشکل کو بادل ناخواستہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مہتابی جشن والا بادشاہ جشن کے وقت اچھا تھا، یا اب اچھا ہے؟ مجھے اس پر غور کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ میں تو آج کی رات قبرستان کا ایک ایسا مہتابی جشن دیکھنے آیا ہوں جو بغیر کسی خرچ اور اہتمام کے مجھے حاصل ہے جہاں آرا بیگم کی مجلس نظر آ رہی ہے، وہ شبنم کا کرتہ پہنے مجلس میں جا رہی تھی۔ کافوری شمع کرتہ میں لگی اور جل گئی۔ مرزا جہانگیر نے سٹین صاحب ریزیڈنٹ کے گولی ماری وہ بچ گئے گولی ٹوپی میں لگی۔ قید ہو کر الہ آباد گئے۔ مر کر یہاں آئے۔

ان سب قبروں کی ایک تاریخ ہے، اور اس تاریخ میں ایک عبرت ہے اور نصیحت ہے۔ میں ان مینڈکیوں سے کہتا ہوں، جو شکار کی تاک میں دوڑ رہی ہیں۔ کہ دنیا میں بڑے شکاری بادشاہ ہوتے دوسروں کا ملک چھین لیتے ہیں۔ اپنی عزت کے لئے دوسروں کی عزت۔ اپنے آرام کے لئے دوسروں کا آرام اپنی خوشی کے لئے دوسروں کی خوشی برباد کر دیتے ہیں۔ تمہارا شکار چھوٹے چھوٹے کیڑے ہیں۔ وہ بھی دنیا میں عزت اور خوشی اور آرام کی زندگی بسر کرنے کے لئے آتے ہیں۔ مگر تم ان کو کھا جاتی ہو۔ تم کو سانپ کھا جاتا ہے۔ سانپ کو مور کھا جاتا ہے۔ مور کو آدمی کھا جاتا ہے۔ آدمی کو بادشاہ کھا جاتا ہے۔ اور بادشاہ کو یہ قبر کھا جاتی ہے۔ پیچھے ہٹ۔ گھر چل۔ یہ بادشاہ قبروں کا نوالہ ہیں۔ یہ بادشاہ دوسروں کو نوالہ بناتے تھے۔ آج بے جان خاک کا نوالا بنے ہوئے پڑے ہیں۔ اب یہ سوچ کر تو نہ کسی کو نوالہ بنا۔ نہ کسی کا نوالہ بن۔ تاکہ زندگی کا راز تجھ پر کھولا جائے + + (خاص)

آگے بیٹھا ہوا موٹر چلا رہا تھا۔ وہ اندر اکیلی تھی۔

چوک کے موڑ پر آ کر گاڑی یکبارگی رک گئی۔ کسی درد آلود جگر خراش آواز نے اس کا کلیجہ دہلا دیا۔ اس کے شوہر مسٹر کرشن کمار فوراً موٹر سے اترے۔ کھڑکی سے سر نکال کر مرن مئی نے دیکھا، کہ کوئی آٹھ دس سالہ بچہ خون میں لت پت ہو کر درد سے تڑپ رہا ہے۔ اور راستہ کے پتھروں پر لوٹ رہا ہے۔ اس کا غمناک مایوس چہرہ دیکھ کر مرن مئی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایسی دردمند شکل آج تک اس کی نگاہوں سے نہ گذری تھی۔

جب چند آدمیوں نے مل کر اس لڑکے کو اٹھایا، تو معلوم ہوا۔ کہ اس کے بائیں پاؤں کی ہڈی بالکل چور چور ہو گئی ہے۔

(۲)

مرن مئی سوچتی تھی۔ کیا میں نے کبھی کوئی پاپ کیا ہے۔ مگر ہر چند سوچنے پر بھی اسے کوئی بات یاد نہ آتی تھی۔ جب دیدہ و دانستہ اس نے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی، تو پھر اس کے لڑکے کو اتنی تکلیف کیوں ہے؟ ہر چند سوچنے پر بھی وہ اس کا فیصلہ نہ کر سکی۔ جب مسٹر کرشن کمار غصہ میں آ کر نوکروں پر ناراض ہوتے، تو مرن مئی بار بار نہایت منت و خوشامد سے نوکروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے کی درخواست کرتی۔ یہی نہیں بلکہ انھیں علیحدہ بلا کر کچھ روپے بھی دے دیتی تھی۔ کتنی ہی غریب عورتیں اس کی امداد سے گذر اوقات کرتی تھیں۔ ان تمام خیر و خیرات کے باوجود بھی اس کا بچہ کیوں بیمار ہے؟ اس کا باعث سمجھ میں نہ آتا تھا۔

پریشانی اور الجھن کی وجہ سے جیسے تمام مکان کی ایک ایک چیز زبانِ حال سے اسے لعنت ملامت کر رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کہتی تھی، کہ حقیقتاً ان قیمتی چیزوں میں قطعی سکھ نہیں۔ کیا بدحیثیت جھونپڑی اور کٹی میں بھی بہت سکھ ہے؟۔

بیوی کو مغموم اور ہراساں دیکھ کر کرشن کمار نے کہا " مرن! تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، کہ بچہ کم عمر ہے جلد اچھا ہو جائیگا۔" مرن مئی نے ڈاکٹر پر بد اعتقادی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں بڑی پاپن ہوں۔ ایسا نہ ہوتا تو ...."

کرشن کمار نے ہنستے ہوئے سمجھایا "فکر کرنیکی ضرورت نہیں۔ مرن سی جیسی نیک عورتیں دنیا میں بہت کم ہیں۔" مرن مئی کو شوہر کی یہ بات کچھ ٹھیک نہ معلوم ہوئی۔ اس نے کہا "نہیں۔ کوئی نہ کوئی قصور ہوا ہے۔ میرا دل بار بار کہہ رہا ہے، کہ مجھ سے ضرور کوئی نہ کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔ اور بغیر گناہ کا کفارہ ادا کئے ہوئے بچہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"اس خیالی گناہ کا کفارہ کیونکر ہوگا" کرشن کمار بھی سوچنے لگا۔

بہت سی باتوں کے بعد یہ طے پایا، کہ دوسرے دن علی الصباح مرن مئی گھاٹ پر جا کر دیوی کے درشن کریگی۔ اور وہیں سو فقیر کو ایک ایک چونی تقسیم کریگی۔

(۳)

جیسے بھڑوں کو چھیڑ کر ان سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے، اسی طرح تیرتھوں میں بھکاریوں پر رحم کرنے سے جان بچانا بھی محال ہو جاتا ہے۔ جوتن مئی نے سب سے پہلے گنگا اشنان کیا۔ بیش قیمت ساڑی پہنی۔ اور بالوں کی کھلی ہوئی لٹیں پشت پر ڈالے ہوئے جب اس نے فقیروں کو چونی تقسیم کرنی شروع کی، تو پہلے اسے کچھ خوشی ملی۔ مگر جب آخر میں ان لوگوں نے "ماتا! تمھاری جے ہو۔ رانی جی! آپ کا سکھ بڑھے" وغیرہ دعائیہ فقرے کہہ کر اسے گھیر لیا۔ تو اسے جے یا سکھ پانے کی کچھ بھی امید نہ رہی۔ ایک حریص فقیر نے گھوم پھر کر اس سے تین چار چونیاں اینٹھ لیں۔ جو لوگ اپاہج کاہل الوجود تھے، وہ اس مجمع کو چیر کر اس کے پاس تک نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ جو جس قدر طاقتور تھا، اسی قدر زیادہ فائدہ ہوا۔ دنیا میں ہر جگہ طاقتور ہی کی فتح ہے۔

بالآخر مرن مئی نے گھبرا کر موٹر کا دروازہ بند کر لیا۔

کرشن کمار نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "کیوں کیا شوق پورا ہو گیا؟"

مرن مئی مسکرائی۔ اس وقت کرشن کمار کی مشتاق نگاہوں میں اس کا حسنِ نوبہار نہایت دلپذیر نظر آتا تھا۔ اس نے بچہ کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور بار بار اس کا منہ چوم کر کہا۔ "اب پریم کمار کو آرام ہو جائیگا۔" بچہ بھی ہنس پڑا۔ باہر سے جے جے کار کی آوازیں آنے لگیں۔ کرشن کمار نے بیوی کو پھر اُس طرف مخاطب نہ ہونے دیا۔

انھوں نے موٹر کا ہارن بجایا۔ موٹر چلا۔

مرن مئی نے بھگوتی کے مندر کی جانب دیکھ کر نہایت عقیدت سے پرنام کیا

عین اُسی وقت کسی نے کان آشنا لہجہ میں کہا۔ "ماں لچھے ہو!"

مرن مئی نے چونک کر دیکھا۔ دس بارہ برس کا ایک لنگڑا لڑکا لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوا کہہ رہا تھا۔ "ماتا! آپ کی جے ہو۔"

مرن مئی کو احساس ہوا۔ جیسے اس نے پہلے بھی کبھی یہ آواز سُنی ہے۔ یہ دردمند شکل پہلے بھی کبھی دیکھی ہے۔ کچھ دیر تک وہ اسی غور و خوض میں رہی۔ اُسے یاد آگیا۔ کہ اِسی بات کے کفارہ کے لئے تکلف اُٹھا رہی ہے۔ پاگلوں کی مانند گاڑی سے اُتر کر لڑکے کے پاس پہنچی اور اس سے دریافت کیا۔ "بیٹا! تمھارا پاؤں کیسے ٹوٹا؟"۔

لڑکے نے مغموم لہجہ میں کہا۔ "موٹر سے۔"

"کتنے دن ہوئے؟"

"دو برس"

"کہاں؟"

"چوک کے موڑ پر۔"

مرن مئی نے پھنسے ہوئے گلے سے پوچھا۔ تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟

لڑکے نے کبیدہ خاطر لہجہ میں کہا۔ "ماں جی کیا کروں۔ ابھی میں ہسپتال میں ہی تھا، کہ ماں کا سایہ ہمیشہ کے لئے سر سے اُٹھ گیا۔ اِسوقت دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ ماں! کیا لنگڑا شخص کچھ کام کر سکتا ہے؟"

مرن مئی نے آنسو پونچھتے پونچھتے کہا۔ "نہیں!"

وہ لڑکے کا ہات پکڑ کر اسے گاڑی کے پاس لائی، اور بولی۔ "جسے ڈھونڈتی تھی وہ مل گیا۔ پاپ کا پتہ چل گیا ہماری موٹر سے ہی لنگڑا ہو کر یہ لڑکا بھکاری بن گیا ہے۔"

کرشن کمار یہ سن کر کانپ اٹھے۔ مرن مئی نے کسی قدر جوش سے کہا۔ "آج سے یہ ہمارے ہی مکان پر رہیگا۔ کیوں؟"

کرشن کمار نے کہا۔ "ضرور۔"

شوہر اور بیوی دونوں نے مل کر لنگڑے لڑکے کو موٹر میں بٹھا لیا۔ (انامی)

[صفحہ ۸۱۵ کا بقیہ]

علاوہ دماغ بھی ہیرو ہے۔ لیکن جب تک دل کسی چیز کو قبول نہ کرے، وہ شاہراہ دماغ سے کسی طرح گذر ہی نہیں سکتی، انسانی جذبات میں تحریک و اشتعال پیدا کرنیکا دل ہی ایک زبردست آلہ ہے۔ خواہ اس سے اچھے خیالات پیدا ہوں، اور خواہ مواقب و تاریخ کے اعتبار سے بُرے جذبات اور تخیل کی نمائش ہوتی ہو۔ اس کا تعلق ماحول اور عمدہ تربیت پر منحصر ہے۔ بہر حال دل کی مبارک ہستی، ایک عجیب ہستی ہے۔ جس کے پردہ پر ہر اچھی بُری صورت کا عکس فوراً آ جاتا ہے۔ حقیقت میں لطریں اچھی طرح جانتی ہیں۔ کہ دل ایک نعمت ہے، اور وہ نعمت بھی کیسی نعمت جس کے وجود پر دنیا کی تمام دلچسپیاں موقوف ہیں۔ اگر دل غمگین ہوتا ہے، تو کائنات کا ایک ایک ذرہ اُداس اور غمگین نظر آتا ہے۔ اور اگر دل حقیقتاً خوش ہے، تو قید خانہ کی چار دیواری میں بھی مسرت و نشاط کی کیف آفریں لہریں موج زن نظر آتی ہیں۔

(خاص)

میخانہ

جوش مستی

(جناب اسد انصاری ایڈیٹر میخانہ ، لکھنؤ)

کس غضب کا یا الٰہی موسم برسات ہے ٭ کیوں نہیں پھولے سماتی شاخ گل کیا بات ہے

ہے ادائے لطف ساقی کی نگاہ قہر میں ٭ ہر طرف مستی ہی مستی چھا رہی ہے دہر میں

مست ہے ہر شے زمانہ کی زمانہ مست ہے

بلبلوں کا شور قمری کا ترانہ مست ہے

میکشوں کے فیض سے زاہد بھی میکش ہو گئے ٭ تابع فرمان ساقی سارے سرکش ہو گئے

فصل گل نے متقی کو کر دیا تقویٰ شکن ٭ واعظوں کو جوش مستی نے کیا توبہ شکن

مست ہے ہر شے زمانے کی زمانہ مست ہے

بلبلوں کا شور قمری کا ترانہ مست ہے

آج کیا باعث ناصحوں نے کیوں نصیحت چھوڑ دی ٭ کیا سبب ہے عابدوں نے کیوں عبادت چھوڑ دی

کیوں نسیم جانفزا پھرتی ہے اتراتی ہوئی ٭ کس لئے ہر شخص پر مستی سی ہے چھائی ہوئی

مست ہے ہر شے زمانے کی زمانہ مست ہے

بلبلوں کا شور قمری کا ترانہ مست ہے

کیوں چلے آتے ہیں سب مسجد سے میخانہ کی سمت ٭ خود بخود بڑھنے لگے کیوں ہاتھ پیمانہ کی سمت

بیخودی کیوں کر رہی ہے حکمرانی ہوش پر ٭ زلفیں دم لیتی نہیں کیوں ہر غزال کے دوش پر

مست ہے ہر شے زمانے کی زمانہ مست ہے

بلبلوں کا شور قمری کا ترانہ مست ہے

میکدہ پر ابر ہے کیوں ہر طرف چھایا ہوا ٭ میکشوں پر آج کیوں واعظ ہے گرمایا ہوا

شیخ جی کو رشک ہے کیوں میکشوں کے حال پر ٭ مست ہو کر جھومتے ہیں پھول کیوں ہر ڈال پر

مست ہے ہر شے زمانہ کی زمانہ مست ہے

بلبلوں کا شور قمری کا ترانہ مست ہے

جوش میں ساقی بھی ہے میکش بھی ہیں سب جوش میں ٭ کیا قیامت ہے بپا دنیائے صبر و ہوش میں

جس کو دیکھو بیخود و سرمست ہے مخمور ہے ٭ منزل عقل و خرد رندوں سے کوسوں دور ہے

مست ہے ہر شے زمانے کی زمانہ مست ہے

بلبلوں کا شور قمری کا ترانہ مست ہے

میکدے کی سمت سب جاتے ہیں گرمائے ہوئے ٭ واعظ ناداں سے پوچھو کیوں ہو گھبرائے ہوئے

طالب دیدار ساقی کو تو یہ دید ہے ٭ فصل گل ہے جوش پر بادہ کشوں کی عید ہے

مست ہے ہر شے زمانے کی زمانہ مست ہے

بلبلوں کا شور قمری کا ترانہ مست ہے

ذرہ ذرہ عالم ایجاد کا مستی میں ہے ٭ زندگی کا لطف کچھ مخمور کی ہستی میں ہے

میکدہ پر اودی اودی ہے گھٹا چھائی ہوئی ٭ باغ و صحرا پر ہے مستی کی ادا چھائی ہوئی

مست ہے ہر شے زمانے کی زمانہ مست ہے

بلبلوں کا شور قمری کا ترانہ مست ہے

میکشی ہے اپنے دم سے میکشی کے دم سے ہم ٭ اپنا عالم ہے جدا اور ہیں جدا عالم سے ہم

فصل گل ہے رات دن پینا پلانا چاہیئے ٭ اے اسدؔ مستی کی اک دنیا بسانا چاہیئے

مست ہے ہر شے زمانے کی زمانہ مست ہے

بلبلوں کا شور قمری کا ترانہ مست ہے

(خاص)

نظام المشائخ

خوشی

[جناب مولانا واحدی ایڈیٹر "نظام المشائخ" دہلی]

دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہیں ہے۔ جس کے حاصل کرنے کی ہر شخص کو خواہش ہو، کوئی کسی نعمت کو پسند کرتا ہے، اور کوئی کسی نعمت کو۔ پھر پسندیدہ نعمت بھی ایک وقت ناپسندیدہ بنجاتی ہے۔ اولاد کتنی بڑی نعمت ہے۔ اور انسان اس کے لئے کیا کیا جتن کرتا ہے۔ لیکن میں بہت سے انسانوں کو جانتا ہوں، جنھیں اولاد سے کچھ بھی رغبت نہیں ہے۔ اور ایسے تو بے شمار ہیں۔ جو کبھی اولاد کے دیوانے تھے، اور بعد میں اولاد کے دشمن ہوگئے۔ اولاد کی نالائقی کی وجہ سے، اولاد کی ماں کے مرجانے کے سبب سے، یا اولاد کے سلسلہ میں کمانے کی فکر جو زیادہ کرنی پڑی اس لئے، بہرحال وجہ سے بحث نہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے، کہ اولاد جیسی نعمت بھی ہمیشہ محبوب نہیں ہوتی، اور اولاد بھی کوئی مستقل محبوب شے نہیں ہے۔ جن کی ہم خود اولاد ہیں یعنی ہمارے ماں باپ، اور جس نے درحقیقت ہمیں پیدا کیا ہے، یعنی ہمارا خالق اور خدا یہ بھی مستقلاً محبوب نہیں ہیں۔ کھانا بھی محبوب نہیں ہے، پینا بھی محبوب نہیں ہے پہننا بھی محبوب نہیں ہے۔ احباب بھی محبوب نہیں ہیں۔ بیوی بھی محبوب نہیں ہے۔ غرض کوئی نعمت مستقلاً اور حقیقتاً محبوب نہیں ہے۔ اور کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جس کے حاصل کرنے کی ہر شخص کو خواہش ہو کوئی کسی نعمت کو پسند کرتا ہے کوئی کسی نعمت کو۔ پھر پسندیدہ نعمت بھی دوسرے وقت ناپسندیدہ بنجاتی ہے۔ وہی شخص جو تندرستی میں کھانے کا بڑا شوقین ہوتا ہے بیماری میں کھانے کے نام سے گھبرانے لگتا ہے۔ لیکن ہاں ایک نعمت ہے جو ہر شخص کو پسند ہے۔ جس کی ہر شخص کو خواہش ہے، اور جس کا انسان ہمیشہ مبتلا رہتا ہے۔ کسی آن اُس سے علیحدگی نہیں چاہتا۔ بلکہ اسی کے لئے خدا سے تعلق رکھتا ہے۔ ماں باپ سے تعلق رکھتا ہے، بیوی بچوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور وہ نعمت اگر اُسے خدا سے بے تعلقی میں میسر آتی معلوم ہوتی ہے، تو خدا سے بے تعلق ہوجاتا ہے، ماں باپ سے بے تعلق ہونے میں نظر آتی ہے، تو مادر پدر سے آزاد ہوجاتا ہے۔ بیوی بچونکی ترک میں دکھائی دیتی ہے، تو بیوی بچونکو چھوڑ دیتا ہے۔ آپ سمجھے وہ نعمت کونسی ہے؟ اُس نعمت کا کیا نام ہے؟ اُس کا نام ہے "خوشی"۔ یہ اگر راحت میں ملتی ہے، تو انسان راحت کی طلب کرتا ہے۔ اور اگر تکلیف میں ملتی ہے، تو انسان تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتا۔ لوگ خدا کو مقصود بالذات کہتے ہیں مگر میں تو کہتا ہوں، کہ خدا کے حصول اور خدا کے وصال کا کسی کو خیال بھی نہ آئے۔ اگر خدا کے حصول اور خدا کی وصال کی تہ میں خوشی موجود نہو۔ اور جہاں یہ خوشی موجود نہیں ہوتی، وہاں خدا کے حصول اور خدا کے وصال کا خیال آتا بھی نہیں۔ دینی و دنیاوی خوشیوں کی بابتہ اگر یہ عقیدہ نہو کہ سب خدا کی عنایت و مہربانی سے حاصل ہوتی ہے، تو ہم بھی خدا کی پرواہ نہ کریں۔ چنانچہ جن کا یہ عقیدہ نہیں ہوتا، تو وہ

پرواہ نہیں کرتے بلکہ پرواہ کرنیوالونکا مذاق اڑاتے ہیں۔ غرضکہ خوشی بڑی ہی اہم نعمت ہے، جس کے لئے انسان اس نعمت کے بنانے والے اور اُس نعمت کے دینے والے کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے، مگر یہ عجب بات ہے، کہ نعمتوں میں سے کوئی نہ کوئی نعمت ہر شخص کو حاصل ہوتی ہے۔ کسی کے ہاں اولاد نہیں ہے تو دولت وافر ہے۔ کسی کے پاس دولت نہیں ہے، تو وہ اولاد سے مالامال ہے مگر حاصل نہیں ہوتی، تو یہی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ دنیا کی تمام نعمتیں کسی گھر میں جمع ہو جائیں، تب بھی اس کے رہنے والے خوشی کو ترستے دکھائی دینگے، بات یہ ہے، کہ خدا سے بغیر معاملہ کئے خوشی کا ملنا ناممکن ہے، خدا چاہتا ہے، کہ تم اسکی بتائی ہوئی بدائیوں سے بچو۔ اور اسکی بتائی ہوئی اچھائیوں کو اختیار کرو۔ اگر تم اسکی مرضی کے مطابق چلو گے، تو وہ بھی تمھاری خواہش کو پوری کر دیگا۔ ورنہ تمام سامان عیش مہیا ہو جانیکے باوجود بھی کوئی خلش ایسی باقی رہیگی، کہ عیش کو منغص کر دیگی۔ سب سے بڑی اچھائی اور سب سے بڑی نیکی خدا کے نزدیک خدا کی مخلوق کی خدمت ہے۔

جو لوگ خدا کی مخلوق کی خدمت کرتے ہیں، اور خدا کی مخلوق کے کام آتے ہیں، انھیں خوشی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ اور حقیقی خوشی سے وہی شادکام ہوتے ہیں، جس کا دوسرے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے آپ شاید فرمائیں، کہ ہر شخص ملک اور قوم کی رہنمائی کا اہل نہیں ہوتا، اور ہر شخص خادم بنجائے، تو مخدوم کون ہو؟۔ لہذا خوشی چند ہی لوگوں کے لئے رہ گئی، لیکن میری مراد رہنمائی سے نہیں ہے رہنما تو اکثر رہنمائی کا احسان جتاتے وقت اپنی ایسی ایسی پریشانیوں کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ جن سے بفضل خدا عوام محفوظ ہیں۔ میرے سامنے وہ بزرگ ہستیاں ہیں، جو خواہ پوری انسانی آبادی کی اپنی تعلیم اور اپنی رہنمائی سے خدمت کر رہی ہوں۔ یا صرف اپنے بیوی بچونکو پال کر انسانی آبادی کے ایک چھوٹے سے جزو کی خدمت انجام دے رہی ہوں۔ لیکن اُنکے دل میں خدمت خلق اللہ کا جذبہ ہے۔ ایسی ہستیاں خوشی سے محروم نہیں ہوتیں۔ اگر وہ مسلسل خدمت خلق میں مصروف ہیں۔ تو انکی خوشی کا سلسلہ بھی نہیں ٹوٹتا۔ اور اگر کبھی کبھی اُن کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے تو جذبہ کے وقت اور جذبہ کے مطابق عمل کرتے وقت ان کو خوشی قطعی حاصل ہو جاتی ہے ایک بوجھ اٹھانیوالے کے بوجھ کو سہارا دیکر بھی انسان اپنی تیلون کی شکل کے بگڑنے سے بے نیاز ہو سکتا ہے لوگ گناہ میں مسرت کو تلاش کیا کرتے ہیں، لیکن گناہ میں مسرت کی تلاش سے بڑھکر کوئی حماقت نہیں ہے

پاپ میں چین کہاں! خوشی کے خواہاں ہو، تو نیکی کرو۔ اور سب سے بڑی نیکی یہ ہے، کہ اپنے آپ کو تج دو اور ان کے کام آؤ، جو تمھارے کام کے محتاج اور ضرورتمند ہیں

کرم جنس ہے یاں دستگیری ناتوانوں کی
خرید اکر ملیں جتنی دعائیں نیم جانوں کی (خاص)

دل

[جناب امین سلونوی سابق ایڈیٹر "نظم" لکھنؤ]

دل کیا ہے؟ دنیا کے تمام بڑے بڑے عقلاء، فیلسوف حکما اور شعراء نے اپنے اپنے نظریات کے مطابق اپنے اپنے خیالات پیش کردیئے ہیں۔ اور مختلف طریقوں سے اسکی ماہیت پر غور کر چکے ہیں اور الگ الگ اپنے قیاس وخیال سے اس کا تجربہ بھی کر چکے ہیں۔ وہ بھی کافی ہے۔ اس لئے اس وقت اس کے متعلق کسی طولانی خطبہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ دل ایک ایسی چیز ہے۔ جس سے ہر وقت ہر انسان کو سابقہ رہتا ہے۔ چنانچہ بقدر فکر ہر ذہن اور ہر دماغ نے اسکے متعلق کچھ نہ کچھ خیال آرائی کی ہے۔ بظاہر ایک پارۂ گوشت، اور یہی ایک مشت خاک انسان کی امیدوں کا مسکن، دنیا بھر کی آرزوں کا خزانہ ہے۔ جس پر تمام تکالیف و مصائب، آرام وراحت کا دارومدار ہے۔ سطح سے اور بلند ہونیکے بعد اس کے احترام کا درجہ خانۂ خدا کی صورت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اور پھر یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ دنیا کی ساری برکتیں ساری نعمتیں ایک دل کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور یہ سچ بھی ہے۔ کہ اس کی وسعتوں میں ہماری ساری زندگی کا راز مخفی ہے۔ اللہ اللہ ایک پارۂ گوشت کی یہ حقیقت، ایک مشت خاک کی یہ وقعت۔ دنیا کے تمام تکلفات اسکی تمام خواہشات، صرف دل کی جنبشوں پر موقوف ہیں۔ اس کی ہر تحریک کہیں تو باغ وبہار کا مظاہرہ کرتی ہے، اور کہیں اجڑے اور سنسان محلوں کا نمونہ پیش کرکے درس عبرت دیتی ہے، کہیں میدان کارزار کا ہنگامہ برپا کرتی ہے۔ کہیں فتح وکامرانی کی محفلیں سنوارتی ہے۔ کہیں باعث تفریح اور کہیں موجب تکلیف بن جاتی ہے۔ کہیں اس کی اداؤں میں اس قدر دلکشی نظر آتی ہے، کہ انسان بیخود ہوجاتا ہے۔ کہیں اس درجہ پر غرور کہ ہفت اقلیم کی سلطنت کو ٹھکرا دینے کے لئے تیار ہوجاتی ہے۔ کہیں ظالم کے لباس میں، اور کہیں مظلوم کی صورت میں۔ اور ایک بے چین نادان بچہ، کہیں نہایت تندخو درندہ، کہیں یہی راہبر اور رہنما، کہیں غارتگروں کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ جس شخص نے دنیائے عشق ومحبت کی سیر کی ہوگی اُسے اسکے تغیرات کا حال خوب معلوم ہوا ہوگا۔

انسان کی ہر خیالی قوت اور ہر قسم کا ادراک گو مختلف ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن قوت سے فعل میں آنے کا دل ہی کی سلسلہ جنبانیوں پر موقوف ہوتا ہے۔ گویا دل ایک ایسا آئینہ ہے، کہ جس پر تمام دنیا کی کیفیات کا عکس آجاتا ہے، اور اس سے مختلف اثرات، مختلف صورتیں ظہور میں آتی ہیں۔

سب سے پہلے انسان پر اگر کسی کیفیت کا اثر ہوتا ہے، تو وہ اثر پہلے دل کی قبولیت کا شرف حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد محسوسات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا اصول مسئلہ ہے، کہ جس سے شاذ ہی کسی کو انحراف ہوسکے۔ کسی چیز کی اتحاد، کسی بات کا ظہور، کسی فعل کا وقوع ہونا، یہ تمام دل کی حسیات سے متعلق ہیں۔ اور اگرچہ انسانی جسم میں دل کے

[بقیہ صفحہ ۱۱۱ پر دیکھئے]

نظّارہ

چاند

اک فلک کا چاند ہے اور اک ہمارا چاند ہے

(جناب ظفر عباس صاحب فضل ایڈیٹر "نظّارہ" لکھنؤ)

حُسن سے اور عشق سے کس طرح کا ہے ساز باز — آسماں تک چھُپ سکے پہونچا کسطرح اُلفت کا راز
یہ نہیں وہ صورتیں جن میں ہو مشکل امتیاز — ہے اُدھر رنگ شفق لال اسطرف ہے چشم ناز
خود ہی تو بتا دے ایدل کون پیارا چاند ہے — اک فلک کا چاند ہے اور اک ہمارا چاند ہے

اس طرف ہے بام خانہ اور اُدھر بام فلک — اسطرف گھنگھور گیسو اور اُدھر شام فلک
اس طرف زلفوں کی گرہیں اور اُدھر دام فلک — سامنے گوری جبیں ہے کون لے نام فلک
خود ہی تو بتلا دے ایدل کون پیارا چاند ہے — اک فلک کا چاند ہے اور اک ہمارا چاند ہے

چاندنی ہے سہم اُدھر اور چشم قاتل اس طرف — قُرب پر تو اُس طرف جلوے کی منزل اس طرف
ماہ کامل اُس طرف اس کا مقابل اس طرف — صبح کا تارا اُدھر ہے اور یہ دل اس طرف
خود ہی تو بتلا دے ایدل کون پیارا چاند ہے — اک فلک کا چاند ہے اور اک ہمارا چاند ہے

مست بھری آنکھیں بھی ہیں ڈورے بھی ہیں لال اسطرف — اُس طرف ہلکی سیاہی چہرے کا خال اسطرف
اُس طرف کالی گھٹائیں اور کھُلے بال اس طرف — چودھویں رات اُس طرف، چودھواں سال اس طرف
خود ہی تو بتلا دے ایدل کون پیارا چاند ہے — اک فلک کا چاند ہے اور اک ہمارا چاند ہے

یوں مقابل چودھویں شب ہیں زمین و آسماں — دیکھکر تصویر حیرت بن گیا سارا جہاں
فضل اب تو حد سے بڑھتا ہے مرے دل کا گماں — اُس طرف ہالہ ادھر انگڑائی لینے کا سماں
خود ہی تو بتلا دے ایدل کون پیارا چاند ہے — اک فلک کا چاند ہے اور اک ہمارا چاند ہے

(خاص)

نرگس

قدم قدم پر میری موت

(جناب تبسم نظامی ایڈیٹر رسالہ "نرگس" لکھنؤ)

فطرتِ پردہ دار نے مارا — حُسن کے انتظار نے مارا
ہم سکوں میں بھی بے قرار رہے — ورنہ جن کو قرار نے مارا
ایک دن ہو تو صبر بھی کرلیں — وعدۂ بار بار نے مارا
ہوئی دنیا ہلاکِ حُسنِ بہار — مجھے یادِ بہار نے مارا
کی اگر احتیاطِ خندۂ گُل — تو نوائے ہزار نے مارا
انکھڑیوں سے شراب برسا کر — ایک مست خمار نے مارا
اپنے مرکز پہ بے قرار ہوں میں — گردشِ روزگار نے مارا
کس کو کس کو نشانِ منزل دیں — پرسشِ رہگذار نے مارا
بھولی بھولی حسین شکلوں میں — چھپ کے اک پردہ دار نے مارا
ستمِ یار کی شکایت کیا — دلِ ناکردہ کار نے مارا
خارِ گلشن بھی دل میں بیٹھ گیا — تیر کیا بہار نے مارا
آپ کے اعتبار نے لوٹا — آپ کے انتظار نے مارا

اے تبسّم شہید فطرت ہوں
زندگی کے خمار نے مارا

(خاص)

نگار

ایک شاعر کا افسانۂ حیات

(جناب نیاز محمد خاں صاحب نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار" لکھنؤ)

(۱)

جیوپٹر سو رہا ہے۔ دیویاں آہستہ آہستہ خوابگاہ الوہیت کے قریب جاتی ہیں اور پھر دبے پاؤں واپس آتی ہیں۔ پردار کنیزیں۔ حد درجہ سبک پرواز کے خلوت گاہ مقدس کے چاروں طرف چکر لگاتی ہیں اور لوٹ جاتی ہیں۔

آفتاب بلند ہو کر کوہ اولمپس کی چوٹی کو زرنگار بنا رہا ہے چڑیاں اپنے اپنے آشیانوں سے نکل کر ادھر ادھر اُڑ رہی ہیں کسان ہل لیکر کھیتوں میں پہونچ گئے ہیں لکڑہارے کلہاڑیاں لئے ہوئے خشک درختوں کی جستجو میں اپنے جھونپڑوں سے باہر نکل رہے ہیں پھول کھل چکے ہیں۔ سبزہ شبنم سے لہک اٹھا ہے چشموں کی روانی میں تیزی پیدا ہو چلی ہے۔ الغرض ساری کائنات پیدا ہو چکی ہے لیکن جیوپٹر ہنوز محو خواب ہے کیونکہ بارگاہ خداوندی کے مطرب گنگ ہیں۔ اُن کے ساز خاموش ہیں اور وہ موسیقی جس کی نازک موجیں، جیوپٹر کی نیند میں تھرتھری پیدا کر کے اس کو بیدار کیا کرتی تھیں آج نہ مغنی کے گلے سے پیدا ہوتی ہے۔ نہ بربط کے تاروں سے۔

(۲)

دولت کی دیوی :-

اے شاعر۔ بغیر تیرے موسیقی سوگوار ہے اور جیوپٹر ابھی تک بیدار نہیں ہوا۔ سنا ہے کہ شاعر دولت کا شیدا ہوتا ہے۔ اس لئے سب نے مجھے منتخب کر کے تیرے پاس بھیجا ہے کہ تجھے منا کر دربار میں لے چلوں اور اگر تو چاہے تو اس کے عوض دنیا کی دولت تیرے آگے ڈال دوں۔

یہ کہکر اس نے اپنے لانبے سیاہ بال نچوڑے اور شاعر کے قدموں پر موتیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ شاعر نے جو بالکل خاموش دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔ نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر اسی طرح گردن جھکائی۔ دیوی اس کا یہ انداز دیکھ کر ہنس پڑی اور بیشمار نقرئی پھول شاعر کے سامنے بکھر گئے۔

شاعر بدستور خاموش رہا اور دیوی یہ سمجھ کر کہ شاید وہ اس سے بھی زیادہ کچھ چاہتا ہے آگے بڑھی اور بولی — "اے شاعر! اگر تو اس پر بھی راضی نہیں تو میں تجھے دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیزیں دینے کے لئے آمادہ ہوں جو سوائے جیوپٹر کے کسی اور کا حصّہ نہیں — ہاں، میں اپنے لبوں کا یاقوت۔ کانوں کا صدف دانتوں کا ہیرا اور ان سب سے بڑھکر اپنے سینہ و شانہ کا نرم اور لچیلا سونا بھی تیری سپردگی میں دینے کے لئے راضی ہوں۔ لیکن خدا کے لئے تو میرے ساتھ چل اور جیوپٹر کو کسی طرح بیدار کر۔

یہ کہکر وہ شاعر کی آغوش میں مچلنے ہی والی تھی کہ اس نے خشونت کے ساتھ ہٹا دیا اور بولا۔ نہیں مجھے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اور نہ میں تیرے ساتھ چل سکتا ہوں۔ کیونکہ میری شاعری خود اب تک محو خواب ہے۔

(۳)

شہرت کی دیوی :-

اے شاعر میں جانتی تھی کہ تجھے منانے کے لئے مجھی کو آنا پڑے گا - سچ ہے تجھے دولت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے - تیرا دماغ خود بے بہا خزینہ ہے بہترین جواہر کا - تجھے تو صرف شہرت درکار ہے سو میں ایک تحفہ تیرے واسطے لائی ہوں اسے قبول کر -

یہ کہہ کر اس نے ایک نہایت نازک حباب جس میں قوس قزح کے تمام رنگ جھلک رہے تھے آنچل میں رکھ کر پیش کیا اور بولی اے شاعر دیکھ اس کے اندر کیا نظر آتا ہے زرا غور کر - تمام آسمان و زمین میں تیرا ہی نام جلی حرفوں سے لکھا ہوا نظر آتا ہے بادلوں کی روشنیوں میں، شفق کی رنگینیوں میں پہاڑوں کی بلندیوں وادیوں کی وسعتوں اور سمندر کی گہرائیوں میں ہر جگہ تو ہی تو ہے لے یہ حباب اپنے پاس رکھ اور میرے ساتھ دربار میں چل -

شاعر نے برہمی کے ساتھ اس حباب رنگیں کو زمیں پر ٹپک دیا اور وہ چور چور ہو گیا - شاعر نے پیشانی پر شکن ڈال کر کہا - اے دیوی مجھے ناپائیدار شہرت و عزت کی ضرورت نہیں میں تو کچھ ایسی چیز چاہتا ہوں جو میری روح کو بیدار کر سکے - میں تیرے ساتھ چل کر کیا کروں جبکہ میری شاعری مجھ سے گم ہو گئی ہے

(۴)

شعر و موسیقی کی دیوی :-

اے شاعر، آج تو کیوں اس قدر افسردہ ہے - کیا تیرا ملکۂ شعری مضمحل ہو گیا ہے - کیا اب تیرا کوئی خیال موسیقی قبول کر کے تیری زبان سے شعر بن کر نہیں نکلتا - وہ تو مجھے معلوم تھا کہ جبتک میں نہ آؤں گی تو راز دل کسی سے نہ کہے گا دولت تیرے سامنے کیا چیز ہے شہرت کی کیا حقیقت ہے - اچھا اب اس سوگ کو دور کر اور مجھے اپنی آغوش میں لیکر اپنے سینہ کو شاعری سے بھر لے - میرے لبوں کو چوم کر اپنی شاعری میں آلہانہ ترنم پیدا کر لے، ہاں میری آنکھیں چوم لے تاکہ تو اپنے کلام سے لوگوں پر جادو کر سکے لب پر لب ملا لے تاکہ تیری ہر شاعرانہ تخئیل موج بادہ بن کر نکلے -

یہ کہکر دیوی اپنے نازک ہاتھ بڑھائے ہوئے اس کے قریب پہونچی - لیکن شاعر نے اُسے رد کر دیا اور بولا مجھے ایسی آورد کی شاعری درکار نہیں - یہ شاعری تو تیرے سینہ و آغوش تیرے لب و چشم کی ہو گی نہ کہ میرے دل کی جا مجھے پریشان نہ کر کہ آج میری روح کیفیات کے اعتبار سے بالکل تہید ست ہے -

۵

حسن و شباب کی دیوی :-

اے شاعر مجھ سے زیادہ واقف الحال دنیائے شعر کا اور کون ہو سکتا ہے میں جانتی تھی کہ نہ تو دولت کے فریب میں آنے والا ہے نہ شہرت کے سیمیائی وجود مٹنے والا اسی طرح میں اس رمز سے بھی واقف ہوں کہ جب تک حسن کا احساس نہ ہو نہ سچا شعر پیدا ہو سکتا ہے نہ حقیقی، اس لئے اے میرے اچھے شاعر گردن اٹھا، نگاہ اونچی کر اور جنگل کے اس سکون میں اپنی آغوش کو حسن سے بھر لے -

یہ کہکر حسن کی دیوی تمام اُن معطر صباحتوں کے ساتھ جو فردوس ہی کے یاسمن زاروں سے حاصل ہو سکتی ہیں - تمام ان پاکیزہ نزاکتوں کے ساتھ جو کوثر و سلسبیل ہی کی موجوں سے استعارہ ہو سکتی ہیں - تمام ان رنگینیوں کے ساتھ جنھیں صرف بہار جنت ہی پیش کر سکتی ہے - تمام اُن کیفیتوں سرشاریوں اور اداہائے جانستاں کے ساتھ جو صرف نوخیز شباب ہی میں نظر آ سکتی ہیں - لبوں سے شراب ٹپکاتی ہوئی آنکھوں سے جادو جگاتی ہوئی اعضاء میں خواہش سپردگی - جوش جوانی میں التماس فشار اور سینہ کی عریانیوں

دعوت لذاتِ بے اندازہ لئے ہوئے، مدہوشانہ والہانہ، کورانہ، آگے بڑھی تاکہ نوجوان شاعر کے سراپا میں آگ لگا دے، پانی کرکے بہادے۔ اس کی روح کو بیچین کرکے باہر لے آئے، مگر قبل اس کے کہ یہ بجلیاں شاعر کے خرمن ہوش سے اپنا خراج وصول کریں، شاعر نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اُسے روک دیا اور بولا۔

اے دیوی مجھے حسن کی قوتوں کا اعتراف ہے اس لئے تو اُن اداؤں سے کام نہ لے جن سے میں ناآشنا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ میں تجھے دیکھکر کانپنے لگوں، تھرتھرانے لگوں، لیکن میرے جسم کی کپکپی مجھے ہلاک تو کر سکتی ہے، لیکن کسی شعر میں تبدیل نہیں ہوسکتی میری روح افسردہ ہے۔ میرا دل برف سے زیادہ سرد ہے۔ ایسا سرد کہ شاید اب کوئی دنیاوی شعلہ اس میں گرمی پیدا نہیں کرسکتا۔ تو جا اور کہدے کہ شاعر نہیں ملا۔ کیونکہ تیری توہین مجھے گوارا نہیں "

(۶)

شاعر تھک کر سو گیا۔ نیند اس کی روح کو سیر کراتی ہوئی ایشیا کے اس سب سے بڑے جزیرہ نما میں لے گئے جسے وحشی جاہل اور غیر مہذب کہا جاتا ہے۔

رات کا پچھلا پہر ہے اور سارا گانوں سوائے اس حصّہ آبادی کے جسے عورت سے تعبیر کیا جاتا ہے، سو رہا ہے۔ ہر گھر سے چکّی کی غمگین آواز آرہی ہے اور اسی کے ساتھ نرم و سادہ موسیقی معصوم سروں میں کبھی کبھی بلند ہو کر شاعر کی روح کو کسی خاص غور و فکر میں مبتلا کر دیتی ہے۔

صبح کا وقت ہے۔ مرد خشمگیں چہرہ لئے ہوئے اٹھتا ہے اور عورت کو آواز دیتا ہے۔ وہ جو برتن پھیلائے ہوئے انھیں صاف کر رہی ہے۔ اپنے بچوں کا منہ دھلا رہی ہے اپنے انہماک سے نہیں سنتی۔ مرد خونخوارانہ انداز سے آگے بڑھتا ہے اور اس کے نازک جسم کو سخت آزار پہونچاتا ہے وہ خاموشی سے اس ستم کو برداشت کر رہی ہے اور پھر مکان کے ایک گوشہ میں ہاتھوں کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ڈالکر کلائی کا خون پونچھ رہی ہے اور روتی جاتی ہے۔ مرد چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں پر غصہ نکالتا ہے اور انھیں اپنے قوی ہاتھوں کی ضرب سے لہولہان کرکے گھر سے باہر نکالدیتا ہے۔ عورت اپنے جگر کے ٹکڑوں کا یہ حال گھونگھٹ کے اندر ہی اندر کنکھیوں سے دیکھتی جاتی ہے اور خاموش کھڑی کانپ رہی ہے۔ شام کو وہی ظالم مرد کہیں اور گانوں چلا جاتا ہے اور رات کو اس کی وہی مظلوم عورت جب تنہائی میں کچھ گنگناتی ہے تو صرف یہ کہ۔

تجھ بن پیا کچھو نہ سہائے

شاعر جاگ اٹھتا ہے لیکن ایک کراہ کے ساتھ ایک ایسی آہ کے ساتھ جو کبھی اس کے دل سے نہ نکلتی تھی۔ جیوپٹر کے مطربوں اور مغنیوں کے ساز میں نغمہ دوڑنے لگتا ہے لیکن اس درجہ جگر خراش و دلدوز کہ اولمپس کی فضا میں اس سے قبل کبھی نہ گونجا تھا۔ جیوپٹر بیدار ہوتا ہے۔ لیکن ایسی شدید فسردگی لئے ہوئے جو کبھی اس سے پہلے اس پر طاری نہ ہوتی تھی۔ دیویاں جب شاعر کی تلاش میں پھر صحرا کی طرف جاتی ہیں تو اس کو پتھر پر سر رکھے ہوئے اطمینان کی نیند میں مصروف پاتی ہیں۔ مگر اس حال میں کہ اس کا کلیجہ شق نظر آتا ہے اور دل سینہ سے باہر۔

(خاص)

نوبہار

سوسائٹی کے ایک فرد کا فرض

[جناب عظیم الکریم عباسی بی ۔ اے ایڈیٹر "نوبہار" جبلپور]

سوسائٹی کے ایک فرد کے کیا فرائض ہیں؟ یہی سوال ہے جسکے متعلق مندرجہ ذیل سطور میں عرض کرونگا۔ مگر اس سوال پر بحث کرنے سے قبل مختصراً یہ معلوم کرنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی کی ابتدا کب اور کیوں ہوئی۔ کیونکہ اسی کے پردے میں اس کے ایک فرد کے فرائض پوشیدہ ہیں۔

ایک وقت ایسا بھی تھا کہ لوگ "ملکیت" کے لفظ سے بیلے ناآشنا تھے۔ جو شخص جو چیز چاہتا تھا استعمال کرتا تھا۔ سب کو سب چیزوں پر اختیار تھا۔ ہر شخص اپنی قابلیت، ہمت اور طاقت کے بموجب چیزوں کا استعمال کرتا تھا۔ گویا لوگ قدرت کے قانون پر زندگی بسر کرتے تھے اپنے ہمسایوں کا کچھ خیال نہ کرتے تھے۔ مگر رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اور ایک زمانہ وہ آیا کہ لوگوں نے آپس میں اس بات کا فیصلہ کرلیا کہ وہ زمین اور اس کی پیداوار کو آپس میں تقسیم کرلیں اور جو جسکے حصے میں آئے وہ اسے خود اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے جس میں کسی دوسرے شخص کو کسی قسم کا دخل نہ ہوگا۔ اگر کوئی ایسی بات آپڑے جس سے اسکے سکون میں فرق آجائے تو اسکی سوسائٹی کے باقی افراد اسکی مدد کریں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے کچھ قانون بھی بنائے جن پر پابند رہنا ہر ایک کا فرض ہوگیا۔ اس طرح سول سوسائٹی کی ابتدا ہوئی اور لوگ "ہماری ملکیت" "تمہاری ملکیت" کے الفاظ سے روشناس کئے گئے۔ وہ شخص زیادہ مال کا مالک بن بیٹھا جو دوسروں سے زیادہ محنتی، ہوشیار، قابل اور چالاک تھا۔ گویا ملکیت کی بنا محنت پر رکھی گئی۔

سول سوسائٹی نے کسطرح اور کون کون سے قانون بنائے اور انھیں کس طرح جاری کیا؟ کن کن طریقوں پر وہ کمزور اشخاص کو طاقتور لوگوں کے مضبوط شکنجوں سے نجات دلاتے تھے؟ کس طرح انہوں نے دولت حاصل کی؟ ——— یہ ایسے سوالات ہیں جن کے لئے بہت وقت اور وقت کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ باتیں انکے دلوں پر نقش کردی گئی تھیں کہ

(۱) قدرت نے کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا پیدا نہیں کیا۔

(۲) مساوات کا قانون قدرت ہی کی طرف سے جاری کیا گیا ہے

(۳) سول سوسائٹی کی ابتدا تمام لوگوں کے فائدے کے لئے ہوئی۔ کوئی دوسرا مقصد مدنظر نہ تھا۔

(۴) اگر سول سوسائٹی فائدہ کے بجائے نقصان کا باعث ہو تو وہی قدرتی زندگی (جسکا بیان اوپر ہوچکا ہے) بہتر ہے۔

(۵) سول سوسائٹی میں حق اور فرائض کا چولی دامن کا ساتھ ہے اگر کسی کو اسکا حق نہیں ملیگا تو سوسائٹی کیلئے اس پر کوئی فرض نہ ہوگا۔

اسلئے سول سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ہمارا حق کیا ہے کیونکہ ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے حقوق برقرار رکھیں۔ سوسائٹی میں ہمارے حقوق مندرجہ ذیل ہوسکتے ہیں۔

(۱) آزادی سے اپنی زندگی بسر کرنا اور اپنی دولت استعمال کرنا۔

(۲) اپنی جسمانی اور دماغی طاقت کو آزادی سے کام میں لانا اس طرح کہ قانون کے خلاف بھی نہو۔

(۳) قانون سازی میں ہماری شرکت ——— یہی تمام حقوق سے بڑھکر اور ضروری ہے۔ اگر یہ حق ہمیں نہیں ملا تو سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی حق ہمیں نہیں ملا - یہ ہمارا قدرتی حق ہے۔ کیونکہ جب ہم اپنی تمام چیزیں جس میں ہمارا جسم بھی شامل ہے سوسائٹی کی حکومت کے لئے وقف کر دیتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہمیں اسکی قانون سازی میں شریک نہ کیا جائے جنکی پابندی ہر فرد پر فرض ہے۔!

اس حق کا طریقہ ہر ملک میں اور ایک ہی ملک میں مختلف اوقات میں جدا رہا ہے۔ عموماً یہ کیا جاتا ہے کہ مختلف گروہوں میں سے ایک شخص منتخب کر لیا جاتا ہے (انتخاب کرنے والا وہی گروہ ہوتا ہے) یہ شخص اپنے گروہ کا نمایندہ ہوتا ہے اور اسکی جانب سے بحث کرتا ہے۔ جب کسی قانون پر بحث ہوتی ہے تو تمام لوگ ایک ہی رائے قائم نہیں کرتے بلکہ مختلف رائیں پیش کرتے ہیں۔ ان میں وہی رائے تسلیم کی جاتی ہے جس پر سب سے زیادہ لوگوں کو اتفاق ہو۔

اس کام میں ان لوگوں کا کوئی حق نہیں ہوتا جنھوں نے قانون کے خلاف کبھی کوئی بات کی ہو اور جو پاگل ہوتے ہیں وہ بھی اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ایسے لوگ قانون کی نگاہ میں مردہ ہوتے ہیں اور قانون کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ان کے علاوہ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اس میں شرکت کی کوشش کرے یہ ناانصافی ہوگی اگر صرف دولتمند اشخاص ہی اس سے فائدہ اٹھائیں اگر غریبی اور امیری میں امتیاز کیا جائے اس حالت میں بھی مزدور پیشہ لوگوں کو امیروں پر ترجیح دینا چاہئے کیونکہ دولت محنت اور مزدوری کا نتیجہ ہوتی ہے نہ کہ محنت اور مزدوری دولت کا۔ قدرت نے تمام لوگوں کو برابر حقوق دئے ہیں اور قانون کی نگاہ میں بھی ایسا برابر ہونا چاہئے۔ انصاف بھی یہی کہتا ہے۔ لیکن اگر قانون سازی میں صرف ایک ہی گروہ کی شرکت ہو تو کیا ان مساوی حقوق میں فرق نہیں آتا؟ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ دشمن کے خلاف اپنے ملک و قوم کی حفاظت میں حصہ لے اور جس سوسائٹی میں یہ فرض تسلیم نہیں کیا گیا اسکا ملک آزاد نہیں کہا سکتا۔ لیکن یہ کس منہ سے کہا جائیگا کہ اپنے ملک و قوم کی حفاظت میں حصہ لینا ہر شخص کا فرض ہے جب کہ قانون سازی میں کچھ لوگ حصہ لیتے ہیں اور کچھ اس حق سے محروم کر دیئے جائیں؟ اور کس اصول پر مساوی حقوق کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے؟ جس طرح امیروں کے جسم و جان ہوتی ہے اسیطرح غریبوں کی بھی ہوتی ہے۔ اول الذکر کی طرح آخر الذکر کے بھی بال بچے ہوتے ہیں جب انہیں ایذا پہنچائی جاتی ہے تو انکے دل میں بھی درد ہوتا ہے اور آنسو بہتے ہیں۔ کیا اس پر بھی انھیں اس حق سے محروم کر دینا چاہئے اگر ایسی حالت میں کسی مزدور سے لڑائی پر جانے کو کہوگے تو وہ یہ جواب دیگا :- جناب! میں کیوں اپنی جان خطرہ میں ڈالوں -؟ میرے پاس کچھ ملکیت بھی نہیں جسکا مجھے ڈر ہو۔ دشمن میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں جسطرح آج کل رہتا ہوں اسطرح اسوقت بھی رہونگا تم لوگوں کے قبضہ میں ساری زمین ہے۔ تم ہی قانون بناتے ہو اور میرا کچھ خیال نہیں کرتے تم جیسا چاہتے ہو۔ مجھے سزا دیتے ہو۔ تمہارا کہنا ہے کہ چونکہ میرے پاس کچھ ملکیت نہیں اسلئے میں قانون سازی میں شریک نہیں ہو سکتا۔ پھر تم کس بنا پر مجھ سے کہتے ہو کہ تم لڑائی پر جاؤ:— اس کا جواب بجز خاموشی اور شرمندگی کے کیا ہوگا انصاف بھی یہی کہتا ہے کہ وہ کیوں لڑائی پر جائیں کیا قانون اور ملک کی حفاظت کے لئے ——— قانون جس کے بنانے میں انھیں کوئی دخل نہ تھا۔ اور ملک جس کے وہ مالک نہیں؟ کیا یہی انصاف ہے کہ غریبوں کو لڑائی پر جانے کے لئے مجبور کیا جائے۔ تاکہ ملک کی

حفاظت ہو اور بعد میں ان سے کہدیا جائے کہ تم قانون بنانے میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اسلئے کہ تم اس قابل نہیں ہو، تم بدمعاش، کمینہ یا مجرم ہو بلکہ صرف اسلئے کہ تمہارے پاس کچھ ملکیت نہیں؟ جب انکے پاس ملکیت نہیں تو وہ کیوں اپنی جان بلاوجہ خطرہ میں ڈالیں کیا صرف اسوجہ سے انکو انکے قدرتی حق سے محروم کردیا جائے کہ وہ غریب ہیں؟ کیا اچھا مقولہ ہے "غریبوں کو اسوجہ سے حقیر نہ سمجھو کہ وہ غریب ہیں"۔

میرے دوستو، یہی وہ بات ہے جس پر تمہیں ثابت قدم رہنا چاہئے۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو امیروں کی طرفداری کرنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور انکی تعداد ان سے زیادہ ہے جو تباہ شدہ امیروں کی برائیاں [illegible] کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ لیکن تمہارا فرض یہ ہے کہ تم مزدور پیشہ اور غریب لوگوں کی قدر کرو اور انکے حقوق انکو دلاؤ۔ مفلسی کوئی جرم یا گناہ نہیں ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ ان ہی کے افعال کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم انھیں اور زیادہ تکلیف پہنچاؤ یہی انکے لئے کیا کم ہوا ہے۔ دنیا میں ہمیشہ سے غربت کا اثر رہا ہے اور ہمیشہ رہیگا انسان کے وجود کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسکا ایک بہت بڑا حصہ مزدوری کرکے کھائے۔ اسلئے تمہیں ان سے نفرت نہیں کرنا چاہئے۔ ان کی وجہ سے تمہیں فائدہ ہوتا ہے۔ یہ ان ہی کی محنت کا نتیجہ ہے کہ تم لذیذ غذائیں کھاتے ہو آرام سے عالیشان حویلیوں میں رہتے ہو اور عیش کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہو۔ اسلئے تمہارا بھی فرض یہ ہے کہ تم انکے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور انکے حقوق انھیں دلاؤ۔

چنانچہ ہر مہذب سوسائٹی کے فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ مزدور پیشہ لوگوں کے حقوق کا بھی خیال رکھے جیسا کہ تمام بڑی بڑی سوسائٹیوں میں دیکھا جاتا ہے اگر کسی سوسائٹی میں یہ بات نہیں تو اسکا وجود باعث ننگ ہے جو لوگ اپنے اس حق کو بغیر چوں و چرا کئے چھوڑ بیٹھتے ہیں اور غلامی کی زندگی پر اسکو ترجیح دیتے ہیں انکی ہستی ہمیشہ ذلالت کی گہرائیوں میں پڑی سسکتی رہتی ہے۔ وہ صرف اپنے ہی پر نہیں بلکہ اپنی اولاد پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ ایک باپ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تندرستی کا خیال رکھے اور ان کے آرام کے لئے کافی اسباب مہیا کردے۔ لیکن اگر انکی زندگی اس قسم کی غلامی میں بسر ہو تو یہ سازوسامان اور تندرستی کس کام آئیگی

یہ برائیاں اور بداخلاقیاں تمہاری قوم میں بہت کثرت سے پائی جاتی ہیں انکے دفع کرنے کیلئے دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے ـــــ صبر اور استقلال۔ اگر ان بلاؤں سے اپنی قوم کو ہمیشہ کے لئے نجات دلانا چاہتے ہو تو رفتہ رفتہ انکی جڑیں کاٹنا شروع کردو۔ غیر ممکن ہے کہ تم ان کا وجود ایک ہی وار میں نیست و نابود کردو اگر بے صبری سے کام لوگے تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اکثر ہمدردان قوم یہ چاہتے ہیں کہ یہ خرابیاں قلیل عرصہ میں رفع ہو جائیں۔ لیکن جب انھیں اس میں ناکامی ہوتی ہے تو وہ اسکا سارا الزام دوسروں پر رکھتے ہیں اور انھیں نامرد بناتے ہیں۔ کیا ایسے لوگ ملک و قوم کے حقیقی جاں نثار کہلائے جا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ان کے فعل سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام وہ ظاہرا ملک کے لئے کرتے ہیں۔ مگر اس کے پردے میں ان ہی کا فائدہ مدنظر ہوتا ہے۔ اکثر ایسے جاں نثار بھی دیکھے جاتے ہیں جنکے مقصد میں خودغرضی کی بو تو ضرور آتی ہے مگر اتنی نہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ نتیجہ پر جلد پہنچ جائیں اور انکا مقصد جلد بر آئے تاکہ وہ بھی اس سے کچھ فائدہ اٹھالیں۔ لیکن جب ناکام رہتے ہیں تو دوسروں کو اسکے نہ کرسکنے کا ملزم ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ خود بھی نہیں کرسکتے۔ انکے

[بقیہ صفحہ ۸۴۴ پر دیکھئے]

آنریبل جسٹس سر عبدالقادر سرپرست '' ادبی دنیا ''

حکیم سید شمس اللہ قادری ' ایڈیٹر '' تاریخ ''

رائےصاحب صوفی لچھمن پرشاد ' ایڈیٹر '' مستانہ جوگی ''

مسٹر عزیز حسن بقائی ' ایڈیٹر '' پیشوا ''

پروفیسر سید محمد ضامن علي رکن ادارت '' هندوستاني اکیڈمي جرنل ''

مسٹر مرتضیٰ احمد خاں محمد زادي ' ایڈیٹر '' انقلاب ''

مسٹر وحید الدین احمد ' ایڈیٹر '' آئینہ ''

مسٹر سید زوار عباس ' ایڈیٹر '' الٰہ آباد یونیورسٹی اردو ایسوسي ایشن میگزین ''

مسٹر ایم - اے - رحمان ' مالک ' نورجہاں ''

ڈاکٹر پورن سنگھ ہنرانوری ایڈیٹر '' چمن ''

مسٹر جمال صابری ' ایڈیٹر '' علی گڑھ پنچ ''

مسٹر ظفر ہاشمی ' ایڈیٹر '' چمنستان ''

ڈاکٹر سعید احمد ' ایڈیٹر '' کامیابی '

مسٹر عابد قریشی ' ایڈیٹر '' کاروبار ''

مسٹر ذکریا فیاضی ' ایڈیٹر '' علی گڈھ میگزین ''

مسٹر اے ۔ سروری ' ایڈیٹر '' مکتبہ ''

مسٹر یوسف نظامی' ایڈیٹر ''نرگس''

مسٹر سیوراتی بھٹناگر' ایڈیٹر ''پرتاب'' دہلی''

مسٹر اشرف صبوحی' ایڈیٹر ''ارمغان''

مسٹر جمیل بیگ مغطر' رکن ادارت ''جام جہاں نما''

مسٹر منظر صدیقی ایڈیٹر ''ساحر''

مسٹر ایم - عارف ' ایڈیٹر '' ایمل ''

مسٹر امرچند قیس ' ایڈیٹر '' سدرشن ''

مسٹر خبر بہوروی ' ایڈیٹر '' موٹرکار ''

پروفیسر امرناتھ جھا ' ایڈیٹر '' الہ آباد یونیورسٹی میگزین ''

پروفیسر ظفر تاباں ' ایڈیٹر '' ذرۂ عمر '
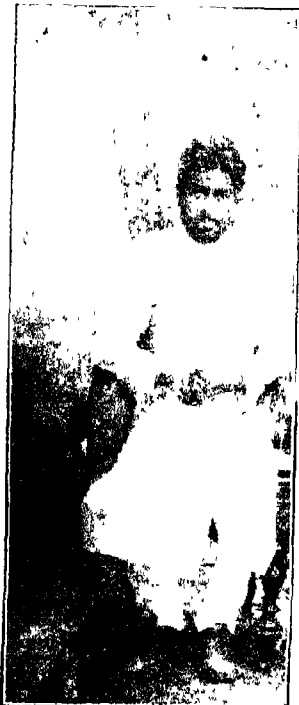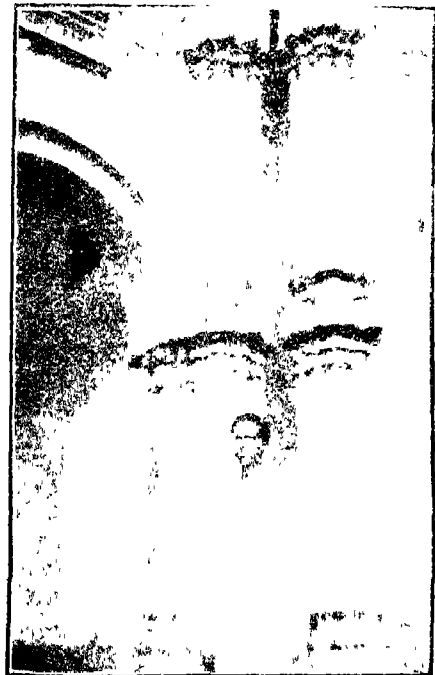
مسٹر لبھو رام جوش ' ایڈیٹر '' رہنمائے تعلیم ''

حکیم آشفتہ صاحب ' ایڈیٹر '' مبصر ''

مسٹر لچھمی چند ودیارتھی، ایڈیٹر ''رہنمائے تعلیم''

مسٹر احمد سعید خاں، ایڈیٹر ''رہبر''

مسٹر امرناتھ سیٹھا، ایڈیٹر ''ونواش''

ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، ایڈیٹر ''انڈین ہسٹاریکل جرنل''

نورجہان

عورتوں کا مستقبل

[جناب میر عزیز الرحمٰن صاحب چیف ایڈیٹر "نورجہاں" لاہور]

خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے سامنے دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک امریکہ، انگلستان، فرانس، اور روس وغیرہ کی زندہ مثالیں موجود ہیں۔ اگر ہم ذرا سی ہوشمندی سے کام لیں تو ہم دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ ہم اس وقت ایک ایسی دہلیز پر کھڑے ہیں جس پر دو دروازے ہیں اور دونوں الگ الگ سمتوں کو لیجاتے ہیں۔ یہ کہ ہم کس دروازہ سے کس راستہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ ہماری عقلمندی یا بیوقوفی پر دال کریگا۔ ان ممالک نے جن کا بیان کیا گیا ہے تعلیم و ترقی نسواں کے مسائل میں پہلے بہت غلطیاں کھائی ہیں۔ لیکن بہت دیر کے بعد انکو اس بات کا احساس ہوا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی معاشری زندگی میں فرق ہونا چاہیئے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ دونوں کو ایک ہی دنیا میں رہنا اور بسنا ہے اور آپس میں ملکر گذارہ کرنا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے اور قدرت کے منشا کا لحاظ رکھا جائے تو ہر ذی ہوش اس امر کا اعتراف کریگا کہ ہر دو کے فرائض جداگانہ اور ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اس لئے یہ لازم آتا ہے کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے نصاب تعلیم اور انکی کتابوں کی غلامانہ تقلید نہ کرنی چاہیئے۔ یقیناً یہ نہایت نامناسب اور غیر موزوں ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کا فیصلہ ایسے امتحانوں کی تیاری پر موقوف ہو۔ جن کے نصاب میں سب نہیں تو بہت کثرت سے ایسے مضامین چھوڑ دیئے گئے جو ہم لوگ لڑکیوں کے پڑھنے کے لئے بہت ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ لڑکیوں کے نصاب تعلیم کا ایک جداگانہ معیار قائم کریں۔ ان کی تعلیم میں امور خانہ داری، قوانین صحت و تندرستی، فنون لطیفہ، زبان دانی جیسے مضامین لازماً ہونا چاہئیں جو انکو سمجھدار بیوی اور قابل ماں بننے میں مدد دیں۔ اور ان کے نظریئے کو بھی وسیع کر سکیں۔ ہماری عورتوں کو اندھی رہنما نہ بننا چاہیئے بلکہ روشنی، ہمت اور امید کی پیامبر بننا چاہیئے۔ تمدن و معاشرتِ قوم میں یہ کام عورت ہی کا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کی اچھی باتوں کو نئی روشنی کی پسندیدہ باتوں میں ملا دے۔ ہمارا مقصد تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جو ایک عورت کو اپنے گھر کے اندر زیادہ مفید طریقے سے اور خوش خوش رہنا سکھلا دے۔ نہ کہ اسے گھر سے باہر نکال دے۔ جو اسے خانگی زندگی کو چھوڑ کر گھر سے باہر رہنے کی زندگی و مشاغل کی ترغیب نہ دے۔

ایک بات اور ہے جو نصاب تعلیم کے مسئلہ سے کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن افسوس ہے کہ اسکا اکثر بلکہ بیشتر زنانہ مدارس میں خیال نہیں رکھا جاتا۔ وہ یہ ہے کہ مدرسے جانیوالی لڑکیوں کو متواتر کئی کئی گھنٹے تک بلا خوراک یا تھوڑی خوراک پر مدرسے میں ٹھیرنا پڑتا ہے۔ جو ان کی صحت کے لئے نہایت مضر ثابت ہو رہا ہے۔ اس معاملہ میں مدرسہ کے اندر سرکاری

[بقیہ صفحہ ۸۴۹ پر دیکھئے]

نوشیروان

ستارۂ صبح

(جناب منشی بلدیو سہائے صاحب صحرائی سُرُوری، سابق ایڈیٹر "نوشیروان" گوجرانوالہ)

"ستارۂ صبح" دامنِ صبح میں پڑا جھلملا رہا ہے ... اسے فلک پر کوئی فرشتہ پیامِ رخصت سُنا رہا ہے
جو انتظامِ نجوم میں ساری رات بیدار رہ چکا تھا ... وداع فرمائے قافلے کو وہ میر بادہ بھی جا رہا ہے
بکھیر کر جس کو کہکشاں نے تجلیٔ شب بنا دیا تھا ... ستارۂ صبح میں سمٹ کر وہ رنگِ محفل سجا رہا ہے
"فلک" کا وہ برق وش مغنی، جسے بہ سوز آرکیف کہئے ... کھڑا ہوا مرکزِ سکوں پہ سحر کے کچھ گیت گا رہا ہے

فضا سکوں سے بھری ہوئی ہے نسیم کی موج مشکبو ہے
چمن کے گوشے بسے ہوئے ہیں نوائے طوطی کی "تو ہی تو" ہے

"ستارۂ صبح" پر نگاہیں جمی ہوئی ہیں مسافروں کی ... مچل رہی ہے اُمنگ بیداریوں کی، پلکوں میں رہروؤں کی
وہ کوئی "آغوشِ شوق" سے اُٹھ کے اپنا برقع اٹھا رہا ہے ... وہ خوش نصیبانِ وصل کے دل پہ پھر چڑھائی ہے ولولوں کی
وہ پھر طلوعِ سحر کی مستی دماغِ عالم پہ چھا رہی ہے ... شکست کے انتظام میں ہیں وہ مستیاں دیر خوابیوں کی
"ستارۂ صبح" کے چمکتے ہی عالمِ نُور پھوٹ نکلا ... ظہور کے طلعتوں کے شانے سے زلف سلجھائی ظلمتوں کی

سحر عروسِ "صبح" کی طرح سواد اُڑوں سے آ رہی ہے!
کرن کرن مسکرا رہی ہے، سہاگ کے گیت گا رہی ہے

مری سُن اے صبح کے ستارے کہ اک چراغِ سحر ہوں میں بھی ... تری طرح محفلِ جہاں سے ارادہ کوشِ سفر ہوں میں بھی
وہ انجمن جس پہ کیف کا انحصار تھا لُٹ لُٹا چکی ہے ... تری طرح منتظر کسی کا سرِ رہگذر ہوں میں بھی
ہوں منتظر جلد "صبح" آئے، مجھے پیامِ اجل سنائے ... حواس کھو چکے ہیں میرے خمار سے منتشر ہوں میں بھی
فنا کی بے کیفیوں سے میرا بدل چکا ہے نظامِ ہستی ... اگرچہ تیری طرح "سوادِ حیات" پر جلوہ گر ہوں میں بھی

ہے میری تیری اب ایک حالت، اگر ہے کچھ فرق تو یہی ہے!
کہ تیری آنکھوں میں "نیند" ہے تو، مری نگاہوں میں "موت" بھی ہے

ٹھہر ٹھہر صبح کے ستارے! کہ میں ہوں پا در رکاب گویا ... محیطِ ان زندگی کی بیداریوں میں ہوں مثلِ خواب گویا
ادھر کھلی آنکھ، اُدھر جو دیکھا تو ختم تھی زندگی کی مستی ... کہ تھا بہار دنگی بے وفا ایک رات میرا شباب گویا
ارے کہیں مضطرب نہ کر دے مجھے یہ تیرا خرامِ تنہا ... سمجھ رہا ہوں کہ میرے ہی دل پہ ہو رہا ہے عذاب گویا
ٹھہر! کہ آویزشِ مجازی سے دامن اپنا ذرا چھڑا لوں ... پھر ایک نغمہ کی طرح چھیڑونگا تیرا تارِ رکاب گویا

"فلک" پہ اے "صبح" کے ستارے ابھی نہ ہرگز خموش ہونا
کہ ہے ترے ساتھ ہی مجھے بھی جہان سے چہرہ پوش ہونا

(خاص)

نیرنگ

شہید وطن

[جناب پروفیسر اکبر حیدری ایم آر اے ایس (لندن) نگران ترتیب رسالہ "نیرنگ" دہلی]

اک گل افسردہ فرش خاک پر تھا محو خواب — جب مری نظروں پڑیں اس منظر غمناک پر
کانپ اٹھا میرے پہلو میں دل پر اضطراب — اُف گل سرسبد و صحن چمن کی خاک پر

خواب کے ذروں میں خوابیدہ تھی اب بے تجمل
آہ! یہ انجام رعنائی یہ ہستی کا مآل

میں نے اس گل کو اٹھا کر رکھ لیا آغوش میں — میری آنکھیں اشک خونابہ فشاں سے بھر گئیں
کچھ سکوں پیدا ہوا مرے دل پرجوش میں — آنسوؤں کی چند بوندیں کام اپنا کر گئیں

دامن گل میں سمایا اشک خونابہ فشاں
جاگ اٹھیں از سر نو پھول کی سب پتیاں

موت کے آغوش میں اک زندگی پیدا ہوئی — رنگ گل جو زرد تھا اب ارغوانی ہو گیا
دیکھتے ہی دیکھتے پژمردگی جاتی رہی — از سر نو وہ فنا آغوش منظر ہو گیا

جاگ اٹھا خواب راحت سے جہان رنگ و بو
اور مجھ سے اس طرح گویا ہوا جوشش نمو

اے مآل اندیش شاعر اے امین زندگی — تو نے کیوں اس خواب راحت سے اٹھایا ہی مجھے
مضمحل کرتی ہے تجھ کو کیوں مری افسردگی — تیرے اشک خونفشاں نے کیوں جگایا ہی مجھے

زندگی بھر دی ہے کیوں میرے دل خاموش میں
تو نے مجھ کو کیوں اٹھا کر رکھ لیا آغوش میں

کیا سناؤں میں تجھے اب اپنی رو داد حیات — کیا بتاؤں کیا تھا میری زندگی کا مدعا
آب و گل میں جلوہ گر تھی زندگی بے ثبات — رنگ و بو تھے میرے ہر انداز میں جلوہ نما

خود نمائی کی مرے دل میں مگر خواہش نہ تھی
خود پرستی کی مری فطرت میں گنجائش نہ تھی

میں امانت دار حق تھا حق پرستی کے لئے — منتظر تھی بزم گلشن مجھ سے ہر ایثار کی
میں نے دنیا کو دکھائے رنگ و بو کے معجزے — میں نے اپنے خون سے نشو و نمائے خار کی

میری نکہت سے معطر ہو گئی بزم نسیم
میں نے صحن باغ میں ہر سمت پھیلا دی شمیم

میری ہستی وقف ہے صحن چمن کے واسطے — میں فنا ہو کر سماؤں گا چمن کی خاک میں
جان دی میں نے مگر اپنے وطن کے واسطے — زندگی پیدا کروں گا میں وطن کی خاک میں

آب و گل میں جذب ہو کر گل کھلاؤں گا ابھی
ذرے ذرے میں مرے پنہاں ہے روح زندگی

الوداع اب اے مآل اندیش شاعر الوداع! — اہل دنیا کو سنا جا کر ذرا میرا پیام
زندگی بیکار ہے بے سود ہے ہر اجتماع — قلب انساں میں نہ ہو جب تک وطن کا احترام

خدمت خاک وطن انساں کا پہلا فرض ہے
جان دیکر جو ادا ہوتا ہے یہ وہ قرض ہے

دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھول پھر مرجھا گیا — میرے احساسات میں پیدا ہوئے حب وطن
زندگی کا فلسفہ میری سمجھ میں آ گیا — اب مری نظروں میں تھا بدلا ہوا رنگ چمن

میں نے آہستہ سے اس گل کو زمیں پر رکھ دیا
یعنی جس جا سے اٹھایا تھا وہیں پر رکھ دیا (خاص)

بہار زندگی

[مولانا خضر رحمانی ایڈیٹر رسالہ "نیرنگ" دہلی]

اے دل درد آشنا! اے راز دار زندگی — زندگی سے ہے بری گویا بہار زندگی
پھر دل پر شوق ہے منت گذار زندگی — پھر مجسم ہے کسی کا راز دار زندگی
لغزشوں سے بچ کے چل ذرہ رہ رہرو راہ حیات — گلستاں سمجھا ہے جسے خار زار زندگی
لالہ و گل سے غرض کیا بامراد زیست کو — موت کی آنکھوں سے دیکھیگا بہار زندگی
اے خوشا وہ دل کہ جس کا مدعا کوئی نہیں — نے نثار آرزو ہے کامگار زندگی
جس جھلک سے ذرہ ہائے طور کو لرزش ہوئی — دل اسی پرتو سے ہے آئینہ دار زندگی
دل گرانبار امانت تھا ازل سے ہمنشیں — کیا تعجب گر اٹھایا اس نے بار زندگی
دیدۂ خونبار کی اللہ رے گلکاریاں — دامن صد چاک ہے یا لالہ زار زندگی
ایک انگڑائی میں مرگ و زیست کے عقدے کھلے — ہو گئی آساں گرانی خمار زندگی
رفتہ رفتہ ہو گیا تبدیل آئین حیات — مٹتے مٹتے مٹ گئے نقش و نگار زندگی
عرصۂ فانی سے جاتا ہوں سوئے راہ بقا — دور ہو فطرت کے دامن سے غبار زندگی

زندگی ہے اک کشاکش ہستی موہوم کی
موت ہی بنتی ہے عشرت پردہ دار زندگی (خاص)

نیرنگ خیال

دنیا کی سب سے پہلی ایجاد

(جناب حکیم محمد یوسف حسن چیف ایڈیٹر رسالہ نیرنگ خیال لاہور)

آہ زمانہ جس کو تاریخی کتب میں لوہے کا زمانہ کہتے ہیں۔ جبکہ آدم کی اولاد پتھروں کے آلات سے تدریجی ترقی کرتی ہوئی لوہے کی اشیا بنانے لگی تھی۔ انسان اپنی قوت لایموت کے لئے جنگلوں میں جاکر جانوروں کو پتھر مار کر شکار نہیں کھیلتا تھا بلکہ لوہے کی ایک لمبی اور موٹی سلاخ سے کام لینے لگا تھا جس کو وہ کبھی لکڑی میں گاڑ لیتا اور کبھی ایسے ہی کندھے پر اٹھائے پھرتا تھا۔

ان دنوں بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کا وجود نہ تھا بلکہ جنگل کے قریب اور پانی کے کنارے منتشر طور پر دس دس بیس بیس جھونپڑیاں دیکھی جاتی تھیں۔ دریاؤں سے مچھلی اور پانی آسانی سے مل سکتا تھا جنگلوں سے پھل پھول پتے اور شکار کے قابل جانور بہ افراد ملتے تھے۔ اس لئے انسانوں کا ڈیرا ایسے ہی مقامات پر رہا ہوتا تھا۔ جہاں یہ اشیا وافر تعداد میں مل سکتی ہوں۔

بحیرہ خضر کے قریب ایک گنجان جنگل کے کنارے پہاڑی کے دامن میں چند جھونپڑیاں تھیں چاروں طرف سبزہ لہک رہا تھا۔ سبزہ سے ڈھکی ہوئی پہاڑی دور سے ایک زمردین مہرہ معلوم ہوتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے بحیرہ خضر میں آ کر گرتی تھیں۔ کہیں آبشار تھے کہیں چشمے تھے۔ انسان اور حیوان آزادی سے دوڑتے پھرتے تھے۔

ایک دن جبکہ آسمان پر بادل جھوم جھوم کر جمع ہو رہے تھے ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا شگفتگی اور زندگی پھیلا رہی تھی۔ ان جھونپڑیوں سے ایک نوجوان باہر نکلا۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے چھوٹی چھوٹی مونچھیں سرخ و سپید چہرہ پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ بازو کھلے ہوئے تھے چھاتی اور پشت پر چیتے کی کھال کا ایک ٹکڑا اس انداز سے لپٹا ہوا تھا کہ دور سے ایک آتشیں کرتا معلوم ہوتا تھا۔ کمر میں ایک موٹا رسہ لپیٹے ہوئے تھا جس میں لوہے کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لٹک رہے تھے جو شاید ہی چھری کی طرح کاٹنے کے کام آتے ہیں۔ کمر کے نیچے ایک موٹا سا کپڑا گھٹنوں تک پہنے ہوئے تھا۔ لیکن پنڈلیاں برہنہ تھیں۔ اور پاؤں میں اس سے بنی ہوئی تھی۔

نوجوان کے ہاتھ میں تین انچ "دنی" اور ڈیڑھ گز لمبی لوہے کی سلاخ تھی۔ جو عصا کا کام دے رہی تھی۔ اس نے سر کو اونچا کر کے قدرت کے ان مناظر پر ایک مالکانہ حیثیت سے نگاہ ڈالی جو اس کے گرد و پیش پھیلے ہوئے تھے۔ وہ آسمان پر جمع ہونے والے بادلوں کو دیکھ کر زیر لب مسکرایا اس نے لوہے کی سلاخ کو ایک دو بار ہوا میں گھمایا اور پھر کچھ سوچ کر بے پروائی سے سامنے کی پہاڑیوں کی طرف چل دیا۔

پہاڑی کے نیچے پہنچ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ گویا کسی کی تلاش و جستجو میں ہے۔ اس نے وحشیانہ انداز میں دو تین دفعہ چیخ کر "دشی" "دشی" پکارا لیکن جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ ناامید ہو کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

کہ وہ کسی کے انتظار میں ہے۔

بادل کی گرج۔ بجلی کی چمک اور ننھی ننھی بوندوں کی پھوار اس کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکی۔ وہ بالکل خاموش ایک بت کیطرح چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہ ایک پتھر اس کی لپٹ پر لگا۔ وہ محویت سے چونک پڑا اور اس نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔

سر کوہ ایک نوجوان حسینہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے سفید سفید دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دئے گویا نوجوانوں کو وہیں سے اپنی آغوش میں کھینچ لینا چاہتی ہے۔ "باغاز"

باغاز نے کہا ادشی! ادشی فرط مسرت سے ناچنے لگی اور باغاز جلدی جلدی چٹانوں کو پھاندتا ہوا پہاڑی پر چڑھنے لگا یہاں تک کہ باغاز ادشی کی آغوش میں تھا۔

ادشی "میری محبت! تم دیر سے کیوں آئے؟"

باغاز "تم دیر سے آئی ہو۔ جب بکریاں گھر واپس آتی ہیں اور میں دودھ کرا مان کے آگے رکھتا ہوں تو پھر تمہارے پاس آنے کا وقت ہوجاتا ہے۔ اور میں اس جگہ پہونچ جاتا ہوں میں نہیں تم دیر سے آتی ہو"

ادشی "وہ کیوں۔ جب ابا گوشت بھون کر ہمیں کھلاتے ہیں تو میں بھی کھا کر فوراً تمہارے پاس چلی آتی ہوں"

اس کے بعد وہ پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ عورت ایک لمبا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ بازو اور پنڈلیوں کا کچھ حصہ ننگا تھا۔ پاؤں برہنہ تھے۔ ہاتھ میں باغاز کی طرح لوہے کی ایک سلاخ تھی۔ ادشی آگے آگے اور باغاز اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ جب ادشی باغاز کا ہاتھ تھام لیتی اور اس کو کسی بڑی چٹان کے پھاندنے میں امداد دیتی تو باغاز اظہار تشکر میں اس کا منہ چوم لیتا۔ اس وقت ادشی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے محبت کے شعلے نکلنے لگتے۔ وہ باغاز کو بغل میں لیکر زور سے دباتی۔ اس کے بالوں۔ اس کی پیشانی اور ہاتھوں پر بوسے دیتی تھی۔

وہ ایک چشمے کے کنارے پہونچے جس کا ... پانی دونوں نے پیا۔ ادشی ایک درخت سے شہتوت توڑ کر لائی اور باغاز کو پیش ... اس کے بعد ... چشمے میں پاؤں لٹکا کر دونوں بیٹھ گئے اور پیار محبت کی باتیں کرنے لگے۔

باغاز "تم میرے ساتھ شادی کب کروگی؟"

ادشی "جب کوئی تحفہ میرے لئے لاؤگے"

باغاز "میں تمہارے شایاں شان تحفہ لاؤں گا"

دونوں آدھ گھنٹہ تک چشمہ کے کنارے بیٹھے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ اور جب رات کی تاریکی اُن کو جدا کرنے لگی تو ادشی نے باغاز کے بالوں اور ہاتھوں پر بوسے دئے اور اپنی لوہے کی سلاخ کو اسکی سلاخ پر اس زور سے مارا کہ چنگاریاں نکلنے لگی۔ اُس نے اُسے شادی کا تحفہ جلد لانے کی تاکید کی۔

باغاز سر جھکائے ہوئے اپنی جھونپڑی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ادشی کو کونسا تحفہ نظر کرے جس سے وہ خوش ہوکر اُس سے شادی کرے۔ وہ پہاڑی چٹانوں اور کھنڈروں سے گذر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک سفید چمکیلی چیز پر پڑی۔ اس نے اٹھا کر دیکھا وہ چاندی کی تھی۔ اس نے کہا اوہو سفید لوہا اس سے بہتر اور کیا تحفہ ہوسکتا ہے وہ فرط مسرت سے اچھل پڑا اور رات بھر اُسے اس خیال سے نیند آئی کہ وہ صبح اس نرم اور سفید لوہے کا تار کھینچکر اپنی محبوبہ کی انگلیوں پر لپیٹے گا۔

دوسرا دن اُسے ... سفید لوہے کے صاف کرنے میں صرف کرنا پڑا اور ادشی کے پاس جانے سے قبل اس نے ایک موٹا تار

تیار کر لیا جس کو اپنی انگلی کے گرد لپیٹ کر اپنے ایک گول چھلا سا بنا لیا۔

وہ دونوں حسب معمول پہاڑی کے دامن میں ملے۔ اوشی اُسے پہاڑی کی چوٹی پر لے گئی جہاں اس نے بہت سے پھل جمع کر رکھے تھے جو باغاز اور اوشی نے ملکر کھائے۔ جب پیار و محبت کی باتیں ہونے لگیں تو باغاز نے فرطِ مسرت سے بیتاب ہو کر کہا میں شادی کا تحفہ لایا ہوں۔

اوشی تعجب اور مسرت سے باغاز کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس سے لپٹ گئی اور پھر ہاتھ پکڑ کر مستانہ وار رقص کرنے لگی۔ اُس نے باغاز کا منہ چوم کر کہا۔ "لاؤ میرا تحفہ"

باغاز نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چاندی کا چھلا نکالا اور پیش کیا۔ اوشی کا چہرہ جو خوشی و مسرت سے سرخ ہو رہا تھا زرد ہو گیا۔ اس نے چھلے کو دو چار بار الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا "یہ لوہا ہے یہ برص آلود بیمار لوہا۔ میں اور یہ تحفہ۔ نہیں میں اسے قبول نہیں کر سکتی۔" اور اس نے چھلے کو پھینک دیا۔

باغاز کی آنکھیں چھلے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ جو صرف باغاز سے سنی تھی چھلا پہاڑی پتھروں پر سے لڑھکتا گردشیں کرتا اور چکر کاٹتا ہوا پہاڑی کے دامن میں کسی غار میں جا گرا۔ باغاز ٹکٹکی باندھے ہوئے اس چھلے کو دیکھ رہا تھا۔ اوشی غصّہ بھری نگاہوں سے باغاز کو دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔

دنیا باغاز کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی۔ وہ بت بنا بیٹھا تھا۔ اگر اُسے کوئی چیز نظر آ رہی تھی تو صرف لڑھکتا اور چکر کاٹتا ہوا چاندی کا چھلا۔

حیثان پر خدا جانے وہ کتنا عرصہ بیٹھا رہا۔ کس وقت اٹھا اور گھر گیا۔ لیکن جب اس کے اوسان بجا ہوئے تو وہ جھونپڑی میں لیٹا ہوا تھا۔ کل کے واقعہ کی یاد ابھی اس کے دماغ میں تازہ تھی۔

وہ اپنی ناکامی پر دل کھول کھولکر رویا۔ اور آنسوؤں نے جب دن کی روشنی کو دھندلا کر دیا تو اس جھلملاہٹ میں بھی اُسے چاندی کا چھلا لڑھکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

سارا دن اسی سوچ بچار میں گذر گیا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے آج وہ اوشی سے ملنے بھی نہیں گیا اور اپنی جھونپڑی کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

غروب آفتاب کے وقت ہی وہ اپنی جھونپڑی میں جا کر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی اُسے نیند آ گئی۔ لیکن پریشان خواب رات بھر اسے تکلیف دیتے رہے وہ دیکھتا تھا کہ چھلا پہاڑی پتھروں پر سے لڑھکتا اور گردشیں کاٹتا ہوا گزر رہا ہے۔ خواب میں چھلے کا جسم اس قدر بڑھ گیا کہ وہ اسے ایک خالی کیا ہوا چاند معلوم ہونے لگا۔ کبھی وہ اس ہالے کی شکل اختیار کر لیتا جو چاند کے گرد دیکھا جاتا ہے۔ اور جس سے قدیم زمانہ میں بارش کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ کبھی وہ دیکھتا کہ اس چھلے پر اوشی اور باغاز دونوں بیٹھے ہوئے لڑھک رہے ہیں آپس میں ہنستے ہیں اور کھیلتے ہیں۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ آسمان پر زرد ستارہ چمک رہا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اس کی طبعیت میں ایک ولولہ اور جوش سا پیدا ہوا اس نے کہا اگر اتنا بڑا چھلا بن سکے جس پر بیٹھ کر اوشی اور باغاز دونوں پہاڑی سے لڑھکا کریں تو اس تحفہ کو اوشی ضرور قبول کر لیگی۔ واقعی ایک ننھا سا برص آلود چھلا اوشی کی توہین تھی۔

کئی دن رات کی محنت شاقہ کے بعد باغاز نے لوہے کا ایک بہت بڑا چھلا تیار کیا۔ یہ ایک موٹی سلاخ تھی جس کو گول بنا لیا گیا تھا بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے لکڑی کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر چھلے کے اندر لگائے اور لوہے کی سلاخ میں بڑے بڑے چھید لگائے۔ پھر ان چھیدوں میں سے لکڑی کے ٹکڑے گذار کر اس

بڑے پہلے کے درمیان سب کو ایک مرکز پر ملا دیا۔ اور اس مرکز سے اس نے دو ٹکڑے دائیں بائیں نکالے۔ پھر لڑھکانے سے یہ بڑا اچھلا لڑھکنے اور چکر کاٹنے لگا اور بیٹھنے کی جگہ بھی مل گئی۔

ہر روز باغاز اُسے لڑھکاتا ہوا باہر لیجاتا تھا۔ لیکن اس کو اس طرح میں کامیابی نہ ہوتی تھی کہ اس کے اوپر بیٹھکر اسے لڑھکا سکے۔ ایکدن وہ اس کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ دور سے اوشی نے باغاز کو اس عجیب آلہ کے ساتھ کھیلتے دیکھا۔ اس نے چلا کر اُسے ٹھہرنے کو کہا اور خود دوڑی ہوئی باغاز کے پاس آئی۔ وہ اس ایجاد کو دیکھکر بہت خوش ہوئی وہ اس کے ساتھ کھیلتی رہی۔ وہ اس کو لڑھکاتی رہی اور باغاز سے پوچھتی تھی کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ باغاز نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم اور میں دونوں اس پر بیٹھ کر لڑھکیں۔

اوشی سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے اچھل کر کہا اگر ایک ایسا آلہ اور بناؤ تو دونوں کو بیک بار لڑھکانے سے تمہارا مطلب حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک مہینہ کی محنت شاقہ کے بعد باغاز نے دوسرا پہیہ (Wheel) بنایا اور اوشی نے دونوں کو ایک لکڑی سے جوڑ دیا۔ اب یہ آلہ گھومتا تو تھا لیکن گھسٹتا ضرور تھا۔ کبھی باغاز اوپر بیٹھتا تو اوشی ڈھکیلتی تھی اور کبھی اوشی بیٹھتی اور باغاز اسے کھینچتا تھا۔ اوشی نے دنیا کی سب سے بڑی اور پہلی ایجاد کا نام پہیہ رکھا۔

باغاز نے کہا یہ میری ایجاد ہے اور میں تمہیں تحفہ دیتا ہوں۔

اوشی نے کہا کہ اس ایجاد میں نصف حصہ میرا ہے۔ عورت اور مرد دنیا میں انسانی زندگی کے دو پہیے ہیں۔ اسی طرح اس پہیہ کی ایجاد میں بھی نصف کام تمہارا اور نصف میرا ہے۔ میں تمہارے تحفہ کو قبول کرتی ہوں اور بقیہ نصف حصہ کو تمہیں بطور تحفہ پیش کرتی ہوں۔

دوسرے دن جب دونوں اس پہیہ گاڑی پر بیٹھکر کھیلتے اور گھومتے تھے تو گرد و نواح کی جھونپڑیوں کے تمام انسان جمع ہو گئے۔ انھوں نے دونوں کو مبارکباد دی۔ اور سب لوگوں نے انھیں سجدہ کیا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے آگے بڑھکر باغاز کو "کرا" کا خطاب دیا۔ اور آئندہ کے لئے اس کا نام کرا باغاز قرار پایا۔ گاؤں والوں نے اُسے ایک خچر انعام دیا۔ جس کو دو رسوں کے ساتھ اس دو پہیہ گاڑی میں باندھا گیا۔ جو آہستہ آہستہ اوشی اور کرا باغاز کو کھینچتا ہوا اس کے مکان تک لے گیا۔ جس کے آگے عورتیں مرد اور بچے ناچ رہے تھے۔ یہ دنیا کا پہلا پہیہ اور پہلی گاڑی تھی جو ایک کامیاب طبیعت کی ایجاد تھی۔ آج اس پہیے کی ارتقائی تاریخ نے عہد حاضرہ کی تہذیب و تمدن کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ اور دنیا کا ہر متمدن ملک اور اس کا ہر ترقی پذیر کام اس پہیہ کا مرہون منت ہے۔ (خاص)

[بقیہ صفحہ ۸۲۳]

خرچ اور لڑکیوں کے والدین کی شمولیت سے کھانا یا ناشتے کا کچھ ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ پڑھائی اور مدرسہ میں حاضری کے گھنٹوں کے درمیان ناشتہ کا وقفہ رکھا جائے جس میں سب لڑکیوں کو کوئی ایسی خوراک یا ناشتہ دیا جائے۔ جو ان کے قویٰ کو قوت بخشے اور ان کے دل و دماغ کو تر و تازہ رکھ سکے۔ ہم دیکھ رہے ہیں ان کی گڑھے دار آنکھیں پچکے ہوئے رخسار اور مرجھائے ہوئے چہرے ملک کی آئندہ نسل کی صحت کے ضامن نہیں ہو سکتے۔

امید ہے وہ حضرات جن کے ہاتھ میں اسوقت محکمۂ تعلیم کی باگیں ہیں اور قوم و ملک کے وہ افراد جو تعلیم و ترقی نسواں کے حامی ہیں ان امور پر توجہ دیں گے اور اپنے پورے پورے رسوخ و اثر سے کام لیکر ان مقاصد کے حاصل کرنیکی سعی فرمائینگے۔ (خاص)

نئی روشنی

جوہر شرافت اور انتقام

(جناب حسرت لکھنوی ایڈیٹر "نئی روشنی" دہلی)

جمیل اپنے ڈرائنگ روم میں پھنسا ہوا کسی خاص مسئلہ پر غور کر رہا ہے اور اس کے اضطراب و حرکات سے صاف نمایاں ہے کہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے۔ کبھی خود بخود بڑبڑاتا ہے کبھی اس کے دست و پا چشم و ابرو میں اضطراری جنبش پیدا ہوتی ہے۔ آخر میں اس نے خط لکھنے کا پیڈ اٹھایا اور تھوڑی دیر تک قلم کو ہونٹوں میں دبائے رکھنے کے بعد حسب ذیل خط لکھا۔

بدرہ! خوش رہو! تم شاید جمیل کی ہمدردی سے توقع رکھتی ہوگی کہ وہ تمہارے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے گا۔ اور شاید جمیل کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو تمہارے خیال کی تصدیق ہو جاتی۔ لیکن تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ جمیل کے پہلو میں شریف دل ہے جو اس کی ہر وقت رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ وہ ہرگز ایسا مشورہ نہیں دے سکتا جس پر غیر شریفانہ یا ننگ انسانیت فعل کا اطلاق ہو سکے۔ دیکھو بدرہ تمہاری ضد نادانی پر مبنی ہے میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ تم جس قدر خوبصورت ہو۔ تعلیم یافتہ ہو۔ ایک معزز خاندان کی رکن ناموس ہو معاف کرنا۔ اسی قدر نا عاقبت اندیش۔ اور نسوانی اعلیٰ صفات سے بے پروا ہو۔ تم کو اپنے مستقبل۔ اپنی پوزیشن پر غور کرنا چاہئے

چند منٹوں میں یہ خط ملفوف کیا گیا۔ چھوٹن چھوکرے کو دیگر ہدایت کی کہ یہ خط کسی کے سامنے نہیں تنہائی میں بدرہ کو دیدو۔ ایک گھنٹہ نہ گذرا ہوگا کہ وہی چھوکرا خوبصورت لفافے میں بند خط محو خیال جمیل کے روبرو میز پر رکھ کے اُلٹے پاؤں کمرہ سے باہر چلا گیا۔

جمیل کی محویت کم ہوئی تو اس کی نظر لفافہ پر پڑی فوراً کھول کے پڑھا جس کے عنوان کی ہیبت سے لرز گیا۔

چیلنج

مدعی شرافت جمیل

تمہاری سلامتی چاہنے کے بعد آج مجھے چند سطروں میں اپنے تمام جذبات کی تفسیر کرنا ہے جس کے لئے خود بھی بیتاب ہوں تاکہ تمہارے واسطے انتباہ ہو۔ سب سے پہلے تو یہ کہنا ہے کہ تمہارے پہلو میں یا تو دل نہیں اور اگر ہے تو کیف بادہ الفت سے خالی اس لئے کہ نسوانی خودداری کو خیرباد کرکے میں نے جس کے حسن و جمال کے تم خود بھی قائل ہو اور بار ہا کہہ چکے کہ اگر موقع ملتا تو میں پرستش کرتا) واردات قلب کا اظہار کیا ہے انھیں بیدردی سے ٹھکرایا ہی نہیں بلکہ ناصحانہ روش اختیار کی اور میرے جذبہ نسوانی کو غیرت دلائی میں نہایت صفائی سے کہتی ہوں کہ تم کو اپنے بیدار کی شکست کا مستقبل قریب میں اعتراف کرنا پڑے گا۔ میں اپنی توہین پر صبر نہیں کر سکتی میرے محسوسات انتقام پر برابر اُبھار رہے ہیں۔

(بدرہ)

جمیل کے مضطرب دل پر اس خط کے ہر فقرہ کی وہ کاری

قرب پڑی کہ صابر و جابر ہونے کے باوجود اس کے منہ سے آہ
نکل گئی۔ اس خط کو لفافہ میں بند کر کے جیب میں رکھا۔ اور ڈرائینگ
روم سے نکل کے کوٹھی کے سامنے والی طولانی سڑک پر بے قصد
وارادہ چل کھڑا ہوا۔

اس کی محویت اس وقت تک کم نہ ہوئی جب تک اُسے
دریا کی مستانہ رو لہروں کے دیوار قلعہ سے ٹکرانے کی نغمہ خیز
صدا اس کے کانوں میں نہ آئی۔ شام کا وقت قریب تھا۔ طیور
آشیانوں کی طرف جانے میں عاجل اور سورج کی سنہری شعاعیں
مست خرام لہروں پر طلائی چادر بچھائے ہوئے ہیں۔

یہ سہانا اور جاذب نظر منظر اس کی توجہ اپنی طرف منعطف
نہ کر سکا اور وہ بے تکلف ریت کے قدرتی فرش پر بیٹھ کے اپنی
خیالی الجھن کی ادھیڑ بن میں مصروف ہو گیا۔ شام ہوئی رفتہ رفتہ
رات کی تاریکی بڑھنے لگی۔ جمیل کو کچھ ہوش کہ خود فراموشی کے
عالم میں کہاں بیٹھا ہے۔ قریب و بعید کے سلسلہ وار بولنے والے
مینڈک اگرچہ زمین کو سر پر اٹھائے ہوئے تھے اور ایک ہنگامہ
ان کی بے سُری اور بے تکی آوازوں سے برپا تھا۔ مگر جمیل کے
نزدیک ایک سکوت تھا کہ وہ سکون قلب سے پوری توجہ کے
ساتھ ذہنی مسئلہ پر دل ہی دل میں بحث کر رہا تھا۔

نصف سے زیادہ رات گذر چکی مگر جمیل کی محویت میں کوئی
تغیر نہیں ہوا اور شائد رات بھر گذر جاتی۔ ناگاہ ٹورچ لائٹ
کی شفاف اور تیز روشنی اس کے چہرہ پر اس طرح پڑی کہ نیم باز
آنکھوں میں شعائیں سما گئیں۔ اب اس نے سر اٹھایا اور آنکھیں
کھول کے بغور دیکھا۔ روشنی غائب ہو چکی تھی کسی قدر فاصلہ پر
ہنسنے کی چند خفیف آوازیں اس کے کانوں میں آئیں۔ اور
تاریکی میں بہت غور کرنے پر میدان نیز تاروں کی ہلکی روشنی
دو تین سیاہ سائے متحرک نظر آئے۔ جمیل نے لاحول پڑھی اور
خود بخود کہا! یہ میرا وہم ہے۔ ورنہ یہاں اسوقت کون ہو سکتا
ہے (آسمان کی طرف دیکھ کر) نصف شب متجاوز ہو چکی۔ اور نہ
ساری رات گذر جائے۔ دفعتاً پھر اس کے چہرہ پر لائٹ پڑی
کہ اس کی آنکھیں چوندھا گئیں مگر دوسرے سکنڈ میں کچھ نہ تھا
اب جمیل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور معاً اسے خیال آیا کہ جس جگہ
میں بیٹھا ہوں گھاٹ ہے۔ قریب ہی کہیں مسان ہوگا۔ ممکن ہے
ارواح خبیثہ مجھے تنہا دیکھ کے دق کرنا چاہتی ہوں۔

جمیل نے اس خیال کو دل سے نکالا چاہا مگر نہ نکلا وہ مضبوط
اور جری ہونے کے باوجود وہم میں گرفتار ہو گیا۔ اس کے خیال
کی تبدیلی کے ساتھ حواسوں میں بھی اختلال پڑ چکا تھا۔ اسلئے
اپنے مقام سے اٹھا اور جس طرف سے روشنی آئی تھی۔ سیاہ
مجسمے متحرک نظر آئے۔ اس نے چاہا کہ راستہ کترائے نکل
جائے۔ مگر وہ متحرک ہیکل خطوط متوازی کی طرح اُس کے ساتھ تھے
جمیل نے کچھ سورتیں اور آئتیں پڑھ کے اپنے اوپر دم کیں اور
رفتار تیز کر دی۔

جب ایک بڑی کوٹھی کی پشت پر پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ
متحرک سیاہ مجسمے اب اُس کی طرف نظر نہیں آتے۔ اس نے خیال کیا کہ
یقیناً خبیث روحیں تھیں جو آبادی کے قریب پہونچ کے واپس
گئیں۔ ٹورچ لائٹ کو وہ اگیا بیتال کا کرشمہ سمجھا۔

کوٹھی کے صدر دروازہ سے کوئی پچاس قدم کے فاصلہ
پر ایک عظیم الشان پیپل کا درخت تھا۔ اس کے نیچے روشنی
دیکھ کے جمیل نے اپنی رفتار اور سست کر دی اور بھوت
پلید کا خیال اس کے دل سے بالکل دور ہو چکا ہے۔ اس نے
دیکھا کہ ایک حسین و جمیل دوشیزہ پیپل کی تھالی میں پوجے کا

سامان رکھے ہوئے پیپل کی جڑ کے پاس بیٹھی ہے اور نہایت آزادمندانہ و معصومانہ انداز سے کچھ پھول پڑھا رہی ہے۔

جمیل اسی جگہ ٹھٹکا تھا کہ اُس مہ جبین حور پیکر نے بڑی بڑی شرمیلی اور خوبصورت آنکھوں سے جمیل کی طرف دیکھا اس کی بے گناہ نگاہوں میں صباکے ساتھ شوخی اور دلبری کا بھی شائبہ تھا۔ جمیل جھجکا اور چاہا کہ قدم بڑھائے۔

نازنین نے اپنی ترنم خیز آواز میں کہا! خدا کے نیک بندے اگر شہر کی طرف جانے کا ارادہ ہے تو میں بھی ساتھ ساتھ چلوں گی آنے کو تو آگئی اور بڑی دیر سے اس سوچ میں تھی کہ واپس کیونکر جاؤں گی۔ شکر ہے کہ تم کو فرشتہ بنا کے بھیجدیا گیا۔ کیا ایک بیکس عورت کے ساتھ آپ اتنی ہمدردی کریں گے۔

جمیل نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ بڑی خوشی سے اس میں میرا کیا نقصان ہے چلیے۔

"ذرا ٹھہر جائیے میں پوجا سے فراغت کرلوں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ اور صرف ہوں گے۔

حسین پوجارن حشر سامان خرام و فتنہ پیما انداز سے تھالی کاندھے پر رکھ کے جس پر چومکہ دیا روشن تھا۔ جمیل کے پاس سے گذری اور جمیل کے قامت زیبا پر ایک غلط انداز نظر ڈالی تو جمیل اس کے رعب حسن سے کانپ گیا۔

تھوڑی دور چل کے جب کہ آبادی کے کنارے پر دونوں راہرو پہونچ گئے حسینہ نے کہا۔ بس اب آپ جا سکتے ہیں یہاں سے میرا غریب خانہ قریب ہے۔ معاف کیجئے گا آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔

"جمیل حسن و جمال کی دیوی مجھے کیوں شرمندہ کرتی ہے میں نے تو کوئی خدمت ہی نہیں کی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اسوقت مجھے کس کی ہمروہی کا فخر حاصل ہے حسینہ نے مسکرا کے کہا۔ ایک دردمند عورت کے ساتھ جس کو آپ کی ہمدردی کی ضرورت تھی۔ اس نوجوان بھولے اور طرحدار جوان اپنے دین و مذہب کا واسطہ کوئی ایسی یادگار نہ چھوڑ جو میرے دل کو صدمہ پہونچائیں۔ آہ مجھ بدبخت میں نہ ایسے جذبات ہیں نہ کشش یہ تو آپ ہی کے خس کی گہرائیت ہے کہ حسن وخاشاک دل کھنچے جاتے ہیں۔ تبسم کے ساتھ نگاہیں نیچی کرکے۔ کیا ایک مجہول و نامعلوم عورت کے جذبات کا آپ احترام کرنیکو تیار ہیں۔ جمیل نے جواب دیا جہاں تک شرافت اجازت دے گی اے معصوم حسن امید کہ معصیت کی دعوت مجھے نہ دیجائے گی۔ اچھا تو رخصت! یہ کہہ کر وہ حسین عورت قریب کی گلی میں بجلی کی طرح کوندھ کے چلی گئی۔ جمیل فوراً بڑھا کہ دیکھے کس مکان میں جاتی ہے۔ مگر اس کوشش میں ناکام رہا۔

بنگلہ پر پہونچ کے جمیل نے سلیپنگ سوٹ پہنا اور مسہری پر لیٹ کے گذشتہ واقعہ پر غور کرنے لگا۔ اس پر غنودگی سی طاری تھی کہ کمرہ میں کسی کے آنے کی ہلکی چاپ معلوم ہوئی اس نے آنکھیں نہیں کھولیں بلکہ کان لگا دئے بڈلیمپ کی خفیف روشنی اور کامل سکوت تھا لیکن چاپ کا احساس برابر ہورہا تھا جمیل نے گوشہ چشم سے دیکھا تو خوبصورت پجارن کا ہوبہو نقشہ نظر آیا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا اور اسے گمان ہوا کہ کوئی دروازہ کی طرف گیا۔ دروازہ پر گیا تو کوئی نہ تھا۔ لاحول کرکے پھر مسہری پر دراز ہوگیا۔ اپنے سرہانے خفیف تنفس کا اس کے کانوں کو ادراک ہوا اور معاً بستر پر اُٹھ بیٹھا اسی لمحہ میں ایک نازک ہاتھ اس کے نتھنوں سے مس ہوا اور پھر تھرا کے اپنے بستر پر گر پڑا۔

جمیل دو ماہ کی شدید علالت کے بعد آج اس قابل ہوا ہے کہ اٹھ کے بیٹھا اور گذشتہ واقعات پر غور کرنا چاہا مگر یادداشت اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ کچھ نہ یاد آیا البتہ پجارن کی تصویر اس کی چشم تصور کے سامنے تھی۔

مولوی وکیل احمد صاحب جمیل کے والد کمرہ میں آئے یہ نہایت کامیاب وکیل تھے اور جمیل ان کا اکلوتا بیٹا تھا بی۔اے پاس کرنے کے بعد اس نے اپنے آبائی پیشہ کی طرف توجہ کی اور امتحان دے چکا تھا ہنوز نتیجہ کا انتظار تھا کہ بیمار ہوگیا۔

بیٹا جمیل تم امتحان میں کامیاب ہوگئے۔ اور شکر ہے کہ خدا نے صحت بھی دی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں تمہارے فرض سے ادا ہو جاؤں۔ بدرہ خاتون میرے بھائی کی نشانی اور تمہاری دیکھی ہوئی تمام صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ لڑکی ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ موزوں اور مناسب جوڑ ناممکن ہے۔ اگر تم کو کوئی عذر ہو تو صاف صاف کہہ دو۔

جمیل نے خاموش ہو کے سر جھکا لیا۔ گویا رضامندی کی دلیل تھی۔ ایک ہفتہ کے بعد مسٹر جمیل احمد اور بدرہ خاتون کا شرعی عقد ہوگیا۔ دعوت ولیمہ شان سے عمل میں آئی جس میں ردزہ اقارب احباب اور روساء امراء سب ہی شامل تھے۔

جمیل جبکہ عروسی میں داخل ہوا تو بجائے بنی سنوری حسین دولھن بدرہ کے اس نے دیکھا خوبصورت پجارن اُسی لباس میں پیتل کی تھالی پر چومک روشن کیے گھونگھٹ نکالے عروس کی مسہری کے پاس استادہ ہے۔ جمیل کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور دریا کے کنارے سے بنگلہ پہونچنے تک کے تمام واقعات سامنے آگئے۔ اُس نے اُلٹے پاؤں پلٹنا چاہا لیکن پجارن نے گھونگھٹ کے اندر سے اس کے کیفیات کا مشاہدہ کر لیا اور برق لرزیدہ کی طرح جست کرکے جمیل کے پاس پہونچ گئی۔ وہ لرز گیا اور قریب تھا کہ منہ سے چیخ نکل جائے لیکن پجارن نے گھونگھٹ الٹا تو بدرہ کا چاند سا چہرہ دکھائی دیا۔ اوہ۔ فریب دھوکا جمیل کے منہ سے نکلا۔ اور انتقام، انتقام بدرہ کی زبان سے نکلا اس کے بعد دونوں ہم آغوش ہوگئے

(عاصی)

(بقیہ صفحہ ۴۲۲)

جاں نثاروں کا ایک گروہ ہوتا ہے جو ان دونوں سے بڑھ چڑھ کے ہوتا ہے۔ اگر اس قسم کے جاں نثار اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں تو ان کی دلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اُن کا ملک ہمیشہ غلامی کے شکنجے میں پھنسا رہے۔ وہ دوسرے کے ہاتھوں سے آزاد ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی ناکامی کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ اُن میں نہ تو اس کام کی قابلیت ہی ہوتی ہے نہ صلاحیت، مگر اُن کا خود غرض دل یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ اُن کا ملک آزاد ہو، اور اُن کی نالائقی دوسروں پر ظاہر ہو جائے۔ اس قسم کے لوگ نفرت کے قابل ہیں مندرجہ بالا تینوں قسم کے جاں نثار ہمارے ملک میں کثرت سے ملینگے۔ حقیقی جاں نثار وہی ہوتے ہیں جو اپنا کام صبر و استقلال کے ساتھ کرتے جاتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی کوششوں کا زریں نتیجہ اگر وہ نہ دیکھ سکیں تو کوئی مضائقہ نہیں آئندہ آنے والی نسلیں دیکھ لینگی۔ فتح ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے۔ یہ قصہ بہت مشہور ہے کہ ایک ضعیف مالی کھجور کا درخت اپنے باغ میں لگا رہا تھا کسی نے اُس سے دریافت کیا: "تم کیوں اسکے لگانے کی تکلیف کر رہے ہو۔ کیونکہ تم بہت جلد مر جاؤگے اور اس کا پھل نہیں کھا سکوگے": اس نے جواب دیا: "کوئی مضائقہ نہیں اگر میں نہیں کھا سکونگا تو میرے بچے تو کھائینگے"۔ یہی اُصول ان جاں نثاروں کے مدِنظر ہوتا ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسی ہستیاں ہمارے یہاں بہت کم ہیں +

(خاص)

ہمایوں

خیالات

(جناب میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا - ایڈیٹر "ہمایوں" لاہور)

اپنا رہبر بنوں آپ - لیکن اس تھکے ماندے مسافر کو کبھی
آرام لینے دوں اور پھر کبھی اُسے چل لینے دوں جدھر بھی چلے -

میں جو اس کا رہبر آج بنا مجھے کیا معلوم کیسی مشکلیں ہیں جن سے یہ پہنچا یہاں تک - اس میں کیا کچھ کمزوریاں تھیں - پھر رستے کی کوفت ہمراہیوں کا مزاج واقعات حادثات اور اس کی محدود قوتیں کن کن سے اسے واسطہ پڑا اور اس پر کیا کچھ گذری - اس کے دل نے اس کے جسم پر اس کے جسم نے اس کے دماغ پر کیا کیا مہربانیاں کیا کیا ظلم کئے - مجھے جو آج اس کا رہبر بنتا ہوں مجھے کیا معلوم دنیا کی زندگی میں یہ سب کچھ رنگینیوں کے ڈورے پھینکے جاتے ہیں - دنیا والوں پر کہ جو انھیں تھام لیں وہ اوپر کو اوپر ہی اوپر چڑھے جائیں - ان کی زندگی عام زندگی سے بلند و بالا ہوتی جائے - وہ معمولی باتوں کے اندر غیر معمولی کی جھلک دیکھ پائیں اور روز بروز دیکھتے رہیں —— یوں میں اپنے آپ کا رہبر تو بنوں ضرور ہی لیکن اسے اور اس کے کام کو اور اس کے میدان کو اور اس کی لغزشوں کو بھی نیچا اور ادنیٰ نہ سمجھ لوں اس کو حقارت اور نفرت سے نہ دیکھوں بلکہ محبت کی عینک خود اور اسے بھی لگا کر مشقت کی گھاٹیوں میں سے مسرت کے پھولوں کے بیچوں بیچ عین اُن آسمانی چشموں کے پاس سے ہوتے ہوئے نت نئی زندگیوں کے وہ نظارے خود بھی دیکھوں اور اسے بھی دکھاؤں جو ہر موڑ پر دیکھنے والوں کے لئے یوں بے تاب میں اپنے سکون کے اندر بھی جیسے کوئی شرمیلی پاک دامن اپنے اُس والہ و شیدا کے لئے جس کی زندگی عبارت ہو سچی محبت اور سچی خدمت اور سچی مسرت ہے - (خاص)

صبح

(جناب منصور احمد صاحب جائنٹ ایڈیٹر "ہمایوں" لاہور)

عبدالسمیع آج کی اُس پرانی کوٹھی کے پاس ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا تھا جو روز بروز اب کھنڈر ہوتی جا رہی تھی - اس کی نگاہیں اس پکی سڑک پر جمی ہوئی تھیں - جو حسن آغا کی جاگیر سے ہو کر ریلوے سٹیشن تک گئی تھی - اور جس کے دونوں طرف ببول کے درختوں کی دو سیدھی قطاریں دور تک عجیب بہار دکھا رہی تھیں - سڑک پر بچے اپنے مویشی ہانکے لئے جا رہے تھے - مرد بچے کندھوں پر ڈالے گزر رہے تھے اور عورتیں خاموشی سے اپنے کندھوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں عبدالسمیع کی آنکھیں ان لوگوں میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں -

یکایک اس کا چہرہ ایک پرمسرت مسکراہٹ سے جگمگا اٹھا اور اس کے خوبصورت ہموار سفید دانت نظر آنے لگے - وہ اٹھ بیٹھا اس کا قد کیسا بلند اس کا جسم کتنا سڈول اور اس کا چہرہ کتنا خوبصورت تھا - اس نے کمر کے گرد ایک ڈوری اتنی کس کر باندھ رکھی تھی کہ اس کا بے آب و رنگ لباس کھنچ کر اونچا ہو گیا تھا اور اس کے بڑے بڑے ٹخنے اور موٹی ٹانگیں نظر آنے لگی تھیں اس نے

پکار کر کہا۔

صبحہ...... صبحہ...... اری صبحہ!..... یہاں آؤ۔"

ایک لڑکی نے مڑ کر اس طرف دیکھا جس طرف سے آواز آ رہی تھی۔ عبدالسمیع کو دیکھتے ہی اس نے پہچان لیا۔ ایک شیریں تبسم اس کے ہونٹوں پر دوڑ گیا۔ جسے اُس نے جھٹ اپنے نقاب میں چھپا لیا۔ وہ اپنے گدھے کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ جس کی پشت پر دو خالی ٹوکریاں رہتی تھیں۔ صبحہ نے ایک پتلی سی چھڑی سے دو تین دفعہ اُسے مارا جس سے گدھا اس کا مطلب سمجھ کر فوراً گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبدالسمیع کو نصف راستے میں جا ملنے کے لئے وہ سڑک چھوڑ کر ایک ٹوٹی پھوٹی پگڈنڈی پر ہو لی۔ جو ایک چھوٹی سی نہر کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ اپنی خاموش طبیعت اور ضبط شدید کے باوجود اس کے جذبات بے قابو ہو رہے تھے۔ اُس نے اُن کو چھپانے کے لئے نقاب سے اپنا منہ بالکل ڈھانپ لیا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچ گئی تو دونوں پھر تاج کی پرانی کوٹھی کی طرف چل دئے۔ بڑے پتھر کے پاس پہونچکر وہ ٹھہر گئے عبدالسمیع نے اپنا سر متفکرانہ انداز سے جھکا لیا۔ جیسے وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ہے اس کا چہرہ مغموم سا نظر آ رہا تھا۔ آخر کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

"صبحہ" میں نے کئی دن سے تمہیں حسن آغا کے گھر میں نہیں دیکھا۔ کیا تمہاری کسی سے لڑائی ہو گئی ہے یا کسی اور وجہ سے تم نہیں آئیں جو مجھے معلوم نہیں۔

صبحہ نے چہرے سے نقاب اٹھا دیا اور مضطربانہ اپنے لباس کو توڑنے مروڑنے لگی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے عبدالسمیع کھڑا اس کے روح پرور حسن سے اپنی آنکھوں کی تشنگی فرو کر رہا تھا۔ وہ ایک صاف دل لڑکی تھی ہوشیار۔ مخلص اور اس کے افعال و اطوار کی کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ اعتقاد میں پختہ تھی اور اپنے نفس پر اُسے پورا اعتماد تھا۔ عبدالسمیع کو وہ حسن آغا کے ہاں سے جاننے لگی تھی جہاں وہ نوکر تھی وہیں عبدالسمیع بھی ملازم تھا اور حسن آغا کو اس پر بڑا اعتبار تھا وہیں یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ ایک دوسرے سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ ان پر انگلیاں اٹھنے لگی تھیں لڑکی کے رشتہ داروں نے اس بات کا تذکرہ لڑکی کے باپ سے کر دیا۔

صبحہ کا باپ عبدالسمیع کا رتبہ اپنی لڑکی سے بہت کم سمجھتا تھا اس کی نگاہ گاؤں کے رئیس کے لڑکے پر تھی جو ایک باحیثیت نوجوان تھا۔ امیر اور خوش پوش جو اس کی لڑکی کو پسند کرتا تھا اور اس نے اپنی بیوی بنانے کے عوض اس کے باپ کو تیس پونڈ ادا کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس کے مقابلے میں عبدالسمیع کی محبت بہت بڑی توہین تھی اور جب اُس نے صبحہ کے باپ کو اپنے لئے پیغام دیا تو اُسے سختی سے جواب دے دیا گیا اور یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر وہ پھر اُن کے ہاں آئے گا تو اُسے بُری طرح گھر سے نکال دیا جائے گا۔

عبدالسمیع اس سلوک سے شرمندہ اور مغموم ہو کر اپنے آقا کے گھر واپس چلا گیا۔ لیکن اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اس واقعے کے متعلق ایک لفظ بھی صبحہ سے نہ کہے گا۔ اور کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے وہ صبحہ کی محبت کو اپنے دل سے جدا نہ کرے گا۔

عبدالسمیع کو ہر شخص شریف اور دیانتدار خیال کرتا تھا اور اس کا آقا اُس پہ بڑا مہربان تھا۔

صبحہ دیر تک خاموش رہی۔ آخر عبدالسمیع نے محبت آمیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

صبحہ تم بیمار تھیں؟...... اور تم اپنے کام پر کب واپس آؤ گی۔

صبیحہ نے غم اور افسوس کے انداز میں زمین کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

اب میں حسن آغا کے ہاں اپنے کام پر واپس نہیں آؤں گی۔

یہ الفاظ سن کر عبدالسمیع کی آنکھیں غصے سے سُرخ ہو گئیں اور اس نے درشت اور کرخت لہجے میں کہا۔

"اچھا! اب تم حسن آغا کے ہاں نہیں آؤ گی؟ یہ کس نے کہا؟"

"میرے باپ نے!"

کیوں؟

اس لئے کہ اُسے ہماری محبت کا علم ہو گیا ہے۔

اور اسی لئے وہ ہمیں جدا کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں" ہمیشہ کے لئے

"ناممکن!"

"ناممکن کیسے؟ اور ......"

یکایک وہ خاموش ہو گئی۔

عبدالسمیع نے قیافے سے اس کی بات معلوم کر لی اور غضب آمیز آواز میں بولا۔ صبیحہ شرماؤ نہیں اور جس بات کو تم چھپانے کی کوشش کر رہی ہو اُسے کہہ ڈالو۔ کہہ ڈالو کہ تمہاری نسبت کسی کے لڑکے سے ہو گئی ہے ..... لیکن میں تم سے قسم کھا کر کہتا ہوں

اُسے اپنا گلا گھٹتا ہوا معلوم ہوا۔ اس کی آنکھیں شعلے کی طرح سرخ ہو گئیں اور اس کی رگیں ڈوری کی طرح نمودار ہو گئیں۔ اس نے اپنے گلے کی خشکی کو نگلتے ہوئے بھاری آواز میں کہا"

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ شادی کبھی نہ ہو گی۔ ... کبھی نہیں، کبھی نہیں ... جب تک میں زندہ ہوں تم میرے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتیں"

یہ پہلا موقع تھا کہ صبیحہ نے عبدالسمیع کو ایسے درشت لہجے میں بولتے اور ایسی وحشیانہ صورت بنائے دیکھا تھا۔ وہ سخت ڈر گئی اور اس نے اسی وقت اپنی آنکھیں اس کی طرف سے پھیر لیں ..... کیا یہ وہی عبدالسمیع تھا۔ وہی خاموش صابر و شاکر انسان جس نے آج تک اپنی زندگی نہایت امن و صلح سے گزاری تھی اور کبھی کسی سے لڑا جھگڑا نہ تھا؟

عبدالسمیع بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا اور اس طرح کانپ رہا تھا جیسے اُسے سخت بخار چڑھ رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب یہ کیفیت گزر گئی اور وہ اپنے آپ میں آگیا تو صبیحہ نے آہستہ اور نرم آواز میں کہا۔

عبدالسمیع تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ ..... کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنے باپ کی نافرمانی کروں؟ ...... میں ایسی بات کیونکر کر سکتی ہوں؟"

اس نے جواب دیا" پھر یہ کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ "صبیحہ"

لڑکی ایک لمحہ کے لئے خاموش رہی پھر یکایک آنسو اُس کی آنکھوں سے بہنے لگے جن کو دیکھ کر عبدالسمیع کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے دل میں کسی نے چھری چبھو دی ہے۔ اب اس کی آنکھوں سے غصے کے بجائے رحم ٹپک رہا ہے۔ اس نے بڑھ کر صبیحہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ دونوں پرانی کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ وہاں صبیحہ کو اس نے گھاس کے ایک تودے پر بٹھا دیا اور اس کے آنسو خشک کئے۔ پھر پشیمانی کے لہجے میں کہنے لگا۔

صبو رو و نہیں۔ تمہارے یہ آنسو میرے دل میں سوراخ کر رہے ہیں۔ مجھے تمہاری محبت کا یقین ہے۔ لیکن کسی اور سے تمہاری نسبت کا خیال میرے لئے ناقابل برداشت ہے اور ایسے

توڑنے کے لئے میں وہ سب کچھ کر گزروں گا جو میری طاقت میں ہے۔ میں تمہارے باپ سے ملوں گا اور اُسے اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ مجھے قبول کرے گا... یقیناً... یقیناً

صبحہ نے سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے جب اُس نے کہا۔ تم خالی خولی محبت پیش کر کے اُسے کس طرح راضی کر لوگے۔ کیا تم نے ایک دفعہ کہہ کر جواب صاف نہیں لے لیا؟ اور کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری اس کارروائی کا علم نہیں؟

عبدالسمیع کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ہجوم جذبات نے اُس کا گلا بند کر دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ حیران کھڑا رہا۔ کبھی اس کی آنکھیں امید کی روشنی سے چمک اٹھتی تھیں اور کبھی مایوسی کے اندھیرے سے تاریک ہو جاتی تھیں۔ آخر نامعلوم طریقے سے اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔

لیکن اس دفعہ میرے پاس ذرائع موجود ہیں۔"

کیا ذرائع ہیں"

عبدالسمیع نے ذرا سے تامل اور خاموشی کے بعد چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور پھر صبحہ کے کان میں کہا۔

میں نے مہر کی رقم فراہم کر لی ہے۔

صبحہ نے آستین سے اپنی آنکھیں اور اپنی ناک خشک کی اس کا چہرہ ایک شگفتہ تبسم سے جگمگا اٹھا۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

عبدالسمیع سچ کہو...... تم مہر ادا کر سکو گے....

تیس پونڈ؟

ہاں وہ میری جیب میں ہیں...... تمہیں دکھا دوں؟ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے نوٹوں کا ایک پلندہ نکالا اور لرزتے ہوئے ہاتھوں اور کانپتی ہوئی زبان سے اُن کو گننے لگا جب وہ اُن کو گن چکا تو اس نے صبحہ کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کہا۔"

یہ سب تمہارے ہیں۔ صبحہ تمہارا مہر جو میں تمہارے باپ کو دوں گا۔ ان کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھو.... لو.... لو"

وہ اُس کو نوٹ اپنے ہاتھوں میں لینے پر مجبور کرتا رہا لیکن صبحہ بے حس و حرکت کھڑی رہی یکایک اس کا تبسم غائب ہو گیا اور اس کی آنکھیں متفکر نظر آنے لگیں۔ اس نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ تم نے اتنی بڑی رقم کہاں سے لی؟ سب جانتے ہیں کہ تم بہت غریب ہو۔

یہ ایک ٹیڑھا دلیرانہ اور غیر متوقع سوال تھا۔ جس نے عبدالسمیع کو حد درجہ برہم کر دیا۔ اس کی بھویں تن گئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے غصے کے لہجے میں کہا۔ تمہیں اس سے کیا کہ میں نے یہ رقم کہاں سے لی۔ یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ کیا تمہارے اطمینان کے لئے یہ کافی نہیں کہ میں اس پر قابض ہوں؟ یہ نوٹ میرے ہیں اور میں ان کو تمہارے مہر کے طور پر تمہارے باپ کے حوالے کر دوں گا۔

صبحہ اُسی طرح سوچ میں ڈوبی ہوئی بولی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔

تمہارے باپ مویشی بھی تو نہیں جن کو بیچ کر تم نے یہ روپیہ حاصل کیا ہو۔ نہ تمہارے کوئی رشتہ دار ہیں جنہوں نے تمہیں قرض دیا ہو۔ باقی رہا آقا وہ اتنا فیاض تو ہے نہیں کہ تمہیں تمہاری تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ دے۔

صبحہ کا چہرہ یکایک مرجھا گیا۔ خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی وہ آگے بڑھی دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

نہیں تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے ...... ناممکن.. لیکن تم کانپ کیوں رہے ہو؟" پھر یکایک حقیقت کو پا کر وہ چلائی۔ یہ نوٹ تمہارے نہیں ہیں .... انھیں چھوڑ دو۔ یہ حسن آغا کے ہیں۔ وہی تیس پونڈ جو چند دن گزرے اس کے گھر سے چوری ہو گئے تھے۔

یہ سن کر عبدالسمیع کا چہرہ اتر گیا اور اُس نے غصہ میں آ کر کہا۔" تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟...... میں چور ہوں۔ تم مجھ پر چوری کا الزام لگاتی ہو۔"

پھر تم نے اتنی بڑی رقم کہاں سے لی؟"

عبدالسمیع نے ہکلاتے ہوئے چند الفاظ کہے جو بالکل سمجھے نہ جا سکے۔ ایک کریہہ اور وحشیانہ کیفیت اس کے چہرے پر چھا گئی جس کے نیچے صبیحہ کو شرم اور پشیمانی صاف نظر آ رہی تھیں۔ عبدالسمیع کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں یا ناکامی اور ذلت کے آنسوؤں سے اُس وقت صبیحہ کے سامنے ایک کمزور و ناتواں عورت کے سامنے سرکش مرد کی شکست کامل کا نقشہ تھا۔ وہ اب اس سے ڈرتی نہ تھی بلکہ رحم کی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دئے اور اُسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے کہا۔

عبدالسمیع مجھ سے خفا نہ ہو۔ مجھے تم سے محبت ہے اور تمہاری بہتری اور خوشی کی خواہش ہے۔ یہ رقم اس کے مالک کو واپس دے دو۔ ایسے روپئے پر خدا کی لعنت ہوتی ہے اور وہ کبھی خیر و برکت کا موجب نہیں ہوتا۔ تم ضرور اسے واپس کر دو اور خدا تمہارا یہ قصور معاف کر دے گا۔ عبدالسمیع ضرور تم ایک نیک آدمی ہو اور ہر شخص تمہیں راست باز اور امانت دار سمجھتا ہے۔ اپنی شہرت کو داغ مت لگاؤ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم یہ رقم چپکے سے اس کے مالک تک پہنچا دو گے۔

صبیحہ رونے لگی اور اپنے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا کر اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ میں ہرگز ہرگز چوری کا روپیہ اپنے مہر میں قبول نہ کروں گی۔ خدا ہماری شادی کو کبھی مبارک نہ کرے گا۔ میں ایسی چیز ہرگز قبول نہ کروں گی۔

عبدالسمیع نے اس کے قریب ہو کر جوش سے کہا۔ اور میں بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تمہیں مجھ سے جدا کر دیا جائے، اور یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تم کسی دوسرے شخص کی بیوی بنو یہی وجہ ہے کہ میں نے ایسا گناہ کیا اور اپنے آقا اور محسن کی چوری کی۔ یہ بالکل سچ ہے کہ میں نے چوری کی اور میں ایسا کرنے میں حق بجانب تھا۔ میں ایک غریب اور بے یار و مددگار انسان ہوں۔ اور میرا رقیب امیر اور طاقتور ہے وہ یقیناً کامیاب ہوگا اور مجھے ہزیمت اٹھانی پڑے گی۔ بتاؤ اور وہ کون سا حربہ ہے جس سے میں اُس کے ساتھ برد آزما ہو سکتا ہوں؟ تم تصور بھی نہیں کر سکتی کہ میرا اس وقت کیا حال ہوا جب میں نے اس کے ساتھ تمہاری نسبت کے متعلق سنا میں قریب قریب پاگل ہو گیا اور تمام رات میں نے اپنے گھر کے دروازے کے سامنے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔

یکایک یہ خیال میرے دل میں آیا میں نہیں جانتا کہاں سے شاید شیطان میرے کان میں کچھ پھونک رہا تھا۔ وہ اس معاملہ میں بڑا اچھا مشیر ثابت ہوا۔ کیونکہ اس نے مجھے تمہارے حصول کا طریقہ بتا دیا اُسی وقت مجھ کو یاد آیا کہ دو دن ہوئے حسن آغا کو اس کی جاگیر کے ایک حصے کی آمدنی سے پچاس پونڈ وصول ہوئے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ

رقم ابھی اس پیٹی ہی میں پڑی ہے جو اس کے کمرے میں رکھی رہتی ہے اسی وقت میں اٹھ کھڑا ہوا میں نے اپنے آپ سے کہا۔ تیس پونڈ کی میرے آقا کے آگے کیا حقیقت ہے جس کا بیشمار روپیہ بنک میں جمع ہے اور جو غریب کسانوں سے بے اندازہ سود وصول کرتا ہے۔ لیکن میرے لئے یہ رقم بڑی اہمیت رکھتی ہے میری خوشی کا انحصار ہی اس پر ہے۔ اس طرح میں نے یہ چوری کی صبحہ میں نے یہ سب کچھ تمہارے لئے کیا۔ مجھے معاف کر دو جیسا کہ مجھے امید ہے کہ خدا بھی مجھے معاف کر دے گا جس کے آگے میں توبہ کروں گا اور دعا کروں گا کہ وہ میرے اس گناہ عظیم کو بخش دے جو میری عمر بھر کا ایک ہی گناہ ہے۔

صبحہ رو رو کر اس کی باتیں سنتی رہی۔ پھر یکایک اس کو عبدالسمیع کا گرم سانس اپنے چہرے کے قریب پہنچتا ہوا معلوم ہوا۔ یہاں تک کہ اس کے ہونٹ اس کے رخسار سے چھونے لگے عبدالسمیع نے نوٹ اس کے ہاتھ میں دینے کی کوشش کرتے ہوئے بدلی ہوئی اور خوف زدہ آواز میں کہا۔

صبحہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارا پرستار ہوں میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں تمہارے بغیر زندہ رہوں۔ تم میری روح ہو۔ تم میری آنکھوں کا نور ہو۔ اور تم میرے دل کی مسرت ہو۔ صبحہ یہ نوٹ لے لو اور ان کا جو چاہے کرو۔ ان کو لے لو۔

یہ کہہ کر اس نے اُسے چوم لیا۔ صبحہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ اسی وقت نوٹوں کا پلندہ بھی اس کے ہاتھوں سے چھوا جس نے اُن کو آگ کے شعلے کی طرح بھڑکا دیا۔ وہ چیخ مار کر جلدی سے پرے ہٹ گئی اور کہنے لگی۔

مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اور اُس وقت تک ہرگز میرے قریب آنے کی جرأت نہ کرو جب تک تمہاری یہ موجودہ حالت قائم ہے۔ اس وقت مجھے تمہارا دیکھنا بھی ناگوار ہے۔ یہ نوٹ جا کر اپنے آقا کو دے دو۔ اگر تم پھر ان کو میرے ہاتھوں میں دینے کی کوشش کرو گے تو میں ان کو پھاڑ کر پرزہ پرزہ کر دوں گی۔ ابھی یہاں سے چلے جاؤ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں فوراً چلا کر لوگوں کو مدد کے لئے بلا لوں گی۔

اس وقت صبحہ کے سامنے غریب اور مسکین عبدالسمیع نہ تھا بلکہ اس سے ایک بالکل مختلف آدمی وہ آدمی جسے اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا جو اس وحشی درندے سے مشابہ تھا جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خون ابل رہا ہو۔ اور جس کے سُرخ چہرے سے شعلے برس رہے ہوں۔ یکایک اس نے اس فوری اور خوفناک تبدیلی کا مظاہرہ شروع کر دیا جو اس کی روح میں واقع ہو چکی تھی۔ اس نے اُس کی تقریر کا ایک لفظ بھی نہ سمجھا اور نیم شعوری حالت میں اس کی طرف بڑھتا گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ بھی پیچھے ہٹتی گئی۔ صبحہ نے مدد کے لئے پکارنے کو منہ کھولا مگر معاً اس نے اپنے آپ کو ایک وحشی آغوش میں جکڑا ہوا پایا۔

دونوں میں بڑی کشمکش ہوئی آخر صبحہ نے خیال کیا کہ اب وہ مغلوب ہو چلی ہے۔ بار بار وہ مدد کے لئے چلانے لگتی لیکن بار بار عبدالسمیع کا ہاتھ اُس کی پکار کو روک دیتا پھر بھی کبھی کبھی اُس کی زبان سے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور جملے ادا ہو جاتے وہ کہتی مجھے چھوڑ دو...... میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں.... میں تم سے نفرت کرتی ہوں ...... مجھے تم سے گھن آتی ہے۔

جس کا جواب وہ بڑے کرخت اور ظالمانہ لہجے میں دیتا۔

"تم کسی دوسرے شخص کی نہیں ہو سکتیں تم میری ہو......

مجھے تم سے محبت ہے ...... اور تمہیں مجھ سے محبت کرنی ہوگی...
مجھ سے !!

آخر صبحہ ایک ایسی زور کی چیخ مارنے میں کامیاب ہوگئی۔ جس سے ساری کوٹھی گونج اُٹھی۔ خوف زدہ عبدالسمیع نے سمجھا کہ ایک لمحہ میں ہر طرف سے مدد آپہنچے گی۔ اور خیال کیا کہ لوگ اس کی گرفت سے لڑکی کو چھڑا کر اس کے رقیب کے حوالے کر دینگے اور اُسے گرفتار کر کے قید خانے میں بھجوا دیں گے۔ یکایک اُس کے دل میں ایک خیال آیا جس سے تین باتیں اُس کے سامنے آگئیں۔ اول یہ کہ لڑکی محض اس کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ دوسری یہ کہ اُسے شکست ہوگی اور اس کا رقیب کامیاب ہوگا تیسری یہ کہ گاؤں کے تمام لوگ اُس کی ذلت پر ہنسیں گے اور اس کا منہ چڑائیں گے۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہا تھا کہ اس پر ایک اور احساس طاری ہوا جو اس کی روح کی تہ سے اٹھا اور جس نے اس کی ہستی تک کو بدل کر رکھ دیا۔ نامعلوم طور پر اُس نے ایک ہاتھ سے لڑکی کی گردن کو زور سے دبایا اور دوسرے ہاتھ سے جو اس کے منہ پر تھا اور سختی سے اُس کی چیخ پکار کو روکے ہوئے تھا اس کا گلا بالکل ہی گھونٹ دیا اور لگاتار کہتا رہا۔

میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا ...... تم کبھی کسی دوسرے سے شادی نہیں کر سکو گی ...... مجھے تم سے محبت ہے میں تمہیں کبھی اپنا راز افشا نہیں کرنے دوں گا ... تمہیں مجھ ہی سے محبت کرنی ہوگی۔

یکایک لڑکی کی قوت جواب دے گئی اور عبدالسمیع نے یہ سمجھ کر کہ اس نے مدافعت ترک کر دی ہے اس کو چھوڑ دیا۔ اُس کے چھوڑتے ہی وہ گھاس کے ڈھیر پر گر پڑی اور پھر اس نے کوئی حرکت نہ کی۔

کچھ دیر تک عبدالسمیع بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ کیا ہوگیا صبحہ کو گھاس کے ڈھیر پر پڑا ہوا دیکھتا رہا۔ بتدریج اس کا دماغ اپنی اصلی حالت پر آگیا اور سر سے پیر تک کانپتے ہوئے وہ جھپٹ کر نہایت تردد اور احتیاط سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔ کئی بار اُس نے آہستہ آہستہ اس کو ہلایا اور بھرائی ہوئی آواز میں اُس کو پکارا۔ پھر یک لخت وہ چلا اُٹھا۔

یہ میں نے نہیں کیا ...... نہیں، نہیں ... یہ میں تھا۔

وہ رونے اور واویلا کرنے لگا اور خاک میں لوٹنے اور تیز ناخنوں سے اپنے منہ کو نوچنے لگا۔

اتفاقاً اس وقت حسن آغا کوٹھی کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وہ کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے قریب ترین راستے سے مغرب کی نماز کے لئے مسجد کو جا رہا تھا۔ اور نہایت انہماک سے اپنی تسبیح پر کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ معمول کے مطابق اپنی بڑی ٹوپی جو اس کے کانوں کو بھی تقریباً ڈھانپ لیتی تھی اور پھٹا پرانا سیاہ جبہ پہنے ہوئے تھا۔ چلتے چلتے اسے کوٹھی میں سے ایک خوفناک آواز آئی۔ اس نے جلدی سے اپنا سر اٹھایا۔ اور غور سے سننے لگا تسبیح خیال اُسے بالکل بھول گیا آواز بار بار آرہی تھی۔ حسن آغا آواز کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کوٹھی کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ عبدالسمیع ایک زخمی کتے کی طرح رینگ رہا ہے اور بھاری آواز میں کراہ رہا ہے۔ سخت حیران ہو کر اس نے پوچھا۔

عبدالسمیع تمہیں کیا ہوا تمہیں کس نے اس بُری طرح زخمی کیا ہے۔

عبدالسمیع نے پوری پوری آواز سے چلا کر اور زار زار رو کر کہا۔

صبحہ مر گئی ہے میرے آقا اور اُسے میں نے ہی مارا ہے

[بقیہ ۸۴۳ صفحہ پر دیکھئے]

ہمدرد قوم

رامناتھ کا خط

[جناب لالہ کوڑے مل آنند سابق ایڈیٹر رسالہ "ہمدرد قوم" مظفر نگر]

رامناتھ ایک ۶ - ۷ سال کا بالک تھا - کہ جس کا باپ اسکی پیدائش سے چند ماہ پہلے راہی ملک عدم ہو چکا تھا - اسکی غریب والدہ محنت مزدوری کر کے اوقات بسر کرتی اور اپنے اکلوتے بچے کو پالتی تھی - بیوہ عورتوں کی جو حالت ہندوستان میں ہو رہی ہے وہ ناقابل بیان ہے - بیچاری رامناتھ کی ماتا کوسلیا کی بھی یہی حالت تھی کہ کسی کا اناج پیس دیتی کسی کے کپڑے سی دیتی کبھی کپاس اوٹکر اور کبھی چرخہ چلا کر محنت مزدوری سے کچھ پیسے حاصل کر لیا کرتی تھی اور اسی میں اپنا اور اپنے نور چشم رامناتھ کا بمشکل تمام پیٹ بھر لیتی اور پھٹا پرانا جو کپڑا مل جاتا اسی میں اپنا اور اپنے بچہ کا تن ڈھانپ لیا کرتی تھی - بہت مشکل سے گذر ہو رہا تھا جس شہر میں رامناتھ کی یہ بیوہ والدہ رہتی تھی - وہاں پر میونسپلٹی کی طرف سے لازمی تعلیم کا سسٹم تھا - اسلئے رامناتھ نے بھی ایک پرائمری اسکول میں جا کر کچھ کچھ پڑھنا لکھنا شروع کر دیا تھا -

مگر جب وہ اپنے دیگر ساتھی لڑکوں کو اچھے کپڑوں میں ملبوس دیکھتا یا انکو مٹھائی اور چاٹ وغیرہ کھاتے دیکھتا تھا تو اسکا جی بھی ویسے ہی کپڑے اور ویسی ہی مٹھائی وغیرہ کھانے کو چاہا کرتا تھا - لیکن بیچارہ کیا کرتا - بجز اس کے کہ اپنی دکھیا اور غریب ماں سے التجائیں کر لیتا تھا کہ مجکو بھی پیسے دیدے اور ویسے ہی عمدہ کپڑے پہنا دے -

اسکی کوسلیا ماتا - کہاں سے اچھے کپڑے دیتی اور کہاں سے مٹھائی وغیرہ کھلاتی - وہاں تو روٹیوں کا بھی گذر مشکل سے ہو رہا تھا - رات کے ایک ایک دو - دو بجے تک جبکہ تمام عالم پر سناٹا چھایا رہتا ہے اور لوگ میٹھی نیند سویا کرتے ہیں - کوشلیا اپنے مکان میں تنہا سوت کاتا کرتی تھی دوطرف صبح ہی ۴ - ۵ بجے سے اٹھکر چکی چلاتی اور گھر کے کام کاج میں لگ جایا کرتی تھی - جب وہ اپنے معصوم بچے رامناتھ کو اچھے کپڑوں یا مٹھائی وغیرہ کیلئے مچلتا دیکھتی تو خون جگر پی کر ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتی اور جوں توں کر کے ٹال مٹول کر دیتی تھی -

ایکدن دسہرہ کا تہوار تھا - محلہ کے لڑکے اچھے اچھے کپڑوں کو پہنے نئے نئے کھلونے لئے پھر رہے تھے - کوئی باجہ بجا رہا تھا - کوئی گاڑی چلا رہا تھا - کسی کے ہاتھ میں مٹھائی تھی - کسی کے پاس پیسے تھے - ہنستے کودتے اور اچھلتے ہوئے پھر رہے تھے رامناتھ کے پاس وہی پھٹا پرانا اور میلا کرتہ تھا - نہ اسکے پاس کوئی پیسہ تھا نہ کھلونا - دوسرے ساتھی لڑکوں کی اس چہل پہل کو دیکھکر اس کا دل بھی للچا آیا چنانچہ وہ بہت اداس چہرہ بنائے ہوئے اپنی ماتا کے پاس گیا اور بضد ہوا کہ مجھکو نئے نئے کپڑے پہنا دے اور بازار سے کھلونے اور مٹھائی خرید دے - بیچاری کوشلیا نے جب اپنے معصوم اور ننھے بچہ کی اس ضد کو دیکھا - تو رو پڑی - رامناتھ نے جب دیکھا کہ ماتا کی آنکھوں سے آنسو

پوچھ رہا ہے تو وہ رونے لگا اور بولا کہ ماتا جی تم کیوں روتی ہو اور مجھکو ویسے ہی کپڑے ۔ کھلونے اور مٹھائی کیوں نہیں دیتی ہو جیسا کہ محلہ اور شہر کے دوسرے لڑکوں کو مل رہے ہیں ۔ کوشلیا نے آنسو پونچھکر پھر ٹال ٹولی کرنا چاہا مگر اسمرتبہ رامناتھ نہیں مانا اور ریضد ہوا کہ یا تو وہ اسکو بھی ویسے کپڑے وغیرہ دیوے جیسا کہ دوسرے لڑکوں کو انکی ماتاؤں نے پہنایا تھا یا وجہ بتلادے کہ وہ ایسا کیوں نہیں کرتی ۔ جب کوشلیا نے دیکھا کہ آج رامناتھ کسی طرح بہلتا ہی نہیں ہے تو بہت اداس ہوئی اور بچہ کا منہ چوم کر بولی ۔ بیٹا میرے پاس تمہارے پہنانیکو اچھے کپڑے نہیں ہیں ۔ میرے پاس روپیہ یا پیسہ نہیں ہے کہ جن سے میں تم کھلونے یا مٹھائی خرید دوں ۔

رامناتھ ۔ محلہ کے دوسرے لڑکوں کی ماتاؤں کے پاس تو ہیں ان کے پاس کہاں سے آگئے ۔

کوشلیا ۔ نے رو کر جواب دیا ۔ بیٹا ان کی ماتاؤں کو ان بچوں کے پتا جی نے دیئے ہیں ۔

رامناتھ ۔ پھر میرے پتا جی تم کو کیوں نہیں دیتے ہیں!

کوشلیا ۔ تمہارے پتا جی یہاں نہیں ہیں وہ اس لئے نہیں دیتے ہیں ۔

رامناتھ ۔ پھر میرے پتا جی کہاں ہیں مجھکو بتلاؤ ۔ میں ان سے ہی مانگوں گا ۔

کوشلیا ۔ تمہارے پتا جی بھگوان کے پاس چلے گئے ہیں!

رامناتھ ۔ بھگوان کہاں رہتے ہیں ۔

کوشلیا ۔ بھگوان سواگ لوک میں رہتے ہیں ۔

رامناتھ ۔ کیا میرے پتا جی بھی سواگ لوک میں بھگوان کے پاس ہی موجود ہیں ۔

کوشلیا نے آبدیدہ ہوکر جواب دیا ہاں وہ بھی وہیں موجود ہیں یہ جواب سنکر بالک رامناتھ ۔ چپ ہوگیا اور وہاں سے اٹھکر دوسری جگہ جا بیٹھا اور وہاں پر اس نے ایک کاغذ پر حسب ذیل خط لکھا ۔

میرے پتا جی ۔ تم میری ماتا کو میرے واسطے اچھے کپڑے کیوں نہیں دیتے ہو ۔ میرے لئے میری ماتا کو مٹھائی اور پیسے اور کھلونے ۔ جیسا کہ میرے محلہ کے دوسرے میرے ساتھی لڑکوں کے پتا جی دیتے ہیں ۔ کیوں نہیں دیتے ہو ۔ پتا جی میرا جی بھی کپڑے پہنے کو چاہتا ہے ۔ اور میرا دل بھی کھلونے کیطرف مائل ہے ۔ میرے لئے بھی ویسے ہی کپڑے ۔ کھلونے اور مٹھائی بھیجدو اور پیسہ بھی بھیجدو اور تم بھی آجاؤ ۔ اور مجھکو اپنے ساتھ لے جاکر تماشے دکھلایا کرو جیسے میرے ساتھی لڑکوں کو ان کے پتا جی دکھلایا کرتے ہیں ۔ آپ کا رامناتھ

اس خط کو لکھکر اس نے ایک سادہ لفافہ میں بند کیا اور اس پر حسب ذیل پتہ لکھا ۔

بمقام سواگ لوک ۔ بوقت بھگوان جی کے پہونچکر میرے پتا جی کو ملے ۔

اس لفافہ کو لیکر وہ ڈاکخانہ پہونچا ۔ اور لفافہ کو لیٹربکس میں ڈالنا چاہا ۔ لیکن لیٹربکس تک اسکا چھوٹا ہاتھ نہیں پہونچنے پایا اسلئے وہ کود کود کر اس لفافہ کو لیٹربکس میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگا ۔ مگر کامیاب نہیں ہوا ۔ اتنے میں وہاں پر ایک شریف اور نیک بزرگ کا گذر ہوا ۔ رامناتھ نے ان سے درخواست کی کہ مہربانی فرماکر میرا لفافہ لیٹربکس میں ڈالدیجئے میرا ہاتھ نہیں جاتا ہے

اس فرشتہ خصلت بزرگ نے اس بچے کے ہاتھ سے لفافہ لیکر لیٹربکس میں ڈالنا چاہا ۔ لیکن لفافہ پر سواگ لوک کا پتہ پڑھکر اسکو

شوق ہوا کہ وہ خط کے مضمون کو بھی مطالعہ کرے۔ چنانچہ اس نے لفافہ کھولکر اسکو بھی پڑھا۔ خط کو پڑھکر اسکے دل میں ایک درد پیدا ہوگیا۔ اور رو پڑا۔ اور اسکے دلمیں خیال آیا کہ اگر میں مرجاوں اور میرے بچے اور میری زوجہ کی بھی ایسی ہی حالت ہوجاوے جیسا کہ اس وقت رامناتھ بالک کی اور اسکی والدہ کی ہو رہی ہے تو میری روح کسقدر بیقرار ہوگی۔ اس خیال سے بزرگ کو بیقرار کردیا اور رامناتھ کے اوپر بہت رحم آیا۔ رامناتھ کو بہت تسلی وتشفی دیکر یہ کہا کہ تمہارے پتا جی نے تمکو بھیجا ہے۔ اور مجھکو حکم دیا ہے کہ جس جس چیز کی تمکو ضرورت ہو اس کو میں مہیا کردوں۔ بتلاؤ کیا کیا سامان لینا چاہتے ہو۔ یہ سنکر اور اس کے پیار کو دیکھکر رامناتھ بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس غریب بچہ سے تو خواب میں بھی کسی نے اسطرح پیار کی باتیں نہیں کی تھیں۔ اس کے بعد اسکو بازار میں لیگیا۔ اور بہت اچھے اچھے کپڑے۔ کھلونے اور مٹھائی خریدکر دی اور اسکے ہمراہ اسکے مکان پر جاکر اسکی ماتا کوشلیا سے یہ کہا کہ آج سے تم میری دہرم کی بہن ہو۔ تیرے اس بچے رامناتھ کو میں اپنا بچہ سمجھوں گا۔ اب تم بالکل بے فکر ہوجاؤ۔ میں اس کی تعلیم وتربیت اپنے خرچ سے کرونگا۔ اسکو اور تمکو جس جس سامان کی ضرورت ہوا کریگی میں بہم پہونچاتا رہونگا۔ اور ہمیشہ دیکھ بھال رکھونگا اور اس نے ایک سو روپیہ کا نوٹ کوشلیا کے سپرد کردیا جس جس چیز کی ضرورت پڑے منگواتے رہنا۔ اسکی ماں سخت حیران تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا میں یہ خواب دیکھ رہی ہوں۔ مجھ بدقسمت بیوہ کی تو صبح صبح کوئی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا ہے۔ یہ اسقدر مہربانیاں کرنیوالا دیوتا۔ پرماتما نے کہاں سے بھیجدیا ہے۔

بالاخر اس بزرگ انسان نے اسکی کافی دلجوئی کردی۔ اور چلا گیا اسکے بعد وہ ماہ بماہ پچاس روپیہ ماہوار بطور وظیفہ ان کے پاس بھیجتا رہا۔ اور گاہے بگاہے خود بھی آکر ملتا رہا اور رامناتھ کو مثل اپنی اولاد کے پیار کیا کرتا تھا اور جس جس چیز کی ضرورت سمجھتا رہا علاوہ پچاس روپیہ ماہوار کے وہ اشیا بھی انکو بہم پہونچاتا رہا۔ رامناتھ رفتہ رفتہ بڑا ہوگیا۔ اور تحصیل علم سے بھی فارغ ہوچکا ہے۔ اب رامناتھ اسی بزرگ فرشتہ خصلت انسان کی ریاست میں منیجر ہے اور ہزارہا روپیوں کا مالک ہے لیکن وہ اس وقت بھی اپنی اس پرانی حالت کو نہیں بھولا اور اپنی آمدنی کا بہت بڑا حصہ غریب غربا اور خاصکر یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی امداد میں خرچ کرتا رہتا ہے۔

سچ ہے پرماتما کی بادشاہت میں وہ ہی داخل ہوتے ہیں جو دل کے غریب اور روح کے پاک۔ اور پرماتما ان کی ہی دعاؤں اور پرارتھناؤں کو قبول کرتے ہیں جو مثل رامناتھ کے معصوم ہوتے ہیں — (خاص)

[بقیہ صفحہ ۸۴۰]

دھی میں جاکر اُس کی نعش دیکھ لوا ور تمھارے نوٹ جو میں نے چرائے تھے وہ بھی وہیں پڑے ہیں اس نے پھر اپنے منہ کو اپنے ناخنوں سے کوچنا اور خاک میں لوٹنا اور رونا اور واویلا کرنا شروع کردیا۔

حیران ہوکر حسن آغا نے کوٹھی کے اندر جھانکا جہاں لڑکی کا جسم گھاس پر پڑا ہوا تھا اس کے قیمتی نوٹ نعش کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کوٹھی کے اندر جانا چاہتا تھا لیکن موت کی ہیبت اُسے داخل ہونے سے روکتی تھی اپنی ساری دلیری کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مجتمع کرکے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور اندر گھس گیا۔ پھر ٹٹول ٹٹول کر اُس نے اپنے نوٹ جمع کرنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ اس کا ہاتھ لڑکی کی سرد گردن سے چھو گیا وہ اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور چلا چلا کر کہنے لگا۔

”پکڑو...... پکڑو! چور پکڑو...... چور کو پکڑو...... خونی کو پکڑو...... خونی!“ (خاص)

ہمدم

صحافتِ اُردو عُنفوانِ شباب میں

(جناب رحم علی الہاشمی سابق ایڈیٹر ہمدم، لکھنؤ)

گذشتہ بیس سال کے اندر صحافتِ اُردو میں کیسا انقلابات رونما ہوئے یہ ایک دردانگیز داستان ہے اور پھر اتنی مختصر بھی نہیں کہ ماہوار رسالہ کے ایک مضمون کی چاردیواری میں محدود ہو سکے اس لئے کہ یہ بیس سال اتنے گوناگوں تغیرات اور انقلاب انگیز واقعات کے حامل ہیں کہ اس کے پیشتر کی ایک صدی بھی اتنے تغیرات اور واقعات پیش نہ کر سکے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو صحافت کے لئے یہ زمانہ عنفوان شباب کا ہے جو زندگی کی نیرنگیوں اور تلوّن مزاجیوں کا خاص زمانہ ہوتا ہے۔ قدرت کا قانون افراد اور ادارات پر یکساں عمل کرتا ہے۔ اس لئے جس طرح ایک انسان کی زندگی کی سرگذشت اس دور کی سب سے زیادہ مشکل ہوتی ہے اسی طرح ادارات کی واردات بھی اس دور میں تبصرہ و تحلیل کی گرفت سے دور دور بھاگتی ہے۔ اُردو صحافت کی ابتدا تو حال کی نہیں ہے بلکہ آج سے تقریباً سو سال پیشتر اس کا جنم ہو چکا تھا اور ۱۸۹۰ء میں ملک کے اکثر حصّوں سے کئی اخبارات نکل رہے تھے۔ بلکہ اگر ہم اپنی تحقیقات کا دائرہ ذرا اور وسیع کریں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اخبار کا وجود ہندوستان میں کئی صدی پیشتر سے تھا۔ اور اُردو اخبار بھی سلاطین اودھ کے دورِ حکومت میں رواج پا چکے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز تک اُردو صحافت جس حالت میں تھی اُسے بچپن ہی کی حالت کہنا چاہئے اور آغازِ شباب کی کیفیات اس شعبہ میں اس صدی کے چند سال گذرنے کے بعد پیدا ہوئیں۔ اس دورِ طفلی کی یادگار اس وقت صرف ایک اودھ اخبار لکھنؤ زندہ ہے۔

یہ کہنا کہ آج عُنفوانِ شباب کے بیس پچیس سال گذارنے کے بعد صحافتِ اُردو نے بھرپور جوانی کے دور میں قدم رکھا ہے ابھی غالباً قبل از وقت ہوگا۔ اس لئے کہ ابھی تک اس فن سے یا اس میں کام کرنے والوں کے مزاج سے عموماً وہ تلون دور نہیں ہوا جو الھڑپن کے زمانہ کی خصوصیت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمانہ میں بعض اُردو صحیفہ نگار اور اخبارات ایسے پیدا ہوئے جو ان کیفیات کی سطح سے قدرے بلند تھے۔ لیکن اول تو ان کی تعداد اس وسیع ملک میں ایک دو سے زیادہ نہیں ہے اور دوسرے ان کے کارنامے اس قابل نہیں ہیں۔ کہ متمدن دنیا میں صحافت کا جو معیار قائم کیا گیا ہے اس کی سطح پر رکھے جا سکیں۔ سید جالب دہلوی مرحوم بابو رام رچھپال شیدا مولوی محبوب عالم، مولٰنا ظفر علی خاں قاضی عبدالغفار مولٰنا محمد علی۔ مولٰنا ابوالکلام وغیرہ اس دور کے چند ممتاز افراد ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف آخرالذکر دو حضرات ایسے ہیں جنہوں نے اُردو صحافت کو متمدن دنیا کے معیار صحافت پر پہونچانے کی کوشش کی اور مولٰنا ابوالکلام آزاد بہت

بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن ہماری قوم کی ناقدر شناسی کا یہ عالم ہے کہ آج ان دونوں کی کوششیں محض افسانہ کی شکل میں باقی ہیں۔ جو اخبارات ان حضرات نے اُردو صحیفہ نگاروں کے لئے نمونہ بنا کر پیش کئے وہ سیلاب حوادث کے نذر ہو گئے اور اس وقت ہمارے سامنے نہ یہ اخبارات ہیں اور نہ ان کی مثال۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں مستحق ستائش ہیں کہ انھوں نے کم از کم ظاہری شکل و صورت میں اُردو صحافت کے معیار کو بہت کچھ بلند کیا اور متمدن ممالک کے اعلےٰ اخبارات کے دوش بدوش کھڑا کر دیا۔ لیکن مضامین اور مواد کے لحاظ سے ابھی ریاست میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ملک میں اعلےٰ استعداد کے کام کرنے والوں کی کمی ہے اور محض ایک سورما چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔

اس اثناء میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے پچاسوں نہیں بلکہ سیکڑوں اُردو اخبارات جاری ہوئے اور کم و بیش مختصر زندگی بسر کر کے فنا ہو گئے۔ یہ کہنا کہ ان تمام اخبارات میں زندہ رہنے کی استعداد ہی نہ تھی غالباً اکثر صورتوں میں صحیح نہ ہوگا۔ خاص کر بعض اخبارات کے متعلق ہمیں علم ہے کہ ان میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ان میں سے بعض اخبارات نے اپنے مستقل نقش و نگار دنیائے صحافت میں چھوڑے ہیں جن کی تقلید موجودہ نسل میں کی جا رہی ہے اور میرے خیال میں اس تقلید سے اُردو صحافت کا معیار مائل بترقی ہے۔ اس سلسلہ میں الہلال و پیغام و جمہور (کلکتہ) ہمدرد (دہلی) زمیندار (لاہور) نئی روشنی (الہ آباد) سیارہ و اخوت و ہمدم (لکھنؤ) حریت و استقلال (کانپور) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور ان میں اول الذکر دو اخبارات کے علاوہ باقی سب روزانہ تھے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ستائش روزنامہ "زمیندار" ہے جو باد مخالف کے شدید جھونکوں کے باوجود اپنی شمع حیات کو روشن کئے ہوئے ہے خدا کرے اسکو روز افزوں ترقی حاصل ہو۔ اس کے بعد متاع حیات میں سب سے زیادہ حصہ ہمدم (لکھنؤ) کو حاصل ہوا جو تقریباً سولہ سال زندہ رہ کر پریس آرڈیننس کا شکار ہوا۔ اب پھر اس کے احیاء کی کوششیں کیجا رہی ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کہ یہ اپنے نئے دور میں ہمدم ہی ہوگا۔ یا اسی نام کا کوئی اور اخبار جو نام کے سوا کسی اور بات میں اصل سے مشابہ نہ ہوگا۔ بہر حال اگر جدید نغیر ہمدم کا اعلان صحیح ہے تو ان سطور کے قارئین کرام تک پہونچنے کے پیشتر اس کا اظہار ہو جائے گا۔

ان اخبارات نے آنے والی نسلوں کے لئے کیا نقش و نگار چھوڑے ہیں یہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے اور اسی کے غائر مطالعہ پر ہندوستان میں صحافت اُردو کے مستقبل کا انحصار ہے تفصیل اس کی ذرا طویل ہوگی۔ لیکن اس کا ذکر اگر مختصراً بھی نہ کیا گیا تو یہ مضمون نامکمل رہ جائے گا اس لئے میں صرف اشارہ کے طور پر بعض اہم باتوں کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ آزاد نگاری، اصابت رائے، خبروں کا اہتمام و انتظام، ترتیب و صحت مضامین، ظاہری شکل و صورت اور ارزانی یہ چند وہ معیار ہیں جن سے کسی اخبار کا حسن و قبح جانچا جاتا ہے۔ لیکن جن اخباروں کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے انمیں الہلال و جمہور کے علاوہ کوئی بھی ایسے نہیں ہیں جو مندرجہ بالا معیار کے تین سے زیادہ اصول پر پورے اتر سکیں اور یہ فہرست اُن اخبارات کی تھی جو میرے نزدیک اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ اگر اس فہرست میں ذرا اور اضافہ کیا جائے تو بہت سے

اخبارات ایسے ملیں گے جو اس معیار کے ایک اصول پر بھی پورے نہ اتریں گے اور خاص لطف کی بات یہ ہے کہ اس اہم نقص کے باوجود انھوں نے اپنی قوت حیات کا مظاہرہ مندرجہ بالا اخبارات سے زیادہ کیا۔

گذشتہ دور کی تاریخ کے متعلق اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ داستان ایک ضخیم کتاب کی محتاج ہے اور گو اس میں شک نہیں کہ یہ نہایت ہی دلچسپ اور نصیحت آموز ہوگی تاہم اس کے لئے جس فرصت اور سرمایہ کی ضرورت ہے اس سے میں اس وقت بالکل خالی ہوں اس لئے اس خیال پر قناعت کرتا ہوں کہ جس مقصد کے لئے میں نے یہ مضمون لکھا ہے اس کے لئے مندرجہ بالا مختصر اشارہ کافی ہے

اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ زمانہ حال میں صحافت اُردو کا رجحان کیا ہے اور اس کی مشکلات اور ضروریات کیا ہیں میں نے اوپر جو حالات بیان کئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے رجحان کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے اور اس کے لئے ابھی کم از کم دس سال اور انتظار کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ ابھی صحافت اُردو کے آغاز شباب کا دور ختم نہیں ہوا۔ اور اس وقت اس کی اصلی خصوصیت نیرنگی اور تلون ہے۔ جس سے اصلی رجحان کی علامات نمایاں نہیں ہوتیں۔ اس لئے میں اسکی تحقیق کی بے سود کوشش کرنے کے بجائے صحافت اُردو کی مشکلات اور ضروریات کو لیتا ہوں جن کی طرف ملک کے ارباب حل و عقد اور خصوصاً ممتاز اہل جرائد کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

مشکلات کے سلسلہ میں سب سے پہلے ہمیں خریداروں کی کمی کے مسئلہ پر توجہ کرنا ہے اور دوسرا مسئلہ قابل اور ذی استعداد کارکنوں کا قریب قریب قطعی فقدان ہے۔ خریداروں کی کمی کا یہ عالم ہے کہ لکھنؤ جیسے بڑے شہر میں جو اُردو زبان کا منبع و مرکز ہے اور جہاں ایسے مرد اور عورتوں کی تعداد جو اُردو اخبار پڑھ سکیں ایک لاکھ کے لگ بھگ ہوگی اسی لکھنؤ میں ایک دو نہیں بلکہ پانچ اُردو روزانہ اخبار نکلتے ہیں لیکن ان سب کی مجموعی اشاعت شہر کے اندر دو ہزار بھی نہیں ہے۔ روزنامہ ہمدم کی تقلید میں لکھنؤ کے ان تمام اخباروں نے اپنی مقامی بکری کی قیمت دو پیسہ فی پرچہ کر دی ہے اور یہ قیمت ایسی ہے کہ آٹھ آنہ روز کمانے والا مزدور بھی ایک اخبار روز خرید سکتا ہے۔ لیکن ہماری قومی پستی اور جمود کا یہ حال ہے کہ مزدور تو الگ رہے۔ بڑی بڑی جائداد رکھنے والے رئیس اور سیکڑوں روپیہ ماہوار وثیقہ پانے والے نواب بھی دنیا کے حالات سے بے خبر رہنا باعث فخر سمجھتے ہیں اور دو پیسے کا اخبار خریدنا گوارا نہیں کرتے ایسی صورت حال کی اصلاح مسلسل کوشش اور دوا دوش سے ہو سکتی ہے اور شروع میں خود ایڈیٹر صاحبان کو اپنے حلقہ اثر میں یہ پروپیگنڈا کرنا چاہئے کہ اُردو دان لوگ اُردو اخبارات پڑھنے کا ذوق پیدا کریں۔ لیکن اس سلسلہ میں ذرا وسعت نظر اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ ایڈیٹر صاحبان خود اپنا اخبار خریدنے پر لوگوں کو مجبور نہ کریں بلکہ اخبار پسند کرنے کا کام خریداروں کی مرضی پر چھوڑ دیں جس وقت اخبار بین طبقہ کی معقول تعداد اس طرح پیدا ہو جائے گی اُس وقت اس کا نفع ہر اخبار کو پہونچے گا۔

قابل اور ذی استعداد کارکنوں کی فراہمی کا مسئلہ ذرا اس سے بھی زیادہ دقت طلب ہے اور چونکہ صحافت کے مستقبل کا سارا انحصار اخبارات میں کام کرنے والے عملہ کی قابلیت پر ہے اس لئے مالکان اخبار و ایڈیٹران کو اس طرف خاص

توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت عموماً اُردو اخبارات کا عملہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو ناکافی تعلیم یا سفارش کی وجہ سے کسی دوسرے محکمہ میں جگہ نہیں پا سکتے اور چونکہ اخبار نویسی کا کام ابھی ذریعہ معاش کی حد تک نہیں پہونچا ہے بلکہ اس کی صورت ایک مشن کی سی ہے۔ اس لئے ایسے کام کرنے والے اخباری ملازمت سے بہت جلد بد دل ہو جاتے ہیں۔ اور ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں اور جس وقت ان کو کہیں موقعہ ملجاتا ہے اُسی وقت اخباری زندگی کو خیرباد کہدیتے ہیں۔ اس کی اصلاح کے لئے مالکان اخبار اور کارکناں اخبار میں اتحاد عمل کی ضرورت ہے اور وہ اس طرح کہ مالکان اخبار اخبار کی ملازمت کو اس کی موجودہ غیر استوار حالت سے نکالیں اور مستعد کام کرنے والوں کے لئے یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کا ذرا زیادہ موقع بہم پہونچائیں۔ اسی کے ساتھ جو لوگ اخبار نویسی کا فن اختیار کریں انھیں اس فن کی تمام نیرنگیوں کو سمجھ کر اس میں قدم رکھنا چاہئے اور ایک دفعہ اس میں داخل ہو کر پھر اپنی مشق بڑھانے اور اس فن کے معیار کو بلند کرنے کے لئے یکسوئی اور مستعدی کے ساتھ کام شروع کر دینا چاہئے۔

صحافت اُردو کی ضروریات میں سب سے پہلی وہی چیز ہے جس کی دوسرے کاروبار میں بھی ضرورت ہے یعنی سرمایہ۔ عام طور پر جو اخبارات نکلتے ہیں وہ کارکنوں کی ناتجربہ کاری یا بعض دیگر اسباب کی وجہ سے کافی سرمایہ جمع کر کے کام نہیں شروع کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس وقت تک یہ قلیل سرمایہ چلتا ہے اُس وقت تک اخبار بھی چلتا ہے اور اس کے ختم ہونے کے بعد اخبار بھی فنا ہو جاتا ہے۔ یا اگر زندہ رہتا ہے تو اس کی حالت اس گداگر کی سی ہو جاتی ہے۔ جو ایک پیسہ کی خیرات کے لئے ذلیل سے ذلیل حرکات کرنے پر آمادہ ۵۰

ہو جاتا ہے۔ اُس وقت سے پھر ایسے اخبار کا وجود ملک و قوم کیلئے مفید ہونے کے بجائے نہایت ہی خطرناک ہو جاتا ہے اور اس سے معیار صحافت بلند ہونے کے بجائے اور پستی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

دوسری اہم ضرورت قابل اور تجربہ کار اخبار نویسوں کی فراہمی کے لئے اُن کی تربیت کا انتظام کرنا ہے اس سلسلہ میں میرا خیال ذرا عام لوگوں سے مختلف ہے اس لئے کہ میں اُن لوگوں کی تائید نہیں کرتا جو فن صحافت کی تعلیم کے لئے کالج کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک اخبار نویسی کی تعلیم کے لئے بہترین درسگاہ خود اخبار کا دفتر ہے بشرطیکہ اس دفتر میں واقعی قابل اور ذی استعداد لوگ موجود ہوں اور وہ یا تو ممالک متحدہ کے اخباری کام کا عملی تجربہ رکھتے ہوں۔ یا ایسے لوگوں کے ساتھ کافی مدت تک کام کر چکے ہوں جو صحافتی دنیا کے اعلیٰ ترین جرائد میں کام کا عملی تجربہ رکھتے ہوں۔ ایسے افراد کی عملہ میں موجودگی کا اخلاقی اثر خود اتنا ہوگا جو برسہا برس کی درسی تعلیم سے زیادہ کارآمد ہوگا۔ اس لئے ملک کے ذی استطاعت حضرات کو جو اُردو زبان اور اُردو صحافت سے دلچسپی رکھتے ہیں معقول سرمایہ جمع کر کے کسی ایک یا دو مرکزی مقام پر بہترین تربیت یافتہ عملہ کی زیر نگرانی اُردو اخبار نکالنے کی کوشش کرنا چاہئے تاکہ یہ اخبار ہندوستان کے لئے صحافت اردو کا ایک قابل تقلید نمونہ بننے کے علاوہ آئندہ نسل کے لئے قابل اور ذی استعداد اخبار نویسوں کی تربیت کا بھی کام دے اور یہ مقصد بذات خود اتنا اہم ہے کہ اس کے لئے سرمایہ دار حضرات کو جس مالی ایثار کی ضرورت ہوگی وہ آئندہ کے فوائد کے لحاظ سے بالکل ہی حقیر ہے کیا ہمارے متمول رؤسا اور تاجرین اور امراء اور والیان ملک جو اُردو زبان کی حمایت کے اتنے لمبے چوڑے دعوے کرتے رہتے ہیں اس کام کیلئے اتنی حقیر مالی قربانی بھی نہیں کر سکتے۔ (خاص)

ہندوستان

اردو اخبارات کی ترقی و توسیع

بیسویں صدی کے دوران میں

[جناب ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے سابق ایڈیٹر "ہندوستان" وجائنٹ ایڈیٹر "بندے ماترم" لاہور]

اردو اخبارات اور رسائل میں جو ترقی اور توسیع گذشتہ تیس سال میں ہوئی ہے۔ ہر ایک مختصر مضمون میں بحث کرنا قریب قریب محال ہے۔ اجمالی تذکرہ ہی لازماً اکٹھا کرنا پڑتا ہے

اخبارات اور ترقی تمدن کی تحریک ۔ انگریزی تعلیم اور مغرب والوں کے ساتھ میل جول ہونے کے باعث ہمارے خیالات میں اہم انقلاب واقع ہو گیا ہے۔ قریب قریب تمام باتوں میں مغربی تمدن ہی کا اثر پایا جاتا ہے۔ بلاد مغرب میں اخبارات اور رسالے ضروریات زندگی میں داخل ہیں۔ جمہور ملک کی نگاہوں میں انکی جیسی وسیع و اعلےٰ وقعت ہے۔ اس سے یہ خوب عیاں ہے کہ اخبارات کا اثر اقتدار ناقابل بیان ہے۔ اہل مغرب کو اس امر کا اعتراف ہے کہ اخبارات امن عالم۔ ترقی افراد۔ انقلاب حکومت اور اصلاح تمدن کے محرک ہوتے ہیں جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ترقی تمدن اور اصلاح قومی کا معیار اخبارات ہیں اگر کسی قوم یا ملک کی ترقی کا اندازہ کرنا ہے۔ تو اس کے اخبارات کی حالت پر نگاہ ڈالنا چاہیئے۔ جس سے یہ امر خوب ظاہر ہوتا ہے۔ آیا افراد قوم اور ابنائے ملک کوئیں (مینڈک ہیں) یا روشن خیال اور شستہ مذاق۔ اگر اس قابل قدر معیار کو مد نظر رکھ کر گذشتہ تیس سال پر نظر غائر ڈالی جائے۔ تو اردو اخبارات کی خدمات حسنہ قدر شناسی کے واسطے موزوں الفاظ وضع کرنے میں خاص دشواری رونما ہوتی ہے۔ بلا مبالغہ یہ دور ہر قسم کی ترقیوں کا زمانہ ہے۔ تجارت اور صنعت۔ تعلیم اور سوشیل رفارم۔ قومی بیداری اور اسکی حقوق کی تدریج توسیع اور نیز ہمارے مشاغل زیست کے تمام شعبوں میں قابل تحسین ترقی نظر آتی ہے۔ یہ اقلیدس کی کثیر الاضلاع شکل کی مانند ہے۔ جس کا عکس اخباروں کی مقبولیت اور توسیع میں دکھائی دیتا ہے۔ بعبارت دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ ہر قسم کی ملکی ترقی اور قومی اقبال مندی کے محرک اور نمائندے اخبارات اور رسائل ہیں جن کی ہستی سے شہر اور قصبات سے قطع نظر دیہات اور دور افتادہ مقامات کما حقہٗ آشنا ہیں۔ بطور کلیہ یہ دعویٰ پیش کیا جا سکتا ہے۔ کہ ملکی ترقی اور قومی اصلاح کا کوئی کام اخباروں کی استمداد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ان ہی کے وسیلہ سے عوام کے دل و دماغ پر گرفت حاصل ہو سکتی ہے اور ان کے خیالات میں تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کے جذبات کی اصلاح اور خواہشات کا تزکیہ بھی جرائد ہی کی وساطت سے ممکن العمل ہے۔ اسیوجہ سے اخبارات ہر قسم کی ترقی کے محرک اور اصلاح کے بانی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ انکی تحریک سے بہترین قومی مفاد مرتب ہوتے ہیں اور پچھلے تیس سال کی ترقی اور بہتری کا جزو اعظم باسانی تمام اخباروں کی ہستی سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اخبار نویسی کا دور اول اور اسکی خصوصیات ۔ بیسویں صدی

کا اخباری عروج اور ایڈیٹری اقبال تین بڑے طبقات میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ (۱) پہلا دور انیسویں صدی کے آخری سالوں سے منسلک ہے اور ۱۹۰۱ء میں ختم ہوتا ہے اس عہد میں میدان اخبار نویسی میں کوئی غیر ملکی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ جسے ترقی کو تحریک عظیم پہونچی ہو۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں جو مزاج اہل ادب اور وقایع نگار کا تھا۔ اسے بیسویں صدی کے ابتدا سے کوئی امتیازی تحریک نصیب نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے کم وبیش ترقی کی ایک سی رفتار رہی۔ اخباروں کے ایڈیٹروں کے ذہنی مزاج نے ہی کوئی نمایاں اور قابل تعریف انقلاب قبول نہیں کیا۔ پنجاب[لہ] کے اخباروں کی بابت یہ بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ مولوی حاجی محبوب عالم صاحب نے ہفتہ وار پیسہ اخبار اور انتخاب لاجواب کے اجرا سے ایک کار نمایاں انجام دیا۔ جس سے اردو اخبار نویسی کی کایا پلٹ گئی۔ مولوی صاحب موصوف نے سیاحت مغرب کے دوران میں اخبار نویسی کی جو ممتاز اور قابل قدر خصوصیات ملاحظہ فرمائی تھیں۔ ان کی روشنی میں اردو جرائد کی کہنہ سال روش میں معتدبہ اصلاح فرما کر اپنے معاصرین پر احسان گرامی کیا التزام مضامین اور مفید معلومات کی اشاعت کے ساتھ ہی اخبار نویسی کے فرایض اور نصب العین کو بلند کر دیا جس سے بالواسطہ اسگلے وقتوں کے ذاتیات کو۔ جو استعمال کے واسطہ راستہ صاف ہوگیا۔ بیسویں صدی کے دوران میں اردو اخباروں کو جو ترقی نصیب ہوئی ہے۔ اس کی تحریک ابتدائی مولوی محبوب عالم کی مساعی حسنہ سے بہم پہونچی تھی۔ جب کبھی اردو اخبار نویسی کی تاریخ مرتب ہوگی۔ تو مورخ کو مولوی صاحب موصوف کی مبارک کوششوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ پیسہ اخبار کے خاندان میں کئی اخبار ظہور پذیر ہوئے۔ بچوں کے واسطے ایک اخبار اور ایک عورتوں کے واسطے بھی جاری ہوا۔ جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا تھا۔ جنگ روس وجاپان کے وقت تک خاص شان سے چلتا رہا اس کا خاتمہ ناموافق ملکی خیالات کے سبب سے وقوع میں آیا تھا۔ پیسہ اخبار نے انگریزی کتابوں کے تراجم بھی شایع کرکے اردو دان پبلک کی بڑی ضرورت پوری کی ہر مضمون کی بیسیوں کتابیں شایع ہوئیں۔ رسالے اور اخبارات مطبع پیسہ اخبار میں چھپنے لگے۔ پیسہ اخبار دور اول کے شروع ہی سے اردو اخبار نویسی کا اسکول بن گیا۔ جہاں نہ صرف پنجاب ہی کے نوجوان داخل ہوکر ایڈیٹری۔ وقایع نگار۔ اور اہتمام اخبار سیکھتے رہے۔ بلکہ اردو زبان پہ ناز کرنے والے شہروں کے جوان بخت بھی بھرتی ہوکر اپنا نوشت وخواند کا شوق پورا کرتے رہے جو نوجوان پیسہ اخبار کے اسٹاف میں معمولی فرائض انجام دینے پر رکھے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ پنجاب اور یو۔پی کے اخباروں کے ایڈیٹر بنے۔ بعضوں نے اپنے اخبارات جاری کئے۔ اور اردو اخبار نویسی کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان اصحاب میں لالہ دینا ناتھ صاحب حافظ آبادی کا اسم گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ آپ تین چار سال تک پیسہ اخبار میں رہے۔ پھر آپ نے علحدگی اختیار کرکے اپنا اخبار ہندوستان نکالا۔ جو دور اول کے ہفتہ وار اخباروں میں اپنی قسم کا پہلا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اسے جو مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ کایا پلٹ کا جو مبارک کام مولوی محبوب عالم صاحب نے شروع کیا تھا۔ لالہ دینا ناتھ

[لہ] راقم مضمون ہذا کے سامنے پنجاب کے حالات خصوصیت سے ہیں۔ یو۔پی والوں کی اخباری اولوالعزمیوں کی اہمیت اور وقعت کو نظر انداز کرنا مقصود نہیں ہے۔ راقم کا ذاتی تجربہ دیگر صوبوں کی بابت محدود ہے۔

جی نے اسے پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا۔ معاصرین کو ہندوستان کی مدح کے سوا چارہ نہ رہا مگر بعض اخباروں نے ہٹ دھرمی کہو یا مصلحت خاص۔ اپنی روش میں ترمیم کرنے میں کوتاہی کی اس وجہ سے اس بارے میں پیچھے رہ گئے۔

شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے نے جو اب آنریبل جسٹس سر عبدالقادر مشہور ہیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں رسالہ مخزن کی بنیاد ڈالی جو اپنی قسم کا نرالا تھا۔ اس سے رسالوں کی دنیا میں خاص انقلاب واقع ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد مخزن بند ہو گیا۔ اس کا پھر اجرا ہوا مگر شیخ صاحب موصوف کا اس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ جب آپ بیرسٹری پاس کرنے کو ولایت تشریف لے گئے۔ تو رسالہ دوسروں کے سپرد کرنا پڑا تھا۔

۱۹۰۲ء میں پنجاب میں دو روزانے اخبار عام اور پیسہ تھے۔ اور یو۔پی میں اودھ اخبار تھا۔ ان کے سوا اور کسی کو قبولیت عامہ کا امتیاز نصیب نہ ہوا تھا۔ پنجاب کے ہفتہ وار اخباروں میں قابل ذکر اخبار عام ہے۔ جو غالباً نصف صدی سے قائم چلا آتا ہے۔ پنڈت گوپی ناتھ کے زمانہ میں اسے بڑی نیک نامی اور شہرت نصیب ہوئی تھی۔ دور ونزدیک اس کا بڑا چرچا تھا۔ پنڈت جی کی شوخ زبان اور نرالی طرز تحریر سے اسے چار چاند لگ گئے تھے۔ اخبار عام کے شائقین بے صبری سے انتظار کرتے رہتے تھے۔ ہفتہ وار اردو اخباروں میں یہ سب سے پرانا ہے۔ گو اودھ اخبار روزانہ یا ہفتہ وار جرائد میں سب سے پرانا شمار ہوتا ہے علاوہ ازیں کوہ نور وطن۔ صدائے ہند گلزار ہند۔ رفیق ہند۔ لاہور۔ میں صادق الاخبار۔ بہاولپور میں۔ جو دو نوں بند ہو گئے ہیں۔ راول پنڈی میں۔ کبھی تہلکہ اخبار۔ کبھی نکلا تھا۔ نور افشاں۔ لامیانہ میں بہت پرانے اخبارات تھے۔ اور ان میں سے بعض اب تک موجود ہیں۔ ان کے سوا آریہ گزٹ۔ پنجاب سماچار۔ پنجۂ فولاد۔ انتخاب لاجواب۔ راجپوت گزٹ۔ تہذیب النسواں بچوں کا اخبار شریف ——— بہادر لاہور میں۔ تحفۂ سرحد سرحد میں زمیندار۔ کرم آباد گجرات والا۔ وکٹوریہ پیپر۔ سیالکوٹ میں حق پسند۔ وکیل۔ اور آبزور ایڈ گزٹ۔ امرتسر میں۔ وآبہ ہوشیار پور۔ میں ست دھرم پرچارک جالندھر میں۔ آرمی نیوز اور سول ملٹری نیوز۔ لامیانہ میں میں شایع ہوتا تھا۔ دہلی میں مرزا حیرت کا اخبار کرزن گزٹ۔ افضل الاخبار۔ اور دلی پنچ وغیرہ تھے۔ رسالوں میں مخزن کے علاوہ رسالہ آزاد لاہور سے نکلتا تھا۔ اس زمانہ کے یو۔پی کے ہفتہ وار اخباروں میں قابل ذکر شحنۂ ہند اور انیس ہند۔ (میرٹھ) مجز عالم رہبر و نیر اعظم (مراد آباد) روہل کھنڈ گزٹ۔ اور آریہ پترکا (بریلی) اودھ اخبار۔ اودھ پنچ۔ اور ہندوستانی (لکھنؤ) کانپور گزٹ۔ کانپور۔ البشیر (اٹاوہ) آگرہ اخبار (آگرہ) مشرق اور ریاض الاخبار۔ (گورکھپور) اور الخلیل وغیرہ ہیں۔ راجپور کا مشہور اخبار دبدبۂ سکندری۔ اور بدایوں میں ذوالقرنین تھا۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء میں ہندوستان بزم ہستی میں آیا تھا جو دور اول کے ہفتہ وار اخبارات میں سب سے نرالا اور نئے طریقۂ اخبار نویسی کا نمایندہ سمجھا جاتا ہے۔ انڈیا۔ گوجرانوالہ سے اور سوراج۔ الہ آباد سے اس طبقہ کے انتہائی جذبات کی ترجمانی کیواسطے جاری ہوا تھا۔ جو پہلے انتہا پسند قوم پرست پھر انارکسٹ اور پیچھے بالشویکی انقلاب پسند کہلائے مگر اس وقت کی ہوا ان کے راس نہ آئی۔ یا یوں کہنا چاہئے۔ کہ جان مارلے (وزیر ہند) اور لارڈ منٹوں کی پالیسی اسے اخباروں

کی ہستی کے سراسر منتبائن تھی۔ دور اول کے آخیر تک پیسہ اخبار لاہور میں اور اودھ اخبار لکھنؤ میں روزانہ اخبارات کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اول تو کوئی نیا روزانہ نکلا ہی نہیں۔ اگر جاری ہی ہوا تو لاہور سے مہینوں کے بچے کی طرح جلد عدم آباد کو سدھار گیا۔ نہ تو اس کی ضرورت ثابت ہوئی۔ اور نہ ہی زاد راہ سے آراستہ تھا۔ اسی طرح کئی ہفتہ وار اخبارات اور رسائل بھی نکلے۔ اور پھر بند ہو گئے۔ البتہ زمانہ کو غیر معمولی قبولیت حاصل ہوئی۔ اور وہ پرانے دم خم کے ساتھ قائم چلا جاتا ہے۔ ترقی لاہور سے نکلا۔ اور چند برس کے بعد بند ہو گیا۔ اس دور میں پنجاب میں مسلمان اخبار نویسوں نے اردو نویسی کی ترقی میں ہندوؤں سے زیادہ نمایاں حصہ لیا ہے۔ پیسہ اخبار کے علاوہ وطن (لاہور) جس کے بانی مولوی انشاء اللہ خاں مرحوم تھے۔ اور وکیل (امرتسر) جس کے بانی اور مہتمم شیخ غلام محمد خاں تھے۔ سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ زمیندار کے بانی میاں سراج الدین زبردست شخصیت کے اخبار نویس تھے۔ دہلی میں مرزا حیرت۔ لکھنؤ میں منشی گنگا پرشاد ورما۔ اور گورکھپور میں حکیم برہم اور میرٹھ میں مجدا اسوقت شحنۂ ہند والے نرالی مگر واجب التعظیم ہستیاں ہیں۔ ہندوؤں میں سب سے پہلے پنڈت گوپی ناتھ جی اور ان کے بڑے بھائی پنڈت گوبند سہائے۔ اور نئے دور میں لالہ دینا ناتھ جی عجیب و غریب شخصیتیں ہیں۔

دور ثانی کی نرالی خصوصیات ۔ دور ثانی کا آغاز ۱۹۱۰ء میں اور اختتام ۱۹۲۰ء میں ہوتا ہے۔ یہ دور زیادہ تر روزانہ اخباروں کی شہرت اور ہر دل عزیزی کا زمانہ ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ عجیب و غریب واقعات سے اخباروں کی جڑھ بنتی ہے چنانچہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی کے حملہ طرابلس سے مسلمانان ہند میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس وجہ سے وطن زمیندار اور وکیل روزانہ ہو گئے اس کے ساتھ ہی جنگ بلقان و ترکی کا مشغلہ بھی ہاتھ آ گیا۔ لیکن جب یہ دونوں دلچسپیاں مفقود ہو گئیں۔ تو روزانہ اخباروں کی کساد بازاری ہو گئی۔ وطن اپنی سابقہ اشاعت ہفتہ واری پر جا رہا۔ مگر پیسہ اخبار اور زمیندار اور نیز وکیل چلتے رہے۔ زمیندار کے مالک و ایڈیٹر سیاحت یورپ سے نئے خیالات سے سرشار ہو کر آئے تھے۔ اس وجہ سے زمیندار کو خاص اہمیت اور قبولیت عامہ نصیب ہوئی۔ کیونکہ مولانا ظفر علی خاں ہندو مسلم اتحاد کے بڑے سرگرم وکیل ہو گئے تھے اپنے اخبار میں پُر زور مضامین لکھتے تھے اور دھواں دھار لکچروں میں دونوں گروہوں کو اختلافات در کنار کرنے کی تلقین کرتے تھے تھوڑے دن کے لئے پنڈت ہری لال شرما نے روزانہ سچ نکالا تھا۔ اور پنجاب کے مشہور شاعر اور اہل قلم لالہ بانکے دیال نے لاہور میں آکر جنگ سیال روزانہ جاری کیا تھا۔ مگر پبلک نے خاطر خواہ سرپرستی نہ کی۔ اس وجہ سے یہ دونوں اخبار چلا نا بود ہو گئے

فروری ۱۹۱۲ء میں لالہ دینا ناتھ جی نے دیش اور پنڈت ہری لال شرما نے ہندو روزانہ جاری کیا۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں لارڈ ہارڈنگ پر اسی داخلہ دہلی کے وقت کسی نابکار نے جو بم پھینکا تھا۔ اس کا مقدمہ ۱۹۱۳ء میں دہلی میں چلا۔ جس سے عوام میں بیحد دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ایک خاص آدمی مقدمہ کی کیفیت بذریعہ تار اور مراسلہ ہمدم پہونچانے کو عدالت دہلی میں تعینات کیا گیا۔ اول مرتبہ اردو روزانہ ہمدم روزانہ چار پانچ ہزار کے مابین شایع ہونے لگا۔ ہندو تو چند مہینے کے بعد بند ہو گیا۔ مگر دیش جاری رہا۔ جب اگست ۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگ عظیم شروع ہوئی تو زمیندار روزانہ بہت ہی

مقبول ہوا۔ اس کی اشاعت بقول مہتمم اخبار پندرہ ہزار سے اوپر تھی۔ لالہ دینا ناتھ جی نے دوسرا روزانہ پبلک ۱۹۱۸ء میں جاری کیا۔ لکھنؤ سے ہمدم راجہ صاحب محمود آباد کے حسب ارشاد میر جالب دہلوی کی ایڈیٹری میں نکلنا شروع ہوا۔ جسے یو۔ پی میں بہت نیک نامی حاصل ہوئی تھی۔ دہلی کے مولوی محمد علی صاحب نے ہمدرد روزانہ جاری کیا تھا۔ جسے اس علاقہ میں کافی مقبولیت نصیب ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد بعض وجوہات سے یہ بند ہو گیا۔ دور ثانی میں روزانہ اخباروں کی ہستی سے ہفتہ وار اخباروں کی بہت بے قدری ہو گئی۔ شہروں کے لوگ ان سے مستغنی ہو گئے مگر دیہات والوں کو ہفتہ وار اخبار پڑھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ پرتاپ روزانہ (لاہور) ۱۹۲۹ء میں مارشل لا سے پہلے جاری ہوا تھا۔ اس دور میں ہندو اور مسلمان روزانہ اخبارات قریب قریب مساوی رہتے فرقہ وارانہ تو تو میں میں پردہ میں نہ چھپائے پڑی رہتی۔ رسالوں میں ادیب الہ آباد سے اجرا سے دور جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کے محاسن ظاہری میں تصاویر سب سے بڑھ کر نرالی خصوصیت تھی۔ مضامین بلند پایہ تھے۔ اور لکھنے والوں کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ چار سال کے بعد بند ہو گیا ہمدم (لکھنؤ) اپنے مضامین کی خوبی کے واسطے بدستور سابق ممتاز اور قابل قدر ہے۔ العصر (لکھنؤ) کو زیادہ زندگی نصیب نہ ہوئی۔ لاہور سے ہمالہ لالہ دینا ناتھ کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا رہا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ دہلی۔ آگرہ۔ اور دیگر شہروں سے بھی چند رسالے جاری ہوئے۔ مگر جلد بند ہو گئے تعلیم یافتہ گروہوں نے ان کی سرپرستی نہ کی۔ یا یوں سمجھنا چاہئے کہ پبلک نے انھیں سرپرستی کے قابل نہ سمجھا۔

اردو اخبار نویسی کا مسکن شاندار۔ دور ثانی میں روزانہ اخباروں کی کثرت اور قبولیت عامہ اور نیز ہفتہ وار اخباروں کی قابل قدر تعداد اور ہر دل عزیزی سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ پڑھے لکھے لوگوں میں عجیب قسم کی ذہنی بیداری اور دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اسی سے جذبہ قوم پرستی وابستہ ہے۔ اس کی تحریک حقیقی کا سہرہ روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں کے سر بندھنا چاہیئے۔ لاہور میں زمیندار اور ہندو۔ اور دہلی میں ہمدرد اس انوکھے احساس کے نمایندے قرار دیئے جاتے ہیں۔ اس امر کو ضرور ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ گو یو۔ پی اردو کا مسکن ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اردو کی ٹکسال ہوئے ہیں۔ مگر اخباری اولوالعزمیوں کا گھر پنجاب خاص کر لاہور ہے۔ جس کے بازاروں میں اردو کے محاورے اور الفاظ سنائی نہیں دیتے مگر اس کے اخباروں کے کالم اردو کی شان نمایاں کرتے ہیں جیسے یو پی کے اہل زبان طنزاً "پنجابی اردو" "کھڑی اردو" "غیر شستہ زبان" پکارتے اور اہل پنجاب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مگر اردو اخبارات اور رسائل اور لٹریچر جتنا پنجاب میں پیدا ہوتا ہے۔ یو۔ پی کی دگنی سے زائد آبادی اس کا عشر عشیر بھی نہیں دکھا سکتی۔ انگلستان سے اضلاع متحدہ امریکہ اور کینیڈا تین ہزار میل۔ اور آسٹریلیا اس ہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ ان ملکوں کے باشندے انگریزوں کے ہم مذہب اور ہم نسل ہیں۔ زبان بھی انگریزی ہے مگر مقامی جغرافیائی اور فطری حالات نے تلفظ اور لہجے اور بولی میں خاصا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ لاہور۔ دہلی اور میرٹھ سے ساڑھے تین سو میل اور لکھنؤ سے پانچ سو میل اوپر ہے۔ ہماری مادری زبان اور جغرافیائی حالات کے اعتبار سے پنجاب کی اردو دہلی اور لکھنؤ کی اردو کی مانند شستہ نہیں ہو سکتی تاہم اردو ہے اور عمدہ اردو ہے۔

دور ثالث کی ممتاز شوکت۔ ولایتی اخباروں کا تتبع۔ دور ثالث (۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک) باقی دونوں سے نرالا اور ارفع ہے۔ یہ روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات اور رسائل کا شاندار دور ہے۔ نصب العین اخبار نویسی بہت بلند ہو گیا ہے۔ اور مغرب والوں کی مانند بنتا جاتا ہے۔ عوام پہلے سے کہیں بڑھ کر اخباروں کے شایق نظر آتے ہیں۔ پڑھے لکھے دونوں کے درمیان عجب قسم کی بےداری پائی جاتی ہے۔ جس کی جھلک اخباروں کے کالموں میں دکھائی دیتی ہے۔ ہر شعبۂ زیست میں چستی و چالاکی اور جوش پایا جاتا ہے جس کی تحریک اخباروں سے پہونچی ہے۔ اشاعت کے لحاظ سے یہ دور سابقہ دوروں سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ اخبار نویس اپنی ذمہ داری کا احساس پہلے سے کہیں زیادہ ظاہر کرتے ہیں۔

لالہ لاجپت رائے جی نے مشترکہ سرمایہ سے بندے ماترم ۱۹۲۰ء میں نئی قومی سپرٹ کی نمایندگی کے واسطے جاری کیا تھا کیسری ۱۹۲۰ء میں لالہ شام لال کپور کی ایڈیٹری میں لاہور سے طبع ہونا شروع ہوا تھا۔ نان کوآپریشن (عدم تعاون) کے زمانہ میں ۱۹۲۲ء میں بندے ماترم کی اشاعت اٹھارہ ہزار تک اور پرتاپ و کیسری کی بارہ بارہ ہزار تک جا پہونچی تھی۔ دیش اور پبلک اور پیسہ اخبار کی بےحد بےقدری ہو گئی۔ مگر زمیندار اور ہمدرد کی ہر دل عزیزی بھی ہندو اخباروں سے کچھ کم نہ تھی سیاست اور انقلاب (لاہور) اسی دور میں جاری ہوئے۔ لالہ خوشحال چند نے ملاپ ۱۹۲۳ء میں جاری کیا تھا۔ جو اب شمالی ہند کے اخباروں کا سرتاج ہونے کا دعوے دار ہے۔ کانپور اور امرتسر اور دہلی میں بھی روزانے اخباری ہوئے۔ مگر جلد بند ہو گئے۔ لاہور کا سب سے پرانا روزانہ اخبار پیسہ اور دیش و پبلک اور دہلی کا ہمدرد اور پرانا اخبار ہمدرد اب بالکل بند ہو گئے ہیں۔ دہلی کا روزانہ تیج اور لاہور کا ملاپ۔ قریب قریب ایک ہی وقت میں نکلتے تھے۔ اور ان ہی کا ہمعصر ہندو بھی تھا۔ جو کچھ عرصہ تک بند ہو گیا۔

دور ثالث کے روزانہ اخباروں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ایجنسیوں کی وساطت سے ملکی اور غیر ملکی خبریں حاصل کی جاتی ہیں اور ان کے بدلے انھیں ہر مہینے مقدبہ رقم نذر کرنا پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف مقامات میں اپنے نامہ نگار تعینات کر رکھے ہیں۔ بعض اہم واقعات کی چھان بین اور بعض تحیر پیدا کرنے والے مقدمات کی کاروائیاں شایع کرنے میں بڑی چابکدستی اور مستعدی سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ پہلو بہت قابل قدر ہے۔ دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تصاویر شایع کی جاتی ہیں جو سب اخباروں میں تو نہیں۔ مگر لاہور کے بعض اخباروں نے اس میں پیش قدمی کر دی ہے۔ تیسری بات غور طلب یہ ہے کہ روزانہ اخباروں نے سنڈے اڈیشن شروع کر دیے ہیں۔ اور بعض مخصوص اڈیشن بھی ہفتہ کے دوران میں طبع کئے جاتے ہیں جو انگریزی اخباروں کی تقلید ہے۔ چوتھی نمایاں بات فرقہ وارانہ استدعا ہے۔ اہل اخبار اپنے مذہبوں کی سرپرستی حاصل کرنے کے واسطے ایسے واقعات شایع کرتے ہیں۔ اور مصالح لگا کر ایسے طریقہ سے پیش کرتے ہیں جس سے عوام کے مذہبی جذبات اشتعال پاتے ہیں۔ یہ قابل افسوس روش پنجاب کے اخباروں میں خصوصیت سے نمایاں ہے۔ فرقہ وارانہ جذبات کی برانگیختگی نیک نامی اور مالی آسودگی کا ٹوٹکہ تصور کیا جاتا ہے۔

دور حاضرہ کے ہفتہ وار اخباروں کی حالت بھی بہت بدل گئی ہے۔ تصاویر اور افسانے ان کی ایک قابل قدر خصوصیت ہے۔ تاریخی۔ علمی۔ سائنسی اور اقتصادی مضامین اور پولیٹیکل

مباحث کی تفصیلی بحث دوسری ممتاز خصوصیت ہے - اس لحاظ سے یہ برطانیہ کے ہفتہ وار اخباروں کی تقلید کر رہے ہیں - ریاست - دہلی - اس امر میں سب پر بڑھ گیا ہے پہلے اور دوسرے دور میں ہفتہ وار اخباروں میں خبریں اور واقعات کا لب لباب پیش کیا جاتا ہے - جواب پنجاب کے بہت سے اخباروں میں عنقا کی حیثیت رکھتا ہے - مگر یو - پی میں اب تک پرانی روش غالب ہے - گذشتہ دس سال کے دوران میں بہت سے ہفتہ وار اخبار جاری ہوئے - پھر جلد ہی بند ہو گئے ان میں سے کئی اب تک کامیابی سے چل رہے ہیں - دور حاضرہ میں رسالوں کی جیسی بھرمار دیکھنے میں آتی ہے - ویسی کبھی نہ دیکھی گئی تھی - اچھے اچھے رسالے جاری ہوئے اور کامیابی سے چل رہے ہیں - اور اپنی ہستی کا مقصد خیر و خوبی سے انجام دیتے ہیں سب سے پرانے رسالوں میں زمانہ - کانپور - دلگداز - لکھنؤ اور بعض اور رسالے ہیں - نئے رسالوں میں ہمایوں - اور شباب اردو - نیرنگ وغیرہ لاہور میں - اور دیگر رسالے دوسرے شہروں سے نکلتے ہیں۔

جنوبی ہند میں اردو جرائد کا سب سے بڑا مرکز حیدرآباد دکن ہے جہاں سے بعض روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات شایع ہوتے ہیں - انجمن ترقی اردو کے تمام رسالے اورنگ آباد میں طبع ہوتے ہیں - مدراس - بمبئی - اور کلکتہ سے وقتاً فوقتاً اردو کے جرائد نکلتے رہے ہیں - مگر ان کی چنداں وقعت نہیں اشاعت بہت محدود ہے - اثر و اقتدار عنقا کے برابر ہے لیکن سب سے بڑا زور پنجاب اور یو - پی ہی میں ہے

اردو اخبار نویسی کی کوتاہیاں اور اصلاح و ترقی کی تجاویز

تیس سالہ اخبار نویسی کے اجمالی تذکرہ کے بعد یہ خالی از لطف نہ ہوگا - اگر اردو اخباروں کی خامیوں پر سرسری نگاہ ڈال کر انکی اصلاح کی تجاویز پیش کی جائیں -

(۱) عدم مشارکت عمل کے بعد ہندو مسلم کشیدگی وقوع میں آئی - جس سے اکثر اخباروں نے اپنی اپنی قوم کے افراد کے جذبات دینی کو مشتعل کر کے مستفید ہونے میں بڑی چابکدستی ظاہر کی ہے اور کر رہے ہیں - گویا ہندو مسلم کشیدگی بڑھانے والے اخبارات ہیں (۲) حقیقی معنوں میں اخبارات عوام کے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے - بلکہ اہل اخبار خود مغالطہ میں مبتلا ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں - کہ ہم جمہور کی نمایندگی کرتے ہیں - لیکن افسوس یہ ہے - کہ عوام کے خیالات اور ضروریات سے جتنے وہ بے بہرہ ہیں اتنا اور کوئی نہیں ہوگا - چند خطوط جو کسی مضمون کے موافق یا مخالف ڈاک سے موصول ہوتے ہیں - یا دو چار آدمی کسی سوال کے متعلق جو رائے ایڈیٹر صاحب کے روبرو ظاہر کرتے ہیں - وہ عام رائے کا آئینہ نہیں ہو سکتی ایڈیٹر لوگ ایسے موقع پر شاذ ہی جاتے ہیں - جہاں عوام کا جم غفیر ہے - وہ تھرڈ کلاس کی گاڑی میں کبھی سفر نہیں کرتے جہاں وہ عوام کے اصل خیالات سے آگاہ ہو سکیں - (۳) اہل دیہات کی خواہشات سے ایڈیٹر کلیتہً ناآشنا ہیں - دفتروں کے بابوؤں اور شہر کے دوکان داروں کو "قوم" فرض کرنا بڑی بھاری نادانی ہے - (۴) ایڈیٹر صاحبان ہمیشہ اپنے موافق پہلو دکھانے کے کوشاں رہتے ہیں - دوسرا پہلو دکھانے کی ان میں اخلاقی جرأت نہیں - انصاف اور حق کا یہ اقتضا ہے کہ موافق اور مخالف دونوں پہلو پبلک کے روبرو پیش کئے جائیں (۵) پولٹیکل معاملات سب سے زیادہ خیال کیا جاتا ہے - اور ایڈیٹر اپنے ایڈیٹوریل کالم

میں اسی پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ حال آن کہ تجارتی صنعتی۔ زراعتی۔ سوشیل مباحث سے عوام کو بے حد دلچسپی ہوتی ہے۔ (۶) خود ایڈیٹر کسی اہم مسئلہ کو شاذ ہی مطالعہ کرتے ہیں ان کے دفتر میں شمار و اعداد یا انسائیکلو پیڈیا یا دیگر مسائل کی مستند کتابیں نہیں ہوتیں۔ اسو جہ سے مضحکہ خیز لاعلمی سے جو جی میں آتا ہے اناپ شناپ لکھ دیا جاتا ہے۔ اس سے اہل علم اور اہل الرائے کے نزدیک اردو اخبارات کی چنداں وقعت نہیں ہوتی۔ ایڈیٹوریل اسٹاف میں بھی بیشتر ایسے آدمی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ جو انگریزی اور اردو سے کما حقہ آشنا نہ ہونے کے ساتھ اصول اخبار نویسی سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے معلومات نہایت محدود اور رائے جو صحیح واقعات اور اعداد پر مبنی ہونی چاہئے بالکل خام ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اردو اخبارات کی تحریر مستند اور قابل اعتبار نہیں سمجھی جاسکتی۔

(۷) ہمارے اخباروں کے دفتروں کی بد انتظامی ضرب المثل ہے اور یہ بد انتظامی اخباروں کی ترقی اور نیک نامی اور اثر کے وسعت کے راستہ میں بڑی بھاری رکاوٹ ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اہل قلم طبعاً انتظامی صلاحیت میں کچھی دست ہوتے ہیں۔ وہ حتی الوسع اس سے گریز کرتے ہیں۔ جو آدمی منیجر مقرر کئے جاتے ہیں۔ وہ تجربہ اور احساس ذمہ داری اور تعلیم میں کوتاہ ہوتے ہیں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کی مساعی جمیلہ خاک میں مل جاتی ہے۔

خریداروں کے شکائتی خطوط ردی میں پھینک دیئے جاتے ہیں۔ اگر خریدار پیشگی منی آرڈر بھیج دیتا ہے۔ تو اس کے نام اخبار جاری نہیں ہوتا۔ اگر کوئی خریدار کسی اور جگہ پر اخبار طلب کرتا ہے۔ تو نہیں پہونچتا۔ بار بار لکھتا ہے مگر جواب نہیں ملتا۔ آخرکار چپ ہو رہتا ہے۔ اس کا تلخ تجربہ اس کے دوستوں کو بھی بدگمان کر دیتا ہے۔ بعض ایڈیٹر اور مالک کسی آدمی کے خط کا جواب دینا کسر شان سمجھتے ہیں۔ مجھے خود اس کا تجربہ بارہا ہو رہا ہے۔ سو آراج کے مطالبہ میں اخبارات سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور انتظام دفتر کی یہ کیفیت ہے کہ اس پر "باہر دیکھکر کھو پنچ ہزاری" کی کہاوت خوب چسپاں ہوتی ہے۔ اردو اخبارات ہی اس آفت کا شکار نہیں ہیں۔ بلکہ چوتھائی صدی کے ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ کہنے کو تیار ہوں کہ ہمارے انگریزی زبان کے اخبارات اور رسائل جن کے ایڈیٹر مالک اور منیجر ہمارے ہندوستانی بھائی ہیں۔ اس آفت کی دست بدرست بالا نہیں ہیں۔ البتہ انتظام کی کمی بہیئت مجموعی سب اخباروں کا قابل افسوس خاصہ ہے۔ روپیہ کے دین لین میں بھی پرلے درجہ کی بے قاعدگی پائی جاتی ہے

(۸) روزانے اردو اخباروں کی قیمت مشہور انگریزی اخباروں سے کم نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ٹربیون، ہندو، ہرلڈ اور مسلم آوٹ لک۔ ملاپ اور پرتاپ وغیرہ کی قیمت فی پرچہ ایک آنہ ہے۔ حال آن کہ ٹربیون میں جتنا میٹر ہوتا ہے اس سے اردو کے تین روزانے بھرے جاسکتے ہیں۔ اگر عوام کو روشن خیال بنانا اور ان کے درمیان اتحاد و یک جہتی پیدا کر کے راہ راست پر چلانا اخبارات کا فرض ہو۔ تو قیمت میں تخفیف امر ضروری ہے۔ گراں قیمت ترقی کے راستہ میں رکاوٹ ہے۔ (۹) جو بات دوکان داروں میں عائد ہوتی ہے۔ وہی اخباروں پر بھی چسپاں ہوتی ہے۔ بالعموم اول وہ اسی بات پر قانع رہتے ہیں۔ کہ ان کی دوکان

شہر بھر میں سب سے بڑی شمار ہو - اس قسم کی تمنا اخبار والوں کے دل میں بھی ہے - وہ شہروں کے باہر بہت کم جاتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ قصبات اور دیہات جہاں روزانہ ڈاک جاتی ہے - اخبار پہونچتا رہے - تاکہ اہل دیہات دنیا کے حالات سے پوری آگاہی حاصل کریں -

تجاویز اصلاح - اصلاح اور ترقی کے واسطے میرے نزدیک حسب ذیل تجاویز مفید ثابت ہوں گی - اگر انھیں اخباروں کے مالک - ایڈیٹر اور دیگر کارکن سوچ سمجھ کر عملی صورت دیں -

(۱) بطور کلیہ یہ امر تسلیم کرنا لازمی ہے کہ ہر ایک کام یا فن سیکھنے کیواسطے تجربہ کار ماہر کی شاگردی کرنا پڑتی ہے - ان پڑھ آدمی اس اصول کے قائل اور کاربند ہیں - فوٹوگرافی اور دیگر تمام مفید ہنر پہلے استادوں سے سیکھتے ہیں یورپ اور امریکہ میں کروڑپتیوں کے لڑکے دوسرے کارخانوں اور کوٹھیوں میں ادنیٰ کلارکوں کے پہلو بہ پہلو کام سیکھتے ہیں تب اپنے کارخانے کا اہتمام ہاتھ میں لیتے ہیں - گو وہ بی - اے - ایم - اے کی ڈگریاں حاصل کرکے دوسرے ملکوں کی سیاحت ہی کرتے ہیں - مگر وہ کاروبار کے لایق نہیں سمجھے جاتے - لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک ہر ایک پڑھا لکھا اپنے کو اخبار کی ایڈیٹری اور منیجری کے اہل سمجھتا ہے - اور تربیت خاص سراسر فضول گماں کرتا ہے - حال آں کہ تفصیل یہ ہے کہ مضمون نگاری اور ایڈیٹری بھی ایک خاص فن ہے جس کے ساتھ بڑی اور نازک ذمہ داریاں وابستہ ہیں - مالکان اخبارات کو اچھے تعلیم یافتہ - تجربہ کار اور کام سے واقف آدمی ایڈیٹری کے واسطے منتخب کرنے چاہئیں - اسی طرح ایڈیٹوریل اسٹاف میں بھی ایسے تربیت یافتہ آدمی بھرتی کرنے چاہئیں جنھوں نے پہلے کہیں کام کیا ہو - البتہ ایک آدھ اناڑی بھی تربیت کے واسطے رکھا جاسکتا ہے - اس سے کام کا معیار اور اخبار نویسی ذمہ داری کا احساس بہت بڑھ سکتا ہے - جو بات شایع ہوگی - وہ مستند ہوگی - اور عوام کے خیالات کا آئینہ بھی ہوسکتی ہے - اگر ایڈیٹر اہل الرائے سے گفتگو کرنے کے علاوہ ایسے مجمع میں اکثر جایا کرے جہاں لوگ بکثرت جمع ہوں تحریر میں اسلوب پیدا ہوجائیگا - اور رائے پختہ اور نشیب و فراز کے غور پر مبنی ہوگی - اگر جمہور کے جذبات کی نمایندگی امر ضروری اور اخبار کا فرض اولیٰ ہو تو ایڈیٹر کو ہر طبقہ کے باخبر اور بلند خیال لوگوں سے ذاتی ملاقات کرنا چاہئے - مالکان اخبارات کی یہ چال کہ سو اسو روپئے کے ایڈیٹر کو برطرف کرکے اس کے اسّی روپئے پانے والے اسسٹنٹ کو ایڈیٹر بنایا جاتا ہے - ہرگز نفع آور ثابت نہیں ہوسکتی - یہ صفید کفایت شعاری اور مصلحت کے سراسر نقیض ہے - جو اخبارات ہندوستان بھر کے و نیکلر اخباروں میں "کثیر الاشاعت" ہونے کے مدعی ہوں انھیں خبروں کے سوا ماہروں سے خاص خاص مسائل پر معقول معاوضہ دے کر مضامین لینے کا انتظام کرنا چاہئے جس سے ان کی شہرت اور اثر بلند پایہ اصحاب کی نگاہوں میں بڑھے گا - اور ان کی آرا خاص وقعت حاصل کریں -

(۲) مالکان اخبارات کو انتظام کی طرف توجہ خاص توجہ دینا چاہئے جس کی خوبی پر منافع اور نیک نامی اور اثر و اقتدار موقوف ہے - چھبیس سال کے تجربہ اور مشاہدہ اور غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں - کہ اردو

(نیز انگریزی) اخباروں کی ناکامی اور تنزل کا ایک بڑا سبب دفتر کی اندھیر نگری ہے۔ اس قصہ سے یہ لازم ہے کہ اچھے تجربہ کار اور انتظامی اہلیت سے آراستہ اور روشن خیال آدمی مقرر کرنے چاہئیں۔ اخبار کی آمدنی کا ایک بڑا وسیلہ اشتہارات ہوتے ہیں۔ اگر تربیت یافتہ گریجویٹ لگائے جائیں۔ تو تاجروں سے خط و کتابت کرکے اشتہار حاصل کرکے مستفید ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ بسا ضروری ہے۔ کہ اخبار کے دفتر میں قرینہ اور قاعدہ ہو۔ ملازموں کے مشاہرے۔ ترقی۔ رخصت اور تقسیم منافع کا خاص اہتمام ہو۔ تاکہ کام کرنے والوں کو دلی شوق اور ذمہ داری سے کام کرنے کا حوصلہ ہو۔ فی زمانہ ایف۔ اے اور بی۔ اے بکثرت دستیاب ہو سکتے ہیں۔ جب آپ اور باتوں میں ولایتی اخباروں کی تقلید کرتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ دفتر کے قاعدہ اور انتظام میں آپ ان کی پیروی نہ کریں خوش انتظامی اور سلیقہ شعاری پر مالی کامیابی کا تمام تر انحصار ہے۔ اس پر ساری توجہ مرکوز ہونا چاہئے۔

(۳) اردو اخباروں کی قیمت بمقابلہ انگریزی اخباروں کے زیادہ ہے۔ اس کی تخفیف اخبارات کی ترقی اور توسیع اشاعت کی معاون ہوگی۔ اس مقصد سے بہترین مشینری اور کم خرچ طریق طباعت سے کام لینا ضروری ہے ایسی مشینیں بہم پہونچ سکتی ہیں۔ جو ایک گھنٹہ میں موجودہ چھاپہ خانہ کی دقیانوسی مشینوں سے دگنا اور اس سے بھی زیادہ چھاپ سکتی ہیں۔ نستعلیق ٹائپ تیار ہونے میں عرصہ درکار ہے۔ اس لئے کاتبوں سے کام لینا لازم ہے۔ مگر اور باتوں میں کفایت ہو سکتی ہے جس سے اخبار تیار کرنے کا خرچ بخوبی گھٹ سکتا ہے۔

(۴) آخر میں اردو اخبارات کی ترقی اور نیک نامی اور اثر و اقتدار کی توسیع کے واسطے یہ لازم ہوگا کہ بھان متی کا تماشا دکھانے والوں کی طرز عمل سے قطع مل جل کر کام چلایا جائے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ لاہور میں اب پانچ ہندو روزانے عوام کی سرپرستی حاصل کئے ہوئے ہیں اور یہ پانچوں اپنے کو "نیشنلسٹ" (قوم پرست) مشہور کرتے ہیں۔ اگر یہ سب مل کر ایک بڑی کمپنی بنالیں۔ اور ایک قوم پرست روزانہ اور دوسرا ہفتہ وار ایک ماہانہ رسالہ اور اپنے مقصد کی کتابیں شایع کرے۔ تو کام بڑا شاندار اور منافع حاصل ہوگا۔ اور اخبار کی اشاعت خاص کوشش سے ان کی مجموعی اشاعت سے دگنی تگنی ہو سکتی ہے۔ ان کے موجودہ مالک ایڈیٹر ایک ایک ضروری کام اپنے ہاتھ میں لیکر پوری توجہ کے ساتھ کام انجام دے سکتے ہیں۔ کمپنی نئی مشینری منگا کر اعلےٰ پایہ کا پریس بھی چلا سکتی ہے۔ مشترکہ سرمایہ کی کمپنی میں استقلال ہوگا۔ اور اس کے کاروبار پر عوام کو پورا بھروسہ ہوگا۔ ایک آدمی اشاعت کا اہتمام کر سکتا ہے۔ اور دوسرا اعلےٰ منتظم۔ تیسرا پریس کا منیجر چوتھا کتابوں کا ذمہ دار بن سکتا ہے۔ بیسوں آدمیوں کے واسطے روزگار بہم پہونچ سکتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ہوگا کہ دنیا پر ہماری صداقت انتظامی روشن ہو جائے گی۔ اگر ہم اپنے معمولی کاروبار اچھی طرح انجام نہیں دے سکتے تو ملک کی حکومت کیسے چل سکتی ہے۔

اسی طرح لاہور کے تین روزانے مسلم اخبارات ایک مشترکہ کمپنی بنا کر اپنے اخبار چلا سکتے ہیں۔ اگر اخبارات

(بقیہ صفحہ ۹۵۷ پر دیکھئے)

ہندوستانی اکیڈیمی جرنل

شہزادوں کا امتحان

جناب ڈاکٹر اے صدیقی صدر شعبہ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی و رکن ادارہ "ہندوستانی اکیڈیمی جرنل"

"تاریخ اور کہانی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دنیا میں قدر دونوں کی ہے۔ مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ زیادہ قدر کس کی ہے بچوں کو ہمیشہ اور بوڑھوں کو کبھی کبھی کہانی زیادہ پسند ہوتی ہے۔ مذہبی مزاج والوں اور علم کے قدر شناسوں کے ہاں تاریخ کے چڑھاوے ہیں، کہانی کہنے اور سننے والا دونوں گنہگار۔ بعضے ثقہ لوگ تو اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ اگر دھوکے سے بھی کہانی کے کچھ لفظ اُنکے کانوں تک پہنچ جائیں تو بغیر کفّارہ دیئے اُنھیں چین نہ آئے۔ اُن سے اُتر کر کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تحقیق کے جوش میں ہر کہانی کو سُن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، اور "واہیات، مزخرفات" کہہ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر بھی اہل قلم کا ایک گروہ ایسا ہے جو کہانیوں کو پسند ہی نہیں کرتا۔ بلکہ اُن کو قوموں کی دماغی زندگی کے ضروریات میں سے جانتا ہے۔ اِسی گروہ میں سے ایسے لوگ بھی ہوتے چلے آئے ہیں جنھوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ذریعہ کہانی ہی کو بنایا ہے۔ ہندوستان میں کلیلہ و دمنہ کا مصنف، ایران میں شیخ سعدیؒ، روم میں مولانا جلال الدین رومیؒ اسی گروہ میں سے تھے۔

کہانیاں بھی کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جن کا مقصود صرف بچوں کا بہلانا ہوتا ہے کہ کہانی ختم نہیں ہونے پائی اور وہ سو گئے۔ اور اگر نہ سوئے تو جب تک کہانی ہوتی رہی ہنستے رہے اور ختم ہو گئی تو فوراً دوسری کا تقاضا شروع ہو گیا۔ ایک کہانی وہ ہوتی ہے جسے سن کر ہوشمند لوگ بھی کہیں کہ خوب ہے۔ کہانیاں سچ مچ کے واقعے نہیں ہوتیں مگر اُن کی خوبی کی دلیل یہی ہے کہ آدمی اُن کو جب تک سنتا رہے اُس کو یہی خیال ہو کہ گویا یہ سب ایسے واقعات بیان ہو رہے ہیں جو سچ مچ بیت چکے ہیں۔ اِسی طرح کی کہانیوں کی ایک اور قسم بھی ہے جسے ہم "تاریخی کہانی" کہتے ہیں۔ تاریخی کہانی کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ واقعات تاریخی ہوں اور اُن میں رنگ کہانی کا سا دیا جائے۔ تاکہ مدرسوں کے بچے دھوکے میں آ کر اُنھیں کہانی ہی سمجھیں اور کہانی کے بہانے اُنھیں تاریخ کے واقعات یاد ہو جائیں۔ دوسری صورت یہ کہ اُس کے واقعات کے متعلق ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے، کہ وہ حقیقت میں گذرے بھی تھے۔ مگر جن تاریخی اشخاص کے متعلق وہ کہانی گڑھی گئی ہے اُن پر وہ ایسی چسپاں ہوتی ہے، کہ اُسے سراسر جھوٹ کہہ دینا مشکل ہوتا ہے۔

جو کہانی ہم تمھیں آج سنائینگے، وہ اِسی آخری قسم کی ایک تاریخی کہانی ہے:۔

شاہجہاں بادشاہ ایکدن اپنے خلوتخانے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ خدمتگار نے آکر عرض کی: "وزیر صاحب حاضر ہیں"۔ بادشاہ نے ارشاد فرمایا: "بلالو"۔ سعد اللہ خاں وزیر اعظم

حاضر ہوئے تو بیٹھنے کا اشارہ پاکر آداب بجا لائے۔ سعد اللہ خاں نے بادشاہ سلامت کو فکر مند پایا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی: "نصیبِ اعدا کچھ فکر و اندیشہ معلوم ہوتی ہے؟"

شاہ جہاں: "ہاں سعد خاں تم ٹھیک سمجھے۔ میں اِس امر پر اکثر غور کیا کرتا ہوں اور آج تک فیصلہ نہ کر سکا کہ اپنے چاروں بیٹوں میں سے کس کو ولی عہد کروں؟"

سعد اللہ خاں چُپ ہو کر کچھ سوچنے لگتا ہے۔

شاہ جہاں: "تمھاری رائے میں چاروں میں کون سب سے بہتر ہے؟"

سعد اللہ خاں (ہاتھ جوڑ کر): "حضور کا اقبال بلند رہے فدوی کی کیا مجال کہ شہزادگانِ والاتبار کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرے۔"

شاہ جہاں: "بڑی مشکل ہے۔ میں خود فیصلہ نہیں کر سکتا سو اُس کی تو وجہ یہ ہے کہ باپ کے نزدیک سب بیٹے برابر ہیں۔ تم سے پوچھتا ہوں تو تم اپنی رائے ظاہر کرنا مصلحت نہیں جانتے"

سعد اللہ خاں: "بجا ارشاد ہے۔ پیر و مرشد کو جس طرح شفقتِ پدری مانع ہے۔ اُسی طرح اِس فدوی کو سُوءِ ادب کا خیال کوئی رائے قائم نہیں کرنے دیتا۔"

شاہ جہاں: "سُوءِ ادب کا خیال! اِن ڈھکوسلوں سے کیا فائدہ؟ وہ پھر بھی بچے ہیں اور تم بوڑھے آدمی ہو، سلطنت کے وفادار ہو، عقیل اور مُدبّر ہو، رائے تمھاری ہر معاملے میں صائب ہوتی ہے۔ اِن لڑکوں کو تم نے بچپن سے دیکھا ہے۔ ایک ایک کی اُفتادِ مزاج سے واقف ہو، بھلا میں کیسے مان لوں کہ تم اُن کی اہلیت یا نااہلی کے متعلق کوئی رائے ہی نہیں رکھتے؟ اگر تم اِس امر میں کوئی رائے نہیں رکھتے تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ میں کسی سے صلاح مشورہ نہیں کر سکتا۔"

سعد اللہ خاں: "حضور اگر فدوی کی گستاخی معاف فرمائی جائے تو ——— تو عرض کرے ——"

شاہ جہاں: "میں تم سے رائے پوچھ رہا ہوں۔ اپنا خیال ظاہر کر دینے میں تم کو اس درجہ پس و پیش کیوں ہے؟"

سعد اللہ خاں: "فدوی کی کیا مجال کہ اپنے خیال کے بیان کرنے میں پس و پیش کرے، مگر معاملہ بہت اہم اور نازک ہے۔ اِس خاص نظر سے فدوی نے کبھی شاہزادگانِ والاتبار کی قابلیتوں پر غور کیا، اور نہ اُن کو جانچا۔"

شاہ جہاں: "یہ ٹھیک ہے۔ میرا منشا یہ نہیں کہ تم اِسی وقت جواب دو۔ سوچ کر جواب دینا، مگر جلد۔"

سعد اللہ خاں (ہاتھ جوڑ کر): "جو ارشادِ عالی (دل و زبان سے) مگر ——"

شاہ جہاں: "کیوں؟ ابھی کچھ خلجان باقی ہے؟ دو تین دن غور کر لو، اُس کے بعد اپنی رائے بیان کرنا۔"

سعد اللہ خاں چپ رہ جاتا ہے۔

شاہ جہاں: "اگر اور کچھ کہنا ہے تو کہو، اور بے کھٹکے کہو۔"

سعد اللہ خاں (ہاتھ جوڑ کر): "فدوی کو زیادہ تکلف اِس وجہ سے ہے کہ پوری جانچ کے بغیر ایسے اہم معاملے میں رائے دینا ممکن نہیں۔ اور مجھ نمک خوار کا امتحان لینا صاحبزادگانِ والا مرتبت کی شان کے خلاف ہوگا۔"

شاہ جہاں (غصے کے لہجے میں): "سعد اللہ خاں! آج تم کو کیا ہو گیا ہے؟ میں اُن باپوں میں نہیں ہوں جو اولاد کے ناز اُٹھا کر اُنھیں خراب کرتے ہیں۔ تمھاری رائے پر عمل کیا جائے تو شہزادوں کی تعلیم و تربیت کچھ بھی نہ ہو سکے۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ چاروں لڑکوں کا سخت امتحان لو، اور جس طرح تم مناسب سمجھو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مجھے

ایک دن اپنے مالک کے سامنے کھڑے ہوکر اس کا جواب دینا پڑیگا کہ میں نے اپنی رعایا کی فلاح کا کیا انتظام کیا اور ملک کو کیسے شخص کے ہاتھ میں دیا۔ وہاں یہ عذر ہرگز نہ سُنا جائیگا کہ میرے نزدیک چاروں برابر تھے، اُنھیں میں سے ایک کو کر دیا۔"

سعد اللہ خاں: "بجا ارشاد۔"

سعد اللہ خاں پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ شاہ جہاں بھی آبدیدہ ہوجاتا ہے اور بھرّائی ہوئی آواز میں یوں کہتا ہے:-

"جاؤ، اب امتحان کا انتظام کرو۔ دیکھو امتحان سخت ہو۔ کسی قسم کی رورعایت کو ہرگز دخل نہ دینا۔ کل آکر مجھے بتانا، کہ تم نے کیا انتظام کیا ہے اور امتحان لینے کی کیا تدبیریں سوچی ہیں۔"

سعد اللہ خاں (ہاتھ جوڑکر): "ایسا ہی ہوگا۔" (اشارہ پاکر آداب بجا لاتا ہے اور رخصت ہوتا ہے۔)

دوسرے دن فجر کی نماز اور وظیفے سے بادشاہ سلامت نے جوں ہی فراغت پائی، سعد اللہ خاں کو یاد فرمایا۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی، کہ وزیر صاحب حاضر ہوکر آداب بجا لائے شاہ جہاں نے بیتابی سے پوچھا: "کہو کیا بندوبست کیا؟"

سعد اللہ خاں (ہاتھ جوڑکر): "چاروں صاحب بغیر فدوی کو اطلاع کیئے ہوئے کسی سے نہ ملیں سوا چند ملازموں کے جو نامزد کر دیے جائینگے۔ کسی کو شاہزادوں کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت نہ ہوگی۔ جو خاصہ فدوی تجویز کریگا اُسکے سوا کھانے پینے کی کوئی چیز وہاں تک نہ پہنچ سکیگی۔ ایک پرچہ نویس ہر وقت حاضر رہیگا۔ جس کے ذریعے سے فدوی کو سب حالات معلوم ہوتے رہینگے۔"

شاہ جہاں: "نہایت مناسب۔ اچھا۔"

سعد اللہ خاں آداب بجا لاکر رخصت ہونے لگتا ہے۔

شاہ جہاں: "مگر دیکھو، کوئی کمی نہ کرنا۔ جانچ پوری ہو۔"

سعد اللہ خاں کے چلے جانیکے بعد شاہ جہاں نے چاروں بیٹوں کے پاس کہلا بھیجا، کہ ہم نے سعد اللہ خاں کو تمھارا امتحان لینے کا حکم دیا ہے۔ جو کچھ وہ کہیں، اُس کی پوری پابندی کی جائے۔"

جوں ہی سعد اللہ خاں کو اِس پیام کی خبر پہنچی، اُس نے اپنے احکام جاری کر دیے۔ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ اُسے معلوم ہوا کہ سارے محل میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، اور ہر طرف چمیگوئیاں ہو رہی ہیں۔ پرچہ نویس نے جو خبر دی اُس سے معلوم ہوا کہ داراشکوہ نے نہ صرف سعد اللہ خاں کو بُرا بھلا کہا، بلکہ باپ کی شان میں بھی نا ملائم کلمے زبان پر آئے۔ شجاع اور مُراد نے بھی سخت غصے کا اظہار کیا۔ مگر عالمگیر نے کوئی رائے نہیں ظاہر کی۔ مسکرا کر چپ ہوگیا۔ اور بدستور اپنے اشغال میں مشغول رہا۔ پکے پکائے کھانے کے بجائے کچّی جنس کو پسند کیا۔

اُن تینوں صاحبوں کا یہ حال تھا کہ سعد اللہ خاں کا بھیجا ہوا جو کھانا آتا اُسے پھینکوا دیا کرتے۔ نوکروں کے ذریعے سے کھانے کا انتظام ہوتا اور ایک ایک کی جگہ چار چار خرچ ہوتے اور اخراجات بھی تھوڑے دنوں تک حسب معمول جاری رہے، مگر آٹھ ہی سات دن بعد شہزادوں کو معلوم ہوا کہ تحویل میں کچھ باقی نہیں۔ مقرّب نوکروں نے عرض کی کہ سرکار کچھ فکر نہ کریں روپیے کا انتظام ہو جائیگا۔ دو چار روز یوں گذرے اس کے بعد اُنھیں نوکروں نے عرض کی کہ سرکار اگر حکم ہو تو کسی مہاجن سے معاملہ کر لیا جائے۔ اس تجویز پر خوشنودی کا اظہار ہوا اور ایک سے

بجائے دو دینے کا وعدہ۔ غرض کہ اِس محاصرے کو پندرہ دن گذر گئے۔ سعد اللہ خاں کو رتی رتی حال معلوم ہوتا تھا۔ وہ چشم پوشی کرتا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ بندش سخت کرنے لگا۔ جب ایک ہفتہ باقی رہا تو جو کھانا سعد اللہ خاں کے حکم سے آتا تھا وہ بہت ہی ردی درجے کا ہوتا تھا اور اِتنا کم کہ آدمی کا پیٹ مشکل سے بھرے یہ تو وہ جانتا ہی تھا کہ کھانے کی اِس کمی یا خرابی کا کوئی اثر شہزادوں پر نہ ہوگا۔ اِس لیئے کہ مہاجن کے یہاں سے انتظام کافی ہے۔ جب امتحان کی مدت کے ختم ہونے میں صرف چار دن باقی رہے تو بجائے دو وقت کے کھانا ایک ہی وقت آنے لگا۔ اور اخیر کے دو دن کھانے کی قسم سے کوئی چیز سعد اللہ خاں نے بھیجی ہی نہیں۔ خدا خدا کرکے امتحان کے ختم ہونے کا دن آیا سعد اللہ خاں فجر کی نماز پڑھ کر شہزادے دارا شکوہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دارا شکوہ بہت ہی اخلاق سے پیش آیا۔ حد سے زیادہ آؤ بھگت کی۔ بات بات پر وزیر صاحب کی قابلیت اور خوش تدبیری کا راگ گاتا۔ رخصت ہونے سے پہلے خلعت ہفت پارچہ عطا فرمایا۔ وہاں سے اٹھ کے سعد اللہ خاں سلطان شجاع اور سلطان مُراد کے حضور میں حاضر ہوا۔ وہ بھی بے حد تواضع سے پیش آئے۔ بلکہ مُراد نے تو جب اُن کے آنے کی خبر سُنی تو اُنکے استقبال کو دَوڑ پڑا۔ اور بڑے تپاک سے لیجا کر صدر میں بٹھایا۔ قصہ مختصر تینوں سرکاروں سے بھاری بھاری خلعت پا کر سعد اللہ خاں عالمگیر کے درِ دولت کی طرف چلا۔ دروازے پر پہنچا تو کسی خدمتگار تک نے بات نہ پوچھی۔ ڈیوڑھی کے اندر قدم رکھا تو ایک چوبدار نظر پڑا۔ دریافت کیا۔ کہ شہزادے صاحب کہاں تشریف رکھتے ہیں۔ جواب ملا کہ سب سے اوپر کی منزل میں جلوہ افروز ہیں۔ سعد اللہ خاں ایک تو بوڑھا آدمی دوسرے موٹا، پان سات زینوں کی چڑھائی اُس غریب کے لیئے مصیبت ہوگئی۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا چڑھنا شروع کیا، ایک زینہ طے کر چکتا تو تھوڑی دیر دم لیتا اور پھر آگے بڑھتا۔ خدا خدا کرکے آخری زینے پر پہنچا اور یہ امید بندھی کہ اب جلد آرام سے بیٹھنے کا موقع ملیگا۔ لیکن اُسے کیسی کچھ مایوسی ہوئی ہوگی جب وہ زینے کے دروازے سے نکل کر صحن میں پہنچا اور دیکھا کہ اُس ساری منزل میں نہ کوئی فرش ہے نہ چٹائی۔ سامنے ہی کے رواق میں ایک سیتل پاٹی کی جانماز بچھی ہے۔ جس پر خود بدولت بیٹھے کلام اللہ کی تلاوت میں مصروف ہیں۔ اب تو سعد اللہ خاں بہت گھبرایا اور دل میں کہنے لگا کہ اور سب کا تو میں نے امتحان لیا مگر اِس نے میرا امتحان لے لیا۔ اب دیکھا چاہیئے یہ حضرت تلاوت سے کب فارغ ہوں اور کب میری فریاد کو پہنچیں ایک ایک گھڑی ایک ایک دن کے برابر معلوم ہو رہی تھی مگر "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کھڑا رہا۔ بڑی دیر کے بعد عالمگیر نے تلاوت ختم کی اور سر اٹھایا تو خدمتگار سے ناخوشی کا اظہار کیا۔ اور وزیر صاحب سے یوں کہنے لگا: "آپ کو ناحق تکلیف اُٹھانا پڑی مجھے اطلاع ہوگئی ہوتی تو میں خود نیچے چلا آتا۔ اور ویسے بھی تلاوت کے بعد میں نیچے چلا جایا کرتا ہوں۔" سعد اللہ خاں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی: "اِن لوگوں کی خطا نہیں، فدوی نے اِس کو خلاف ادب سمجھا کہ حضور کو تکلیف دے۔" عالمگیر نے معمولی مزاج پرسی کی اور پوچھا: "آپ نے کسی خاص غرض سے تکلیف کی؟" سعد اللہ خاں نے جواب دیا: "صرف شرفِ حضوری مقصود تھا۔ بہت دنوں سے حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔"

عالمگیر: "کہیئے شہر کا کیا حال ہے؟"

سعد اللہ خاں: "حضور کے اقبال سے ہر طرف خوشحالی اور امن کا عمل ہے"

عالمگیر: "الحمد للہ آج کل غلے کا کیا بھاؤ ہے؟"
سعد اللہ خاں: "حضور گیہوں تین من کا بک رہا ہے اور چاول ـــــ"
عالمگیر (بات کاٹ کر): "نہیں، میں ان چیزوں کو نہیں پوچھ رہا ہوں۔ غریب رعایا کے کھانے کے غلوں کا نرخ معلوم کرنا چاہتا ہوں"

سعد اللہ خاں یہ سن کر سناٹے میں رہ گیا اور معذرت کے طور پر کہنے لگا: "فدوی کا حافظہ اس وقت یاری نہیں دیتا۔"

اس پر عالمگیر نے پند و نصیحت کا ایک دفتر کھول دیا اور سعد اللہ خاں کو وزیروں کے فرائض پر ایسا سبق دیا کہ وہ تمام عمر نہ بھولا ہوگا۔ اس کے بعد عالمگیر نے رخصت ہونے کی اجازت دی۔ سعد اللہ خاں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی: "آج صبح کو فدوی حضور کے برادران والا تبار کے حضور میں بھی حاضر ہوا۔ تینوں صاحبوں نے گراں پایہ خلعت سے اس ذرۂ بے مقدار کو سرفرازی بخشی۔ فدوی کی بڑی بدنصیبی ہوگی اگر اس دربار سے خالی ہاتھ جانا پڑا۔" یہ سن کر عالمگیر مسکرا دیا اور کہنے لگا: "خلعت کسی کارگزاری پر دیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی محل تو ہے نہیں، لیکن میں آپ کی استدعا کو رد نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے ملبوس خاص عطا کیا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر اپنا مینی پاک جو گزی کا ہاتھ بھر کپڑا تھا سعد اللہ خاں کو اُڑھا دیا۔ سعد اللہ خاں نے سات سلام کرکے اُسے لیا اور آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا، اور دعائیں دیں۔ عالمگیر نے کہا: "میں یہ پھر کہے دیتا ہوں، کہ یہ خلعت آپ کو صرف اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ میں نے آپ کی بات کو رد کرنا پسند نہیں کیا۔ اور میرے بھائیوں نے جو خلعت دیے وہ آپ کی خوشامد میں دیے اس لیے کہ وہ تو ہمیشہ سے بھوکوں مر رہے تھے۔ یہاں اس کی مطلق ضرورت نہیں، میں جو پہلے کھاتا تھا اب بھی کھاتا ہوں، بلکہ اگر یہی صورت رہے جو اس وقت ہے اور آپ جنس بھیجنا بند رکھیں تو میرے خزانے میں ابھی اتنی جنس بچی رکھی ہے کہ کئی روز چلیگی۔ اس کے بعد خدا رزاق ہے۔" نوکر کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک بڑا مٹکا سامنے لا کر رکھ دیا۔ کھولا گیا تو بھرا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک کاغذ بھی رکھا تھا وہ نکال کر عالمگیر نے سعد اللہ خاں کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا: "یہ اس جنس کی آمد و خرچ کا حساب ہے، جو آپکے حکم سے روزانہ آیا کرتی تھی۔ اس حساب سے ابھی دس دن کا آذوقہ باقی ہے۔" سعد اللہ خاں نے گردن جھکالی اور کہا: "فدوی کی مجال نہ تھی کہ ایسی گستاخی کرتا لیکن ضرورت مجبور کر دیا کرتی ہے۔"
عالمگیر: "میں آپ سے شکایت نہیں کرتا، نہ مجھے اسکا کوئی رنج ہے۔"
سعد اللہ خاں نے سلام کیا اور رخصت ہوا۔

بادشاہ سلامت کو بھی خبر پہنچی کہ امتحان ختم ہوا، مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ نتیجہ کیا نکلا۔ خلوت کے وقت سعد اللہ خاں کی یاد ہوئی۔ سعد اللہ خاں جانتا تھا کہ جلد بلایا جائیگا۔ اس لیے تیار ہی بیٹھا تھا۔ امتحان کا نتیجہ ذہن میں ترتیب دے چکا تھا۔ طلبی کی خبر آئی تو فوراً بوچے پر سوار ہو کر محل کو روانہ ہوا۔ شاہی خلوتخانے میں داخل ہو کر آداب بجا لایا۔ بادشاہ سلامت نے خندہ پیشانی سے جواب دیا اور قریب بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ ذرا دیر بعد یوں ارشاد ہوا: "کہو امتحان ختم ہو گیا؟"
سعد اللہ خاں: "حضور۔"
شاہجہاں (مسکرا کر): "نتیجہ سننے کے ہم بھی مشتاق ہیں۔"
سعد اللہ خاں: "اجازت ہو تو فدوی تفصیل سے عرض کرے۔"
شاہجہاں: "ضرور۔"
سعد اللہ خاں: "فدوی نے جو یہ خاص طریقہ اختیار کیا، اس کا سبب یہ تھا کہ کسی کتاب کی عبارتیں یاد ہونے یا کسی علم

کے مسائل مستحضر ہونے کی جانچ تو تھی ہی نہیں۔ دیکھنا یہ تھا کہ جب مشکلات اور تکلیفوں کا سامنا ہو تو طبیعت کا رنگ کیا ہوتا ہے۔ اور اُن مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا تدبیریں عمل میں لائی جاتی ہیں۔ فدوی نے یہ خیال کیا کہ شہزادوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت اُسی وقت ہوتی ہے جب اُن کے خزانے خالی ہوں اور خرچ کرنے کو روپیہ پاس نہو، جس پرتکلف کھانے کی بچپن سے عادت رہی ہو اُس کی جگہ بہت معمولی قسم کا کھانا میسّر آئے اور وہ بھی نہایت کمی کے ساتھ، اِس کے علاوہ وہ حکومت بھی باقی نہ رہے جس کے وہ عادی تھے بلکہ کوئی دوسرا شخص جو رتبے میں اُن سے کم ہو اُن پر حکومت کرے، اِن تمام باتوں کو مدِ نظر رکھ کر فدوی کی سمجھ میں یہ تدبیر آئی کہ نظربندی کی سی صورت پیدا کر دی جائے، اور پھر یہ اندازہ کیا جائے کہ کون صاحب اپنے وقار کو قائم رکھ کر اِن دقتوں کو جھیل سکے اور جو تدبیریں اختیار کیں اُن سے ہوشمندی اور کردار کی قوت ظاہر ہوتی ہے یا سراسیمگی اور کمزوری۔"

شاہجہاں: "بیشک یہی طریقہ درست تھا اور اِس پر اِس وقت بحث کرنیکی ذرا بھی ضرورت نہیں۔ میں یہ جانتا تھا کہ جانچ کا جو ڈھنگ تم اختیار کروگے وہ مناسب ہوگا اور اگر مجھ کو تم پر پورا بھروسا نہوتا تو میں تم سے امتحان لینے کو کہتا ہی نہیں۔"

سعداللہ خاں: "حضور کی ذرّہ نوازی ہے ورنہ غلام کس قابل ہے؟"

شاہجہاں: "ہاں، تو بتاؤ کیا رائے قائم کی؟"

سعداللہ خاں: "پورا ایک مہینا یہ مصنوعی نظربندی قائم رہی۔ روز کی خبر فدوی کو پہنچتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت برہمی کا اظہار فرمایا جارہا ہے اور ایسے کلمات استعمال ہوتے ہیں جو شاہانہ شخصیتوں کے لیے کسی طرح زیبا نہیں۔ تدبیر یہ کی گئی کہ جو خاصہ فدوی اپنے اہتمام میں تیار کرا کر بھیجتا تھا وہ پھنکوا دیا جاتا تھا۔ اور حسب عادت پرتکلّف کھانے پکوائے جاتے تھے۔ جب روپئے کی کمی پڑی تو مہاجنوں سے بہت سخت شرح سود پر قرض لیا گیا۔ کفایت کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی، بلکہ نوکر چاکروں کو نفع حاصل کرنیکا بڑا موقع ہاتھ آیا۔ اور ایک ایک کی جگہ دس دس خرچ ہوئے۔ جب آج صبح کو فدوی درِ دولت پر حاضر ہوا تو حد سے زیادہ تپاک اور غیر معمولی عنایت اور مرحمت سے تواضع کی گئی، اِس حد تک کہ حفظ مراتب کا خیال بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اِس بے مقدار کی ایسی تعریف و توصیف کی گئی جس کے مقابلے میں شاعروں کا مبالغہ بھی گرد تھا۔ نہایت قیمتی خلعت فدوی کو ملے اور یہ نہ معلوم ہوا کہ کس کارِ نمایاں کے صلہ میں۔ اور لطف یہ کہ یہ معلوم تھا کہ جو کلمے غلام کے متعلق غلام کی غیر موجودگی میں روزمرہ استعمال ہوا کرتے تھے اُنکی خبر فدوی کو پہنچتی رہتی تھی۔ غرض کہ اِس مہینے بھر میں ایک بات بھی ایسی ظہور میں نہیں آئی جس کے بارے میں یہ کہا جاتا کہ شہزادوں کی شان کے مطابق تھی۔ کوئی تدبیر ایسی عمل میں نہیں آئی جس کو ہم تدبیر کا نام بھی دے سکیں، سوا ایک عالمگیر کے سب صاحبوں کا ایک ہی سا حال تھا۔ سب سے آخر میں فدوی اُن کی حضور میں حاضر ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو جو حال ہمیشہ سے تھا اب بھی ہے۔ وہی جاہ و جلال اور وہی سادگی، وہی مشاغل، وہی باضابطگی۔ مجھ بوڑھے کا ساتویں منزل تک سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے فشار ہوگیا۔ اوپر پہنچ کر دیکھا تو نہ بیٹھنے کی جگہ نہ لوٹنے کی مجال۔ اب سمجھ میں آئی کہ یہ اِس خطاکار کی بداعمالیوں کی یاداش تھی۔ کم سے کم آدھا گھنٹا کھڑا رہا۔ تب حضرت کلام اللہ کی تلاوت سے فارغ ہوکر متوجہ ہوے۔ خدمتگاروں پر ناخوش ہوئے کہ وزیر صاحب کو یہاں تک

[بقیہ صفحہ ۸۷۶ پر دیکھئے]

نشاطِ روح

[جناب مولانا اصغر حسین صاحب اصغر گونڈوی ایڈیٹر "ہندوستانی اکیڈیمی جرنل" الہ آباد]

لٹئے بیرنگ کا سو رنگ سے رسوا ہونا
کبھی میکش، کبھی ساقی، کبھی مینا ہونا

از ازل تا با بد محو تماشا ہونا
میں وہ ہوں جس کو نہ مرنا ہے نہ پیدا ہونا

سارے عالم میں ہے بیتابی و شورش برپا
ہائے اس شوخ کا ہشکل تمنا ہونا

فصلِ گل کیا ہے؟ یہ معراج ہے آب و گل کی
مری رگ رگ کو مبارک رگِ سودا ہونا

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے پنہاں بھی ہے
جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا ہونا

تری شوخی، تری نیرنگ ادائی کے نثار
اک نئی جان ہے تجدید تمنا ہونا

جلوۂ حسن کو ہے چشم تحیر کی طلب
کس کی قسمت میں ہے محروم تماشا ہونا

اس سے بڑھ کر کوئی بے راہ روی کیا ہوگی
گام پر شوق کا منزل سے شناسا ہونا

اہلِ شعر و غزل پھر ہے طبیعت اصغر
ابھی کچھ اور مقدر میں ہے رسوا ہونا

(خاص)

[صفحہ ۸۶۳ کا بقیہ]

تکلیف دی، مجھے نہ اطلاع کردی کہ میں خود نیچے اتر چلیا۔ یہ اس مصیبت زدہ کی اشک شوئی تھی، جس پر فدوی کو خود ہی آگے معذرت سی کرنی پڑی۔ اس طرح یہ معاملہ شہزادے صاحب کی فتح اور اس جہاندیدہ کی شکست پر ہوا۔ اس کے بعد گفتگو مختلف ملکی اور مالی امور پر شروع ہوئی، اور اس خصوص میں بھی جیت انھیں کی رہی۔ غلے کا نرخ پوچھ کر آشا ممتحن کا امتحان لے لیا۔ اور یہ ایسی کڑی ہار تھی، جس پر فدوی عمر بھر شرمندہ رہیگا۔ آخر میں جب فدوی نے دیکھا کہ تین بارگاہوں سے خلعت ہفت پارچہ اور مرصع سیرپیچ سے سرافراز ہو چکا ہے اور چوتھی بارگاہ سے خالی خولی لوٹ رہا ہے تو لالچ نے ستایا اور ساری عزت کو بالائے طاق رکھ کر حرفِ مطلب زبان پر لایا۔ بجائے خلعت کے ٹکا سا جواب پایا اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔ اپنے جی میں اپنے تئیں ملامت کرتا تھا کہ یہ تونے کیا بے محل استدعا کی! حیران تھا کہ یہ خفت کس طرح مٹاؤں، خود بدولت نے بشرے سے دل کی کیفیت کو تاڑ کر فرمایا: "خیر میرے سوال کو ہم رد نہیں کرتے، ملبوسِ خاص عطا کرتے ہیں۔" اس نیم جان کی

جان میں جان آگئی۔ پچھلی کلفتیں ایک ہی فقرے میں کافور ہو گئیں۔ مگر جب ہاتھ بڑھایا تو گزی کا آدھ گز ٹکڑا تھا۔ گفتگو کے سلسلے میں ایک مناسب موقع پر یہ بھی جتا دیا کہ ابھی اگر آٹھ دس دن تو کھانے کو کچھ نہ بھیجتا تو بھی مجھے پروا نہ ہوتی۔ مہینے بھر سے جو آزوقہ آتا رہا اُس کے جمع اور خرچ کا حساب یہ موجود ہے۔ یہ مختصر سا حال ہے اُس امتحان کا جو آج ختم ہوا۔ اُن تینوں صاحبوں نے اس بات کا پورا ثبوت دے دیا، کہ جب اُن کے لیے تنعم کے سامان موجود ہوں اور اُس کے سارے ذرائع مہیا، تو وہ اپنے ظاہری وقار کو قائم رکھ سکتے ہیں نہیں تو خیر و عافیت۔ بخلاف اس کے چھوٹے صاحب نے وہ اصول قائم کر رکھے ہیں اور زندگی کا وہ اسلوب اختیار کیا ہے، جس کے مقابلے میں ہر حملہ کرنیوالے کی شکست یقینی ہے۔ اس امتحان میں ہر قدم پر بلند اقبال شاہزادے نے اپنی برتری اور ممتحن کی کم مائگی اس خوبصورتی سے اور اس شان سے ثابت کی ہے جو فدوی کے تو حاشیہ خیال میں بھی نہ تھی

+ + + + + + + + + + + + + +

(خاص)

تحریر کی ماہیت

[جناب محمد نعیم الرحمن صاحب ایم اے رکن ادارت "ہندوستانی اکیڈیمی جرنل" الہ آباد]

تہذیب و تمدن نے ہمیں اس قدر طویل زمانہ سے تحریر اور اُس کی ظاہری وضع اور شان سے آشنا کر رکھا ہے کہ ہمیں کبھی اس کا خیال بھی نہیں آتا، اور اگر آتا بھی ہے تو نہایت شاذ موقعوں پر، کہ ہماری تحریر — عام اس سے کہ وہ انسان کی کسی برادری یا قوم کی ہو — کیسی کچھ عجیب و غریب اور پر اسرار چیز ہے۔ آج بیسویں صدی کے ایک چوتھائی حصے کے گذرنے کے بعد، اگر کوئی شخص اپنے اس دعوی کو ثابت کر دیتا ہے کہ وہ کسی کے خیال کی رَو کو اپنے ذہن کے نہاں خانہ میں وصول کر کے اس کے خیالات کو "پڑھ" کر بیان کر سکتا ہے، تو ہم اُسے صاحبِ کمال اور اس کے "کمال" کو کرامات سمجھتے ہیں۔ اگر اسی تناسب سے اس پر غور کیا جائے تو ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ انسان کی دہر جدا گانہ برادری میں جس شخص نے پہلے پہل پتھر، لکڑی یا پتّوں پر کچھ اُلٹے سیدھے نشان بنائے ہونگے اور انھیں اوروں کے سامنے "پڑھ" کر سنایا ہوگا، وہ شخص حقیقت میں بہت بڑا صاحبِ کمال تھا اور اس کا یہ فعل واقعی ایک زبردست کرامات کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ چند عجیب عجیب سے نشان بنا کر اور ان کو پڑھ کر اپنے ہمچشموں اور ہمعصروں پر "جادو" کر دیتا تھا — وہ لوگ اس کی شخصیت اور اس کے اس کمال سے "مسحور" ہو جاتے تھے؛ اس کے وہ "نقش" بالکل "سحر" کا کام کرتے تھے! پھر اسی لحاظ سے ہماری اس کرامات، ہمارے اس معجزے پر بھی غور کیجئے کہ ہم اب سینکڑوں اور ہزاروں برس پہلے کے انسانوں کے بنائے ہوئے نشانات — آپ انھیں نشان، نقش، خط، تحریر، لکھائی جو کچھ چاہیں کہیں — کو دیکھ اور پڑھ کر نہ صرف ان کے حالات اور خیالات کا پتہ لگا لیتے ہیں، بلکہ کچھ وثوق کے ساتھ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا الفاظ بولتے تھے اور ان کا کیا تلفظ کرتے تھے!

تحریر کی سب سے پہلی غرض اور قریب ترین غایت یہ ہے کہ ہم اس کے ذریعے سے اپنے الفاظ کی ایک ایسی تصویر کھینچ سکیں جو نہ صرف یہ کہ ہماری آواز کو ثابت اور قائم کر دے، بلکہ اسے ضبط کر کے ہمارے مقام اور ہمارے وقت سے دور، اور بہت دور، مقام اور وقت تک پہنچا دے۔ اسی غرض کو پورا کرنے کے لئے ہمارے زمانے میں دو چیزیں اور ایجاد ہوئی ہیں: گراموفون اور ٹیلیفون۔ یہ دونوں بھی ایسے وسیلے ہیں، جن سے ہم اپنے الفاظ اور اپنی آواز کو دور ترین مقامات تک پہنچا سکتے ہیں؛ لیکن ان میں وہ پائداری نہیں پائی جاتی جو تحریر میں ہے۔ آواز اور تلفظ یہ دونوں پیدا کرتے ہیں، لیکن وہ آواز ہوا میں منتشر اور گم ہو جاتی ہے۔ علاوہ اس کے گراموفون کے نقش بھی تو آخر ایک قسم کی تحریر ہی ہیں؛ اور ٹیلیفون کے پردے میں سے نکلنے والی آواز بھی تحریر کی دست نگر ہوتی ہے۔ اس طرح یہ دونوں بغیر تحریر کے گویا بیکار ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارے بعد کسی زمانہ میں اس قسم کے کتب خانے ایجاد ہوں، جن میں ہماری کتابوں کی جگہ صرف گراموفون کے ریکارڈ ہی رکھے ہوں؛ لیکن ابھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ، بہ نسبت ریکارڈوں کے کاغذ — اور وہ بھی نفیس ترین اور باریک ترین کاغذ — کے ورقوں کی مجلد کتابیں ان آوازوں اور لفظوں کے قائم و دائم رکھنے کا بہتر اور زیادہ سہل وسیلہ ہیں، اور ان میں جگہ بھی کم صرف ہوتی ہے؛

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ریکارڈ کے دو "صفحے" ہمارے کاغذی صفحوں سے زیادہ مواد کے حامل نہیں ہو سکتے۔

حقیقت میں تحریر چند ایسے خود ساختہ نشانوں کے ایک سلسلے کا نام ہے، جن کی شکلوں کو اپنے موضوع (معنی) سے ایک ایسا علاقہ ہوتا ہے جو آنکھوں کے ذریعے سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہ نشان ترقی کرتے ہوئے جن درجوں سے گذرے ہیں وہ غالباً یہ ہیں: سب سے پہلے درجے میں یہ محسوس چیزوں کی سادہ تصویریں یا خاکے تھے، جیسے آدمی، مکان، گھوڑا، درخت وغیرہ کی تصویریں؛ دوسرے درجے میں انھوں نے ایسی شکلیں اختیار کیں، جن کو تصویر تو نہیں بلکہ محض "علامت" کہنا چاہئے، مثلاً "زاویہ" کا اظہار کرنے کے لئے اہل اقلیدس ∠ کی علامت بناتے ہیں؛ اس کے بعد کے درجے میں صوتی شکلیں پیدا ہوئیں، جن سے زبان کی اصلی آوازوں کا پتہ لگتا ہے۔ پھر یہ ہوا کہ آوازیں بدلتی رہیں، مگر ان کی نشانیاں مستقل طور پر قائم رہیں؛ اور اس طرح ایک ایسا طرز تحریر یا رسم خط پیدا ہوا جس میں زیادہ تر "صوتی" اور کمتر "صوری" حیثیت موجود تھی۔ یہ سب سے آخر کی اور وہ صورت ہے جو ہم آجکل استعمال کر رہے ہیں، اور جن کو ہم "حرف ہجا" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ان حروف تک پہنچ جانے کے بعد غور کیجئیگا تو معلوم ہوگا کہ تحریر کے اس طرز کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنی زبان کی کُل آوازوں کے اظہار کے لئے چند علامتیں یا نشانیاں مقرر کر لیں۔ یہ علامتیں لفظوں کی نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک ایک آواز کے لئے موضوع ہے۔ یہی نہیں؛ بلکہ ہم نے ان علامتوں میں سے تقریباً ہر ایک کو مختلف صورتیں دے رکھی ہیں۔ مثال کے طور پر "ب" کے حرف ہی کو لیجئے۔ جیسے ہم ب، بہ، بـ، اور ـب ـــــ سے ہی طرح لکھتے ہیں؛ لیکن ہر صورت میں اس کا نام "بے" ہی ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے (اور ایسا ہوتا بھی ہے) کہ ہر ایک لکھنے والا اُن کو اپنے اپنے خاص طرز پر لکھے؛ مگر اب ان سب صورتوں کو "بے" ہی کہتے ہیں، اور ایک ہی طرح اُس کا تلفظ کرتے ہیں، کہیں فرق نہیں ہوتا۔ یہی حال ہمارے حرف ہجا کے اور سب حرفوں کا بھی ہے۔ لیکن یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ جب ہم اُردو کی عبارت پڑھتے ہیں، تو ہماری نگاہ ہر ہر حرف پر اٹک یا جم نہیں جاتی ہے، بلکہ ہم کئی کئی حرفوں کے ایک مجموعے، یعنی ایک ایک لفظ، کو نہایت تیزی کے ساتھ آنکھوں سے دیکھتے اور معاً اس کا مجموعی تلفظ سمجھتے جاتے ہیں، (اور یہ تلفظ کا سمجھنا بھی ایسا ہے گویا ہم کسی کو ان الفاظ کو بولتے اور ادا کرتے ہوئے سن بھی رہے ہیں۔ اسی طرح الفاظ کے مجموعے، یعنی جملے اور فقرے، بھی ہماری آنکھوں اور (اُن کے ساتھ ہی ساتھ) کانوں کے ذریعے ذہن میں اُترتے اور قائم ہوتے جاتے ہیں۔ پڑھنے کی تو یہ صورت ہے؛ مگر جب آپ لکھنے بیٹھتے ہیں، تو ایک ایک حرف نہیں بلکہ ایک دَم سے ایک ایک لفظ لکھتے ہیں، گو آپ کو بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ہر لفظ کا ہر حرف ایک خاص آواز کے لئے بنا ہے اور وہ وہی آواز ہے جسے آپ اُس وقت استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ کیفیت نہ صرف آپ کی مادری زبان کی ہے؛ بلکہ اس کے علاوہ اور کوئی اجنبی زبان بھی آپ لکھتے ہیں، تو آپ ایک ایک لفظ ہی لکھتے ہیں ـــــ یعنی یہ کہ آپ کو یہ معلوم ہے کہ مختلف حرفوں کے ملاپ سے کیا کیا آواز پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ نے کبھی کسی جہاز میں ایک شخص کو جھنڈی ہلا ہلا کر پیغام بھیجتے اور دوسرے جہاز میں ایک اور شخص کو اسے دیکھ کر سمجھتے اور پھر اُسی طرح جواب دیتے دیکھا ہے، تو آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ لکھنے اور پڑھنے والے کی حالت بالکل وہی ہے جو جھنڈی سے

پیغام بھیجنے اور پانے والے کی ہوتی ہے۔ "پانے والے" کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو جو بات اس سے کہی گئی ہے وہ محض چند ایسی علامتوں کا مجموعہ ہے جو آنکھ سے نظر آسکتی ہیں: اور "پیغام بھیجنے والے" کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو وہ صرف چند حرکتوں کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح "لکھنے والے" کے نقطۂ نظر سے تحریر گویا اُس کے ہاتھ کی چند حرکتوں یا اس کے چند اشاروں کا تحریری اظہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریر میں حرکت کو جو دخل ہے، وہی لکھنے والے کی شخصیت کی خصوصیت ہے، چنانچہ یہ خصوصیت "دستخط" میں بہت صاف نظر آتی ہے، کیونکہ دستخط گویا اپنے لکھنے والے کے سر اور آنکھ کا اشارہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ لکھنے والا کہتا ہے کہ "میں بول رہا ہوں"۔ لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئیے کہ لفظوں کی یہ شان کہ ان میں حرکت کا ایک شائبہ ہے اور اُس سے پڑھنے والے کی آنکھ کا جو تعلق ہے، وہ پھر براہ راست اُن آوازوں سے بھی ایک زبردست علاقہ رکھتا ہے، جن سے سننے والے کے کان آشنا ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ جب کوئی عبارت پڑھتے ہیں تو پڑھتے پڑھتے آپ (بغیر غور کئے) برابر اپنے ذہن میں یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ان تمام حرفوں (بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ لفظوں اور فقروں) کے تلفظ کی آواز بھی آپ کے کانوں میں آرہی ہے: اور جس قدر تیزی سے آپ عبارت پڑھتے ہیں اتنی ہی تیزی سے وہ آوازیں بھی آرہی ہیں ——— حالانکہ اگر آپ بولنا چاہیں تو شاید اتنی سُرعت سے بول نہ سکینگے۔

ایک تحریر اور اس کے پڑھنے میں جو نفسیاتی علاقہ ہے وہ بہت ہی نازک اور دلچسپ ہے۔ فرض کیجئے میں "کرشن راؤ" لکھتا ہوں۔ لکھتے وقت مجھے خیال آتا ہے کہ یہ کسی آدمی کا نام ہے: اس نام میں دو لفظ ہیں: کرشن اور راؤ۔ اِن میں سے ہر ایک کے تلفظ میں ایک جُدا آواز کا احساس ہوتا ہے؛ لیکن دونوں مل کر ایک آدمی کے نام کا تصور ذہن میں پیدا کر دیتے ہیں۔ پھر جب یہ الفاظ میں کسی کو پڑھ کر سناتا ہوں، تو سننے والے کو بھی ایک شخص کے وجود کا احساس ہوتا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ وہ شخص مرد ہے اور یہ کہ غالباً وہ مدراس کا باشندہ ہے۔ اب غور کیجئے کہ صرف دو لفظ "کرشن راؤ" لکھنے میں کتنی مختلف اور متفرق چیزیں اور اُن کی تصویریں میرے ذہن میں وارد ہوگئیں: نام، انسان، مرد، مدراسی شخص۔ پھر یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہی ساتھ اس کی تمام خصوصیتیں بھی ہیں جن کا تصور اُن کے ساتھ ہی ذہن پر طاری ہو جاتا ہے۔ اس پورے سلسلے کی تفصیل کسی قدر طویل ہے! آپ ان تمام تصورات کی تقسیم اور تفریع کیجئیگا تو معلوم ہوگا کہ وہ تین قسم کی ہیں: ایک تو وہ تصویر ہے جو ان خارجی خصوصیات کے اضافے سے پیدا ہوتی ہے جو "کرشن راؤ" کے سات عدد حرفوں کی ظاہری شکل پر مبنی ہیں؛ دوسری وہ تصویر ہے جو ان دو لفظوں کے (حرفوں کے مخلوط) تلفظ سے ذہن کے اندر پیدا ہوتی ہے؛ تیسری وہ تصویر ہے جو تصور، نگاہ، حرکت یا اشارہ اور سماعت، اِن چاروں سے ملکر ذہن پر نقش ہوتی ہے۔ تھوڑی سی دیر کے لئے اس پر غور کیجئے کہ نگاہ، حرکت اور سماعت کا یہ مخلوط اثر (جس میں سے ہر ایک کا جداگانہ طور پر بھی آسانی سے احساس کیا جا سکتا ہے) کس قدر پُرلطف اور کیسا دلچسپ ہے!

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ کے ورق پر لفظوں کے لکھ دینے کا عمل "ادبیات" کا بہت کچھ اہم لازمہ نہیں ہے؛ مگر اس حقیقت سے کیونکر انکار ہو سکتا ہے کہ اکثر ہوشمند مصنف اور مؤلف، جن کو صحیح معنوں میں مصنف یا مؤلف کہا جا سکتا ہے، واقعی یہی سمجھتے ہیں کہ

تصنیف، تالیف اور انشار کے ہر مفہوم میں ہر ہر لفظ اور اس کے ہر ہر حرف کی تحریر کا عمل ضرور شامل ہے۔ "منشی" اور "انشار" کے لفظوں ہی پر غور کیجئے کہ ان میں ایک ایک حرف کی سنجیدگی اور متانت کا مفہوم موجود ہے! ہاں اتنا ضرور تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ عموماً روزانہ اور ہر وقت کی تحریر میں اس امر کا زیادہ لحاظ نہیں ہوتا کہ ہماری تحریر کی ظاہری علامتوں (یعنی حرفوں) میں آواز اور سماعت کا بھی کچھ دخل ہے، ورنہ یہ کہ یہی حرف اور لفظ حقیقت میں ہمارے خیال اور مافی الضمیر کے صحیح نمائندے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم ان علامتوں یعنی حرفوں کو کاغذ پر لکھتے ہوئے ان کا حرکاتی تعلق تو گویا بھول جاتے ہیں، مگر خود اُن ہی حرفوں کو اپنے مافی الضمیر کا بدل یا اُس کے برابر سمجھ لیتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جب ہم کسی غیر زبان ـــــ مثلاً انگریزی ـــــ کی تحصیل کے ابتدائی درجوں میں ہوتے ہیں اور ہم انگریزی کی کسی عبارت کو پھر اپنی انگریزی عبارت میں بیان کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے ذہن میں اُس خیال کو اردو ہی میں ادا کرتے ہیں، پھر انگریزی میں اُس کا ترجمہ کر کے کاغذ پر لکھتے ہیں؛ لیکن مشق کی کثرت اور مزاولت کے بعد ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ ہم کوشش اور کاوش کے بغیر ہی اپنا مافی الضمیر براہ راست انگریزی زبان ہی میں ادا کر دینے پر قادر ہو جاتے ہیں، اور رفتہ رفتہ انگریزی بھی ہر لحاظ سے درست بول اور لکھ سکتے ہیں۔ یہ تو عام تجربہ کی بات ہے کہ عموماً تحریر اور تقریر کی زبان مختلف سمجھی جاتی ہے، اور تقریباً ہر شخص اس کا اعتراف کر سکتا ہے کہ بہ نسبت بولنے کے لکھنے میں زیادہ آزادی اور صفائی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لکھتے وقت ہر ایک حرف اس مجموعی حیثیت اور طاقت کے ساتھ ہمارے سامنے ہوتا ہے کہ ہم نہ صرف یہ کہ اُس کی صورت دیکھ سکتے بلکہ اس کے اندر جو آواز نہاں ہے اُسے اپنے ہوش کے کانوں سے بھی سکتے ہیں۔ نگاہ اور سماعت کی یہ لطیف اور نازک سازش تحریر میں جو لطف اور حُسن پیدا کرتی ہے اور الفاظ، اور پھر الفاظ سے مرکب ہو کر جملے، جو ایک موسیقی کا سماں باندھ دیتے ہیں، اور اس طرح رُوح کو جو سرور اور لذت حاصل ہوتی ہے وہ کچھ انھیں کو خوب معلوم ہے جو انشا اور تحریر کے دیوانے اور اپنے قلم کے دھنی ہیں!

تحریر اور اس کے مختلف حصوں کا کان اور آنکھ سے جو تعلق ہے، وہ ہر لکھنے والے کے لئے مختلف ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا ذہن لکھتے وقت حروف کی صورتوں سے، اور بعض ان حروف کی آواز سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ یہ فرق مختلف لکھنے والوں کی تحریروں کے مطالعہ سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ جو لکھتے ہوئے ہر ہر حرف اور ہر ہر شوشے کا خیال رکھتے ہیں؛ مگر چونکہ وہ حروف کی آواز پر زیادہ نہیں جاتے، اس لئے "اصرار" کو "اسرار" یا "نذر" کو "نظر" وغیرہ لکھ جاتے ہیں۔ اور دوسرے ہیں کہ ان کا حال اس کے برعکس ہے؛ وہ لکھینگے بالکل درست، مگر حروف اور نقطے اور شوشے جا و بیجا سب ہی طرح کے بنتے چلے جائینگے۔ ناولوں اور ڈراموں کے مصنفوں سے اگر دریافت کیجئے تو وہ آپ کو بتائینگے کہ اشخاص کی گفتگو لکھتے وقت وہ واقعی کچھ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ لفظ اور ان کی آوازیں، بلکہ بولنے والے کی آنکھ، اور اس کے ہونٹ اور ہاتھ کی حرکت تک اُن کے سامنے ہیں: گویا وہ ہونٹوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور لفظوں کی آواز ان کے کان میں صاف صاف آرہی ہے۔ اب متواتر اُن کے "اشخاص" کی تقریریں سنتے چلے جائیے، کیسی مربوط اور مسلسل ہوتی ہیں؛ اور جہاں کہیں یہ ربط، یہ علاقہ، یہ سلسلہ ٹوٹتا یا ڈھیلا ہوتا نظر آئے یقین کر لیجئے کہ وہ مقامات وہ ہیں کہ جہاں

کسی سبب سے لکھنے والے کا ذہن سست ہو گیا ہے، اور اس کی آنکھ اور اس کے کان پوری طرح اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ اس سے آپ بڑی خوبی اور آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ شاعر ــــ شرط یہ ہے کہ وہ حقیقی معنی میں شاعر ہو محض تک ملانے والا نہ ہو ــــ اپنے آپ کو اپنے مناظر اور محسوسات میں کس خوبی، کس کمال کے ساتھ گم کر دیتا ہے؛ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ سننے والے کے "جگر کے پار" ہوتا ہے۔

اس تمام گفتگو سے اتنا تو ضرور معلوم ہو گیا کہ ادبیات کا مادہ ــــ حروف، الفاظ، جملے ــــ کسی قدر مختلف اور متفرق عناصر سے ترکیب پاتا ہے۔ کسی ایک کتاب کا تصور کیجئے، اور اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے باب، اس کی فصل، پھر فصل کے ہر ایک جزو، ہر فقرے، جملے اور لفظ سے ہوتے ہوئے حرف تک پہنچ جائیے؛ اور اب غور کیجئے کہ جب ایک ایک حرف اور اس کی آواز اپنے اندر تخیل، فکر، حسن اور منظر کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے، تو کل کتاب کس بلا کی چیز نہ ہوگی! بہت گہرائی تک نہ جائیے، موٹی سی چیز "لفظ" ہی کو لیجئے اور اس کو تحریر کی بنا اور اصل سمجھ کر اندازہ کیجئے کہ اس کی ماہیت اور اہمیت کیا ہے۔ عملی طور پر دیکھا جائے تو لفظ مجموعہ ہے چند آوازوں کا۔ یا یوں کہئے کہ چند آوازیں مل کر ایک لفظ پیدا کرتی ہیں، اور یہ آوازیں اتنی ہی ہیں جتنے کہ ہماری زبان کے حروف تہجی ہیں۔ ہم نے ان ہی چند گنی چنی آوازوں کو طرح طرح سے الٹ پھیر کے ملا رکھا ہے۔ اسی گھول میل سے ہم طرح طرح کے (تقریباً بے شمار) "معنی" پیدا کر لیتے ہیں؛ اور یہی "معنی" ہیں جو ہمیں اپنے "خیال" یا مافی الضمیر کو ظاہر اور اسے دوسروں کے ذہن پر نقش کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہر لفظ ایک خیال، ایک معنی کا حامل ہے؛ اور جب کئی لفظ مل کر ایک جملہ، فقرہ یا فصل کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں، تو خیالات اور معانی کا ایک سمندر کا سمندر موجیں مارتا ہوا ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اسی سلسلے میں ان الفاظ کو بھی یاد رکھنا چاہیئے جن کے خاص خاص معنی ہوتے ہیں، مثلاً مختلف فنون کی اصطلاحیں، یا وہ الفاظ جن کو صرف و نحو کی اصطلاح میں "حروف" کہتے ہیں۔ ایسے الفاظ کے سوا ہماری روزمرہ کی بول چال کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو ایک سے زیادہ معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اپنی زبان کا ایک لفظ کئی کئی معنی اپنے اندر لئے ہوتا ہے، بلکہ اجنبی زبانوں کے الفاظ بھی اپنے اصلی اور نقلی معنوں میں اگر ان سے مل جاتے ہیں اور یہ کیفیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ الفاظ کی یہ نیرنگی اور ان میں جو آواز پوشیدہ ہے ان کی یہ گوناگون موسیقی لطف اور کیف کی ایک دنیا آنکھوں اور کانوں کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے۔ یہی الفاظ کی نشست اور ترتیب، یہی بندش کی خوبی کسی بولنے یا لکھنے والے کی فصاحت، بلاغت اور قوت ادا کا پتہ دیتی ہے۔ شاعر اور نثر نگار کا کمال اسی سے کھلتا ہے۔ لطیفوں، پھبتیوں اور پہیلیوں میں اسی سے جان پڑتی ہے۔ ہمارے الفاظ کی یہی شان اور یہی کیفیت ہے جسے ہم "حقیقت" اور "مجاز" کہتے ہیں، جس کو ہم نے تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل اور صنائع و بدائع کی بیسیوں قسموں کے نام سے موسوم کر رکھا ہے، جسے ہم "قافیہ" سجع اور وزن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہی وہ چیز ہے جس کے وسیلے سے آپ "شاعری" کرتے ہیں اور بقول نظامی عروضی کے "چھوٹی سی بات کو بڑا اور بڑی بات کو چھوٹا، اچھے کو برا اور برے کو اچھا کر دکھاتے ہیں اور "غضب اور شہوت کی قوتوں کو اس طرح برانگیختہ کر دیتے ہیں کہ طبیعتوں میں انقباض اور انبساط پیدا کر کے اس دنیا کے

---

۵ "چہار مقالہ" کا دوسرا مقالہ "تمہید"۔

نظام میں بڑے بڑے کاموں اور واقعوں کا سبب "پیدا کردیتے ہیں!
لفظ کا پورا مفہوم اس پر منحصر ہے کہ اُسے فقرے اور عبارت میں کیا جگہ دی گئی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ کوئی لفظ بذاتِ خود (تنہا) پورے معنے دیتا یا دے سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض وقت ہمارے فقرے میں صرف ایک ہی لفظ ہوتا ہے۔ جیسے کسی سوال کے جواب میں صرف "ہاں" یا "نہیں" کہا جائے، یا مثلاً یہ کہ اس سوال کے جواب میں کہ "کمرے میں کون ہے؟" صرف یہ کہا جائے کہ "بشیر" یا "تم کل کہاں گئے تھے؟" کے جواب میں کوئی کہے کہ "شاہ گنج"۔ لیکن تھوڑے ہی غور سے یہ امر واضح ہوجائیگا کہ ان سب اور اسی قسم کی تمام صورتوں میں یہ ایک ایک لفظ حقیقت میں پورے پورے فقرے کا ایک لفظ ہے اور باقی سب لفظ محذوف ہوگئے ہیں۔ تقریر (اور تحریر) میں فقروں سے کسی طرح گزیر نہیں ہوسکتا ہے، اور فقرے لفظوں سے مرکب ہوتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ لفظوں کی ترکیب سے فقرہ بنتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ چند لفظوں کو جس طرح چاہا، پاس پاس رکھ دیا اور اُسے فقرہ کے نام سے موسوم کردیا! مثلاً "میں نے کل بازار میں گذرتے ہوئے ایک عجیب تماشا دیکھا" کو تو آپ فقرہ کہہ سکتے ہیں، مگر "کل بازار ہوئے عجیب نے گزرتے تماشا میں دیکھا میں ایک" کو ہرگز یہ نام نہ دینگے۔ ہر لفظ کو دوسرے سے کوئی خاص تعلق ہے، اور ہر لفظ ایک خاص جگہ ہی میں رہ کر اپنے سابق اور لاحق لفظ سے مل کر کچھ معنی دیتا اور دے سکتا ہے۔ اس تعلق کو درہم برہم کردیجئے، معنی بھی غائب ہوئے جاتے ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ ہر لفظ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب تک کہ وہ اور لفظوں کے ساتھ، اور وہ بھی اپنی خاص جگہ میں، نہ ہو وہ بالکل مُردہ ہے۔ خیال کی صورت ایک زندہ کی سی ہے: وہ زندہ ہے، حرکت کرتا ہے، آگے بڑھتا ہے۔ اس کے اظہار کے لئے، اُسے جیتا جاگتا، چلتا پھرتا دکھانے کے لئے زندہ لفظوں کی ضرورت ہے نہ کہ مُردہ کی۔ مثال کے لئے لفظ "ہاتھی" کو لیجئے (اس کے موضوع لہٗ سے بحث نہ کیجئے!)۔ اس میں معنی ہیں، ضرور ہیں؛ لیکن اکیلا یہی لفظ کیسا ٹھوس، جما ہوا، بے جان سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اسی کو "ہاتھی نے جھک کر بادشاہ کو سلام کیا" میں دیکھئے؛ صاف معلوم ہوتا ہے کہ لفظ میں جان پڑگئی۔ اس لئے کہ اب اُسے جھکنے سے، بادشاہ سے اور سلام سے ایک تعلق پیدا ہوگیا، اور وہ زندہ ہوکر ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔ ہر لفظ اپنے اندر ایک معنی رکھتا ہے، اور وہ معنی بھی شکل، وضع، صفت، حالت اور انداز کی تصویروں پر حاوی ہوتے ہیں؛ اور جب ایک فقرے میں ہر لفظ اپنی اُن تمام کیفیتوں اور خصوصیتوں کے ساتھ ایک خاص ترتیب سے مل جاتے ہیں، تو ایک اور وسیع منظر ذہن کی آنکھ کے سامنے پیش کردیتے ہیں۔ پھر اسی سے ایک ایک فصل، ایک ایک باب اور ایک ایک کتاب کی دنیا کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اور خصوصاً جب ہم کو یہ بھی یاد آجاتا ہے کہ ہر لفظ کا ہر حرف اپنی آواز کی موسیقی لئے ہوئے موجود ہے، تو غور کا مقام ہے کہ آنکھ، کان، ہونٹ اور ذہن سے گذر کر پڑھنے والے کی کُل ہستی، اُس کے وجود، اس کی رُوح کے لئے کتنی بڑی جنت کا سامان مع اپنی تمام تفصیل کے فراہم ہوجاتا ہے۔

لفظ سے گذر کر جب ہم "فقرہ" پر پہنچتے ہیں، تو اس میں یہی کیفیت نظر آتی ہے کہ گو ہر فقرہ بذاتِ خود ایک معنی، ایک مفہوم کا حامل ہے؛ لیکن پھر بھی جب تک کہ وہ اپنے قبل اور بعد کے فقروں سے ایک خاص اسلوب پر ـــ یعنی صرف ونحو، منطق، محاورہ، انشاء اور طرزِ ادا کے اصولوں کے مطابق ـــ مربوط نہ

ہو اُس میں جان نہیں پڑتی۔ یہی اصول ہر لفظ کے لئے اور یہی ہر فقرے کے لئے ہر وقت اور ہر لمحہ مدنظر رہنا ضروری ہیں، ورنہ "تحریر" نہ ہوگی، محض بکواس ہو کے رہ جائیگی، بلکہ شاید اسے کوئی بکواس کہنا بھی پسند نہ کرے۔ "خیال" اور "تصور" کے اظہار کے لئے صحیح حرف، صحیح آواز، بجا لفظ، درست مفہوم، مناسب ترتیب، معقول نظم، ربط اور تسلسل کی ضرورت ہے۔ ہر حرف اور اس کی آواز میں مناظر کا جو ایک چھوٹا سا ہجوم ہے وہ لفظوں، فقروں، فصلوں اور بابوں کی صورت میں ترقی کرتا ہوا جب پوری کتاب کی صورت میں جلوہ نما ہوتا ہے، تو ایک نہیں لاکھوں قیامت کے ہنگامے اس کے اندر گم ہو جاتے ہیں، اور پڑھنے والا ــــ بشرطیکہ اس کے پاس صحیح قسم کے کان، آنکھ، دل اور دماغ ہوں ــــ محسوس کرنے لگتا ہے کہ مطالعہ کا ہر لمحہ ایسے مناظر، ایسے ایسے افکار اس کے سامنے پیش کر رہا ہے، جن میں سے ہر ایک کی وسعت اپنے لئے ایک ایک دنیا کی طلبگار ہے!

آپ نے بہت سے عالموں اور اپنے اپنے فن کے ماہروں کی تقریریں اور لیکچر سُنے ہونگے۔ اپنے حافظے پر ذرا سا زور دیجئیگا تو آپ کو یاد آجائیگا کہ ان میں سے اچھے اچھے اور زبردست ــــ چھوٹے لوگوں کا ذکر نہیں ہے ــــ تقریر کرنے والے اس کمال اور خوبی سے بولتے ہیں کہ ہر ہر قدم پر آپ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور دل ہی دل میں کہا کرتے ہیں کہ

"دیکھنا تقریر کی لذت!" ــــ اور اس "لذت" میں حُسن، خوبی، لُطف، پاکیزگی، باریکی، نزاکت، ہمہ گیری سبھی کچھ شامل ہے

"دیکھنا تقریر کی لذت! کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!!"

اب ذرا دیر کے لئے اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیجئے کہ آپ ایسا کہنے اور سمجھنے پر اس لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ "بڑا آدمی" ہے، پھر غور کیجئے کہ آپ کے اس خیال اور اس رائے کا کیا سبب ہے؟ سبب صرف یہ ہے کہ پہلے تو ایسا لیکچرار اپنی تقریر یا لیکچر کے موضوع کو بہت سا وقت اور ہمت صرف کرکے پوری طرح سمجھ چکا ہے: اس کے ذہن میں اس کی پوری پوری تصویر، اپنی تمام تفصیل کے ساتھ، نہایت صفائی سے منکشف ہو چکی ہے! وہ ہر چیز، ہر بات، ہر امر، ہر کیفیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے؛ پھر وہ ان امور اور کیفیات کو بیان اور ظاہر کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ صحیح، بجا اور موزون الفاظ استعمال کرتا ہے، ان کو اپنے فقروں میں صحیح جگہ دیتا ہے، اور فقروں کے آپس میں بجا اور ضروری ربط اور سلسلہ قائم کرکے بولتا ہے، بلکہ یہ بھی کہ وہ فقروں میں ہر ضروری اور اہم لفظ پر بجا طور پر اور ضرورت کے مطابق زور دیتا ہے، اپنی آواز کے اُتار چڑھاؤ کا ہر وقت خیال رکھتا ہے، اپنی آنکھوں سے، پیشانی سے، ہونٹوں سے، ہاتھوں اور انگلیوں سے مدد لے کر اپنے لفظوں میں اور لفظوں کے اس زور میں ایک جان سی ڈال دیتا ہے؛ اور شروع سے آخر تک برابر اس امر کا خیال رکھتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ آپ کے ذہن میں اپنے خیال کو جاگزین اور راسخ کر دینے، آپ کو اپنے قول کا قائل بنا دینے، آپ کو اپنے ہی خیالات کی رو میں اطمینان اور سلامتی کے ساتھ بہا دینے اور آپ کو اپنے رنگ میں رنگ دینے کے لئے چھوٹے اور بڑے، ہلکے اور بھاری، سادہ اور رنگین، عامیانہ اور عالمانہ ہر قسم کے الفاظ ــــ ان کے حقیقی اور مجازی معنوں میں ــــ استعمال کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک اچھا لکھنے والا بھی آپ پر "سحر" کر دیتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں ہر فقرے کا ہر لفظ ایسی خوبی سے انتخاب کرتا اور اسے

ایسی موزون اور مناسب جگہ پر رکھتا ہے اور اس طرح بجا طور پر اوقاف کی علامتیں ——(یعنی ' ؛ ! . ! ؟ " " ( ) [ ] اور ......)—— اُن کے درمیان درمیان میں لگاتا ہوا جاتا ہے کہ آپ نہ صرف اس پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جس جس لفظ پر وہ زور دینا چاہتا ہے آپ بھی پڑھتے ہوئے اُسی پر زور دیں، بلکہ آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ گویا وہ آپ کے سامنے بیٹھا ہوا بول رہا ہے اور آپ اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ اور اس کے تمام اشارے بھی دیکھ رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کے کمال کے معترف اور اس کے قول کے قائل ہو جاتے ہیں!

غرض یہ کہ عبارت میں زور، اثر اور حسن پیدا کرنے میں مناسب اور موزون الفاظ کے استعمال کو بہت بڑا دخل ہے۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ زیادہ زور اور تاثیر کے لئے صرف دقیق، غیر مانوس، مغلق اور اجنبی زبان ہی کے لفظ استعمال کرنا چاہئیں اول تو یہ بات لکھنے والے کی قابلیت، اظہار کے کمال اور ادا کی قوت پر منحصر ہیں، اور یہ بات نہ صرف اس سے حاصل ہوتی ہے کہ اُسے اپنی زبان اور اس کے محاورے پر قوی دسترس ہو، اس سے کامل طور پر واقف اور اس میں پوری طرح ماہر ہو بلکہ اس کا بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے کہ اُسے اُس موسیقی میں کتنا حصہ ملا ہے جو کائنات کے ہر ہر ذرّے میں جاری و ساری ہے۔ آپ کو ضرور یاد ہوگا کہ اکثر وہ کلام جسے آپ قابل تعریف سمجھتے ہیں اور جس کے زور اور بلندی کے آپ قائل ہیں عموماً چھوٹے چھوٹے اور سادہ سادہ لفظوں اور جملوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جتنے بڑے بڑے لکھنے والے ہیں، عام اس سے کہ وہ شاعر ہوں یا نثر نگار، سب کی تحریروں میں آپ یہ ایک نمایاں خصوصیت پائینگے کہ جب کبھی انھیں اپنے کسی جذبہ کا قوی اظہار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ سادہ الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملوں ہی سے کام لیتے ہیں۔ یہ حقیقت اس طرح نہایت آسانی سے واضح ہو سکتی ہے کہ آپ صرف اسی پر غور کریں کہ غصّے اور محبّت کے جوش میں آپ جو کچھ بولتے ہیں اس میں کبھی بڑے بڑے لفظ اور پیچیدہ لمبے چوڑے فقرے نہیں ہوتے۔ مثلاً کسی کے آنکھ کے اثر کا یہ بیان ملاحظہ ہو کہ "ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!" اور کس سادگی سے اس کی تقریب کی گئی ہے کہ "کیفیت چشم اُس کی مجھے یاد ہے" ساقی! یا اسی طرح

"دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے:
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا!"

انصاف شرط ہے، غور تو کیجئے ان چار مصرعوں میں کہنے والا کیا کیا کچھ نہیں کہہ گیا ہے۔ آتش نے غلط تو نہیں کہا تھا کہ

لگا لیتے ہیں مطلب اپنے اپنے طور پر سامع:
مزہ رکھتی ہے آتش کی زباں مجذوب کی بڑ کا!

اپنی ذہنیت اور "ظرف" کے مطابق ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ کہنے یا لکھنے والا یقیناً بلند اور وسیع ہے، جب نثر کا یہ عالم ہے اور ہو سکتا ہے تو نظم کا تو کیا کہنا ہے، جس کو قافیہ اور ردیف کی وساطت سے براہ راست موسیقی سے ایک مضبوط علاقہ اور ایک قوی ربط حاصل ہے! لیکن جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، صحیح اور بجا الفاظ اور ان کے لئے مناسب قافیے اور خصوصاً بحر کا انتخاب اور استعمال اس کیفیت، شان اور علو کے پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے: اور یہی ایک حقیقی شاعر کی بزرگی اور ہمہ گیری کی دلیل ہے۔

ایک اور ضروری چیز جس کے بغیر کوئی تحریر اپنی اصلی شان اور خالص ادا کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہو سکتی، وہ صدق

بیان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ جس چیز، جس امر، جس کیفیت کی حقیقت کا مطالعہ کریں اور اس کے واقعی تجربے کے بعد اس کے احساس تک پہنچیں، اُسے بالکل سچائی کے ساتھ اسی طرح بیان بھی کریں۔ یہ تو ایک بدیہی امر ہے کہ جس چیز کا احساس، وجدان اور تجربہ آپ خود نہیں کر چکے ہیں، اُسے اس کی تمام باریکیوں اور نزاکتوں کے ساتھ آپ ہرگز نہیں بیان کر سکتے۔ اگر آپ کا تجربہ کمزور، نامکمل اور ناقص ہے یا آپ محض سنی سنائی یا اوروں کے تجربے کی بات کہہ رہے ہیں، تو اس کا اظہار جن الفاظ میں آپ کرینگے وہ بالکل ایسی صورت اختیار کر لینگے جیسے کوئی کسی کا منہ چڑاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو جس چیز یا کیفیت کا جتنا زیادہ گہرا اور وسیع تجربہ ہوگا اسی قدر خوبی، خوش اسلوبی اور صدق کے کمال کے ساتھ اسے بیان بھی کر سکیگا اور جب یہ امر مسلّم ہے، تو یہ امر بھی نہایت آسانی سے طے ہو جاتا ہے کہ جب تک آپ اپنے احساس اور وجدان کے ذریعے حاصل کئے ہوئے مناظر اور کیفیات کو صاف صاف الفاظ میں پڑھنے والے کے سامنے پیش نہ کرینگے، وہ تمام امور اور اُن کے حقائق بدستور دُور، بعید اور ناقابلِ حصول رہینگے: اور کلام اور بیان کی صفائی اور اظہار کی درستی جس قدر چھوٹے اور سادہ الفاظ میں ہو اسی قدر وہ مقبول اور مفید بھی ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کو بعض وقت طویل اور سنگین اصطلاحوں سے کام لینے کی بھی ضرورت ہوگی؛ لیکن اصطلاح آپ کی زبان کی صفائی اور سادگی اور آپ کے طرزِ ادا کی سلاست اور دلآویزی کے لئے کسی طرح سدِ راہ نہیں ہو سکتی۔ یوں غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم جتنے "اسم" استعمال کرتے ہیں وہ حقیقت میں سب کے سب اصطلاحی ہیں؛ اور ان کے روزانہ اور اس قدر کثرت کے ساتھ استعمال ہونے کی وجہ سے وہ ہمیں صاف اور سادہ معلوم ہوتے ہیں اور ان کی اصطلاحی کیفیت ہماری نظر سے اوجھل ہو گئی ہے۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ ہماری آنکھوں نے کسی چیز کو صاف طور پر دیکھا ہے، اور ہمارے وجدان نے اُس کا صریح طور پر احساس کیا ہے، تو کوئی سبب نہیں ہے کہ ہم اس منظر یا کیفیت کو سادگی اور صفائی کے ساتھ بیان نہ کر سکیں، اور بیان بھی ایسا کہ جس میں ہمارے احساس، ہمارے وجدان کا پورا پورا زور اپنی اصلی حالت میں باقی رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی تحریر کو موثر، پرزور اور حقیقت نما بنانے کے لئے جن امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہیں کہ لکھنے والے کو حروف اور اُن کی آواز پر، صحیح اور موزون لفظ کے انتخاب پر، سادگی اور صفائی پر پورا پورا عبور، کامل قدرت حاصل ہو؛ اُسے زبان کی صرف و نحو کے قواعد اور محاورے کے اسلوب سے پوری پوری واقفیت ہو؛ وہ نہ صرف ردیف اور قافیے کی، بلکہ ہر لفظ اور ہر حرف کی موسیقیت کا صحیح ذوق رکھتا ہو اور اس کے وجدان سے بہرہ ور ہو ـــــ مختصر یہ کہ وہ اپنی آنکھ، اپنے کان، اپنے دماغ کا مالک ہو اور ان پر پوری طرح قادر ہو۔ اگر یہ صفات موجود ہیں، تو کوئی وجہ، کوئی سبب نہیں کہ وہ ایک زبردست منشی اور اس کی تحریر صحیح جذبات کی قوی ترین محرک ثابت نہ ہو۔ یہی صفات اس کے طرزِ ادا میں وہ زور، اور اس کے الفاظ وہ اثر پیدا کر دیتی ہیں جو ہر پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر کر اُسے مسحور، اور اس کی ہستی کے ایک قطرے کو اس کائنات اور اس کی حقیقت کے ناپیدا کنار سمندر میں گم، اس کی عظیم الشان وحدت سے متحد کر سکتا ہے!

(خاص)

آشوب روزگار

(جناب مولانا سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔اے صدر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی سابق رکن ادارۂ "ہندوستانی اکیڈیمی جرنل")

رنگ لایا ہے نیا یہ فلکِ دُوں پرور — ہمسری کرتے جواہر سے ہیں کنکر پتھر
بے خرد جو ہیں وہی پھولتے پھلتے ہیں خوب — بیدِ مجنوں ہی کی شاخوں میں اب آتا ہے ثمر
بندہ گئی ظلم شعاروں کی یہ عالم میں ہوا — دمِ عیسیٰ کو دبانے لگی بادِ صرصر
لبِ جاں بخشِ مسیحا سے نکلتا ہے دَم — تیغ کے آگئے آئینۂ رُخ میں جوہر
صاف دل جو ہیں وہ سب خونِ جگر پیتے ہیں — تیرہ باطن کو میسر ہے شرابِ احمر
فتنۂ حشر کو سوتے سے جگا دیتے ہیں — دادخواہوں کی فغاں میں بھی اب اُلٹا ہے اثر
کہتے ہیں شق ہو زمیں اور سما جائیں ہم — سیم و زری کا جو خزانہ لیے بیٹھے ہیں بشر
بادہ آلود کباب اُس کو ہے منّ و سلویٰ — زاہد اب فاقے سے کچھ ایسا ہوا ہے مضطر
حکمِ مفتی کا ہر اک سے ہے کہ واجب ہے سوال — یاد حافظ کو ہے قرآں میں فقط لَا تَنْہَر
ہاتھ خالی جو اُٹھے سب کا نظر آتا ہے — فلسفی ہو کے خجل پیٹتا ہے اپنا سر
ننگ اب ناموری اہلِ خرد جانتے ہیں — چند ناداں جو زمانے میں ہوئے نام آور
اب جو تحریر میں تانیث کو تذکیر لکھے — ہو عطارد رقم اور منشیوں کا سر دفتر
رُبعِ مسکوں میں بس اب فرد منجم ہے وہی — جو کہ تربیع کو بھی جانتا ہو نیک نظر
فتحمند اور جواں مرد سپاہی ہے وہی — عمر بھر جس نے نہ دیکھی ہو کبھی تیغ و سپر
ملک میں پائے وہی رستمِ دوراں کا خطاب — قتل جو کر دے کوئی اپنا جواں مرد پسر
سرخرو ملک میں ہو حشمتِ شیرویہ ملے — ہاتھ اپنا جو بھرے خونِ پدر میں دختر
دارِ دنیا میں وہ ہو جائے سکندر قسمت — مالِ دنیا کے لئے بھائی کا جو کاٹے سر
رہبرِ ایماں کا اندھوں کی نگاہوں میں ہو وہ — باپ کا نورِ بصر کھوے اگر نورِ نظر
حاملِ بارِ نبوت خرِ عیسیٰ کہلائے — وائے بر اہلِ خرد حیف بریں اہلِ نظر

ضامنؔ آشوبِ زمانہ سے یہ حالت پہنچی
شکلِ تصویر ہیں خاموش جو ہیں اہلِ ہنر

(خاص)

ہونہار

خوش نصیب

[جناب فیاض حسین صاحب تسنیم، مدیر "ہونہار" دہلی]

شیخ عبدالرحیم صاحب دہلی کے ایک نہایت دولتمند تاجر تھے انکا معمول تھا کہ شام کو دوکان سے آکر اپنے محلہ میں گشت لگاتے غریب لوگوں کے حالات دریافت کرتے اور حتی الامکان ان کی مدد کرتے۔ کوئی سائل ان کے مکان سے خالی نہ جاتا اور اگر جاتا تو مراد پوری ہوکر دعائیں دیتا ہوا جاتا۔

سوداگر صاحب کے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک غریب منشی ظہیرالدین کا مکان تھا۔ یہ صاحب کسی دفتر میں منشی تھے بہت کم تنخواہ ملتی تھی اور بڑی مشکل سے گذر ہوتی تھی۔ ان کا بیٹا بشیر انگریزی مدرسے کی ساتویں جماعت میں تعلیم پاتا تھا۔ منشی جی صاحب کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میرا بیٹا اچھی طرح تعلیم پائے تاکہ آیندہ ہماری حالت درست ہوسکے۔ لیکن افسوس کہ ان کے سامنے ان کی یہ آرزو پوری نہوئی اور وہ کچھ عرصہ کے بعد انتقال کر گئے۔

ایک تو منشی ظہیرالدین کے گھر والے پہلے سے غریب تھے اور اب انکے مرنے کے بعد تو بہت بری طرح زندگی بسر ہونے لگی۔ گھر میں جو کچھ سامان تھا وہ بھی فروخت ہوگیا۔ بشیر کی تعلیم بھی رک گئی۔ اور اس نے مدرسہ جانا چھوڑ دیا۔ ماں بیچاری پسائی کرکے اپنی اور بشیر کی گذر کرتی تھی۔

لیکن بشیر ہمیشہ رنجیدہ رہتا تھا۔ اسکو مدرسہ چھوٹنے کا بہت رنج تھا۔ اور اسی رنج میں وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا ایکدن شیخ عبدالرحیم صاحب کی بشیر پر نظر پڑگئی۔

شیخ صاحب:۔ "میں کیا تم بیمار ہو؟"

بشیر:۔ "نہیں تو"

شیخ صاحب:۔ "تو پھر اتنے دبلے کیوں ہو؟"

بشیر:۔ "کچھ طبیعت خراب رہتی ہے"

شیخ صاحب:۔ "مدرسے تو روزانہ جارہے ہوگے؟"

بشیر:۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) "مدرسہ جانا تو میں نے والد صاحب کے مرنے کے بعد ہی چھوڑ دیا"

شیخ صاحب:۔ "کیوں چھوڑ دیا؟"

بشیر:۔ "والد صاحب کے مرنے کے بعد گھر کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ روٹی بھی ہم لوگوں کو بہت مشکل سے ملتی ہے ایسی حالت میں لکھنا پڑھنا کیسے ہوسکتا ہے"

شیخ صاحب:۔ "بشیر یہ سن کر مجھے نہایت رنج ہوا۔ اگر تم خرچ کی وجہ سے پڑھنے نہیں جاتے تو میں تمہاری تعلیم کے اخراجات اٹھانے کو تیار ہوں۔ لیکن تم پڑھنا مت چھوڑو۔"

بشیر:۔ "شیخ صاحب! میں آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ میری حالت پر رحم کھاتے ہیں۔ لیکن اگر میں پڑھنا شروع کردوں تو مجھسے اپنی ماں کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اگر آپ میری مدد ہی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اپنے یہاں ملازم رکھ لیجئے۔ اور میرے اور میری ماں کے گذارے کیلئے کچھ دیدیا کیجئے"

شیخ صاحب اچھا مجھے منظور ہے اور آج ہی سے میں تمہیں اپنے یہاں ملازم رکھے لیتا ہوں ۔"

بشیر پھر اسکول میں داخل ہو گیا ۔ وہ ایک نہایت ہوشیار اور محنتی لڑکا تھا ۔ ہمیشہ سچ بات زبان سے نکالتا ۔ تمام اساتذہ اس کی عزت کرتے اور اسکی دیانت داری اور سچائی سے خوش تھے مدرسہ سے آکر سب سے پہلے وہ اپنے آقا کے گھر کا کام کاج کرتا بازار سے سودا وغیرہ لاتا ۔ اور رات کو اپنا سبق یاد کرتا ۔

ایک مرتبہ بشیر کے استاد سے شیخ صاحب کی ملاقات ہوئی ماسٹر صاحب نے بشیر کی بہت تعریف کی اور کہا کہ ایک مرتبہ میری جیب میں سے دس روپے کا نوٹ نکل کر گر گیا اور ایک لڑکے نے اٹھا لیا ۔ لیکن نوٹ اٹھاتے ہوئے بشیر نے دیکھ لیا ۔ لڑکے نے کہا بشیر ایک روپیہ ہم تمہیں مٹھائی کھانے کیلئے دیں گے ۔ دیکھو تم ماسٹر صاحب سے مت کہنا ۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ یہ تو مجھسے نہیں ہو سکتا کہ جھوٹ بولوں ۔ جب ماسٹر صاحب مجھسے دریافت کریں گے تو میں سچ سچ کہدونگا ۔ ورنہ یہ نوٹ تم ماسٹر صاحب کو واپس کر دو ۔

لڑکا " یار تم بھی عجیب ہو ۔ ایک روپیہ نہ سہی دو روپیہ لے لینا غریب آدمی ہو دو روپے سے کوئی نہ کوئی کام چل جائیگا "

بشیر " نہیں بھائی مجھے تمہارے روپے نہیں چاہئیں "

لڑکا " اچھا اچھا میں سمجھ گیا تم آدھے روپے لینا چاہتے ہو اچھا آؤ ہم تمہیں پانچ ہی روپے دیتے ہیں "

بشیر " بھائی کیوں مجھے لالچ میں ڈال کر گنہگار کرتے ہو میں کچھ بھی نہیں لینا چاہتا ۔ بس تم خدا کیلئے یہ نوٹ ماسٹر صاحب کو واپس کر دو ۔ اور گنہگار نہ بنو "

لڑکا " اچھا یار تم نے میری بات نہیں مانی ۔ ابھی اسکا مزہ چکھاتا ہوں ۔ لڑکا نوٹ لئے ہوئے میرے پاس آیا اور کہا کہ ماسٹر صاحب یہ نوٹ میں نے بشیر کی کتاب سے نکالا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آپ کا نوٹ چرایا تھا ۔

مجھے یہ سنکر بہت غصہ آیا اور میں نے بشیر کو بلایا ۔ بشیر میرے ناراض ہونے پر خوفزدہ نہیں ہوا بلکہ اس نے سارا قصہ شروع سے آخر تک سچ سچ سنا دیا ۔ وہ پہلے ہی سے کلاس میں ایماندار مشہور تھا اس کے بھولے اور معصوم چہرے نے گواہی دی کہ وہ بالکل بے قصور ہے ۔ چنانچہ میں نے بشیر کو شاباش دی اور لڑکے کو اس کے جھوٹ بولنے پر خوب پیٹا ۔

بشیر کے چال چلن اور اسکی محنت اور اس کی سچائی کا شیخ عبدالرحیم صاحب پر بہت اچھا اثر پڑا ۔ وہ بھی بشیر کی بڑی عزت کرتے تھے ۔ لیکن چاہتے تھے کہ بشیر کی دیانت اور ایمانداری کا امتحان لیا جائے ۔ چنانچہ وہ بیسوں دفعہ اپنے روپیوں کا بکس کھلا ہوا چھوڑ گئے ۔ کبھی بند کر گئے اس کی چابی بشیر کو دے گئے لیکن جب کبھی آکر روپیوں کا شمار کیا تو ایک پائی کا بھی فرق نہ نکلا ۔

ایک مرتبہ آزمائش کے طور پر شیخ صاحب نے بشیر کی تنخواہ میں کچھ کمی کر دی ۔ اور بشیر کی وہی پہلی سی حالت پھر ہو گئی کہ ماں بیٹوں کی مشکل سے گذر ہونے لگی ۔ بشیر کے بدن پر ثابت کپڑے بھی نظر نہ آتے ۔ لیکن وہ خدا کا بندہ روزانہ پڑھنے جاتا اور اپنے آقا کا کام اسی مستعدی اور ہوشیاری سے کرتا ۔

ایک دن جبکہ سوداگر صاحب مکان میں نہیں تھے ۔ محلہ کا ایک لڑکا کھیلتا ہوا گھر میں گھس آیا اور چارپائی پر روپے دیکھ کر بولا ۔

لڑکا " یار بشیر ! کیا یہ روپئے تمہارے ہیں ؟ "

بشیر " نہیں تو میرے نہیں ہیں بلکہ شیخ صاحب کے ہیں شاید وہ رکھے ہوئے بھول گئے ہیں ۔

لڑکا: سنا ہے کہ مرزا صاحب نے تمھاری تنخواہ میں کمی کر دی ہے اور تمھاری مشکل سے گذر ہوتی ہے
بشیر: ہاں، تم نے صحیح سنا ہے لیکن مجھے مرزا صاحب سے کوئی شکایت نہیں ہے جیسا میں کام کرتا ہوں۔ اسی کے مطابق تنخواہ دیتے ہیں انھوں نے مجھے آرام بھی دیا ہے مجھے پڑھایا ہے لکھایا ہے۔ میری ضرورتوں کو پورا کیا ہے۔ اگر وہ کچھ بھی نہ دیں تب بھی میں اُن کی اسی طرح خدمت کرونگا۔"

لڑکا: صرف ایک تمھیں ہو جو شیخ صاحب کی تعریف کرتے ہو ورنہ وہ تو بہت ہی بُرے اور دغاباز آدمی ہیں۔ دیکھو بے قصور تمھاری تنخواہ کم کر دی۔ اگر تمھاری جگہ میں ہوتا تو انکو اس کا ایسا بدلہ دیتا کہ میاں یاد ہی تو کرتے۔"

بشیر: خدا کیلئے انھیں بُرا بھلا مت کہو۔ وہ بہت ہی شریف آدمی ہیں۔"

لڑکا: ہونگے مکار آدمی کو تمھیں شریف کہہ سکتے ہو۔ میری رائے میں تو آؤ ان روپیوں کو لے کر بمبئی بھاگ چلیں اور وہاں چل کر اس سے کوئی کاروبار کریں۔"

بشیر: بھائی سنتے ہو! میں تمھاری اس نصیحت کو نہیں سننا چاہتا۔ اور نہ میں اپنے مالک کی نمک حرامی کرنا چاہتا ہوں تم ابھی مکان سے چلے جاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

لڑکا: اچھا مت جاؤ لیکن اکڑتے کیوں ہو؟"

بشیر: بس تمھاری بھلائی اسی میں ہے کہ چلے جاؤ۔"

لڑکا: جاتا تو ہوں لیکن دیکھو تمھاری اس بُرائی کا نتیجہ تمھیں ضرور بھگتنا پڑیگا۔"

شیخ صاحب جو قریب کے کمرے سے تمام گفتگو سن رہے تھے وہاں سے ہٹ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ ٭ ٭ ٭

آج شیخ صاحب کی لڑکی کی شادی ہے۔ چاروں طرف سے ہزاروں مہمان آآکر جمع ہو رہے ہیں۔ باجے بج رہے ہیں ہر طرف سے مبارک سلامت کا شور و غل مچا ہوا ہے۔ میاں بشیر آج اپنے چھوٹے سے کمرے میں چارپائی پر بہت رنجیدہ لیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے ہمجولی اور محلے کے لڑکے اچھے اچھے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائے ہوئے جدھر نکل جاتے ہیں وہ جگہ مہک جاتی ہے۔ شام ہو گئی لیکن بشیر میاں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنی غریبی اور مفلسی پر آنسو بہا رہے ہیں۔ اتنے میں اُن کے آقا شیخ عبدالرحیم صاحب تشریف لائے۔

شیخ صاحب: کیوں بشیر! آج میری لڑکی کی شادی ہے۔ ہر جگہ خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ لیکن تم میاں رنجیدہ پڑے ہوئے ہو"

بشیر: (روتے ہوئے) حضور کیا کروں۔ کپڑے ہی نہیں ہیں۔ شرم کی وجہ سے باہر نہیں جاتا۔ لوگ کہیں گے اتنے بڑے آدمی کا نوکر ہے اور کپڑے بھی پاس نہیں ہیں۔"

شیخ صاحب: اچھا ذرا باہر والے کمرے میں ہو آؤ۔ وہاں میز پر تمھارے لئے ایک خط رکھا ہے۔ اس کو پڑھ لو اور ایک گھنٹہ کے بعد مجھ سے ملو۔"

بشیر آنکھیں پونچھتا ہوا باہر کے کمرے میں پہنچا۔ لفافہ چاک کر کے خط کو پڑھا لکھا تھا

عزیزم بشیر! کمرے میں جتنے کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں۔ وہ سب تمھارے لئے تیار کرائے گئے ہیں۔ برابر والے کمرہ میں غسل کر کے اچھے سے اچھا جوڑا جو تمھیں پسند ہو پہن کر میرے پاس آجاؤ۔ کیونکہ تمھیں بھی میری لڑکی کی شادی میں شریک ہونا ہے۔ میری خوشی یہ ہے کہ تم آئینے والی میز کے اوپر جو ریشمی کپڑے گھٹنے ہوئے ہیں اُن کو پہن کر آؤ۔"

عبدالرحیم

بشیر نے جو یہ خط پڑھا تو خوشی سے اُچھل پڑا۔ دل ہی دل میں شیخ صاحب کی شرافت کی تعریف کرنے لگا۔ جلدی جلدی غسل کر کے کپڑے پہنے۔ سر سے صافہ باندھا اور تیار ہو کر شیخ صاحب کے سامنے جا کر اُن کو سلام کیا۔

شیخ صاحب نے بشیر کو دعائیں دیں اور مسکرائے۔

مکان کے باہر شہر کے بڑے بڑے معزز لوگوں کا مجمع تھا کیونکہ مرزا صاحب نے سب کو مدعو کیا تھا۔ تمام لوگ دولھا کا انتظام کر رہے تھے۔

شیخ صاحب آئے اور مجمع کو مخاطب کر کے یہ تقریر کی:-

"میرے بھائیو اور بزرگو! دنیا میں ایمانداری اور دیانتداری بڑی چیز ہے۔ شریف آدمی کی صرف یہی نشانی ہے۔ میاں بشیر جو آج آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔ ایمانداری اور دیانتداری کی مجسم تصویر ہیں۔ یہ ایک غریب کے لڑکے ہیں اور یتیم ہیں لیکن اپنی سچائی اور ایمانداری سے انھوں نے مجھے نہایت خوش رکھا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ ان کا امتحان لیا لیکن ہمیشہ یہ اس میں پورے اترے۔ میں ان سے بہت خوش ہوں میں انھیں کچھ انعام دینا چاہتا تھا لیکن بعد کو میں نے طے کیا کہ تمیم نہیں بلکہ اس دُرِ یتیم کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دوں۔ لڑکی کے سوا میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس لئے آیندہ بشیر میاں ہی میری جائداد کے مالک ہونگے۔" اس تقریر سے مجمع پر ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ لوگوں نے اس عجیب غریب شادی پر بہت تعجب کیا۔ بشیر شیخ صاحب کے قدموں پر گر پڑا اور کہا حضور میں اس عزت افزائی کے لائق نہیں ہوں۔ میں تو آپ کا ادنیٰ غلام ہوں۔" شیخ صاحب نے بشیر کا سر اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ تھوڑی دیر میں نکاح پڑھا دیا گیا۔ اور دہلی میں اس عجیب و غریب شادی کی شہرت ہو گئی۔ ٭ شیخ صاحب کے انتقال کے بعد میاں بشیر تمام جائداد کے مالک ہو گئے۔ اور آج چاندنی چوک میں ان کی بہت بڑی دکان ہے۔ (خاص)